بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ

الحمد للہ والمنۃ کہ دریں زمان میمنت اقتران تفسیر سراپا تنویر گنجینۂ حقائق و معارف و خزینۂ اسرار و لطائف کشاف مشکلات قرآنیہ و وصاف مخدرات فرقانیہ ہستی بہ

معارف القرآن

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

الحافظ محمد ادریس صاحب کاندھلوی

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

جلد اول مشتمل بر تفسیر پارہ ① ② ③

بہ ترجمہ حقیقت آگاہ معارف پناہ عارف باللہ حضرت شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ اسرارہما

ناشر

مکتبہ رحمانیہ

اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

مکتبہ رحمانیہ
MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

اِقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

کتاب کی کمپوزنگ کے حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ..... معارف القرآن (جلد اوّل)

تصنیف ..... حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر ..... مکتبہ رحمانیہ
اِقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

مطبع ..... خضر جاوید پرنٹرز

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ
إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ

اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ
إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

احوال وآثار :

ہندوستان کے صوبہ یو۔پی میں شاہدرہ دہلی اور سہارن پور ریلوے لائن پر مظفر نگر سے ۵۰ دہلی سے ۶۴ اور سہارن پور سے ۶۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ایک قصبہ ہے جسے "کاندھلہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چالیس پچاس ہزار نفوس پر مشتمل یہ قصبہ برگ و گل کے اعتبار سے زرخیز اور افراد کے اعتبار سے مردم خیز ہے۔

بارہویں، تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں جس قدر اہلِ علم وفضل اس قصبہ کی خاک سے اٹھے، وہ شرف کسی اور قصبہ کو حاصل نہ ہوسکا۔ بقول احسان دانش "کاندھلہ" میں متعدد شاعر بھی تھے، اور جید مولوی بھی، انگریزی کے فارغ التحصیل فضلاء بھی اور اصول وعقیدہ سے انگریزی کو گناہ خیال کرنے والے صاحب نظر بھی، نیز پرانی فیشن کے وہ علماء بھی جن کی علمیت کے باعث بڑی بڑی درس گاہیں، اور دنیا بھر کے دارالعلوم کاندھلہ کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ جس روشن ضمیر نے مثنوی مولانائے روم کا ساتواں دفتر لکھا وہ بھی اسی قصبہ کی خاک سے اٹھا تھا۔"

کاندھلہ کے ارباب علم وفضل کی ایک طویل فہرست ہے، جسے اس وقت چھیڑنا طوالت کا باعث ہوگا۔ کاندھلہ کے انہی علماء و فضلاء کے باعث دنیائے علم ودانش میں دیوبند اور علی گڑھ کی طرح کاندھلہ کا نام بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کا تعلق بھی اسی مردم خیز قصبہ سے ہے۔ اگرچہ آپ کی جائے پیدائش بھوپال ہے لیکن آپ کا وطن مالوف کاندھلہ ہے مقدمۃ التفسیر میں مولانا نے خود اس بات کی صراحت فرمائی۔

"بھوپال میری جائے ولادت اور کاندھلہ میرا وطن ہے"

شہر بھوپال میں مولانا ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ ۲۰ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اس طرح آپ صدیقی النسب ہیں، آپ مثنوی مولانا روم کے ساتویں دفتر کے مؤلف مولانا مفتی الٰہی بخش کی اولاد میں ہیں۔

تعلیم وتربیت:

خاندانی روایات کے مطابق مولانا نے قرآن کریم حفظ کیا۔ کاندھلہ میں قرآن کریم کی تکمیل کے بعد آپ کے والد مولانا حافظ محمد اسمٰعیل کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو تھانہ بھون لے گئے اور وہاں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ اشرفیہ میں آپ نے درس نظامی کی ابتدائی کتب پڑھیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولوی عبداللہ، مؤلف تیسیر المنطق سے آپ نے کسب فیض کیا۔ مولانا تھانوی کے مدرسہ میں چوں کہ صرف ابتدائی تعلیم کا اہتمام تھا اس لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا آپ کو سہارن پور لائے اور مدرسہ عربیہ

مظاہر العلوم میں داخل کیا۔ مظاہر العلوم میں آپ نے مولانا خلیل احمد سہارن پوری، مولانا حافظ عبداللطیف، مولانا ثابت علی جیسے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا اور ۱۹ برس کی عمر میں سند فراغ حاصل کی۔ مظاہر العلوم سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد ذوق پیدا ہوا کہ دارلعلوم دیوبند میں بھی جو عالم اسلام کی مقتدر ہستیوں کا مرکز تھا، دورۂ حدیث کیا جائے چناں چہ مظاہر العلوم سے سند فراغ حاصل کر کے دوبارہ دورۂ حدیث کیا، اور مولانا علامہ انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین دیوبندی، اور مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہم جیسے اجلاء محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

تدریسی زندگی:

۱۳۳۸ھ ۱۹۲۱ء سے آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مفتی محمد کفایت اللہ کے قائم کردہ مدرسہ امینیہ دہلی سے آپ نے تدریس شروع کی اور ایک سال بعد ہی ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دیوبند میں تدریس کی دعوت دی۔ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی تدریس ایک بڑا اعزاز تھا، مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا اور دیوبند فروکش ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعزاز کو اس طرح دو ۲ آتشہ کیا کہ ایک سال قبل جن کبار اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا۔ انہیں کے پہلو میں بیٹھ کر ان سے حاصل کردہ فیض کو عام کرنا شروع کر دیا۔ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے سال اول ہی میں آپ نے فقہ کی اعلیٰ ترین کتاب الہدایہ، ادب کی ایک اہم کتاب مقاماتِ حریری جیسی مشکل کتب پڑھائیں۔ دارالعلوم دیوبند سے یہ تعلق کم وبیش نو سال قائم رہا۔ اس دوران نماز فجر کے بعد نو درہ میں درس قرآن دیتے جس میں دارالعلوم کے متوسط اور اعلیٰ درجات کے طلباء حتیٰ کہ بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ اسی درس کی بناء پر آپ کو بیضاوی اور تفسیر ابن کثیر پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم چھوڑ کر حیدرآباد دکن آ گئے۔

حیدرآباد دکن میں قیام:

حیدرآباد دکن کا نو برس پر مشتمل قیام آپ کی زندگی میں اس اعتبار سے تاریخی گردانا جاتا ہے کہ وہاں قیام کے دوران آپ نے عظیم الشان کتاب التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح تالیف کی۔ حیدرآباد دکن میں قیام کے دوران دنیائے علم کے ایک عظیم کتب خانہ، کتب خانہ آصفیہ میں موجود بعض نادر مخطوطات سے استفادہ کیا جن میں تورپشتی کی المفاتیح شرح مصابیح سب سے اہم ہے۔ جس سے آپ نے تعلیق میں استفادہ کیا اور بعض مقامات پر سیرۃ المصطفیٰ میں بھی اس کے حوالہ جات موجود ہیں۔ حافظ تورپشتی کی یہ کتاب مصابیح کی ایک بلند پایہ شرح ہے جس کا مخطوط نسخہ دنیا میں صرف کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں:

علامہ شبیر احمد عثمانی، صدر مہتمم اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہوئے تو ان حضرات نے آپ کو بہ حیثیت شیخ التفسیر دارالعلوم آنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول کر لی اور حیدرآباد دکن کے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ پر ستر روپے ماہانہ کی دارالعلوم کی تدریس کو ترجیح دی۔ اور ۱۹۳۹ء میں دوبارہ دارالعلوم آ گئے۔ دارالعلوم میں یہ قیام ہجرت پاکستان تک (دس سال) رہا اور وہاں آپ نے تفسیر بیضاوی، تفسیر ابن کثیر، سنن ابی داؤد اور طحاوی کی مشکل الآثار جیسی امہات الکتب پڑھائیں۔

پاکستان ہجرت:

مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور اس کے بعد پورے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت

کے حصول کے لیے بھرپور تحریک شروع ہوگئی۔ مولانا نے اگرچہ عملاً تو سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن آپ دوقومی نظریہ کے زبردست حامی تھے، سیرۃ المصطفیٰ میں بھی جہاد کی بحث میں دوقومی نظریہ پر مدلل اور علمی گفتگو کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ مئی ۱۹۴۹ء میں مولانا نے پاکستان ہجرت کرنے کا ارادہ کرکے بادلِ ناخواستہ دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر آپ کو دارالعلوم ہاٹھ ہزاری چاٹگام، مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی جانب سے بہ حیثیت شیخ الحدیث آنے کی دعوت دی گئی لیکن آپ نے مغربی پاکستان آنے کو ترجیح دی اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں ریاست بہاولپور کی دعوت پر آپ پاکستان آگئے اور جامعہ عباسیہ بہاول پور میں بہ حیثیت شیخ الجامعہ تدریسی خدمات کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا۔

جامعہ عباسیہ بہاول پور سے وابستگی:

۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو آپ نے جامعہ عباسیہ میں بہ حیثیت شیخ الجامعہ چارج لیا۔ جامعہ عباسیہ میں عصری و دینی تعلیم کے اختلاط کی وجہ سے روحانیت اور للّٰہیت نہ تھی جو دینی مدارس کا خاصہ ہوتی ہے، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کو وہاں کا یہ ماحول اور مادی دوڑ پسند نہ آئی اور جلد ہی طبیعت میں تکدّر پیدا ہوگیا۔

جامعہ اشرفیہ لاہور سے تعلق:

۱۹۵۱ء کے اوائل میں مولانا جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے اور یہاں خطاب فرمایا، مولانا مفتی محمد حسن کی نظر انتخاب نے مولانا کو جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کے طور پر منتخب کرلیا۔ چناں چہ بہاولپور واپس جانے کے بعد ایک خط میں مولانا کو جامعہ اشرفیہ آنے کی دعوت ان الفاظ میں دی۔

''میں آپ کو پلاؤ اور بریانی چھوڑ کر دال روٹی کی دعوت دے رہا ہوں''

مولانا نے دال روٹی کی اس مخلصانہ دعوت کو بصد اخلاص قبول کیا۔ مفتی صاحب نے دل کی گہرائیوں سے جو بات کہی تھی، مولانا کے دل پر اثر کرگئی اور مولانا ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو جامعہ عباسیہ سے کم مشاہرہ پر جامعہ اشرفیہ آگئے اور پھر عمرِ عزیز کے آخری لمحہ تک جامعہ اشرفیہ سے اپنا تعلق قائم رکھا۔

وفات حسرت آیات:

۲ اگست ۱۹۷۳ء کی شب اچانک ہچکیاں آنی شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر اور اطباء معائنہ کے بعد اس بات پر متفق ہوئے کہ معدہ بہت کمزور ہوگیا ہے اور جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چناں چہ کمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۲ اگست ۱۹۷۳ء سے جولائی ۱۹۷۴ء تک کا یہ تمام سال اسی طرح کمزوری اور نقاہت میں گزرا۔ لیکن شدید مرض اور اضمحلال میں بھی درس بخاری کا سلسلہ بند نہ کیا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو شدید دورہ پڑا اور طبیعت پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اخیر وقت میں جب ذرا ہوش آتا تو کلمہ طیبہ کا ورد ہوتا اور یہ آیت تلاوت کرتے۔

﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾

۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء ۸ رجب ۱۳۹۴ھ کو صبح صادق کے وقت طلوع آفتاب سے قبل علم کا یہ آفتاب و ماہتاب اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسی دن ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ خلف الرشید، والد محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور

اس طرح اس پیکر علم وعرفان کو سپرد خاک کیا گیا۔ مولانا کی وفات حسرت آیات برصغیر میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اہل علم پر غم کا ایک پہاڑ بن گئی۔ مولانا کی وفات سے ایک ایسا علمی خلا پیدا ہوا کہ جو بعد میں پورا نہ ہوا۔

تصنیفی خدمات:

تدریسی خدمات کا ایک مختصر خاکہ گذشتہ اوراق میں پیش کیا جاچکا ہے، درس وتدریس اور وعظ وخطبات کے علاوہ تحریر وتصنیف سے بھی مولانا نے دین متین کی لازوال خدمات سرانجام دی ہیں۔ تصنیف وتالیف میں مولانا کسی خاص میدان کے شہسوار نہیں بلکہ ہر میدان علم میں شہسواری کا ایسا ملکہ رکھتے ہیں کہ گویا زندگی ہی اس میدان میں گزری ہے۔

علم تفسیر، حدیث، عقائد وکلام، سیرت نبی کریمؐ، ردِ فرق باطلہ، غرض کہ ہر علمی میدان میں مولانا نے اپنی لازوال خدمات کے ایسے سنگِ میل نصب کئے ہیں کہ جو رہتی دنیا تک قائم ودائم رہیں گے۔ مولانا کی تصانیف کے مفصل تذکرہ کا تو یہ موقع نہیں لیکن اختصار کے ساتھ آپ کی چند تصانیف کا تعارف پیش خدمت ہے۔

علم تفسیر = معارف القرآن:

علوم ومعارف کا ایک بھرپور خزینہ اور علماء متقدمین کے علوم کا ایک بہترین مجموعہ ہے، مطالب قرآنیہ کی توضیح وتشریح، ربط آیات کا بیان، احادیث صحیحہ اور اقوال وآثار صحابہ وتابعین پر مشتمل تفسیری نکات ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید، ان کے شبہات اور جوابات کلام الٰہی کی عظمت وشوکت، اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا بیان، یہ چند خصوصیات ہیں جو معارف القرآن میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء میں اس تفسیر کی تالیف کا آغاز کیا گیا اور ابھی سورۂ صافات کے اختتام تک پہنچے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ پھر سورۂ صٓ سے آخر تک بطور تکملہ مولانا محمد مالک کاندھلویؒ نے تحریر فرمائی۔ مولانا محمد مالک صاحب نے بھی مولانا ہی کے طرز واسلوب کا تتبع کیا ہے۔

الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی:

ساتویں صدی ہجری کے مفسر قرآن قاضی ناصر الدین ابوالخیر عبد بن عمر الشیرازی البیضاوی م ۶۸۵ھ کا نام علم تفسیر میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی مرتب کردہ تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل ہمیشہ علماء مفسرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے اور اس پر متعدد تعلیقات کی گئیں اور بہت سی شروح لکھی گئیں۔

۲۰ شوال ۱۳۶۰ھ کو اس کتاب کی تالیف کا آغاز کیا گیا یہ تفسیر ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اور اس کا واحد مخطوطہ ادارہ اشرف التحقیق میں موجود ہے۔

بیضاوی کی توضیح اور اس کے ادق نکات کی تشریح میں یہ کتاب ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ طوالت واطناب سے گریز کیا گیا ہے اور نہ اس قدر اختصار سے کام لیا گیا کہ بیضاوی کے دقیق نکات وضاحت طلب رہ جائیں۔ اس مسودہ کی تدوین کے بعد اگر موزوں سائز پر طبع کرایا جائے تو تقریباً چار ہزار صفحات اس کی ضخامت ہوگی۔

مقدمۃ التفسیر:

اصول وتاریخ تفسیر پر ایک جامع اور مفصل رسالہ ہے جو ابھی تک مخطوط شکل میں ہے۔

علم حدیث = تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری:

بخاری کے مشکل مقامات خصوصاً تراجم ابواب جو امام بخاری کی ایک امتیازی شان ہے، کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ اس کے تین اجزاء طبع ہو چکے ہیں جبکہ بقیہ اجزاء ابھی طبع نہیں ہو سکے۔

التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح:

ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب کی کتاب مشکواۃ المصابیح مجموعہائے حدیث میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ علماء نے اس کتاب کی جس قدر شروح لکھی ہیں، شاید کسی اور کتاب کو یہ سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔ مولانا نے اس کتاب میں مشکوٰۃ کی عمدہ اور آسان زبان میں بلیغ پیرایہ میں توضیح وتشریح کی ہے۔ مولانا کی حیات میں اس کتاب کے چار اجزاء دمشق اور باقی چار اجزاء پاکستان میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد یہ کتاب ازسرنو سات جلدوں میں مکمل طبع ہوئی ہے۔

حجیت حدیث:

حدیث کی قطعیت اس کی حجیت اور اس کا مصدر شرعی ہونا اس پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں دلائل عقلیہ ونقلیہ سے بڑی بھر پور بحث کی ہے اور یہ کتاب منکرین حدیث کے لیے ایک مسکت جواب ہے۔

علم عقائد وکلام = الکلام الموثوق فی ان کلام اللہ غیر مخلوق:

قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور کلام الٰہی کے غیر مخلوق اور قدیم ہونے پر مولانا نے اس رسالہ میں بھر پور علمی، تحقیقی اور مدلل گفتگو کی ہے اور معتزلہ وفلاسفہ کے غلط نظریات کی تردید کی ہے۔

احسن الحدیث فی ابطال التثلیث:

عیسائیت کے نظریۂ تثلیث کی تردید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت وبشریت پر ایک عظیم تحقیق ہے۔ عیسائیت کے خلاف مولانا کے متعدد رسائل ہیں جن کو تدوین وتعلیق کے بعد شائع کیا جائے اور قوم کے ان بدنصیبوں کو پڑھایا جائے جو عیسائی مشنری سکولوں میں پڑھ کر اپنے ایمان واسلام کو ضائع کر رہے ہیں۔

عقائد اسلام:

دین اسلام کے بنیادی واساسی عقائد جن میں توحید ورسالت، قیامت اور ملائکہ پر ایمان شامل ہیں، پر مشتمل اردو زبان میں ایک منفرد کتاب ہے جو اس مسئلہ میں علمی بحث پر مشتمل ہے

علم الکلام:

مذہب اسلامی کی خصوصیات، احوال قیامت، جنت وجہنم عالم برزخ، حوض کوثر کے وجود پر مدلل ومحکم بحث پر مشتمل ہے۔

دستور اسلام:

اسلامی نظام حکومت کے بیان پر مشتمل ایک عمدہ کتاب ہے جس میں اسلامی نظام انتخاب، اقتصادی نظام اور تعلیمی نظام پر بحث کی گئی ہے اور نظام حکومت کی بنیادوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

خلافت راشدہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت پر ایمان، عقائد اسلامی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، مولانا نے اپنی اس کتاب میں خلافتِ راشدہ پر علمی بحث کی ہے۔

سیرۃ المصطفیٰ:

مولانا کی خدمات دینی وعلمی میں سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ایک تابندہ ستارہ کی مانند ہے۔ آپکی تصانیف میں سب سے زیادہ قبولیت عامہ سیرۃ المصطفیٰ کو حاصل ہوئی۔

اس کتاب کے معلق مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''جو شخص اردو کی ضروری استعداد رکھتا ہو کتاب مذکور کے مطالعہ یا درس سے محروم نہ رہے''۔

ان کتب کے علاوہ مولانا کی بہت سے دیگر مؤلفات ہیں جن کو خوف طوالت سے ترک کر دیا گیا۔

محمد سعد صدیقی

حضرت کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ
وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ
اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ
الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا
لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ
حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا
عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ

حضرت کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

لطائف و معارف

اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق کی جو فضیلت نکلتی ہے
وہ بالکل ظاہر ہے واقعی واقعۂ غار میں اُنکی جان نثاری قابل صد
آفرین ہے یارِ غار کی مثل جو دنیا میں مشہور ہے وہ یہیں سے
ہے حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابوبکر جیسے صرف
کی فضیلت دیدیں اور مجھ سے تمام عمر کی عبادت اور نیکیاں لے لیں
تو میں اسپر راضی ہوں

امت مرحومہ کا اتفاق ہے اسپر اتفاق ہے کہ اسوقت آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار صرف حضرت صدیق تھے
حتیٰ کہ مخالفین بھی اس کو مقر اور معترف ہیں پس یہ ایک
ایسی فضیلت ہے جو حضرت صدیق کی شان عظمت کو واضح کر رہی ہے
اور اگر خدا اُنکو شرف قبولیت حاصل نہ ہوتا تو اُنکی اس فضیلت

معارف القرآن اور اس کے مؤلف کے بارے میں

زیر نظر تفسیر (جس کی پہلی جلد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ کے ہاتھوں میں ہے) حضرت مولانا حافظ محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی جلالتِ شان واخلاص کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تفسیر اور صاحب تفسیر کے بارے میں میرا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے تاہم تفسیر ہذا میں غور کرنے والوں کو علوم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آئے گا۔ اس بات کا اندازہ اہل علم حضرات مطالعہ کے بعد کر سکیں گے۔ اس بارے میں اگر مختصراً یوں کہا جائے تو جامع تبصرہ ہوگا کہ یہ تفسیر سلف صالحین اور علماء متاخرین کے علوم ومعارف کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ اس میں ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شامل کیا ہے۔ لفظی ترجمہ کے بعد رواں ترجمہ ہے جس میں ضروری تشریحات کی گئی ہیں۔

حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کو آیت اور سورتوں میں ربط کا خاص ذوق تھا اس ذوق کو اپنی تفسیر میں پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ آیات کی ضروری تشریح کے بعد فائدہ کے عنوان سے اسرار ونکات بیان کیے ہیں اور جا بجا فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی ہے۔

حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ جہاں ایک طرف حافظ ابن کثیر، امام قرطبی، امام فخر الدین رازی اور علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال نقل کرتے ہیں وہاں شیخ محی الدین ابن عربی، حضرت حسن بصری اور مولانا روم رحمۃ اللہ علیہم کے صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی نقل کرتے ہیں۔ نیز جا بجا شکوک وشبہات کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں تمام کتب تفسیر آپ کے پیش نظر ہیں اور مختلف ائمہ تفسیر اور مفسرین کے اقوال نقل کر کے آخر میں قول راجح بیان کرتے ہیں م آخذ میں سب سے زیادہ علامہ آلوسیؒ کی روح المعانی اور امام رازیؒ کی تفسیر کبیر پر بھروسہ کیا ہے۔

حضرت مولفؒ کی تفسیر وحدیث اور علم کلام میں گرانقدر تصانیف اس بات کا بین اور واضح ثبوت ہیں کہ ہر فن میں آپ کا مقام بہت بلند تھا لیکن اپنے شیخ ومربی حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح تفسیر قرآن کریم اور علوم کتاب اللہ کی شرح و تحقیق کا رنگ سب پر غالب تھا اسی جذبہ وشوق میں تفسیر معارف القرآن شروع فرمائی جو اپنے موضوع پر ایک بے مثال تفسیر ہے اور تمام متقدمین کے علوم ومعارف کا ایک جامع خزانہ ہے۔ اس تفسیر کے ساتھ حضرت مولفؒ کے قلبی لگاؤ اور شغف کا یہ عالم تھا کہ اخیر حیات میں جب کہ ضعف ونقاہت کی کوئی حد نہیں رہی تھی حتی کہ اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ تھی لیکن اس ضعف کے باوجود بھی تفسیر کا سلسلہ برابر جاری رہا دن رات یہی فکر تھی کہ کسی طرح تفسیر مکمل کرلوں وفات سے کچھ عرصہ قبل کی بات ہے کہ جب مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مولفؒ کے صاحبزادے) رمضان المبارک میں عمرہ کے لیے جارہے تھے تو ان کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں والہانہ انداز میں تکمیل تفسیر کے لیے دعا کا ذکر فرماتے ہوئے یہ الفاظ تحریر فرمائے تھے۔ ''میرا دل از حد پریشان ہے سوائے تفسیر کے کسی چیز میں دل نہیں لگتا اس لیے سب سے فارغ اور یکسو ہونا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تفسیر اور شرح بخاری کو جلد مکمل فرمادیں اور اس کی طباعت کا غیب سے انتظام فرمادیں'' اللہ تعالیٰ حضرت مؤلفؒ کی اس عظیم خدمت کو قبول فرمادیں"۔ آمین

حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ کو بھوپال شہر میں (جب کہ آپ کے والد صاحب وہاں مقیم تھے) پیدا ہوئے آپ کا اصل وطن کاندھلہ تھا آپ کے والد صاحب کا نام مولانا محمد اسمٰعیل کاندھلوی صدیقی ہے۔ والد کی طرف سے آپ کا شجرۂ نسب خلیفۂ اول یارِ غار سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

آپ نے ۹ برس کی عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا اور ۱۹ برس کی عمر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور (انڈیا) سے سند فراغ حاصل کی اور پھر دوسری مرتبہ دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کرکے سند حاصل کی۔

ایک سال مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس رہے پھر ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے اور پھر بعض وجوہات کی بنا پر وہاں سے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت شیخ التفسیر آپ کا تقرر ہوا عرصہ دس سال آپ اس منصب پر فائز رہے قیام پاکستان کے بعد جب آپ ہجرت کرکے پاکستان تشریف لیے تو جامعہ عباسیہ بہاولپور میں بہ حیثیت شیخ الجامعہ (پرنسپل) آپ کا تقرر ہوا وہاں کے ماحول میں آپ جو توقعات لے کر گئے تھے جب وہ پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو آپ نے اسے بھی خیر باد کہہ دیا اور پھر مستقل طور پر جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور تشریف لائے یہاں تک کہ جب ۷۴ برس کی عمر میں جولائی ۱۹۷۴ء کو آپ نے اس دارافانی سے رحلت فرمائی تو آپ مدرسہ ہذا کے روح رواں اور شیخ الحدیث والتفسیر تھے۔

غرض حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ اس صدی کے مایہ ناز محدث و شیخ الحدیث والتفسیر تھے آپ کی تمام زندگی ہی علم اور دین کی خدمت میں گذری علوم اسلامیہ میں شغف وانہماک اور تصنیف وتالیف ہمیشہ سرمایۂ حیات رہی۔ حضرت مؤلف کی علمی جلالتِ شان کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ اپنی مشہور ومعروف کتاب التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح کی طباعت کے سلسلہ میں دمشق تشریف لے گئے اور وہاں ایک سال قیام کیا تو شام وعراق اور مصر کے اکابر علماء نے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا اور اپنی تحریرات میں خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا کہ آپ عرب وعجم کے ایک مایہ ناز محدث ومفسر ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ حافظ قرآن تھے مجود تھے، مفسر وشارح تھے اس پر وارد ہونے والے شکوک وشبہات کے جواب دینے والے تھے، واعظ تھے، صوفی تھے، آخر میں اس قطعہ پر بات ختم کرتا ہوں۔

قطعہ

علم میں تھے شاہِ انورؒ فکر میں اشرف علیؒ
اللہ اللہ کیا شؤں تھے حضرت ادریسؒ میں

درسِ قرآں میں وہ بیضاویؒ پہ سبقت لے گئے
علم کے دریا رواں تھے آپ کی تدریس میں

عبدالمنان
خادم الافتاء والتدریس دارالعلوم حسینیہ شہداد پور سندھ پاکستان
۲۶ شعبان ۱۴۱۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ عَبْدِهٖ وَرَسُوْلِهٖ سَیِّدِ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّیَّاتِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلَیْنَا مَعَهُمْ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ○))

حمد بے حد اور سپاس بے قیاس خاص تیرے ہی لیے ہے اے خداوند ذوالجلال کہ تو نے ہم کو وجود عطا کیا اور ایمان اور اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا اور سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں ہم کو پیدا کیا اور قرآن سکھایا تا کہ دل روشن ہو اور اظہار مافی الضمیر اور بیان کے لیے زبان عطا کی تا کہ تیرا کلام پڑھ سکیں اور تیرا نام لے سکیں اور تیرے حکموں کو گاتے اور بجاتے پھر سکیں۔ اور ہزاراں ہزار صلاۃ وسلام ہوں رسول مقبول ﷺ پر جن کے ذریعہ ہم نابکاروں اور ناہنجاروں کو تیرا پیغام پہنچا اور جن کے ذریعہ ہم گم گشتگانِ راہ کو تجھ تک پہونچنے کا راستہ معلوم ہوا اور ہزاراں ہزار رحمتیں اور برکتیں ہوں حضور پُرنور کے آل واصحاب پر جنہوں نے بلا کم و کاست نہایت امانت و دیانت اور کمال حفاظت کے ساتھ تیرے کلام کو اور تیرے پیام اور تیرے دین کو اور تیرے رسول کی شریعت کو لوگوں تک پہونچایا اور دنیا میں تیرے دین کا ڈنکا بجایا اور تیرے دشمنوں سے جہاد وقتال کیا اور تیری راہ میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو پانی کی طرح بہایات اور اپنے اہل وعیال کو تجھ پر اور تیرے رسول پر قربان کیا حتی کہ تیرے دین کو سربلند کیا اور کفر کو سرنگوں کیا۔ ﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾۔

اور ہزاراں ہزار رحمتیں ہوں ان علمائے دین پر جنہوں تیرے عطا کردہ نورِ فہم اور نورِ تقویٰ سے کتاب وسنت کے حقائق ودقائق کو اور شریعت کے لطائف ومعارف کو ایسا روشن کیا کہ جس کو دیکھ کر دنیا حیران ہے اور کسی امت میں یہ جرأت نہیں کہ وہ امت محمدیہ جیسے مفسرین اور محدثین اور فقہا و متکلمین اور اولیاء اور عارفین کے مقابلہ میں توریت وانجیل کا مفسر اور محدث اور فقیہ اور متکلم اور صوفی اور مفتی پیش کر سکے کہ وہ علماء اسلام کی طرح توریت وانجیل کی تفسیر کرتا ہو اور توریت وانجیل کی روشنی میں اپنے ہم مذہبوں کو فتوے دیتا ہو اور حلال وحرام سے ان کو آگاہ کرتا ہو۔ یہود اور نصاریٰ میں اگر کچھ ہمت ہے تو کرۂ ارضی کے کسی گوشہ میں توریت اور انجیل کا کوئی پکا کچا حافظ یا چھوٹا موٹا مفسر اور محدث اور مفتی ہو تو نکال کر لائیں اور دنیا کو دکھلائیں۔

اے اللہ! تو اپنی رحمت اور عنایت سے اس نابکار و ناہنجار حرف نگار کو ان علماء ربانیین کے زمرہ میں داخل فرما جنہوں نے تیرے کلام کی خدمت کی اور اس کی تفسیریں لکھیں اور میرے والدین پر بھی رحمت فرما جنھوں نے اس ناچیز کو قرآن کریم حفظ کرایا اور دین کا علم سکھایا ؎

روح پدرم شاد کہ می گفت باستاد
فرزند مرا عشق بیا موزود گر ہیچ

اور اے اللہ مجھ کو اور میری اولاد کو اور اولاد الاولاد کو اپنے علم کا صحیح وارث بنا اور ہمارے ظاہر و باطن کو اپنے دین کے رنگ سے رنگیں فرما اور ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۠﴾ کا صحیح مصداق بنا۔ آمین یارب العالمین

أَمَّا بَعْدُ!

بندہ ناچیز حافظ محمد ادریس بن مولانا * حافظ محمد اسمٰعیل کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جونسباً صدیقی اور مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی ہے۔ اہل اسلام کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے سرور عالم سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا پس عام بندوں پر اس کا سمجھنا اور علماء پر اس کا سمجھانا فرض ہوا تا کہ خدا تعالیٰ کے حکموں اور اس کی اتاری ہوئی ہدایتوں پر عمل کر کے فریضۂ بندگی بجالا سکیں جو بندہ خدا تعالیٰ کے حکموں کو نہ جانے اور بندگی نہ بجالائے تو وہ بندہ نہیں بلکہ وہ گندہ ہے۔ قرآن کریم عربی زبان میں اُترا جس کا ہندوستان کے عوام کو سمجھنا بہت مشکل تھا اس لیے ہندوستان میں سب سے پہلے عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱۵۰ھ میں کلام اللہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جس کا نام ''فتح الرحمٰن'' رکھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان بکثرت فارسی زبان سمجھتے تھے اور خط و کتابت اکثر و بیشتر فارسی میں ہوتی تھی اور سرکاری مراسلے سب کے سب فارسی میں ہوتے تھے اس لیے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کی سہولت کے لیے فارسی میں ترجمہ کیا بعد ازاں فارسی کا رواج کم ہوتا چلا گیا اور ضرورت اس کی ہوئی کہ اردو زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا جائے چناں چہ شاہ ولی اللہ کے ترجمہ کے پچپن سال بعد ۱۲۰۵ھ میں ان کے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر دہلوی نے اردو میں قرآن کریم کا بامحاورہ ترجمہ کیا مگر اس کا پورا پورا لحاظ رکھا کہ محاورہ مدلولِ قرآنی کے تابع رہے ایسا نہ ہو کہ مدلولِ قرآنی کو محاورۂ زبان پر قربان کر دیا جائے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا ترجمہ تھا جو نہایت عمدہ ہے اور بے مثال اور بے نظیر ہے اور ہر طرح سے قابل اطمینان اور قابل وثوق و اعتماد ہے اور علماء ربانیین کے نزدیک مستند اور معتمد ہے شاہ عبدالقادر صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ نے علاوہ ترجمہ کے مختصر اور ضروری فوائد بھی لکھے ہیں جو مشکلات میں مشعل راہ کا کام دیتے ہیں اور جن مشکل مقامات میں اکابر علماء کا قلم خاموش نظر آتا ہے وہاں شاہ عبدالقادر کا قلم بولتا ہے اور بالبداہت اس شعر کا مصداق نظر آتا ہے ؎

بینی اندر خود علوم اولیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اور اس ترجمہ کا نام ''موضح القرآن'' رکھا جو اس کی صفت بھی ہے اور تاریخ بھی۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۳۰ھ میں بمقام دہلی وفات * پائی۔

دوسرا اردو ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحبؒ دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ نے کیا مگر شاہ رفیع الدین کا ترجمہ تحت اللفظ تھا کہ جو ترتیب الفاظ قرآنی کی ہے وہی ترتیب اردو ترجمہ کے الفاظ کی رہے تا کہ کم استعداد والے کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کس لفظ کا ترجمہ ہے اس امر کو ملحوظ رکھ کر شاہ رفیع الدین نے لفظی ترجمہ فرمایا اور یہ امر ایک درجہ میں بہت مشکل ہے کہ اردو ترجمہ میں الفاظ قرآنی کی ترتیب بھی ملحوظ رہے اور تا حد امکان اردو زبان کی فصاحت بھی ملحوظ رہے الغرض اس مصلحت کی بناء پر شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ لفظی تھا اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بامحاورہ تھا تا کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے اور مطلب بخوبی ذہن میں آ جائے اس لیے کہ جو سہولت فہم

---

* والد صاحب مرحوم یعنی مولانا حافظ محمد اسمٰعیل نے بتاریخ ۱۹ شوال شب جمعہ ۱۳۶۱ھ بمقام قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر انتقال فرمایا اور جمعہ کی نماز کے بعد عیدگاہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝﴾۔ آمین

* مرآۃ التفسیر ص ۶۴ مصنفہ مولانا ذوالفقار احمد میں شاہ عبدالقادر کی تاریخ وفات ۱۲۳۰ھ لکھی ہے اور صاحب حدائق الحنفیہ نے یہ لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی اور منظور الٰہی تاریخ وفات ہے۔ دیکھو حدائق الحنفیہ ص ۴۷۱۔ واللہ اعلم

بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہوسکتی ہے وہ لفظی ترجمہ سے حاصل نہیں ہوسکتی اگرچہ تحت اللفظ ترجمہ کرنا اور ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یہ بھی بہت بڑا کمال ہے لیکن آسانی سے مطلب سمجھنا جو بامحاورہ ترجمہ سے ممکن ہے وہ تحت اللفظ ترجمہ سے ممکن نہیں غرض یہ کہ شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ ترجمہ کیا جو عجب شان رکھتا ہے کہ جس کے الفاظ۔ فصاحت و بلاغت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کے تحت معانی کا ایک سمندر موجزن ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر قرآن اردو زبان میں نازل ہوتا تو انہی محاورات اور الفاظ کے لباس میں نازل ہوتا جو شاہ عبدالقادر نے استعمال کئے ہیں اسی عرصہ میں شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز نے ۱۲۰۸ھ میں فارسی زبان میں ایک مبسوط تفسیر لکھنی شروع کی جو حقائق و معارف میں بلاشبہ امام رازی کی تفسیر کبیر کا نمونہ تھی کاش کہ مکمل ہوجاتی مگر افسوس کہ مکمل نہ ہوسکی ایک حصہ میں صرف پارہ الٓمٓ اور پارہ سَیَقُوْلُ کی آیت ﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ تک تفسیر آئی اور دوسرے حصہ میں پارۂ تبارک الذی اور پارہ عم کی تفسیر آئی۔ درمیان قرآن کی تفسیر نہ ہوسکی اگر یہ تفسیر مکمل ہوجاتی تو بسیط ارض پر اس تفسیر کی نظیر نہ ہوتی جیسا کہ تفسیر عزیزی کے موجودہ حصہ کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے دقیق اور عمیق علوم کسی اور تفسیر میں نظر نہیں آتے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ [1] نے ۱۲۳۹ میں وفات پائی نماز جنازہ بیرون شہر دہلی ادا کی گئی۔ اطراف واکناف سے آنے والوں کے ہجوم کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا پچپن مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اور دہلی کے ترکمان دروازہ کے باہر اپنے والد بزرگوار کے پہلے میں دفن ہوئے۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں فارسی اور اردو میں ترجمہ اور تفسیر لکھنے کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ کے وقت سے شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ ۱۱۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵۰ھ میں فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا جس کا نام ''فتح الرحمن'' رکھا اور ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ مقتدائے دقیقہ شناس تاریخ وفات ہے۔

تفسیر قرآن کا پہلا وہ بنیادی پتھر اس کا وہ صحیح ترجمہ ہے جو قواعد عربیت اور قواعد شریعت کے پورا پورا مطابق ہو ہندوستان میں تفسیر قرآن کا یہ سنگ بنیاد یعنی صحیح ترجمۂ قرآن۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں رکھا گیا اور ہندوستان میں یہ خیر کثیر (ترجمہ قرآن کریم) اس مبارک باپ اور مبارک بیٹوں کے ہاتھوں سے جاری ہوئی اور یہی تین ترجمے اردو زبان میں تفسیر قرآن کے لیے سنگ بنیاد بنے اور ہندوستان میں کوئی عالم ان ترجموں سے بہتر ترجمہ نہ کرسکا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ بہ عن الاسلام وسائرِ المسلمین خیرا آمین یارب العالمین۔

غرض یہ کہ یہ حضرات ترجمۂ قرآن کے بانی اور امام ہیں اور علوم دینیہ میں تمام ہندوستان کے استاد ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اگر یہ تین ترجمے نہ ہوتے تو ہر کس وناکس کو ترجمہ کا حوصلہ بھی نہ ہوتا اس لیے کہ کسی کے کلام اور مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ترجمہ ہے اور یہ کام نہایت دشوار ہے جب تک مترجم دونوں زبانوں کے لغات اور محاورات اور استعارات و کنایات اور حقیقت و مجاز اور اسالیب کلام سے پورا واقف نہ ہو تو ترجمہ نہیں کرسکتا ہر کس وناکس کا تو کیا ذکر ہے۔ اگر ان حضرات کے یہ تراجم منہ

---

[1] شاہ عبدالعزیز کا تاریخی نام غلام حلیم ہے جس سے ۱۱۵۹ھ نکلتا ہے یہی آپ کا سن ولادت ہے۔ تحفۂ اثنا عشریہ کے دیباچہ میں غلام حلیم کے نام سے اپنے کو مؤلف کتاب ظاہر کیا ہے علوم وفنون اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ سے حاصل کیے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

ہوتے تو بڑے بڑے علماء کو ترجمہ دشوار ہو جاتا اور شاید بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کے بعد بھی ایسا ترجمہ نہ کر سکتے۔ ان حضرات جیسا نورِ فہم اور نورِ تقویٰ کس کے پاس ہے جو ان جیسا ترجمہ کر سکے۔ ان تین ترجموں کے بعد جس کسی نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا سو اس نے شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کی مدد اور سہارے سے کیا۔ حق جل شانہ نے اپنے کلام پاک کی اس خدمت یعنی ترجمہ کے لیے سر زمین ہند سے شاہ ولی اللہ اور اس کے بیٹوں کو منتخب فرمایا: ﴿وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾

بحمدہٖ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ پہلی منزل یعنی ترجمہ کی منزل گذر گئی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان تین علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کے تین نہایت صحیح اور بے مثال ترجمے پہونچ گئے تو اب اس منزل کے طے ہو جانے کے بعد ضرورت اس کی تھی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے جس میں فقط حل مطالب اور ربط آیات کا خاص اہتمام کیا جائے اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی طرح اقوال مختلفہ میں سے ارجح الاقوال پر اکتفا اور اقتصار کیا جائے اور لطائف اور نکات اور مذاہب باطلہ کی تردید کی تفصیل سے گریز کیا جائے تا کہ خاص و عام اس سے نفع اٹھا سکیں۔

یہ خدمت اور یہ سعادت من جانب اللہ حکیم الامت حضرت مولانا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہٗ کے حصہ میں آئی اور بیان القرآن کے نام سے ۱۳۲۵ھ میں ایک تفسیر لکھی جو اپنی افادیت اور جامعیت اور مقبولیت میں ثریٰ سے ثریا تک پہنچ گئی۔

اور اسی زمانہ میں ''بیان القرآن'' سے کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے ''فتح المنان'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے جس میں مختصر حل القرآن و توضیح مطالب کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید پر بھی کلام فرمایا اور فلسفہ قدیم و جدید کے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات دیئے یہ تفسیر بھی بحمدہٖ تعالیٰ بہت مقبول ہوئی اور گشتگان راہ کے لیے مشعل ہدایت بنی مگر تفسیری حیثیت سے مطالب قرآنیہ کی بالاستیعاب توضیح اور مسلسل تشریح اور ربط آیات اور حل مشکلات اور بیان معانی میں جو نرالی شان ''بیان القرآن'' کو حاصل ہوئی وہ اردو زبان میں کسی اور تفسیر کو حاصل نہیں ہوئی ﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾

اور اسی طرز پر ایک نہایت مختصر اور جامع تفسیر جو جدید شبہات کے قلع قمع کے لیے کافی اور شافی ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی قدس اللہ سرہٗ نے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی۔ اور فصاحت و بلاغت اور حسن تعبیر کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے۔

بحمدہ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ دو منزلیں اور طے ہو گئیں اول صحیح ترجمہ دوم مختصر اور جامع تفسیر جس سے قرآن کریم کے مطالب اور معانی بخوبی و آسانی سمجھ میں آ سکیں تو اب ضرورت اس کی ہوئی کہ بیان القرآن کے طرز پر ایک ایسی تفسیر لکھی جائے جو مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح اور ربط آیات کے علاوہ قدرے احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہ و تابعین پر اور بقدر ضرورت لطائف و معارف اور نکات اور مسائل مشکلہ کی تحقیقات اور ملاحدہ و زنادقہ کی تردید اور ان کے شبہات اور اعتراضات کے جوابات پر بھی مشتمل ہو تا کہ کلام خداوندی کی عظمت و شوکت اور اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا کچھ نمونہ نظروں کے سامنے آ جائے پھر یہ کہ وہ ترجمہ اور تفسیر سلف صالحین کے مسلک سے ذرّہ برابر ہٹا ہوا نہ ہو عہد نبوت اور عہد صحابہ و تابعین سے لے کر اس وقت تک امت کے علماء ربانیین اور راسخین فی العلم نے جس طرح قرآنِ کریم کا مطلب سمجھا ہے اسی طرح اس امانت کو بلا کسی خیانت کے مسلمانوں تک پہونچا دیا جائے اور کسی جگہ بھی اپنی رائے اور خیال اور نظریہ کو قرآن کے بہانہ سے پیش کر کے مسلمانوں کو دھوکہ اور فریب نہ دیا جائے جیسا کہ آج کل آزاد منشوں کا یہ

طریقہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیریں لکھ کر اس لیے شائع کر رہے ہیں کہ تاویل وتحریف کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو مغربی تہذیب وتمدن کے مطابق کر دیں ان آزاد مفسروں کی ہمہ تن یہ کوشش ہوتی ہے کہ لفظ تو عربی ہوں اور معنی مغربی ہوں اور یورپ کے ملحدین کے خیالات باطلہ کو قرآن کے نام سے مسلمانوں میں پھیلایا جائے۔ غرض یہ کہ یہ گروہ قانونِ خداوندی کو مسخ کر رہا ہے اور اپنے حسب منشاء قرآن کے معنی گھڑ کر لوگوں میں شائع کر رہا ہے۔ اللّٰھم احفظنا منھم.

اے مسلمانو! خوب سمجھ لو یہ گروہ قرآن کریم کا مترجم اور مفسر نہیں بلکہ یورپ کے نفسانی تمدن کا مترجم اور مفسر ہے ان سے بچتے رہنا ناچیز نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے یہ تفسیر لکھنی شروع کی کہ جیسا مطلب قرآن کریم کا اللہ کے رسول نے اور صحابہ و تابعین نے سمجھا ہے وہی مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے تا کہ لوگ صحیح طور پر قرآن کو سمجھ سکیں اور صحیح طور پر اس پر عمل کر سکیں بغیر علم صحیح کے عمل صحیح ناممکن ہے یہ ناچیز سلف صالحین کے اتباع کو سعادت سمجھتا ہے اور سلف کے مسلک سے ہٹ کر تفسیر کو ضلالت اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت سمجھتا ہے۔

تو مباش اصلاً کمال اینست وبس تو درو گم شو وصال اینست وبس

بحمدہٖ تعالیٰ اس فقیر وحقیر نے اسی التزام کے ساتھ تقریباً ۱۳۶۰ھ میں تفسیر لکھنی شروع کی مگر دیگر مشاغل کی بناء پر پابندی نہ ہو سکی جب موقع ملا کچھ لکھ لیتا۔ اور ارادہ یہ کیا کہ جس طرح صحابہ وتابعین اور سلفِ صالحین نے قرآن کریم کو سمجھا ہے بعینہٖ اسی طرح اس کو مسلمانوں تک پہونچا دیا جائے، مغربیت اور عصریت کے نفسانی تقاضوں سے مرعوب ہو کر قرآنِ کریم کے مدلول اور مفہوم کو نہ بدلا جائے۔

اور ''مَعَارِفُ الْقُرْآن'' اس تفسیر کا نام رکھا جو اس رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ میں سورۂ نساء کے ختم تک پہونچی وللہ الحمد والمنۃ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور عنایت سے باقی کی تکمیل فرمائے اور قبول فرمائے۔ آمین

اس حقیر وفقیر کی یہ تفسیر گداگروں کی جھولی کی طرح ہے جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے نوالوں سے لبریز ہے اور فقیروں کی گدڑی کی طرح ہے جس میں ناظرین کو رنگ برنگ کے پیوند نظر آئیں گے۔ اگر کوئی اس گدائے بے نوا سے پوچھے کہ تیرے پاس یہ قسم قسم کے کھانے اور رنگ برنگ کے اطلس وکمخواب کے ٹکڑے کہاں سے میسر آئے تو یہ ناچیز جواب میں یہ عرض کرے گا کہ میں تو گدائے بے نوا ہوں مگر بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہوں وہاں سے بھیک میں جو کھانے مل جاتے ہیں وہ لا کر دوستوں کے سامنے رکھ دیتا ہوں جس کو جو لقمہ اور نوالہ خوش ذائقہ معلوم ہو نوش جان کرے اور جو مرغوب طبع نظر آئے وہ تناول کرے یہی حال اس علم کے گدائے بے نوا کا ہے کہ اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے وہ سب کا سب خسروان علم وحکمت کے دروازوں سے ملی ہوئی بھیک ہے جو ایک دریوزہ میں جمع کر دی گئی ہے اور اکثر وبیشتر ان دروازوں کے نام بھی بتلا دیئے ہیں۔ جہاں سے یہ فقیر بھیک مانگ کر لایا ہے تا کہ جسے اور کچھ مانگنا اور لینا ہو تو وہ خود ان دروازوں پر پہونچ جائے اس اظہار حقیقت کے بعد امید ہے کہ احباب کرام اس ہیچمداں کو اس تالیف میں ایک دسترخوان بچھانے والے سے زیادہ نہ سمجھیں گے۔ اور گاہ بگاہ اس سُفرہ چین کو جو غرق معصیت ہے دعاء مغفرت سے نواز دیا کریں گے۔ آخر جو خادم دسترخوان بچھائے اور اس پر کھانے لا کر چنے اس کا بھی کچھ حق ہے۔ علمی سُفرہ چین کا حق یہ ہے کہ اس کے لیے یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازیں اور آخرت کی ذلت

اور ندامت سے محفوظ رکھیں۔ آمین

عرض حال کے بعد اب یہ ناچیز اپنے خدائے پروردگار سے بصد ہزار عجز و نیاز ملتجی ہے کہ اس تفسیر کو اس فقیر و حقیر کے ہاتھ سے تکمیل کو پہونچائے اور اس کو قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ اور میرے لیے اور میرے والدین کے لیے اور میری اولاد جسمانی اور روحانی کے لیے خصوصاً اور عام مسلمانوں کے لیے عموماً مفید اور نافع اور مشعلِ ہدایت بنائے۔ آمین۔ اور اس تحریر سراپا تقصیر کو اس فقیر و حقیر کے لیے زادِ معاد اور توشۂ آخرت اور خیر جاری اور ذریعۂ مغفرت اور سرمایۂ سعادت بنائے۔ آمین یارب العالمین

ع ویرحم اللہ عبدًا قال آمینا

در قیامت ہر کسے در دست آردنامۂ من نیز حاضری شوم تفسیر قرآن در بغل

﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ ﴾

بندۂ ناچیز
محمد ادریس کان اللہ لہٗ وکان ہو اللہ ووفقہٗ لما یحب ویرضاہ وجعل آخرتہٗ خیرًا من اولاہ۔ آمین
۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ ہجری
جامعہ اشرفیہ لاہور
پاکستان

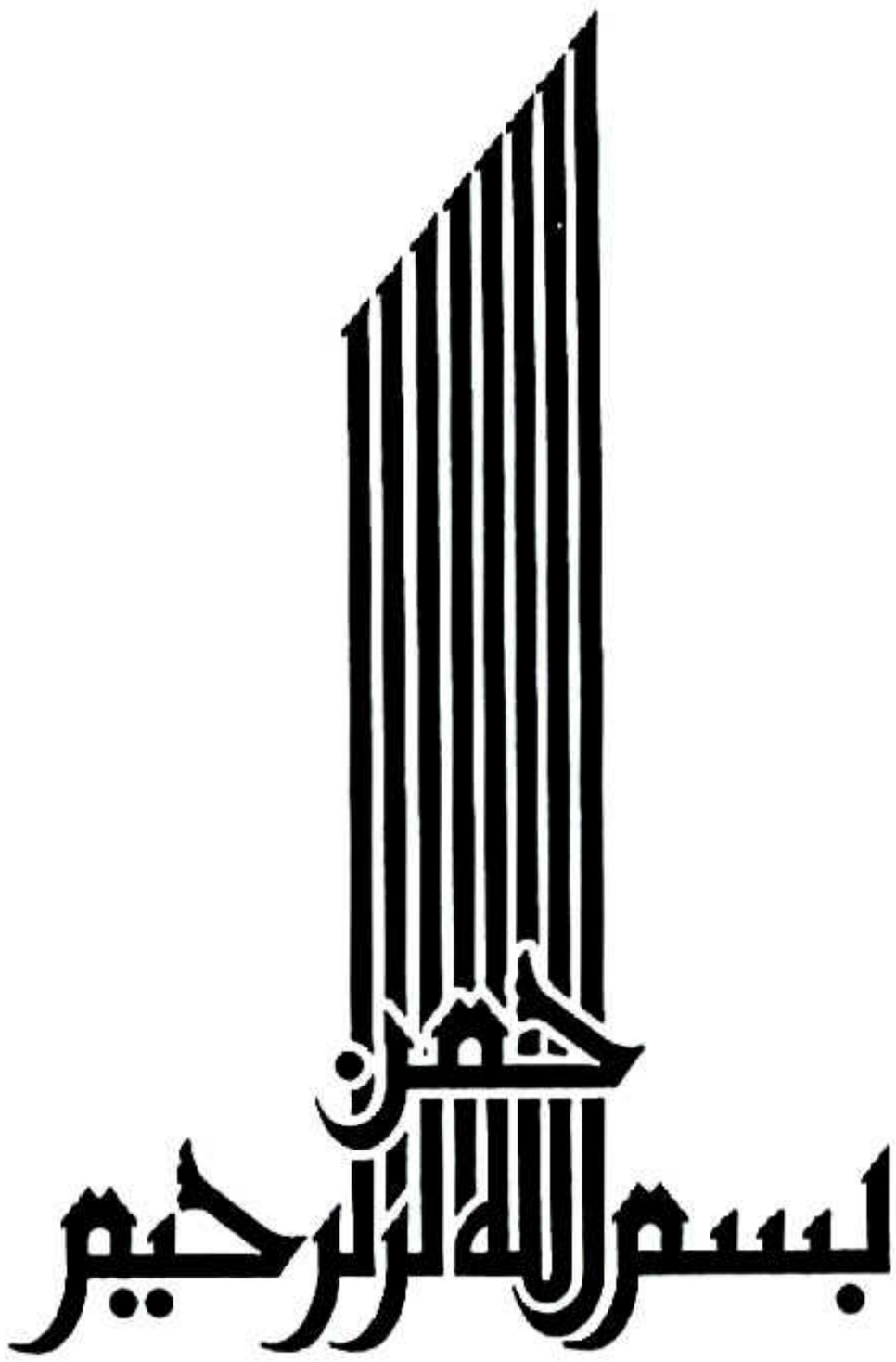
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجازت نامہ

برائے اشاعت تفسیر معارف القرآن

میں مکتبہ رحمانیہ لاہور کے منتظمین کا
شکر گزار ہوں کہ انہوں نے معارف القرآن
کی احسن طریقہ پر طباعت کا انتظام فرمایا (جزاکم اللہ احسن الجزاء)
اللہ تعالیٰ صاحب تفسیر میرے والد گرامی رحمہ اللہ
تعالیٰ اور ان کی اولاد و تمام متعلقین کیلئے
اس اشاعت کو ذریعہ نجات بنائے۔ آمین۔

(حافظ محمد عمران صدیقی)


بسم الله الرحمن الرحيم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین جلد اوّل تفسیر "معارف القرآن"

سورۂ فاتحہ و بقرہ

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ۷
احوال و آثار ۷
تعلیم و تربیت ۷
تدریسی زندگی ۸
حیدرآباد دکن میں قیام ۸
دارالعلوم دیوبند میں ۸
پاکستان ہجرت ۸
جامعہ عباسیہ بہاول پور سے وابستگی ۹
جامعہ اشرفیہ لاہور سے تعلق ۹
وفات حسرت آیات ۹
تصنیفی خدمات ۱۰
علم تفسیر: معارف القرآن ۱۰
الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی ۱۰
مقدمۃ التفسیر ۱۰
علم حدیث: تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری ۱۱
التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح ۱۱
حجیت حدیث ۱۱
علم عقائد و کلام: الکلام الموثوق فی ان کلام اللہ غیر مخلوق .. ۱۱
احسن الحدیث فی ابطال التثلیث ۱۱
عقائد اسلام ۱۱
علم الکلام ۱۱
دستور اسلام ۱۱
خلافت راشدہ ۱۲
سیرۃ المصطفیٰ ۱۲
معارف القرآن اور اس کے مؤلف کے بارے میں ... ۱۵
اجازت نامہ ۲۳

سُورۂ فاتحہ

سورۂ فاتحہ کی تفسیر ۳۳
اسماء سورۂ فاتحہ ۳۵
استعاذہ ۳۷
خلاصہ ۴۱
سوال دربارۂ استعانت بغیر اللہ ۴۹
جواب ۴۹
اسرار مجموعۂ سورت ۵۸
صلوٰۃ المسلمین اور صلوٰۃ نصاریٰ کا تقابل ۵۹

پارہ ① الٓمّٓ ○

سُورۂ بَقَرَۃ

سورۂ بقرہ کی تفسیر ۶۱

صفات مؤمنین مخلصین ۶۷
ایمان اور کفر کی تعریف ۶۹
تشریحات ۶۹
مسئلہ تکفیرِ اہلِ قبلہ ۷۱
ایمان کے لیے کفر سے برأت اور بیزاری شرط ہے ۷۴
ایمان کی صورت اور اُس کی حقیقت ۷۶
ایمان کے وجودی مراتب ۷۸
غیب سے کیا مراد ہے؟ ۷۹
لطیفہ ۷۹
صفاتِ کافرین ۸۲
کُفر کی تعریف ۸۳
اقسام کفر ۸۴
لطائف ومعارف ۸۹
□ قلب ۸۹
□ سمع ۸۹
□ ابصار ۸۹
□ ختم اور غشاوہ ۹۰
قبائح منافقین ۹۳
پہلی قباحت ۹۳
منافقین کی دوسری قباحت ۹۵
منافقین کی تیسری قباحت ۹۷
منافقوں کی چوتھی قباحت ۹۸
منافقین کی دو مثالیں ۱۰۰
مثالِ اوّل منافقین ۱۰۰
منافقین کی دوسری مثال ۱۰۴
تعلیم توحید ۱۰۵
اثباتِ رسالتِ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بضمنا ثباتِ حقی
قرآنِ عظیم ۱۰۸
ذکرِ معاد یعنی قیامت کا بیان اور بشارتِ مؤمنین صالحین. ۱۱۲
قرآنِ کریم کے کلامِ الٰہی ہونے پر کافروں کا ایک شبہ
اور اُس کا جواب ۱۱۴
مراتبِ ہدایت ۱۱۶
مرتبۂ اُولیٰ۔ ہدایتِ بیان ۱۱۶
مرتبۂ ثانیہ ۔ ہدایتِ توفیق ۱۱۶
مراتبِ اضلال ۱۱۷
استعجاب بر کفر و نافرمانی و تذکیر انعامات ربانی اور مبداء
و معاد کی یاددہانی ۱۱۹
ذکرِ تخلیق سامان حیاتِ جسمانی ۱۲۰
ذکرِ تخلیق سامان حیاتِ روحانی و اعطاء خلافت رَبانی ۱۲۳
حقیقت ملائکہ ۱۲۵
جواب تفصیلی بعد جواب اجمالی ۱۲۷
ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۱۲۹
مناظرۂ عدو اللہ دربارۂ فضیلت خلیفۃُ اللہ ۱۳۱
خلاصۂ کلام ۱۳۴
ازالۂ اشتباہ از لغزش سیدنا و ابینا آدم علیہ السلام و تحقیق مسلک
علماء اسلام دربارۂ عصمت انبیاء کرام علیہم السلام ۱۳۷
عصمت کے معنی ۱۳۸
معصیت کے معنی ۱۳۹
متعلقاتِ عصمت ۱۴۱
قسم اوّل۔ عقائد ۱۴۱
قسم دوم۔ تبلیغ احکام ۱۴۱
قسم سوم۔ فتویٰ اور اجتہاد ۱۴۲
قسم چہارم افعال و عادات ۱۴۲
وَلی اور رسُول میں فرق ۱۴۶

عصمتِ انبیاء علیہم السلام اور حفاظتِ اولیاء میں فرق ۱۴۶
دلائل عصمتِ انبیاء کرام علیہم السلام ۱۴۷
اَعادۂ حکم ہبوط ۱۵۲
ہبوط آدم علیہ السلام کے اسرار و حکم ۱۵۳
فوائد مستنبط از قصۂ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ۱۵۵
فائدہ جلیلہ! ۱۵۶
ترک اطاعت اور ارتکاب معصیت میں فرق ۱۵۶
تذکیر اجمالی انعامات خاصہ بر اسلاف یہود و امر ایشاں
بایفاء عہود و نہی از دین فروشی و حق پوشی ۱۶۰
توبیخ عالم بے عمل ۱۶۳
اصلاحِ نفس کا طریقہ اور حُبِ مال اور حُبِ جاہ کا علاج .. ۱۶۴
تفصیل انعامات و عنایات خداوند جلیل و شرح جنایات و
تقصیرات قوم بنی اسرائیل و حکم مراقبہ بعنایات و ملاحظۂ
جنایات کہ در حیاء حکم اکسیر دارد ۱۶۹
اِنعام اوّل ۱۶۹
اِنعام دوم ۱۷۱
اِنعام سوم ۱۷۱
اِنعام چہارم ۱۷۲
اِنعام پنجم ۱۷۴
اِنعام ششم ۱۷۴
اِنعام ہفتم ۱۷۵
اِنعام ہشتم ۱۷۶
اِنعام نہم ۱۷۷
اِنعام دہم ۱۷۸
تتمۂ اِنعام دہم ۱۷۹
ذکر شنائع بنی اسرائیل و بیانِ تعنت ایشان با نبیاء علیہم السلام
رب جلیل ۱۸۰
ذلت سے نکلنے اور عزت میں داخل ہونے کا طریقہ ۱۸۳
شناعت دوم (۲) ۱۸۶
شناعت سوم (۳) ۱۸۷
شناعت چہارم معاندانہ سوالات ۱۹۱
شناعت پنجم (۵) ۱۹۳
استعجاب بر قساوت بعد مشاہدۂ عجائب قدرت ۱۹۵
شناعت ششم (۶) ۱۹۸
متضمّن بدفع کلفت ناصحین مشفقین از انتظار و طمع ایمان
معاندین ۱۹۸
شناعت ہفتم (۷) ۲۰۰
تحمیق یہود بے بہبود ۲۰۰
شناعت ہشتم (۸) ۲۰۱
شناعت نہم (۹) ۲۰۱
شناعت دہم (۱۰) ۲۰۳
شناعت یازدہم (۱۱) ۲۰۶
فائدہ در بیان فرق مدارات و مداہنت ۲۰۷
شناعت دوازدہم (۱۲) ۲۰۸
شناعت سیزدہم (۱۳) ۲۱۰
شناعت چہاردہم (۱۴) ۲۱۱
شناعت پانزدہم (۱۵) ۲۱۳
شناعت شانزدہم (۱۶) ۲۱۵
شناعت ہفدہم (۱۷) ۲۱۶
شناعت ہشتدہم (۱۸) ۲۱۷
شناعت نوزدہم (۱۹) ۲۱۹
موت کی تمنا کا حکم شرعی ۲۲۱
شناعت بستم (۲۰) ۲۲۲
نکتہ ۲۲۳

شناعت بست ویکم (۲۱) ۲۲۵
قصہ ہاروت وماروت ۲۲۷
خلاصۂ کلام ۲۳۰
ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۲۳۰
ایک اور اشکال اور اس کا جواب ۲۳۰
شناعت بست ودوم (۲۲) ۲۳۱
متضمن بتلقین احباب بآداب خطاب ۲۳۱
شناعت بست وسوم (۲۳) ۲۳۳
شانِ نزول ۲۳۳
شناعت بست وچہارم (۲۴) ۲۳۳
شانِ نزول ۲۳۳
شناعت بست وپنجم (۲۵) ۲۳۵
شناعت بست وششم (۲۶) ۲۳۶
شناعت بست وہفتم (۲۷) ۲۳۷
باشتراک نصاریٰ ۲۳۷
شناعت بست وہشتم (۲۸) ۲۳۹
باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین ۲۳۹
شناعت بست ونہم (۲۹) ۲۴۰
باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین ۲۴۰
شناعت سی ام (۳۰) ایضًا ۲۴۲
باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین ۲۴۲
عذرِ لنگ ۲۴۴
شبہ ۲۴۵
شناعت سی ویکم (۳۱) ایضاً ۲۴۶
باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین ۲۴۶
خاتمۂ کلام واتمامِ حجت والزام وتسلیۂ سیّد انام علیہ افضل
الصلوٰۃ والسلام ۲۴۸
تکریر تذکیر واعادۂ تحذیر ۲۵۰
قصۂ کامیابی ابراہیم خلیل علیہ السلام در امتحان خداوندِ جلیل وتحویلِ
کلام از ذکرِ بنی اسرائیل بسوئے ذکرِ اسمٰعیل علیہ السلام ۲۵۱
اقوالِ مفسرین در تفسیر کلماتِ ابتلاء ۲۵۳
قصہ بنائے خانہ تجلی آشیانہ وفضائل قبلہ اسلام وتلقین
آداب بیتِ حرام ۲۵۵
دُعائے ابراہیم علیہ السلام برائے حرم وساکنانِ حرم ۲۵۶
دعائے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام برائے قبولیت خدمت تعمیر
بیت اللہ ۲۵۷
دعائے ابراہیمی برائے وجود اُمّتِ مسلمہ وقوم مسلمانان
وظہور رسولِ محترم از ساکنان حرم کہ صاحب قرآن وخاتم
پیغمبراں باشد ۲۵۸
لطائف ومعارف ۲۶۱
ترغیب وتاکید اِتباع ملۃ ابراہیمی کہ عین توحید وعین
ملت اسلام اَست وفضائل ملت اِسلام ۲۶۳
یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دینے والوں
کو جواب ۲۶۵
تعلیم طریقہ ایمان ۲۶۷
تفریع بر مضمون سابق مع توبیخ وتقریع ۲۶۷
تلقین جواب از مجادلہ اہلِ کتاب ۲۷۰

پارہ ② سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ

اثبات فضیلت قبلۂ ابراہیمی واسرار تحویل قبلہ ۲۷۲
شانِ نزول ۲۷۳
تمام اُمتوں پر اُمتِ محمدیہ کی فضیلت ۲۷۴
تحویل قبلہ پر ایک شبہ مع الجواب ۲۷۶
ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۲۷۷
تحویل قبلہ کا حکیمانہ جواب ۲۷۷

عناد اہل کتاب دربارۂ قبلہ ۲۸۰
عناد اہل کتاب دربارۂ صاحب قبلتین ورسول ثقلین ﷺ ۲۸۰
حکمت اوّل درتحویل قبلہ ۲۸۰
حکمت دوم درتحویل قبلہ ۲۸۱
حکمت سوم درتحویل قبلہ ۲۸۱
حکمت چہارم درتحویل قبلہ ۲۸۲
حکم پنجم درتحویل قبلہ ۲۸۲
تحویل قبلہ کے حکم کو مکرر لانے کی حکمت ۲۸۲
بیان وظائف رسول اعظم ﷺ کہ از قبلۂ ابراہیمی وحرم محترم مبعوث باشد ۲۸۳
تلقین ذِکر وشکر ۲۸۴
طریقۂ تحصیل ذکر وشکر وبیان فضیلت صبر ۲۸۵
بیان حیات شہداء کہ اَز ثمراتِ صبر است ۲۸۶
بیان امتحان صبر وبشارتِ صابرین وجزاء صبر ۲۸۸
استشہاد بر فضیلت صبر ۲۹۱
شانِ نزول ۲۹۱
رجوع بخطابِ یہود ووعید بر کتمانِ حق وجحود ۲۹۳
اعلانِ توحید ۲۹۵
دلائل توحید ۲۹۶
استعجاب واستبعاد براتخاذ انداد بعد واضح شدن وحدانیت رب عباد ۲۹۸
انجام شرک ۳۰۰
خطابِ عام وتذکیر انعام وابطال رسوم شرکیہ وتفصیل حلال وحرام ۳۰۱
خطاب خاص بہ اہل اختصاص ۳۰۳
ذکرِ محرماتِ معنویہ مثل دین فروشی وحق پوشی ۳۰۸
ابوابُ البرّ والصّلہ ۳۰۹
اُصول برّ ۳۱۰
فروعِ برّ۔ یعنی احکامِ عملیہ وفروعیہ کا بیان ۳۱۲
حکم اوّل دربارۂ قصاص ۳۱۲
حکم دوم وصیّت ۳۱۵
حکم سوم۔ صوم ۳۱۶
تعیین ایام معدودہ ۳۱۸
نزولِ قرآن اور صیامِ رمضان میں مناسبت ۳۱۹
اقوال علماء کرام دربارۂ تفسیر آیت فدیہ صیام ۳۲۲
گروہ اوّل ۳۲۲
ایک شبہ ۳۲۴
رفع تعارض ۳۲۵
دوسرا گروہ ۳۲۵
ترغیب دُعا بعد تلقین تکبیر وثناء ۳۲۷
حکم چہارم متعلق بہ سحور وفطار ۳۲۹
حکم پنجم: دربارۂ اعتکاف ۳۳۱
حکم ششم: منع از مالِ حرام ۳۳۲
حکم ہفتم: اعتبار حساب قمری ۳۳۳
حکم ہشتم: اصلاح بعض رسوم جاہلیت ۳۳۴
حکم نہم: متعلق بہ قتالِ کفار ۳۳۵
حکم دہم: انفاق فی الجہاد ۳۳۸
حکم یازدہم متعلق حج وعمرہ ۳۴۰
تتمۂ احکامِ حج ۳۴۲
اباحت تجارت درزمانۂ عبادت ۳۴۳
اہلِ ذکر اور اہلِ دُعا کی اقسام ۳۴۴
تقسیم دیگر ۳۴۷
حکم دوازدہم۔ استسلامِ تام وقبول جمیع احکام اسلام ۳۴۹

تنبیہات وتہدیدات ۳۵۳
حکم سیزدہم۔ متعلق بمصارف انفاق ۳۵۵
حکم چہاردہم متعلق بہ فرضیت جہاد وقتال درشہر حرام ۳۵۷
شانِ نزول ۳۵۷
انجام ارتداد ۳۵۹
حکم پانزدہم۔ متعلق بہ شراب وقمار ۳۶۰
حکم شانزدہم۔ متعلق بمقدار انفاق ۳۶۱
حکم ہفدہم۔ مخالطتِ یتیم ۳۶۳
حکم ہشت دہم۔ مناکحت کفار ۳۶۴
حکم نوزدہم۔ حرمتِ جماع درحالتِ حیض ۳۶۶
حکم بستم۔ متعلق بہ احترام نام پاک خداوندِ انام ۳۶۷
شانِ نزول ۳۶۷
حکم بست ویکم۔ ایلاء ۳۷۰
حکم بست ودوم وسوم عدت طلاق ومدت رجعت ۳۷۲
حکم بست وچہارم۔ عدد طلاق رجعی ۳۷۴
حکم بست وپنجم۔ خلع ۳۷۴
حکم بست وششم۔ حلالہ درطلاق ثالث ۳۷۵
حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما ۳۷۷
اہل سُنّت والجماعت کے دلائل ۳۷۸
حضرت عمر وحضرت عثمان وحضرت علی رضی اللہ عنہم ۳۷۹
اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ۳۷۹
حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب ۳۸۰
حکم بست وہفتم۔ منع از اضرارِ نساء وزجر از لعب باحکام
خداوندی ۳۸۲
حکم بست وہشتم۔ منع از اضرارِ نساء بعد از عدت ۳۸۴
حکم بست ونہم۔ متعلق بہ رضاع ۳۸۵
حکم سی ام۔ عدتِ وفات زوج ۳۸۷
حکم سی ویکم۔ متعلق پیغام نکاح در اثنائے عدت ۳۸۸
حکم سی ودوم۔ بابت مہر ۳۹۰
حکم سی وسوم۔ محافظت صلوٰات عموماً وصلوٰۃ وسطیٰ خصوصاً .. ۳۹۱
حکم سی وچہارم۔ وصیت برائے سکونت بیوہ ۳۹۴
حکم سی وپنجم۔ متعہ برائے مطلقات ۳۹۶
خاتمۂ احکام معاشرت برتذکیر آخرت ۳۹۷
حکایتِ قصہ گریزندگاں از موت ووباء برائے تنبیہ
شیفتگان حیات دُنیا وتمہید تشجیع بر جہاد وقتال وترغیب
انفاق مال ۳۹۷
بیانِ ربط بطریق دیگر ۳۹۸
نکتہ ۳۹۸
تشجیع شاکرین بر جہاد وقتال کافرین ۴۰۰
ترغیب انفاقِ مال درراہ خداوندِ ذوالجلال ۴۰۱
قصہ طالوت وجالوت ۴۰۶
برائے ترغیب جہاد وقتال ورعایت آداب جہاد ۴۰۶
بیانِ حکمتِ مشروعیت جہاد ۴۱۲
اثباتِ رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ۴۱۲

پارہ ③ تِلْكَ الرُّسُلُ

ذکر فضائل رسل وبیان حال اُمم ۴۱۳
ترغیبات وترہیبات دربارۂ صدقات ونفقات ۴۱۷
اثباتِ توحید ذات وکمالِ صفات ۴۱۸
آیت الکرسی ۴۱۸
فوائد ولطائف ۴۲۰
حق اور باطل نُور اور ظلمت کا فرق واضح ہے ۴۲۵
کسی پر کوئی زبردستی نہیں جو چاہے اختیار کرے ۴۲۵
ایک شُبہ اور اس کا ازالہ ۴۲۶
ذکر مبدأ ومعاد ۴۲۷

قصہ اوّل: دربارۂ اثبات وجود باری عزاسمہ ۴۲۸
قصہ دوم: برائے اثبات معاد یعنی برائے اثبات
حشر ونشر ۴۳۰
قصہ سوم: نیز برائے اثبات حشر ونشر ۴۳۲
فوائد ولطائف ۴۳۳
رجوع باحکام صدقات ۴۳۶
فضیلت انفاق فی سبیل اللہ وذکر بعض شرائط قبول ۴۳۷
مثال نفقات مقبولہ ۴۴۰
مثال نفقات وطاعات غیر مقبولہ ۴۴۲
بیان بقیہ آداب صدقات وذکر مصارف خیر ۴۴۵
احکام ربا (سود) ۴۵۰
بیع اور سود میں فرق ۴۵۱
سودخوار کے استدلال کی ایک مثال ۴۵۱
رِبا کی اقسام ۴۵۱
سُود کے حرام ہونے کی وجہ ۴۵۲
سُود تمام شریعتوں میں حرام رہا ہے ۴۵۴
سود ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ تنزّل کا ذریعہ ہے ۴۵۴
فوائد ولطائف ۴۵۶
احکام قرض ورہن ۴۵۹
خاتمہ سُورۃ ۴۶۳
مشتمل بر تذکیر جلالِ خداوندی وعظمت وتحذیر از محاسبہ آخرت
وتلقین ایمان وسمع وطاعت تعلیم دعاء فلاح دارین در آخرت
عفو ومغفرت ودُنیا فتح ونصرت ۴۶۳
مدح اہلِ ایمان ۴۶۵
بیان مدارِ تکلیف بعد از بیان مدح وتوصیف ۴۶۵
تعلیم دُعاء جامع متضمّن بفلاحِ دارین ۴۶۶

تفسیر سورۂ آلِ عمران ۴۶۹

اثباتِ توحید وبیانِ محکم در ابطالِ الوہیتِ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام
ومناظرۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم با نصارائے نجران ۴۷۱
خلاصہ کلام ۴۷۵
فوائد ولطائف ۴۷۵
تقسیم آیات بسوئے محکمات ومتشابہات مع تقسیم سامعین
بسوئے زائغینِ فہم وراسخینِ علم ۴۷۷
لطائف ومعارف ۴۸۰
مال واولاد کے نشہ میں حق سے استغنا پر وعید اور تہدید ... ۴۸۵
خلاصۂ کلام ۴۸۶
ذکرِ استشہاد برائے دفع استبعاد ۴۸۷
بیان حقارت لذاتِ دنیویہ ۴۸۹
لطائف ومعارف ۴۹۰
بیانِ نفاست نعمائے اُخرویہ ومستحقین آنہا ۴۹۱
خلاصۂ کلام ۴۹۲
صفاتِ متقین ۴۹۲
رجوع بسوئے مضمون توحید ۴۹۳
بیان حقانیتِ اسلام وجواب مجادلہ مخالفینِ اسلام ۴۹۵
ذکر بعض احوالِ شنیعہ یہود بے بہبود ۴۹۷
فوائد ۴۹۷
استعجاب پر اعراض اہل کتاب ۴۹۸
بشارت غلبہ مؤمنین بر اعداء بعنوان مناجات ودُعا ۵۰۰
شانِ نزول ۵۰۰
فوائد ۵۰۱
ممانعتِ دوستان از دوستیِ دُشمنان ۵۰۳
شانِ نزول ۵۰۳
فوائد ۵۰۴
آغاز مضمون رسالت ۵۰۵

وبیان آنکہ معیار محبت خداوندی اتباع رسول است ۵۰۵
ذکر اصطفاء بعض برگزیدگان خداوند انام علیہم السلام ۵۰۷
قصہ حضرت مریم وحضرت عیسیٰ علیہما السلام ۵۰۹
فوائد ۵۱۱
قصہ دُعا زکریا علیہ السلام برائے فرزند ارجمند ۵۱۳
تتمہ قصہ حضرت مریم علیہا السلام ۵۱۷
آغاز قصہ عیسیٰ علیہ السلام ۵۱۹
حضرت مریم علیہا السلام کا تعجب اور اس کا جواب ۵۲۰
خوارقِ عادات کے متعلق فلاسفہ اور ملاحدہ کے شبہات
کے جوابات ۵۲۰
فضائل وکمالات عیسیٰ علیہ السلام ۵۲۲
ذکر عداوتِ یہود با عیسیٰ علیہ السلام وحفاظت خداوند اَنام وبشارت
رفع اِلی السمآء محفوظیت اَز مکرِ اَعداء ۵۲۵
استدلال بر نبوت محمدیہ بقصہ مذکورہ ۵۲۷
نصاریٰ کے ایک استدلال یا شبہ کا جواب ۵۲۷
لطائف ومعارف ۵۲۸
دعوت مباہلہ برائے اتمام حجت بر اہلِ مجادلہ ۵۳۶
دعوتِ اہل کتاب بلطف وعنایات ۵۴۰
ابطال دعوائے اہلِ کتاب در بارۂ ملت ابراہیم علیہ السلام ۵۴۳
یہود کی شرارتوں اور خیانتوں اور افتراء پردازیوں کا بیان ۵۴۸
اہلِ کتاب میں سے اہلِ امانت کی مدح اور اہلِ خیانت
کی مذمت ۵۵۰
خلاصۂ کلام ۵۵۳
اطلاع ۵۵۵
ایک ضروری تنبیہ ۵۵۵
اہل کتاب کا حضرات انبیاء علیہم السلام پر افتراء اور اس کی
تردید ۵۵۶
تذکیر میثاق انبیاء وتوبیخ بر انحراف ازاں ۵۵۸
تشریح قولِ اوّل ۵۵۹
تشریح قولِ دوم ۵۵۹
دونوں قولوں میں فرق ۵۶۰
خلاصۂ حقیقت اسلام وعدم قبول غیر دینِ اسلام ۵۶۲
بیان حکم مرتدین ۵۶۳
فائدہ: کافروں کی تین قسمیں ۵۶۴

آیاتہا ۷ | ① سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ ⑤ | رکوعاتہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ② مٰلِكِ يَوْمِ

سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے * جہان کا بہت مہربان نہایت رحم والا مالک انصاف

الدِّيْنِ ؕ③ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ④ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

کے دن کا تجھ ہی کو ہم بندگی کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں چلا ہم کو راہ

الْمُسْتَقِيْمَ ۙ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ⑥ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ

سیدھی راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر غصہ ہوا

عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ع ⑦

ع ۱ ۱ ۷

اور نہ بہکنے والے۔

سُورۂ فاتحہ کی تفسیر

سُورۂ فاتحہ جمہور علما کے نزدیک مکی ہے بعض علما اس کے مدنی ہونے کی طرف گئے ہیں مگر یہ قول شاذ ہے۔ ابتداء بعثت میں سب سے پہلے ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ... الخ﴾ چند آئتیں نازل ہوئیں جیسا کہ صحیحین میں ہے اور چند روز کے بعد پوری سُورۂ فاتحہ مع بسم اللہ کے نازل ہوئی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور ابونعیم اور بیہقی کی دلائل النبوت میں عمرو بن شرجیل رضی اللہ عنہ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو غیب سے کچھ آوازیں سنتا ہوں خدا کی قسم مجھ کو اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کبھی آپ کے ساتھ ایسا نہ کرے گا۔ خدا کی قسم آپ امانتیں ادا کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا اے ابوبکر رضی اللہ عنہ تم محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ لے کر ورقہ کے پاس جاؤ اور یہ واقعہ بیان کرو۔ چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہاتھ پکڑ کر ورقہ کے پاس

---

* مترجم گوید یعنی عالمِ انس و عالمِ جن و عالمِ ملائکہ و علیٰ ہذا القیاس۔ فتح الرحمٰن

لے گئے۔ ورقہ نے آپ سے حال دریافت کیا اس پر آپ ﷺ نے یہ فرمایا:

((فقال اذا خلوت و حدی سمعت نداء خلفی یا محمد یا محمد فانطلق هاربا فی الارض فقال لا تفعل اذا اتاك فاثبت حتی تسمع ما یقول ثم ائتنی فاخبرنی فلماخلا ناداه یا مُحمّد قل بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحیُم۔ الحمد لله ربّ العٰلمین حتی بلغ و لا الضالین قال قل لا اله الا الله فاتی ورقة فذکر ذلك له فقال لهٗ ابشر ثم ابشر فانی اشهد انك الذی بشر به ابن مریم و انك علی مثل ناموس موسی و انك نبی مرسل. الحدیث)) (تفسیر در منثور ص ۲ ج ۱۔ و تفسیر قرطبی ص ۱۱۵ ج ۱)

ترجمہ: کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے غیبی آواز یا محمد یا محمد کی سنتا ہوں، جس کی دہشت سے بھاگنے لگتا ہوں۔ ورقہ نے کہا ایسا مت کرو ٹھہر کر اس کی بات سنو اور پھر جو کہے۔ اس کی آ کر مجھ کو خبر دو۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ایک جگہ تنہا تھے۔ کہ آواز آئی۔ اے محمد یہ پڑھئے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الی آخر السورۃ اس کے بعد کہا لا الٰہ الا اللہ کہو آپ یہ سب سُن کر ورقہ کے پاس آئے اور سارا واقعہ ذکر کیا۔ ورقہ نے کہا اے محمد تم کو بشارت ہو اور پھر بشارت ہو۔ تحقیق میں گواہی دیتا ہوں کہ تم بلاشبہ وہی نبی ہو کہ جن کی مسیح بن مریم علیہما السلام نے بشارت دی ہے اور تمہاری شریعت موسیٰ کی شریعت کے طرز کی ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم یقیناً نبی مرسل ﷺ ہو۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سورت ابتداء بعثت کے چند روز بعد اتری ہے کہ جب خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہو چکے تھے اور ورقہ بن نوفل ابھی بقید حیات تھے۔ ابتداء بعثت میں نزولِ وحی کی شدت اور اس کی عجیب و غریب کیفیت کی وجہ سے جو اس سے پہلے نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی تھی آپ پر ایک خاص خشیت اور دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جب آدمی پر کوئی خاص کیفیت اور شدت طاری ہوتی ہے تو دل کی تسلی اور تشفی کے لیے اپنے محرم خاص اور محب با اختصاص سے ذکر کرتا ہے تا کہ دل کو سکون اور اطمینان ہو۔ آنحضرت ﷺ کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کرنا اور ورقہ کے پاس جانا محض اس لیے تھا کہ یہ محرم راز اور ہمدم و ہم ساز ہیں۔ حبیب اور لبیب ہیں۔ ہوشمند اور دانش مند ذی علم اور ذی فہم ہیں ان سے مل کر تسلی ہوگی۔ معاذ اللہ آپ ﷺ کو اپنی نبوت و رسالت میں کوئی شبہ اور تردد نہ تھا اور نہ ورقہ سے کوئی تعلیم و تلقین مقصود تھی۔ ورقہ تو صرف توریت اور انجیل کے ایک عالم تھے۔ اور حضرت تواوتیت علم الاوّلین والآخرین کے مصداق تھے۔ حضور ﷺ ورقہ سے کیا علم اور فیض حاصل کرنے جاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ورقہ اگرچہ عالم تھے مگر صاحبِ حال اور صاحب کیفیت نہ تھے۔ آپ کے قلب مبارک پر جو وحی کی کیفیت گزر رہی تھی۔ اس کی حقیقت اور اس کی لذت کی کیفیت تو آپ ہی کو معلوم تھی۔ ورقہ ذوقی طور پر نہیں جانتے تھے۔ بلکہ محض علمی طور پر اتنا جانتے تھے کہ حضرات انبیاء پر نزولِ وحی کے وقت یہ کیفیات گزرتی ہیں۔ اس لیے وہ آپ کی تسلی کرتے تھے اور ایسے وقت میں تسلی اور تشفی وہی کر سکتا ہے کہ جس پر یہ حالت اور یہ کیفیت نہ گزر رہی ہو اور کچھ اجمالی طور پر اس قسم کی چیزوں سے واقف اور باخبر ہو۔ جیسے تیماردار بیمار کی تسلی کرتا ہے ورنہ جس پر یہ کیفیت گزرے گی اور جس پر یہ حالت طاری ہوگی وہ خود ہی خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو جائے گا۔ اسے اپنی ہی خبر نہ رہے گی۔ دوسرے کی کیا تسلی اور کیا تشفی کرے گا۔ اور عقلاً یہ ضروری نہیں کہ تسلی دینے والا صاحبِ حال سے افضل اور اکمل یا اعلم اور افہم ہو۔ فافهم ذلك و استقم۔ ورقہ بن نوفل کا حضور ﷺ کو تسلی دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ انجیل متی کے باب سوم میں یوحنا حواری

کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا مذکور ہے۔ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا جائے۔

چوں کہ سب سے پہلے ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ کا نزول ہوا جس میں یہ حکم تھا کہ اللہ کے نام سے پڑھو اس لیے اس کے چند روز بعد ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ... الخ﴾ کا نزول ہوا یعنی ہم اسی حکم سابق کے مطابق اللہ ہی کے نام سے پڑھتے ہیں۔

بعض علما اس طرف گئے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ مگر صحاح ستہ کی تمام روایتوں میں سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتوں کا سب سے پہلے نازل ہونا مذکور ہے اور یہی جمہور کا قول ہے۔ عجب نہیں کہ ان بعض علما کی مراد یہ ہو کہ سب سے پہلے پوری سورت جو نازل ہوئی وہ سورۂ فاتحہ ہے اور سورۂ اقراء ابتداءً پوری نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی چند آیتیں اتریں اور بقیہ سورت بعد میں نازل ہوئی اور سورۂ فاتحہ پہلی ہی مرتبہ میں پوری نازل ہوئی جیسا کہ روایت مذکور سے ظاہر ہے۔

اسماء سورۂ فاتحہ

اس سورت کے بہت سے نام ہیں مشہور نام فاتحہ[1] ہے اس لیے کہ قرآن شریف اسی سے شروع ہوتا ہے اور سورۂ الحمد[2] ہے اس لیے کہ ابتدا میں یہ لفظ حمد واقع ہے اور اس سورۃ کو فاتحۃ الکتاب[3] اور فاتحۃ القرآن[4] بھی کہتے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا آغاز اور شروع اسی سورت سے ہوتا ہے اور اس کا ایک نام ام الکتاب[5] بھی ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کی ہدایت کے لیے ایک سو چار کتابیں مختلف انبیاء و رسل علی نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام پر اتاریں اور تمام علوم اور حکمتوں کو ان میں ودیعت رکھا اور پھر ان سب کا خلاصہ توریت و انجیل و زبور و قرآن حکیم میں درج فرمایا اور پھر ان سب علوم کو قرآن حکیم میں بھر دیا اور پھر قرآن کے تمام علوم کو مفصل میں اور علوم مفصل کو فاتحۃ الکتاب میں ودیعت فرمایا اور فاتحۃ الکتاب کے علوم کو اپنی حکمت بالغہ سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں بھر دیا۔

کہتی ہے سو زبان سے قرآن کی خامشی
لاریب ذات پاک کی سچی کتاب ہوں
مجھ میں بھرے جہاں کے علوم و فنون ہیں
قرآن میرا نام ہے اُم الکتاب ہوں

اور اس سورۃ کا نام سورۃ الکنز[6] بھی ہے۔ یعنی یہ علوم الٰہی کا ایک عظیم خزانہ ہے ایک حدیث میں ہے کہ یہ سورت ایک خزانہ سے نازل ہوئی ہے جو عرش کے نیچے ہے اور چوں کہ اس سورت میں حق جل شانہٗ نے بندوں کو اپنی بارگاہ میں عرض و معروض کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے اس لیے اس سورۃ کا نام تعلیم المسئلہ[7] بھی ہے۔ یعنی جب ہمارے دربار میں حاضر ہوا کرو تو اس طرح معروض کیا کرو کہ اپنی التجاء پیش کرنے سے پہلے خدا کی حمد و ثناء کرو اور اس کی عظمت اور طاقت اور اس کی قدرت اور ربوبیت کا دل اور زبان سے اعتراف کرو اور پھر اس کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرو اور اسی کو اپنی حاجتوں کا برلانے والا اور معین و مددگار سمجھو اور یہ دعا مانگو کہ اے اللہ ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تیرا فضل و کرم ہو چکا ہے نہ ایسے لوگوں کا راستہ جن پر تیرا قہر و غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا راستہ۔ سبحان اللہ کیسی دعا ہے

جو دین و دنیا کی ایسی تمام نعمتوں کو شامل ہے جو قہر و غضب اور گمراہی سے پاک صاف ہوں یعنی سعادت عطا فرما اور شقاوت سے بچا۔ مطلب یہ ہے کہ اہل انعام کی طرح ہم کو فضائل سے آراستہ فرما اور اہل غضب اور اہل ضلال کے ذمائم اور رذائل سے ہم کو بچا تا کہ نابکار و ناہنجار بندے تیرے مقبول بندوں کی صف میں کھڑے ہو کر تیرے انعام و اکرام سے بہرہ یاب ہو سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

اہل عقل غور کریں کہ کیا اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہو سکتی ہے جو لاکھوں امیدوں اور آرزوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہو۔ اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الشفاء[8] اور سورۂ شافیہ بھی ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہر مرض کے لیے شفاء ہے اور ایک نام اس کا کافیہ[9] اور وافیہ[10] بھی ہے کہ خیرات و برکات کے لیے کافی اور وافی ہے اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الصلاۃ بھی ہے کہ نماز میں اس کا پڑھا جانا ضروری ہے جاننا چاہیے کہ اس سورت کا نماز میں پڑھا جانا ضروری ہے۔ مگر ہر نمازی کے لیے نہیں بلکہ جو امام ہو یا منفرد ہو یعنی اپنی تنہا نماز پڑھتا ہو۔ اس کے لیے نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سننا اور خاموش رہنا فرض و لازم ہے مقتدی کو امام کے پیچھے کچھ پڑھنا جائز نہیں ہیں۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۲۰۴)

ترجمہ: "یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو نہایت غور اور توجہ کے ساتھ امام کی قرآت کی طرف کان لگا کر سنو اور بالکل خاموش رہو۔"

اُمید ہے کہ اگر تم نے امام کی قرآت کو سنا اور خاموش کھڑے رہے اور امام کے ساتھ قرآن میں کوئی منازعت اور مخالجت نہ کی تو تم پر رحم کیا جائے گا۔ یعنی مقتدیوں سے رحمتِ خداوندی کا وعدہ استماع اور انصات کے ساتھ مشروط ہے ورنہ پھر یہ وعدہ نہیں اور یہ آیت بالا جماع قرآت خلف الامام کے بارہ میں نازل ہوئی جیسا کہ امام بیہقی اور زرقانی نے اس کی تصریح کی ہے اور احادیث صحیحہ مشہورہ میں ہے کہ:

((اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا)) "جب امام پڑھے تو خاموش رہو"۔

اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ:

((لَا صَلَاةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابُ)) "کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی۔"

سو امام احمد بن حنبل اور سفیان بن عیینہ سے ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ یہ حکم امام اور منفرد کا ہے۔ احادیث دو قسم کی ہیں ایک وہ قسم ہے کہ جس میں امام اور منفرد کے احکام وارد ہوئے ہیں ان میں یہ آیا ہے کہ نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور دوسری قسم احادیث کی وہ ہے کہ جس میں مقتدی کے احکام آئے ہیں ان تمام احادیث میں صرف یہی حکم آیا ہے ((اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا)) کہ جب امام پڑھے تو خاموش رہو امام کے احکام الگ ہیں اور مقتدی کے احکام الگ اپنی اپنی جگہ دونوں ٹھیک ہیں امام پڑھے اور مقتدی خاموش رہے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

استعاذہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○
پناہ پکڑتا ہوں اور حمایت ڈھونڈتا ہوں خدا تعالیٰ کی بہکانے اور پھسلانے سے شیطان مردود کے

جمور علما کا اس پر اتفاق ہے کہ تلاوت قرآن کی ابتداء سے پہلے ﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ پڑھنا سنت ہے جس کے معنی ہیں کہ میں شیطان مردود کے فتنہ سے اللہ کی پناہ میں آنے کی درخواست کرتا ہوں۔ كَمَا قَالَ تَعَالٰى: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ اس لیے کہ استعاذہ شیطان کے مکر اور شر سے بچنے کے لیے تریاق کا حکم رکھتا ہے۔ كَمَا قَالَ تَعَالٰى:

﴿وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۰۰ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝۲۰۱ ﴾ (الاعراف:۲۰۰،۲۰۱)

اور عطاء یہ کہتے ہیں کہ ہر قرأت کے شروع میں استعاذہ واجب ہے خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں استعاذہ کی حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے جال میں پھنسنے سے محفوظ ہو جائے اور بسم اللہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی رحمت میں داخل ہو جائے اسلیے استعاذہ۔ بسم اللہ پر مقدم ہوا۔ کیونکہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے۔ نیز قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کی تلاوت سے پہلے زبان اور قلب کی طہارت ضروری ہے۔ اس لیے تلاوتِ قرأن سے پہلے استعاذہ کا حکم دیا گیا تا کہ زبان اور قلب کو ایک گونہ طہارت حاصل ہو جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ ہی کے نام نامی * اور اسم گرامی کی اعانت اور امداد سے کہ جو بیحد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ اس کے کلام کو شروع کرتا ہوں اور اس کے کلمات قدسہ کے انوار و تجلیات اور ظاہری اور باطنی ثمرات و برکات کا امیدوار ہوں۔

بِسْمِ اللّٰهِ بعض علما کے نزدیک سورۂ فاتحہ اور ہر سورت کا جزو ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سوائے سورۂ نمل کے کسی سورۃ کا جزو نہیں دو سورتوں میں محض فصل کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ تبرکاً ہر سورت کے ابتداء میں اس کو لکھا جاتا ہے۔

---

* نام نامی۔ یہ ترجمہ اسم کی اصل کی طرف اشارہ کے لیے کیا گیا ہے اس لیے کہ اسم کی اصل سمو ہے جو علو اور رفعت پر دلالت کرتی ہے اور شروع کرتا ہوں اخیر تک بسم اللہ کے متعلق کی طرف اشارہ ہے کہ تقدیر کلام اسی طرح سے ہے بسم اللہ اشرع کلام اللہ وار جو ببرکۃ اسمہٖ انوار کلماتہ القدسیہ و تجلیاتہ اور اس طرف اشارہ ہے کہ جار مجرور کی تقدیر موخراً مناسب ہے تا کہ فائدہ حصر اور اختصاص کا حاصل ہو اور حصر کے ظاہر کرنے کے لیے ترجمہ میں ''ہی'' کا لفظ بڑھایا اللہ ہی کے نام نامی الخ

((ان رسول الله ﷺ كان لا يعرف فصل السُورة حتّى ينزل بِسْمِ الله الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ)).

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ دو سورتوں میں فصل نہ جانتے تھے یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی۔"

اسی وجہ سے بسم اللہ الخ کو نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ جہراً نہیں پڑھا جاتا تاکہ جزء فاتحہ ہونے کا واہمہ نہ ہو۔ اور اسی لیے بسم اللہ الخ کو کسی سورۃ کے ساتھ ملا کر نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ سورۃ سے علیحدہ دو خطوں کے درمیان میں لکھتے ہیں تاکہ جزء سورت ہونے کا شبہ نہ ہو مگر سورۂ نمل میں بسم اللہ بالاتفاق سورت کا جزء ہے اس لیے اس کو مثل دیگر آیات کے ملا کر لکھا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کی مستمرہ سنت یہ تھی کہ بسم اللہ کو نماز میں آہستہ پڑھتے تھے۔ (ابن کثیر۔ ترمذی۔ زاد المعاد)

امام ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کی خوب تفصیل فرمائی ہے اور امام اعظم نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کا خوب مدلل اور مبرہن ہونا ثابت کیا ہے۔ حضرات اہل علم اس کی طرف مراجعت فرمائیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو با ہے بعض علما کے نزدیک وہ مصاحبت اور الصاق کے لیے ہے اور بعض علما کے نزدیک استعانت کے لیے ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس صورت میں ابتداء ہی سے اپنی عبودیت اور عجز و استکانت کا اظہار اور پہلے ہی وھلہ میں اپنی حَوْل اور قُوَّۃ سے تبری کا اعلان ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اعانت اور توفیق سے ہم شروع کرتے ہیں۔ حاشا اپنی حول اور قوۃ سے نہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی اسی کو مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل ہی کا اظہار ہو۔ اور ادعاء مصاحبت نہ ہو۔ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً اور یہی معنی اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے زیادہ مناسب ہیں اور یہی معنی لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کے مرادف ہونے کی وجہ سے كَنْزٌ مِّنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ (یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ) کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں بسم اللہ کی با کا کسرہ بھی انکسار اور ذل عبودیت ہی کی طرف مشیر ہے۔

﴿اَللّٰهُ﴾ اس ذات واجب الوجود کا عَلَمْ ہے جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب اور نقص کے شائبہ اور واہمہ سے بھی پاک اور منزہ ہے اور اسی وجہ سے لفظ جلالت ہمیشہ موصوف ہی واقع ہوتا ہے اور اسماء حسنیٰ کو بطور صفت اس اسم عظیم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (الحشر)

اور یہ اسم عظیم رب اعلیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کا اطلاق ہمیشہ سے صرف اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات پاک کے لیے ہوا ہے۔ جس طرح کوئی اس کی ذات اور صفات میں اس کا شریک و سہیم نہیں۔ اسی طرح اس اسمِ عظیم میں بھی اس کا کوئی قسیم نہیں۔ اسی وجہ سے تمام اولیاء اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اسم ذات ہی اسم اعظم ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی لفظ اللہ ہی کو اسم اعظم فرمایا ہے جیسا کہ امام طحاوی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔

((حدثنا مُحمد بن الحسن عن ابی حنيفة قال اسم الله الاكبر هو الله قال محمد الاترىٰ ان الرحمٰن اشتق من الرحمة والرب من الربوبية و ذكر اشياء نحو هذا والله غير مشتق من شيئ)). (مشکل الآثار ص ۶۲ ج ۱)

ترجمہ: "محمد بن حسن نے روایت کیا امام ابوحنیفہؒ سے کہ اسم اعظم وہ لفظ اللہ ہے کہا محمد بن حسن نے اس لیے کہ رحمٰن مشتق ہے رحمت سے اور رب مشتق ہے ربوبیت سے اور اس قسم کی مثالیں ذکر فرمائیں اور لفظ اللہ کسی شئ سے مشتق نہیں۔"

خود چہ شیریں ست نام پاک تو — خوشتر از آب حیات ادراک تو
نام تو چوں بر زبانم میرود — ہر بُنِ مواز عل جوئے شود
اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام — شیر و شکر می شود جانم تمام
اللہ اللہ ایں چہ نام خوش مذاق — حرف حرفش میدہد جان را رواق
اسم اعظم ہست اللہ العظیم — جانِ جان و محی عظم رمیم

(خاتمہ مثنوی از مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس اللہ سرہٗ)

اسم ﴿اللّٰہُ﴾ کے بعد تمام اسماء حسنیٰ میں اسمِ ﴿رَحْمٰن﴾ کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

ترجمہ: "آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو۔"

بظاہر اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب یہ دو نام ہیں۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔ عبداللہ میں عبد۔ اسم اعظم کی طرف مضاف ہے اور عبدالرحمٰن میں اسم رحمٰن کی طرف مضاف ہے جس کا مرتبہ اسم اعظم کے بعد ہے اسی وجہ سے حدیث میں نبی کریم ﷺ نے عبداللہ کو پہلے ذکر فرمایا اور عبدالرحمٰن کو بعد میں۔

﴿رَحْمٰن﴾ اور ﴿رَحِیْم﴾ دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اختلاف اس میں ہے کہ کس میں مبالغہ زیادہ ہے جمہور کا قول یہ ہے کہ رحمٰن میں بہ نسبت رحیم کے زیادہ مبالغہ ہے اس لیے کہ لفظ رحمٰن اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن کریم میں رحیم کا اطلاق نبی کریم ﷺ کے حق میں بھی آیا ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝﴾ (التوبہ:۱۲۸)

پس رحمٰن کے معنی ایسا انعام کرنے والا کہ کوئی اس جیسا انعام نہ کر سکے اور یہ معنی حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور رحیم مطلق منعم کو کہتے ہیں خواہ دوسرا اس جیسا انعام کر سکے یا نہ کر سکے اور بعض علما یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہم معنی ہیں جیسے ندمان اور ندیم تاکید کے لیے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ اور ان صفتوں کا اطلاق حق جل وعلاء پر ایسا ہی حقیقی ہے جیسا علیم وقدیر اور سمیع وبصیر کا اطلاق اس پر حقیقی ہے۔ اور جس طرح اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی رحمیت بھی ہماری رحمت کے مماثل نہیں۔

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ: "کوئی شے اس کے مثل نہیں وہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

وہ اپنے سننے اور دیکھنے میں اور ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں۔

﴿وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ (محمد:۳۸)

ترجمہ: "اللہ ہی ہر طرح سے بے نیاز ہے اور تم ہی ہر طرح سے اس کے محتاج ہو۔"

اسی طرح وہ اپنی صفت رحمت میں بھی نہ رقتِ قلب کا محتاج ہے۔ اور نہ انفعالِ نفس کا جیسے اُس کی ذات بے چون وچگون ہے اسی طرح اس کی صفت علم وقدرت اور صفت رأفت ورحمت وغیرہ بھی بے چون وچگون ہے۔

اُس کی بے چون وچگون رحمت حقیقیہ۔ علما کی مجاز وتاویل اور استعارہ وتمثیل کی ذرہ برابر محتاج نہیں۔

اے برون از وہم وقال وقیل من　　خاک بر فرق من و تمثیل من

صفات باری تعالیٰ میں صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہی مسلک تھا اور وہ حضرات اس ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کے اسماء حسنیٰ میں تاویل کو بدعت سمجھتے تھے۔

امام ابوالحسن اشعری نے اخیر عمر میں متکلمین کے طریق تاویل وتمثیل کو چھوڑ کر مذہبِ سلف ہی کی طرف رجوع فرمایا جیسا کہ امام موصوف نے اپنی آخری تصنیف کتاب الابانہ میں اس کی تصریح کی ہے قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ رحمت کے حقیقی معنی رقت قلب کے ہیں۔ باری تعالیٰ کی شان میں رحمت کا اطلاق مجاز ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سبحان اللہ جہاں رحمت حقیقی تھی وہاں تو مجاز بنا دیا اور جہاں مجاز سرتا پا مجاز تھا وہاں حقیقت بنا دی یعنی حقیقت کے اعتبار کو دیکھا جائے تو رحمت بارگاہ خداوندی میں حقیقت ہے اور بندہ میں سراسر مجاز مگر ارباب تاویل نے معاملہ برعکس کر دیا۔

اور ابتداء کے لیے ان تین ناموں کو یعنی اللہ اور رحمٰن اور رحیم کو اس لیے خاص فرمایا کہ انسان پر تین حالتیں گزرتی ہیں۔

اوّل: اس کا عدم سے نکل کر وجود میں آنا۔

دوم: اس کا باقی رہنا اور جس قدر خلاق علیم نے اُس کے لیے مدۃ بقا مقرر فرمائی ہے اس کو پورا کرنا جس کو عرف میں حیاتِ دینا اور زندگی کہتے ہیں۔

سوم: اس نشاۃ دنیا کے ختم ہونے کے بعد حیاتِ دنیویہ پر ثمرات کا مرتب ہونا۔ عمل نیک پر جزا اور عمل بد پر سزا پانا۔

پس ابتداء میں تین نام ذکر فرمائے تا کہ تینوں حالتوں کی جانب اشارہ ہو جائے لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لیے کہ تخلیق وتکوین بارگاہِ الوہیتہ سے متعلق ہے اور لفظ رحمٰن سے دوسری حالت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے جو اس جگہ ٹھیک راستہ پر چلا اس کے لیے آخرت کی تمام منزلیں آسان ہیں۔ شیطان اور نفس آمارہ ہر وقت اس کی تاک میں ہے اس لیے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہاء رحمت کا محتاج ہے۔

اور لفظ رحیم کو تیسری حالت یعنی نشاۃ آخرت کے یاد دلانے کے لیے ذکر فرمایا۔

دارِ دُنیا چوں کہ مومن وکافر سب کے لیے باعثِ رحمت ہے، مومن کے لیے تو ظاہر ہے کافر کے حق میں دنیا اس لیے رحمت ہے کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کر سکتا ہے اور اگر سوء اختیار سے توبہ بھی نہ کرے تو فی الحال اس کا عذاب جہنم سے رہا رہنا ہی بہت بڑی رحمت ہے نیز بعثت انبیاء اور ارسال رسُل اور انزالِ کتب ایک ایسی عظیم رحمت ہے کہ جو مومن اور کافر سب کے لیے ہے یہ امر آخر ہے کہ کوئی اس رحمت سے متمتع اور منتفع ہوا اور کوئی نہ ہوا۔ الحاصل دار دنیا مومن اور کافر سب کے لیے باعث رحمت ہے اور دارِ آخرت صرف مومنوں کے لیے باعثِ رحمت ہے اور کافروں کے واسطے باعث عذاب ونقمت۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝﴾ (المدثر: ۸، ۹)

ترجمہ: "جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن کافروں پر نہایت سخت اور دشوار ہوگا۔ کسی قسم کی اس میں آسانی نہ ہوگی۔"

اس لیے نشاۃ دُنیا کے یاد دلانے کے لیے لفظ رحمٰن ذکر فرمایا کہ جس میں بہ نسبت رحیم کے زائد مبالغہ ہے اور نشأۃ آخرت کے یاد دلانے کے لیے رحیم کا لفظ استعمال فرمایا اس لیے کہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے عمومِ رحمت پر دلالت کرتا ہے اور عموم رحمت کا محل صرف دار دنیا ہے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا اور دارِ آخرت صرف مومنوں کی رحمت کے لیے ہے۔

نیز رحمٰن فعلان کا وزن ہونے کی وجہ سے کچھ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ کلام عرب میں وزن فعلان اکثر صفاتِ عارضہ اور اوصافِ متجددہ اور حادثہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسے عطشان اور غضبان اور ریان اور لہفان وغیرہ لہٰذا لفظ رحمٰن سے اس دار حدوث وتجدد اور دار فانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔ اور لفظ رحمٰن چوں کہ عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے اس لیے قران کریم میں ﴿استواء علی العرش﴾ کو صفت رحمٰن کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ:۵) اس لیے کہ عرش تمام مخلوقات کو محیط ہے۔ جیسا کہ اس کی رحمت تمام مخلوق کو محیط اور واسع ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (الاعراف:۱۵۶) پس ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ:۵) سے یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ وسیع مخلوق یعنی عرش پر سب سے زیادہ وسیع صفت رحمٰن کے ساتھ استواء فرمایا ہے اور صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قضائے خلق کے بعد ایک کتاب میں یہ لکھ کر ﴿اِنَّ رَحْمَتِیْ تَغْلِبُ غَضَبِیْ﴾ "یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔" اپنے قریب عرش پر رکھا۔

حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ سبقت رحمتی غضبی مراحم خسروانہ کا قانون ہے جو عرش پر آویزاں ہے۔

رحیم صفت مشبہ کا صیغہ ہے یا اس کے ہم وزن ہونے کی وجہ سے دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ فعیل کا وزن کلامِ عرب میں معانی ثابتہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ علیم وحکیم وجمیل، لہٰذا لفظ رحیم سے دارِ باقی اور عالم جاودانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔

علامہ آلوسی کے کلام سے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن سے عام رحمت مراد ہے خواہ بالواسطہ یا بلا واسطہ صورۃً اور معنیً ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہو یا فقط معنیً اور باطناً رحمت ہو۔ اگرچہ صورت اور ظاہر کے لحاظ سے وہ عذاب ہو۔ جیسے مریض کو تلخ دوا کا پلانا صورۃً ایلام اور تکلیف ہے مگر معنیً سراسر رحمت ہے پس رحمٰن سے ایسی ہی عام رحمت مراد ہے کہ جو ان تمام انواع واقسام کو شامل ہو۔ یہ دار فانی اسی قسم کی رحمت کا محل ہے اس کی رحمت راحت وانعام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مصائب وآلام کی شکل میں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ﴾ (البقرہ:۲۱۶) اور رحیم سے وہ رحمت مراد ہے جو بلا واسطہ ہو۔ اور ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہی رحمت ہو۔ دارِ آخرت میں اسی قسم کی رحمت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ بھی ہوگی اور کسی قسم کا اس میں شائبہ رنج والم کا بھی نہ ہوگا۔

خلاصہ

یہ کہ لفظ اللہ میں جس کے معنی یہ ہیں کہ جو ذات تمام صفات کمال کی جامع اور تمام نقائص وعیوب سے پاک اور منزہ ہے۔ تمام مباحث الٰہیات کی طرف اشارہ ہے۔

اور لفظ رحمٰن میں مباحث نبوت وشریعت کی طرف اشارہ ہے کہ جنکے بغیر خدا کی مرضی کے موافق ایک لمحہ گزارنا محال ہے۔

اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امور آخرت کی طرف اشارہ ہے اور یہی وہ تین امر ہیں کہ جو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا لباب اور عطر ہیں۔ اور تفتازانی اور جرجانی انہیں تین مقاصد اور مواقف کی شرح میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ جرجانی رحمۃ اللہ علیہ اور تمام متکلمین کو تمام اہلِ اسلام کی طرف سے جزائے خیر عطاء فرمائے کہ دین کے مقاصد اصلیہ کو خوب واضح فرمایا اور امت کے لیے صحیح موقف کو خوب واضح اور روشن کر دیا۔ آمین یارب العالمین۔

سورۂ فاتحہ میں بھی انہی تین باتوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○﴾ میں صفاتِ الٰہیہ کو بیان فرمایا ہے اور ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے احوال آخرت کی طرف اشارہ فرمایا اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ... الخ﴾ سے مباحث نبوت و رسالت۔ ایمان اور کفر۔ سعادت اور شقاوت۔ ہدایت اور ضلالت کے فرق کی جانب اشارہ فرمایا۔

اور تمام قرآن انہیں مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے جو سورۂ فاتحہ میں اجمالاً ذکر فرمائے اسی وجہ سے اس سورت کا نام اُم الکتاب ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال اور چوں کہ کتاب الٰہی کی ہر سورت انہی مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے جو اجمالاً ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں درج ہیں۔ اس لیے ہر سورت کی ابتداء میں بسم اللہ کا لکھنا اور پڑھنا مسنون قرار دیا گیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ①
حقیقی ✿ ستائش اللہ ہی کے لیے مخصوص ✿ ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے

① جو فعل علم اور اختیار اور قدرت اور ارادہ سے صادر ہو اس کی واقعی خوبی بیان کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ مدح میں نہ فعل کا اختیاری ہونا ضروری ہے اور نہ اس خوبی کا واقعی ہونا لازمی ہے اسی وجہ سے مدح کسی وقت ممنوع بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

((احثوا التراب وجوہ المداحین)).

ترجمہ: "مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو۔"

مگر حمد سے کسی وقت منع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس میں واقعی خوبی کا اظہار ہوتا ہے۔

بعض علما نے تعریف حمد سے قید اختیار کو حذف کر دیا ہے اس لیے کہ اس قید کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات ذاتیہ کی ثناء کو حمد کہنا دشوار ہوگا۔ اس لیے کہ صفات ذاتیہ جیسے علم و قدرت افعال خداوندی کی طرح اختیاری نہیں۔ اگرچہ یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ یہ صفات اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان کے ثمرات ضرور اختیاری ہیں یا ان کے موصوف کا فاعل مختار ہونا حمد کے لیے کافی ہے۔ حمد اور مدح میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حمد انہی صفاتِ کمال پر ہو سکتی ہے جن کا صفات کمال ہونا قطعی اور یقینی ہو۔ اور ان میں کسی قسم کے نقص اور عیب کا

✿ قولہ حقیقی ستائش اشارۃ الی ان الاولی ان یکون لام التعریف فی الحمد للجنس والحقیقۃ کما اختارہٗ جار اللّٰہ العلامۃ وھُوَا بلغ من الاستغراق۔ کمالا یخفی علی ارباب الذوق فافھم ذالک واستقم۔

✿ قولہ مخصوص ہے۔ ھذہ ترجمۃ لام الاختصاص فی للّٰہ۔

شائبہ بھی نہ ہو۔ بخلاف مدح کے کہ اس میں نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت قطعاً اور یقیناً صفت کمال ہو، ظناً بھی صفت کمال ہونا مدح کے لیے کافی ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ صفت کمال شائبہ نقص سے پاک ہو، بلکہ اگر اس میں کچھ نقص بھی ہو تب بھی مدح ہو سکتی ہے۔

نیز حمد میں یہ ضروری ہے کہ محاسن و کمالات کا ذکر محبت اور اجلال کے ساتھ ہو اور مدح میں یہ ضروری نہیں۔ مطلقاً محاسن اور کمالات کے بیان کرنے کو خواہ وہ محبت اور اجلال سے ہو یا نہ ہو مدح کہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک برابر والا دوسرے برابر والے کی مدح کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ لفظ حمد سے جو تعظیم و تفخیم مترشح ہوتی ہے وہ لفظ مدح سے نہیں ہوتی اس لیے کہ حمد کا اکثر اطلاق اس غنی حمید ہی پر ہوتا ہے۔ نیز حمد زندہ ہی کی ہوتی ہے اور مدح زندہ اور غیر زندہ دونوں کی ہوتی ہے اور حمد کے بعد سب سے پہلے اسمِ ذات کو ذکر فرمایا اور اس کے بعد پھر دیگر اسماء صفات و افعال کو ذکر کیا، تاکہ ذاتاً اور صفۃً اور فعلاً ہر طرح سے اس کا مستحق حمد و ثنا ہونا معلوم ہو جائے۔

② ربوبیت بمعنی پرورش کرنا اور کسی شئ کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا تربیت اگرچہ والدین سے بھی ظہور میں آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۲۴)

اور یہ دُعا مانگ کہ: "اے اللہ! میرے ماں باپ پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے خوردسالی میں مجھ کو پالا۔"

مگر والدین کی تربیت نور آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی خانہ زاد نہیں بلکہ نور زمین کی طرح مستعار اور عطاء غیر ہے۔ جس طرح نورِ زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیہ الٰہی ہے۔

نیز حقیقی تربیت جب ہو سکتی ہے کہ کسی شے کو نیست سے ہست کیا جائے۔ اور پھر اس کے تمام اسبابِ تربیت کو پیدا کیا جائے اور پیدا کرنے کے بعد انتفاع کے تمام موانع دور کر دیئے جائیں۔ تب تربیت مکمل ہو سکتی ہے۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں مگر نہ اولاد ان کی مخلوق ہے اور نہ وہ سامان تربیت کی خالق ہیں بلکہ سب کا سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے نیز والدین کی تربیت چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہے۔ تمام عالم کے لیے عام اور محیط نہیں اور حق تعالیٰ شانہٗ کی تربیت غیر محدود اور عام اور محیط ہے پس قابل ستائش وہی ربوبیت ہو سکتی ہے۔ جو اصلی اور ذاتی ہو۔ مستعار اور عطاء غیر نہ ہو۔ ہر طرح سے کامل اور مکمل ہو کسی قسم کا اس میں نقص نہ ہو۔ تمام عالمین کے لیے عام اور محیط ہو اس لیے ارشاد ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

یعنی حقیقی * ستائش خدا تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے کہ جس کی ربوبیت اصلی اور ذاتی اور کامل ہونے کے علاوہ تمام جہانوں کے لیے عام اور محیط ہے اسی وجہ سے جب فرعون نے کہا۔

﴿وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ترجمہ: "رب العالمین کیا چیز ہے۔"

تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا:

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط﴾ (الصافات: ۵)

ترجمہ: یعنی "یعنی رب وہ ہے کہ جس کی تربیت سبع سماوات اور سبع ارضین اور کل عالم کو محیط ہے۔"

---

* اشارہ اس طرف ہے کہ الحمد کا لام تعریف۔ لام حقیقت اور لام جنس ہے یعنی حمد کی حقیقت اور جنس ہی اللہ کیلیے مخصوص ہے اور جن علما نے لام کو استغراق کے لیے لیا ہے انہوں نے اس طرح ترجمہ کیا کہ سب تعریف واسطے اللہ کے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد شاید فرعون کو یہ تردد ہوا ہو کہ تربیت کو صرف ذات خداوندی میں منحصر کر دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ جبکہ ہم والدین اور آفتاب اور ماہتاب کی تربیتوں کا بھی روزانہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اس لیے موسیٰ علیہ السلام دوبارہ جواب کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا:

﴿رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾ (الشعراء:۲۶) ترجمہ: "وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے آباؤ واجداد کا۔"

یعنی تمہارے آباؤ اجداد کی تربیت اصلی اور ذاتی نہیں بلکہ عطیہ الٰہی ہے، تمہارا اور تمہارے تمام آباء اوّلین کا حقیقی رب اور پروردگار وہی ہے اور تیسری بار یہ فرمایا:

﴿قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (الشعراء:۲۸)

ترجمہ: "وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور انکے درمیان کا اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔"

یعنی آفتاب اور ماہتاب کو اپنی کھیتوں کا مربی سمجھنا غلط ہے اس لیے کہ خود آفتاب و ماہتاب اور ان کے نور کو اسی رب العالمین نے پیدا کیا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ (یونس:۵)

ترجمہ: "اسی نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا۔"

اگر وہ رب العالمین شمس وقمر کو روشنی نہ بخشتا یا کھیتیاں پکانے کی خاصیت ان میں نہ رکھتا تو کہاں سے کھیتیاں پکاتے۔

رب العالمین میں ربوبیت خداوندی کا تمام اجناس وانواع اور تمام افراد واشخاص کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پہلی آیت یعنی ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الصافات:۵) میں اس کی ربوبیت کا تمام امکنہ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ اور دوسری آیت ﴿رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (الشعراء:۲۶) میں اس کی ربوبیت کا ماضی اور حال اور مستقبل اور تمام اوقات اور ازمنۂ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا اور تیسری بار ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ﴾ (مزمل:۹) فرما کر اس کی ربوبیت کا تمام اوضاع اور حالات تمام تغیرات اور کیفیات کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کسی شخص اور کسی زمان کسی مکان اور کسی حالت اور وضع کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سب کو عام اور محیط ہے اس لیے وہی لائق عبادت اور مستحق حمد وثناء ہے۔

حضرات صوفیہ کرام قدس اللہ اسرارہم فرماتے ہیں کہ ارواح کے کانوں میں سب سے پہلے وصف ربوبیت ہی کا نغمہ جانفزا پہنچا ہے اور اسی وصف سے اوّل خدا کو پہچانا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۛ﴾

ترجمہ: "اس وقت کو یاد کرو کہ تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور خود ان کو ان کی جانوں پر گواہ بنایا کیا میں تمہارا رب نہیں۔ سب نے کہا بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔" (الاعراف:۱۷۲)

حق تعالیٰ شانہٗ نے سب سے پہلے اسی اسم رب کے ساتھ ارواح کو مخاطب کیا اور اسی نام سے اُن سے عہد اور میثاق لیا اور بظاہر یہی وجہ ہوگی کہ اوّل الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء ومرسلین اور عباد مخلصین کی جو دعائیں حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم میں ذکر فرمائی ہیں۔ وہ اکثر وبیشتر کلمہ ﴿رَبَّنَا﴾ سے وارد ہوئی ہیں اور ایک مقام پر یعنی ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا

مُنَادِيًا... الخ﴾ ان آیات میں کلمہ ﴿رَبَّنَا﴾ سے دُعا کرنے والوں کو اولوالالباب فرمایا ہے۔

③ عالم اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہو۔ عَالَمٌ علامت سے مشتق ہے۔ عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ علامت ہے اسماء الٰہیٰ اور صفات خداوندی کے لیے عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کے کسی اسم کا مظہر اور آئینہ ہے مومن و کافر اس کی شان اور انعام اور انتقام کے مظہر ہیں۔ صاحب عزت اور صاحب ذلت اس کی شان ﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ کے آئینہ میں ہیں۔ عالم غیب اور عالم شہادت اُس کے نام نامی ﴿هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ کے لیے آئینہ ہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

بے حد مہربان، نہایت رحم والا

عجب نہیں کہ بسم اللہ میں وہ شان رحمت مراد ہو کہ جو تکوین اور تربیت عالم کے لیے باعث ہوئی۔ اور الحمد میں الرحمٰن سے وہ رحمت مراد ہو جو خاص حالت تربیت میں مبذول ہوتی ہے اگر یہ رحمت روک لی جائے تو تربیت اور پرورش ناممکن ہو جائے۔

اور الرحیم سے وہ رحمت مراد ہو کہ جو تربیت اور پرورش کے بعد جزا اور سزا کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اس لیے کہ تربیت اور تکمیل کے بعد آثار اور ثمرات کا نہ مرتب ہونا اس تربیت کے ضائع کرنے کے مرادف ہے۔

کھیتی پک جانے کے بعد اگر اس پر درانتی نہ چلائی۔ گندم اور بھوسہ الگ الگ نہ کیا جائے تو کھیتی کو ضائع کرنا ہے۔

اسی طرح اگر اس عالم کی تربیت ختم ہو جانے کے بعد مومن اور کافر۔ سعید اور شقی کو جدا جدا نہ کیا جائے۔ تو عالم کی تربیت کا ضائع اور بیکار ہونا لازم آئے گا۔ اور آئندہ آیت یعنی ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا تکرار اس کی رحمت کے مکرر اور مضاعف ہونے کی طرف مشیر ہے لیکن مبادا رحمت کی یہ فراوانی کہیں بندوں کو مغرور نہ بنا دے اس لیے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا اضافہ فرمایا تا کہ رغبت کے ساتھ رہبت کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے جیسے ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ کے بعد ﴿شَدِيْدِ الْعِقَابِ﴾ کی صفت کا ذکر فرمایا۔ اھ کلامہ

اور عجب نہیں کہ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے پہلے ذکر کرنا ((سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي)) کی جانب مشیر ہو۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○

روزِ جزا کا مالک

یعنی اللہ تعالےٰ قیامت اور جزا کے دن کا ملک ہے، جس میں فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی جزا کا فیصلہ فرمائے گا۔ اس لیے کہ نیکی، بدی اور فرمانبردار، نافرمان اور موافق، مخالف میں فرق کرنا عقلاً و نقلاً ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝﴾ (صٓ:۲۸)

و قال تعالیٰ:

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝﴾ (النجم:۳۱)

و قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ۝﴾ (طٰہٰ:۱۵)

نیز دُنیا میں کوئی ظالم ہے اور کوئی مظلوم اور مظلوم کا ظالم سے انتقام عین عدل اور عین حکمت ہے اور دنیا میں یہ انتقام نہیں لیا گیا تو آخرت میں لامحالہ لیا جائے گا۔

اس آیت میں دو قراءتیں ہیں اور دونوں صحیح اور متواتر ہیں ایک ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ یعنی روز جزا کا بادشاہ اور دسری قراءت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ یعنی روز جزا کا مالک۔ اور اس کی مالکیت اور ملکیت یعنی بادشاہت کے لیے روز جزا کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اس کے جلال و جمال کا بلا واسطہ "ظهور على وجه التمام و الكمال." عالم کے ہر ہر فرد کے لیے ایک ہی آن میں صرف اسی روز ہوگا۔ دنیا میں بھی وہی حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ ہے مگر دنیا میں اس کی مشیت اور حکمت سے کچھ مجازی بادشاہت اور مجازی مالکیت نظر آتی ہے۔ قیامت کے دن سارے مجاز ختم ہو جائیں گے اور صرف حقیقت ہی حقیقت رہ جائے گی۔ علما کا اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں قراءتوں میں سے کون سی قراءت افضل ہے بعض علما مِلِكِ بمعنی بادشاہ کی قراءت کو راجح قرار دیتے ہیں۔ اور وجہ ترجیح یہ بیان کرتے ہیں۔

① کہ ملکیت یعنی بادشاہت میں جو عظمت ہے وہ صف مالکیت میں نہیں۔ مالک تو ہر ایک ہوتا ہے مگر بادشاہ ہر ایک نہیں ہوتا۔

② مالک کا حکم فقط اپنے مملوک پر چلتا ہے اور بادشاہ کا حکم تمام ملک اور تمام رعایا پر جاری اور نافذ ہوتا ہے۔

③ بادشاہ کی اطاعت سب پر واجب ہے اور مالک کی اطاعت فقط اس کے مملوک پر واجب ہے۔

④ نیز لفظ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ بھی مالکیت پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر ملک کے بجائے مالک پڑھا جائے تو تکرار لازم آتا ہے۔

⑤ قرآن کریم کی آخری سورت میں ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ آیا ہے لہٰذا قرآن کی پہلی سورت میں بھی ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھنا چاہیے تا کہ اول قرآن اور آخر قرآن ایک دوسرے کے مناسب اور ہم رنگ ہو جائے اور جو حضرات علما ﴿مٰلِكِ﴾ کی قراءت کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ وجوہ بیان کرتے ہیں:

① کہ ملکیت یعنی باشاہت انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور مالکیت انسان اور غیر انسان سب کو شامل ہے۔

② مالک اپنی مملوک کو فروخت کر سکتا ہے۔ بادشاہ رعایا کو فروخت نہیں کر سکتا۔

③ رعیت بادشاہ کے ملک اور سلطنت سے بھاگ کر نکل سکتی ہے اور مملوک بھاگ کر مالک کی ملکیت سے نہیں نکل سکتا۔

④ غلام پر مولی کی خدمت واجب ہے۔ رعایا پر بادشاہ کی خدمت واجب نہیں۔

⑤ غلام بغیر آقا کی اجازت اور اذن کے کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور رعیت بغیر بادشاہ کی اجازت کے کام کر سکتی ہے اور مملوک چوں کہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کو سوائے مولی کے کسی چیز سے تعلق بھی نہیں ہوتا۔ غلام کے پیش نظر ہر وقت آقا کی خوشنودی رہتی

ہے۔رعایا چوں کہ اپنی چیزوں کی مالک بھی ہوتی ہے اس لیے ان کو بادشاہ سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔

⑥ غلام کو آقا سے توقع رحم وکرم کی ہوتی ہے اور رعیت کو بادشاہ سے عدل وانصاف کی اُمید ہوتی ہے اور بندہ رحم وکرم کا زیادہ محتاج ہے۔

⑦ بادشاہت میں ہیبت زیادہ ہے اور مالکیت میں شفقت اور عنایت زیادہ ہے۔

⑧ بادشاہ کے سامنے جب لشکر پیش ہوتا ہے تو ضعیفوں، کمزروں اور بیماروں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور مالک ضعیف اور کمزور غلاموں پر اور مزید توجہ کرتا ہے اور ان کی اعانت اور خبر گیری میں مشغول ہوتا ہے۔

⑨ مالک کو مملوک سے تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ بادشاہ کو رعایا سے اتنی محبت اور تعلق نہیں جتنا کہ آقا کو غلام سے ہوتا ہے اور عاشقوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مژدہ جاں فزا نہیں کہ محبوب کو ہم سے محبت اور تعلق ہے۔

⑩ ﴿مٰلِكِ﴾ میں ﴿مَلِكِ﴾ سے ایک حرف زیادہ ہے۔ لہٰذا مٰلِكِ کی قراءت میں ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ اس لیے کہ ایک حرف کے زیادہ ہونے کی وجہ سے دس نیکیاں اور زیادہ ہوگی۔ ﴿فَتِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴
خاص تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے ہر کام میں مدد چاہتے ہیں (اس لیے کہ بغیر تیری اعانت اور امداد کے کچھ نہیں ہوسکتا)

یعنی اجسام علویہ، سفلیہ، کواکب، نجوم، نور اور ظلمت کسی کو تیرا شریک نہیں ٹھہراتے ہیں، ہر خیر وشر اوسعادت ونحوست کا تجھے ہی مالک سمجھتے ہیں۔ پہلی آیت میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت کو بیان کیا اور معرفت ربوبیت کے بعد معرفت عبودیت کا درجہ ہے۔ اس لیے اس کے بعد عبادت کا ذکر کیا گیا۔

① کسی کی نہایت درجہ تعظیم کے لیے دل وجان سے غایت درجہ کا تذلل اختیار کرنا اس کا نام عبادت ہے لہٰذا جو تذلل اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری یعنی بلا اختیار کے ہو وہ عبادت نہیں کہلائے گا اور اسی طرح جو تذلل کسی کے جبر، قہر اور زور سے ہو وہ بھی عبادت نہ کہلائے گا اور جس تذلل سے تعظیم مقصود نہ ہو وہ استہزا اور تمسخر کہلائے گا اور لائق عبادت اور مستحق بندگی وہی ذات ہوگی جو غایت درجہ کی عظمت اور جلال اور نہایت درجہ خوبی، کمال اور انتہائی انعام واکرام اور انتہائی جود ونوال کے ساتھ متصف ہو کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی درجہ اور مرتبہ عقل اور خیال میں نہ آسکے اور جو انتہائی عظمت وجلال کے ساتھ موصوف نہ ہو اس کے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنا سراسر بے موقع اور بے محل ہے اسی وجہ سے قرآن کریم نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اور کسی چیز کو بے محل رکھنے ہی کا نام ظلم ہے۔ خداوند ذوالجلال کو اگرچہ کسی کی عبادت اور بندگی کی ذرہ برابر حاجت نہیں۔ مگر مقتضائے حکمت یہ ہے کہ صاحبِ نقصان صاحبِ کمال کے سامنے تذلل اور پستی اختیار کرے ورنہ کمال اور نقصان کی مساوات لازم آئے گی جو سراسر خلاف حکمت ہے۔ ابتدائے آفرینش عالم سے اس وقت تک دنیا کے تمام عقلا اور عالم کے تمام حکما اس پر متفق رہے ہیں کہ ہر صاحب کمال کی تعظیم اور اس کا احترام عقلاً واجب اور فرض ہے یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ناقص کامل کی تعظیم کو اس لیے ضروری نہ سمجھے کہ اس ناقص کو اپنے زعم میں اس کامل کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ احتمال خداوندی ذوالجلال میں جاری نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ مخلوق کا خالق سے مستغنی ہونا ناممکن اور محال ہے۔ ممکن کا وجود ہی

واجب الوجود کے سہارے سے ہے۔

پناہ بلندیو پستی توئی ہمہ نلیستند آنچہ ہستی توئی

اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ جو شخص وجود باری یا توحید باری کا منکر ہو وہ ناجی نہیں بلکہ ناری ہے۔ اگرچہ اس کو کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ وجود باری اور توحید باری کا مسئلہ فطری، عقلی اور بدیہی ہے اور عقلاء عالم کا اجماعی ہے۔ بعثت انبیا پر موقوف نہیں حجت پوری ہو چکی ہے لہٰذا اب کوئی عذر مسموع نہیں اور اسی وجہ سے کہ عبادت اختیاری تذلل کا نام ہے حضرات فقہا نے عبادت کے لیے نیت کا ہونا بالاجماع شرط قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ کمال محبت کے ساتھ کمال اطاعت کا نام عبادت ہے۔ کمال عظمت کے ساتھ کمال محبت بھی عبادت کے مفہوم میں داخل ہے۔ جس درجہ کی محبت اور عظمت ہوگی۔ اس درجہ کی عبادت ہوگی۔ عظمت کے ساتھ جب تک محبت نہ ہو عبادت نہیں کہلائے گی اور ﴿ اِيَّاكَ ﴾ جو ﴿ نَعْبُدُ ﴾ کا مفعول ہے اس کی تقدیم حصر کے لیے ہے یعنی خاص تیری بندگی کرتے ہیں کسی اور کی نہیں نیز تقدیم مفعول میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عابد کی نظر اپنی عبادت پر نہ ہونی چاہیے بلکہ معبود پر ہونی چاہیے۔ نیز عبادت سے فقط معبود کی رضا اور خوشنودی مقصود و مطلوب ہونی چاہیے۔

خلاف طریقت بود کا ولیا تمنا کنند ازخدا جز خدا

گراز دوست چشمت براحسان اوست تو در بند خویشی نہ در بنداوست

اور ﴿ نَعْبُدُ ﴾ صیغہ جمع ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب تیری بندگی کرتے ہیں بجائے ﴿ اَعْبُدُ ﴾ کے صیغہ جمع لانے میں التزام جماعت کی طرف اشارہ ہے نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بندگی کرنے والا اپنی عبادت پر ناز نہ کرے۔ بلکہ یہ سمجھے کہ عبادت کرنے والا صرف وہی ایک نہیں بلکہ بے شمار بندگی کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ابتداء سورت میں طرز کلام غائبانہ تھا۔ اور ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ میں بجائے غائبانہ کے حاضرانہ طرز کلام اختیار کیا گیا اور اس طرح غَیْبَتْ سے خطاب کی طرف انتقال کیا گیا وجہ اس کی یہ ہے:

① کہ شروع سورت میں حمد اور ثناء کا ذکر تھا اور تعریف اور ثناء غائبانہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ غائبانہ حمد زیادہ اخلاص کی علامت ہے اور ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت اور خدمت حضوری میں ہوتی ہے۔

② نیز نمازی نے جب نماز شروع کی تو شروع نماز میں بمنزلہ اجنبی کے آ کر کھڑا ہو گیا اور خداوند ذوالجلال کی غائبانہ حمد و ثنا شروع کی یعنی ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہا یعنی اسم ظاہر کے ساتھ اس کی حمد و ثناء کی اور اسم ظاہر حکم میں غائب کے ہے اور جب حمد و ثنا حد کمال کو پہنچی تو جو حجابات درمیان میں تھے وہ اٹھ گئے اور بعد۔ قرب سے اور اجنبیت یگانت سے بدل گئی اور یہ شخص اس قابل ہو گیا کہ خداوند ذوالجلال کے حضور بصیغۂ خطاب عرض معروض کر سکے۔

③ نیز ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ کے بعد ہدایت کے سوال کا ذکر ہے اور سوال اور درخواست حضوری ہی میں زیادہ بہتر اور مناسب ہوتی ہے اس لیے کہ جب سخی کے سامنے سوال کیا جائے تو سخی اور کریم اُس کے رد کرنے سے شرماتا ہے۔ اور ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ کے بعد ﴿ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ کو اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت پر قوت اور قدرت بدون اس کی اعانت اور توفیق کے حاصل نہیں ہو سکتی اور توفیق کا طلب کرنا یہی استعانت ہے مطلب یہ ہے کہ بعادت کے لیے بندہ کی حول اور قوت کافی نہیں جب تک

خدا کی اعانت حاصل نہ ہو۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ غرض یہ کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کا ذکر کرنا عجب (گھمنڈ) کو زائل کرتا اور نخوت اور کبر کو فناء کرتا ہے۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں فرقہ جبریہ کے رد کی طرف اشارہ ہے۔ جبریہ۔ بندہ کو جماد کی طرح مجبور محض بتاتے ہیں۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے کیونکہ عبادت کے معنی اختیاری تذلل کے ہیں۔ فی الجملہ بندہ کے لیے اختیار ثابت ہوا اور جبر محض کی نفی ہوئی اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ میں فرقہ معتزلہ کے رد کے طرف اشارہ ہے۔ اربابِ اعتزال بندہ کو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل قرار دیتے ہیں۔ ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے اس لیے کہ مطلب یہ ہے کہ بندہ اگرچہ عبادت اور بندگی اپنے اختیار سے کرتا ہے لیکن جماد کی طرح مجبور محض اور اختیار سے عاری اور کورا نہیں مگر ایسا فاعل مستقل بھی نہیں کہ حق تعالےٰ شانہ کی اعانت سے مستغنی اور بے نیاز ہو جائے بندہ فاعل مختار ضرور ہے مگر اپنے اس خداداد اختیار میں مختار نہیں ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کی اعانت اور امداد کا محتاج ہے۔ فافهم ذلك فانه دقيق و لطيف و سياتى تفصيل ذلك انشاء الله تعالىٰ۔

سوال: دربارۂ استعانت بغیر اللہ

اس آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگی جائے حالانکہ قرآن وحدیث میں جابجا اسکا ذکر ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو۔ بیمار ہو تو علاج کرو۔ آخر طبیب اور دواء سے استعانت اور استمداد نہیں تو اور کیا ہے لہذا یہ بتلایا جائے کہ وہ کون سی استعانت ہے جو غیر اللہ سے جائز ہے اور کون سی کفر اور شرک ہے۔

جواب

جاننا چاہیے کہ غیر اللہ سے مطلقاً استعانت حرام نہیں استعانت بغیر اللہ بعض صورتوں میں کفر اور شرک ہے اور بعض صورتوں میں جائز ہے۔ ضابطہ اس کا یہ ہے کہ اگر سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھ کر یا بعد عطاء الٰہی اور تفویض خداوندی اس کو قادر مختار جان کر اس سے مدد مانگے تو بلاشبہ کفر اور شرک ہے یا اس شئی کو تاثیر اور فاعلیت میں مستقل بالذات یا مستقل بالعرض تو نہیں سمجھتا لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا نہیں کرتا لیکن دوسروں کو اس کے استقلال کا توہم ہوتا ہے تو یہ استعانت بالغیر ناجائز اور حرام ہوگی۔ اور بعض صورتوں میں کفر اور شرک کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا۔ پہلی صورت جبکہ غیر اللہ کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھے اس کے شرک ہونے میں تو کسی کو بھی کلام نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر کو قادر بالذات تو نہیں سمجھتا لیکن قادر بعطائے الٰہی سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قدرت اور اختیار عطاء کیا ہے کہ جو امور طاقت بشری سے باہر ہیں۔ ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے جیسے بادشاہ اپنے وزراء اور احکام کو کچھ تصرف عطاء کر دیتا ہے اور وہ بعد عطائے اختیارات مستقل سمجھے جاتے ہیں۔ اور پھر بادشاہ کے علم اور ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح معاذ اللہ۔ خدا تعالیٰ نے بھی کچھ اختیارات انبیاء اور اولیاء کو عطاء کئے ہیں اور وہ بعد عطاء الٰہی مستقل اور مختار ہیں۔ مشرکین عرب۔ ملائکہ اور اصنام کے متعلق بعینہٖ یہی

عقیدہ رکھتے تھے۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ﴾ (الزمر:۳)

مشرکین ان کو مستقل بالذات نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو فاعل مستقل بہ عطاء الٰہی سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا دیا ہے قران کریم میں جا بجا اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا۔

کمال قال تعالیٰ: ﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ﴾ (الفرقان:۵۵) وقال تعالیٰ:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ﴾ (العنکبوت:۱۷)

یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ خدائی اور خدائی اختیارات کا کسی طرف منتقل ہونا یا عطا کیا جانا نہ اختیاراً ممکن ہے اور نہ اضطراراً۔ کفار بغیر عطاء الٰہی کسی چیز پر ان کو قادر نہیں سمجھتے تھے۔ وقال تعالیٰ:

﴿قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا ۝﴾ (الجن:۲۱) وقال تعالیٰ: ﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (الاعراف:۱۸۸)

ان آیات میں بالذات نفع اور ضرر کے مالکیت اور اختیار کی نفی نہیں اس لیے کہ نہ کوئی نفع اور ضرر کے بالذات مالک اور مختار ہونے کا مدعی تھا اور نہ کوئی عاقل اسکو تسلیم کرسکتا ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نفع اور ضرر کا بالذات مالک ہو۔ مشرکین بھی اس کے قائل تھے۔ اصل مالک اور خالق وہی اللہ ہے۔

تیسری صورت کہ جب اس غیر کو نہ مستقل بالذات سمجھے نہ مستقل بالعرض لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا کرے۔ مثلاً اس کو یا اس کی قبر کو سجدہ کرے یا اس کے نام کی نذر مانے تو یہ بھی حرام اور شرک ہے لیکن یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ عملی ہے۔ اس کا مرتکب حرام کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ دائرہ اسلام سے خارج نہ ہوگا۔ چوتھی صورت کہ جب استعانت بالغیر میں اس غیر کے استقلال کا ایہام ہوتا ہو جیسے روحانیات سے مدد مانگتا۔ اگرچہ یہ شخص مستقل نہ سمجھتا ہو لیکن مشرکین چوں کہ ارواح کو فاعل مستقل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اس لیے ارواح سے مدد مانگنا قطعاً حرام ہوگا۔ حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں تردد اس میں ہے کہ اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج کیا جائے یا نہیں فعل چوں کہ شرک کا مظہر اتم ہے اس لیے دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا قوی اندیشہ ہے خلاصہ کلام یہ کہ اول کی دو صورتیں قطعاً کفر اور شرک ہیں اور ان کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج ہے اور اخیر کی دو صورتیں قطعاً حرام ہیں تردد اس میں ہے کہ ایسے شخص کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج مانا جائے یا نہیں لیکن اگر ایسی شے سے مدد مانگے کہ جس سے مدد مانگنا کفار اور مشرکین کے شعائر سے ہو۔ تو ایسی صورت میں اگر کوئی فقیر اور مفتی زُنّار باندھنے والے کی طرح اس پر بھی ظاہر کے اعتبار سے کفر اور شرک کا فتوی دے اور کافر ہونے کا حکم لگائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ چوں کہ وہ شے شعار کفر اور شرک سے ہے اس لیے اس کی نیت کا اعتبار نہ کیا جائیگا البتہ امور عادیہ جو طاقت بشریہ کے تحت داخل ہوں اور کارخانہ عالم اسباب ان کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو اور کسی شخص کو ان کے فاعل مستقل ہونے کا توہم بھی نہ ہوتا ہو جیسے روٹی کی امداد سے بھوک دفع کرنا اور پانی کی امداد سے پیاس دفع کرنا تو یہ استعانت بالغیر جائز ہے بشرطیکہ اعتماد محض اللہ پر ہو اور غیر کو محض ایک ذریعہ اور وسیلہ اور عون الٰہی کا ایک مظہر سمجھے جیسے نل محض پانی کے آنیکا راستہ ہے اسی طرح اسباب فیض خداوندی کے راستے ہیں اصل دینے والا وہی ہے اور مشرک یہ سمجھتا ہے کہ یہ نل ہی مجھ کو پانی دے رہا ہے۔ اس لیے نل ہی سے پانی مانگتا ہے اور نل ہی کی

خوشامد کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص دوا کو محض ایک وسیلہ سمجھے اور طبیب کو محض معالج جانے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن اگر دوا کو مستقل مؤثر سمجھے اور طبیب کو صحت بخشنے والا جانے تو یہ شرک ہوگا جاننا چاہیے کہ اسباب شرعیہ کا بھی وہی حکم ہے کہ جو اسباب عادیہ کا حکم ہے صرف فرق اتنا ہے کہ اسباب عادیہ کا اسباب ہونا عادۃ سے معلوم ہوا اور اسباب شرعیہ کا سبب ہونا شریعت سے معلوم ہوا۔ پس جس طرح اسباب عادیہ سے استعانت اور استمداد جائز ہے اسی طرح اسباب شرعیہ مثل دعا اور رقیہ صبر اور نماز وغیرہ سے بھی استعانت جائز ہے اس لیے کہ ان امور کا اسباب ہونا شریعت سے معلوم ہوا۔ اور امور غیر عادیہ میں اگرچہ غیر کو مظہر عون الٰہی سمجھے اور اصل اعتماد بھی اللہ ہی پر ہو مگر چوں کہ امور غیر عادیہ کا نسبب نہ عادۃً ثابت ہے۔ نہ من جانب اللہ اور بالفرض اگر ثابت بھی ہو تو قطعی اور دائمی نہیں اسلیے امور غیر عادیہ میں استعانت بغیر اللہ کفر اور شرک تو نہ ہوگی۔ مگر بدعت وضلالت ضرور ہوگی۔ حضر شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں

در ینجا باید فہمید کہ استعانت از غیر بوجہے کہ اعتماد بر آن غیر باشد و ادارا مظہر عونا لٰہی نداند حرام است و اگر التفات محض بجانب حق است و اورا یکے از مظاہر عون دانستہ ونظر بکارخانہ اسباب وحکمت او تعالی در آں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید دور از عرفان نخواہد بود و در شرع نیز جائز و رواست انبیاء و اولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند و در حقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لاغیر۔ (فتح العزیز صفحہ ۸)

ترجمہ: "اس جگہ جاننا چاہیے کہ غیر اللہ سے استعانت اس وقت حرام ہے کہ جب اعتماد اور بھروسہ اس غیر پر ہو اور اس غیر کو امداد الٰہی کا مظہر نہ سمجھے۔ اور اگر التفات اور نظر صرف خدا پر ہو۔ اور اس غیر کو اعانت الٰہیہ کا محض مظہر جان کر کارخانہ اسباب پر نظر کرتے ہوئے اس غیر سے ظاہری طور پر مدد چاہے تو خلاف عرفان نہیں اور شریعت میں بھی جائز ہے۔ اور حضرات انبیا علیہم السلام اور اولیاء نے بھی غیر اللہ سے اس قسم کی ستعانت کی ہے اور چوں کہ نظر صرف حق تعالیٰ پر ہے اس لیے یہ استعانت بالغیر نہیں بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔"

اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

استعانت یا بچیزے است کہ توہم استقلال آنچنیز در ہم وفہم ہیچ کس از مشرکین وموحدین نمے گزرد۔ مثل استعانت بحبوب و غلات و در رفع گرسنگی و استعانت ب آب در دفع تشنگی و استعانت برائے راحت بسایۂ درخت و مانند آں و در دفع مرض ب آدویہ وعقاقیر و در تعین وجہ معاش بامیر و بادشاہ کہ درحقیقت معاوضہ خدمت بمال است وموجب تذلل نیست یا باطباءٔ معالجان کہ بسبب تجربہ و اطلاع زائد از انہا طلب مشورہ است و استقلالے متوہم نمی شود پس ایں قسم استعانت بلا کراہت جائز است زیرا کہ درحقیقت استعانت نیست و اگر استعانت است استعانت بخدا است و یا بچیز یست کہ توہم استقلال در مدارک مشرکین جا گرفتہ مثل استعانت بارواح و روحانیات فلکیہ یا عنصریہ یا ارواح سائرہ مثل بہوانی و شیخ سدو و زین خاں و ایں نوع استعانت عین شرک است و منافی ملت حنفی۔ (فتح العزیز ص ۳۷)

ترجمہ: "استعانت اور استمداد یا تو ایسی چیز سے ہے کہ موحدین اور مشرکین کو بھی اس کے مستقل ہونے کا شبہ نہیں ہوتا جیسے بھوک دفع کرنے کے لیے غلہ اور اناج سے مدد حاصل کرنا اور پیاس دفع کرنے کے لیے پانی اور شربتوں سے مدد حاصل کرنا اور راحت آرام حاصل کرنے کے لیے درخت کے سایہ سے مدد حاصل کرنا اور ہماری دفع کرنے کے لیے دواؤں اور بوٹیوں

سے مدد حاصل کرنا معاشی امور میں امیر اور بادشاہ سے مدد چاہنا کہ جو درحقیقت معاوضہ خدمت ہے موجب تذلل نہیں۔ یا اطبا اور معالجین سے ان کے تجربہ اور زیادتی واقفیت کی بناء پر مشورہ لینا ان صورتوں میں استقلال کا وہم بھی نہیں ہوتا پس اس قسم کی استعانت بلا کراہت جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ استعانت حقیقتاً نہیں محض ظاہری استعانت ہے حقیقتاً استعانت خدا تعالیٰ سے ہے۔ یا ایسی چیز کے ساتھ استعانت ہے کہ جس کا مستقل بالتاثیر ہونا مشرکین کے ذہنوں میں جگہ لیے ہوئے ہے جیسے ارواح سے یا روحانیات فلکیہ اور عنصریہ سے استعانت کرنا یا ارواح سائرہ یعنی چلنے پھرنے والی ارواح سے مدد طلب کرنا جیسے بہوانی اور شیخ سدو اور زین خاں اس قسم کی استعانت عین شرک ہے اور ملت حنفیہ اسلامیہ کے بالکل منافی اور مباین ہے۔"

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾

ہم کو راہ راست دکھا اور اس پر چلا اور منزل مقصود تک پہنچا

① ہدایت کے معنی لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں اسی وجہ سے یہ لفظ حقیقتاً ہمیشہ خیر ہی کے موقعہ پر مستعمل ہوتا ہے اور ﴿فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝﴾ (الصافات: ۲۳) میں بطور تہکم اور بطریق استہزاء آیا ہے۔

② ہدایت کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے اگر ہدایت سے کسی شے کی نشان دہی اور رہنمائی مراد ہو تو لفظ الیٰ کے ساتھ متعدی ہوگا۔ اور اگر ہدایت سے منزل مقصود تک پہنچنا مراد ہو تو لام کے ذریعے سے متعدی ہوگا۔ اور اگر راستہ کا قطع کرانا اور منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہو تو بلا واسطہ متعدی ہوگا جیسا کہ اس آیت میں بلا واسطہ متعدی ہے۔ اس لیے ہم نے اس کے ترجمہ میں دکھانا اور چلانا اور پہنچانا تینوں چیزوں کا ذکر کیا۔

③ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں۔ جس میں پانچ باتیں پائی جائیں۔ ① مستقیم یعنی سیدھا ہو۔ ② اور موصل الی المقصود ہو یعنی مقصد تک پہچانے والا ہو۔ ③ اور سب سے زیادہ قریب اور نزدیک ہو۔ ④ اور وسیع اور کشادہ ہو۔ ⑤ اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔ جس راستہ میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں اس کو صراط کہتے ہیں جب تک یہ پانچ باتیں نہ پائی جائیں اس وقت تک صراط کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔

اس جگہ صراط کی صفت مستقیم ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے سب سے قریبی راستہ یہی ہے اس لیے کہ اقلیدس کا قاعدہ ہے کہ جب دو نقطوں میں مختلف اور متعدد خطوط ملائے جائیں تو تمام خطوط میں سب سے قریب اور سب سے چھوٹا خط ہی خط مستقیم ہوگا اور سیدھا ہی راستہ منزل مقصود تک پہونچاتا ہے نیز خط مستقیم متغیر نہیں ہوتا اور غیر مستقیم متغیر ہو جاتا ہے اور اسی ایک راستہ کا تمام عالم کے مرور اور عبور کے لیے کافی ہونا اس کے وسیع ہونیکی دلیل ہے اور خدا تک پہنچنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ﴾ (الانعام: ۱۵۲)

"اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی راستہ پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو مبادا تم کو خدا کے سیدھے راستہ سے

نہ ہٹادیں۔"

مطلب یہ ہوا کہ اے پروردگار میں عاجز اور ناتواں ہوں مجھ کو قریب اور سیدھے راستہ سے اپنے تک پہنچادے ٹیڑھے راستہ پر پڑ جانے سے خطرہ ہے کہ منزل مقصود تک نہ پہنچوں اور دور کے راستہ میں مشقت ہے۔

④ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "صراط مستقیم" سے دین اسلام مراد ہے اور بعض احادیث صحیحہ سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "صراط مستقیم" سے اسلام مراد ہے جو "مابین السماء والارض" سے بدرجہا زائد وسیع ہے۔ محمد بن الحنفیہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے اللہ کا دین مراد ہے جس کے سوا اور کوئی دین مقبول نہیں۔ (ابن کثیر)

⑤ اس آیت میں صراط کو اہل انعام کی طرف مضاف فرمایا اس لیے کہ سیدھے راستہ پر چلنے والے یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص انعام فرمایا اور متعدد آیات میں صراط کو اللہ کی طرف مضاف فرمایا کما قال تعالیٰ ﴿وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ ﴿صِرَاطِ اللّٰهِ ۔ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ﴾ اس لیے کہ وہ صراط مستقیم اللہ ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ قادیان کے دہقان یوں کہتے ہیں کہ نبیؐ کے راستہ پر چلنے سے آدمی نبی بن جاتا ہے۔ اللہ اکبر اگر یہی قاعدہ ہے تو پھر خدا کے راستہ پر چلنے سے خدا بن جانا چاہیے اور تفسیر ابن کثیر جلد اوّل صفحہ ۴۹ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ﴿اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے ملائکہ اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین سب مراد ہیں لہٰذا قادیانیوں کے نزدیک فرشتوں کے راستہ پر چلنے سے فرشتہ بن جانا چاہیے۔

⑥ استقامت کے معنی توسط اور اعتدال کے ہیں جو ٹھیک افراط اور تفریط کے درمیان میں ہے حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت پر قدم کا ٹھیک جم جانا کہ اب ڈگمگانے کا احتمال نہ رہے اس کا نام استقامت ہے اور استقامت کا مقام نہایت بلند ہے اسی وجہ سے حضرات عارفین استقامت کو کرامت سے فوق اور برتر سمجھتے ہیں۔

⑦ ہدایت اور استقامت کے مراتب نہایت مختلف اور متفاوت ہیں۔ ہدایت اور استقامت کا کوئی مرتبہ ایسا نہیں کہ اس کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ اور افضل مرتبہ نہ ہو۔ اور صراط مستقیم اگرچہ ایک ہے لیکن وسیع ہونے کی وجہ سے اور سالک کے سریع اور بطی ہونے کی وجہ سے اس میں بھی قرب اور بعد کا تفاوت ہوسکتا ہے اس لیے طلب ہدایت کا ہر شخص مامور ہے۔ طالب کو اگر ہدایت و استقامت کے بعض مراتب حاصل بھی ہوں تب بھی وہ ہدایت کے اعلیٰ مراتب سے مستغنی نہیں ہوسکتا ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست

ہرچہ بروے میرسی بروے بایست

علاوہ ازیں ہدایت پر قائم اور ثابت رہنے کے لیے ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کی اعانت اور توفیق کی حاجت ہے جیسا کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا﴾ (النسآء:۱۳۶)

ترجمہ: "اے ایمان والو ایمان لاؤ۔"

اس آیت میں ایماں داروں کو پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے اسلام پر ثابت اور مستقیم رہنا مراد ہے۔ اسی طرح ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں مزید ہدایت کی طلب اور ثابت قدمی اور استقامت کی دعا تعلیم کرنا مقصود ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ۷ ع *

یعنی ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تو نے اپنا ایسا خاص انعام فرمایا کہ اسی خاص انعام اور خاص فضل کی بناء پر وہ نہ تیرے مغضوب اور معتوب ہیں بلکہ تیرے مقرب اور محبوب ہیں۔ تیری رضا اور خوشنودی کا تمغہ اور پروانہ حاصل کئے ہوئے ہیں اور نہ وہ گمراہ ہیں۔ صحیح راستہ انکو معلوم ہے منزل مقصود سامنے ہے بصد ذوق وشوق خط مستقیم کی طرف دوڑے چلے جارہے ہیں۔ یمین ویسار کی طرف التفات بھی نہیں کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار عالم ہم نابکاروں کو انعام اور اہل انعام کی راہ پر چلا اور دار انعام میں پہنچا اور غضب اور ضلال کی راہ سے محفوظ اور دور رکھ اور اپنی توفیق اور اعانت کو ہمارا ہادی اور معین اور دستگیر بنا اور انبیاء وصدیقین وشہداء وصالحین کو رفیق طریق بنا تا کہ ان کی معیت اور رفاقت میں افتاں وخیزاں تیری بارگاہ میں پہنچ سکیں آمین۔

پس قول اللہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ اور قولہ ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ سے ملائکہ اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین مراد ہیں۔ جن کو حق تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور عبادت کی نعمت سے سرفراز فرمایا (ابن کثیر) اور انعام کی خاص نوع اور کسی خاص قسم کو نہ ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اے اللہ ہم پر ہر قسم کا انعام فرما اور وہ تمام الطاف وکرم اور وہ تمام آلا ونعم جو تو نے اپنے تمام انعام والے بندوں پر متفرقاً نازل فرمائے وہ ہم پر مجتمعاً نازل فرما۔ آمین

نیز لفظ صراط کو ﴿ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ کی طرف مضاف کرنے میں سالکین راہ حق اور راہروان منزل آخرت کے لیے ایک عظیم الشان تسلیہ ہے کہ وہ سفر اور راستہ کی تنہائی سے ہرگز نہ ڈریں نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ان کے رفیق سفر ہیں۔ ﴿ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ﴾ (النساء:۶۹)

نیز مقام سوال میں منعم کے انعامات واحسانات کا تذکرہ۔ اجابت اور قبول میں خاص اثر رکھتا ہے اسی طرح سوال ہدایت کے وقت حق جل وعلا کے انعام عام کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اے ربُّ العالمین اور اے ارحم الراحمین تو نے اپنی رحمت واسعہ سے بہت بندوں پر ہدایت کا انعام فرمایا ہم کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز اور اس پر استقامت نصیب فرما۔ اور ہم گنہگاروں کو بھی اپنے لطف عمیم سے اہل انعام کے زمرہ میں داخل فرما۔ آمین

﴿ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ سے وہ فریق مراد ہے جو دیدہ ودانستہ راہ راست کو چھوڑ دے اور علم صحیح کے باوجود ہوائے نفس کے

---

* ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ چوں کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ ﴾ کی صفت ہے اس لیے ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ ترجمہ ہی سے اس کی صفتہ موصحہ ہونا معلوم ہوجائے انتہی اور بعض نے اس طرح ترجمہ کیا ہے نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپکا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہوئے۔ انتہی یہ ترجمہ بتقدیر المضاف ہے۔ کما قال ابو حیان و قدر بعضهم فی غیر المغضوب محذو فا قال التقدیر غیر صراط المغضوب علیهم واطلق هذا التقدیر فلم لیقیده بجز غیر ولا نصبه و هذا لیتاتی الا بنصب غیر فیکون صفة لقوله الصراط وهو ضعیف. الخ (کذا فی البحر المحیط جلد ۱ صفحہ ۳۰)

پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے۔ اس نوع کے کامل ترین افراد بہود بے یہود ہیں کہ باوجود تورات کے عالم ہونے کے کتمان حق اور استکبار اور اتباع ہوی جیسے امراض میں مبتلا رہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام سے ہمیشہ معاندانہ رویہ رکھا جان بوھ کر قتل انبیاء اللہ کے مرتکب ہوئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر اب تک ذلت ومسکنت کی مہر لگادی گئی۔ غضب اور لعنت کا طوق انکی گردنوں میں ڈالدیا گیا۔ ﴿مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ﴾ (المائدہ:۶۰)

اور ﴿ضَآلِّيْن﴾ سے وہ مراد ہے جو سواء السبیل سے بھٹک کر غلط راستہ پر جا پڑا۔ اس نوع کے کامل ترین افراد نصاریٰ ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (المائدہ:۷۷)

ترجمہ: "بہتوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھے راستے سے بھٹک گئے"۔

یہود اور نصاری کے کامل ترین افراد ہونے کی وجہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کی تفسیر یہود سے اور ضالین کی تفسیر نصاریٰ سے فرمائی۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْن کے مصداق صرف یہود اور نصاری ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان دو قسموں کے تحت میں ہر قسم کے گمراہ اور کافر اور فاسق و فاجر عاصی اور مبتدع علی اختلاف المراتب داخل ہیں مگر یہود مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کے کامل ترین فرد اور نصاری ضالین کے اوّلین مصداق ہیں۔ سلف صالحین یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امت کے علما میں سے جو بگڑا وہ یہود کے مشابہ ہوا اس لیے کہ وہ اپنی اغراض کی وجہ سے کلمات الٰہیہ کی تحریف اور کتمانِ ما انز ل اللہ اور تلبیس الحق بالباطل اور اہل علم وفضل کے حسد میں گرفتار ہوا۔ کہ یہود کے اخلاق ہیں اور اس امت کے عباد اور زہاد سے جو بگڑا وہ نصاریٰ کے مشابہ ہوا۔ اس لیے کہ اس نے اپنی عبادت میں بجائے شریعت غراء اور سنت بیضاء کے ہوائے نفس کا اتباع کیا اور نصاری کی طرح تعظیم مشائخ میں اس درجہ کا غلو کیا کہ اعتقاداً نہ سہی عملاً تو ضرور ان کو رب اور انکی قبور کو مساجد بنالیا۔ بعض مرتبہ چوں کہ نعمت ہی علم وعمل کے فساد کا باعث ہوتی ہے اکثر عیش اور تنعم ہی میں پڑ کر انسان خدا کو بھول جاتا ہے' احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے اس لیے ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کے بعد ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کا اضافہ مناسب ہوا کہ اے رب العالمین اپنی نعمتوں پر حمد وشکر کی توفیق عطا فرما خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ تیرے انعام کے بعد غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر سیدھے راستہ سے بہک جائیں اور تیری لعنت وغضب کے مستحق بنیں۔ اپنی نعمت کو اطاعت کا ذریعہ بنا۔ معصیت کا سبب نہ بنا۔

آیت موصوفہ میں صرف انعام کو اپنی جانب منسوب فرمایا۔ غضب اور ضلال کو اپنی جانب منسوب نہیں فرمایا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ انعام محض اس کا فضل ہے بلا کسی استحقاق کے بندوں پر مبذول فرماتا ہے۔ مگر غضب ابتداءً نازل نہیں فرماتا۔ بلکہ ان کی نافرمانی اور دیدہ ودانستہ عدول حکمی کے بعد اور علی ہذا گمراہ جب ہوتے ہیں کہ جب صراط مستقیم کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

نیز ادب الٰہی کا اقتضاء یہ ہے کہ جب افعال احسان ورحمت کا ذکر ہو تو صراحتاً اللہ جل جلالہ کی طرف اس کی اسناد ہونی چاہیے۔ اور جب افعال جزا اور عقوبت کا ذکر ہو تو پھر فاعل کا حذف اور فعل کا مبنی للمفعول لانا مناسب ہے مثلاً ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿الَّذِىْ خَلَقَنِىْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ﴿۷۸﴾ وَالَّذِىْ هُوَ يُطْعِمُنِىْ وَيَسْقِيْنِ ۙ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۙ﴿۸۰﴾﴾ (الشعراء)

ترجمہ: "جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھ کو راہ دکھاتا ہے اور وہی مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھ کو

شفا دیتا ہے۔"

خلق اور ہدایت اور اطعام اور استقاء اور شفا ان تمام افعال کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ مگر مرض کو شئ مکروہ ہونے کی وجہ سے ادباً اپنی جانب منسوب کیا اور یہ کہا۔

﴿ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ ﴾ (الشعراء)

ترجمہ: "جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفاء دیتا ہے۔"

اور یہ نہیں کہا:

﴿ وَ اِذَا اَمْرَضَنِیْ فَهُوَ يَشْفِيْنِیْ ﴾

ترجمہ: "وہ جب وہ مجھ کو بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو وہی مجھ کو شفاء دیتا ہے۔"

اور مومنین جن نے کہا:

﴿ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ ﴾ (الجن:۱۰)

ترجمہ: "اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا یا ان کے رب نے ان کے ساتھ خیر ابھلائی کا ارادہ کیا ہے۔"

میں ارادہ شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا اور صیغہ مجہول کے ساتھ اس کو ذکر کیا۔ یعنی ﴿ اَشَرٌّ اُرِيْدَ ﴾ کہا اور ﴿ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ میں ارادہ رشد کو رب العزت کی جانب منسوب کیا۔

اور علیٰ ہذا خضر علیہ السلام نے ﴿ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا ﴾ "میں نے ارادہ کیا اس کشتی کو عیب دار بنادوں" عیب اور ارادہ عیب دونوں کو اپنی جانب منسوب کیا اور۔

﴿ اَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ ﴾ (الکہف:۸۲)

ترجمہ: "میرے رب نے ارادہ کیا وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں۔ اور خدا کی مہربانی سے اپنا خزانہ نہ نکالیں۔"

اس آیت میں ارادہ رحمت کو رب العالمین کی جانب منسوب کیا اور ﴿ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ﴾ (الکہف:۸۲) (میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا) کہہ کر اس کو اور موکد کر دیا۔

اور اسی طرح

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآىِٕكُمْ ؕ ﴾ (البقرہ:۱۸۷) اور ﴿ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ﴾ (النساء:۲۴)

ترجمہ: "روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مخالطت تمہارے لیے حلال کر دی گئی۔" اور "اور ان محرمات کے سوا اور عورتیں تمہارے لیے حلال کر دی گئیں۔"

میں اس خاص احلال کو چوں کہ اللہ جل جلالہ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب تھا۔ اس لیے دونوں جگہ ﴿ اُحِلَّ ﴾ کو مبنی للمفعول ذکر کیا گیا۔ اور ﴿ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ ﴾ (البقرہ:۲۷۵) میں یہ مانع نہ تھا۔ اس لیے اس حلال اور تحریم کی اسناد صراحتاً اللہ کی طرف کی گئی۔

نیز منعم حقیقی صرف وہی تبارک وتعالیٰ ہے کما قال تعالیٰ۔ ﴿ وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ﴾ (النحل:۵۳) اس لیے انعام کو اللہ

کی طرف منسوب کیا گیا۔ اور غضب خدا کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ملائکہ اور انبیاء اور عباد صالحین کی طرف سے بھی خدا کے نافرمان اور سرکش بندوں پر ہوسکتا ہے۔

نیز مغضوب علیہم کے فاعل کا حذف اہل غضب کی تحقیر اور تذلیل کی طرف مشیر ہے اور انعام کے فاعل کی تصریح اہل انعام کے تشریف وتکریم کی طرف مشیر ہے۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا هذا الّذِی اکرمه السلطان و خلع علیه (بادشاہ نے اس شخص کا اکرام کیا اور اس کو خلعت عطاء کیا) بہ نسبت هٰذَا الّذِی اُکْرِمَ وَخُلِعَ عَلَیْهِ (اس شخص کا اکرام کیا گیا اور اس کو خلعت دیا گیا) کے بدرجہا بلیغ ہے اور ذکر فاعل کی وجہ سے یہ پہلا کلام جس قدر ممدوح کی مدح وثناء اور تشریف وتکریم پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرا کلام اس دلالت میں اس کے پاسنگ بھی نہیں۔

نیز حذف فاعل کچھ اعراض اور ترک التفات پر دلالت کرتا ہے جو اہل غضب کے مناسب ہے اہل انعام کے مناسب نہیں اس لیے انعام کا فاعل ذکر کیا گیا اور غضب کا فاعل حذف کیا گیا اور چوں کہ انعام کی ضد غضب ہے۔ ضلال انعام کا مقابل نہیں بلکہ رشد اور ہدایت کا مقابل ہے اس لیے اہل انعام یعنی ﴿ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ﴾ کے بعد متصلاً ہی اہل غضب یعنی ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ ﴾ کا ذکر فرمایا اور اہل ضلال کو بعد میں ذکر کیا۔ کیونکہ ایک ضد کے بعد دوسری کا ذکر کلام میں ایک خاص شان اور خاص تناسب پیدا کر دیتا ہے۔

اور اہل غضب کی تقدیم کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ یہود بہ نسبت نصاریٰ کے اسلام سے زیادہ دور ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے صرف ایک نبی یعنی محمد ﷺ کی تکذیب کی اور یہود نے دو پیغمبروں کی یعنی مسیح بن مریمؑ اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی تکذیب کی حق تعالیٰ شانہ نے ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ ﴾ کو لفظ کے ساتھ ذکر فرمایا اور حرف لَا کے ساتھ یعنی ﴿لَا الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ ﴾ نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ حرف لا فقط ماقبل کی نفی کے لیے آتا ہے اس صورت میں کلام کے یہ معنی ہوئے کہ اے اللہ ہم کو انعام کا راستہ بتلا نہ اہل غضب کا۔ اور لفظ غیر ماقبل کی نفی اور مغایرت دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ مغایرت پر صراحتاً اور نفی ماقبل پر ضمناً۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے اللہ ہم کو انعام کا راستہ بتلا جن کا راستہ اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے بالکل مغایر اور مباین ہے خود اہل انعام اور ان کا راستہ غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکلیہ پاک ہے۔ اہل فہم غور کریں کہ یہ معنی بہ نسبت پہلے معنی کے کس قدر لطیف ہیں اور کیا یہ لطافت بجائے لفظ غیر کے حرف لا، لانے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ کَلَّا ہرگز نہیں۔

نیز لفظ غیر کے لانے میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا یہ زعم کہ ہم ہی اہل انعام ہیں جیسا کہ وہ کہتے تھے:

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدہ:۱۸) غلط ہے بلکہ اہل انعام ان کے سوا اور غیر ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدہ:۳)

ترجمہ: "آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔"

اور ﴿وَ لَا الضَّآلِّیْنَ﴾ میں حرف عاطف یعنی واؤ کے ہوتے ہوئے حرف لا کا اس لیے اضافہ فرمایا تا کہ اہل انعام کے راستہ کا اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے فرداً فرداً اور علیحدہ علیحدہ مغائر ہونا معلوم ہو جائے ﴿وَ لَا الضَّآلِّیْنَ﴾ سے اگر حرف لا کو حذف کر کے ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ الضَّآلِّیْنَ﴾ کہا جائے تو مجموعہ فریقین کے راستہ سے اہل انعام کے راستہ کا مغایر ہونا مفہوم ہوگا۔ اہل انعام کے راستہ کا ہر واحد سے علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم نہ ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ مجموع من حیث المجموع کی مغایرت ہر واحد کی مغایرت کو

مستلزم نہیں۔ہاں ہر واحد کی مغایرت مجموع من حیث المجموع کی مغایرت کو بالاولویت مستلزم ہے۔فافہم ذلك واستقم

اسرار مجموعۂ سورت

① اس سورت میں دس چیزیں مذکور ہیں۔پانچ چیزیں خدا تعالیٰ کے متعلق ہیں اور پانچ بندوں کے متعلق ہیں۔خدا تعالیٰ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں: الوہیت، ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت اور بندہ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں: عبادت، استعانت، طلب ہدایت، طلب استقامت اور طلب نعمت۔

بندہ کی یہ پانچ صفتیں اسی ترتیب سے خدا تعالیٰ کی پانچ صفتوں سے متعلق ہیں اور معنی کلام یہ ہیں کہ اے خدا تعالیٰ ہم خاص تیری عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ تو ہمارا اللہ یعنی معبود ہے اور خاص تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اس لیے کہ تو ہی تمام جہانوں کا مربی اور پرورش کرنے والا ہے اور تجھ ہی سے ہدایت کی درخواست کرتے ہیں۔اس لیے کہ تو رحمن ہے تیری رحمت اور مہربانی عام ہے اور تجھ ہی سے استقامت کی التجا کرتے ہیں اس لیے کہ تو رحیم ہے۔تیری خاص رحمت خاص اہل ایمان اور اہل ہدایت ہی پر مبذول ہے اور تجھ ہی سے انعام کے امیدوار ہیں۔اس لیے کہ تو ہی جزا اور سزا کا مالک ہے ایسی کامل نعمت ہم کو عطا فرما کہ جو غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکل پاک ہو۔(تفسیر کبیر ص ۱۵۱ جلد ۱)

② نیز بندہ جب مقام مناجات میں کھڑا ہوا اور خدا کی صفات کمال بیان کرتا ہوا ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ تک پہنچا تو بے اختیار سیر الی اللہ کا شوق دامنگیر ہوا۔ارادہ سفر کا مصمم کیا تو سفر کے لیے عبادت کا توشہ لیا۔اور استعانت اور امداد خداوندی کی سواری پر سوار ہوا۔زاد اور راحلہ کے مکمل ہو جانے کے بعد راستہ معلوم کیا۔جب سیدھا راستہ معلوم ہو گیا تو رفقاء طریق کی فکر ہوئی کہ جن کی رفاقت اور معیت سے راستہ سہولت سے قطع ہو اور راہزنوں یعنی اہل غضب اور اہل ضلال کا کوئی خدشہ اور دغدغہ باقی نہ رہے۔(تفسیر عزیزی ص ۴۸)

③ جن علوم کی حضرات انبیاء علیہم السلام نے دعوت دی۔وہ تین علم ہیں: علم شریعت، علم طریقت اور علم حقیقت۔اور پھر علم شریعت کی دو قسمیں ہیں: اوّل علم عقائد، دوم علم احکام۔سو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾﴾ میں الٰہیات یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان ہے اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ ... الخ﴾ میں ہدایت اور ضلالت سعادت اور شقاوت کا بیان ہے اور چوں کہ ﴿اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے انبیاء وصدیقین۔شہداء اور صالحین مراد ہیں اس لیے اس آیت میں مباحث نبوت وامامت کی طرف اشارہ ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں علم احکام کی طرف اشارہ ہے علم طریقت جس میں نفس اور قلب کے امراض اور معالجات سے بحث کی جاتی ہے۔اس کے تین مرتبے ہیں۔

پہلا مرتبہ : **توحید فی العبادۃ** ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو عبادت نہ کرلے۔

دوسرا مرتبہ: **توحید فی الاستعانت** ہے یعنی سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگے۔

تیسرا مرتبہ: **استقامت** ہے یہ سلوک کا اعلیٰ مرتبہ ہے کہ طریق عبودیت اور جادہ اخلاص ومحبت پر قدم ایسا ٹھیک جم جائے کہ ذرہ برابر اِدھر اُدھر ہٹنے نہ پائے ان مراحل اور مقامات کے طے ہو جانے کے بعد درجہ ہے مکاشفات اور تجلیات کا کہ قلب پر سحائب

الہام کی بارش ہونے لگے اور علوم اور معارف اسرار اور لطائف منکشف ہونے لگیں۔ یہ علم حقیقت ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہے اپنا انعام فرمائے۔ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ

اس سورت کے ختم پر ﴿اٰمِيْن﴾ کہنا مسنون ہے اور لفظ آمین اسم فعل ہے یعنی یہ کلمہ دراصل تو اسم ہے مگر معنی میں فعل کے ہے یعنی افعل (ایسا ہی کر) کے معنی میں ہے جیسے رُوَيْدَا اور حَيَّهَلْ اور هَلُمَّ۔ اسماء افعال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ جو ہم نے تجھ سے مانگا ہے وہی کر دے یعنی اہل انعام کے راستہ پر چلا اور اہل غضب اور اہل ضلال سے ہم کو الگ رکھ اور لفظ آمین بالاتفاق سورہ فاتحہ کا جزء نہیں بلکہ جس طرح عام دعاؤں کے بعد آمین کہنا سنت ہے اسی طرح الحمد کے بعد بھی آمین کہنا باتفاق سنت ہے۔ اختلاف صرف اس میں کہے کہ آمین آہستہ کہنا بہتر ہے یا آواز سے جمہود صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم کا یہی مذہب ہے کہ آہستہ کہنا بہتر ہے اور یہی امام ابوحنیفہ، اور امام مالک اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کیوں کہ آمین دُعا ہے اور دعا کے آہستہ مانگنے کا حکم قرآن کریم میں صراحتاً موجود ہے۔ ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝﴾ (الاعراف) اور صحیح حدیثوں میں قُوْلُوْا آمِيْن یعنی آمین کہنے کا حکم آرہا ہے جس سے جہر ثابت نہیں ہوتا ورنہ قولوا التحيات الله ...الخ اور قولوا ربنا لك الحمد (متفق علیہ) میں بھی جہر کا قائل ہونا پڑے گا حالاں کہ امت کا کوئی عالم اس کا قائل نہیں دلائل کی تفصیل شرح بخاری اور شروح ہدایہ میں دیکھیں۔

صلوٰۃ المسلمین اور صلوٰۃ نصاریٰ کا تقابل

کلام الٰہی کے دقائق و اسرار کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے۔ بڑے سے بڑے فہیم اور ذکی اور صاحب فہم ثاقب کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔ یہ مختصر سورت یعنی سورہ فاتحہ جس کے معارف و لطائف کا ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اس کے وہ اسرار و معارف جو اللہ رب العزت کے علم میں ہیں وہ رودر کنار علما اسلام اور حضرات مفسرین نے جو اس مختصر سورت کے حقائق و معارف بیان فرمائے ہیں۔ ہم انہیں کے استیعاب اور استقصاء سے عاجز اور درماندہ ہیں۔ جس کی تصدیق علمائے اسلام کی تفاسیر سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ سورہ فاتحہ جیسی سورت نہ توریت میں اتاری گئی اور نہ زبور میں اور نہ انجیل میں۔ (اخرجہ الترمذی وصححہ)

اسی وجہ سے ہر نماز میں اس سورت کا پڑھنا لازم قرار دیا گیا۔ اس وقت ہم انجیل کی وہ عبارت ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جس کو نصاریٰ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ تاکہ دونوں کے موازنہ اور مقابلہ سے اہل اسلام کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہو اور نصاریٰ کے لیے اگر وہ خدا سے ڈریں اور غور و فکر سے کام لیں تو ان کے لیے موجب ہدایت ہو۔

انجیل متی باب ششم آیت نہم میں ہے کہ اس طرح نماز پڑھا کرو۔

اَبُوْنَا الَّذِی فِی السَّمٰوَاتِ لِیَتَقَدَّسْ اِسْمُك لِتَاء تِ مَلَكُوْتُكَ لِتَكُنْ مَشِیَّتُكَ كَمَا فِی السَّمَآ ءِ عَلَی الْاَرْضِ خَبِّرْ نَا كَفَافَنَا اَعْطِنَا الْیَوْمَ وَاغْفِرْلَنَا خَطَایَا نَا كَمَا نِغْفِرُ نَحْنُ لِمَنْ اَخْطَاءَ اِلَیْنَا. وَلَا تُدْ خِلْنَا فِی التَّجَارِبِ لٰكِنْ نَجِّنَا مِنَ الشَّرِیْرِ. اٰمِیْنَ.

ترجمہ: "اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک ہو۔ تیری بادشاہت آنی چاہیے تیری مشیت جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ایسے ہی زمین پر بھی ہو ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہماری خطاؤں کو معاف کر جیسا کہ ہم اپنے خطا کاروں کی خطائیں معاف کرتے ہیں اور ہم کو آزمائش میں نہ لا بلکہ برے لوگوں سے بچا آمین۔ یعنی قبول فرما۔"

اربابِ فہم وبصیرت اگر سورۃ فاتحہ کے بعد اس عبارت پر ایک نظر ڈالیں تو ان کو بخوبی منکشف ہو جائے گا کہ اس عبارت کو سُورہ فاتحہ کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو ثری (خاک) کو ثریا سے ہے۔ صیغہ امر سے تقدیس اسم اور اتیان ملکوت کو طلب کرنا محض لاطائل اور تحصیل حاصل ہے وہ ہمیشہ سے قدوس اور اسلام اور ملیک مقتدر اور عزیز وحکیم ہے اس مالک الملکوت اور قدوس وحکیم کی شان میں یہ لفظ کہنا کہ چاہیے کہ تیرا نام پاک ہو اور تیری بادشاہت آئے سراسر خلافِ ادب ہے۔

اور علی ہذا یہ کہنا (لتكن مشيتك كما فی السّماء علی الارض) چاہیے کہ تیری مشیت جیسے آسمان میں ہے ویسے ہی زمین میں بھی ہو۔ یہ بھی سراسر خلاف ادب ہے کیا اس کی مشیت سبع سمٰوات اور سبع ارضین میں جاری اور ساری نہیں؟ اور کیا کوئی ذرہ اس کی قدرت اور مشیت سے مستثنیٰ ہے؟ حَاشا وَكَلَّا۔ ﴿بَلٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ اور علیٰ ہذا آج کی روٹی کے سوال کو ہدایت اور صراط مستقیم کے سوال (جو دُنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح اور سعادت دارین) کو علیٰ وجہ الاتم شامل ہے۔ اس سے کیا نسبت؟ اور پھر اس ﴿غَفُوْرٌ الرَّحِیْمُ﴾ اور ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ سے یہ سوال کرنا کہ ایسی مغفرت عطاء فرما جیسا کہ ہم اپنے گنہگاروں اور خطاء کاروں کی مغفرت کرتے ہیں۔ کھلی ہوئی سفاہت اور صریح گستاخی ہے اس کی کامل وعظیم اور وسیع وعمیم مغفرت کو اپنی ناقص اور محدود اور برائے نام مغفرت کے ساتھ تشبیہ دینا اور در پردہ اپنے خطا کاروں کو خدا کے خطاروں کے ساتھ مماثل بتلانا اور ضمناً اپنی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی کے ہم پلہ قرار دینا کیا یہ کھلی ہوئی گستاخی نہیں؟

اُس رب العالمین اور اس حنان ومنان کے تمام آلاء ونعم میں سے صرف آج کی روٹی کا سوال کرنا۔ رب غفور اور ارحم الراحمین سے اپنی ناقص اور محدود مغفرت کے مماثل مغفرت طلب کرنا۔ نصاریٰ کے فہم وفراست کو خوب واضح کرتا ہے اخیر میں لفظ آمین مذکور ہے جو اہل اسلام سے سرقہ ہے سوائے اہل اسلام کے دُنیا میں کوئی بھی آمین کو نہیں جانتا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

آیاتہا ۲۸۶ | ② سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۸۷ | رکوعاتہا ۴۰

سورۂ بقرہ مدنی ہے اس کی دو سو چھیاسی آیتیں ہیں اور چالیس رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا

الٓمّٓ ۚ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۚ

الم ○ اس کتاب میں کچھ شک نہیں

سورۂ بقرہ کی تفسیر

اس سورۃ کو سورہ بقرہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ذبح بقرہ کا واقعہ مذکور ہے جو حق جل وعلا کی الوہیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اس لیے کہ ایک مقتول کا محض ایک مذبوحہ گائے کا ایک ٹکڑا لگا دینے سے زندہ ہو جانا فقط اس ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (البروج:۱۶) کے ارادہ اور مشیت کا ایک ادنی کرشمہ تھا کسی مادہ اور طبیعت کے اقتضاء کو اس میں اصلا دخل نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ واقعہ منکرین حشر اجساد کے لیے ایک عظیم الشان حجت ہے کہ وہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی مردوں کو اسی طرح زندہ فرمائے گا۔ جس طرح اس مقتول کو زندہ فرمایا۔ نیز یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے ایک معجزہ تھا جو ان کی نبوت اور رسالت کی تصدیق کے لیے من جانب اللہ ظاہر کیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ بقرہ کا یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور احیاء موتی اور قیام قیامت' تینوں کی دلیل ہے اور یہی تین امور قرآن کریم کے اعظم مقاصد ہیں۔ نیز اس واقعہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ صراط مستقیم * کا اقتضاء یہی ہے کہ بغیر تفتیش اور تفحص کے انبیاء کرام علیہم السلام کی اطاعت کی جائے جس چیز کا حضرات انبیاء علیہم السلام حکم دیں اس کو بے چون و چرا قبول کیا جائے۔ حضرات انبیاء کے حکم کے بعد تفتیش میں پڑنا شک اور نفاق کی علامت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پر اطمینان ہوتا تو اس تفتیش کے خلجان میں نہ پڑتا اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی اطاعت سے انحراف ضلال مبین (کھلی گمراہی) ہے۔ اور ان حضرات سے حجتیں کرنا موجب غضب اور لعنت ہے اعاذنا اللہ تعالیٰ من ذلك. آمین۔ نیز دُنیا کی محبت ہی تمام فتنہ اور فساد کی جڑ ہے۔ جب دنیا کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو اعزہ اور اقارب کی محبت بھی دل سے نکل جاتی ہے اللہ جل جلالہ * کی ہدایت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی نصیحت جب ہی نفع دیتی ہے کہ دل میں خدا کا خوف اور کچھ ڈر ہو۔ جب خدا کا خوف دل میں ہوتا ہے تب ہی صراط مستقیم

---

* سورہ بقرہ اور سورہ فاتحہ کے باہمی ربط کی طرف اشارہ ہے فافهم ذلك واستقم. ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ

* اس میں بھی ربط کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ اور ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ کو ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ اور ﴿ضَآلِّيْنَ﴾ کے ساتھ کیا ربط ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ

اور راہ حق کی تلاش اور خداوند ذوالجلال کے غضب اور لعنت سے بچنے کی فکر ہوتی ہے ورنہ جس شقی اور بد بخت کا دل خدا کے خوف سے خالی ہے اس کے حق میں انبیاء کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔ نیز سورہ فاتحہ میں ہدایت اور صراط مستقیم کا ذکر تھا او سورہ بقرہ میں شروع ہی سے ہدایت اور صراط مستقیم کا ذکر فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ابتداء ہی میں ہدایت کا ذکر فرمایا اور پھر بتلایا کہ صراط مستقیم کیا ہے۔ وہ ایمان اور تقویٰ اور اعمال صالحہ کی راہ ہے پھر یہ بتلایا کہ یہ ہدایت کی نعمت کس کو نصیب ہوئی۔ اور کون اس دولت و سعادت سے محروم رہا۔ ﴿هُدًى﴾ سے ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ تک اس فریق کا ذکر فرمایا جس کو ہدایت نصیب ہوئی اور جو ظاہراً اور باطناً اللہ کی ہدایت اور صراط مستقیم پر چلنے والے تھے۔ اور پھر اہل غضب اور اہل ضلال کے دو فرقوں کا ذکر فرمایا ایک کافرین مجاہرین جو ظاہراً اور باطناً صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے تھے۔ دوم منافقین جو ظاہراً صراط مستقیم پر تھے اور باطناً غضب اور ضلال کی راہ پر تھے۔ اور چوتھی قسم یعنی جو ظاہراً تو غضب اور ضلال کی راہ پر ہو اور معنیٰ صراط مستقیم پر ہو یہ قسم عقلاً اور شرعاً باطل ہے اس لیے اس قسم کو ذکر نہیں فرمایا۔ نیز سورہ فاتحہ میں حق تعالیٰ شانہ کی ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر تھا اس لیے سورہ بقرہ کے شروع ہی میں صحیفۂ ہدایت * کا ذکر فرمایا کہ جس سے بڑھ کر کوئی تربیت اور رحمت نہیں پھر ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ... الخ﴾ میں اس ظاہری ربوبیت اور رحمت کا ذکر فرمایا جس کا تمام نوع انسانی سے تعلق ہے اور ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ میں تمام لوگوں کو اپنی عبادت اور بندگی کا خطاب عام فرمایا۔ بعد ازاں اس خاص ربوبیت اور اس خاص رحمت کا ذکر فرمایا کہ جو دو خاص فرقوں سے متعلق تھی۔ ایک فرقہ بنی اسرائیل دوم فرقہ بنی اسماعیل پھر مسئلہ ملت اسلام اور قبلہ اسلام کا ذکر فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ ملت ابراہیمی اور قبلہ ابراہیمی کا اتباع ہی صراط مستقیم ہے اور اس راہ سے اعراض سراسر سفاہت اور حماقت ہے اور آیت ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ﴾ میں جو ٹھیک سورۂ بقرہ کے نصف پر ہے صراط مستقیم کی تفصیل فرمائی کہ صراط مستقیم اللہ اور یوم آخرت اور ملائکہ اور انبیاء پر ایمان لانا ہے گویا کہ یہ آیت ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کی تفسیر ہے کہ غیب سے یہ چیزیں مراد ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں بعد ازاں اخیر سورت تک احکام کا سلسلہ چلا گیا۔ اخیر سورت میں ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ... الاية﴾ میں پھر صراط مستقیم کی حقیقت اور ایمان بالغیب کی کیفیت کو واضح فرمایا اور مغفرت اور رحمت اور نصرت کی دعا پر سورت کو ختم فرمایا خلاصہ کلام یہ کہ سورہ بقرہ کے شروع میں بھی ہدایت اور صراط مستیم اور رحمت اور ربوبیت کا ذکر فرمایا اور درمیان میں بھی اور اخیر میں بھی گویا کہ یہ تمام سورت سورہ فاتحہ کی تفسیر اور تشریح ہے۔

الٓمّٓ ۝١ ج

اس قسم کے حروف جو سورتوں کے ابتداء میں ذکر کئے جاتے ہیں ان کو "حروفِ مقطّعات" کہتے ہیں اس لیے کہ یہ کلمات حروف تہجی کی طرح جدا جدا پڑھے جاتے ہیں اس لیے مقطعات (جدا جدا) کہلاتے ہیں ان کے بارہ میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔

---

* یعنی ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ ۱۲ منہ۔

① خلفاء راشدین اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ان کی مراد معلوم نہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ :

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ (آل عمران:۷) ترجمہ: "ان متشابہات کی حقیقت سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔"

② بعض سلف اور جمہور متکلمین اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک حروف مقطعات اُن سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں یہ مذکور ہیں جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل مذکور ہیں یہ حروف مقطعات اس تفصیل کا اجمال ہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری کا نام (الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم و سننہ و ایامہ) کتاب موصوف کے تمام مفصل مضامین کا اجمال ہے جس طرح مرکبات کلامیہ کا مفید معنی ہونا ان کے اجزاء یعنی کلمات مفردہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا مفید معنی ہونا حروف ہجائیہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے جس درجہ کلام میں ترکیب ہوگی اسی درجہ معنی میں بھی ترکیب ہوگی یہی وجہ ہے کہ مرکبات اضافیہ اور مرکبات توصیفیہ کے معنی میں اتنی ترتیب نہیں جتنی کہ مرکبات تامہ خبریہ کے معنی یہ ترکیب ہے ترکیب لفظی کے انحطاط سے ترکیب معنوی میں بھی انحطاط آ گیا۔

مرکبات اضافیہ اگرچہ فی حد ذاتہا مرکبات ہیں مگر مرکبات تامہ خبریہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں اور اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے مگر حروف ہجائیہ مادہ کلمات ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے بسیط ہیں پس اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی انتہا درجہ کی بساطت اور غایت درجہ کا اجمال ہوگا۔ جن کا بغیر تفہیم الٰہی اور بدون تائید غیبی کے سمجھنا ناممکن اور محال ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے فوز الکبیر میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کے اسرار اور رموز رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہی حضرات پر منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ خاص طور پر علوم نبوت کے وارث بنائے گئے بلکہ کسی وقت حروف مقطعات خود بخود ان وارثین علوم نبوت کے سامنے اپنے اندرونی اسرار اور اغوامض بولنے لگتے ہیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر سنگریزے تسبیح پڑھتے تھے اور صحابہ کرام اپنے کانوں سے سنگریزوں کی اس تسبیح کو سنتے تھے۔ اور گوہ اور ہرن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرتے تھے باقی ہم جیسوں کا حروف مقطعات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہنا ہرگز اس کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ کہ نفس الامر اور واقع میں یہ حروف معانی اور حقائق سے عاری ہیں۔ (روح المعانی)

حدیث میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظہر ہے اور کو بطن ہے یعنی ظاہری معنی کے علاوہ اس آیت کے کچھ باطنی اور معنوی اسرار اور لطائف بھی ہوتے ہیں جن کو ارباب باطن ہی سمجھتے ہیں اور وہ باطنی اسرار۔ مدلول لفظی کے ماتحت ہوتے ہیں مخالف نہیں ہوتے ہیں بلکہ باطنی اسرار کے حق اور باطل ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ آیت کے ظاہری مدلول کے مطابق ہوں نہ کہ مخالف۔ کیونکہ شرط یہ ہے کہ وہ باطنی معنی ظاہری مدلول کے ماتحت ہوں اور ظاہر ہے کہ ماتحت ہو کر مافوق کا مخالف کیسے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حروف مقطعات ظاہر کے اعتبار سے مجہول الکنہ اور غیر معلوم المراد ہوں اور باطن کے اعتبار سے ارباب باطن کے نزدیک معلوم المراد ہوں۔

③ علامہ زمخشری اور قاضی بیضای فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات۔ حروف تہجی کے اسماء ہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کا مادہ اور عنصر یہی حروف تہجی ہیں۔ انہی سے مل کر کلام بنتا ہے۔ قرآن کریم کی بعض سورتوں کو ان حروف سے شروع کرنے میں اعجاز قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن جس کے کلام الٰہی ہونے کا تم لوگ انکار کرتے ہو وہ انہی حروف سے مرکب ہے جن سے تم اپنے کلام کو ترکیب

دیتے ہو پس اگر یہ قرآن خدا کا کلام نہیں تو تم اس جیسے کلام کے بنانے سے کیوں عاجز ہو پھر اس ذاتی اعجاز کے علاوہ اس پر بھی تو نظر کرو کہ ان مقطعات کا پیش کرنے والا شخص محض امی سے جس نے نہ کبھی کسی مکتب کا دروازہ جھانکا اور نہ کسی استاذ اور کاتب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور تم فصحاء اور بلغاء اور ادباء اور خطباء ہو اور اس نبی امی نے جن حروف کو پیش کیا ہے ان میں ایسے ایسے دقیق اور نکات کی رعایت کی گئی ہے کہ جن کی بڑے سے بڑا ادیب اور ماہر عربیت بھی رعایت نہیں کر سکتا۔

صد ہزاراں دفتر اشعار بود　　پیش حرف امیش آں عار بود

مثلاً یہ کہ قرآن مجید کی انتیس صورتوں میں جو شمار کے اعتبار سے حروف تہجی کے برابر ہیں۔ چودہ حروف لائے گئے ہیں جو حروف تہجی کا نصف ہیں۔ نیز حروف کی تمام اقسام یعنی مہموسہ اور مجہورہ۔ شدیدہ اور رخوہ۔ مطبقہ اور منفتحہ وغیرہ وغیرہ میں سے ہر قسم کے نصف نصف حروف لائے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے کشاف اور بیضاوی کی مراجعت فرمائیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حروفِ مقطعات کی تفسیر میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ اس ناچیز کا گمان یہ ہے کہ یہ تمام اقوال اپنی اپنی جگہ پر سب درست ہیں حروف مقطعات لغت عربیۃ کے اعتبار سے حروف تہجی کے اسماء ہیں۔ جیسا کہ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں اور یہی خلیل بن احمد اور سیبویہ اور دیگر ائمہ عربیت کا مذہب ہے اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے متشابہات اور خداوند ذوالجلال کے مخفی اسرار ہیں جن کے معانی سے عام طور پر لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی اور نہ ان میں اس کی استعداد ہے اس لیے ان پر ایمان لانا لازم ہوا اور ان کی تحقیق اور تفتیش کرنا ممنوع ہوا اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ جب حروف مقطعات کو سر الٰہی مانا گیا تو قرآن مفہوم المعنی نہ رہے گا تو پھر نزول سے کیا فائدہ؟ جواب یہ کہ نزول قرآن کا فائدہ۔ فہم معانی میں منحصر نہیں۔ بلکہ بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جہاں مکلفین سے فقط ایمان لانا مطلوب ہے اسی طرح حروف مقطعات کے نازل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے من جانب اللہ ہونے کا یقین کریں تا کہ بندوں کا کمال انقیاد ظاہر ہو۔

زباں تازہ کردن باقرار تو　　نینگیختن علت ازکار تو

یہ حضرات مفسرین اور محدثین (بکسر الدال) کا مذہب ہے اور حضرات محدثین (بفتح الدال) یعنی جو حضرات محدث من اللہ اور ملہم من اللہ ہیں ان کا مسلک یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کبھی کبھی اپنے مخصوص بندوں کو حروف مقطعات کے معانی اور اسرار سے بذریعہ الہام کے مطلع فرما دیتے ہیں۔ محدثین (بکسر الدال) اور محدثین (بفتح الدال) میں حقیقی نزاع نہیں۔ محض لفظی نزاع ہے۔ محدثین۔ جو علم اور ادراک کی نفی کرتے ہیں وہ عوام کے اعتبار سے ہے اور اس نفی سے بھی علم یقینی کی نفی مراد ہے علم ظنی اور وجدانی کی نفی مراد نہیں اور محدثین (بفتح الدال) جو حروف مقطعات کے معانی کے علم اور ادراک کے قائل ہیں وہ خواص کے لیے قائل ہیں نہ کہ عوام کے لیے اور پھر خواص کو بھی جو علم ہوتا ہے وہ ظنی اور وجدانی ہوتا ہے۔ قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اور عجب نہیں کہ حروف مقطعات عالم غیب میں ذوالوجوہ ہوں کسی پر کوئی معنی اور کسی پر کوئی معنی منکشف ہوں۔ مثلاً کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ حروف مقطعات اسماء الٰہی ہیں اور کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ ایہ اسماء سور ہیں جس کسی نے جو کچھ کہا وہ اپنے مکاشفہ اور مشاہدہ کے لحاظ سے کہا اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم کو عربی زبان میں اتارا عربی زبان کے اعتبار سے حروفِ مقطعات حروف تہجی کے اسماء ہیں۔ سورتوں کے شروع میں طرح طرح کے لطائف اور معارف اور قسم قسم اعجاز کی رعایت کے ساتھ ان کو لایا گیا ہے لہٰذا ائمہ عربیت اور علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی کا یہ قول محدثین اور محدثین کے قول کے ہرگز منافی

اور مخالف نہیں علامہ زمخشری اور بیضاوی کا قول لسانٌ عربیٌ مُّبین کے قواعد پر مبنی ہے اور محدثین (بکسر الدال) کا قول کہ حروف مقطعات متشابہات سے ہیں ظاہر شریعت پر مبنی ہے اور محدثین (بفتح الدال) یعنی اولیاء اللہ اور عارفین کا قول باطن شریعت پر مبنی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ظاہر اور ہر باطن کے لیے کچھ وجوہ ہوتے ہیں کوئی عالم کسی وجہ کو اختیار کرتا ہے اور کوئی کسی وجہ کو ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ واللہ سبحانہ تعالیٰ اَعْلم وعلمہ اتم احکمہ۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

یہی کتاب حقیقت میں کتاب ہے کہ تمام کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ کے متفرق علوم اور مضامین کی جامع ہے اور اسی وجہ سے اس کا اتباع کتب سماویہ کا اتباع ہے اور اس کا انکار تمام کتب الٰہیہ کا انکار ہے کتاب کا اصل مادہ لغت میں جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے اس لیے اس کے مناسب معنی بیان کئے گئے اور ذٰلِکَ اسم اشارہ اس لیے لایا گیا کہ اس طرف اشارہ ہو جائے کہ اس کتاب کے جامعیت محسوس اور مشاہد ہے۔ ارباب معنی تو علوم اور معارف کی روشنی میں اس کی جامعیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اصحاب لفظ۔ فصاحت اور بلاغت کے آئینہ میں اس کی جامعیت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ می دارد　　برنگ اصحاب صورت را بیوار باب معنی را

اور بجائے لفظ ﴿هٰذَا﴾ کے جو اشارہ قریب کے لیے مستعمل ہوتا ہے لفظ ﴿ذٰلِكَ﴾ کا استعمال فرمایا جو اشارہ بعیدہ کے لیے وضع ہوا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی بے مثال جامعیت اور عجیب وغریب حقائق ومعارف اور اسرار وغوامض اور دقائق اور لطائف پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نظر وفکر کی جولانگاہ سے بہت ہی دور اور بلند اور برتر ہے۔ یعنی قرآن اگرچہ باعتبار صورت کے حاضر و قریب ہے مگر اسرار وحقائق کے اعتبار سے ہمارے فہم وادراک سے بہت بعید ہے۔ اس لیے بجائے ﴿هٰذَا﴾ کے ﴿ذٰلِكَ﴾ اسم اشارہ بعید لایا گیا۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ

اور اس کتاب کا کامل اور بے مثال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے تمام مطالب مدلل اور مبرہن ہیں اس میں کسی قسم کے شک اور تردد کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ایسی جامع اور مکمل۔ اور واضح اور مدلل کتاب میں بھی اگر کسی کو کوئی شک اور شبہ پلیش آئے تو وہ اس کے فہم کا قصور ہے اس کتاب میں تو کوئی شبہ نہیں یہ نافہم اپنی نافہمی سے شبہ میں پڑ گیا ہے۔ قرآن کریم کی کوئی بات بھی عقل سلیم کے خلاف نہیں۔

یہ پہلی سورت ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے نازل ہوئی۔ مگر ایک آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ بالاتفاق حجۃ الوادع میں دسویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ میں اتری۔ تبّع کے زمانہ سے یہود نبی آخر الزمان کے انتظار میں مدینہ منورہ آکر آباد ہوئے تھے ان آیات میں انہیں کو خطاب ہے کہ یہ وہی کتاب ہے، جس کی خبر انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں۔ مالک بن صیف یہودی مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالتا تھا کہ یہ وہ کتاب نہیں کہ جس کی خبر اگلی کتابوں میں دی گئی ہے اور اس میں کوئی شک اور شبہ

نہیں۔ علماء بنی اسرائیل میں سے جو حقیقت میں علماء تھے۔ وہ قرآن کو سنتے ہی ایمان لے آئے اور جن کے دل ثمن قلیل اور دارہم معدودہ کی محبت میں گرفتار تھے وہ اس سعادت سے محروم رہے کما قال اللہُ تعالیٰ:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝۱۰۶ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝۱۰۷ۙ وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝۱۰۸ وَ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَ يَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝۱۰۹﴾ (بنی اسرائیل)

ترجمہ: "قرآن کو ہم نے بتفریق نازل کیا تا کہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ پڑھیں اور بتدریج ہم نے اس کو نازل کیا آپ کہہ دیجیے کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ مگر وہ لوگ جن کو اس کے نازل ہونے سے پہلے اس کا علم دیا گیا ان کی حالت تو یہ ہے کہ جب ان پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو ٹھوڑیوں پر سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ بیشک خُدا کا وعدہ (جو اس کتاب کے نازل کرنے کے متعلق تھا) وہ پورا ہو کر رہا اور گریہ وزاری کرتے ہوئے ٹھوڑیوں پر گرتے ہیں اور ان کے خشوع میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

فائدہ ۱: اس روایت سے ذلک اسم اشارہ بعید لانے کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ ذٰلِكَ کا اشارہ اس کتاب کی طرف ہے کہ جس کی انبیاء سابقین خبر دیتے چلے آئے تھے۔ یعنی یہ وہی کتاب ہے جس کی خبر کتب سابقہ میں دی گئی ہے۔

فائدہ ۲: یہ خصوصیت قرآن کریم ہی کی ہے کہ اس کے تمام مضامین عقل سلیم کے مطابق اور سب کے سب یقینی ہیں۔ تقلیدی اور ظنی نہیں کہیں ریب اور تردد کی گنجائش نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کتاب کے مضامین اور مطالب اس درجہ قطعی اور یقینی ہوں کہ اس میں کہیں شک اور شبہ کی گنجائش نہ ہو تو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں کیا شک اور شبہ ہو سکتا ہے توریت اور انجیل کو دیکھیے کہ اصل ہی سے مشکوک ہے تثلیث اور الوہیت مسیح اور کفارہ کے مضامین فقط اس درجہ ہی میں نہیں کہ عقل کو ان میں کوئی شک اور تردد ہو بلکہ عقل قطعاً ان کو لغو اور باطل سمجھتی ہے۔ توریت میں العیاذ باللہ حضرات انبیاء کا بت پرستی کرنا اور جھوٹ بولنا اور العیاذ باللہ حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا مذکور ہے اس کو کون عقل باور کر سکتی ہے۔ وید اور دساتیر میں جا بجا عناصر اور کواکب پرستی کے مضامین مذکور ہیں جن سے عقل نفرت کرتی ہے لنگ اور بھگ (فرج) کی پوجا کا ذکر ہی عقل کے لیے باعث صد عار و ننگ ہے۔ شرک اور بے شرمی کی بھی حد ہوگئی کہ شرمگاہ کو بھی پرستش سے نہ چھوڑا۔

مولانا عبدالحق صاحب حقانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ص ۶۱ ج ۲ گبن جو کہ انگلستان کا بڑا مشہور مورخ اور مقنن ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"محمد کا مذہب شکوک و شبہات سے پاک ہے مکہ کے پیغمبر نے بتوں اور انسانوں اور ستاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا ہے کہ جو شے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ الخ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا۔ الخ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر یقین رکھتا ہو وہ مسلمانوں کے عقائد مذکورہ بالا کو کہہ سکتا ہے کہ وہ عقائد ہمارے ادراک اور قوائے عقلی سے بڑھ کر ہیں وہ اصل کہ جس کی بناء عقل اور وحی پر ہے محمد کی شہادت سے استحکام کو پہنچی انتہیٰ ملخصاً۔ اور سیل باوجود سخت تعصب کے اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ

میں اقرار کرتا ہے کہ تھوڑے سے دنوں میں جو محمد کا دین شرقاً غرباً روئے زمین پر پھیل گیا اس کی وجہ سے تھی کہ اس مذہب کے جملہ امور وہ امور ہیں کہ جن کو عقل بہت جلد تسلیم کرتی ہے جو لوگ تلوار کے زور سے اس دین کا پھیلنا خیال کرتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں۔ انتہیٰ ملخصاً۔"

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ
راہ بتائی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے اور درست کرتے ہیں نماز کو اور
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾
ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں

صفات مؤمنین مخلصین

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یہ کتاب ہدایت ہے متقیوں کے لیے جس درجہ کا تقویٰ ہے اس درجہ کی ہدایت ہے یہ جملہ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ کی دوسری دلیل ہے یعنی کتاب حقیقت میں یہی ہے اس لیے کہ اوّل تو اس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں دوم یہ کہ یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک نور مبین اور مشعل ہدایت ہے جب تک دل میں خدا کا خوف نہ ہو اس وقت تک راہ ہدایت نظر نہیں آتی یا یہ کہو کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کی دلیل ہے یعنی اس جامع کتاب میں اس لیے شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ کتاب تو مشعل ہدایت ہے لوگوں کے شبہات اور توہمات کی ظلمتوں اور تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے اتاری گئی ہے ہر بات اس کی میزان عقل میں تلی ہوئی ہے ہر بیان اس کا شافی اور کافی مدلل اور مبرہن ہے۔ اوہام پرستوں کے لیے سیف قاطع ہے۔ بھلا ایسی کتاب میں کہاں شک اور شبہ کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ چناں چہ قرآن کریم نے چند سال میں جو لوگوں کو ہدایت کی طرف کھینچا توریت انجیل اس کی نظیر تو کیا عشر عشیر بھی نہیں پیش کرسکتی۔ چند ہی روز میں عرب جیسے وحشی ملک کو خدا پرستی کا گہوارہ بنا دیا۔ عرب کے درندے یکلخت شمع نبوت کا پروانہ بن گئے حواریین کے بے وفائی کے خود نصاریٰ معترف ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہود نے تیس درہم رشوت لیکر حضرت مسیحؑ کو گرفتار کرا دیا۔ سورہ فاتحہ میں بندوں کی جانب سے خدا کی حمد وثنا کا ذکر تھا۔ سورہ بقرہ میں اس کے برعکس خدائے عزوجل کی جانب سے عباد متقین کی مدح وثناء کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ۔ خود اپنی رحمت اور فضل سے ایمان اور تقویٰ کی صفت عطا فرمائیں اور پھر خود ہی اس کی توصیف فرماتے ہیں۔ اللّٰھُمَّ لا نحصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك۔

لغت میں تقویٰ کے معنی صیانت اور حفاظت کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں ان چیزوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے ضرر رساں ہوں۔ خواہ از قبیل عقائد و اخلاق ہوں یا از قبیل اقوال و افعال و احوال ہوں۔ اور چوں کہ ضرر کے درجات مختلف ہیں اسی اعتبار سے تقویٰ کے درجات بھی مختلف ہیں۔

پہلا مرتبہ: یہ ہے کہ کفر سے تائب ہو کر اسلام میں داخل ہو اور اپنے کو عذاب دائمی کی مضرت سے بچالے۔ ﴿اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ

التَّقْوٰی﴾ (الفتح:۲۶) میں تقویٰ سے یہی معنی مراد ہیں۔

دوسرا مرتبہ: یہ ہے کہ اپنے نفس کو ارتکاب کبائر اور اصرار علی الصغائر کی مضرت سے محفوظ رکھے کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا﴾ (الاعراف:۹۶) اہل شریعت کی اصطلاح میں جب تقویٰ کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خِلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى

ترجمہ: چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دے۔ یہی تقویٰ ہے۔

وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى

ترجمہ: خدا کی راہ میں اس طرح چل جس طرح کہ خاردار جنگل میں ڈر ڈر کر اور سنبھل سنبھل کر کوئی چلتا ہے۔

لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

ترجمہ: چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھ۔ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے پہاڑ بنتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب سے تقویٰ کی حقیقت دریافت کی تو یہ جواب دیا کہ اے امیر المومنین کیا آپ کبھی کسی پُرخار راستہ سے بھی گزرے ہیں فرمایا کیوں نہیں۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین پھر آپ نے اس وقت کیا کیا۔ فرمایا کہ میں نے دامن چڑھائے بچا بچا کر قدم رکھے کانٹوں سے بچنے کے لیے اپنی تمام جدوجہد کو خرچ کر ڈالا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین یہی تقویٰ ہے یعنی حق جل وعلا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنی پوری ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینے کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (الحجرات:۱۳)

ترجمہ: "یقیناً خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہے۔"

تیسرا مرتبہ: یہ ہے کہ قلب کو ہر اس چیز سے محفوظ کر لیا جائے جو خدا تعالیٰ سے غافل کرتی ہو اور ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران:۱۰۲) (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) اس آیت میں تقویٰ کا یہی مرتبہ مراد ہے۔ خدا کا خوف ہی ہدایت کا مبداء اور ہر قسم کے فوز و فلاح کا سرچشمہ ہے اسی لیے حضرت نوح اور حضرت ہود اور حضرت صالح اور حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی نصیحت فرمائی۔ ﴿اَلَا تَتَّقُوْنَ﴾ کیا تم کو خدا کا خوف نہیں۔ اور ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ﴾ (الشعراء:۱۷۹) "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔ اس لیے کہ بغیر خدا کے خوف کے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی کما قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى﴾ (الاعلیٰ:۱۰) یعنی نصیحت وہی قبول کرلے گا جو خدا سے ڈرتا ہوگا۔

حق جل وعلا نے دوسرے موقعہ پر بجائے یعنی ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (ہدایت ہے انسانوں کے لیے) ارشاد فرمایا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں وہ درحقیقت انسان نہیں انسانیت اور آدمیت کا اقتضاء یہ ہے کہ اپنے خالق اور مالک

---

* یہ قید اس لیے لگائی کہ اگر دنیاوی ذلت وندامت سے ڈر کر معصیت کو چھوڑا تو وہ تقویٰ نہیں خدا کے ڈر سے گناہ کو چھوڑنے کا نام تقویٰ ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ

سے ڈرے اور جو اس احکم الحاکمین سے نہیں ڈرتا وہ انسان نہیں بہائم کے مثل ہے بلکہ بہائم سے بدتر د قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

سفرِ آخرت کے لیے تقویٰ ہی کا توشہ اور تقوے ہی کا لباس کارآمد ہوسکتا ہے کما قال تعالیٰ:

﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾

ترجمہ: "سفر کے لیے توشہ لے لو پس تحقیق سب سے بہتر توشہ تقویٰ ہے۔"

جس طرح بغیر زادِ راہ کے مسافر کا دنیاوی سفر ناممکن ہے۔ اسی طرح بغیر تقویٰ کے توشہ کے آخرت کا سفر ناممکن ہے اور جس طرح ایک معمولی راستہ سے برہنہ اور عریاں گزرنا خلاف حیا اور خلاف شرم ہے اسی طرح اس عظیم الشان شاہراہ سے جو ایک لمحہ کے لیے بھی بے شمار ملائکۃ اللہ سے خالی نہیں رہتی لباس تقویٰ سے برہنہ اور عریاں گزرنا کس طرح بے حیائی اور بے شرمی نہ ہوگا۔ اعاذنا اللہ من ذٰلك. اٰمین.

﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں ایمان بالغیب متقیوں کا خاص شعار ہے یہ کلمہ المتقین کی صفت ہے یا یوں کہو کہ پرہیز گاروں کی تعریف بیان فرماتے ہیں کہ پرہیز گار وہ ہیں جو خدا پر اور خدا کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور عبادت گزار ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں المتقین ہیں تمام بری باتوں کے ترک کی طرف اشارہ تھا۔ اب اُمورِ خیر کا ذکر فرماتے ہیں چوں کہ اجزاء انسانی میں سب سے اعظم اور اشرف جزء قلب ہے۔ اس لیے سب سے پہلے فعل قلب یعنی ایمان کا ذکر فرمایا جو درستی اعتقاد کا نشان ہے اور آئندہ ﴿وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ... الخ﴾ میں اعمال بدینہ کا ذکر فرمایا جو درستی اعمال کی نشانی ہیں۔

ایمان اور کفر کی تعریف

لغت میں ایمان کے معنی تصدیق اور تسلیم کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں۔ ایمان اس کو کہتے ہیں کہ جو چیز۔ اللہ کا نبی۔ اللہ کی طرف سے لیکر آئے نبی کے اعتماد اور بھروسہ پر دل سے اس کی تصدیق کرنا یعنی دل سے اس کو سچا جاننا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا یہ تو ایمان ہے اور دین کی کسی ایک چیز کا نہ ماننا اور انکار کرنا کفر ہے۔

تشریحات

① تصدیق قلبی سے محض علم اور معرفت مراد نہیں۔ تصدیق اور چیز ہے اور علم اور معرفت اور چیز ہے اور علم کے معنی جاننے کے ہیں۔ اور معرفت کے معنی پہچاننے کے ہیں اور تصدیق کے معنی ماننے کے ہیں اور ایمان نام ماننے کا ہے۔ جاننے کا نام ایمان نہیں۔ کفار مکہ دلائل نبوت کو دیکھ کر جانتے تھے کہ آپ نبی ہیں اور علماء یہود آپ کو خوب پہچانتے تھے کہ یہ وہی نبی اخر الزمان ہیں جن کی انبیاء کرام علیہم السلام بشارت دیتے چلے آئے آپ کی جو علامتیں توریت اور انجیل میں تھیں وہ تمام علامتیں اپنی آنکھوں سے آپ میں دیکھتے تھے۔

﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ ترجمہ: "یہود اپنے بیٹوں کی طرح حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہچانتے تھے۔"

مگر مانتے نہ تھے اس لیے ایمان سے بے بہرہ تھے۔ ایمان محض جاننے اور پہچاننے کا نام نہیں بلکہ اپنے اختیار اور ارادہ اور رضاء و رغبت سے ماننے کا نام ایمان ہے۔ وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴾ (النمل: ۱۴)

ترجمہ: "آپ کی نبوت کا محض تکبر کی وجہ سے انکار کرتے ہیں مگر دل ان کے یقین کئے ہوئے ہیں۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ محض علم اور ایقان۔ ایمان کی حقیقت نہیں بلکہ ایمان کی حقیقت تسلیم اور اذعان ہے یا بالفاظ دیگر۔ ایمان جاننے اور پہچاننے اور یقین کرنے کا نام نہیں بلکہ ماننے کا نام ایمان ہے۔

② ایمان کی تعریف میں نبیؐ کے بھروسہ اور اعتماد کی قید اس لیے لگائی گئی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ کی باتیں محض نبی ﷺ کے کہنے سے اور محض نبی ﷺ کے اعتماد اور بھروسہ پر مانے مثلاً کوئی شخص توحید اور رسالت دونوں کا اقرار کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ میں توحید خداوندی کا فلاسفر کی طرح محض دلائل عقلیہ کے بنا پر قائل ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے کہنے سے توحید کا قائل نہیں تو ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں اس کی توحید فلاسفۂ یونان کی توحید ہے اہل ایمان کی توحید نہیں جیسا کہ عارف جامی شواہد النبوت کے پہلے ہی صفحہ میں حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

تحسین رکن از ارکان اسلام اقرار بکلمہ شہادت است وحقیقت ایمان تصدیق بمضمون آں وآں مشتمل بر دو امر است یکے اقرار بوحدانیت حق سبحانہ تعالیٰ وگرویدن ب آں و دوم اقرار نبوت ورسالت محمد ﷺ وگرویدن ب آں۔ وامر اول وقتے معتبر است کہ مقتبس از مشکوۃ نبوت باشد اگر بمجرد دلائل عقلی اکتفاء کند چوں فلاسفہ واز مشکوۃ نبوت نگیرد مفید نجات نیست' انتہیٰ کلامہ۔

③ دین کی باتوں کا ماننا وہی معتبر ہے کہ جب ان کو اسی طرح مانا جائے کہ جس طرح اور جس ہیئت سے انکارِ دین ہونا ثابت ہوا ہے۔ مثلاً کوئی شخص نماز کا شعار اسلام اور فریضہ دین ہونا تو تسلیم کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ صلوۃ سے مطلق دعاء اور خشوع وخضوع مراد ہے اور نماز کی فرضیت بہ ہیئت مخصوصہ یعنی بطریق قیام وقعود اور رکوع وسجود۔ تسلیم نہیں کرتا تو ایسا شخص قطعاً دائرہ ایمان سے خارج ہے یا مثلاً زکوۃ کی فرضیت کو تسلیم کرے مگر یہ کہے کہ زکوۃ سے محض تزکیہ اور تطہیر مراد ہے یہ خاص نصاب اور مال کی خاص مقدار ضروری نہیں تو ایسا شخص مومن نہیں۔ ملحد اور زندیق ہے۔ اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو شریعت کے الفاظ کو بحال اور برقرار رکھے اور اس کی حقیقت کو بدل دے یہ ایمان نہیں بلکہ دین کا تمسخر اور مذاق ہے اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ﴾

ترجمہ: "اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ یہ لوگ یعنی صحابہ ایمان لائے۔"

اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان میں وہی تصدیق اور اذعان معتبر ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قبول اور تسلیم اور ان کے تصدیق اور اذعان کے ہم رنگ ہو۔ یہ نہیں کہ نام تو وہی ہوا اور حقیقت کچھ اور ہو۔

④ اصل ایمان تو تصدیق قلبی ہے اور زبانی اقرار حقیقتِ ایمان کی حکایت ہے اگر حکایت محکی عنہ کے مطابق ہے تو فبہا۔ ورنہ سوائے مکر و فریب کے کوئی شے نہیں۔ محض ایک جھوٹ ہے جو صدق اور راستی کے لباس میں نمودار ہے۔

⑤ حضرات متکلمین فرماتے ہیں کہ ایمان کی اصل حقیقت تو تصدیق قلبی ہے اور اقرار لسانی۔ دینوی احکام کے جاری کرنے کے لیے شرط ہے کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے بغیر زبان کے دل کا حال کیسے معلوم ہو تصدیق قلبی چوں کہ ایک پوشیدہ چیز ہے ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا اس لیے بطور علامت اقرار لسانی اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ ظاہری احکام جاری ہو سکیں ورنہ اگر کوئی شخص گونگا ہو یا

کسی کے اکراہ اور زبردستی سے محض زبان سے کلمۂ کفر کہے اور دل میں تصدیق موجود ہو تو کافر نہیں یا تصدیق قلبی کے بعد مرجائے اور زبانی اقرار کی نوبت نہ آئے تو اس کے ایمان میں کوئی خلل نہیں۔

حضرات محدثین اگرچہ اقرار باللسان اور عمل بالارکان کو جزءِ ایمان قرار دیتے ہیں لیکن ایمان کی اصل اور جڑ تصدیق قلبی ہی کو بتاتے ہیں اور یہ تصریح فرماتے ہیں کہ ایمان بغیر عمل صالح کے ناقص ہے کفر نہیں۔ حضرات متکلمین اور حضرات محدثین میں محض صوری نزاع ہے حقیقی اور معنوی نزاع نہیں۔

امام غزالی قدس اللہ سرہٗ ''فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ'' میں ایمان اور کفر کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

اَلْکُفْرُ ھُوَ تَکْذِیْبُ الرَّسُوْلِ ﷺ فِیْ شَیْءٍ مِمَّا جَآءَ بِہٖ وَالْاِیْمَانُ تَصْدِیْقُہٗ فِیْ جَمِیْعِ مَا جَآءَ بِہٖ.

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی بھی تکذیب کر دینے کا نام کفر ہے اور تمام اُمور میں آپ ﷺ کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔''

امام غزالی قدس سرہٗ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے لیے فقط ایک دو امر کی تصدیق کافی نہیں۔ تمام اُمور میں رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ ہاں کفر میں تمام اُمور کی تکذیب ضروری نہیں۔ ایک شے میں بھی رسول ﷺ کی تکذیب کفر ہے۔

مسئلہ تکفیرِ اہل قبلہ

یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں اہل ایمان اور اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام متواترات اور ضروریات دین پر ایمان رکھتے ہوں گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ فقط قبلہ کی طرف نماز پڑھنے سے اہل ایمان اور اہل قبلہ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک رسول کی تمام باتوں کی تصدیق نہ کرے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَ الْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ﴾

ترجمہ: ''نیکی اور بھلائی اس میں منحصر نہیں کہ فقط تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی جانب پھیر لو لیکن نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر اور تمام فرشتوں پر اور اللہ کی ہر کتاب پر اور تمام پیغمبروں پر۔''

الحاصل اصطلاح شریعت میں اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام ضروریات دین کی تصدیق کرتے ہوں اور کسی امر دینی کے مُکَذِّب اور منکر نہ ہوں اور ضروریات دین سے وہ امور مراد ہیں کہ جو شریعت میں ایسے معلوم اور مشہور ہوں کہ خواص و عوام سب ان کو جانتے اور پہچانتے ہوں۔ جیسے توحید اور رسالت اور جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک امر کا بھی انکار کر دے کہ جس کا دین سے ہونا قطعی اور بدیہی طور سے ثابت ہے تو وہ شخص قطعاً دائرۂ ایمان اور زمرۂ اہل قبلہ سے خارج ہے اگرچہ وہ شخص قبلہ رو ہو کر دن میں پچاس نمازیں ادا کرتا ہو۔ قال تعالیٰ:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵﴾

ترجمہ: "کیا تم لوگ کتابِ الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ ایسے شخص کی جزاء سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دنیا میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ محض بعض احکام کو مان لینا کافی نہیں جب تک تمام احکام کی تصدیق نہ کرے۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۸۶ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝۸۷ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸﴾

ترجمہ: "ایسے ہی لوگوں نے حیات دُنیا وی کو اخروی حیات کے بدلہ میں خرید لیا ہے۔ پس ان پر سے نہ عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی اور البتہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو کھلے ہوئے نشانات دیئے اور روح القدس (علیہ السلام) سے ان کی تائید کی تو پھر کیا تم ایسے ہو گئے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس تمہاری خواہشات کے خلاف کچھ لیکر آیا تو تم نے سرکشی کی۔ پھر کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ نہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں جس خاص کفر پر لعنت فرمائی ہے وہ یہی کفر ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام من جانب اللہ ایسی چیز لے کر آئے جو نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو یہود بے بہبود نے اس کے ماننے سے سرکشی کی اور حضرات انبیاء کی تکذیب کی۔

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ فلاسفہ یونان جو سماوات وکواکب کے فنا وفساد کے قائل نہیں وہ قطعاً کافر ہیں۔ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسائل میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ نصوص، قطعیہ اور اجماعِ انبیاء کرام علیہم السلام کے منکر ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲﴾ (تکویر) * وَقَالَ تَعَالٰی: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝۱﴾ (انشقاق) * وَقَالَ تَعَالٰی: ﴿وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝۱۹﴾ (النباء) * مجدد صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

نمید انند کہ مجرد تفوہ بکلمۂ شہادت در اسلام کافی نیست تصدیق جمیع ما علم مجیئہٗ من الدین بالضرورۃ باید (مکتوبات ص ۳۲۳ ج ۱)

ترجمہ: "نہیں جانتے کہ محض کلمہ شہادت پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ان تمام امور کی تصدیق ضروری اور لازمی ہے کہ جن کا دین سے ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو گیا ہو۔"

---

* یعنی جب سورج بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔ * جب آسمان پھٹ جائے گا۔
* اور آسمان کھل جائے گا تو اس میں دروازے ہو جائیں گے۔

البتہ جو امور ظنی طور ثابت ہوئے ہوں ان کی تصدیق جزء ایمان نہیں اور نہ انکار کفر کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔ ہاں جو امور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں اور تواتر کے درجہ کو نہ پہنچے ہوں ان کے انکار سے اگرچہ کفر لازم نہیں لیکن گمراہی یقیناً ہے اور کفر کا اندیشہ ہے اور یہ گمراہی کا حکم بھی اس شخص کے لیے ہے جو کسی ایسے خاص امر کا انکار کردے جو خبر واحد سے ثابت ہوا ہو اور جو شخص سرے ہی سے حدیث کا منکر ہو اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال وافعال کو حجت نہ سمجھتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے اور جو اس کے کفر میں شبہ کرے وہ بھی کافر ہے۔

کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ (النساء)

ترجمہ: "تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعضوں کو مانتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ نکالیں۔ ایسے لوگ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور کسی میں فرق نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور انکا ثواب عطا کریں گے اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول کے درمیان تفریق کرنا اللہ کے کلام کو حجت سمجھنا اور پیغمبر کی حدیث کو حجت نہ سمجھنا قطعاً کفر ہے اور جو شخص ایسا عقیدہ رکھے وہ پکا کافر ہے۔ وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝﴾ (النساء)

ترجمہ: "قسم ہے تیرے پروردگار کی لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو آپس کے جھگڑوں میں حکم اور منصف نہ بنائیں۔ اور پھر آپ کے فیصلہ کے بعد ذرہ برابر قلب میں کوئی انقباض نہ پائیں اور برضا ورغبت آپ کے فیصلہ کو اچھی طرح تسلیم کرلیں۔

معلوم ہوا کہ ایمان محض اقرار کرنے کا نام نہیں بلکہ شرط یہ ہے کہ پیغمبر کے حکم اور فیصلہ پر دل وجان سے راضی ہو اور بہزار رضا ورغبت اس کو تسلیم کرے۔ اور اگر کسی ایک بات کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کردے تو قطعاً کافر ہے۔ کفر کے لیے یہی ضروری نہیں کہ توحید ورسالت ہی کا انکار کرے جب ہی کافر ہو۔ جو حکم بھی دین کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی طور سے ثابت ہوا ہو اس کا انکار کفر ہے۔ مثلاً جس شے کی حلت یا حرمت نص قرآنی یا حدیث متواتر سے ثابت ہو۔ جیسے زنا اور لواطت اس کا انکار بھی۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ (التوبہ:۲۹)

ترجمہ: "ان لوگوں سے ضرور جہاد وقتال کرو جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور نہ حرام سمجھتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔"

ایمان کے لیے کفر سے برأت اور بیزاری شرط ہے

امام ربّانی شیخ مجدّد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ ونفعنا بعلومہٖ وبرکاتہٖ۔ آمین۔ اپنے ایک طویل مکتوب میں جو عقائد اسلامیہ کی تحقیق میں قلم مبارک سے نکلا ہے فرماتے ہیں:

ایمان عبارت از تصدیق قلبی است آنچہ از دین بطریق ضرورت وتواتر بما رسیدہ است واقرار لسانی نیز رکن ایمان گفتہ اند کہ احتمال سقوط وارد وعلامت ایں تصدیق تبرّی است از کفر وبیزاری از کافری وآنچہ در کافر یست از خصائص ولوازم آن ہمچنا بستن زنار ومثل آن واگر عیاذا باللہ سبحانہٗ بادعوائے ایں تصدیق تبرا از کفر ننماید مصدیق دینین است کہ بداغ ارتداد متسم است وفی الحقیقت حکم منافق است لا الیٰ ہٰؤلاءِ ولا الیٰ ہٰؤلاءِ پس در تحقیق ایمان از تبرّی کفر چارہ نبود وادنائے آں۔ تبرّی قلبی است واعلائے آں تبری قلبی وقالبی۔ وتبرّی عبارت از دشمنی است بادشمنانِ حق جل وعلا، آں دشمنی خواہ بقلب بود اگر خوفِ ضررِ ایشاں داشتہ باشد وخواہ بقلب وقالب ہر دو در وقت عدمِ آں خوف وآیتِ کریمہ ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ﴾ مؤید ایں معنیٰ است چہ محبت خدائے عزوجل ومحبت رسول او علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰت والتسلیمات۔ بے دشمنی دشمناں صورت نہ بندد

ع تولیٰ بے تبرا نیست ممکن

ایں جا صادق است حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ایں ہمہ بزرگی کہ یافت وشجرۂ انبیاء گشت بواسطہ تبری از دشمنان او تعالیٰ بودہ۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ﴾ (الممتحنہ:۴) (مکتوبات ص ۳۲۵ دفتر اول مکتوب نمبر ۲۶۶)

ترجمہ: "ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل سے ان چیزوں کی تصدیق کی جائے جو دین سے بطرق بداہت اور تواتر ہم تک پہنچی ہیں۔ علماء نے اقرار لسانی کو بھی ایمان کا جزء اور رکن کہا ہے مگر یہ ایسا رکن ہے کہ بعض حالات میں مثلاً اجبار اور اکراہ کی حالت میں ساقط ہو جاتا ہے اور اس تصدیق کی علامت یہ ہے کہ کفر اور کافری اور کفر کے تمام خصائص ولوازم جیسے زنار باندھنا ان سب سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرے اور اگر کوئی شخص باوجود دعویٰ ایمان کے معاذ اللہ کفر سے تبری اور بیزاری نہ ظاہر کرے تو وہ دو متضاد دینوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو داغ ارتداد سے داغی ہے اور درحقیقت ایسا شخص منافق کے حکم میں ہے نہ ادھر نہ اُدھر۔ پس ایمان کے ثابت کرنے کے لیے کفر سے تبری اور بیزاری ضروری اور لابدی ہے جس کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ کم از کم دل سے بیزار ہو اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ قلب اور قالب یعنی زبان اور قلب اور ظاہر اور باطن دونوں سے کفر سے تبری اور بیزاری ظاہر کرے اور تبری کے معنے یہ ہیں کہ خدا کے دشمنوں سے دشمنی رکھے خواہ فقط دل سے ہو اگر اظہار میں ضرر کا اندیشہ ہو اور خواہ زبان اور دل دونوں سے اس دشمنی کا اظہار ہو اگر کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو اور یہ آیت ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ﴾ (التحریم:۹) ❶

---

❶ یعنی اے نبی کفار ومنافقین سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے۔

اسی معنی کی مؤید ہے اس لیے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے دشمنوں سے دشمنی اور عداوت نہ ہو (ع تولیٰ بے تبرا نیست ممکن) دوستی اور محبت بغیر دشمنوں سے بیزاری کے ممکن نہیں۔ یہ مقولہ ایسے ہی موقع پر صادق آتا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ جو کچھ بزرگی پائی اور شجرۂ انبیاء ہوئے یہ سب حق تعالیٰ کے دشمنوں سے تبری اور بیزاری ہی کی وجہ سے ان کو حاصل ہوئی۔ چناں چہ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں۔ اے ایمان والو تحقیق تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں میں اسوۂ حسنہ ہے جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے یہ کہہ دیا کہ ہم بالکل بری اور بیزار ہیں تم سے اور ان تمام چیزوں سے جن کی تم سوائے خدا کے پرستش کرتے ہو۔ ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی ہم اللہ کے مومن اور تمہارے کافر ہیں اور ظاہر ہوئی ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لیے یہاں تک کہ ایمان لاؤ تم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر۔

یہ آیتیں سورۂ ممتحنہ کی ہیں۔ بظاہر یہ سورت اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے نازل ہوئی جیسا کہ اس کے شان نزول سے ظاہر ہے۔ تفصیل کے لیے اس سورۃ کی تفسیر مطالعہ کریں۔ وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ﴾ (النساء:۶۰)

ترجمہ: "کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو زبان سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئی مگر باوجود اس دعوے کے حالت یہ ہے کہ اپنا مقدمہ شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو اللہ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ شیطان کو ہرگز نہ مانیں۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کے بعد طاغوت کیساتھ کفر اور اس کی تکذیب بھی ضروری اور لازم ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سوتے ہوئے بیدار ہو جائے اگر وہ دس بار بسم اللہ اور دس بار سبحان اللہ اور دس بار اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَکَفَرْتُ بِالطَّاغُوْتِ (تصدیق کی میں نے اللہ کی اور تکذیب کی میں نے طاغوت یعنی شیطان کی) پڑھے تو وہ ہر خوف ناک چیز سے محفوظ رہے گا۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر رضی اللہ عنہما (حصن حصین ص ۶۷)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منشاء نبوی یہ ہے کہ خدائے عزوجل کی تصدیق اور اس کے دشمنوں کی دشمنی اور براءت اور بیزاری قلب میں اس درجہ راسخ ہو جائے کہ غفلت کے وقت میں بھی اس سے ذھول اور غفلت نہ ہو۔ وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ﴾ (مؤمن: ۸۴، ۸۵)

ترجمہ: "پس جب ہمارے قہر کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ پر اور اس چیز کے منکر ہوئے جس کو خدا کے ساتھ شریک گردانتے تھے۔ پس یہ ایمان ان کو نفع بخش نہ ہوا کہ ہمارے قہر کو دیکھ کر ایمان لائے۔"

معلوم ہوا کہ اگر مشاہدۂ عذاب سے پہلے شرک اور مشرکین سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرتے تو مفید اور نافع ہوتا۔ ناظرین غور کریں کہ کافروں نے مشاہدۂ عذاب کے وقت فقط ایمان پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ ایمان کے ساتھ خدا کے دشمنوں کی تکذیب اور ان سے

تبری اور بیزاری کو بھی ظاہر کیا۔ معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ کفر اور کافری سے تبری اور بیزاری بھی ضروری ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآنِ کریم میں جا بجا مہاجرین کی جو مدح اور ثناء فرمائی ہے وہ بھی اس تبری اور کفر سے بیزاری کی بدولت ہے کہ اللہ اور اس ۔کے رسولؐ کی محبت میں کفر سے اس قدر بیزار ہوئے کہ اپنے وطن مالوف اور آباؤ وابنائ، بیوی اور بچے، خویش اور اقارب، دوست احباب سب ہی کو چھوڑ دیا۔ اور علیٰ ہٰذا اصحاب کہف کا سوائے ہجرت اور اعتزال عن الکفار کے کوئی اور عمل ایسا نمایاں نہیں کہ اس کی جانب اس منقبت کبریٰ کو منسوب کیا جا سکے۔ اصحاب کہف کو یہ تمام درجات وفضائل صرف دشمنانِ حق سے ہجرت کی بدولت حاصل ہوئے۔

غلبۂ اعداء اور ہجوم دشمن کے وقت سپاہیوں کی معمولی نقل وحرکت بھی بہت وقعت رکھتی ہے بخلاف زمانہ امن وسکون کے کہ اس وقت کی غیر معمولی نقل وحرکت بھی کسی شمار میں نہیں۔ زمانہء جنگ میں معمولی وفاداری کا اظہار بھی حکومت کی نظر میں غیر معمولی شمار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عنفوان شباب کی عبادت زمانہ پیری کی عبادت سے ہزار درجہ افضل اور بہتر ہے اس لیے کہ زمانہء شباب میں اعداء دین یعنی نفسِ امارہ اور شیطان لعین کا غلبہ اور ہجوم ہوتا ہے۔ شیاطین اور شہوات کا لشکر ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ دشمنان دین کے مقابلہ ہی کہ وجہ سے زمانۂ شباب کی عبادت پر قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ دینے کا وعدہ آیا ہے۔

ایمان کی صورت اور اُس کی حقیقت

حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ایمان کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان کی صورت ہے اور اطمینانِ نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا یہ ایمان کی حقیقت ہے۔ اطمینان نفس سے مراد یہ ہے کہ مقتضائے شریعت، مقتضائے طبیعت بن جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُ کُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ)).

ترجمہ: "تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی طبعی خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔"

اس حدیث میں ایمان سے یہی اطمینان نفس مراد ہے یعنی نفس اس درجہ مطمئن ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسول کا ہر حکم اس کو لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت اور نافرمانی کا ادنیٰ سا خیال اور معمولی سا وسوسہ بھی آگ میں جلنے سے بدرجہا زائد اس پر شاق وگراں ہو۔ ایمان کی اس کیفیت اور حالت کو نبی کریم ﷺ نے ((ذاك صریح الایمان)) "یہی کھلا ہوا ایمان ہے" فرمایا ہے۔

حاشا وکلا نبی کریم ﷺ کی ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ معصیت کا وسوسہ صریح ایمان ہے ورنہ ہم نالائقوں کے ایمان کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان سے زیادہ صریح اور جلی ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ ہمارے نفوس تو ہر وقت وساوس کی جولان گاہ بنے رہتے ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب قلب * میں کفر اور فسوق اور عصیان کی کراہت اور ناگواری اس درجہ راسخ ہو جائے کہ معصیت کا وسوسہ اور خیال بھی اس قدر

---

* اشارۃً الی قولہ تعالیٰ: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴾ (فائدہ) عجب نہیں کہ خلفائے راشدین اس معنی کی بناء پر کہا جاتا ہو۔ فافهم واستقم.

شاق اور گراں ہو کہ آگ میں جلنا اس سے آسان معلوم ہوتا ہو تو اس کیفیت اور حالت کو نبی کریم ﷺ نے صریح ایمان فرمایا۔

اور علیٰ ہذا نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد مبارک ((اذا زنی العبد خرج منه الایمان)) (بندہ جب زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے) اس حدیث میں ایمان سے اسی یقین اور اطمینان کا زائل ہونا مراد ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ کے اس ارشاد میں ﴿یٰۤاَیَّتُهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا﴾ (اے ایمان والو! ایمان لاؤ) ایمان اوّل سے تصدیق قلبی مراد ہے اور دوسرے ایمان سے ایمان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا مراد ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ ۔﴿یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝﴾ (الفجر) ❁

حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایمان بمعنی اطمینان نفس کو مدار نجات نہیں قرار دیا بلکہ اپنی بے پایاں رحمت سے ایمان کی صورت یعنی تصدیق اور اقرار لسانی ہی کو قبول فرما کر عذاب جہنم سے نجات اور دخول بہشت کا وعدہ فرمایا۔ ہاں تقرب اور وصول الی اللہ کا مرتبہ بغیر اطمینان نفس اور یقینِ کامل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایمان صوری اور ظاہری اگرچہ ایمان حقیقی کے لحاظ سے بہت معمولی اور ادنیٰ شئ ہے مگر کفر اور شرک کے اعتبار سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

اسی وجہ سے حدیث میں ہے ((مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ اَنْ زَنٰی وَ اَنْ سَرَقَ)) "جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا اگرچہ زنا اور چوری کرے۔ معاذ اللہ

اس حدیث سے زنا اور سرقہ کی اجازت مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے اے لوگو! تم کسی طرح لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ کر کفر اور شرک کے دائرہ سے نکل آؤ۔ زنا اور سرقہ اگرچہ فی حد ذاتہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں مگر کفر اور شرک کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ بخار اور زکام اگرچہ فی حد ذاتہ مرض اور بیماری ہے۔ مگر سل اور جذام کے مقابلہ میں عافیت ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے جس جگہ بخار کی طرح زنا اور سرقہ کا مرض ہونا بیان فرمایا وہاں یہ ارشاد فرمایا: ((لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن)) ❁ اور ((اذا زنی العبد خرج منه الایمان)) ❁ اور جس جگہ زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے لحاظ سے ذکر فرمایا وہاں یہ ارشاد فرمایا: ((من قال اللہ اِلَّا اللہ دخل الجنة وان زنیٰ وان سرق)). یعنی زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے ساتھ وہی نسبت ہے جو بخار اور زکام کو سل اور جذام کے ساتھ ہے۔

ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے نبی کریم ﷺ کے حالات دریافت کیے تو اس میں یہ بھی دریافت کیا کہ کوئی شخص آپ پر ایمان لانے کے بعد آپ کے دین سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا نہیں۔ اس پر ہرقل نے کہا:

وکذلك الایمان حین تخالط بشاشته القلوب.

ترجمہ: "ایمان کی یہی خاصیت ہے کہ جب اس کی مسرت دلوں میں رچ جاتی ہے تو وہ پھر کسی طرح نکل نہیں سکتی۔"

اس جگہ بشاشت سے وہی اطمینان نفس اور انشراح صدر مراد ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ یہی حقیقی ایمان ہے کہ جس کے بعد مرتد ہونا ناممکن ہے۔ چناں چہ حضرات صوفیہ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا رَجَعَ مَنْ رَّجَعَ مِنَ الطَّرِیْقِ. جزایں نیست کہ جو شخص واپس ہوتا ہے وہ راستہ ہی سے واپس ہوتا ہے۔ منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد واپسی ناممکن ہے اور اس دعاء ماثورہ ((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْۤ اَسْئَلُكَ اِیْمَاناً لَّا یَرْتَدُّ))

❁ اے نفس مطمئن تو اپنے خدا کی طرف لوٹ جا کہ تو خدا سے راضی اور خدا تجھ سے راضی۔

❁ حالت ایمان میں زانی زنا نہیں کرتا۔ ❁ جب بندہ نے زنا کیا تو اس سے ایمان نکل گیا۔

(اے اللہ تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں کہ جس کے بعد ارتداد نہ ہو سکے) میں اسی ایمان کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ ایمان صوری کے بعد مرتد ہونا ممکن ہے۔ وہ ایمان جس کے بعد ارتداد ناممکن ہو وہ یہی ایمان ہے کہ جس سے نفس مطمئن ہو جائے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّآ نَسْئَالُكَ اِیْمَاناً لَّا یَرْ تَدُّ وَیَقِیْنًا لَیْسَ بَعْدَہٗ کُفْرٌ . اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ.

ایمان کے وجودی مراتب

علامہ نیسابوری تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں ہ ایمان کے تین وجود ہیں۔ ایک وجود عینی دوسرا وجود ذہنی تیسرا وجود لسانی۔ اصل ایمان وجود عینی یعنی وجود خارجی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب بندہ اور خُدا تعالیٰ کے درمیان حجابات مرتفع ہو جائیں تو اس وقت مومن کے دل میں ایک نور حاصل ہوتا ہے۔ یہی نور، ایمان کا وجود عینی ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ دوست ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔"

جب کوئی جدید حجاب مرتفع ہوتا ہے اتنا ہی یہ نور کامل اور قوی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے متعلق اس کو شرح صدر ہو جاتا ہے اور نبی کریم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا صدق اس کے نزدیک آفتاب سے زیادہ روشن اور جلی ہو جاتا ہے۔ وقال تعالیٰ:

﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ (الزمر:۲۲)

ترجمہ: "جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک نور پر ہے۔"

اور یہی نور قیامت کے دن پل صراط پر اہل ایمان کی رہنمائی کرے گا۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ ﴾ (التحریم:۸)

ترجمہ: "ان کا نور سامنے اور دائیں جانب دوڑتا ہوگا۔"

ایمان کا نور علی نور ہونا اہل ایمان قیامت کے دن آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اور جو شخص دنیا میں نور ایمان سے محروم رہا وہ قیامت کے دن بھی نورِ ایمان سے محروم رہے گا۔

﴿ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ (النور:۴۰)

ترجمہ: "جسے اللہ نے نور نہیں دیا پھر اس کے لیے کہیں نور نہیں۔"

قیامت کے دن تو سب ہی کو ایمان کا نور ہونا معلوم ہو جائے گا لیکن اس دارِ دنیا میں بھی جب کبھی کسی عارف اور صاحب بصیرت کو رویائے صالحہ یا کشف سے ایمان مکشوف ہوا تو وہ نور ہی کی شکل میں منکشف ہوا۔

اور اس نور کا مطالعہ اور تصوّر یہی ایمان کا وجود ذہنی ہے اور زبان سے توحید و رسالت کا اقرار یہ ایمان کا وجود لسانی ہے یاد رکھنا چاہیئے کہ ایمان کا محض لسانی وجود بغیر نور کے مفید اور کارآمد نہیں جیسا کہ پیاسے کے لیے آبِ زلال کا فقط تلفظ اور تصور کافی نہیں۔ جب تک کہ اس سے سیراب نہ ہو۔

اَللّٰھُمَّ اشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلْاِسْلَامِ وَنَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِنُوْرِ طَاعَتِكَ اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ.

بِالْغَيْبِ

یعنی جو چیزیں ان کی عقل اور حواس سے پوشیدہ ہیں جیسے جنت اور جہنم اور ملائکہ وغیرہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے فرمانے سے ان سب چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور ان کو حق جانتے ہیں اور جو لوگ ان اُمور غیبیہ کے منکر ہیں وہ سراسر ایمان اور ہدایت سے محروم ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے شاعر نے کہا ہے۔

چو آں کرمے کہ در سنگے نہان است * زمین و آسمان او ہماں است

اور ایمان بالغیب کو تقویٰ کی علامت اس لیے قرار دیا کہ محسوسات کی تصدیق ایمان اور تقویٰ کی علامت نہیں اس لیے کہ جو چیز ظاہری یا باطنی حواس سے محسوس اور مدرک ہو اس کی تصدیق اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے اور شرعاً وہی تصدیق معتبر ہے جو ارادہ اور اختیار سے ہو۔

غیب سے کیا مراد ہے؟

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ بظاہر غیب سے وہ امور مراد ہیں جن کا ذکر حدیث جبریل میں آیا ہے۔ ① اللہ تعالیٰ ② ملائکہ ③ کتب الٰہیہ ④ رُسل ⑤ یوم آخرت ⑥ قضا وقدر۔ ایمان بالغیب سے ان چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے۔ کتاب اور رسول اگرچہ ظاہر کے لحاظ سے محسوس ہیں غیب نہیں لیکن کتاب کا منزل من اللہ ہونا اور پیغمبر کا مرسل من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونا ایک غیبی امر ہے اس اعتبار سے کتب اور رسل بھی ضرور غیب میں داخل سمجھے جائیں گے اور صحابۂ کرام کا رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ایمان بالغیب ہی کہلائیگا۔ اس لیے کہ رسول کی ذات اگرچہ محسوس اور مشاہد ہے۔ مگر وصفِ رسالت اور فرستادۂ خدا ہونا یقیناً غیب ہے۔ یہ کسی نے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور ایمان کا اصل تعلق اسی وصف رسالت کے ساتھ ہے۔

بعض اہل علم نے غیب اور غائب میں فرق بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ:

اَلْغَائِبُ مَا لَا يَرَاكَ وَ لَا تَرَاهُ وَالْغَيْبُ مَا لَا تَرَاهُ اَنْتَ.

ترجمہ: "غائب تو وہ ہے کہ نہ وہ تجھ کو دیکھے اور نہ تو اس کو دیکھے اور غیب وہ ہے کہ تو اس کو نہ دیکھتا ہو اگرچہ وہ تجھ کو دیکھتا ہو۔"

اسی وجہ سے حق تعالیٰ پر غیب کا اطلاق درست ہے غائب کا اطلاق درست نہیں۔ اس لیے کہ وہ ہر شے کو دیکھتا ہے کوئی شے اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

لطیفہ:

بعض شیعہ کہتے ہیں کہ بالغیب سے مہدی موعود اور امام غائب مراد ہیں جن کا شیعہ انتظار کر رہے ہیں۔ واہ واہ

---

* اس کیڑے کی مانند جو پتھر میں پوشیدہ ہے اور وہی اس کا زمین و آسمان ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

اور قائم اور درست رکھتے ہیں نماز کو یعنی خشوع اور خضوع اور تمام آداب کے ساتھ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔

سورۂ لقمان میں ہے:

﴿هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ (لقمان: ۳)

ترجمہ: "ہدایت اور رحمت ہے ان نیکی کرنے والوں کے لیے جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔"

اس آیت میں ﴿الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ کو المحسنین کی صفت گردانا ہے اور غالباً جبرئیل امین نے نبی اکرم ﷺ سے ما الاحسان (احسان کیا چیز ہے) کہہ کر اسی احسان کی حقیقت دریافت کی ہے جو آیت موصوفہ میں مذکور ہے جس کا جواب نبی اکرم ﷺ نے بدیں الفاظ ارشاد فرمایا کہ:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))

ترجمہ: "یعنی نماز اور عبادت کا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہی خیال رکھ کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ تعظیم کا دارومدار تیرے دیکھنے پر نہیں بلکہ اس کے دیکھنے پر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى﴾ (العلق: ۱۴) کیا نہیں جانتا کہ اللہ اس کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ دربار میں بادشاہ کی تعظیم سب ہی پر فرض ہے خواہ کوئی بادشاہ کو دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو۔ قریب ہو یا بعید ہو۔

﴿يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ میں اسی قسم کی نماز مراد ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے عباد متقین کی عبادت اور بندگی کو جب کبھی مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے تو مقیمین الصلوٰۃ کے ساتھ فرمایا ہے مصلین کا لفظ صرف ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جن کی نماز میں اس سرسری ہیئت اور محض ظاہری قیام وقعود کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ چناں چہ ایک جگہ مقام مذمت میں ارشاد ہے ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى﴾ یعنی اس شخص نے نہ تصدیق کی اور نماز کو قائم کرنا اور ٹھیک طرح سے ادا کرنا تو درکنار اس نے تو کبھی نماز کی ہیئت اور صورت بھی نہیں بنائی۔

بعض علماء کے نزدیک اس مقام پر صلوٰۃ سے مطلق نماز مراد ہے۔ فرض ہو یا نفل۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فرض نماز مراد ہے۔ اس لیے کہ فلاح جو کہ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں مذکور ہے وہ فقط فرض نماز پر موقوف ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے کچھ مسائل اور احکام دریافت کیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں تم پر فرض کی ہیں۔ اعرابی نے کہا کیا اور بھی کوئی نماز ان پانچ کے علاوہ مجھ پر فرض ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس کے بعد اس شخص نے زکوٰۃ اور صوم کے متعلق دریافت کیا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ ((وَاللّٰهِ لَا ازيد على هٰذا ولا انقص منه)) "خدا کی قسم اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کروں گا۔" آپ نے ارشاد فرمایا:

((اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ)). ترجمہ: "فلاح پائی اس شخص نے اگر سچ کہا۔"

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾

اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ حصہ ہمارے لیے خاص کر لیتے ہیں جسے وقتاً فوقتاً ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

انفاق سے اس جگہ عام معنی مراد ہیں۔ جو زکوٰۃ اور صدقات نافلہ اور ہر قسم کے انفاق فی سبیل اللہ کو شامل ہے بعض اہل علم نے باطنی اور معنوی رزق یعنی علم نافع کے انفاق کو بھی اس آیت شریفہ کے عموم میں داخل فرمایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے سب سے اوّل ایمان کا ذکر فرمایا جو تمام اعمال صالحہ کی جڑ ہے۔ پھر نماز کا ذکر فرمایا جو عبادات مدنیہ میں سب سے افضل ہے۔ پھر عبادات مالیہ زکوٰۃ اور صدقات کا ذکر فرمایا یا یوں کہو کہ ﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ میں متقین کے حسن اعمال کا ذکر تھا۔ اور ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ میں حسنِ اخلاق کا ذکر ہے اور مما میں من تبعیضیہ ہے یعنی مال کا بعض حصہ خرچ کرتے مسرف اور فضول خرچ نہیں اور ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کی اپنے عامل یعنی ینفقون پر تقدیم کچھ اہتمام اور اختصاص کی طرف مشیر ہے یعنی ان کے مال کا کچھ حصہ ہمیشہ تصدق اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے مخصوص رہتا ہے۔

فائدہ : جاننا چاہیے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سات قسمیں ہیں: ① زکوٰۃ مفروضہ ② صدقۂ فطر ③ خیرات ومبرات جیسے فقراء کو دینا اور مہمانوں کی ضیافت اور حاجت مندوں کو قرض دینا ④ وقف جیسے بناء مساجد و مدارس اور کنواں اور مہمان سرائے اور مسافر خانہ ⑤ مصارف حج ⑥ مصارف جہاد ⑦ نفقات واجبہ جیسے نفقۂ عیال اور نفقۂ زوجہ اور نفقۂ محارم۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ

اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اُترا تجھ پر اور جو اُترا تجھ سے پہلے اور

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۭ﴿۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلٰي هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ

آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں۔ انہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

مراد کو پہنچے

قَالَ تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ.... الیٰ.... وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ اور وہ متقی لوگ ایسے ہیں جو ایمان لائے اس کتاب پر جو تیری طرف نازل ہوئی اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے نازل ہوئیں اس سے مومنین اہل کتاب مراد ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ اسی لیے اس جگہ ﴿وَالَّذِيْنَ﴾ کو مکرر لائے کہ یہ متقین کا دوسرا گروہ ہے۔ اور پہلی آیت میں اہل عرب اور

---

❶ یہ ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کی تقدیم کے نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل کشاف میں ہے۔ ۱۲

اُمیین کا ذکر تھا ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ اور متقین کے یہ دونوں گروہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں آخرت کا تذکرہ اور استحضار متقین کا خاص شعار ہے بخلاف کافروں کے کہ وہ ہر وقت دنیا ہی کی فکر میں رہتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ایسے ہی لوگ ہدایت پر قائم ہیں جو ان کو خدا کی توفیق اور فضل سے ملی ہے کلمۂ علیٰ جو استعلاء کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ لوگ ہدایت پر حاوی اور متمکن ہیں اور ہدایت پر جم گئے ہیں اور ﴿مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ نور ہدایت محض اس رب العالمین کی رحمت اور مہربانی اور اس کی توفیق سے ان کو عطاء ہوا ہے جس سے ان کی تربیت اور اصلاح مقصود ہے۔ ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور ایسے ہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ یعنی مؤمنین کے یہ دونوں گروہ دنیا میں حق تعالیٰ کی توفیق سے نور ہدایت سے سرفراز ہوئے اور آخرت میں اس کی رحمت اور فضل سے مراد کو پہنچیں گے اور مفلح اس کو کہتے ہیں کہ جو اپنی مراد کو بخوبی پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ اور کمی واقع نہ ہو پہلے جملہ یعنی ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ میں ایمان اور تقویٰ کے دنیاوی ثمرہ کا ذکر ہے اور دوسرے جملہ یعنی ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں اخروی ثمرہ ذکر ہے بمبئی کا مسافر اگر غلطی سے کلکتہ میل میں بیٹھ جائے اور ریل چھوٹنے کے بعد معلوم ہو کہ یہ گاڑی بجائے بمبئی کے کلکتہ جا رہی ہے تو اس مسافر کی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی اور کلکتہ کے مسافروں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ ان کو اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارا راستہ صحیح ہے۔ اور ہم دیر یا سویر میں ضرور منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

اور ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ان متقین کو ہدایت پر تمکن اور استعلاء کی خصوصیت حاصل ہے اسی طرح ان کو فلاح کی بھی خصوصیت حاصل ہے یہ لوگ غیروں سے ان دو خصوصیتوں کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا
وہ جو منکر ہوئے برابر ہے کہ تو ان کو ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ نہ
يُؤْمِنُوْنَ ⑥ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰٓى
مانیں گے مہر کر دی ہے اللہ نے ان کے دل پر اور ان کے کان پر اور
اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑦ ع ۱ ۱
ان کی آنکھوں پر ہے پردہ اور ان کو بڑی مار ہے

صفاتِ کافرین

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ... الیٰ... عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ * یہاں تک گروہ اتقیاء کا ذکر فرمایا کہ جو قرآن کریم

---

* یہ آیت نازل ہوئی ان کے حق میں جن کی موت کفر پر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم قدیم میں جانی تھی جیسا کہ عتبہ و شیبہ و ابی جہل و ولید بن مغیرہ۔ (موضح القرآن)

کی ہدایت سے متمتع اور منتفع ہوئے اب آئندہ اشقیاء کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو اپنی شقاوت اور فسادِ فطرت کی وجہ سے اس چشمۂ ہدایت سے منتفع نہیں ہوئے۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔ تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا یعنی جو لوگ اللہ کے علم میں کافر ہیں ان کے حق میں آپکا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے آپ اس قسم کے لوگوں کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ اور ملول نہ ہوں قرآن کی ہدایت اور آپ کی تبلیغ اور دعوت کا قصور نہیں بلکہ ان کی فاسد اور بگڑی ہوئی استعداد اور فطرت کا قصور ہے اصل کافر وہی ہے کہ جس کا خاتمہ اور موت اللہ کے علم میں کفر پر مقرر ہو چکا ہو۔ جیسے ابو جہل اور ابولہب و امثالھم۔ ورنہ جس شخص کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا ہے وہ فی الحال محض ظاہر کے اعتبار سے کافر ہے حقیقت اور انجام کے اعتبار سے مومن ہے۔

بُد عمر را نام اینجابت پرست لیک مؤمن بود ناش درالست

جو لوگ محض ظاہر کے اعتبار سے کافر تھے ان میں سے بہت سے مشفر باسلام ہوئے اور ہوتے رہیں گے لیکن جو اللہ کے علم میں کافر تھے ان میں سے کوئی ایمان نہیں لایا۔ ایسے کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

گزشتہ آیات میں اہل انعام کا ذکر تھا یعنی جن کو حق تعالیٰ نے ایمان اور ہدایت اور تقویٰ کی نعمت سے سرفراز فرمایا اب اہل غضب اور اہل ضلال کا ذکر فرماتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں خالص کافروں کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر ہے۔

حرف تحقیق یعنی کلمۂ ﴿اِنَّ﴾ کا استعمال اکثر ان مواقع میں ہوتا ہے کہ جہاں مخاطب کو کسی قسم کا کوئی تردد ہو۔ مگر کبھی کبھی ایسے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے کہ جہاں متکلم یا مخاطب کے گمان کے خلاف کوئی شی ظاہر ہو جیسے حضرت مریم کی والدہ کا بطور حسرت یہ فرمانا۔

﴿رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی﴾ (آل عمران:۳۶) ترجمہ: "اے پروردگار! تحقیق میں نے تو یہ لڑکی جنی ہے۔"

خلاف اُمید لڑکی کی ولادت کو بطور حسرت حرف اِنَّ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور علیٰ ہذا نوح علیہ السلام کو اپنی قوم سے یہ امید تھی کہ وہ میری تصدیق کریں گے۔ جب خلاف امید انہوں نے تکذیب کی تو بطور حسرت یہ فرمایا:

﴿رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ﴾ (الشعراء:۱۱۷) ترجمہ: "اے پروردگار تحقیق میری قوم نے تو میری تکذیب کی۔"

اسی طرح اس جگہ نبی اکرم ﷺ کے اُمید کے خلاف کفار کے نہ ایمان لانے کو حرف ﴿اِنَّ﴾ کے ساتھ ذکر فرمایا کہ اے ہمارے نبی آپ ان کافروں کے ایمان کی امید نہ رکھیں۔ ان کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے یہ ایمان نہ لائیں گے اور ﴿سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ﴾ اس لیے فرمایا کہ کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے لیکن آپ کے حق میں برابر نہیں آپ تو مامور من اللہ ہیں۔ آپ کو تبلیغ اور دعوت کا اجر ہر حال میں ملے گا اس آیت سے یہ مقصود نہیں کہ آپ ان کو تبلیغ اور ہدایت نہ فرمائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے سے غمگین اور ملول نہ ہوں۔

کُفر کی تعریف

ہم ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ کی تفسیر میں ایمان کے ساتھ کفر کی حقیقت بھی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کر چکے ہیں لیکن امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کفر کی تعریف فرمائی ہے وہ زیادہ واضح ہے اور کفر کی تمام اقسام کو حاوی اور جامع ہے وہ یہ ہے:

اَلْكُفْرُ عَدَمُ تَصْدِيقِ الرَّسُوْلِ صلی اللہ علیہ وسلم فِيْمَا عُلِمَ بِالضَّرُوْرَةِ مَجِيْئُه بِهٖ. (تفسیر کبیر ۱۵۹ ج ۱)

ترجمہ: "یعنی کفر کے معنی یہ ہیں کہ رسول اور پیغمبر کی اس چیز میں تصدیق نہ کرنا جس کا بدیہی اور قطعی طور پر دین سے ہونا معلوم ہو چکا ہے۔"

کیونکہ کفر کی یہ تعریف عدم تصدیق الرسول۔ تکذیب اور ترک تصدیق دونوں کو شامل ہے اور امام غزالی نے جو تعریف کی ہے یعنی تکذیب الرسول وہ بظاہر اس شخص کے کفر پر صادق نہ آئے گی۔ کہ جو نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ تکذیب حالانکہ وہ شخص بالاجماع کافر ہے نبی کی تصدیق نہ کرنا ہی کفر ہے خواہ تکذیب کرے یا نہ کرے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کفر کی تعریف بجائے تکذیب کے ترک تصدیق کے ساتھ کی جائے تا کہ کفر کی دونوں صورتوں پر صادق آ سکے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

﴿وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝۱۳﴾ (الفتح)

ترجمہ: "جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ کرے تو ہم نے ایسے کافروں کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔"

اس آیت شریف میں نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا۔ وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ (السباء:۳۱)

ترجمہ: "کافروں نے کہا ہم ہرگز اس قرآن کی تصدیق نہ کریں گے۔"

سورۂ صافات میں ہے کہ اہل جنت اہل نار سے یہ کہیں گے:

﴿بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (الصافات:۲۹) ترجمہ: "بلکہ تم تصدیق کرنے والے نہ تھے۔"

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝﴾ (القیامہ:۳۱) ترجمہ: "اس کافر نے نہ صدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔"

بلکہ خود یہی آیت یعنی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶﴾ امام رازی کی تائید کرتی ہے اس لیے کہ اس آیت میں نہ ایمان لانے والوں اور نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔

اقسام کفر

علماء نے کفر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں:

① **کفر تکذیب:** یعنی انبیاء و رُسل کو جھٹلانا کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

﴿وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴﴾ (صٓ:۴)

ترجمہ: "کافروں نے کہا یہ ساحر اور جھوٹا ہے۔

﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ﴾ (صٓ:۱۴)

ترجمہ: "ان قوموں میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا پس میرا عذاب ان پر ثابت ہو گیا۔"

② **کفر استکبار:** تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کو نہ ماننا اور اس کے قبول سے انکار کر دینا۔

﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ (البقرہ:۳۴)

ترجمہ: "ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور تکبر کیا اور تھا وہ کافر میں سے۔"

③ **کفر اعراض:** یعنی پیغمبر کی نہ تصدیق کرے اور نہ تکذیب بلکہ اعراض اور روگردانی کرے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝ ﴾ (الاحقاف:۳)

ترجمہ: "اور کافر جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ﴿مُعْرِضُوْنَ﴾ کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ "دھیان نہیں کرتے" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کی طرف توجہ اور التفات نہیں کرتے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (آل عمران:۳۲)

ترجمہ: "آپ کہہ دیجیے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی۔ اور اگر روگردانی کریں تو کہہ دیجیے کہ اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔"

④ **کفر ارتیاب:** یعنی پیغمبر کے نہ صادق ہونے کا یقین ہے نہ کاذب ہونے کا۔ بلکہ شک اور تردد ہے۔ یہ بھی کفر ہے۔ چناں چہ ﴿وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ﴾ کی علت حق تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ﴾ (سباء:۵۴) **ترجمہ:** "یعنی بیشک تھے وہ شک میں متردد۔"

⑤ **کفر نفاق:** یعنی زبان سے اقرار اور قلب سے انکار کرے اور ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ سے دُور تک اسی کفر نفاق کا بیان ہے۔

حق جل شانہٗ کا یہ ارشاد ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ پہلے جملہ کی دلیل ہے یعنی ان کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا اس لیے برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمرد اور عناد اور سرکشی کے سزا میں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر ایک خاص قسم کا پردہ ہے جو ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور عناد کے سزا میں ان پر علم اور ہدایت کے دروازے بند کر دیئے ہیں نہ آنکھ کے راستہ سے ہدایت پہنچ سکتی ہے۔ اور نہ کان کے راستہ سے لہٰذا اب کوئی صورت نہیں کہ ہدایت ان کے دلوں تک پہنچ سکے۔ دل کا دروازہ اگر کھلا ہوا ہوتا تو پھر شاید ہدایت اندر داخل ہو جاتی مگر وہ بند کر دیا گیا۔ یہ دنیا میں ہوا۔ اور آخرت میں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے جو فلاح کی سراسر ضد ہے۔

نکتہ * ﴿عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ اور ﴿عَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ میں کلمۂ ﴿عَلٰى﴾ کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ قلوب اور اسماع ہر ایک کی مہر جداگانہ اور مستقل ہے۔ جمہور علماء مفسرین و متکلمین یہ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں ختم اور غشاوہ سے یہ مراد نہیں کہ حق تعالیٰ نے حقیقتاً ان کے دلوں اور کانوں پر کوئی مہر لگا دی ہے اور ان آنکھوں پر کوئی پردہ ڈال دیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ متکبرین اور معاندین اور ہوا پرست اور دشمنان حق و ہدایت اپنی طبعی زیغ اور جبلی کجروی کی وجہ سے اس درجہ اور اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اخلاق ذمیمہ اور رذائل ان کے دلوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہو چکے ہیں کہ ہر فحشاء اور منکر ان کو مستحسن نظر آتا ہے اور حق جل وعلاء کی ہر نافرمانی ان کو لذیذ معلوم ہوتی ہے ان کی حالت نجاست کے کیڑے کی طرح ہے کہ جس کو گندگی سے طبعی رغبت ہوتی ہے اور خوشبو سے اس کو طبعی نفرت ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ نجاست کا کیڑا عطر کی تیز خوشبو کو برداشت بھی نہیں کر سکتا اور بعض اوقات عطر کی خوشبو سے مر بھی جاتا ہے یہی حالت ان کافروں کی ہے کہ کفر کی نجاست پر فریفتہ ہیں اور حق اور ہدایت کے عطر سے ان کو نفرت ہے۔

حق تعالیٰ نے کافروں کی اس حالت کو بطور استعارہ ختم اور غشاوہ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح مہر اور پردہ بیرونی اشیاء کے وصول اور نفوذ سے مانع ہوتے ہیں اسی طرح ان کی یہ حالت ایمان اور ہدایت کو ان کے دلوں تک نہیں پہنچنے دیتی اور اندرونی کفر کو اندر سے باہر نہیں آنے دیتی اور نہ ان کے کان کسی حق بات کی طرف التفات کرتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں کسی امر حق کو دیکھنا چاہتی ہیں ایسے لوگوں کو ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

قدوۃ الاولیاء امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ختم اور غشاوہ (مہر اور پردہ) ظاہر اور حقیقت پر محمول ہے کافروں کے دلوں پر حقیقتاً ایک مہر ہے اور حقیقتاً ان کی آنکھوں پر ایک پردہ ہے جو مجہول الکیفیۃ ہے اور ہماری نگاہوں سے مستور ہے۔ اللہ کے فرشتے اس ختم اور غشاوہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی مہر اور پردہ کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کافر کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور ان پر لعنت کرتے ہیں جس طرح قلوب مؤمنین پر نقش ایمان لکھا ہوا دیکھ کر ان کے لیے دعاء اور استغفار کرتے ہیں۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ ﴾ (المجادلہ: ۲۲) ''یہی لوگ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے۔''

پس جس طرح مؤمنین کے دلوں پر ایمان کی کتابت حقیقت ہے اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ بھی حقیقت ہے اگرچہ کتابت ایمان کی طرح اس کی کیفیت مجہول ہے ملائکۃ اللہ جس طرح قلوب مؤمنین پر کتابت ایمان کا حسًّا اور عیانًا مشاہدہ کرتے ہیں اسی طرح وہ قلوب کافرین پر مہر اور ان کی ابصار پر پردہ کا بھی حقیقتاً معائینہ کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ص ۱۹۰ ج ۱)

و اخرج البزار و البیهقی فی الشعب و ضعفه عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الطابع معلق بقائمة العرش فاذا انتهكت الحرمة و عمل بالمعاصی و اجترئ علی الله بعث الله الطابع فطبع علیٰ قلبه فلا یقبل بعد ذلك شیئا. (تفسیر درمنثور ص ۲۳۸) تفسیر سورۂ نساء تحت تفسیر قوله تعالیٰ: ﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ (نساء: ۵۵)

''امام بزار اور امام بیہقی شعب الایمان میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں اور امام بیہقی نے اس کی سند کو ضعیف بتایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہر لگانے والا فرشتہ عرش کا پایا پکڑے کھڑا رہتا ہے جب کوئی شخص اللہ کے حکم کی بے حرمتی کرتا ہے اور کھلم کھلا اس کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اللہ کے مقابلہ میں گستاخ اور دلیر ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس مہر لگانے والے فرشتے کو حکم دیتے ہیں وہ فوراً اس گستاخ اور بے باک کے دل پر مہر لگا دیتا ہے جس کے بعد وہ کسی حق کو قبول نہیں کرتا۔'' (تفسیر درمنثور ۲۳۸ ج ۲)

اور احادیث صحیحہ اس معنی کی تائید کرتی ہیں چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر لگ جاتا ہے پس اگر توبہ کر لی اور اس گناہ سے باز آ گیا تو دل کو صیقل کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اور گناہ کیا تو وہ نقطہ اور بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کے دل کو گھیر لیتا ہے اور یہی وہ رَین (زنگ) ہے جس کی حق تعالیٰ نے ﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (المطففین: ۱۴) میں خبر دی ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

پس جس طرح ہم ظاہری سیاہی اور سفیدی اور زنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس سے کہیں زائد ملائکۃ اللہ قلوب بنی آدم کی سیاہی اور سفیدی اور زنگ کا معائنہ کرتے ہیں مجاہد فرماتے ہیں کہ رَیْنَ یعنی زنگ کا درجہ۔ ختم اور طبع سے کم ہے۔ اور ختم اور طبع کا درجہ۔

اقفال سے کم ہے اور اقفال سب سے زائد سخت ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد:۲۶) ترجمہ: "کیا ان کے دلو پر قفل ہیں۔"

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ * فرماتے ہیں کہ حدیث دین اور مجاہد کا قول اس امر کی دلیل ہے کہ آیت میں جس ختم کا ذکر ہے وہ امر حقیقی ہے۔ (تفسیر قرطبی ص ۱۸۸ ج ۱)

((عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اذا كذب العبد تبا عد عنه الملك ميلا من نتن ماجاء به)). (رواه الترمذی)

ترجمہ: "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: کہ بندہ جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے فرشتہ ایک میل دُور چلا جاتا ہے۔" (ترمذی)

((عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال كنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فارتفعت ريح منتنة فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اتدرون ما هذه الريح هذه ريح الذين يغتابون المؤمنين)). (رواه احمد)

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے یکایک ایک بدبو اٹھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جانتے ہو یہ کیسی بدبُو ہے پھر فرمایا یہ بدبُو ان لوگوں کے منہ سے آ رہی ہے جو اس وقت مسلمانوں کی غیبت کر رہے ہیں۔" (مسند احمد)

ہم اگر قصور بصیرت کی وجہ سے کذب اور غیبت کے رائحۂ کریہہ اور اس کی بدبو کا احساس نہ کر سکیں تو ہمارا یہ عدم احساس معاذ اللہ۔ ملائکہ مکرمین اور انبیاء و مرسلین کے عدم احساس کی ہرگز ہرگز دلیل نہیں بن سکتا۔

اسی طرح اگر ہم اپنی درماندہ اور قاصر بصیرت سے قلوب کافرین کی مہر اور ان کی آنکھوں کا پردہ نہ دیکھ سکیں۔ تو ملائکۃ اللہ کے نہ دیکھنے کی کیسے دلیل ہو سکتا ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ختم اور طبع حق جل شانہ کی جانب سے ابتداءً نہ تھا بلکہ ان کے اعراض اور استکبار اور تکذیب اور انکار کی پاداش اور سزا میں تھا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (نساء:۱۵۵)

ترجمہ: "پس بسبب ان کے عہد توڑ دینے اور آیاتِ الٰہی کے انکار کر دینے اور انبیاء علیہم السلام کو دیدہ و دانستہ ناحق قتل کرنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل پردہ میں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے مہر لگا دی پس یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے مگر ان میں کے بہت تھوڑے۔"

---

* امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ حدیث رَین کو نقل کر کے فرماتے ہیں: قلت و فی قول مجاهد هذا. وقوله عليه السلام ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله الا وهی القلب. دليل على ان الختم يكون حقيقيا والله اعلم. (تفسیر قرطبی ص ۱۸۸ ج ۱)

وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝﴾ (الصّف:۵)

ترجمہ: "پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی اور حق سے احراف کیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو بالکلیہ حق سے پھیر دیا اور اللہ نہیں توفیق دیتا حد سے نکلنے والوں کو۔"

وَ قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَھُمْ وَ اَبْصَارَھُمْ کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ نَذَرُھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ۝﴾ (الانعام)

آیات مذکورہ میں اس امر کی تصریح ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ ختم اور طبع ان کے نقض میثاق اور قتل انبیاء اللہ اور زیغ اور انحراف کی پاداش اور سزا تھی ان کی دیدہ دلیری اور علی الاعلان نافرمانی کی ان کو یہ سزا ملی کہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم کر دیئے گئے اور مہر لگا کر ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی گئی۔ اور معرفت اور ہدایت کی سب راہیں ان پر بند کر دی گئیں اب وہ نہ حق کی باتوں کو سمجھ سکیں گے اور نہ سن سکیں گے۔ اور نہ دیکھ سکیں گے اس لیے اب ان کو ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔

اور اگر بالفرض حق تعالیٰ جل شانہ ابتداءً ہی کسی کے دل پر مہر لگا دیں اور اپنی توفیق اور ہدایت سے محروم کر دیں تب بھی ذرا برابر کوئی ظلم نہیں جیسا کہ عطاء بن ابی رباح سے منقول ہے کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے یہ سوال کیا کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے اپنی ہدایت کو روک لیں اور گمراہی اور ہلاکت کو میرے لیے مقدر فرما دیں تو کیا یہ ظلم نہ ہوگا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ارشاد فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے تیری کسی مملوک شئے کو روک لیا ہے تو بے شک تجھ پر ظلم کیا اور اگر خدا نے اپنی مملوک شئی کو روک لیا ہے تو وہ اس کی ملک ہے اس کو اختیار ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ ﴿وَ اللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝﴾ وَ قَالَ تَعَالٰی: ﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ ۚ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝﴾ (آل عمران)

اسی طرح ہدایت بھی اس کی ملک ہے اور اس کی رحمت ہے جس سے اپنے وفاداروں اور اطاعت شعاروں کو نوازتا ہے اور متکبرین اور سرکشوں کو اس سے محروم کرتا ہے۔ (کتاب الھجرتین للحافظ ابن القیم ص ۹۹)

حق تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے لوگوں کو مختلف الاستعداد بنایا کسی کو غبی اور کسی کو ذکی کسی کو خوبصورت اور کسی کو بدصورت کسی کو بینا اور کسی کو نابینا۔ کسی کو صحیح سالم تندرست اور کسی کو معذور اور اپاہج اور گونگا اور بہرا۔ جس کسی کو جو کمال اور خوبی عطاء کی وہ محض اس کا فضل ہے اس پر کسی کا کوئی حق اور قرضہ نہیں اور جس کو نہیں دیا اس پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اسی طرح اس نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے کسی کی طینت میں تکبر اور عصیان اور اباء اور سرکشی کی استعداد رکھی اور کسی کی فطرت میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد رکھی اور اپنے احکام کو ان استعدادوں کے ظہور کا ذریعہ بنایا حکم کے بعد استعدادوں کا ظہور ہوا۔ جس میں عصیان اور اباء کی استعداد تھی اس نے نافرمانی کی اور جس میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد تھی وہ حکم خداوندی سنتے ہی سربسجود ہو گیا۔ جیسے بیج میں برگ و بار سب نہاں ہوتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو سب باہر نکل آتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس نے بندوں کو مختلف الاستعداد کیوں بنایا سو یہ سوال بالکل مہمل ہے وہ مالک مطلق اور ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝﴾ (البروج) ہے ﴿لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْـَٔلُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء)۔

کرا زھرۂ آں کہ از بیم تو — کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زباں تازہ کردن باقرار تو — نینگیختن علت از کار تو

حق تعالیٰ نے جس زمین کو چاہا ایسا شور بنایا کہ جو تخم اس میں ڈالا جائے وہ سوخت ہو جائے اور کسی زمین کو مرغزار اور لالہ زار

بنایا کوئی فلسفی اور سائنس دان اس کی وجہ نہیں بیان کرسکتا کہ خدا تعالیٰ نے زمین کی صلاحیتوں اور استعدادوں میں یہ فرق کیوں رکھا ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۔﴾ (الاعراف:۵۸)۔

ایں زمین پاک وآں شوراست و بد — ایں فرشتہ پاک و آں دیوست ودد
ہر دوگوں زبنور خوردند از محل — لیک شدزاں نیشو زاں دیگر عسل
ہر دوگوں آہو گیا خوردندو آب — زیں یکے سرگین شد وزاں مشکناب
ہر دو نے خوردند از یک آب خور — آں یکے خالی و آں پر از شکر
صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں — فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں
ایں خورد گردد پلیدی زوجدا — واں خورد گردد ہمہ نور خدا

لطائف ومعارف

① قلب:

لغت میں اُس صنوبری گوشت کے ٹکڑے کا نام ہے جو سینہ کے بائیں جانب ایک خالی جگہ میں رکھا ہوا ہے اور یہی مضغہ لحم۔ روح حیوانی کا منبع اور سرچشمہ ہے اسی میں روح حیوانی پیدا ہوتی ہے۔ جس کے وجود پر بدن کی حس وحرکت موقوف ہے اور جو شرائین کے ذریعہ تمام اعضاء میں پہنچتی ہے مگر اصطلاح شرح میں اُس لطیفۂ ربانی کو قلب کہتے ہیں جو اس مضغہ لحم میں من جانب اللہ رکھا ہوا ہے اور انسان کی انسانیت اسی سے قائم ہے اور اسی کی وجہ سے احکام شرعیہ کا مکلف اور مخاطب بنتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝﴾ (قٓ) اور اسی لطیفۂ ربانی کو قرآن کریم میں کہیں نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝﴾ (الشمس) اور کبھی روح کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ (بنی اسرائیل:۸۵)، ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي﴾ (الحجر:۲۹) اس قسم کی آیات میں روح سے وہی لطیفۂ انسانی مراد ہے انسان کا بدن عالمِ خلق سے ہے اور یہ لطیفۂ انسانی عالم امر سے ہے اور الہام یزدانی کا محل اور مورد ہے اس لطیفہ پر جب مہر لگ گئی تو استدلال اور کشف اور الہام کے سب دروازے بند ہوگئے۔

② سمع:

سمع کے معنی کان کے ہیں جو ایک عضو ہے اور کبھی اس کا اطلاق قوت سامعہ پر بھی آتا ہے آیت میں یہی معنی مراد ہیں اس قوت پر جب مہر لگ گئی تو کان کے ذریعہ سے جو ہدایت دل تک پہنچ جاتی تھی اس کا دروازہ بند گیا۔

③ ابصار:

جمع بصر کی ہے آنکھ کی روشنی کو بصر کہتے ہیں۔ جس طرح دل کی روشنی کو بصیرت کہتے ہیں۔

④ ختم اور غشاوہ:

ختم کے معنی مہر کرنا تا کہ وہ چیز بند ہو جائے اور چیزیں باہر سے اندر کی طرف نہ پہنچ سکیں۔ اور غشاوہ پردہ کو کہتے ہیں آنکھ پر غشاوہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ پردہ آنکھ کی شعاع کو باہر سے روک دے۔

⑤ معتزلہ کا گمان یہ ہے کہ کسی کے دل پر مہر لگا دینا ایک امر قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قبیح سے پاک اور منزہ ہے اس لیے معتزلہ قرآن کریم کے اس قسم کی تمام آیتوں کی تاویل کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ختم اور طبع کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف اسناد مجازی ہے۔ اہل حق کہتے ہیں کہ یہ اسناد حقیقی ہے قلوب بنی آدم اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں وہ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے قلوب کو پلٹیں دیتا رہتا ہے۔ اور پھیرتا رہتا ہے کبھی خیر کی طرف اور کبھی شر کی طرف کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝﴾ (الانعام) اس قسم کی آیات سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمام قلوب اس کی انگلیوں میں ہیں قلوب کی ہدایت اور ضلالت اور ان کی سعادت اور شقاوت اس کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے بغیر اس کی توفیق اور عنایت کے ایمان اور ہدایت ممکن نہیں۔ ﴿يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (النحل: ۹۳)، ﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝﴾ (الرعد: ۳۳)، ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ (الانفال: ۲۴)

تمام کائنات اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اسی نے اپنی قدرت سے ان کو عدم کے پردہ سے نکال کر وجود کی مسند پر بٹھلایا ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ عالم کا کوئی ذرہ بدوں اس کے ارادہ اور مشیت کے حرکت کر سکے ایمان اور ہدایت کفر اور ضلالت سب اسی کی مخلوق ہیں تخلیق وتکوین کے اعتبار سے ہر چیز کی اسناد اس کی طرف ہوگی۔ اور اسناد حقیقی ہوگی۔

البتہ کسب اور حصول کے اعتبار سے بندوں کی طرف اسناد ہو سکتی ہے۔ چوں کہ یہ ختم اور تغشیہ بندوں کے اختیاری تمرد اور سرکشی کا نتیجہ اور اس کی سزا ہے اس لیے متمردین اور معاندین کے تقبیح اور تشنیع کے لیے اس کو ذکر کیا لہٰذا مورد مذمت اور مستحق ملامت صرف وہی لوگ ہوں گے جو ان خبیث استعدادوں کے ظرف اور محل ہیں۔ زہر اور سنکھیہ کا پیدا کرنا تو کمال ہے مگر اس کا استعمال قبیح اور مذموم ہے اسی طرح روحانی زہر۔ (کفر وضلالت) اور روحانی تریاق (ایمان و ہدایت) کو پیدا کرنا تو کمال ہی کمال ہے مگر اس کو اپنے اختیار سے استعمال کرنے کا حکم دوسرا ہے زمین اچھی ہو یا بُری۔ شور اور بنجر ہو یا گلزار اور مرغزار ہو پیدا کرنا تو دونوں ہی کا حکمت ہے مگر برائی کیساتھ شور اور بنجر زمین ہی کو موصوف کیا جائے گا۔ پیدا کرنے والا تو ہر حال میں قابل حمد وستائش ولائق صد آفرین وتحسین ہے۔ ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ﴾ (الاعراف: ۵۸) جس زمین کو حق تعالیٰ نے شور اور بنجر بنایا اور انبات کی صلاحیتوں سے اسے محروم کر دیا تو خداوندِ ذوالجلال نے زمین کے اس ٹکڑے پر کوئی ظلم نہیں کیا، اسی طرح خداوند علیم وحکیم نے اگر کسی کے دل پر مہر لگا کر اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر اس کی زمین قلب کو ہدایت کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا تو کوئی ظلم نہیں کیا اہل حق کہتے ہیں کہ یہ ختم اور غشاوہ۔ اُن کی سرکشی اور عناد کی سزا ہے یہ مُہر اُن کو کفر پر مجبور نہیں کرتی اس مہر کا توڑنا ان کے اختیار میں ہے حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں ابھی مہر ٹوٹتی ہے۔

حق جل شانہ نے گمراہی کے قفل پیدا کیے اور کافروں کے دلوں پر ڈالدے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ۲۴) مگر اس علیم وحکیم نے ان قفلوں کے کھولنے کے لیے مفاتیح (کنجیاں) بھی پیدا کیں تا کہ اگر کوئی قفل ضلالت کو کھولنا

چاہے تو کلید ہدایت اور مفتاح سعادت اس کے ہاتھ میں ہے اس سے بسہولت قفل کھل سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بدنصیب کنجی کا ستعمال نہ کرے تو قفل خود بخود تو کھلنے سے رہا۔

⑥ امام ربّانی شیخ مجدّد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ کفر اور کافروں کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ کو ذاتی عداوت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے اس حق جل وعلا کے بالذات دشمن ہیں۔ اسی وجہ سے انکا عذاب دائمی ہے اور ان کی مغفرت ناممکن ہے اس لیے کہ صفت رافت ورحمت جو کہ صفات افعال میں سے ہے وہ ذاتی غضب اور ذاتی عداوت کے مقتضا کو ہرگز نہیں بدل سکتی۔ ایک صفتِ فعل کا مقتضا دوسری صفت فعل کے مقتضا سے متغیر اور متبدل ہوسکتا ہے۔ مثلاً صفت احیاء سے صفت امانۃ کا مقتضا بدل سکتا ہے۔ مگر مقتضائے ذات مقتضائے فعل سے نہیں بدل سکتا۔ اس لیے کہ اقتضائے ذاتی بلاشبہ اقتضائے فعلی اور اقتضاء صفاتی سے بدرجہا اعلیٰ وارفع ہے۔ اس لیے قیامت میں کافروں کو اس کی صفت رأفت ورحمت سے کوئی حصہ نہ ملے گا۔ کیونکہ وہ اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کے بالذات دشمن ہیں اور حدیث قدسی میں جو ((سبقت رحمتی علیٰ غضبی))(میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے) وارد ہوا ہے۔ اس سے ذاتی غضب مراد نہیں جو کفار ومشرکین کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ صفاتی اور فعلی غضب مراد ہے جو گنہگار مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے عصاۃ مومنین (گنہگار مؤمنین) کے ساتھ ذاتی عداوت اور ذاتی غضب متعلق نہیں مؤمنین مذنبین کے حق میں جو عقاب اور عتاب بھی آیا ہے وہ ان کے افعال سیئہ کی طرف راجع ہے بلکہ گنہگاروں کے ساتھ ایمان کی وجہ سے ذاتی محبت متعلق ہے اور اسی ذاتی محبت کی وجہ سے اہل ایمان جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور گناہوں کی وجہ سے جو صفاتی اور فعلی غضب ان سے متعلق ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ سے چند روز عذاب میں رہیں گے اور پھر اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ روح وریحان اور نعیم مقیم میں رہیں گے۔ رہا یہ سوال کہ کافر کے لیے آخرت میں تو رحمت سے کوئی حصہ نہیں مگر دنیا میں بھی کیا اس کے لیے کوئی رحمت ہے یا نہیں جواب یہ ہے کہ دنیا میں کافر کے لیے کسی رحمت کا حاصل ہونا فقط ظاہر اور صورت کے لحاظ سے ہے ورنہ حقیقت میں وہ استدراج اور کید متین ہے اور دار آخرت کی طرح دار دنیا میں بھی کفار سے ذاتی عداوت اور ذاتی غضب رحمت کے فیضان سے مانع ہے۔

کما قال تعالیٰ:

﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾ (المومنون)

ترجمہ: "کیا یہ کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مال اور اولاد سے امداد کیے جارہے ہیں تو ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کررہے ہیں بلکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں۔"

وقال تعالیٰ: ﴿ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ ﴾ (القلم)

ترجمہ: "کہ یہ استدراج ہے ہم بتدریج ان کو جہنم کی طرف لے جارہے ہیں۔ اسی طرح سے کہ ان کو معلوم بھی نہیں۔ اور اُن کو ڈھیل دے رہا ہوں۔ بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔"

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ
اور ایک لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم یقین لائے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور ان کو

بِمُؤْمِنِيْنَ ۘ﴿۸﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ

یقین نہیں دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور کسی کو دغا نہیں دیتے مگر

اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۭ﴿۹﴾ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ

آپ کو اور نہیں بوجھتے ان کے دل میں آزار ہے پھر زیادہ دیا ہم نے ان کو

مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ

آزار اور ان کو دکھ کی مار ہے اس پر کہ وہ جھوٹ کہتے تھے اور جب کہیے

لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ

ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں کہیں ہمارا کام تو سنوارنا ہے سُن رکھو

اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ

وہی ہیں بگاڑنے والے پر نہیں سمجھتے اور جب کہیے ان کو

اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ

ایمان میں آؤ جس طرح ایمان میں آئے سب لوگ کہیں کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان بے وقوف سنتا ہے وہی ہیں

هُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا

بے وقوف پر نہیں جانتے اور جب ملاقات کریں مسلمانوں سے کہیں ہم

اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ

مسلمان ہوئے اور جب اکیلے ہوں اپنے شیطانوں کے پاس کہیں ہم ساتھ ہیں تمہارے ہم تو

مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ

ہنسی کرتے ہیں اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں

يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ

بہکے ہوئے وہی ہیں جنہوں نے خرید لیے راہ کے بدلے گمراہی سو نفع نہ

تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾
ان کی سوداگری اور نہ راہ پائی۔

قبائح منافقین

قَالَ تَعَالٰی : ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ ... اِلٰی ... وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾ ﴾

ربط: ابتداء سورت میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی مدح فرمائی جنہوں نے دل سے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کو مانا اور زبان سے اس کا اقرار کیا۔ یہ اتقیاء کا گروہ تھا بعد میں اشقیاء کا حال ذکر کیا۔ اشقیاء میں دو گروہ تھے۔ پہلا گروہ وہ تھا جو دل اور زبان دونوں سے منکر تھے۔ ان کا ذکر ہو چکا۔ اب آئندہ آیات میں اشقیاء کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو کسی دباؤ اور مصلحت کی بناء پر زبان سے تو مانتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ ایسے شخص کو اصطلاح شریعت میں منافق کہتے ہیں۔ کافروں میں سب سے بدتر یہی فرقہ ہے کہ جس نے کفر کے ساتھ جھوٹ کو جمع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اوس وخزرج کے اکثر قبائل سچے دل سے اسلام میں داخل ہو گئے مگر بعض قبائل جو یہود سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام کی قوت اور شوکت کو دیکھ کر ظاہر میں مسلمان بنے تا کہ ان کے جان و مال اور اہل وعیال محفوظ رہیں مگر اندرونی طور پر یہود اور مشرکین کے ساتھ رہے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارہ میں یہ آیتیں نازل کیں اور ان آیتوں میں منافقین کے اخلاق ذمیمہ اور افعال قبیحہ کے بیان کیا۔

پہلی قباحت

یہ ہے کہ وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں چناں چہ فرماتے ہیں اور تعجب ہے کہ بعضے لوگ باوجود انسان ہونے کے ایسے کمینہ اور کج فہم ہیں کہ محض زبان سے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر حالانکہ وہ کسی درجہ میں بھی مؤمنین نہیں یعنی اللہ اور یوم آخرت کی کیا تخصیص وہ تو کسی چیز پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ان کی ذوات کو ایمان اور اہل ایمان سے ذرہ برابر الصاق [1] اور اتصال نہیں۔ الحاق اور اتصاف کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

خاص اللہ اور یوم آخرت کو ذکر کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ سلسلۂ ایمان بالغیب میں سب سے زائد مہتم بالشان اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے یا یہ وجہ ہے کہ بعض مرتبہ کسی سلسلہ کی پہلی اور آخری چیز کا ذکر کر دیتے ہیں اور مقصود استیعاب اور احاطہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں مقصود یہ ہے کہ ہم اہل ایمان کی طرح اوّل سے آخر تک تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور سلسلہ ایمان کو اول سے آخر تک پکڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ ﴾ ”یہ منافقین اپنے زعم میں اللہ اور مؤمنین سے فریب اور دھوکہ کرتے ہیں۔ حالانکہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنے نفسوں کو“

---

[1] لفظ الصاق سے مؤمنین کے باء کے ترجمہ کی طرف اشارہ ہے فان الباء للالصاق۔ ۱۲

اس لیے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہیں۔ ان سے کوئی شے مخفی نہیں اور مؤمنین کو بذریعہ وحی ان کی دغابازی کی اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ ان کے اس فریب سے اہل ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ الٹا انہی کو نقصان ہوتا ہے۔

فائدہ: مخادعت مفاعلت کا وزن ہونے کی وجہ سے مشارکت کو مقتضی ہے۔ سو منافقین کی طرف سے تو خداع اور مکر ظاہر ہے۔ مگر حق جل شانہ کی طرف سے ان پر ظاہراً احکام اسلام کا جاری ہونا یا دینوی نعمتیں دیکر استدراج اور امہال میں مبتلا کرنا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے خداع ہے۔ کہ ظاہر میں تو اعزاز اور اکرام ہے اور در پردہ ارادۂ تذلیل وتحقیر ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ یعنی یہ منافقین اس قدر احمق اور بدحواس ہیں کہ اس امر کا ذرہ برابر احساس نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ پر کسی کا کوئی فریب اور دھوکہ کسی طرح نہیں چل سکتا۔

فائدہ: ① اگر زباں سے اسلام اور ایمان کا اقرار ہو اور دل میں انکار ہو تو یہ اعتقادی نفاق کہلاتا ہے اور اگر دل میں بھی اقرار ہو مگر اعمال اسلام کے پورے مطابق نہ ہوں تو یہ عملی نفاق کہلاتا ہے اس سے کافر نہیں ہوتا اگر حال قال کے مطابق نہ تو سلف صالحین اس کو بھی نفاق کہتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کو پایا کہ ہر ایک اپنے نفس پر نفاق سے ڈرتا تھا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ ذرا قلب کی نورانیت میں فرق پایا تو اس کو نفاق سمجھتے تھے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ آپ کی حضوری میں قلب کی جو حالت ہوتی ہے وہ اہل وعیال میں جا کر نہیں رہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ یہ حالت ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اگر ہمیشہ یہی حالت رہتی تو گلی کوچوں میں اور بستروں پر فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔

② جاننا چاہیے کہ شیعوں کا تقیہ بھی کھلا ہوا نفاق ہے۔ اگرچہ وہ اس کو ایمان کہیں کما قالوا آلا لا ایمان لِمَن لا تقیة لهٗ اور کیوں نہیں منافق تو اپنے نفاق کو ایمان اور اخلاص ہی سمجھتا ہے۔

③ تفسیر ابن کثیر میں امام مالک سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں ملحد اور زندیق حکم میں منافق کے ہے انتہٰی۔

تشریح: جو شخص شریعت کے الفاظ تو بحال رکھے مگر معنی ایسے بیان کرے جس سے اس کی حقیقت ہی بدل جائے ایسے شخص کو قرآن کی اصطلاح میں مُلحِدْ اور حدیث کی اصطلاح میں زندیق کہتے ہیں ایسا شخص دعویٰ تو اسلام کا کرتا ہے مگر دل میں کفر مضمر ہے اور آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں تاویلات فاسدہ کر کے مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہے وجہ یہ ہے کہ دل میں زیغ اور کجی کی بیماری ہے جو اس کو تاویلات فاسدہ پر آمادہ کرتی ہے اور جتنی تاویلات فاسدہ زیادہ کرتے جاتے ہیں اتنی ہی ان کی دل کی بیماری میں زیادتی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔

اور ان منافقین کا اپنے نفسوں کو دھوکہ اور فریب دینا بالکل ظاہر ہے مگر ان کو اس لیے ظاہر نہیں ہوتا کہ ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ﴾ ان کے دلوں میں ایک خاص قسم کا مرض ہے جس سے ان کی قوت ادراکیہ ماؤف ہو چکی ہے اور یہ کتاب بلاشبہ پیغام شفاء اور نسخۂ ہدایت تھی۔ اگر دلوں کو بغض اور عناد سے صاف کر کے اس نسخۂ شفاء کو استعمال کرتے تو شفایاب ہو جاتے۔ مگر اس کتاب ہدایت کے ساتھ ان کا بغض اور عناد زیادتی مرض کا سبب بن گیا۔ پس اللہ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا۔ جو عضو اور جو حاسہ جس غرض اور جس مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہے اس حاسہ سے اس غرض کے نہ حاصل ہونے کا نام مرض ہے۔ زبان کے حق میں نطق اور گویائی اور آنکھ کے حق میں نظر اور بینائی کا۔ اور جسم کے حق میں گرفت اور احساس کا دشوار ہو جانا یہ زبان اور آنکھ اور جسم کا مرض ہے علیٰ ہذا قلب کے حق میں

اللہ جل جلالہٗ کی معرفت اور اس کی محبت اور اس کی اطاعت کا دشوار ہو جانا کہ جس کے لیے یہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ قلب کا مرض ہے۔

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است گر شکر خوردن بود جان کندن است

حالت مرض میں مرغ منجن اور بہتر سے بہتر غذا بھی مفید نہیں ہوتی بلکہ اور مرض اور بیماری میں قوت اور شدت پیدا کر دیتی ہے۔ ع

ہر چہ گیرد علتی علت بود

اوّل ازالۂ مرض کی فکر چاہیے اس کے بعد مناسب غذا دی جائے۔ اسی طرح باطنی اور روحانی مریض کو ایمان و ہدایت کی تلقین کوئی نفع نہیں دیتی بلکہ اور مرض میں اضافہ کر دیتی ہے۔

جو شخص صفراء کے مرض میں مبتلا ہے اس کی قند اور نبات بھی تلخ معلوم ہوتی ہے اور قند اور نبات کے استعمال سے اس کا صفراء اور زیادہ ہو جاتا ہے۔

وَ مَنْ يَّكُ ذَا فَمٍ مُرٍّ مَرِيْض يَجِدْ مُرًّا بِهِ الْمَاءَ الزُّلَالَا

جس کے منہ کا مزہ تلخ ہو اس کو آب زلال بھی تلخ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص کفر اور نفاق کے مرض میں مبتلا ہو اس کو ایمان کی حلاوت اور شیرینی کہاں محسوس ہو سکتی ہے۔ کفر اور نفاق کے صفراء نے اس کی قوتِ ذائقہ کو تلخ بنا دیا ہے اس لیے اس کو ایماں اور ہدایت کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ ”کہ ایک آزار یہ تھا کہ جس دین کو دل نہ چاہتا تھا ناچار قبول کرنا پڑا اور دوسرا آزار اللہ نے زیادہ دیا کہ حکم کیا جہاد کا جن کے خیر خواہ تھے۔ ان سے لڑنا پڑا۔“ (موضح القرآن) ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰﴾ ”اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ دعوائے ایمان میں جھوٹ بولتے تھے۔“ اور پھر طرفہ یہ کہ اس جھوٹ کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ مردوں کی طرح اپنے عقیدہ کو کھول کر نہیں بیان کرتے۔ عورتوں کی طرح ڈرتے ہیں اسی وجہ سے منافق کھلے کافر سے بدتر ہے۔ اس لیے کہ کافر فقط کفر کرتا ہے مگر جھوٹ تو نہیں بولتا۔ اور نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے بخلاف منافق کے کہ وہ کفر بھی کرتا ہے اور زبان سے جھوٹ بھی بولتا ہے۔ کہ مسلمان ہوں اور اہل ایمان کو دھوکہ دیتا ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾ (المنافقون)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافق تھا وہ اس زمانہ میں زندیق ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی زندیق وہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو اسلام کا کرے مگر دل میں کفر مضمر ہو۔

منافقین کی دوسری قباحت

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ... الیٰ ... وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲﴾

اور یہ منافقین اپنے باطنی مرض کی وجہ سے اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ فساد کو صلاح اور صلاح کو فساد اور مرض کو صحت سمجھنے لگے ہیں۔ کیونکہ جب اسے یہ کہا جائے کہ زمین میں فساد مت کرو تو یہ کہتے ہیں کہ جز ایں نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ منافقین کئی طرح سے فساد پھیلاتے تھے۔ کبھی مسلمانوں کے راز فاش کرتے۔ کبھی کافروں کو مسلمانوں کی مخالفت پر آمادہ کرتے اور کبھی کافروں کے اعتراضات ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے سامنے نقل کرتے تاکہ وہ مذبذب اور متزلزل ہو جائیں ان سب کو حق تعالیٰ نے فساد سے تعبیر

فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں نفاق خواہ دین کا ہو یا دنیا کا خود ایک مستقل فساد ہے۔ دو ۲ رویہ ہونے سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں۔ ایسا شخص ہمیشہ فساد پھیلاتا ہے اور کسی کا خیر خواہ نہیں ہوتا۔ مسلمان جب ان کو اس قسم کے فسادوں سے منع کرتے تو جواب میں یہ کہتے کہ ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱﴾ جزایں نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ سب شیر وشکر ہو جائیں۔ آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے۔ نئے دین کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے کے درپے قتل و غارت اور ایذاء اور ہتک حرمت ہو گیا ہے وہ سب یک لخت ختم ہو جائے اور ملک اور ملّت پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلۂ معاش وتجارت حسب سابق جاری ہو جائے۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ آگاہ ہو جاؤ کہ یقیناً یہی لوگ مفسد ہیں۔ کہ کفر اور ایمان اور شرک اور توحید کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور جس کفر وشرک کے فتنہ اور فساد کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے یہ فتنہ پرداز۔ پھر اسی فساد کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانا چاہتے ہیں۔ اور لیکن قلبی مرض کی وجہ سے ان کا باطنی احساس اس درجہ مختل ہو گیا ہے کہ اصلاح اور فساد کے فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ دین حق فتنہ نہیں بلکہ کفر اور شرک ہی فتنہ اور فساد ہے۔ اسی کے مٹانے اور اسی کی اصلاح کے لیے حضرات انبیاء مبعوث ہوئے اور کفر اور شرک ہی کے فتنہ کے استیصال کے لیے جہاد وقتال کرنا عین اصلاح ہے۔ جہاد کو فساد بتانا یہی فتنہ اور فساد ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾

ترجمہ: "کافروں سے قتال و جہاد کرو یہاں تک کہ کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔"

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ ۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۙ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ﴾

ترجمہ: "لوگ آپس سے ماہ حرام میں قتال کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ بے شک ماہِ محرم میں ابتداءً قتال کرنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو تنگ اور پریشان کر کے نکالنا ماہ حرام میں قتال کرنے کے جرم سے کہیں زیادہ ہے۔ اور کفر اور شرک کا فتنہ قتل و غارتگری کے فتنہ سے بہت بڑا ہے۔"

اگر کسی مریض کا ہاتھ گل یا سڑ گیا ہو تو اس عضو کا کاٹ دینا اور اس کا داغ دے دینا ہی حاذق طبیب کے نزدیک اصلاح ہے۔ ورنہ اگر اس عضو کو قطع نہ کیا گیا تو تمام بدن کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سے اگر اعداء اللہ سے جہاد وقتال نہ کیا جائے تو روحانی طور پر تمام عالم کے خراب ہونے کا اندیشہ بلکہ ظن غالب ہے۔ اب آئندہ آیت میں ان کی بے شعوری کی ایک دلیل بیان فرماتے ہیں کہ وہ اہل عقل اور حق تعالیٰ کا اتباع کرنے والوں کو بے وقوف اور احمق سمجھتے ہیں۔

یہی حال ملاحدہ اور زنادقہ کا ہے کہ آیات اور احادیث میں تاویلات فاسدہ کر کے مسلمانوں کو فتنہ اور فساد میں ڈالتے ہیں اور بے عقلی سے اس فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں۔

منافقین کی تیسری قباحت

قَالَ اللہ تعالیٰ : ﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ... الیٰ ... اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۝﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے وہ لوگ جو حقیقۃً انسان اور آدمی ہیں۔ انسان حقیقت میں وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان رکھتا ہو ورنہ وہ شخص ''نہ ابن آدم بل غلاف آدمند'' کا مصداق ہے۔ ناس سے اس جگہ مطلقاً صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں یا علماء بنی اسرائیل مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ اور تاریخ ابن عساکر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ کی تفسیر اس طرح منقول ہے۔ ﴿كَمَآ اٰمَنَ﴾ ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان چار کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو خلفائے راشدین کے منہاج اور منوال پر ہو اور ﴿كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ کے لفظ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور تصدیق اسی قسم کی معتبر ہے جس قسم کی صحابۂ کرام اور خلفائے راشدین نے تصدیق کی۔ ورنہ جو شخص ملائکہ اور جنت اور جہنم وغیرہ وغیرہ کی تصدیق اس معنی کے لحاظ سے نہ کرے کہ جس معنیٰ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تصدیق کرتے تھے۔ بلکہ اپنی ہوائے نفسانی اور شیطان قرین کے القاء کیے ہوئے معنی کے لحاظ سے کرے تو وہ اصلاً معتبر نہیں۔ ایسی تصدیق تکذیب کے مترادف ہے اور ایسا ایمان بلاشبہ کفر کے ہم معنیٰ ہے۔ الحاصل جب منافقین سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم ایسا ایمان لاؤ کہ جیسا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان لائے تو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ ایمان لائے بیوقوف کہ دین کے دیوانے بنے ہوئے ہیں اور زمانہ کے انقلابات سے نہیں ڈرتے۔ ممکن ہے کہ دوسری طرف کا غلبہ ہو جائے دین کی محبت میں دنیاوی مصالح کو نظر انداز کر دیا۔ روافض اور خوارج بھی صحابۂ کرام کو احمق اور کافر اور منافق کہتے ہیں۔ سفیہ اس کو کہتے ہیں جو اپنے نفع اور ضرر کو نہ پہچانتا ہو۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین چوں کہ آخرت کے نفع اور ضرر کے فکر میں اس درجہ سرشار اور منہمک تھے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے کسی نفع اور ضرر کی ذرہ برابر ان کو پرواہ نہ رہی تھی۔ اس لیے دُنیا کے کتے ان کو دیوانہ اور بے وقوف کہتے تھے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد اوست فرزانہ کہ فرزانہ نشد

منافقین کا مخلصین کو دیوانہ اور سفیہ کہنا بھی ان کے عقل اور سمجھ دار ہونے کی دلیل ہے ؎

و اذا اتتك مذمتی من ناقص فهی الشهادة لی بانی کامل

ناقص العقل کا میری مذمت کرنا یہی میرے کامل العقل ہونے کی شہادت ہے اس لیے آگے ارشاد فرماتے ہیں: آگاہ ہو جاؤ کہ یہی لوگ احمق اور بے وقوف ہیں جنہوں نے باقی کو چھوڑ کر فانی کو اختیار کیا ہے اور عاقلوں کو احمق سمجھتے ہیں۔ اور حق کو باطل اور ہدایت کو ضلالت سمجھتے ہیں۔ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((الکیس من دان نفسه و عمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسه هو اها و تمنی علی الله)).

''عاقل اور سمجھ دار وہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بنایا اور مابعد الموت یعنی آخرت کے لیے عمل کیا اور احمق اور بے وقوف وہ ہے کہ جس نے ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اللہ پر آرزوئیں اور تمنائیں باندھیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

علاوہ ازیں لیل ونہار آپ کے معجزات کا مشاہدہ کیا اور جو نعت اور صفت آپ کی آسمانی کتابوں میں دیکھی اور پڑھی تھی وہ ہو بہو آپ پر منطبق پائی اور پھر بھی ایمان نہ لائے۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی۔ اور یہ منافق ایسے احمق اور بیوقوف ہیں کہ وہ اپنی حماقت اور بیوقوفی کو بھی نہیں جانتے۔ جو احمق اپنی حماقت کو جانتا ہو وہ غنیمت ہے لیکن جو احمق اپنی حماقت اور سفاہت کو دانائی اور فراست سمجھتا ہو اس کا مرض لا علاج ہے۔ ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ منافقین اہل اخلاص کو زبان سے بیوقوف بتلاتے ہیں۔ آئندہ آیات میں یہ بتلاتے ہیں کہ محض زبان سے نہیں دل سے بھی ان کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔

منافقوں کی چوتھی قباحت

قال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ... الیٰ ... وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۝۱۱﴾

اور جب وہ منافقین ملتے ہیں اہل ایمان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیاطین الانس یعنی اپنے رؤسا کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ سوائے اس کے نہیں کہ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں تا کہ لوگوں پر مسلمانوں کی سفاہت اور بیوقوفی ظاہر ہو کہ محض زبانی اقرار سے ہمکو دعوائے ایمان میں سچا سمجھتے ہیں۔ شیاطین سے منافقین کے پیشوا اور سردار مراد ہیں جو دین الٰہی کے مقابلہ میں ہر قسم کے فتنہ اور فساد کے سرغنہ بنے ہوئے تھے۔ شیطان لغت میں سرکش اور حد سے گزرنے والے کو کہتے ہیں۔ خواہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے ہو۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ اہل نفاق کو چوں کہ ایمان سے دلی رغبت نہ تھی محض قتل سے جان بچانے کے لیے ایمان کا ظاہراً اقرار کرتے تھے۔ اس لیے ﴿اٰمَنَّا﴾ کہنے میں کسی حرف تاکید کا استعمال نہ کیا۔ اور جب اپنے شیاطین اور آئمۃ الکفر کی معیت اور مسلمانوں کے استہزاء کو بیان کیا تو حرف ﴿اِنَّ﴾ اور ﴿اِنَّمَا﴾ اور جملہ اسمیہ سے اس کو مؤکد کیا۔ یہ تاکیدی کلمات انکار کی بناء پر نہیں بلکہ اظہار شوق ورغبت کے لیے تھے۔ کما فی المطول۔ آئندہ آیت میں ان کے استہزاء اور تمسخر کا جواب ہے کہ یہ نادان کیا اہل ایمان کا استہزاء اور تمسخر کرتے ہیں ان کو یہ خبر نہیں کہ یہ لوگ خداوند علام الغیوب کے استہزاء اور تمسخر کا محل بنے ہوئے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ یہ کیا اہل ایمان اور اہل اخلاص کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ ﴿اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ۝۱۵﴾ ان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً تمسخر کرتا رہتا ہے اور اُن کی سرکشی اور گمراہی میں ان کو ترقی دیتا رہتا ہے درآں حالیکہ وہ اس میں سرگشتہ اور سرگرداں ہیں۔ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کا استہزاء یہ ہے کہ ان کو خوب مال ودولت دیا تا کہ خوب مغرور اور مست ہو جائیں اور پھر دفعۃً ان کو پکڑ لیا جائے۔ کافر اس مال ودولت کو نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ عذاب اور نقمت ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

﴿اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ ۝۵۵ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۝۵۶﴾ (مومنون)

ترجمہ: "کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جس مال اور اولاد سے ہم ان کی مدد کرتے ہیں اور ان کے لیے خیر اور بھلائی کے لیے سعی کر رہے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کو اس کا احساس نہیں کہ (یہ استدراج اور امہال ہے)"

بعض سلف صالحین سے منقول ہے کہ کافر جب کوئی معصیت کرتا ہے تو اللہ جل شانہ ظاہراً اس کے لیے کوئی دنیوی نعمت پیدا

فرماتے ہیں: "اور وہ حقیقت میں بلاء عظیم اور نقمت یعنی مصیبت ہوتی ہے۔" قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝۴۴﴾ (الانعام)

ترجمہ: "پس جب کہ وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب وہ خوش ہو گئے اس شے سے جو ان کو دی گئی تھی تو ہم نے ناگہانی طور پر ان کو پکڑ لیا پس وہ نا اُمید رہ گئے۔"

اور آخرت کا استہزاء اور تمسخر وہ ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے ایک جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ جب وہ اس دروازے تک پہنچیں گے تو وہ دروازہ فوراً بند کر لیا جائے گا۔ اور ان کو آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔ اہل جنت ان کی یہ حالت دیکھ کر ہنسیں گے۔ كَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝۳۴ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝۳۵﴾ (اخرجه البيهقى فى الاسماء والصفات) (در منثور)

ترجمہ: پس آج کے دن اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے اور تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھیں گے۔" (المطففین)

اور ایک استہزاء اور تمسخر قیامت کے دن یہ ہوگا کہ پل صراط پر اہلِ ایمان کے لیے ایک نور پیدا کیا جائے گا جب منافقین پہنچیں گے تو اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی۔

كَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ﴾ (الحدید: ۱۳)

﴿يَعْمَهُوْنَ﴾ عَمٰہ دل کی بینائی ضائع ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ آنکھ کی بینائی جاتے رہنے کو عمیٰ کہتے ہیں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝۴۶﴾ (الحج)

ترجمہ: "دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔"

آئندہ آیت میں ان کے قابل استہزاء ہونے کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کیوں قابل استہزاء نہ ہوں۔ یہ لوگ تو ایسے بیوقوف اور نادان ہیں کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا ہے۔ چناں چہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ ایسے ہی لوگوں نے یعنی جن کے دل نابینا اور اندھے ہو گئے۔ نہایت خوشی اور رغبت سے گمراہی کو ہدایت کے عوض خرید لیا۔ اشتراء کے معنی خوشی اور رضامندی سے خریدنے کے ہیں۔ تجارت اور خرید و فروخت میں خریدنے والے کی رضا شرط ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (نساء: ۲۹) لہٰذا اس مقام پر بجائے لفظ استبدال کے لفظ اشتراء لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے گمراہی کو ہدایت کے عوض میں نہایت خوشی سے قبول کیا ہے۔

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶﴾ پس نہ سودمند ہوئی ان کی تجارت اور وہ آخرت کی تجارت سے واقف بھی نہیں۔ آخرت کی تجارت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اور جان و مال سے اس کی راہ میں کوئی دریغ نہ ہو۔

كَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ (الصف) اور یہ لوگ تجارت میں نفع تو کہاں سے حاصل کرتے انہوں نے تو اصل سرمایہ ہی کو ضائع کر دیا۔ یہاں اصل سرمایہ سے فطرت سلیمہ اور قبولِ حق کی استعداد مراد ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ

اُن کی مثال جیسے ایک شخص نے سلگائی آگ پھر جب روشن کیا اس کے گرد کو

ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ

لے گیا اللہ ان کی روشنی اور چھوڑا اُن کو اندھیروں میں نظر نہیں آتا۔ بہرے ہیں

بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

گونگے اَندھے سو وہ نہیں پھریں گے۔

منافقین کی دو مثالیں

قال تعالیٰ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ ... الیٰ ... فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾﴾

ربط: حق جل شانہٗ جب منافقین کے قبائح بیان کر چکے تو مزید ایضاح کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ اچھی طرح ان کی سفاہت اور بے وقوفی واضح ہو جائے۔ جس کا ماقبل میں بیان ہوا۔

حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں بار بار ایمان اور ہدایت کو نور فرمایا ہے اور مردہ دلوں کے لیے حیات اور زندگی فرمایا ہے اور کفر اور ضلالت کو ظلمت اور تاریکی اور دلوں کی موت اور بربادی بتایا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے منافقین کے مناسب جنہوں نے ہدایت کے عوض میں ضلالت اور گمراہی کو اختیار کیا دو مثالیں بیان فرمائیں ایک ناری اور دوسری مائی، اس لیے کہ نار مادۂ نور ہے اور ماء یعنی پانی مادۂ حیات ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ﴾ (الانبیاء: ۳۰)

مثالِ اوّل منافقین

مثال ان منافقین کی کوتہ نظری اور غلط فہمی اور نور ہدایت کے بدلہ میں ظلمات ضلالت کو خرید کر خسارہ اٹھانے میں اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی۔ پس جب آگ نے اس کے آس پاس کو خوب روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو سلب فرمالیا اور چھوڑ دیا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے محمد رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی مشعل کو روشن کیا جس کی وجہ سے حق اور باطل اور ہدایت اور ضلالت خوب واضح اور روشن ہو گئے اور تمام مخلوق نے اس میں راہ پائی لیکن منافق اس وقت اندھے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے نور فطرت اور نور بصیرت کو سلب فرمالیا۔ آفتاب نبوت و ہدایت نے اگرچہ تمام عالم کو روشن اور منور کر دیا۔ مگر جب تک آنکھ میں نور اور بینائی نہ ہو تو آفتاب کی روشنی کیا کام آوے گی۔ کاش کہ نرے اندھے ہوتے تب بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ اندھا

کسی کو پکار کر اس کی بات سن سکتا ہے مگر جب بہرا اور گونگا بھی ہو تو پھر راہ پر آنے کی کوئی امید نہیں۔ نابینا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا۔ بہرا ہونے کی وجہ سے کسی کی نصیحت بھی نہیں سُن سکتا اور گونگا ہونے کی وجہ سے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ اسی طرح منافقوں کو نہ عقل کی آنکھ ہے کہ جس سے خود سیدھا اور غلط راستہ پہچانیں اور دیکھ سکیں اور نہ مرشد اور کسی اللہ والے کی طرف رجوع ہے کہ وہ ان کی دستگیری کرے اور ان کا راہنما بن جائے۔ اور نہ خود حق کی طرف کان لگاتے ہیں۔ پھر ایسے شخص کی راستہ پر آنے کی کیونکر اُمید ہو۔ ھذا توضیح ماقالہ الشاہ عبدالقادر الدھلوی فی موضح القرآن۔

اور حضرت شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مترجم گوید حاصل مثل آنست کہ اعمال منافقان ہمہ حبط شدند چنانکہ روشنی آں جماعۃ دو رشد۔ انتہیٰ۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ ہدایت کے بعد گمراہی میں چلا جانا ایسا ہے جیسا کہ روشنی کے بعد اندھیرے میں جا پھنسنا۔

عبداللہ بن مسعود اور دیگر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس آیت شریفہ کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے تو کچھ لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور بعد چندے منافق بن گئے تو ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ظُلمت اور تاریکی میں تھا اس نے آگ سلگائی اس کی روشنی سے آس پاس کی تمام چیزیں نظر آنے لگیں اور جو چیزیں بچنے کے قابل تھیں۔ وہ اس کو معلوم ہو گئیں۔ یکا یک وہ آگ بجھ گئی اور راستہ کے کانٹے اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ اب وہ حیران اور سرگرداں ہے کہ کس چیز سے بچے اور کس چیز سے نہ بچے۔ اسی طرح یہ منافقین پہلے سے کفر اور شرک کی ظلمتوں اور تاریکیوں میں تھے کہ اسلام لے آئے جس کی وجہ سے حلال وحرام، خیر اور شر سب معلوم ہو گیا۔ اور یہ سمجھ گئے کہ کس چیز سے بچیں اور کس چیز سے نہ بچیں۔ اسی حالت میں تھا کہ منافق ہو گیا۔ اور مثلِ سابق پھر ظلماتِ کفر میں جا پھنسا اب اس کو حلال اور حرام، خیر اور شر کی کوئی تمیز نہیں۔ (ابن کثیر)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ یہ تشبیہ نہایت صحیح ہے اوّل ایمان لا کر نور حاصل کیا۔ پھر نفاق کر کے اس نور کو ضائع کیا۔ اور ہمیشہ کے لیے حیرت میں پڑ گئے۔ راہ دنیا میں جو ظلمت کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوتی ہے اس کو اس پریشانی اور حیرت سے کہ جو راہِ آخرت میں باطنی ظلمات کی وجہ سے پیش آئے۔ وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریا کے ساتھ ہے۔ دنیا کی ہر پریشانی محدود اور متناہی ہے اور آخرت کی پریشانی غیر محدود اور غیر متناہی۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کسی وقت میں بھی ایمان نہیں لائے۔ ابتداء ہی سے منافق تھے کسی وقت بھی دل سے ایمان نہیں لائے یہ لوگ از اوّل تا آخر منافق رہے تو اس صورت میں آیت کا مطلب وہ ہوگا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابوالعالیہ اور ضحاک اور قتادہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ منافقین نے محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا اور محض ظاہراً اسلام لائے تو ان کو یہ نفع ہوا کہ اس کلمہ طیبہ کی روشنی میں دنیا میں خوب امن سے رہے۔ جان و مال محفوظ رہا۔ مسلمانوں کے ساتھ مال غنیمت میں شریک رہے۔ جب تک زندہ رہے کلمۂ شہادت کی روشنی سے یہ دنیوی منافع حاصل کرتے رہے۔ مرتے ہی ان کا یہ نور جاتا رہا اور عقابِ سرمدی کے ظلمات میں جا پھنسے۔ (ابن کثیر)

کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت اگر اخلاص سے کہا جائے تو سُبْحَانَ اللّٰہِ نُوْرٌ عَلٰی نُوْر ہے۔ لیکن یہ کلمہ اگر نفاق سے بھی کہا جائے تب بھی اس میں ایک نور ہے اگرچہ وہ اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ناتمام اور ناکافی ہے۔ اس لیے کہ یہ کلمہ سراسر حق ہے اگرچہ منافق اس کو اپنی حماقت سے حق نہ سمجھے۔ اور ہر حق میں نور اور روشنی ہے۔ بہر حال منافق کو اس کلمۂ طیبہ کے اعتراف واقرار کی وجہ سے ایک درجہ کا نور ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ ظلمت اور تاریکی جو کچھ ہے وہ نفاق کی وجہ سے ہے۔ اور اس کلمۂ حق کی روشنی سے دنیاوی فوائد اور منافع حاصل

کئے جن کو حق جل شانہٗ نے مَاحَوْلَهٗ سے تعبیر فرمایا۔ ہر منافق اور خودغرض کا طریق یہی ہے کہ ہر وقت اس کی نظر ماحول پر رہتی ہے۔ اسی طرح ان منافقین نے ظاہری ماحول کو دیکھ کر فقط زبانی قول پر اکتفا کیا اور بجائے مغز کے خول کو کافی سمجھا اور یہ نہ سوچا کہ ظاہری ماحول کو دیکھنا اَحْوَل (بھینگا) کا کام ہے۔ چوں کہ دنیاوی منافع چند روز ہوتے ہیں اس لیے اس کو تشبیہ اس جلانے والی آگ سے دی گئی جو تھوڑی دیر میں بجھ گئی اور اس کا نفع جاتا رہا اور دائمی حیرت وحسرت نے اس کو آ گھیرا۔ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ امام غزالی قدس اللہ سرہٗ مشکوٰۃ الانوار میں فرماتے ہیں کہ نور اس کو کہتے ہیں جو بذاتہٖ اور بنفسہٖ ظاہر ہو اور دوسرے کے لیے مُظْہِر ہو۔ علامہ سہیلی روض الانف ص ۱۲۶ میں فرماتے ہیں: کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو نور سے منتشر ہو۔ نور، ضیاء کے لیے اصل مبداء اور سرچشمہ ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ﴿جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ میں شمس کو ضیاء اور قمر کو نور فرمایا۔ اس لیے قمر کی روشنی میں وہ انتشار اور پھیلاؤ نہیں جو آفتاب کی روشنی میں ہے اور حدیث میں ہے کہ الصلوٰۃ نور والصبر ضیاء "نماز نور ہے اور صبر ضیاء ہے۔" نماز چوں کہ عمود اسلام ہے اور فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے اس لیے اس کو نور فرمایا کہ یہی نماز اس صبر کی اصل اور جڑ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ضیاء فرمایا ہے۔ فحشا اور منکر سے بچنا ہی صبر کا سرچشمہ ہے صبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے نفس کو خدا کی اطاعت پر روکنا اور اس کی معصیت سے بچانا۔ اس لیے صبر اسلام اور ایمان کے اکثر شعبوں کو حاوی اور شامل ہے لہٰذا صبر میں بہ نسبت نماز کے بہت زائد وسعت اور انتشار ہے جو نماز کی محافظت اور پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا اور چوں کہ نور اصل اور مبداء ہے اور ضیاء اس کے تابع ہے۔ اس لیے حق جل وعلاء پر نور کا اطلاق درست ہے۔ كما قال الله تعالىٰ: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (النور: ۳۵) اور ضیاء کا اطلاق جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس کا نور تمام روشنیوں کی اصل ہے اس کا نور کسی کے تابع نہیں۔ آہ کلامہ۔

حکماء نے نور اور ضیاء میں یہ فرق کیا ہے کہ جس روشنی میں حرارت اور گرمی ہو اس کو ضیاء کہتے ہیں اور جس روشنی میں ٹھنڈک ہو اس کو نور کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی آسان اور نرم شریعت کو نور فرمایا۔ كما قال الله تعالىٰ: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴾ (المائدہ) "بیشک آیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان نور اور ایک روشن کتاب"۔ اور شریعت موسویہ کا احکام شاقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ضیاء فرمایا۔ كما قال تعالىٰ: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً﴾ (الانبیاء: ۴۸) "بیشک دی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب اور تیز روشنی۔" اور اسی وجہ سے کہ نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور صبر میں حرارت اور گرمی ہے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا۔

اور اس مقام پر حق تعالیٰ شانہٗ نے ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ فرمایا اور ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِضُوْءِهِمْ﴾ نہ فرمایا اس لیے کہ مقصد یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہو گیا اور روشنی کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ ہر طرف سے ظلمت اور تاریکی نے ان کو آ گھیرا لہٰذا اگر اس مقام پر بجائے ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ کے ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِضُوْءِهِمْ﴾ کہا جاتا تو یہ معنیٰ ہوتے کہ اللہ نے ان کی ضیاء یعنی نور کی شدت اور اس کے انتشار کو زائل کر دیا۔ اور اصل نور باقی رہ گیا۔ اور یہ معنیٰ مقصود کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ مقصود تو یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہو گیا۔ اور یہ مقصد نہیں کہ اصل نور تو باقی رہا محض اس کی شدت اور اس کی تیزی زائل ہو گئی۔ فافهم ذٰلك فانه دقيق ولطيف.

ابتداء آیات میں چوں کہ تذکرہ نار کا تھا اس لیے بظاہر اس کا اقتضاء یہ تھا کہ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ میں بجائے نور کے نار کا ذکر کیا جاتا اور اس طرح کہا جاتا۔ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنَارِهِمْ﴾ "اللہ نے ان کی آگ کو بجھا دیا" لیکن بجائے نار کے نور کو اس لیے ذکر کیا گیا

کہ نار میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک نور اور ایک حرارت اور احراق (جلانا) لہٰذا اشارہ اس طرف ہے کہ اس نار میں سے نور (روشنی) کو تو سلب کر لیا گیا اور حرارت اور احراق کو باقی چھوڑ دیا گیا۔

﴿وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾ "اور چھوڑا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کسی شے کو بھی نہیں دیکھتے۔"

حدیث میں ہے کہ:

((الایمان بضع و سبعون شعبة)) . "ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ ایمان کا ہر شعبہ ایک نور اور مشعل ہے۔ علیٰ ہذا کفر اور نفاق کا ہر شعبہ ظلمت اور تاریکی ہے پس کفر اور نفاق کے شعبوں کے بقدر یہ لوگ ظلمات اور تاریکیوں میں مبتلا ہیں۔ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس یہ لوگ اب کسی صورت سے حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ اس لیے کہ جب ان کی روشنی چھین لی گئی اور اندھیروں میں چھوڑ دیے گئے تو ایسے مدہوش ہو گئے کہ سارے حواس مختل ہو گئے لہٰذا اب نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ سُن سکتے ہیں اور نہ زبان سے کسی سے پوچھ سکتے ہیں پس ضائع کردہ نور ہدایت کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں۔

تنبیہ: یہ مثال ان منافقین کی ہے جن کے دلوں میں نفاق خوب راسخ ہو چکا ہے اب وہ کسی طرح ہدایت کی طرف رجوع کرنے والے نہیں۔ جیسا کہ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ سے معلوم ہوتا ہے اور دوسری آنے والی مثال ان منافقین کی ہے جو ابھی متردد اور مذبذب ہیں۔ کبھی اسلام کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف حیران ہیں کہ کیا کریں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ	
یا جیسے مینہ پڑتا آسمان سے اس میں اندھیرے اور گرج اور بجلی ڈالتے ہیں	
اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ	
انگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے ڈر سے موت کے اور اللہ گھیر رہا ہے	
بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ	
منکروں کو قریب ہے بجلی کہ اُچک لے ان کی آنکھیں جس بار چمکتی ہے ان پر	
مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ	
چلتے ہیں اس میں اور جب اندھیرا پڑا کھڑے رہے اور اگر چاہے اللہ لے جائے ان کے	
بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ع ۲/۱۳/۲	
کان اور آنکھیں بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔	

منافقین کی دوسری مثال

قال اللہ تعالیٰ :﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ ... الیٰ ... اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٠﴾

یا مثال [1] ان منافقین کی گمراہی کو ہدایت کے بدلہ خرید کر خسارہ اٹھانے میں ایسی ہے جیسے آسمان سے زوردار پانی پڑ رہا ہو۔ من السمآء کا لفظ بڑھانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بارش آسمان کے تمام اطراف اور جوانب کو محیط ہے جس طرح پورے آسمان کو سماء کہتے ہیں اسی طرح آسمان کی جانب کو بھی سماء کہتے ہیں۔ نیز ﴿مِنَ السَّمَآءِ﴾ کے لفظ میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ اس بارش کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کس کی مجال ہے کہ آسمان سے آنے والی چیز کو روک سکے۔ اس میں اندھیرے اور گرج اور بجلی ہے۔ جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں۔ خوف کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہے کہ انگلیوں کے پورے نہیں بلکہ پوری انگلیاں اپنے کانوں کے انتہائی سوراخ تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ ہولناک آواز کی وجہ سے موت کے ڈر سے اور اس خوف کی شدت میں یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اللہ تو کافروں کا احاطہ کرنے والا ہے۔ کانوں میں انگلیاں دینا اس کے عذاب سے کسی طرح نہیں بچا سکتا۔ قریب ہے کہ بجلی اُن کی آنکھیں اُچک لے جب وہ برق ان کے لیے چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں وہ چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو حیران کھڑے رہ جاتے ہیں۔ یعنی دین اسلام بمنزلہ باران رحمت کے ہے جو مردہ دلوں کے لیے آب حیات سے کہیں بڑھ کر ہے اور سراسر رحمت ہی رحمت اور نعمت ہی نعمت ہے۔ مگر ابتداء میں کچھ محنت اور سختی ہے جیسے بارش رحمت ہی رحمت ہے اور مردہ زمین کی حیات اور زندگی ہے۔ مگر اول میں کچھ کڑک اور بجلی بھی ہے۔ منافق اوّل کی سختی سے ڈر گئے اور وہ برائے نام مصائب جو حقیقت میں ان کے تزکیۂ نفس کے لیے تھیں ان سے گھبرا گئے۔ اور جس طرح بجلی کی چمک سے روشنی پیدا ہو کر راستہ نظر آ جاتا ہے اور بادل کی کڑک سے دل کانپ جاتا ہے۔ اسی طرح منافق جب دنیوی منافع (جیسے جان و مال کی حفاظت، مال غنیمت میں سے حصہ ملنا) ان منافع پر نظر کرتا ہے تو اسلام کی طرف جھک جاتا ہے اور مثلاً جب جہاد کی سختی پر نظر کرتا ہے تو پھر اسلام سے بدک جاتا ہے بہر حال جس طرح بجلی میں کبھی روشنی اور اجالا اور کبھی تاریکی اور اندھیرا۔ اسی طرح منافق کے دل میں کبھی اقرار ہے اور کبھی انکار۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ﴾ (الحج:۱۱)

الحاصل: ان آیات شریفہ میں دین اسلام کو بارانِ رحمت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اُن کے شبہات اور نفسانی اغراض کو ظلمات کے ساتھ اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والی آیات کو رعد کے ساتھ اور فتوحاتِ اسلام اور غلبۂ دینِ حق کو برق کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جب عذاب سے ڈرانے والی آیتیں نازل ہوتی ہیں تو یہ منافق ان کو سننا نہیں چاہتے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور جب کبھی غلبہ اسلام کی برق کوندنے لگتی ہے اور اسلام کا نور چمکنے لگتا ہے تو اسلام کی طرف چلنے لگتے ہیں اور جب اغراضِ نفسانی کی ظلمت اور تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں: مترجم گوید حاصل مثل آں ست کہ منافقان در ظلمت نفسانی افتادہ اند و چوں مواعظ بلیغہ شنوند فی الجملہ ایشاں را تنبیہے میشود و آں فائدہ نکند مانند مسافراں کہ در شب تاریک وابر حیران باشند و در برق دو سہ قدم بروند و باز بنشینند۔ واللہ اعلم

مثلاً کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم آتا ہے تو پھر اسلام کی طرف چلنے سے رُک جاتے ہیں۔

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲۰﴾

"اور اگر خدا چاہتا تو بغیر بجلی اور کڑک ہی کے ان کے کان اور آنکھیں سب ہی لے جاتا۔ بیشک اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔"

وہ کسی سبب کا محتاج نہیں اور نہ اس کے لیے کوئی مانع ہے۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ ابھی اس فریق کو پہلے فریق کی طرح بالکل اندھا اور بہرہ نہیں بنایا۔ اس فریق سے ابھی ایمان کی امید بالکل قطع نہیں ہوئی ہے۔ شاید یہ ایمان لے آئیں۔ بخلاف پہلے فریق کے کہ جن کی مثال ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ میں ذکر کی گئی۔ ان کے ہدایت پر آنے کی کوئی امید نہیں اس لیے کہ اللہ نے ان کے نور کو بالکل سلب فرمالیا۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ اور وہ بہرے اور گونگے اور اندھے ہیں ﴿فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف لوٹنے والے نہیں اسی وجہ سے اس فریق کے لیے ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کے نورِ فطرت کو ابھی بالکل زائل نہیں فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے بنایا تم کو اور تم سے اگلوں کو
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ
شاید تم پرہیزگاری پکڑو جس نے بنا دیا تم کو زمین بچھونا اور آسمان
بِنَآءً ص وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
عمارت اور اُتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے کھانا
لَّكُمْ ج فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲
تمہارا سو نہ ٹھہراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو۔

تعلیم توحید

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ... اِلٰى... وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲﴾

ربط: یہاں تک مؤمنین اور کافرین اور منافقین کے احوال علیحدہ علیحدہ بیان فرمائے اب اس آیت میں علی العموم سب کو خطاب فرماتے ہیں۔ نیز وہ ہدایت جس کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی وہ دو اصولوں پر منقسم ہے ایک توحید اور دوسرے رسالت۔ اس لیے اول توحید اور عبادت کا مضمون ارشاد فرماتے ہیں: جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی جڑ ہے۔ یعنی یہ کتاب متقین کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔ لیکن

تقویٰ کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صرف خدائے وحدہ للہ لاشریک لہٗ کی عبادت کرو اسی وجہ سے ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ کے بعد ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱﴾ فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ شروع سورت میں اس کتاب کا متقین کے لیے موجب ہدایت ہونا بیان فرمایا تھا اب ان آیات میں تحصیل تقویٰ کا طریقہ بتلاتے ہیں چناں چہ فرماتے ہیں اے لوگو اگر واقع میں تم انسان ہو اور اپنی انسانیت کی حفاظت چاہتے ہو تو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا یعنی تم کو اور تمہارے اصول (آباء واجداد) کو پردۂ عدم سے نکالا اور وجود کا عجیب وغریب خلعت تم کو پہنایا تا کہ تم اس غیر مترقب نعمت اور عمدہ مرحمت کا شکر کرو اور متقی اور پرہیز گار بن جاؤ۔ متقی بننے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر وقت تم اس امر کو پیشِ نظر رکھو کہ وہ تمہارا پروردگار ہے ایک لمحہ اور ایک لحظہ کے لیے تم اس کی تربیت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتے اسی نے تم کو اور تمہارے آباؤ اجداد کو جن سے تم پیدا ہوئے ہو محض اپنی قدرت سے کتم عدم سے نکال کر وجود کا خلعت پہنایا ہے۔ اپنے امکان کو سوچو تا کہ اس کا وجوب معلوم ہو۔ اپنی عاجزی اور درماندگی کو سوچو تو اس کا قادر مطلق ہونا معلوم ہو اپنی ذلت اور خواری کو سوچو تو اس کا عزیز مطلق اور ذوالجلال والاکرام ہونا معلوم ہو۔ اپنے مملوک ہونے کو سمجھو تا کہ اُس کا مالک ہونا سمجھ میں آئے۔ وعلیٰ ہذا القیاس غایت محبت اور نہایت تعظیم واجلال کے ساتھ انتہائی تذلل کا نام عبادت ہے۔ مطلق محبت اور مطلق تعظیم اور مطلق تذلل کا نام عبادت نہیں۔ اسی وجہ سے اولاد کی محبت اور والدین اور اساتذہ کی تعظیم اور ان کی تواضع عبادت نہیں کہلائے گی۔ تمام عالم عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا اور سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے اسی عبادت کی دعوت دی۔ حضرت نوح، ہود، صالح اور شعیب وغیرہم علیہم السلام نے یہی فرمایا:

﴿اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ ترجمہ: "ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝۲۵﴾ (الانبیاء)
ترجمہ: "آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی بھیجتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں) پس میری ہی عبادت کرو۔"

اس لیے اب آئندہ آیت میں معرفت معبود کا طریقہ بتاتے ہیں کہ معبود وہ ہے جس نے آسمان اور زمین کو بنایا۔ الخ

﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲﴾
ترجمہ: "وہ پاک ذات کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس پانی سے تمہارے کھانے کے لیے قسم قسم کے کچھ پھل اور میوے نکالے پس خدا کے لیے اس کے مقابل اور مماثل ہمتا اور شریک نہ بناؤ اور حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔"

کہ تمہارا اور ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور ان انعامات اور انتظامات میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں پس ان انعامات کے شکر میں خاص اسی کی عبادت کرو اور کسی دوسرے کو شریک نہ کرو یعنی یہ سارا عالم بمنزلہ ایک مکان کے ہے۔ آسمان اس کی چھت ہے اور زمین اس کا فرش ہے اور شمس وقمر اور نجوم وکواکب اس گھر کے شمع اور چراغ ہیں۔ قسم قسم کے پھل اور الوان نعمت اس کے دسترخوان پر چُنے ہوئے ہیں۔ عالم کے تمام شجر وحجر اور تمام چرند پرند انسان کی خدمت کے لیے حاضر اور مسخر ہیں اور

یہ مکان اس کے رہنے کے لیے ہے پس جس خدا نے یہ تمام نعمتیں پیدا کیں وہی قابل پرستش ہے جب ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو اس کی عبادت اور بندگی میں دوسروں کو کیوں شریک کرتے ہو۔

ابر و با دومہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار — شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

خلاصۂ کلام یہ کہ جو بارانِ رحمت آسمان سے برس رہی ہے وہ بندہ کی زندگی اور حیات ہے اور رزق اس کی غذا ہے عاقل اور دانا کا کام یہ ہے کہ باران رحمت کو نعمتِ عظمیٰ سمجھے نہ یہ کہ اس سے بھاگے۔ اسی طرح اہل ایمان اور اہلِ اخلاص کو چاہئے کہ ہدایت خداوندی کی جو بارش آسمان سے ہو رہی ہے اس کو اپنی روحانی زندگی کا آبِ حیات سمجھیں۔ منافقوں کی طرح نہ اس سے بھاگیں اور نہ کانوں میں انگلیاں دیں۔ مسند احمد بن حنبل میں باسناد حسن حارث اشعری سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کہ اللہ جل شانہٗ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے متعلق حکم فرمایا کہ ان پر خود بھی عمل کریں اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کریں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کو حکم کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ! ان احکام کا یا تو خود آپ بنی اسرائیل کو جلد حکم کریں یا مجھ کو اجازت دیں کہ میں بنی اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کا حکم کروں۔ یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ نے سبقت کی تو مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کوئی عذاب نہ آ جائے۔ یحییٰ علیہ السلام نے فوراً ہی بنی اسرائیل کو مسجد اقصیٰ میں جمع فرمایا اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور یہ کہا کہ اللہ نے مجھ کو پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ خود بھی ان پر عمل کروں اور تم کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کروں پہلی بات یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے اپنے خالص مال سے بغیر کسی کی شرکت کے ایک غلام خریدا وہ غلام دن میں جو کچھ کماتا ہے وہ بجائے آقا کے کسی اور کو دے دیتا ہے کیا کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو۔ حاشا ہرگز نہیں اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالیٰ ہی تمہارا خالق اور رازق اور مالک ہے پس اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ (بقیہ حدیث کے لیے تفسیر ابن کثیر کی طرف رجوع کریں)

فائدہ: امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ اس آیت شریفہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگر ہزار اطاعت اور عبادت بھی کرے تو ذرہ برابر ثواب کا مستحق نہیں اس لیے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت اس لیے واجب ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اوّل تو تم کو پیدا کیا اور پھر بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ لہٰذا اس منعم حقیقی کا شکر بذریعہ عبادت کے تم پر واجب اور لازم ہے بادشاہ کے انعام و اکرام کے بعد اگر کوئی بادشاہ کا شکر کرے تو اس شکر کی وجہ سے وہ شخص اپنے کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا بلکہ محض فریضۂ شکر سے عہدہ برآ ہو جانے کو غنیمت سمجھتا ہے اور یہ خوب سمجھتا ہے کہ میرا یہ شکر بادشاہ کے انعام و احسان کے مقابلے میں ہیچ ہے اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ کے شکر کو سمجھو کہ بندہ کتنی ہی عبادت کرے۔ اس کی ایک نعمت کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتا۔ استحقاق تو درکنار۔ مگر اس نے محض اپنی رآفت و رحمت اور اپنے فضل عمیم سے ہماری ناقص عبادتوں پر بھی اجر اور ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

﴿رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝۱۹۴﴾ اٰمِیْن. (آل عمران)

حق جل شانہٗ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ معبود کی معرفت کے پانچ طریقے بتلائے یا یوں کہو کہ پانچ قسم کے دلائل بیان کئے دو تو نفس کے متعلقات میں سے ہیں اور تین آفاق سے متعلق ہیں اوّل ﴿خَلَقَكُمْ﴾ فرمایا کہ تم اپنے نفسوں میں

غور کرو کہ تم کو عدم کے بعد وجود کی نعمت عطاء کی۔ دوم یہ کہ تمہارے آباؤ اجداد کو وجود عطاء کیا۔ اور نیست سے ہست کیا جس کو ﴿وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ سے ذکر فرمایا۔ سوم یہ کہ زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا چہارم یہ کہ آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا۔ پنجم یہ کہ آسمان اور زمین کی شرکت سے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے۔ پس جس خداوندِ ذوالجلال نے یہ عجیب وغریب نعمتیں تم کو عطاء کی ہیں اس سے تم اس کی قدرت وعظمت کا اندازہ لگالو۔ اور ہم تن اس کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو کیونکہ عبادت خالص اسی منعم حقیقی کا حق ہے۔

غرض یہ کہ ﴿اُعْبُدُوْا﴾ اس سورت میں پہلا حکم ہے اور ﴿وَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ پہلی نہی ہے اور یہی اسلام کی سب سے پہلی تعلیم ہے کہ صرف خُدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور کسی کو اس کا شریک اور مثل نہ جانو حق تعالیٰ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ استحقاق عبادت کے وجوہ اور دلائل بھی بیان کئے جو سب کے سب فطری اور عقلی ہیں۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ
اور اگر ہو تم شک میں اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس
مِّثْلِهٖ ص وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾
قسم کی اور بلاؤ جن کو حاضر کرتے ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ
پھر اگر نہ کرو اور البتہ نہ کرو گے تو بچو آگ سے جس کی چھپٹیاں ہیں آدمی
وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
اور پتھر تیار ہے منکروں کے واسطے

اثباتِ رسالتِ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بضمن اثباتِ حقی قرآنِ عظیم

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا... الٰى... اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں عبادت اور معرفت معبود کے طریقے بتلائے اور محکم دلائل سے وجود صانع اور اس کی توحید کو ثابت کیا اور شرک کو باطل کیا اب ان آیات میں دلائل نبوت بیان کرتے ہیں جس سے آنحضرت ﷺ کی نبوت ورسالت کی معرفت حاصل ہو۔ اور معرفت نبوت کا طریقہ معجزہ ہے اس لیے ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کی نبوت ورسالت ثابت کرنے کے لیے آپ ﷺ کے سب سے اعلیٰ اور افضل معجزہ کو ذکر کرتے ہیں تا کہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت میں منکرین کو کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

ربط دیگر : علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں عبادت کا حکم فرمایا تھا اور ظاہر ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی عبادت مقبول ہے جو اس کی نازل کی ہوئی کتاب سے معلوم ہو لہٰذا آئندہ آیات میں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ذکر فرمائی کہ اگر تم اس کتاب کو کتاب اللہ نہیں سمجھتے بلکہ معاذ اللہ اسے محمد ﷺ کی تصنیف اور بنائی ہوئی کتاب سمجھتے ہو تو اس کتاب کی ایک سورت ہی کے مثل ایک سورۃ بنا کر پیش کرو۔ چناں چہ فرماتے ہیں: ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ اور اس کتاب کے کتابِ الٰہی ہونے میں ذرہ برابر کوئی شک اور تردّد نہیں جیسا کہ ابتداء سورت میں ارشاد ہوا: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ﴾ لیکن اگر تم قصور فہم یا عناد کی وجہ سے اس کتاب کے بارہ میں جس کو ہم نے اپنے بندہ پر بتدریج نازل کیا۔ تم کسی شک اور خلجان میں مبتلا ہو گئے تو تم بھی اسی طرح ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت جو فصاحت و بلاغت اور ہدایت و ارشاد اور علوم اور معارف میں اس کتاب کے مماثل اور مشابہ ہو لے آؤ قرآن کریم کا وقتاً فوقتاً ضرورت اور واقعات کے لحاظ سے بتدریج نازل ہونا یہی مشرکین کے شک کا زیادہ سبب تھا کہ اگر یہ کلام الٰہی ہے تو تورات و انجیل کی طرح دفعتاً کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ (الفرقان: ۳۲) تدریج تو بشر کے کلام میں ہوتی ہے جیسا کہ شعراء اور خطباء وقتاً فوقتاً حسب موقعہ اور ضرورت اشعار اور خطبات لکھتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ تم ان کافروں سے یہ کہہ دو کہ اگر تم اس زعم فاسد اور خیال باطل کی وجہ سے اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں متردد ہو تو تم بھی اسی طرح ایک ہی [1] مرتبہ اس جیسی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت بنا لاؤ۔ جو فصاحت و بلاغت اور حسن معانی اور لطائف اور احکام معاش و معاد میں قرآن کا نمونہ ہو اور یہ قرآن اگرچہ بتدریج نازل ہوا ہے مگر اوّل تا آخر مربوط اور مسلسل ہے۔

کلام عرب میں تحقیق اور یقین کے لیے کلمہ اِذَا اور شک اور تردّد۔ ظن اور تخمین کے لیے کلمۂ ﴿اِنْ﴾ مستعمل ہوتا ہے اس مقام پر بجائے۔ ﴿وَاِذَا كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ کے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ﴾ میں کلمۂ ﴿اِنْ﴾ استعمال کرنے میں بظاہر اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ابھی اس میں بھی تردد ہے کہ تم کو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں واقعی شک اور تردد ہے۔ یا دل سے تو تم اس کو کتاب الٰہی سمجھتے ہو اور ظاہر میں محض عناد کی وجہ سے اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں شک اور تردد ظاہر کرتے ہو۔ اور رَیبٍ کی تنوین تحقیر کے لیے ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا شبہ کوئی قوی نہیں بلکہ ایک نہایت معمولی اور مہمل اور حقیر شبہ ہے جو سراسر قصور فہم اور عناد پر مبنی ہے۔ اس عجیب و غریب بے مثل اور بے نظیر کتاب میں بھی اگر تردد اور شک کی گنجائش ہے تو پھر توریت و انجیل کے کتابِ الٰہی تسلیم کرنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا۔

جس شپرہ چشم کو عین نصف النہار کے وقت نور آفتاب میں شک اور تردد لاحق ہوتا ہو۔ وہ شب دیجور میں کواکب اور نجوم کا نور کہاں تسلیم کر سکتا ہے۔ رہا وید سو آج تک اس کا بھید کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ اس کی کیا مراد ہے اور اس کے کیا معنی ہیں لہٰذا جس کتاب کا کوئی مفہوم ہی معلوم اور متعین نہ ہوا اس کے بارہ میں شک اور تردد کا سوال ہی عبث ہے ﴿عَلٰى عَبْدِنَا﴾ "اپنے خاص بندے پر" اس سے سرورِ عالم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ اس اضافت میں (یعنی ہمارے عبد کہنے میں) ایک تو آں حضرت ﷺ کی تعظیم و تکریم کی طرف اشارہ ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔ ؎

---

[1] اشارۃ الی ان الامر بالاتیان فی قولہ تعالٰی ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ لا یقتضی التکرار۔ ۱۲ عفا عنہ

لاتدعنی الا بیا عبدھا فانہ اشرف اسمائی

مت پکارا کر مجھ کو مگر اس محبوب کا عبد اور غلام کہہ کر میرا یہ نام سب ناموں سے افضل اور بہتر ہے۔

اگر یکبار گوید بندۂ من از عرش بگذرد خندۂ من

دوسرے اس اضافت میں آپ کے مطیع ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ ہمارے نہایت ہی مطیع اور فرمانبردار بندہ ہیں اور ﴿عَلٰی عَبْدِنَا﴾ میں کلمۂ ﴿عَلٰی﴾ کے لانے میں جو کہ کلام عرب میں استعلاء، غلبہ اور احاطہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ کلام الٰہی کے انوار و برکات اور وحی ربانی کے تجلیاتِ خدا کے اس خاص بندہ کو ہر طرف اور ہر جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

﴿بِسُوْرَةٍ﴾ لفظ سورت قرآن کریم کی ہر سورت کو شامل ہے خواہ وہ طویل ہو یا قصیر جس طرح قرآن کی طویل سورتیں معجز ہیں اسی طرح چھوٹی سورتیں جیسے سورۂ اخلاص اور سورۂ کوثر اور سورۂ عصر بھی معجز ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ لوگ اگر فقط سورۂ والعصر میں تدبر اور تامل کریں تو ان کے لیے کافی اور وافی ہے۔ آھ۔ بلکہ قرآن کا جملہ تامہ معجز ہے۔ تمام عالم کے فصحاء اور بلغاء مل کر بھی اگر چاہیں کہ قرآنِ کریم جیسا ایک جملہ بنالائیں تو ناممکن اور محال ہے۔

اوّل حق تعالیٰ شانہٗ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمام جن اور انس مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ جیسا کہ سورۂ اسرا [1] میں ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ تمام قرآن کا مثل اگر نہیں لا سکتے تو دس سورتیں ہی اس جیسی بنا کر پیش کر دو۔ جیسا کہ سورۂ ہود [2] میں ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت اس سورت کے مماثل بنالاؤ جیسا کہ سورہ یونس [3] میں ہے اور یہ تمام اعلانات مکہ مکرمہ ہی میں کئے گئے۔ اس لیے کہ یہ تمام سورتیں مکی ہیں یعنی سورۂ اسراء جس میں تمام قرآن کے مثل لانے کا ذکر ہے اور سورۂ ہود جس میں دس سورتوں کے لانے کا اور سورۂ یونس جس میں ایک سورت کے لانے کا ارشاد ہے یہ تمام سورتیں مکہ ہی میں نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں پہنچ کر پھر ایک سورۃ کے مثل لانے کا اعلان کیا گیا ہے جیسا کہ اس آیت یعنی ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ میں مذکور ہے اس لیے کہ یہ سورت یعنی بقرہ مدنی ہے۔ اور ہجرت کے بعد سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی۔ ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ اور اگر تم تنہا اس کے مثل لانے پر قادر نہیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم سوائے خدا تعالیٰ کے اپنے تمام اعوان و انصار کو بلالو اگر تم اپنے اس اعتقاد میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں تا کہ وہ تمہاری اس کام میں مدد کر سکیں اور اس مشکل کو حل کر سکیں اور سب مل کر قرآن کے ہم پلہ کلام لا سکیں۔ پس اگر تم سب مل کر بھی ایسا نہ کر سکو۔ یعنی اس کے مثل کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی نہ لا سکو اور ہم پیشین گوئی کیے دیتے ہیں کہ تم ہرگز نہ لا سکو گے۔ قرآن کا ایک اعجاز تو یہ تھا کہ کوئی اس کے مثل نہیں لا سکتا۔ دوسرا اعجاز یہ ہے کہ پہلے ہی پیشینگوئی کر دی گئی اور غیب کی خبر دے دی گئی کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے مثل نہ لا سکے گا۔ بحمد للہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے اور کوئی شخص اس کے مثل نہ لا سکا۔ بالفرض اگر کوئی شخص قرآن کا معارضہ کرتا تو ضرور نقل ہوتا اس لیے کہ ہر زمانہ میں قرآن

---

[1] کَمَا قَالَ اللّٰہ تَعَالٰی: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝﴾ ۱۲۔

[2] کَمَا قَالَ اللّٰہ تَعَالٰی: ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ ۱۲۔

[3] کَمَا قَالَ اللّٰہ تَعَالٰی: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ ۱۲۔

کے مخالفوں کا عدد ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ اگر کسی نے قرآن کریم کا معارضہ کیا ہوتا تو اس کا مخفی رہنا ناممکن تھا۔

خلاصہ یہ کہ اگر تم اس کا مثل نہ لاسکو اور ہرگز نہ لاسکو گے تو پھر میری نبوت کی تصدیق کرو۔ اور اس کو کلام ربانی اور وحی رحمانی سمجھو۔ تم ذرا تو غور کرو کہ ایک یتیم بیکس اور امّی جس کا سارا عرب مخالف اور دشمن ہو وہ ایسا عظیم الشان دعویٰ بغیر تائید الٰہی کیسے کرسکتا ہے کہ تمام جن اور انس بھی اس کا مثل نہیں لاسکتے اور اگر تم اس کی تصدیق نہیں کرتے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اس جگہ پتھر سے یا تو عام پتھر مراد ہیں یا گندک کے پتھر مراد ہیں یا وہ بت مراد ہیں جن کو کافر پوجتے تھے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ﴾ (الانبیاء:۹۸)

ترجمہ: ”یعنی تم اور وہ بُت جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں۔“

جو دراصل خاص کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ البتہ گناہوں کا میل کچیل صاف کرنے کے لیے گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لیے جہنم میں رکھا جائے گا۔ پھر جو اصل ذات ہی سے نجاست اور گندگی ہیں وہ تو دوزخ میں رہ جائیں گے اور جو اصل سے پاک ہیں یعنی مومن ہیں اور گناہوں کی عارضی نجاست ان پر لگ گئی۔

کما فی حدیث البخاری: ((ان المؤمن لاینجس)) ترجمہ: ” وہ پاک صاف ہونے کے بعد نکال لیے جائیں گے۔“

فائدہ: اس آیت سے اور آئندہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے صاف ظاہر ہے کہ دوزخ ابھی موجود ہے جو لوگ اس کے قائل ہوئے کہ جنت و جہنم ابھی موجود نہیں بلکہ قیامت کے دن موجود ہوگی۔ صریح غلطی پر ہیں اور یہ قول سراسر آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ علامہ زبیدی اتحاف شرح احیاء ص ۲۲۱ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ اسی پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ حادی الارواح الی بلاد الافراح میں فرماتے ہیں: ”جنت تیار کی جا چکی ہے مگر اس میں کچھ خالی میدان ہیں جن میں بندوں کے اعمال صالحہ سے باغات اور محل تیار ہوتے ہیں۔“ مثلاً حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے اس کے لیے جنت میں ایک محل تیار ہو جاتا ہے یا جو شخص ایک مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ ایک مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، ایک مرتبہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ یا ایک مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے اس کے لیے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ تفصیل کسی اور موقع پر کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں شک ہے اور ہماری وحی کو انسانی کلام جانتے ہو تو اُٹھو اور میدانِ معارضہ میں آجاؤ۔ مگر ہم پہلے ہی پیشینگوئی کیے دیتے ہیں کہ تم سب مل کر بھی اس کا معارضہ نہیں کرسکتے پس اگر تم معارضہ نہ کرسکو اور تم پر اپنا عجز اور قصور واضح ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ ایمان لے آؤ ورنہ سخت عذاب میں گرفتار ہوگے۔

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
اور خوشی سنا ان کو جو یقین لائے اور کام نیک کیے کہ ان کو ہیں باغ بہتی
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا
نیچے ان کے ندیاں جس بار ملے ان کو وہاں کوئی میوہ کھانے کو کہیں یہ

الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ

وہی ہے جو ملا تھا ہم کو آگے اور ان کے پاس وہ آئے گا ایک طرح کا اور ان کو ہیں وہاں عورتیں

مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

ستھری اور ان کو وہاں ہمیشہ رہنا۔

ذکرِ معاد یعنی قیامت کا بیان اور بشارتِ مؤمنین صالحین

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا... الیٰ... وَّهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾

ربط: حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ سُنّت ہے کہ جب کبھی ترغیب اور وعدہ اور بشارت کا ذکر فرماتے ہیں تو اس کے ساتھ ترہیب اور وعید اور انذار کو بھی ذکر فرماتے ہیں تا کہ خوف اور رجاء سے مل کر ایمان میں ایک اعتدالی کیفیت پیدا ہو جائے اسی سنت کے مطابق حق تعالیٰ نے ان آیات میں جب انذار اور کافروں کی وعید کو ذکر فرمایا تو آئندہ آیات یعنی ﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا... الایۃ﴾ میں مومنین صالحین کے لیے بشارت کا ذکر فرمایا۔ نیز وہ انذار اور تہدید اگرچہ دشمنوں کو تھی مگر عاشقان جاں نثار میں تو اس کے سننے کی بھی سہار نہیں وہ تو سُن کر گھبرا جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی تسلی اور دل تھامنے کے لیے بشارت ذکر فرمائی۔ تا کہ بشارت کی مسرت اور مخاطبت کی لذت سے وہ پریشانی، مبدل بہ شادمانی ہو جائے چناں چہ فرماتے ہیں اور خوش خبری دیدیجیے آپ اُن لوگوں کو جو اس کتاب پر ایمان لائے اور اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی اور اس کتاب کی ہدایت کے مطابق نیک عمل کئے کہ ان کے لیے عجیب قسم کے باغات ہیں۔ ہر ایک کا باغ اس کے ایمان اور عمل صالح کے مطابق ہوگا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی عثمان غنی فرماتے ہیں کہ عمل صالح اس عمل کو کہتے ہیں جو خالص اللہ کیلئے ہو اور ریاء سے بالکلیہ پاک ہو۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾﴾ (الکہف)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمل صالح وہ عمل ہے جس میں چار چیزیں جمع ہوں۔ ① علم ② نیت ③ صبر ④ اخلاص۔ (معالم التنزیل)

ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بشارت کا پورا استحقاق جب ہے کہ جب ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی ہوں۔ اس آیت میں متعلقات ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیل نہیں فرمائی صرف بالا جمال اتنا کہہ دیا کہ جو لوگ ایمان دار اور نیک کردار ہوں گے ہم انہیں اُن کے وہم وخیال سے بڑھ کر انعام دیں گے۔

جنت لغت میں باغ کو کہتے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں ایک خاص مکان کا نام ہے جو نشأۃ آخرت میں ہمیشہ کے لیے ابرار ومتقین کو عنایت ہوگا۔ جیسا کہ جہنم اس مخصوص مکان کا نام ہے جس میں کفار کو ہمیشہ کے لیے اور گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لیے رکھا جائے گا۔ جنت اور جہنم پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں اور اس کی حقیقت کی تحقیق کے درپے نہیں۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ نے جس قدر جنت اور جہنم کے احوال واوصاف بیان کیے ہیں ان پر ان سے ایک حرف بھی زیادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ عالم غیب میں قیاس

نہیں چلتا۔

﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ترجمہ: "جن کے نیچے سے نہریں نہایت تیزی سے بہتی ہیں۔"

﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ﴾ جب کبھی دیئے جائیں گے ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کے لیے تو یہ کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہم پہلے دیئے گئے اور دیئے جائیں گے وہ ایسا پھل کہ جو محض دیکھنے میں ایک دوسرے کے مشابہ اور ہم رنگ ہوگا۔ مگر ذائقہ میں مختلف ہوگا۔ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس اور دیگر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ یہ تشابہ اور تماثل محض لون اور صورت کے اعتبار سے ہوگا۔ مزہ اور لذت میں ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہوگا۔ یہ اس لیے ہوگا کہ ہر مرتبہ جدید مسرت اور نئی خوشی حاصل ہو۔ خلاصہ یہ کہ جنت کے میوے شکل اور صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے مگر مزے میں جُدا اور مختلف ہوں گے۔ اہل جنت جب کسی پھل کو دیکھیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ وہ پہلا ہی پھل ہے مگر جب چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے ﴿وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ اور ان کے لیے وہاں ایسی عورتیں ہوں گی جو ہر قسم کی ظاہری اور باطنی گندگی سے پاک ہوں گی۔

﴿وَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی یہ نعمتیں ہمیشہ رہیں گی۔ دنیا کی نعمتوں کی طرح ان کو زوال اور فنا نہیں۔ نعمت کتنی ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو مگر زوال اور فنا کا اندیشہ اس کو مکدر کر دیتا ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے۔

مرا در منزل جاناں چہ من و عیش چوں ہر دم
جرس فریادمی دارد کہ بر بندید محملہا

اس لیے ارشاد ہوا کہ تم مطمئن رہو، ہمیشہ تم انہیں نعمتوں میں رہو گے، تنعّم اور لذائذ کا مدار تین چیزوں پر ہے ① عمدہ مکان ② لذیذ کھانے ③ حسین و جمیل عورتیں۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ میں عمدہ مکان کا اور ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا ... الخ﴾ میں لذیذ کھانوں کا اور ﴿وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ میں حسین و جمیل ازواج کا ذکر فرمایا:

فائدہ: انسان کے لیے تین چیزوں کا جاننا ضروری ہے ① کہاں سے آیا ہے ② اور کہاں رہتا ہے ③ اور کہاں جانا ہے۔ ﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم عدم سے آئے ہو اور ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ... الخ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ چند روز زمین میں قیام ہے اور ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عالم آخرت کو جانا ہے عذابِ الٰہی سے بچنے کی کوشش کرو۔

اِنَّ * اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ
بے شک اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے اُوپر

---

* کافراں چوں بزکر عنکبوت در قرآن شنید ندا، طعن کردند و گفتند کہ خدا تعالیٰ بذکر ایں چیز ہائے خسیس چہ ارادہ کردہ است ایں آیت نازل شد۔ واللہ اعلم (فتح الرحمٰن)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ

پھر جو یقین رکھتے ہیں سو جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے ان کے رب کا کہا اور جو

كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ

منکر ہیں سو کہتے ہیں کیا غرض تھی اللہ کو اس مثال سے گمراہ کرتا ہے بہتیرے اور

يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ

راہ پر لاتا ہے اس سے بہتیرے اور گمراہ کرتا ہے انہیں جو بے حکم ہیں جو توڑتے ہیں

عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ

اقرار اللہ کا مضبوط کیے پیچھے اور توڑتے ہیں جو چیز اللہ نے فرمائی

يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

جوڑنی اور فساد کرتے ملک میں انہیں کو آیا نقصان

قرآنِ کریم کے کلامِ الٰہی ہونے پر کافروں کا ایک شبہ اور اُس کا جواب

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا ... الیٰ ... اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷﴾

گزشتہ آیات میں اعجازِ قرآن کی دلیل مذکور تھی۔ یہاں منکرین کے ایک شبہ کا جواب مذکور ہے۔ شبہ کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم میں کہیں مکھی اور کہیں مکڑی کی مثال دی ہے اس پر کافروں نے یہ اعتراض کیا کہ قرآن اگر اللہ کا کلام ہے تو اس میں ایسی حقیر اور خسیس چیزوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایسی خسیس اور حقیر چیزوں کا ذکر کلام الٰہی کی عظمت کے لائق نہیں یعنی اگرچہ ہم قرآن کا مقابلہ نہ کرسکیں لیکن اس کتاب میں ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ﴾

بیشک اللہ نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کرے کسی مچھر کی یا اس چیز کی جو حقارت میں مچھر سے بھی بڑھ کر ہو۔ پس اہل ایمان خوب جانتے ہیں کہ یہ تمثیل بالکل حق ہے اور درست ہے ان کے رب کی طرف سے اس لیے کہ تمثیل سے ممثل لہٗ (جس کی مثال دی گئی) کی توضیح اور تفصیل مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیر اور ذلیل چیزوں کی حقارت اور ذلت کی توضیح اور تشریح کے لیے اس کے مناسب مچھر، مکھی اور مکڑی اسی قسم کی حقیر و ذلیل چیزوں کی مثال ذکر کی جائے گی۔ تاکہ اُس شے کی حقارت اور ذلت واضح ہو جائے عزیز اور عظیم

چیزوں کی مثال سے حقیر اور خسیس چیزوں کی حقارت اور ذلت کو کس طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مثال دینے والے کے مطابق ہو۔ بلکہ ممثل لہٗ کے مطابق ہونی چاہیئے حقیر کی مثال حقیر سے اور عزیز کی مثال عزیز سے دینی چاہیئے۔ ورنہ ہر عاقل جانتا ہے کہ حقیر کو عزیز سے مثال دینا احمقوں کا کام ہے۔ توریت اور انجیل اور کلامِ حکماء میں اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الزمر)

ترجمہ: اور البتہ تحقیق ہم نے بیان کی ہے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر مثال تا کہ نصیحت پکڑیں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الحشر)

ترجمہ: "یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ تفکر اور تامل کریں۔"

بعض سلف سے منقول ہے کہ جب میں قرآن کی کسی مثل کو سنتا ہوں اور اس کو نہیں سمجھتا تو میں اپنے اوپر روتا ہوں اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں۔

﴿وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت)

ترجمہ: "یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے ان کو مگر اہل علم۔"

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ مچھر کی مثال اللہ نے دنیا کے لیے بیان فرمائی ہے مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے زندہ ہے اور جب کھا موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے اسی طرح اہل دنیا جب دنیا سے خوب سیر اور سیراب ہو جاتے ہیں تو اللہ ان کو پکڑتا ہے پس وہ ہلاک ہوتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝﴾ (الانعام)

ترجمہ: پس جب بھول گئے وہ اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہو گئے اس سے جو ان کو دیا گیا۔ پس پکڑ لیا ان کو ناگہاں پس وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔" (تفسیر ابن کثیر)

خلاصہ یہ کہ اہل ایمان مثالوں کو حق سمجھتے ہیں کہ اشیاء کی خست اور حقارت بیان کرنے کے لیے یہ مثالیں دی گئی ہیں۔ اور کافر لوگ اپنی حماقت سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ان حقیر مثالوں سے کیا غرض ہے۔ اور کیا ارادۂ خداوندی ایسی حقیر چیزوں کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ آئندہ آیت میں اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں:

﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ﴾ "گمراہ کرتا ہے اللہ اس مثال سے بہتوں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتوں کو۔"

یعنی مقصد یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل۔ اہل ہدایت اور اہل ضلالت میں فرق ہو جائے۔ قرآن اور اس کی تمثیلات سب حق اور عین ہدایت ہیں صحیح المزاج اور سلیم الطبع اشخاص (یعنی اہل ایمان) جب ان تمثیلات کو سنتے ہیں اور ان میں تفکر اور تامل کرتے ہیں تو ان کی ہدایت میں اور اضافہ ہوتا ہے اور ان تمثیلات سے ان کو صراط مستقیم اور حق کا راستہ خوب واضح ہو جاتا ہے اور جن کی روح کا مزاج بالکل فاسد اور خراب ہو چکا ہے ان کو ان تمثیلات سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ان کی گمراہی میں، اور زیادتی ہو جاتی ہے۔ فاسد المزاج کو جس قدر بہتر غذا دی جائے گی اسی قدر اس کے فساد اور مرض میں اضافہ ہوگا۔

قرآن عزیز میں جس طرح ہدایت اور اضلال کو حق جل شانہ کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح ہدایت کو انبیاء و مرسلین اور علماء ربانیین اور ائمہء مجتہدین کی جانب اور اضلال کو شیاطین اور اخوانِ شیاطین کی جانب بھی منسوب کیا گیا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ہدایت اور اضلال کے معانی اور مراتب کو ذکر کیا جائے تا کہ خدا کی ہدایت اور انبیاء و مرسلین کی ہدایت میں فرق معلوم ہو اور جو اضلال حق تعالیٰ جل شانہٗ کی جانب منسوب ہے اس کی کیا حقیقت ہے اور جو اضلال شیاطین اور اخوان شیاطین کی جانب منسوب ہے اس کی کیا ماہیت ہے۔

مراتبِ ہدایت

مرتبۂ اُولیٰ۔ ہدایتِ بیان:

یعنی حق کو بیان کرنا اور واضح کرنا اور لوگوں کو حق کی تعلیم اور دعوت دینا۔ اس معنیٰ سے ہدایت اللہ کی طرف اور اس کے انبیاء و مرسلین اور ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔

اللہ نے بھی حق کو بیان کیا اور اس کی طرف اپنے بندوں کو دعوت دی اور اس کے حکم سے انبیاء و مرسلین اور علماء نے بھی حق کو بیان کیا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی اور اس کی طرف بلایا۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر)

ترجمہ: "تحقیق ہم نے انسان کو رستہ بتایا تو شکر کرے یا ناشکری کرے۔"

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۱۷)

ترجمہ: "قوم ثمود کو ہم نے سیدھا راستہ بتایا لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔"

اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب فرماتے ہیں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (الانبیاء:۷۳)

ترجمہ: "ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔"

ان تمام آیتوں میں ہدایت بمعنی البیان مراد ہے اور یہ ہدایت اللہ رب العزت کے ساتھ مخصوص نہیں۔ انبیاء اور علماء کی طرف بھی اس کی اسناد ہو سکتی ہے۔ نیز یہ ہدایت اہلِ ایمان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مومن اور کافر سب کے لیے ہے۔

مرتبۂ ثانیہ ۔ ہدایتِ توفیق:

یعنی خدا کا اپنے فضل و کرم سے بندہ کے لیے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کو اس کی خواہش اور طبعی میلان کے ایسا موافق بنا دینا کہ اس کی اطاعت لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت حنظل سے بھی زیادہ تلخ معلوم ہو۔ خیر کے اسباب اور دواعی کو اس کے لیے جمع کر دینا اور اس کے تمام عوائق اور موانع کو یکلخت اٹھا دینا۔ یہ ہدایت اللہ جل جلالہٗ کے ساتھ مخصوص ہے اس ہدایت پر نہ کوئی ملک مقرب قادر ہے نہ کوئی نبی مرسل۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ ... الاية﴾ (القصص:۵۶)

ترجمہ: "تحقیق آپ جس کو چاہیں راہ پر نہیں چلا سکتے۔ لیکن اللہ ہی جس کو چاہے راہ پر لائے۔"

اس آیت میں اللہ کے لیے جس ہدایت کو ثابت کیا گیا اور نبی کریم ﷺ سے جس ہدایت کی نفی کی گئی وہ یہی ہدایت بمعنی التوفیق ہے اور ﴿ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (الشوریٰ) میں جس ہدایت کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ ہدایت بمعنی البیان ودعوۃ الحق ہے۔ نبی کا کام ہی یہ ہے کہ حق کو بیان کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دے اور اس کی طرف بلائے مگر خدا وندی اطاعت کا ہوائے نفسانی کے مطابق بنا دینا۔ اور خدا کی عبودیت اور بندگی کی حلاوت اور شیرینی کسی کے دل میں اتار دینا یہ سوائے اسی ملیک مقتدر کے کسی کے قبضہ میں نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے ((لا یتوفق عبد حتی یوفقه الله)). بندہ خود بخود توفیق نہیں پاتا یہاں تک کہ خدا اس کو توفیق دے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب میں خندقیں کھودتے وقت یہ پڑھتے تھے:

((اللّٰهم لولا انت ما اهتدينا ... ولا تصدقنا ولا صلينا ... فانزل سكينة علينا)).

ترجمہ: "اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ اور نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔ پس تو ہم پر سکینت اور طمانیت نازل فرما۔"

اور یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہے۔ حق تعالیٰ اس نعمت کبریٰ اور رحمتِ عظمیٰ سے ان بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس کی رضا اور کوشنودی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت کی جانب گوشۂ چشم سے ایک ادنیٰ التفات کو بھی روا نہ رکھتے ہو۔

كَمَا قَالَ الله تَعَالٰى : ﴿ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (المائدہ:۱۶)

ترجمہ: "جو اللہ کی رضامندی کا تابع ہو اس کو اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتے ہیں اور سیدھے راستہ پر اس کو چلاتے ہیں۔"

مراتبِ اضلال

اضلال، ہدایت کا مقابل ہے۔ جس طرح ہدایت کے دو معنی ہیں اسی طرح اضلال کے بھی دو معنی ہیں۔

معنیٰ اوّل: اضلال کے ایک معنی یہ ہیں کہ خدائے عزوجل کی معصیت کی دعوت دینا اور اس کی اطاعت اور فرماں برداری کو قبیح کر کے بتلانا اور اس کی نافرمانی کو مزین اور مستحسن کر کے ظاہر کرنا اور حق کو باطل کے ستھ ملتبس کرنا۔ حق تعالیٰ نے اسی اضلال کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ﴿ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ (القصص:۱۵)

كَمَا قَالَ الله تَعَالٰى : ﴿ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ﴾ (النمل:۲۴)

ترجمہ: "اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے خوبصورت بنا کر دکھایا۔ پس اس طرح سے ان کو سیدھے راستہ سے روکا۔"

اور ایک مقام پر اسی اضلال کو فرعون کی طرف منسوب کیا ہے:

﴿ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴾ (طٰہٰ:۷۹)

ترجمہ: "اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ان کو سیدھا راستہ نہ بتایا۔"

اور ایک جگہ سامری کی طرف منسوب کیا:

﴿وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ﴾ "سامری نے ان کو گمراہ کیا۔"

اس معنی پر اضلال ہمیشہ شیاطین اور اخوان شیاطین اور آئمۃ الکفر کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب کبھی اس اضلال کی اسناد نہیں کی جاسکتی۔ وہ قدوس حکیم اس سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ معاذ اللہ اپنے بندوں کو شر، فحشاء اور منکر کی طرف بلائے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰﴾ (النحل:۹۰)

ترجمہ: "تحقیق اللہ تعالیٰ تم کو حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور صلہ رحمی کا اور منع کرتا ہے تم کو ہر بے حیائی اور نامعقول بات اور سرکشی سے اللہ تعالیٰ تم کو سمجھاتے ہیں شاید تم یاد رکھو۔"

معنیٰ ثانی: اضلال کے دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنی توفیق اور لطف ورحمت سے کسی کو محروم فرمادیں۔ توفیق اور لطف سے اس شخص کو محروم فرماتے ہیں جو اللہ کی آیتوں کی تکذیب اور انبیاء ومرسلین کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کرے۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝۲۸﴾ (مومن:۲۸)

ترجمہ: "اللہ نہیں ہدایت کرتا اس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنے والا اور جھوٹا ہو۔"

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (القصص:۵۰) ترجمہ: "اللہ نہیں ہدایت کرتا حد سے گزرنے والوں کو۔"

﴿وَ یُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (ابراہیم:۲۷) ترجمہ: "اور گمراہ کرتا ہے اللہ ظالموں کو۔"

یہ اضلال حقیقت میں ان کے اسراف، تکذیب، ظلم اور تعدی کی سزا ہے حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف یہی اضلال منسوب ہوتا ہے اور یہ آیت یعنی ﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ﴾ جس کی اس وقت تفسیر کی جارہی ہے۔ اس میں ہدایت اور اضلال کے دوسرے معنیٰ مراد ہیں۔ یعنی خدا اپنی خاص ہدایت اور توفیق اور لطف ورحمت سے بہت سے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس حق جل وعلاء کے کلام کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کی تمثیل کو حق اور عین ہدایت جانتے ہیں۔ اور اس کے کلام اور تمثیل کا استہزاء اور تمسخر نہیں کرتے۔ اور بہتوں کو ان تمثیلات سے گمراہ کرتا ہے یعنی اپنے توفیق اور لطف ورحمت سے محروم کرتا ہے۔ محروم ان لوگوں کو کرتا ہے جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حدود سے نکل جاتے ہیں اور خدا سے پختہ عہد کرکے توڑ ڈالتے ہیں جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۝۲۶ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ ... الخ﴾ اور نہیں گمراہ کرتا اللہ تعالیٰ ان تمثیلات سے مگر نافرمانوں کو نافرمانی اور سرکشی کی نحوست سے عقل ماری جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کو باطل سمجھنے لگتا ہے اور گمراہ ہوتا ہے۔ اطاعت سے خارج ہونے والوں کو فاسق کہتے ہیں۔ فاسق کا لفظ کافر اور مؤمن عاصی دونوں کو شامل ہے لیکن کافر کا فسق مؤمن عاصی کے فسق سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مگر اس آیت میں فاسق سے کافر ہی مراد ہے۔ قرآن کریم میں فاسق کا لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔

نوٹ: اگر ہدایت واضلال کی اور زیادہ تفصیل درکار ہو تو امام رازی قدس اللہ سرہٗ کی تفسیر کبیر کی طرف مراجعت کریں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ اس آیت میں منافقین کو فاسقین کہا گیا ہے اور ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ﴾ (الحجرات:۱۱) اور ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا﴾ (الحجرات:۶) ان دونوں آیتوں میں فاسق سے مؤمن عاصی مراد ہے کافر فاسق تو حدودِ ایمان سے ہی خارج ہو جاتا ہے۔ اور مؤمن عاصی حدود ایمان سے خارج نہیں ہوتا مگر حدود اطاعت سے خارج ہو جاتا ہے۔ الحاصل حق تعالیٰ شانہٗ ان اشیاء حقیرہ کی تمثیل سے صرف انہی لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں جو بدکار اور نافرمان ہیں۔ اور ان لوگوں کو جو خدا کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں۔ عہد سے اس جگہ وہ وصیت مراد ہے جس کی حق تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں کی زبانی تاکید کی کہ خدا کو ایک جانو اور ایک مانو اور اس کے پیغمبروں کی تصدیق کرو۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ عہد سے وہ عہد مراد ہے جو حق تعالیٰ نے توریت میں یہودیوں سے نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا۔ اور بعض کا قول ہے کہ عہد سے عہد اَلَسْتُ مراد ہے یا یوں کہو کہ عہد سے عام مراد ہے خواہ وہ عہد الست ہو یا توریت و انجیل میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کا عہد ہو۔ اور توڑتے ہیں اس چیز کو جس کا اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس آیت کے عموم میں ان تمام علائق کا قطع داخل ہے جن کے وصل کا خدا نے حکم دیا ہے۔ قطع رحمی اور خدا اور اس کے پیغمبروں سے قطع تعلق کرنا یہ بھی اس میں شامل ہے اور فساد کرتے ہیں زمین میں جو قول اور عمل اور جو حرکت اور سکون خدا کی رضامندی کے خلاف ہو وہ سب فساد اور فتنہ ہے۔ یہ لوگ وہی ہیں جو خسارہ اور نقصان اٹھانے والے ہیں۔ دنیا میں آخرت کی تجارت کے لیے آئے تھے نفع تو کیا حاصل کرتے اصل رأس المال یعنی عقل اور فطرت سلیمہ کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا اس کو بھی ضائع اور برباد کر دیا۔ اور صلاح اور رشد اور ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا اور منعم حقیقی کو چھوڑ بیٹھے اور اس سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ اور نقصان ہوگا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ
تم کس طرح منکر ہو اللہ سے اور تھے تم مردے پھر اس نے تم کو جلایا پھر تم کو مارتا ہے
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾
پھر جلا دے گا پھر اسی پاس الٹے جاؤ گے۔

استعجاب بر کفر و نافرمانی و تذکیر انعامات ربانی اور مبداء و معاد کی یاددہانی

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ ... الیٰ ... ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾

حق جل شانہٗ جب دلائل توحید و نبوت و معاد بیان کر چکے اور عبادت کا حکم دے چکے تو اب آئندہ آیات میں اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ ایسے قدیر و عظیم اور رحیم و کریم پروردگار سے سرکشی سراسر تعجب خیز ہے ان انعامات و احسانات کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ تم شکر کرتے نہ کہ کفر۔ حیرت ہے کہ ان انعامات اور احسانات کے بعد تم کو کفر پر جرأت کیسے ہوئی اور اس توبیخ اور عتاب میں دوسرے عنوان اور دوسرے رنگ میں اس دلیل سابق کا اعادہ فرمایا پھر اس سلسلۂ تذکیر میں اوّلاً نِعَمِ عامّہ کو بیان فرمایا یعنی ان نعمتوں کا ذکر کیا جس کا تعلق

عام بنی آدم سے ہے۔اور ثانیاً نِعَمِ خاصہ کو بیان فرمایا یعنی ان نعمتوں کا ذکر کیا جن کا خاص بنی اسرائیل سے تعلق ہے اور دور تک سلسلۂ کلام چلا گیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ کس طرح اور کیسے تم اللہ جل شانہٗ کے ساتھ کفر کرتے ہو حالاں کہ تم بے جان تھے۔ پس اس نے تم کو حیات اور زندگی عطاء کی اور پھر تم کو موت دیگا اور پھر قیامت کے وقت تم کو دوبارہ زندہ کرے گا پھر تم سب حساب و کتاب کے لیے اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے تا کہ دنیاوی زندگی میں تم نے جو کچھ کیا ہے تم کو اس کی جزاء اور سزا ملے۔ پہلی آیت ﴿وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ﴾ میں وجودِ صانع کو ثابت کیا کہ خدا وہ ہے جس نے تم کو عدم سے نکال کر وجود عطاء کیا اور نیست سے ہست کیا اور دوسری آیت ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ میں حشر و نشر کو ثابت کیا اور ساتھ ساتھ دلیل عقلی بھی بیان کی کہ جو ذات پاک پہلی مرتبہ تم کو موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے وہ دوسری مرتبہ بھی زندہ کرنے پر قادر ہے اور یہ امر بدیہی اور مسلم ہے کہ موت سے کسی کو چارہ نہیں۔ مرنا سب کو ضرور ہے تو سمجھ لو کہ مر کر خدا ہی کے پاس جانا ہے پس ان تمام باتوں کے جاننے کے بعد تم خدا کا کیسے انکار کرتے ہو۔

الحاصل ﴿كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ﴾ میں وجودِ صانع کی دلیل بیان فرمائی کہ تم کو خُدا کا انکار نہ کرنا چاہے کیونکہ تم پہلے مردہ اور معدوم تھے اللہ تعالیٰ نے تم کو وجود عطاء کیا۔ اور جو خود بخود موجود ہو اور دوسروں کو وجود عطاء کرے وہی خدا ہے اور ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ سے حیات ثانیہ کی حجت اور دلیل کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس قادر مطلق نے پہلی مرتبہ تم کو چھوٹے چھوٹے ذروں اور حقیر و ذلیل نطفوں اور خون کے لوتھڑوں اور خون کے ٹکڑوں سے پیدا کیا اور احسن تقویم کا خلعت تم کو پہنایا کیا اس کی نسبت تمہارا یہ گمان باطل ہے کہ وہ دوبارہ بکھرے ہوئے ذرات کو جمع کر کے تم کو حیات عطاء نہیں کر سکتا۔ تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ تمہیں خدا کی قدرت کے انکار سے شرم نہیں آتی۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر چڑھ گیا آسمان کو

فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳ ۹ ۳

تو ٹھیک کیا ان کو سات آسمان اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔

ذکر تخلیق سامان حیاتِ جسمانی

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ... الٰى ... وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع﴾

حق تعالیٰ نے تعمت حیات کا ذکر فرمایا۔ اب ان آیات میں سامان حیات کا ذکر فرماتے ہیں جس پر حیات اور زندگی کا بقاء موقوف ہے۔ اوّل حیات جسمانی کے سامان کا ذکر فرمایا یعنی تمہاری اس ظاہری اور جسمانی حیات کے بقاء کے لیے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور پھر زمین سے مطعومات و مشروبات اور لذائذ و طیبات اور قسم قسم کے ملبوسات تمہارے لیے پیدا کیے۔ اس کے بعد حیات روحانی کے سامان کا ذکر فرمایا۔ یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور منصب خلافت پر سرفراز فرمایا اور ہدایت کے علوم عطاء فرمائے۔ اور انبیاء و مرسلین کا

سلسلہ جاری فرمایا۔ انبیاء ومرسلین اللہ کی طرف سے جو ہدایت اور رُشد کے علوم اور معارف لے کر آتے ہیں وہی لوگوں کی روحانی حیات کا سامان ہوتے ہیں۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ﴾ (الانفال: ۲۴)

تَرجَمَہ: "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا جبکہ وہ تم کو ایسی شے کی طرف بلائے کہ جو تم کو روحانی اور معنوی حیات اور زندگی عطاء کرے۔"

چنانچہ فرماتے ہیں: وہی ایک پاک ذات ہے کہ جس نے پیدا کیا تمہارے منافع اور فوائد کے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب حتیٰ کہ سمیات اور نجاسات بھی نفع سے خالی نہیں، جاننا چاہئے کہ کسی چیز سے انتفاع یعنی نفع حاصل کرنا اور چیز ہے اور کھانا اور چیز ہے۔ انتفاع کی اجازت اور اباحت سے کھانے کی اجازت اور اباحت لازم نہیں۔ پھر وہ رب العزت متوجہ ہوا۔ آسمانوں کی تخلیق وتکوین کی طرف پھر ٹھیک ان کو سات آسمان بنائے کہ کہیں ان میں سوراخ اور شگاف اور ٹیڑھا پن نہیں اور وہ پروردگار ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے کہ کیوں اور کس کے لیے پیدا کیا۔ امام جلیل وکبیر حافظ عماد الدین ابن کثیر قدس اللہ روحہ ونور ضریحہ فرماتے ہیں کہ اس آیت اور حٰمٓ السجدۃ * کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوّل زمین پیدا کی گئی۔ اور پھر آسمان پیدا کئے گئے۔ اور تعمیر کا طریقہ بھی یہی ہے کہ نیچے سے بنانا شروع کرتے ہیں جب تحتانی حصہ مکمل ہو جاتا ہے تب چھت ڈالتے ہیں اور علماء کا اس بارے میں کوئی نزاع اور اختلاف نہیں۔ یعنی سب علماء کی یہی رائے ہے۔ صرف قتادہ سے ابن جریز نے نقل کیا ہے کہ قتادہ کا گمان یہ ہے کہ آسمان سے پہلے پیدا کئے گئے۔ جیسا کہ بظاہر سورہ والنازعات کی اس آیت سے متبادر ہوتا ہے۔

﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۝۲۷ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝۲۸ وَ اَغْطَشَ لَیْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝۲۹ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝۳۰ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ۝۳۱﴾ (النازعات)

تَرجَمَہ: "کیا تم بنانے میں مشکل ہو یا آسمان۔ اسے آسمان بنایا اور اس کی بلندی کو بہت اُونچا کیا پھر اس کو صاف کیا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور پھر اس میں سے کھول کر دھوپ نکالی اور اس کے بعد زمین کو بچھایا اور اس سے اس کا پانی اور چارا نکالا۔"

اس آیت میں آسمان کی پیدائش کو زمین کی پیدائش سے پہلے ذکر فرمایا ہے جو بظاہر سورہ بقرہ اور حٰمٓ سجدہ کی آیات سے متعارض معلوم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس تعارض کے متعلق دریافت کیا گیا تو یہ جواب ارشاد فرمایا کہ اوّل زمین پیدا کی گئی۔ اور پھر آسمان (جیسا کہ سورہ بقرہ اور حٰمٓ سجدہ کی آیات سے ظاہر ہے) اور آسمان بنانے کے بعد زمین کو پھیلایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کا محض مادہ تو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا۔ مگر زمین حالت موجودہ پر آسمان بنانے کے بعد پھیلائی گئی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین اسی حالت موجودہ پر آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور پھر آسمان بنائے گئے تاکہ ان کے ذریعہ سے زمین پر بارش ہو اور پھر اس بارش سے وہ اثمار واشجار اور فواکہ وطیبات زمین سے نمودار ہوں جن کا مادہ قدرت ازلیہ نے زمین میں ودیعت رکھا ہے۔ پس زمین کو

---

* سورہ حٰمٓ السجدہ کی وہ آیت جس سے زمین کا پہلے پیدا ہونا معلوم ہوتا ہے یہ ہے:
﴿قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۹ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ۝۱۰ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ﴾ الایۃ ۱۲

آسمان کے بعد بچھانے کا یہ مطلب ہے کہ آسمان بنانے کے بعد زمین سے فواکہ اور ثمرات اور قسم قسم کے لذائذ وطیبات کو اُگایا۔ خود قرآن نے زمین کو آسمان کے بعد بچھانے کی یہی تفسیر کی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝﴾ (النازعات)

ترجمہ: "اور زمین کو آسمان کے بعد بچھایا یعنی اس میں سے اس کا پانی اور چارا نکالا۔"

اور اسی جواب کو علماء سلف اور خلف نے اختیار کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمین کے بچھانے سے ان اشجار ونباتات کا اُگانا مراد ہے جو زمین میں بالقوہ موجود ہیں۔ اسی معنی کر زمین کا بچھانا آسمان بنانے کے بعد ہوا۔ باقی زمین بحالت موجودہ آسمان سے پہلے پیدا کی گئی۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا
اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب بولے
اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ
کیا تو رکھے گا اس میں جو شخص فساد کرے وہاں اور کرے خون اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں
بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ وَ عَلَّمَ
اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو کہا مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اور سکھائے
اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ
آدم کو نام سارے پھر وہ دکھائے فرشتوں کو کہا بتاؤ مجھ کو
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ
نام ان کے اگر ہو تم سچے بولے تو سب سے نرالا ہے ہم کو معلوم نہیں
اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝۳۲ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ
مگر جتنا تو نے سکھایا تو ہی ہے اصل دانا پختہ کار کہا اے آدم بتا دے ان کو
بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ
نام ان کے پھر جب اس نے بتا دیئے نام ان کے کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو مجھ کو

اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ

معلوم ہیں پردے آسمان اور زمین کے اور معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم

تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

چھپاتے ہو اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر

اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ

ابلیس نے قبول نہ رکھا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں میں کا اور کہا ہم نے اے آدم بس

اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا

تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں سے مخظوظ ہو کر جس جگہ چاہو اور نزدیک نہ جاؤ

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا

اس درخت کے پھر تم بے انصاف ہو گئے پھر ڈگایا ان کو شیطان نے اس سے

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ

پھر نکالا ان کو وہاں سے جس آرام میں تھے اور کہا ہم نے تم سب اُترو تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو

لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ

تم کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایکوقت تک پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی

كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

کئی باتیں پھر متوجہ ہوا اس پر برحق وہی ہے معاف کرنے والا مہربان۔

ذکرِ تخلیق سامان حیاتِ روحانی واعطاء خلافت ربانی

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ ... الٰى ... اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾﴾

گزشتہ آیات میں زمین وآسمان اور دیگر مخلوقات کی پیدائش کو بیان فرمایا کہ ہم نے ان تمام مخلوقات کو تمہارے نفع کے لیے

پیدا کیا ہے۔ آئندہ آیات میں ان مخلوقات سے منتفع ہونے والی مخلوق یعنی انسان کا ذکر فرماتے ہیں۔ انسان سے پہلے دو قسم کی مخلوق موجود تھی۔ ایک فرشتے دوسرے جن اور یہ دونوں قسمیں علوی اور سفلی۔ ارضی اور سماوی اشیاء سے متمتع اور منتفع نہیں ہوسکتیں۔ فرشتوں کا نہ منتفع ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ فرشتوں کو نہ زن اور فرزند کی ضرورت اور نہ طعام وشراب اور نہ طعام وشراب کے لوازم یعنی شہوت اور غضب کی ان کو حاجت۔

جنات اگرچہ بعض چیزوں سے متمتع اور منتفع ہوتے ہیں۔ مگر لطافت بدنی اور غلبہ ناریت کی وجہ سے بہت سے سامان حفاظت سے مستغنی ہیں۔ نہ ان کو کسی مکان اور عمارت کی ضرورت اور نہ کسی قلعہ اور برج کی حاجت ہے اور نہ وہ اپنی حفاظت میں تیر وتلوار اور کسی قسم کے ہتھیار کے محتاج ہیں۔ پس اگر وہ عالم کی بعض اشیاء سے منتفع بھی ہیں تو وہ انتفاع ناتمام اور ناقص ہے۔ علاوں ازیں جنات کی قوت خیالیہ ان کی قوت عقلیہ پر اس درجہ غالب ہے کہ جس چیز کا وہ خیال کر لیتے ہیں۔ اس کو واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کا انتفاع حقیقی اور واقعی نہیں بلکہ خیالی ہے۔ بخلاف انسان کے کہ وہ ان تمام چیزوں سے حقیقۃً اور علی وجہ الکمال منتفع ہوسکتا ہے اس لیے منصب خلافت کے لیے انسان ہی کو خاص کیا گیا۔ جسمانی حیثیت سے تمام عناصر اربعہ اور عالم سفلی کی تمام اشیاء سے نفع اٹھا سکتا ہے اور روحانی حیثیت سے عالم علوی کی تمام چیزوں سے متمتع اور متخلق باخلاقِ الٰہیہ اور متصف بصفات ربانیہ ہوسکتا ہے۔

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ اور اے محمد ﷺ آپ اس وقت کو یاد دلایئے جب تیرے پروردگار نے حضرت آدم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے ان کی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں سے یہ فرمایا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ تحقیق میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ اور نائب بنانے والا ہوں جو میرا نائب ہوکر زمین پر حکومت کرے گا اور زمین والوں پر میرے حکموں کو جاری اور نافذ کرلے گا اور وہ خلیفہ عناصر اربعہ سے مرکب ہونے کی وجہ سے زمین کا انتظام کرے گا، اور منافع ارضیہ سے منتفع ہوگا، اور اس میں ایک روح آسمانی پھونکوں گا، جس کی وجہ سے وہ آسمان والوں پر حکم چلائے گا ؎

گدائے مصطبہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا تذکرہ ملائکہ سے اس لیے فرمایا کہ کائنات ارضی اور سماوی کے منافع فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ آسمان سے پانی کا برسانا۔ زمین سے اشجارہ ونباتات کا اگانا۔ گرم اور سرد ہواؤں کا چلانا وغیرہ ذلک۔ من جانب اللہ ان تمام چیزوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے۔ اور یہ تمام امور فرشتوں ہی کی محافظت اور نگرانی میں ہیں۔ پس جب تک فرشتے اللہ کے خلیفہ کی اطاعت نہ کریں اس وقت تک خلافت کا کام سرانجام نہیں پاسکتا۔ اسی لیے حق تعالیٰ شانہ نے اول فرشتوں کے سامنے حضرت آدم کا علمی فضل وکمال ظاہر فرمایا اور پھر ان کو سجدہ کا حکم دیا۔

سلاطین عالم جب کسی کو منصب وزارت پر سرفراز کرتے ہیں تو حکومت کی تمام فوجیں اس کی ماتحتی میں دیدی جاتی ہیں اور وہ آکر سلامی دیتی ہیں۔ اسی طرح حق جل شانہ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو منصب خلافت پر سرفراز فرمایا تو اپنے تمام جنود وعساکر (یعنی ملائکہ) سے حضرت آدم علیہ السلام کو اطاعت اور فرمانبرداری کا سجدہ کرادیا۔ تاکہ خلافت کے کام میں کسی قسم کا کوئی خلل نہ پیش آئے اور چونکہ یہ تمام عالم بمنزلہ ایک شہر کے ہے اور فرشتے اس کے عامل اور کارکن ہیں اس لیے خلافت کا تذکرہ فرشتوں ہی سے فرمایا۔ کسی اور

مخلوق سے ذکر نہیں فرمایا اس لیے کہ اور سب فرشتوں ہی کے ماتحت ہیں۔

حقیقت ملائکہ:

اہل اسلام کے نزدیک ملائکہ اللہ کے محترم اور مکرم بندے ہیں جو نور [1] سے پیدا کئے گئے ہیں۔ معاصی سے معصوم، خطاء اور نسیان سے محفوظ ہیں۔ ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ (التحریم:٦) کھانے اور [2] پینے سے پاک، تذکرہ و تانیث سے منزہ اور مبرا ہیں۔ قرآن میں ملائکہ کے حق میں ضمیر مذکر کا استعمال محض تشریف و تکریم کی وجہ سے ہے مذکر ہونے کی جوہ سے نہیں جیسے حق جل وعلاء کے لیے ضمیر مذکر کا استعمال محض عظمت و اجلال کی وجہ سے ہے جس طرح بعض انسانوں کو حق تعالیٰ نے اپنی رسالت اور پیمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے۔ اسی طرح بعض ملائکہ کو رسالت پیمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے:

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ﴾ (الحج:۷۵)

فرشتوں نے ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ سے یہ سمجھا کہ جب وہ خلیفہ زمین سے پیدا ہوگا تو اس میں لذات سفلیہ سے منتفع ہونے کی خواہش اس کی جبلت میں مرکوز ہوگی جب ان لذتوں کی اس کو ضرورت ہوگی تو قوت شہویہ جوش میں آئے گی اور جو شخص ان لذات اور منافع میں اس کی مزاحمت کرے گا تو قوت غضبیہ جوش میں آئے گی۔ اور مدافعت کے لیے جنگ وجدال اور قتل وقتال کی نوبت آئے گی۔ اس لیے فرشتوں کو یہ شبہ ہوا کہ زمین کی عمارت اور اصلاح کے لیے ایسے شخص کو خلیفہ بنایا بظاہر خلاف حکمت معلوم ہوتا ہے۔ ﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ فرشتوں نے کسی اعتراض کے طور پر نہیں بلکہ محض حکمت دریافت کرنے کے لیے بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کیا کہ زمین میں آپ اس شخص کو خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے۔ حالانکہ ہم سب ہر لحہ تیری ذات پاک کی ستائش کے ساتھ مسلسل تسبیح کرتے ہیں تا کہ حق تیری ذات اور صفات کا ادا ہوا اور نیز ہم خاص تیرے لیے تقدیس کرتے ہیں۔ یعنی ہم تیرے افعال کو اس بات سے پاک جانتے ہیں۔ کہ تیرا کوئی فعل معاذ اللہ خلافِ حکمت ہو یا معاذ اللہ اس میں سفہ اور عبث کا شائبہ ہو۔ بخلاف بنی آدم کے کہ اگر وہ تیری تسبیح و تقدیس بھی کریں گے تو بسا اوقات ریا اور حرص و ہوا کی آمیزش اور شرکت سے پاک نہ ہوں گی۔ رہا یہ سوال کہ ملائکہ کو نبی آدم علیہ السلام کا مفسد اور خوں ریز ہونا کیسے معلوم ہوا۔ سو حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود اور دیگر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ جب اللہ نے یہ فرمایا: ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ تو فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ وہ خلیفہ کیسا ہوگا؟ تو اللہ رب العزت نے یہ فرمایا کہ اس خلیفہ کے ذریت ہوگی اور زمین میں فساد کرے گی۔ اور ایک دوسرے پر حسد کرے گی۔ اور ایک دوسرے کو قتل کرے گی۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس پر ملائکہ نے یہ سوال کیا: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ... الخ﴾ اور ملائکہ کا یہ سوال محض حکمت دریافت کرنے کے لیے تھا کہ فساد اور خون ریزی کرنے والوں کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ حاشا بطور اعتراض نہ تھا۔ اس لیے کہ ملائکہ کی تو یہ شان ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾

یعنی بغیر اذنِ الٰہی کے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے۔ وقال اللہ تعالیٰ: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ (الانبیاء:۲۶) خدا کے محترم بندے

---

[1] اشارۃ الیٰ ما اخرجہ مسلم عن عائشہ مرفوعاً خلقت الملائکہ من نور ۱۲ فتح الباری ص ۲۱۶ ج ٦

[2] قال الحافظ وفی قصتہ الملائکہ مع ابراھیم و سارۃ مایوید انھم لایکون ۱۲ فتح الباری ص ۲۱۷ ج ٦

ہیں۔ مقصد فقط یہ تھا کہ اس قسم کی مخلوق پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ اگر عبادت اور بندگی مقصود ہے تو ہم اس کے لیے حاضر ہیں۔ ہر وقت تیری اطاعت اور بندگی میں سرشار ہیں اور تیری معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور بری ہیں۔ اس لیے حق جل شانہ نے جواب ارشاد فرمایا: ﴿اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ تحقیق میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے یعنی تم کو معلوم نہیں کہ منصب خلافت کے لیے ایسی ہی حقیقت جامعہ مناسب ہے جو جسمانیت اور روحانیت دونوں کی جامع ہو اور قوت عقلیہ کے ساتھ اس میں قوت شہویہ اور عضبیہ بھی ہو۔ جس نوع کا مزاج ان مختلف قوی سے مرکب ہوگا وہی عالم کے انتظام اور تدبیر و تصرف پر قادر ہوگا۔ کائنات ارضیہ قوت کے حقائق اور منافع کو بخوبی سمجھے گا اور طرح طرح کی صنعتیں ایجاد کریگا۔ تاکہ منافع ارضیہ سے نکل کر فعلیت میں آجائیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں میں یہ استعداد اور صلاحیت نہیں۔ ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

جاننا چاہیے کہ ہر انسان میں دو قوتیں ہیں ایک تو قوت شہویہ جس سے زنا وغیرہ صادر ہوتا ہے جس کو فرشتوں نے ﴿مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ اور دوسری قوتِ غضبیہ جس سے قتل اور ضرب اور خونریزی میں آتی ہے۔ جس کو ملائکہ نے ﴿وَ یَسۡفِكُ الدِّمَآءَ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ فرشتوں نے انسان کے یہ دو عیب ذکر کر کے اشارۃً ان دونوں عیبوں کی اپنے سے نفی کی اس لیے کہ ﴿مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا﴾ کے مقابلہ میں ﴿وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ﴾ کہا اور ﴿یَسۡفِكُ الدِّمَآءَ﴾ کے مقابلہ میں ﴿وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾ کہا۔ اس میں شک نہیں کہ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ بہت سے مفاسد کا سرچشمہ ہیں لیکن ان دو قوتوں میں منافع اور منافع اور مصالح اور فوائد بھی نہایت عجیب و غریب ہیں۔ ملائکہ نے قوتِ شہویہ اور غضبیہ کے مفاسد کا تو ذکر کیا لیکن ان دونوں قوتوں کے منافع اور فوائد سے ان کو ذہول ہوا۔ فرشتوں کا خیال اس طرف نہ گیا کہ یہی قوت شہویہ جب اس کا رخ خداوند ذوالجلال کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تو اس سے وہ ثمرات و نتائج ظہور میں آتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر فرشتے بھی عشعش کرنے لگتے ہیں۔ یعنی غلبہ عشق خداوندی اور اس کی محبت کا جوش اور ولولہ خدا کی محبت اور اس کے عشق میں قلب کا بے چین اور بیتاب رہنا یہ وہ نعمت ہے کہ جس پر ملائک بھی رشک کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ میں قوتِ شہویہ نہ ہونے کی وجہ سے عشق کا مادہ نہیں اطاعت میں اگر فرشتوں کا پلہ بھاری ہے تو عشق اور محبت میں آدمی اور بنی آدم کا پلہ بھاری ہے اور علیٰ ہذا جب قوت غضبیہ کا کارخانہ خداوندی میں صرف کیا جاتا ہے تو اس سے بھی عجیب و غریب نتائج و ثمرات ظاہر ہوتے ہیں یعنی خدا کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی اور اس کے دشمنوں سے جہاد و قتال۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یہی وجہ ہے کہ صحابہ بدریین کی طرح وہ ملائکہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ان ملائکہ سے افضل ہیں جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے جیسا کہ بخاری میں مذکور ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانا یہ ایسی عظیم نعمت ہے کہ ملائکہ اس سے بالکلیہ محروم ہیں۔ نیز جب تک قوت عقلیہ کے ساتھ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ نہ ہو تو تنہا قوت عقلیہ تجارت و زراعت اور صنعت و حرفت اور تمدن و معاشرت کے اصول اور قوانین مرتب نہیں کر سکتی جن پر تمام کارخانہ عالم کا دارومدار ہے۔ لہٰذا خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہوا کہ قوتِ عقلیہ کے ساتھ قوتِ غضبیہ اور قوتِ شہویہ کا بھی حامل ہو۔ نیز اگر جہاں میں برائیاں اور قباحتیں موجود نہ ہوں تو بعثت رسل اور انزال کتب و شرائع احکام و اوامر و نواہی سب معطل و بیکار ہو جائیں۔

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است دوزخ کرا بسوز دگر بولہب نباشد

شیخ اکبر قدس اللہ سرہ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں کہ ملائکہ نے علی الاطلاق تسبیح وتقدیس کا دعوی کیا حالانکہ ان کی تسبیح وتقدیس فقط ن اسماء وصفات کے ساتھ مقید اور مخصوص ہے جن اسماء وصفات کا ان کو علم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ سے معلوم ہوتا ہے مگر ملائکہ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کے ایسے اسماء بھی ہیں کہ وہاں تک ملائکہ کے علم کی رسائی نہیں اور اللہ نے حضرت دم علیہ السلام کو ان اسماء وصفات کا علم عطا فرمایا خصوصاً وہ اسماء وصفات جنکا تعلق نعمت اور عذاب، موت اور ہلاک، صحت اور مرض سے ہے یسے رزاق اور مطعم اور مصور محی اور رحمیت، ملائکہ ایسے اسماء وصفات کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح وتقدیس نہیں کرتے جن کا تعلق عالم جسام سے ہے اس لیے ملائکہ کی تسبیح وتقدیس بنی آدم کی تسبیح کے لحاظ سے مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ انتہی کلامہ، علاوہ ازیں بنی آدم کی تسبیح و تدیس، شیطان اور نفس، قوہ شہویہ اور قوۃ غضبیہ کے معارضہ اور مقابلہ کی وجہ سے زیادہ اکمل او بہتر ہے، بخلاف ملائکہ کے کہ ان کی تسبیح و تدیس بمنزلہ سانس کے اضطراری ہے اور اختیاری تسبیح وتحمید اضطراری تسبیح وتحمید سے بہتر ہے۔

جواب تفصیلی بعد جواب اجمالی

گزشتہ آیات ﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں فرشتوں کے شبہ کا اجمالی جواب تھا۔ اب آئندہ تفصیلی جواب ارشاد فرماتے ہیں، جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور زیادتی بیان فرمائی تا کہ فرشتوں پر ان کی قوت اور افضیلت ثابت ہو اور یہ ظاہر ہو جائے کہ جو شخص علوی اور سفلی کائنات کے اسماء وصفات سے واقف ہو وہی مستحق خلافت ہے یا یوں کہو کہ پہلا جواب حاکمانہ تھا اور یہ جواب حکیمانہ ہے۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا... الخ﴾ اور سکھائے اللہ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام مع ان کے خواص اور آثار کے اس لیے کہ جب تک کہ عالم کی تمام چیزوں کے نام اور ان کی حقیقت اور اوصاف اور خواص اور آثار اور طریقہ استعمال معلوم نہ ہو تو انکا انتظام اور ان میں تو تصرف کیسے کر سکتا ہے۔ محض نام جاننے سے نہ تو حضرت آدمؑ کی فوقیت ثابت ہوگی اور نہ محض نام جاننے سے انتظام ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ قیامت کے روز اول اہل ایمان شفاعت کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ اور یہ کہیں گے:

((انت ابو الناس خلقك الله بيده واسجد لك ملائكته و علمك اسماء كل شئ)).

"آپ (علیہ السلام) سب انسانوں کے باپ ہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کو پیدا کیا اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے نام آپ کو سکھائے۔"

حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتوں کو بھی بعض چیزوں کے نام کا علم تھا مگر ان کا علم انہیں چیزوں میں منحصر تھا جن کی خدمت پر وہ مامور تھے دوسری چیزوں سے ان کو کوئی تعلق اور سروکار نہ تھا۔ خلافت کے لیے علم تام اور عام چاہئے۔ بخلاف حضرت آدم علیہ السلام کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم تام اور عام عطا فرمایا۔ مفردات اور مرکبات کے اسماء اور خواص اور آثار بتلائے صنعتوں اور حرفتوں کا علم عطاء فرمایا۔ حفظان صحت اور معالجہ امراض کے اصول وقواعد بتلائے۔ اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کو ان چیزوں کا علم نہیں دیا گیا۔ لہٰذا وہ خلافت کا کام کیسے انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے اور اسی آیت میں ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ کے بعد جو لفظ

﴿كُلَّهَا﴾ بڑھایا گیا وہ اسی عموم کی تاکید ہے کیونکہ آدم اور فرشتوں میں یہی مابہ الامتیاز ہے کہ فرشتوں کو تمام اسماء کا علم نہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم بذریعہ الہام کے تھی کہ ان کے دل میں ڈال دیا کہ فلاں چیز کا فلاں نام ہے اور فلانی چیز کا فلانا نام ہے۔ اور اس تعلیم میں کلمہ اور کلام اور صوت اور حرف درمیان میں نہ تھی بلا واسطہ حرف اور صوت کے اور بغیر کلمہ اور کلام ان کے دل میں ڈالا اور یہ تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی بلکہ بطریق القارفی القلب تھی جیسے ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ (الانبیاء:۸) میں تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی۔ بلکہ القاء فی القلب کے ذریعہ سے تھی کہ ان کے دل میں زرہ بنانے کا طریقہ ڈال دیا۔ پھر جن چیزوں کے نام اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے ان چیزوں کی تصویروں کو فرشتوں پر پیش کیا پھر فرمایا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام ٹھیک ٹھیک بتاؤ اگر تم اس بار میں سچے ہو۔ کہ تم میں خلافت کی صلاحیت ہے اور تم خلافت کی خدمت انجام دے سکتے ہو۔ اس لیے کہ جب تک حقائق اشیاء اور ان کی صفات اور خواص اور آثار اور طریقہ استعمال کا علم نہ ہو اس وقت تک ان میں تصرف اور ان کا انتظام ناممکن ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا تو پاک اور منزہ ہے ہم کو کسی شئی کا بھی علم نہیں مگر فقط اس چیز کا جس کا تو نے ہم کو جتنا علم عطاء کر دیا بے شک حقیقت میں تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے تو اس سے منزہ ہے کہ تیرا کوئی کام عبث اور خلاف حکمت ہو ہمارا علم ہماری استعداد کے مطابق ہے اور آدم کا علم ان کی استعداد کے مطابق ہے اور استعدادوں اور صلاحیتوں کا تفاوت اور اختلاف تیرے علم اور حکمت پر مبنی ہے آپ مالک مطلق ہیں جس میں جو استعداد چاہیں وہ پیدا کر دیں فرشتوں پر جب یہ بات واضح ہوگئی کہ آدم علیہ السلام خلافت کی استعداد اور صلاحیت میں ہم سے بہتر اور برتر ہیں تو بصد عجز و زاری بارگاہ خداوندی میں یہ بولے: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲﴾۔

فائدہ: جاننا چاہیے کہ ﴿عَرَضَهُمْ﴾ کی ضمیر اسماء کی طرف باعتبار مسمیات کے راجع ہے ظاہر کا مقتضی یہ تھا کہ ضمیر مؤنث کی لاتے اور یوں کہتے ﴿ثُمَّ عَرَضَهَا﴾ جیسا کہ ایک قراءت میں ﴿ثُمَّ عَرَضَهُنَّ﴾ ضمیر مؤنث کے ساتھ آیا ہے لیکن بجائے ضمیر مؤنث کے ذوی العقول کی ضمیر لائے یعنی ﴿هُمْ﴾ کی ضمیر لائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ عرض باعتبار وجود خارجی اور جسامت ظاہری کے نہ تھا بلکہ باعتبار وجود روحی اور ملکوتی یا بطور وجود مثالی کے تھا اور اس وجود کے اعتبار سے تمام مخلوقات عاقل اور مدرک ہیں اور تذکیر و تانیث سے مبرا ہیں حق جل شانہ نے فرمایا اے آدم (علیہ السلام) تم فرشتوں کو ان تمام چیزوں کے نام مع خواص اور آثار کے بتلا دو کیونکہ اے آدم ہم نے تم کو اَدیم ارض (یعنی روئے زمین) کی تمام * اقسام کے مٹیوں سے ملا کر اور مختلف قسم کے پانیوں میں گوندھ کر بنایا ہے اور پھر برابر بنا کر تم میں روح پھونکی ہے جو جنس ملائک سے ہے اس لیے تم میں یہ استعداد اور صلاحیت ہے کہ تم ان چیزوں کے نام اور خواص اور آثار بتلا سکو اس لیے کہ ساری استعدادیں اور صلاحیتیں تم میں جمع ہیں۔ جسمانی حیثیت سے تم زمینی ہو اور روحانی حیثیت سے تم علوی ہو اس لیے تم علوی اور سفلی چیزوں کو جس قدر سمجھ سکتے ہو دوسرا ویسا نہیں سمجھ سکتا۔ غرض یہ کہ تمہارے خمیر میں زمینی اور آسمانی دونوں قسم کی استعدادیں اور صلاحیتیں علی وجہ الکمال موجود ہیں۔ پس ان چیزوں کے نام مع خواص اور آثار کے فرشتوں کے سامنے بیان کرو تا کہ تمہارا افضل و کمال ظاہر ہو اور تمہاری فطرت میں جو عجیب و غریب استعدادیں اور صلاحیتیں ہم نے ودیعت کر رکھی ہیں وہ بروئے کار آجائیں اور فرشتوں پر یہ امر منکشف ہو جائے کہ یہ استعداد بشر کے ساتھ مخصوص ہے ملائکہ کو میسر نہیں پس جب بتائے آدم نے ان تمام چیزوں کے نام جو بے شمار

---

* اور اسی وجہ سے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام روئے زمین کی مٹیوں سے بنایا گیا ہے ان کی اولاد میں کوئی سرخ رنگ لیے اور کوئی گورا اور کوئی بین بین اور کوئی نرم خو اور کوئی ترش رو اور کوئی نیک طینت اور کوئی بد طینت جیسا کہ مسند احمد اور ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں آیا ہے۔ ۱۲

اور بے انتہا تھیں۔ اور اس بیان میں کوئی غلطی بھی نہیں کی تو فرشتے حضرت آدم کے اس کمال علمی کو دیکھ کر حیران رہ گئے تو اس وقت اللہ جل جلالہٗ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے پہلے ہی کہا نہ تھا کہ میں تمام آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو خوب جانتا ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ﴿اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہوں اس کو بھی خوب جانتا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ خلافت کے لیے ایسے حاوی اور کلی علم کی ضرورت ہے بغیر ایسے علم کی خلافت ناممکن ہے۔ فرشتوں کا علم حاوی اور کلی نہیں جس خدمت پر وہ مامور ہیں فقط اسی کے قواعد اور ضوابط ان کو معلوم ہیں کسی دوسری خدمت اور نظام کا ان کو علم نہیں۔ اور علیٰ ہٰذا ملائکہ کی قدرت و مشیت ان کے اختیار اور مرضی کے تابع نہیں بلکہ حق جل شانہٗ کی مرضی کے تابع ہے بخلاف انسان کے کہ اس کی قدرت و مشیت خود اس کی مرضی کے تابع ہے انسان ہی کا علم اور قدرت حق تعالیٰ شانہ کے علم اور قدرت کا نمونہ ہے جو ضدین اور نقیضین سے متعلق ہو سکتا ہے۔ نیز بہت سے چیزوں کا علم محض عقل سے نہیں ہو سکتا جب تک قوت شہویہ اور غضبیہ عقل کی معین اور مددگار نہ ہو اس لیے ایسی چیزوں کا نام وہی بتلا سکتا ہے جس میں قوت عقلیہ اور ادراکیہ کے علاوہ قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو اور علیٰ ہٰذا جنات کا علم بھی ناقص ہے اور علاوہ ناقص ہونے کے غلبہ ناریت اور قوت خیالیہ کے غلبہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے اس لیے یہ خدمت ان کے سپرد نہیں کی جا سکتی۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ ﴿اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا﴾ تو حق تعالیٰ شانہ نے دو جواب اور ارشاد فرمائے ایک حاکمانہ اور ایک حکیمانہ حاکمانہ جواب تو یہ فرمایا کہ ﴿اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ رموز مملکت خویش خسرواں دانند اور حکیمانہ جواب یہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ﴾ کہ آدم علیہ السلام کو اشیاء کے تمام اوصاف اور خواص اور اسماء کی تعلیم دی تا کہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں۔ اس سے حضرت آدم علیہ السلام کا بمقابلہ ملائک فضل و کمال ظاہر ہوا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں: یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو شریک امتحان کریں اور ایک کو خلوت میں جواب سکھلا دیں اور پھر امتحان لیں۔ جواب یہ ہے کہ کہیں ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلا دیئے تھے اور جب یہ ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے بھی بتلایا ہو اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہے کہ استاد نے اقلیدس کی کسی شکل کی دونوں طلبہ کے سامنے تقریر کی مگر امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت کے بتلا سکا اور دوسرا نہ بتلا سکا۔ کیونکہ علم کے لیے استعداد کی ضرورت ہے اور یہ استعداد حضرت آدم علیہ السلام ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت جبرئیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی اس لیے نہ بتلا سکے کہ ان میں اس کی استعداد نہ تھی حق تعالیٰ شانہٗ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی رہا یہ شبہ کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھے ہوں گے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہو گئی مگر یہ اعتراض لغو ہے کیونکہ بتلانے کے لیے مخاطب کا سمجھنا لازمی نہیں۔ اس لیے ﴿اَنۡۢبَاَ﴾ فرمایا۔ ﴿عَلَّمَ﴾ نہیں فرمایا۔ تعلیم کے معنی سمجھا دینے کے ہیں اور ﴿اَنۡۢبَاَ﴾ کے معنی اخبار یعنی تقریر کر دینے کے ہیں گو مخاطب نہ سمجھا ہو اور یہ استعداد خاصہ بشر کا ہے۔ اگر فرشتوں کو یہ استعداد عطاء کر دی جائے تو فرشتے فرشتے نہ رہیں جیسے حس و حرکت خاصہ حیوان کا ہے اگر

جماد میں یہ صفت پیدا فرمادیں تو جماد۔ جماد نہ رہے گا بلکہ حیوان بن جائے گا۔ لہٰذا اس سوال کا حاصل یہ ہوگا کہ فرشتوں کو بشر کیوں نہ بنادیا ظاہر ہے کہ یہ سوال بے معنی ہے جواب اس کا ظاہر ہے کہ اس صورت میں فرشتوں کے پیدا کرنے میں جو حکمت ہے وہ معطل ہوجائے گی اور اگر یہ کہا جائے کہ اول ہی فرشتوں کو بشر بنا کر خلیفہ بنادیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں بنایا اس کی نسبت صرف یہی کہا جائے گا۔ ؎

حدیث مطرب ومی گوورا زدھر کمتر جو　　کہ کس نہ کشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا

(ہذا کلہ، ملخص وعظ نفی الحرج پندرھواں وعظ از سلسلہ تبلیغ) خلاصہ کلام یہ کہ جب حضرت آدم کی فضیلت ظاہر ہوگئی تو فرشتوں کو ان کی تعظیم کا حکم ہوا چنانچہ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ اور اے بنی آدم تم خاص طور پر اس احسان کو بھی یاد کرو کہ جس وقت ہم نے تمام فرشتوں کو تمہارے باپ کی تعظیم وتکریم کا حکم دیا کہ سب مل کر آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تاکہ تمہارے باپ کی فضیلت اور فوقیت عملی طور پر علی اعلان ظاہر ہوجائے بادشاہ جب کسی کو اپنا خلیفہ بناتا ہے تو ارکان دولت کا حکم دیتا ہے کہ نذریں پیش کریں اور فوج کو سلامی کا حکم دیتا ہے تاکہ سب کو معلوم ہوجائے کہ اس خلیفہ کی فرمانبرداری کرنا ہوگی تو سب سجدہ میں گر گئے بعض روایات میں ہے کہ سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام نے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مرتبہ عطا فرمایا کہ تمام قرآن ان کی پیشانی پر لکھ دیا۔ رواہ ابن ابی حاتم وابوالشیخ وابن عساکر غرض یہ کہ سب فرشتے حکم الٰہی بجالائے اور سب نے آدمؑ کو سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور اللہ کے علم میں وہ پہلے ہی سے کافروں سے تھا اگرچہ ظہور اس کے کفر کا اب ہوا اس لیے کہ حکم خداوندی کے امتثال سے انکار کرنا ایک کفر تو یہ ہوا۔ دوسرا کفر یہ کیا کہ حکم خداوندی کو خلاف حکمت اور خلاف مصلحت سمجھا۔ تیسرا کفر یہ کیا کہ اپنے تمرد اور سرکشی کو حکم خداوندی کے تعمیل سے بہتر سمجھا میں نے سنا ہے کہ اس زمانہ کے بعضے ملحد شیطان کو موحد اعظم کہتے ہیں۔ اللہ اکبر جو خبیث ذات اپنے کو خداوند ذوالجلال کا ہم پلہ اور ہم رتبہ سمجھتی ہو وہ تو مشرک اعظم ہے۔ شیطان کو موحد اعظم کہنا یہ اس شخص کے نادان اعظم اور احمق اعظم ہونے کی روشن دلیل ہے۔

فائدہ: ابلیس اصل میں جنات سے ہے مگر ابتداء میں ملائکہ کے ساتھ اختلاط رکھتا تھا۔ فساد اور خونریزی کی وجہ سے جب جنات کو زمین سے نکال کر جزائر اور جبال میں منتشر کیا گیا تو ابلیس ان میں بہت بڑا عالم اور عابد تھا۔ فساد اور خونریزی سے اپنا بے لوث ہونا ظاہر کیا تو فرشتوں کی سفارش سے بچ گیا اور فرشتوں میں رہنے کی اجازت ہوئی مگر دل میں یہ طمع لگی رہی کہ کسی طرح زمین کی فرمانروائی مجھ کو مل جائے اس طمع میں خوب عبادت کرتا رہا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا وقت آیا اور تمام ملائک کو سجدہ کا حکم ہوا۔ تو ابلیس اس وقت ناامید ہوا اور استکبار اور حسد نے اس کو حق جل شانہٗ کے مقابلہ اور معارضہ پر آمادہ کیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون ومطرود رجیم ومردود ہوا۔

ابلیس اگرچہ ملائکہ میں سے نہیں کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ "اور تھا ابلیس جنات میں سے" مگر خطاب سجود میں بتبعیۃ ملائکہ بالاولی داخل تھا۔ بادشاہ جب سپاہیوں کو حکم دیتا ہے تو سائیس اور فراش بدرجہ اولی اس حکم کے مامور ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ شیطان کو علاوہ ملائک کے سجدہ کا کوئی صریح حکم کیا گیا ہو جیسے ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ﴾ * سے متبادر ہے۔

---

* یعنی تجھ کو سجدہ کرنے سے کیا چیز مانع ہوئی جب کہ تجھ کو میں نے حکم دیا تھا۔ ۱۲ مدیر

فائدہ: سجدہ کی دو قسمیں ہیں: ایک سجدۂ عبادت یعنی کسی کو خدا اور معبود سمجھ کر سجدہ کرنا۔ اس قسم کا سجدہ تمام ملتوں میں کفر ہے اور شرک ہے۔ اس قسم کا سجدہ کسی ملت اور شریعت میں کسی وقت میں جائز نہیں رکھا گیا۔ دوسرا سجدۂ تحیت و تکریم۔ یعنی بطور تعظیم کسی کے سامنے سر جھکانا جیسے ابتداء ملاقات میں سلام کرتے ہیں۔ اسی طرح شرائع سابقہ میں بطور تسلیم یہ سجدہ تکریم مشروع تھا۔ شریعت محمدیہ نے اب اس کو بھی ممنوع اور حرام قرار دیا ہے جیسا کہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث متواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے' دونوں سجدوں میں فرق اتنا ہے کہ سجدۂ عبادت تو کفر ہے اور سجدۂ تعظیم حرام ہے یا یوں کہو کہ سجدۂ عبادت شرک اعتقادی اور سجدۂ تعظیمی شرک عملی ہے تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدۂ عبادت نہ تھا اس لیے کہ سجدہ عبادت سوائے خدا کے کسی کو کرنا کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کفر کا حکم نہیں دیتا یہ سجدہ تعظیم و سلام تھا جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہے ﴿خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾۔

مناظرۂ عدو اللہ* دربارۂ فضیلت خلیفۃ اللہ

ابلیس علیہ اللعنۃ الیٰ یوم القیامۃ نے جب سجدہ سے انکار کیا تو علت یہ بیان کی:

﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲﴾ (الاعراف)

ترجمہ: "کہا اے خدا میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔"

اور آگ مٹی سے بہتر ہے اس لیے میں آدم سے بہتر ہوا مگر اس کا یہ دعویٰ کہ آگ مٹی سے بہتر ہے بالکل غلط ہے بلکہ عنصر ترابی کا عنصر ناری سے بہتر ہونا متعدد وجوہ اور دلائل سے ثابت ہے۔

① آگ بالطبع مفسد اور مہلک ہے' احراق اور اتلاف اس کا خاصہ ہے بخلاف تراب کے کہ وہ نہ مہلک ہے اور نہ محرق۔

② آگ کی طبیعت ہی خفت اور حدت اور طیش سے بھری ہوئی ہے بخلاف تراب کے کہ اس میں رزانت و وقار اور ثبات ہے۔

③ زمین ہی حیوانات کے ارزاق و اقوات اور انسانوں کے لباس اور زینت اور تمام سامان معیشت کا معدن اور منبع ہے، بخلاف آگ کے وہ ان تمام نفع رسانیوں سے بالکل بیگانہ ہے۔

④ عنصر ترابی کی ہر حیوان کو ضرورت ہے کوئی حیوان زمین سے مستغنی نہیں، بخلاف عنصر ناری کے کہ وحوش بہائم تو اس سے بالکل مستغنیٰ ہیں، انسان بھی بعض اوقات آگ سے مستغنیٰ ہو جاتا ہے۔

⑤ زمین میں کسی شے کا اگر ایک تخم بھی ودیعت رکھ دیا جاتا ہے تو زمین ایک تخم کو اضعافاً مضاعفہ بن کر واپس کر دیتے ہیں۔ آگ میں جو کچھ بھی رکھا جائے جلا کر سب کو خاکستر بنا دے گی۔

⑥ حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم میں بکثرت زمین اور زمین کے منافع کا ذکر فرمایا ہے کہ زمین کو ہم نے مہاد اور فراش بساط اور قرار احیاء اور اموات کا مادیٰ اور ملجاء بنایا زندہ اس پر زندگی بسر کرتے ہیں اور مر کر اس میں دفن ہوتے ہیں اور بار بار زمین اور زمین کے عجائب میں تفکر اور تدبر کا حکم دیا۔ بخلاف آگ کے کہ اکثر و بیشتر اس کو موقع عقاب و عذاب اور مقام تخویف و ترہیب میں ذکر فرمایا۔

---

* یہ مناظرہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع الفوائد ص ۱۳۹ ج ۴ میں ذکر فرمایا ہے۔

صرف ایک دو جگہ یہ ارشاد فرمایا ہے ﴿ تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴾ (الواقعہ:۷۳) کہ یہ آگ آخرت کی آگ کی یاد دہانی اور مسافروں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

⑦ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار زمین کا منبع برکات اور سرچشمہ ہونا بیان فرمایا ہے:

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى :﴿ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ﴿۹﴾ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ ﴾ (حٰمٓ السجدہ)

اس آیت میں برکت عامہ کا ذکر فرمایا۔ اور آیت ﴿ وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ ﴾ (الانبیاء) اور آیت ﴿ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً ﴾ (سباء:۱۸) اور آیت ﴿ وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ ﴾ (الانبیاء:۸۱) میں ان برکات کو ذکر فرمایا کہ جو زمین کے خاص خاص قطعوں کو حاصل ہیں۔ بہر حال زمین برکات عامہ اور برکات خاصہ دونوں کا معدن اور منبع ہے، بخلاف آگ کے کہ وہ منبع برکات تو کیا ہوتی۔ اس کے برعکس وہ تو برکات کی مٹانے والی اور فنا کرنے والی ہے۔

⑧ مساجد اور وہ بیوت کہ جن میں صبح وشام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ہر وقت اس کی عبادت اور بندگی سے معمور رہتے ہیں وہ سب زمین ہی پر واقع ہیں۔ تمام روئے زین پر اگر سوائے اس بیت حرام کے جس کو خدا نے مبارک اور ﴿ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ اور ﴿ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ﴾ فرمایا ہے اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہ زمین کے شرف اور فضیلت کے لیے کافی اور وافی تھا۔

⑨ جو چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ آگ ان کی خدمت کے لیے ہے جب ضرورت ہوتی ہے تب آگ سلگائی جاتی ہے، ضرورت ختم ہوتے ہی آگ کو بجھا دیا جاتا ہے، آگ زمین کے لیے بمنزلہ ایک خادم کے ہے اور زمین بمنزلہ مخدوم کے ہے۔

علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نار تراب سے بہتر ہے تب بھی یہ استدلال فاسد ہے اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک شے کا مادہ دوسری شے کے مادہ سے مفضول اور کمتر ہو مگر وہ شے بہ ہیئت موجودہ دوسری شے سے افضل اور بہتر ہو مثلاً انبیاء ومرسلین نطفہ اور علقہ سے پیدا کئے گئے اور ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے مگر خدائے عزوجل نے انبیاء ومرسلین کو ملائکہ مقربین پر فضیلت دی آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا اور جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر وزیر بنایا اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو زمین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وزیر اور مشیر بنایا اور اگرچہ آدم علیہ السلام کو ہم نے زمین کی خلافت اور اس کی عمارت کے لیے پیدا کیا ہے مگر سردست ہم نے ان کو حکم دیا کہ اے آدم (علیہ السلام) تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ تاکہ بہشت کے محلات اور باغات اور چشموں اور نہروں کو دیکھ کر دُنیا میں اس کا نمونہ قائم کر سکو اور فقط سیر پر اکتفا نہ کرو بلکہ چند روز وہاں کی رہائش اختیار کرو اور فی الحال اس کو وطن سکونت بناؤ، تاکہ اس کی تعمیر کی کیفیت خوب ذہن نشین ہو جائے، اور حضرت حواء کو جنت میں رہنے کا اس لیے حکم دیا گیا کہ وہ بہشت کے محلوں کی آرائش اور ان کی زیب وزینت اور وہاں کے زیورات اور حریری لباس کو خوب غور سے دیکھ لیں اور سمجھ لیں تاکہ دُنیا کی عورتوں کو اس طریق پر چلا سکیں اور کھاؤ تم اس بہشت سے خوب وسعت اور فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو تاکہ تمام ماکولات اور مشروبات کے خواص اور آثار، منافع اور مضار تم کو معلوم ہوں اور پھر اس علم کے مطابق دنیا کے ماکولات ومشروبات میں تصرف کر سکو اور زمین میں جو شجر اور ثمر تمہارے لیے پیدا کیے گئے ہیں ان سے نفع اٹھا سکو۔ مگر باوجود اس عام اجازت کے بطور ابتلاء اور امتحان جس میں تمہارے لیے سراسر خیر ہی خیر ہے ہم تم کو بعض چیزوں کے

استعمال سے منع بھی کرتے ہیں تا کہ تم لذائذ اور مرغوبات کے خوگر نہ ہو جاؤ اور وہ یہ کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ درخت کے تعین میں علماء کے اقوال مختلف ہیں کسی آیت یا حدیث صحیح سے ثابت نہیں کہ وہ کیا درخت تھا۔ گیہوں کا تھا کہ انجیر کا، زیتون کا تھا یا انگور کا، سلف اور خلف میں مشہور یہی ہے کہ وہ گیہوں کا درخت تھا اور اصل حقیقت خدا ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیا درخت تھا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کا علم کچھ مفید اور نافع نہیں اور اس کا جہل کچھ مضر نہیں۔ غرض یہ کہ تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

فائدہ: حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کو جس جنت میں رہنے کا حکم ہوا تھا اس سے وہی جنت الخلد مراد ہے جس کا قیامت کے بعد متقین سے وعدہ ہے جیسا کہ قرآن کریم کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے پیشتر آیت ﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ میں اسی جنت الخلد کا ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کو ﴿یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ کا حکم ہوا اور الجنۃ کو معرف باالام ذکر فرمایا جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس مقام پر الجنۃ سے معہود اور معروف جنت مراد ہے جس کا سابق میں ذکر ہو چکا ہے پھر اس کے بعد جب حضرت آدم علیہ السلام کے ہوط کا ذکر فرمایا اور ہوط کے معنیٰ اوپر سے نیچے اترنے کے ہیں بعد ازاں یہ فرمایا: ﴿وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ﴾ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ابتداء میں جس جگہ رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ زمین کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی۔ ورنہ اگر پہلے ہی سے زمین پر تھے تو پھر اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ تم زمین پر اترو اور وہاں جا کر ٹھہرو۔

صحیح مسلم میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور یہ عرض کریں گے۔

((یا ابانا استفتح لنا الجنة فیقول و هل اخرجکم من الجنة الا خطیئة ابیکم)).

ترجمہ: "اے ہمارے باپ آپ علیہ السلام ہمارے لیے جنت کا دروازہ کھلوایئے تو آدم یہ جواب دیں گے کہ تمہارے باپ کی غلطی تو تم کو جنت سے باہر لائی ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اسی جنت سے نکالے گئے تھے کہ جس جنت کا دروازہ مؤمنین کھلوانا چاہتے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((احتج اٰدم و موسٰی عند ربهما فحج اٰدم موسٰی قال موسٰی انت اٰدم الذی خلقك الله بیده و نفخ فیك من روحه وَاسجد لك ملائکته و اسکنك فی جنته ثم اهبطت النَّاس بخطیئتك الارض ...اِلی اٰخر الحدیث)).

ترجمہ: "عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حضرت آدم و موسیٰ (علیہما السلام) کا مناظرہ ہوا۔ آدم (علیہ السلام) موسیٰ (علیہ السلام) پر غالب آ گئے موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا آپ تو وہی آدم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور اپنی خاص روح تم میں پھونکی اور فرشتوں سے تم کو سجدہ کرایا، اور اپنی جنت میں تم کو سکونت عطاء فرمائی اور پھر تم ہی نے لوگوں کو اپنی خطاء سے جنت سے زمین کی طرف اُتارا۔"

یہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ ﴿یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ میں ﴿الْجَنَّةَ﴾ سے وہی جنت مراد ہے جو آسمان پر

ہے حاشا جنت سے زمین کا کوئی باغ مراد نہیں۔ جیسا کہ بعض کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ آدم علیہ السلام کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ دُنیا ہی کے باغوں میں سے کوئی گھنا اور گنجان باغ تھا یہ بالکل غلط ہے۔ پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیت میں جنت سے کوئی دنیاوی باغ مراد ہے جہاں حضرت آدم وحوا علیہما السلام آرام سے رہتے تھے۔ اس باغ میں شیطان نے جا کر حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو دھوکہ دیا یہ قول بالکل غلط ہے اور ذرہ برابر قابل التفات نہیں رہا۔ یہ سوال کہ جنت میں جانے کے بعد وہاں سے نکلنا نہیں تو حضرت آدم علیہ السلام جنت میں جانے کے بعد کیسے نکلے، جواب یہ ہے کہ قیام قیامت کے بعد جو جنت میں داخل ہوگا وہ کبھی جنت سے نہ نکالا جائے گا، اللہ نے دخول جنت پر جو خلود اور دوام کا وعدہ فرمایا اس دخول سے وہ دخول جنت مراد ہے جو قیام قیامت اور جزاء اور سزا کے بعد ہوگا۔ کیا احادیث صحیحہ سے یہ ثابت نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ المعراج میں جنت کی بھی سیر فرمائی، اور پھر صبح سے قبل ہی اس عالم میں تشریف لے آئے اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے دخول کو سمجھیے۔

خلاصۂ کلام:

یہ کہ حق جل شانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آئین خلافت سیکھنے کے لیے قسم قسم کی اشیاء سے تمتع اور انتفاع کے طریقے معلوم کرنے کے لیے اپنے حرم خاص جنت میں چند روزہ سکونت کے لیے حکم دیا اور تمام اشیاء سے تمتع اور انتفاع کی عام اجازت عطا فرمائی۔ صرف ایک قسم کے درخت سے منع فرمایا۔ شیطان تاک میں تھا کہ ان سے کوئی گناہ اور لغزش صادر ہو مگر گناہ اور لغزس اسی وقت ہو سکتی ہے جب کوئی قید اور ممانعت ہو جب کسی چیز کی ممانعت ہی نہ ہو تو معصیت کیسے سرزد ہو۔ شیطان کو جب ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کی نہی اور ممانعت کا علم ہوا تو سمجھا کہ شاید اس راہ سے آدم علیہ السلام پر میرا کوئی وار چل جائے اور اس طرح اپنی دشمنی نکالنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے بہکانے اور پھسلانے کی فکر شروع کی۔ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کے پاس گیا اور یہ کہا کہ تم اپنی اس تعظیم وتکریم پر مغرور نہ ہونا۔ انجام کو بھی سوچو۔ انجام تمہارا موت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ موت کیا ہے؟ شیطان نے مردہ جانور کی صورت بنا کر نزع اور قبض روح کی طرح کچھ کیفیت اور شدت اور غرغرہ کی حالت ان کو دکھلائی دیکھتے ہی گھبرا گئے اور خوف زدہ ہو کر پوچھا کہ اچھا اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر کیا ہے؟ شیطان نے کہا:

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۱۲۰)

ترجمہ: "کیا میں تم کو اس درخت کی نشان دہی نہ کروں کہ جس کے کھانے سے موت اور فنا نہ آئے اور بقاء اور دوام اور دائمی سلطنت اور لازوال بادشاہت حاصل ہو جائے۔"

حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے؟ شیطان نے وہی درخت بتلایا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ یہ درخت تو فنا اور زوال کا ہے۔ بقاء اور دوام کا نہیں بلکہ رسوائی اور ندامت کا درخت ہے۔ قرب اور وجاہت کے بجائے بُعد اور ذلت کا موجب ہے اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے ہم کو اس کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اگر اس درخت میں یہ فائدے ہوتے تو وہ ارحم الراحمین ہم کو منع نہ فرماتا۔ شیطان نے کہا:

﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝﴾ (الاعراف)

ترجمہ: "تمہارے پروردگار نے اس درخت سے اس لیے منع نہیں کیا کہ اس کا پھل تمہارے لیے موجب ضرر ہوگا بلکہ اس

لیے منع کیا ہے کہ تم اس کے کھانے سے ہمیشہ زندہ رہنے والے یا فرشتے بن جاؤ گے (جو ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے اور کھانے اور پینے اور زن وفرزند اور دُنیا و مافیہا سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا)۔"

پس اگر یہ حالت تم کو حاصل ہو جائے تو خلافت کا کام کیسے انجام پائے۔ دنیا کی خلافت کا کام تو زن وفرزند اور طعام و شراب اور کسب معاش کی فکر میں مشغولی سے انجام پا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ زن وفرزند میں مشغول رہ کر خدا کے ساتھ مشغول نہیں رہ سکتا۔

حق تعالیٰ شانہٗ کو چونکہ تم سے خلافت کا کام لینا ہے اس لیے تم کو اپنے سے دور بھیج رہا ہے اور اس درخت کے میوہ کا استعمال خداوند ذوالجلال کے قرب واتصال کا موجب ہے اور بہشت میں موت نہیں۔ تم کو محض آئین خلافت کے سکھانے کے لیے چند روز بہشت میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد تم کو اپنی بارگاہِ قرب سے علیحدہ کر کے دُنیا میں بھیجے گا۔ وہاں جا کر تم اور تمہاری اولاد طرح طرح کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونگے اور انجام سب کا موت ہوگا اور خداوند ذوالجلال کا قرب اور وصال اور یہاں کا یہ ملک لازوال دُنیا میں جانے کے بعد اور خلافت ارضی کے ملنے کے بعد باقی نہیں رہ سکتا۔ حضرت آدم اور حواء علیہما السلام ابلیس کی ان دلفریب باتوں سے تردد اور اضطراب میں پڑ گئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک عاشق صادق حکومت اور سلطنت کو چھوڑ سکتا ہے مگر محبوب کی مفارقت اور جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ عاشق صادق کے لیے تو مفارقت کا لفظ ہی فراقِ روح کا پیغام ہوتا ہے۔ ابلیس نے جب دیکھا کہ حضرت آدم اور حواء علیہما السلام تردّد میں پڑ گئے تو ان کو پختہ کرنے کے لیے بہت سی قسمیں کھائیں۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ۝﴾ (الاعراف) کہ خدا کی قسم میں محض تمہاری خیر خواہی سے تم کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ تم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے جو بے ادبی اور گستاخی مجھ سے سرزد ہو چکی ہے اس خیر خواہی سے اس کی کچھ تلافی کر دوں تا کہ عمر بھر تم مجھ کو یاد کرو اور میرے شکر گزار رہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہوا کہ مخلوق کی یہ جرأت اور مجال نہیں کہ خداوند ذوالجلال پر جھوٹی قسم کھائے اور اس تاکید اکید کے ساتھ کھائے۔ اس لیے بظاہر یہ سچ ہوگا اور قرب اور وصال کے حصول کے شوق میں ﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کے حکم سے ذہول ہو گیا اور اس کی عداوت کو بھی بھول گئے ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا﴾ پس شیطان نے آدم اور حواء علیہما السلام کو اس درخت کے بچنے سے اس طرح پھسلا دیا اور معلوم نہیں کہ حضرت حواء علیہا السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے اس لعین نے کیا کیا دلفریب باتیں بنائی ہوں گی جس سے وہ دھوکہ میں آ گئے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں بجائے ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا﴾ کے ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا﴾ آیا ہے۔ کما فی الکشاف۔ اس قراءت میں لغزش کی ایک کیفیت کا بیان ہے، شیطان نے بذریعہ وسوسہ حضرت آدم اور حواء علیہما السلام کو لغزش دی۔ ﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ﴾ پس نکالا ان دونوں کو اس راحت اور آرام سے جس میں وہ تھے اور گناہ کی برائی ظاہر کرنے کے لیے ہم نے آدم اور حواء علیہما السلام سے کہا کہ اُترو تم بہشت سے اس لیے کہ تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہوگا۔ اور بہشت زمعصیت کا محل ہے نہ عداوت اور دشمنی کا۔ اس کے لیے تو دارِ دُنیا ہی موزوں اور مناسب ہے دُنیا ہی میں خدا کی نافرمانی اور آپس کی عداوت ممکن ہے خدا کی بہشت اور ساتوں آسمان حق جل وعلاء کی معصیت سے بالکلیہ پاک اور آپس کی عداوت سے بالکل منزہ ہیں۔

فائدہ: ﴿اِهْبِطُوْا﴾ کا خطاب حضرت آدم اور حواء علیہما السلام کو ہے جیسا کہ دوسری جگہ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا﴾ بصیغہ تثنیہ وارد ہوا ہے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر اور حضرت حواء علیہا السلام اُم البشر ہونے کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان کے قائم مقام ہی اس لیے اس جگہ

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا﴾ میں حضرت آدم اور حواء علیہما السلام کو صیغۂ جمع کے ساتھ مخاطب فرمایا اور چند روز تک تم کو زمین پر ٹھہرنا ہے اور وہاں کے ساز و سامان سے ایک وقت معین تک تم کو متمتع اور منتفع ہونا ہے یعنی وہ انتفاع دائمی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت معین تک ہوگا اور وہ وقت معین ہر شخص کے لحاظ سے تو موت ہے اور سارے عالم کے اعتبار سے قیامت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اس خطابِ سراپا عتاب کو سنتے ہی بے چین اور بے تاب ہو گئے۔ فوراً بارگاہ خداوندی میں ایسے تضرع اور ابتہال کے ساتھ ملتجی ہوئے کہ سارے عالم کا تضرع اور ابتہال بھی اس کے پاسنگ نہیں ہوسکتا۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی شان عفو اور مغفرت جوش میں آ گئی۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریاں اوست　　دے ہمایوں دل کہ آں بریان اوست
در پئے ہر گریہ آخر خندہ ایست　　مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

اور حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ اور معذرت کے کلمات تلقین فرمائے گئے۔ ابلیس کی معصیت چونکہ تمرد اور سرکشی کی بناء پر تھی اس لیے اس کو توبہ اور معذرت کی تلقین نہیں فرمائی۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کی معصیت سہو اور نسیان اور ذہول اور غفلت کی بناء پر تھی اس لیے ان کو بارگاہِ خداوند سے کلمات معذرت کا القاء اور الہام ہوا جو ان کی توبہ کی قبولیت کا سبب ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷﴾

ترجمہ: "پس حاصل کیے آدم نے اپنے رب کے الہام سے معذرت کے چند کلمے۔ پس توجہ فرمائی ان پر اللہ نے اپنی رحمت اور مغفرت سے۔ اور بیشک وہی توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

﴿تَوَّاب﴾ کے بعد ﴿رَحِيْمُ﴾ کی صفت ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا اس پر واجب نہیں محض اپنی رحمت سے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور وہ کلمات یہ ہیں: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳﴾ (الاعراف) جیسا کہ سورہ اعراف میں اُن کا ذکر ہے۔

فائدہ: ① حضرت حواء علیہا السلام چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے تابع تھیں اس لیے اس جگہ ان کی توبہ کا ذکر نہیں فرمایا۔ اور سورۂ اعراف میں دونوں کی توبہ ذکر فرمائی ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ ... الخ﴾ یعنی دونوں نے کہا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا .... الخ﴾ اس پر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کے گناہ کو معاف کیا ار توبہ کو قبول فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بن گئے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ "اللہ تعالیٰ توابین کو محبوب رکھتا ہے"۔

فائدہ: ② توبہ کے اصلی معنی رجوع کے ہیں اور اَوْب کے معنی بھی رجوع کے ہیں۔ تائب اور تواب اس کو کہتے ہیں کہ جو معصیت سے طاعت کی طرف رجوع کرے اور آئب اور اوّاب وہ ہے جو غفلت سے ذکر اور فکر کی طرف رجوع کرے۔ كما قال الله تعالىٰ: ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ﴾ اور جب تاب کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف کی جائے مثلاً ﴿تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهَا﴾ کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے انتقام اور عقوبت سے عفو اور رحمت اور لطف و عنایت کی طرف رجوع فرمایا۔

فائدہ: ③ حضرت آدم علیہ السلام کے توبہ قبول ہو جانے سے عیسائیوں کے عقیدہ کی تردید ہو گئی کہ آدم کی معصیت کی وجہ سے ان کی تمام اولاد گناہ کے بوجھ میں لدی ہوئی تھی۔ عیسیٰ نے آ کر تمام بنی آدم کو اپنی صلیبی موت سے گناہوں سے مخلصی دی۔ نصاریٰ کا یہ عقیدہ بالکل مہمل ہے عقل اور نقل کے خلاف ہے۔

ازالۂ اشتباہ ازلغزش سیدنا وابینا آدم علیہ السلام وتحقیق مسلک علماء اسلام دربارۂ عصمت انبیاء کرام علیہم السلام

قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے باوجود اوّل الانبیاء علیہم السلام اور نبی مکلم اور رسول محترم ہونے کے یہ زلت * (لغزش) کیسے صادر ہوئی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام کی مختصراً توضیح اور تشریح کردی جائے اور عصمت اور معصیت کی حقیقت سمجھادی جائے۔ اصل مسئلہ سمجھ جانے کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی اشکال نہ رہے گا اہل حق کا یہ اماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام خداوند ذوالجلال کی نافرمانی سے معصوم ہوتے ہیں۔ صغیرہ اور کبیرہ سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ قصداً وارادۃً ان سے حق تعالیٰ کی نافرمانی ممکن نہیں۔ اگر قصداً ان سے حکمِ الٰہی کی مخالفت ممکن ہوتی تو حق جل شانہٗ مخلوق کو ان کی بے چون وچرا اطاعت * اور متابعت کا حکم نہ دیتا اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت نہ قرار دیتا اور انبیاء کرا علیہم السلام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا نہ قرار دیتا۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ (نساء:۸۰)

ترجمہ: "جس نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ﴾ (الفتح:۱۰)

ترجمہ: "تحقیق جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اُوپر ہے۔"

دست اور احق چو دست خویش خواند تا یداللہ فوق ایدیھم براند

اور ظاہر ہے کہ یہ اتباع نبوی اور اقتدا مطلق کا حکم جو آیات قرآنیہ سے ثابت ہے وہ کسی خاص امر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عقائد سے لے کر اعمال تک کوئی عقیدہ اور کوئی خلق اور کوئی حال اور کوئی عمل کیوں نہ ہو سب میں اقتداء نبوی ضروری ہے جیسا کہ مقتضائے اطلاق یہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ذوات بابرکات۔ قدسی صفات اور ملکی سمات ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی اصل فطرت وہی ہوتی ہے جو ملائکہ کی ہوتی ہے۔ فطرت کے اعتبار سے انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام ایک ہوتے ہیں۔ فرق فقط لباس بشری کا ہوتا ہے

---

* زلّت بمعنی لغزش فتح زاء کے ساتھ ہے جس کے معنی بلا ارادہ اور اختیار قدم پھسل جانے کے ہیں یہ لفظ زاء کے ساتھ ہے ذال کے ساتھ نہیں۔ ذال کے ساتھ لفظ ذلّت بکسر ذال ہے جو عزت کی ضد ہے اور قرآن کریم میں ﴿فَاَزَلَّهُمَا﴾ زاء کے ساتھ آیات ہے۔ ذال کے ساتھ نہیں۔ خوب سمجھ لو کہیں لغزش نہ ہو جائے۔

* حافظ تور بشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں واز اں جملہ آنست کہ ہوائے ایشاں پئے فرمان حق بودہ است ونفس ایشاں ہموار در طاعت او بفرمان ایشان وازیں وجہ ایشاں از نافرمانی خدا بقصد معصوم مانند وایشاں واجب العصمت اند ومخالفت امر خدائے تعالیٰ برایشان روانیست زیرا کہ حق خلق را فرمودہ است کہ پیروی ایشاں بکنند واگر عصیاں بقصد از ایشاں یافت شدے خدائے تعالیٰ خلق را متابعت ایشاں نفرمودے۔ (معتمد فی المعتقد ص ۶۳)

اور عصمت ملائکہ کا خاصۂ لازمہ ہے اور انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں جیسا کہ حضرت آدم ؑ کا قصّہ اس پر شاہد عدل ہے۔ ابلیس لعین اسی وجہ سے ملعون اور مطرود ہوا کہ اس نے حضرت آدم کی افضلیت اور برتری کو تسلیم نہیں کیا جس سے ثابت ہوا کہ حضرت آدم ؑ ملائکہ معصومین سے افضل اور برتر ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم معصوم سے افضل نہیں ہوسکتا۔

عصمت کے معنی:

عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی مداخلت سے پاک اور منزہ ہوں اور نفس اور شیطان یہی دو چیزیں مادۂ معصیت ہیں اور مادۂ معصیت سے پاک ہونے کا نام عصمت ہے اور معصوم وہ شخص ہے جو اپنے تمام اعتقادات اور نیات اور ارادات اور مقامات اور اخلاق و عادات اور عبادات و معاملات اور اقوال و افعال میں نفس اور شیطان کی مداخلت سے محفوظ ہو اور حفاظت غیبی اس کی محافظ اور نگہبان ہو کہ اُن سے کوئی ایسی شے سرزد نہ ہو جائے کہ اُن کے دامنِ عصمت کو آلودہ کر سکے۔ حق جل شانہٗ کی نظر عنایت اور فرشتوں کی محافظت اُن کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہو جو کشاں کشاں ان کو راہِ راست پر چلاتی ہو اور خلاف حق کے میلان سے بھی اُن کی مانع ہو حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں انبیاء کرام علیہم السلام کو مرتضیٰ اور مصطفین * الاخیار اور عباد مخلصین فرمایا ہے۔ جس سے من کل الوجوہ ارتضا اور اصطفاء اور اخلاص کامل مراد ہے اور مخلص وہ ہے کہ جو خالص اللہ کا ہو غیر اللہ کا اس میں شائبہ نہ ہو یعنی مادۂ شیطانی سے بالکلیہ پاک ہو لہٰذا ضروری ہوا کہ نبی صغائر اور کبائر دونوں سے معصوم ہو اس لیے کہ مادۂ شیطانیہ ہی صغائر اور کبائر کا منشاء ہے اور حق جل شانہٗ کے اس ارشاد ﴿اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ میں لفظ ﴿مِنْ﴾ بیانیہ ہے اور لفظ ﴿رَسُوْلٍ﴾ نکرہ لایا گیا ہے معلوم ہوا کہ ہر رسول کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ اور برگزیدہ بندہ ہو یعنی تمام اخلاق و عادات اور افعال و ملکات اور احوال و مقامات میں من کل الوجوہ حق تعالیٰ کا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ہو اور بلاشرکت غیرے خالص اللہ کو بندہ ہو اور ظاہر ہے کہ ان آیات میں بعض وجوہ سے پسندیدگی مراد نہیں اس لیے کہ بعض وجوہ سے تو ہر مسلمان خدا کا پسندیدہ بندہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کے اصطفاء اور اجتباء اور ارتضاء سے من کل الوجوہ پسندیدگی اور برگزیدگی مراد ہے اور من کل الوجوہ پاک وصاف اور خدا کا پسندیدہ اور بلاشرکت غیر خالص حق تعالیٰ کا بندہ وہی ہوسکتا ہے جسکا ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی بندگی اور اطاعت سے بالکلیہ پاک ہو اور اسی مادۂ معصیت سے بالکلیہ طہارت اور نزاہت کا نام عصمت ہے اور اصطفاء اور ارتضاء باب افتعال کے مصدر ہیں جو اپنے لیے ہوتا ہے۔ اکتیال اور اتزان اپنے لیے کیل و وزن کرنے کو کہتے ہیں اور کیل اور وزن عام ہے خواہ اپنے لیے ہو یا غیر کے لیے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣﴾ (المطففین) اپنے لیے کیل کرنے کو ﴿اکتالوا﴾ یعنی باب افتعال کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا اور دوسروں کے لیے تولنے کو کالوہم اور ﴿وزنوھم﴾ ثلاثی مجرد سے تعبیر کیا گیا پس اس قاعدۂ لغویہ کے بناء پر اصطفا اور ارتضاء کے معنی اپنے لیے پسندیدہ اور برگزیدہ بنانے کے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ پس عصمت کا ماحصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تمام اخلاق و ملکات و عادات و حالات۔ اقوال و افعال

---

* كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝﴾

وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى حاكيا عن اللعين: ﴿رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝﴾

عبادات ومعاملات میں سرتا پا پسندیدہ خداوندی اور برگزیدۂ ایزدی ہوتے ہیں اور ظاہراً اور باطناً دخل شیطانی اور عوارض نفسانی سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی عنایت ربانی وحمایت یزدانی سے علیحدہ نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے چون وچرا اطاعت فرض ہے اور اُن کا ہر قول اور ہر فعل قابل قبول ہے اور اُن کی اطاعت سے انحراف شقاوت ابدی اور خسران دارین کا موجب ہے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے اگر کسی وقت بمقتضائے بشریت کوئی لغزش بطور سہو ونسیان صادر ہو جاتی ہے تو وہ باہر سے آتی ہے اندر سے نہیں آتی جیسے آب گرم میں حرات خارجی اثر سے آتی ہے باقی پانی میں مادۂ حرارت کا نام ونشان نہیں پانی کی طبیعت میں سوائے برودت کے کچھ بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ پانی کتنا ہی گرم ہو اگر آگ پر ڈال دیا جائے تو آگ فوراً بجھ جاتی ہے اسی طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا باطن مادۂ معصیت (نفس وشیطان) سے بالکل پاک ہوتا ہے، البتہ کبھی خارجی اثر سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے لیکن فوراً ہی دست قدرت اُس باہر سے آتے ہوئے غبار کو چہرۂ عصمت سے صاف کر دیتا ہے اور چہرۂ نبوت پہلے سے زیادہ صاف اور روشن ہو جاتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں حق جل شانہٗ کا ارشاد:

﴿ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝۲۴ ﴾ (یوسف)

ترجمہ: "(اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خالص بندوں کے ساتھ) ایسا ہی ہوتا ہے تاکہ (یوسف علیہ السلام) سے بُرائی اور بے حیائی یعنی صغیرہ اور کبیرہ کو اس سے دُور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔"

اسی طرف مشیر ہے کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ سوء اور فحشاء کو یوسف علیہ السلام سے دُور رکھیں اور یہ نہیں فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو سوء اور فحشا سے دُور رکھیں۔ پھیرنا اور ہٹانا اور دُور رکھنا اس کے حق میں ہوتا ہے جو آنا چاہتا ہو معلوم ہوا کہ سوء اور فحشاء حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف آنا چاہتا تھا۔ جس کو حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی طرف آنے سے روک دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اُدھر جانا نہیں چاہتے تھے۔ معاذ اللہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا میلان سوء اور فحشاء کی طرف ہوتا تو حق تعالیٰ اس طرح فرماتے ﴿ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ ﴾ (یوسف: ۲۴) یعنی ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء سے روکا اور بچایا معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام تو سوء والفحشاء سے بھاگ رہے تھے مگر سوء اور فحشاء اُن کے پیچھے لگا ہوا تھا جس کو دست قدرت نے دھکے دے دیئے اور یوسف علیہ السلام کو بالکل بچا لیا کیونکہ یوسف علیہ السلام تو خالص اللہ کے بندے تھے اُن کا قلب مادۂ معصیت سوء اور فحشاء سے بالکلیہ پاک تھا زلیخا کی طرف سے یہ سوء اور فحشاء چلا مگر حق تعالیٰ کی رحمت اور عنایت نے اس کو خدا کے مخلص اور برگزیدہ بندہ تک پہنچنے نہ دیا۔

غرض یہ کہ خارجی اثر کی بناء پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے بطریق سہو ونسیان جو لغزش ہو جاتی ہے تو محض صورت کے اعتبار سے اس پر عصیان یا معصیت کا اطلاق ہو جاتا ہے یا ان کے مقام عالی اور مرتبہ علیا کے لحاظ سے اس کو عصیان کہہ دیا جاتا ہے۔

معصیت کے معنی:

اور معصیت (گناہ) مطلق مخالفت حکم کا نام نہیں بلکہ معصیت اس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً اور قصداً ہو اور بوجہ نسیان اور غلطی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موقع عذر میں یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بھول گیا تھا یا میں سمجھا نہ تھا اگر باوجود نسیان اور غلط فہمی کے بھی کسی مخالفت کو معصیت اور گناہ اور جرم کہا جائے تو پھر موقع عذر میں یہ کہنا کہ میں بھول گیا تھا سراسر لغو ہوگا۔

معلوم ہوا کہ مطلق مخالفت کا نام معصیت نہیں بلکہ معصیت اُس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً ہو اور جو مخالفت سہو اور نسیان کی بناء پر

ظہور میں آئے یا بتقاضائے عظمت یا بتقاضائے محبت کوئی مخالفت سرزد ہو جائے تو اسکو معصیت اور گناہ نہیں کہتے بلکہ اس کو زَلّت اور لغزش کہتے ہیں جیسے کوئی مخدوم اپنے کسی چھوٹے کو سرہانے بیٹھنے کو کہے اور وہ اس کے کہنے کو نہ مانے تو یہ سرکشی اور معصیت نہیں بلکہ عین ادب اور دلیل اطاعت ہے صلح حدیبیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لفظ رسول اللہ مٹا دینے سے انکار کر دینا اسی قبیل سے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کھا لینا بھول چوک کی بناء پر تھا جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (طٰہٰ:۱۱۵)۔

حضرت آدم علیہ السلام حق جل شانہٗ کی ممانعت ﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کو بھی بھول گئے اور شیطان کی عداوت سے بھی ذہول ہو گیا اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى﴾ (طٰہٰ:۱۱۷) یہ بھی یاد نہ رہا سو یہ ماجرا بھولے سے ہو گیا اور بھول چوک کو گناہ اور جرم قرار دینا سراسر غلط ہے۔ حضرت آدم اور حواء علیہما السلام دونوں جنت پر شیدا اور فریفتہ تھے اس لیے ابلیس کی قسم سے دھوکہ میں آ گئے اور یہ سمجھے کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ نیز حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کو کھا لینا بتقاضائے محبت خداوندی تھا۔ خلود اور قرب خداوندی کے شوق میں تھا۔ جیسا کہ ﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخٰلِدِينَ﴾ (الاعراف:۲۰) اس پر دلالت کرتا ہے نیز بتقضائے عظمت بھی تھا اس لیے کہ جب شیطان نے یہ قسم کھائی ﴿وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِينَ﴾ (الاعراف:۲۱) تو حضرت آدم علیہ السلام کو یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ خُدا کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے گا وہ یہ سمجھے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا پس معلوم ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ فعل بارادۂ مخالفت نہ تھا اور نہ بتقاضائے ہوائے نفسانی تھا۔ بلکہ بتقاضائے محبت و عظمت خداوندی تھا لہٰذا اس کو معصیت اور گناہ نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ از قسم زَلّت ولغزش ہے یعنی ارادہ تو اطاعت اور قرب خداوندی کا تھا مگر دشمن نے ایسا دھوکہ دیا کہ قدم پھسل کر دوسری جانب جا پڑا اسی کو لغزش کہتے ہیں۔ ﴿فَدَلّٰهُمَا بِغُرُورٍ﴾ (الاعراف:۲۲) اور ﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ لغزش تھی جو بھولے سے ہو گئی ارادہ نافرمانی کا نہ تھا۔

پس جن آیاتِ قرآنیہ میں اس فعل پر معصیت کا اطلاق کیا گیا ہے وہ محض ظاہر اور صورت کے اعتبار سے ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں یا ان کے مقام بلند اور رتبۂ عالیہ کی نسبت سے اس کا نام عصیان رکھا گیا۔ (مباحثۂ شاہجہان پور ص ۳۷ و ص ۳۸)

اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں ترکِ اُولیٰ ایسا ہے جیسا کہ دوسروں کے حق میں خطاء۔ (حاشیۂ ملا عبدالحکیم علی الخیالی ص ۲۶۱)

حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ افضل اور اولیٰ سے چوک گئے اور بھولے سے غیر اَولیٰ اور غیر افضل کے مرتکب ہوئے اور اوروں کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ حق اور ہدایت سے چوک گئے اور باطل اور ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام باجماع امت ایسی خطاء سے معصوم ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی خطاء اجتہادی کے یہ معنی ہیں کہ کسی وقت بھول چوک سے اولیٰ و افضل کے بجائے خلافِ اولیٰ امر ان سے صادر ہو جاتا ہے۔ اور بجائے عزیمت کے رخصت پر عمل کر لیتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی زَلّت اور لغزش کو اسی معنی پر محمول کرنا چاہیے اور یہ معلوم رہنا چاہیے اگر بالفرض والتقدیر انبیاء کرام علیہم السلام معاذ اللہ ہماری طرح اسیر حرص وشہوت ہوتے تو خدا تعالیٰ ہم پر ان کی بے چون و چرا اطاعت اور متابعت فرض نہ کرتا۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خلاصۂ موجودات اور زبدۂ کائنات ہیں ان کو انبیاء کرام علیہم السلام کی اقتداء کا حکم نہ دیتا اور یہ ارشاد نہ فرماتا:

﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (الانعام:۹۰) (کذا فی المعتمد فی المعتقد للتورپشتی)

امام * ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نظر اور فکر کا اقتضاء یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں عصمت کا اعتقاد ملائکہ کی عصمت کے اعتقاد سے زیادہ مؤکد اور اہم ہو اس لیے کہ لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع اور متابعت پر مامور ہیں اور ملائکہ کی اطاعت پر امور نہیں۔ (المعتمد فی المعتقد للتوربشتی ص ۷۳)

متعلقاتِ عصمت

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عصمت کا تعلق چار چیزوں سے ہے۔ اوّل: عقائد، دوم: تبلیغ احکام، سوم: فتویٰ اور اجتہادات، چہارم: افعال وعادات وسیرت وکردار۔

قسم اوّل۔ عقائد:

عقائد کے متعلق اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام ابتداء ہی سے توحید اور ایمان پر مفطور رہوتے ہیں، جب سے پیدا ہوتے ہیں اسی وقت سے ان کے قلوب کفر اور شرک سے پاک اور منزہ اور ایقان وعرفان سے لبریز ہوتے ہیں اور ان کے مبارک چہرے معرفت اور قرب الٰہی کے انوار وتجلیات سے ہر وقت جگمگاتے رہتے ہیں آج تک کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت حق جل شانہٗ نے اپنی نبوت ورسالت کے لیے کسی وقت بھی ایسے شخص کو منتخب فرمایا ہو جو اس عظیم الشان منصب کی سرفرازی سے پہلے کفر اور شرک کی نجاست میں ملوث اور آلودہ ہو چکا ہو ہرگز ہرگز نہیں۔ اور حق جل شانہٗ کا یہ ارشاد ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء) اسی طرف مشیر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اگرچہ قبل از بعثت نبی نہیں ہوتے مگر خدا کے ولی اور مقرب ضرور ہوتے ہیں اور ایسے ولی اور مقرب ہوتے ہیں کہ دوسرے اولیاء اور مقربین کی ولایت اور قرب کو ان کی ولایت اور قرب کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں ہوتی کہ جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہوتی ہے، اس لیے اُمت محمدیہ کے تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے دلوں میں کفر اور گمراہی کا اعتقاد ناممکن اور محال ہے، البتہ فرقۂ امامیہ کے نزدیک بطور تقیہ انبیاء کے لیے کفر جائز ہے۔

قسم دوم۔ تبلیغ احکام:

سو اس بارہ میں بھی تمام امت محمدیہ کا اتفاق ہے کہ احکام الٰہیہ کی تبلیغ میں انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں۔ دربارۂ تبلیغ اُن سے نہ قصداً کوئی غلطی ہوسکتی ہے اور نہ سہواً تبلیغ کے بارہ میں جھوٹ اور تحریف سے بالکلیہ پاک اور معصوم اور منزہ ہوتے ہیں کسی طور اور کسی صورت سے کذب اور تحریف کا ان سے سرزد ہونا محال ہے تندرست ہوں یا مریض خوش ہوں یا ناراض کوئی حالت ہو مگر یہ ناممکن ہے کہ وحی الٰہی کے پہنچانے میں اُن سے کسی قسم کی سہواً یا عمداً کوئی غلطی ہو جائے ورنہ پھر وحی الٰہی پر وثوق اور اطمینان کی کوئی صورت نہ رہے گی اور نبی کی تبلیغ سے وثوق اور اعتماد بالکل جاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نزول وحی کے وقت فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ وحی الٰہی۔ شیطان وغیرہ کی مداخلت سے بالکلیہ محفوظ رہے۔

---

* اصل عبارت یہ ہے امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ گفتہ است کہ نظر اقتضاء آں می کند کہ تاکید وجوب عصمت در حق انبیاء علیہم السلام افزوں از انست کہ در حق ملائکہ زیرا کہ خلق بمتابعت انبیاء مامورند بہ متابعت ملائکہ مامور نیستند۔ (کذا فی المعتمد فی المعتقد للتوربشتی ص ۷۳)

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى :﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾﴾ (الجن)

"وہی عالم الغیب ہے اپنے خزانۂ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر اپنے برگزیدہ یعنی رسول کو بقدر حکمت و مصلحت بذریعہ وحی کے کچھ بتلا دیتا ہے اور نزولِ وحی کے وقت اس رسول کے آگے اور پیچھے فرشتوں کا پہرہ لگا دیتے ہیں کہ شیطان اور نفس اس میں کسی قسم کا دخل نہ کرنے پائے اور یہ انتظام اس لیے کیا گیا کہ معلوم ہو جائے کہ فرشتوں نے اپنے رب کے پیام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے ہیں۔ غلطی سے پاک اور مبرا ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام احوال کے محیط ہیں اور ہر چیز ایک ایک ان کو معلوم ہے۔"

قسم سوم۔ فتویٰ اور اجتہاد:

فتویٰ اور اجتہاد کے متعلق علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ انتظار وحی کے بعد انبیاء کرام رضی اللہ عنہم کبھی کبھی اُمور غیر منصوصہ میں اجتہاد فرماتے ہیں۔ اگر کسی وقت کوئی اجتہادی خطا ہو جاتی ہے تو فوراً بذریعہ وحی کے مُتنبہ کر دیئے جاتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے کوئی اجتہادی خطا واقع ہو اور من جانب اللہ ان کو مطلع نہ کیا جائے۔

قسم چہارم: افعال و عادات

سو ان کے متعلق اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبائر سے تو بالکلیہ پاک ہوتے ہیں البتہ صغائر یعنی خلافِ اولیٰ اُمور کبھی کبھی سہواً اور نسیاناً اِن سے صادر ہو جاتے ہیں۔ ظاہراً وہ معصیت معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان سے کسی حکم کی تشریح مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ظہر یا عصر کی نماز میں سہو کا پیش آنا بظاہر غفلت معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں سجدہ سہو کا حکم بتلانا مقصود تھا۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو اُمت کو سجدۂ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا؟ اور علیٰ ہذا اگر لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز نہ فوت ہوتی تو قضاء فوائت یعنی فوت شدہ نمازوں کی قضاء کا مسئلہ کیسے معلوم ہوتا اس اعتبار سے یہ سہو اور نسیان عین رأفت اور عین رحمت ہے اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

یالیتنی کنت سھو محمد. **ترجمہ:** "کاش میں رسول اللہ کا سہو ہو جاتا یعنی حضور کا سہو میری یاد سے کہیں بہتر ہے۔"

اور حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ ارشاد ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ (الاعلیٰ) بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ پیغمبر کا نسیان حقیقت میں کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بمقتضائے بشریت سہو اور نسیان ضرور پیش آتا ہے۔ اس لیے کہ انسان جب تک جامۂ بشریت میں ہے خواص بشریہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ بھوک بھی ہے اور پیاس بھی ہے، مسرت اور فرحت بھی ہے اور رنج و غم بھی ضحک اور تبسم بھی ہے، ناراضی اور غصہ بھی۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ کے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (الکہف:۱۱۰) **ترجمہ:** "آپ کہہ دیجیے کہ جز ایں نیست کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔"

یعنی باوجود نبوت و رسالت کے پھر میں بشر ہوں فرشتہ نہیں۔ تمہاری طرح کھاتا اور پیتا ہوں۔ اپنی حوائج ضروریہ کے لیے بازاروں میں بھی آتا جاتا ہوں۔ یہ سب بشریت کے لوازم اور خواص ہیں۔ نبوت و رسالت کے منافی نہیں۔ بہر حال سہو اور نسیان

نسانیت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح دوسرے لوازم انسانیت مثلاً بھوک اور پیاس وغیرہ نہ نبوت ورسالت کے منافی ہیں اور نہ عصمت کے اسی طرح افعال وعادات میں سہو اور نسیان بھی نبوت اور عصمت کے منافی نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے سہو اور نسیان کو دوام اور قرار، بقاء اور استمرار نہیں۔ کبھی کبھی بمقتضائے بشریت سہو ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی نبی کو جب کبھی کوئی سہو ہوا تو وہ ایک ہی مرتبہ ہوا یعنی اس نوع کا سہو پھر اس کو مدت المعر کبھی پیش نہیں آیا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ((لا یلدغ المؤمن من جحر مرتین)). یعنی مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ جن کے قلوب ایمان کی حلاوت اور شیرینی چکھ چکے ہیں۔ وہ شیطان سے دو مرتبہ نہیں ڈسے جاتے ہاں جو حقیقتاً مؤمن نہیں محض نام کے مؤمن ہیں وہ دو مرتبہ نہیں بلکہ صدہا مرتبہ نفس اور شیطان سے ڈسے جاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس درخت کو کھالینا بھی اسی مقتضائے بشریت اور خاصۂ انسانیت یعنی سہو اور نسیان کا ثمرہ اور نتیجہ تھا۔ چنانچہ خود حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے: ﴿فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۵) آدم علیہ السلام بھول گئے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ممانعت اور شیطان کی عداوت کا اس وقت استحضار نہ رہا۔ معصیت اور نافرمانی کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ فقط شیطان کی قسم سے دھوکہ میں آ گئے۔ حدیث میں ہے ((المؤمن غِرٌّ کریم)) مؤمن دھوکہ میں آ ہی جاتا ہے:

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ (الاحزاب: ۵)

ترجمہ: "تم پر بھول چوک میں کوئی گناہ نہیں ولیکن گناہ اس میں ہے جس کا تمہارے دل پختہ ارادہ کرلیں۔"

اس آیت کے مطابق جب خطا اور نسیان میں کوئی گناہ ہی نہیں تو وہ پھر عصمت کے منافی کیسے ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حالت صوم میں بھول کر کھالینا مفسد صوم بھی نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا قلب مطہر اور سینۂ مبارک چونکہ حق جل وعلاء کی عظمت اور جلال سے بھرا ہوا تھا۔ اس لیے جب شیطان نے اللہ کی قسم کھا کر یہ کہا کہ ﴿اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ (الاعراف: ۲۱) "میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں" تو حضرت آدم علیہ السلام کو یہ وہم بھی نہ ہوا کہ کوئی بے حیا اور گستاخ حق تعالیٰ شانہٗ کا نام لے کر جھوٹی قسم کھائے گا۔ اس فریب کے ساتھ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو لغزش میں ڈالا۔

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ﴾ (الاعراف: ۲۲) ترجمہ: "یعنی شیطان نے ان کو دھوکہ اور فریب کے ساتھ پھسلا دیا۔"

غرور کے لفظ سے خود معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصیت دھوکہ سے ہوگئی ورنہ حضرت آدم علیہ السلام کا ارادہ نہ تھا۔ وہ تو مزید قربِ الٰہی کے متمنی اور متلاشی تھے۔ دشمن نے طاعت کے بہانہ سے معصیت میں مبتلا کر دیا مگر یہ معصیت فقط ظاہراً اور صورۃً معصیت تھی حقیقت میں عظیم الشان نعمت اور بے پایاں رحمت تھی۔ مقصود یہ تھا کہ گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریقہ معلوم ہو۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو سے سجدۂ سہو کا حکم بتلانا مقصود تھا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو امت کو سجدۂ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے سہو سے توبہ اور استغفار کا طریقہ بتلانا مقصود تھا کہ جب کبھی کسی سے کوئی گناہ صادر ہو تو فوراً اپنے باپ آدم علیہ السلام کی طرح تضرع اور زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں رجوع کرے شیطان کی طرح معارضہ اور مقابلہ نہ کرے، بالفرض اگر حضرت آدم علیہ السلام سے یہ معصیت نہ سرزد ہوتی تو ہم گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریق کیسے معلوم ہوتا۔

عارف ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں: کہ اللہ کے علم میں سعادت اور شقاوت دونوں ہی مقدر تھیں اس کی حکمت اس کو مقتضی ہوئی کہ سعادت کا بھی افتتاح ہو اور شقاوت کا بھی۔ اس لیے سعادت کا افتتاح حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھ سے کرایا

اور شقاوت کا افتتاح ابلیس کے ہاتھ سے کرایا۔ اھ کلامہٗ۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص سنت حسنہ جاری کرتا ہے تو جتنا اجر اور ثواب اس سنّت پر عمل کرنے والوں کو ملتا ہے اسی قدر اجر و ثواب اس سنت کے جاری کرنے والے کو بھی ملتا ہے جب تک وہ سنّت جاری رہے گی اس شخص کے اجر میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نے اس عالم میں توبہ اور استغفار، تضرع اور ابتہال اور بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کی مبارک سنت جاری فرمائی۔ تا قیام قیامت جس قدر بھی تائبین اور مستغفرین توبہ اور استغفار کرتے رہیں گے اسی قدر حضرت آدم علیہ السلام کے درجات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی تمام تائبین اور مستغفرین کے امام اور تمام متضرعین اور خاشعین کے قدوہ اور پیشوا ہیں۔

اور ابلیس نے اِباء اور استکبار کی سنت سیئہ کو جاری کیا۔ قیامت تک جو شخص بھی حکمِ خداوندی سے اعراض و انکار کرے گا، اس سے ابلیس کی ملعونیت اور مطرودیت میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ وہ کافرین اور مستکبرین کا امام اور احکام خداوندی پر اعتراض کرنے والوں کا پیشوا ہے۔ شیخ ابو العباس عرینی جو کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے شیخ ہیں، وہ یہ فرمایا کرتے تھے: کہ معاذ اللہ حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کی نافرمانی نہیں کی بلکہ یہ معصیت اس بدبخت ذریت نے کی جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں مستور تھی اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں ان کی تمام صالح اور طالح ذریت سوار تھی۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ حق تعالیٰ شانہٗ جب کسی بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو ظاہراً اس کو ذنب اور معصیت میں مبتلا کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ ایک باطنی مرض یعنی اعجاب اور خود پسندی کا علاج ہوتا ہے ایسی حالت میں ذنب اور معصیت میں مبتلا ہونا ہزار طاعتوں سے زائد نافع اور مفید ہوتا ہے اور صاحب بصیرت کے نزدیک یہ معصیت، ایں خطا از صد ثواب اولیٰ تر است، کا مصداق ہوتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ صحت اور عافیت اتنی مفید اور کارآمد نہیں جتنا مرض مفید اور کارآمد ہو جاتا ہے اس لیے کہ مرض کے آتے ہی طبیعت فوراً پرہیز اور علاج کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے اور طبیب حاذق کے مشورہ سے پورے اہتمام کے ساتھ تنقیہ اور مسہل کو شروع کر دیا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی روز میں تمام فاسد اور ردّی مادہ خارج ہو کر طبیعت، پہلے سے زائد صاف اور ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر جب لذائذ وطیبات، فواکہ وثمرات، لطیف غذاؤں اور مقوی دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس قدر قوی ہو جاتا ہے کہ اس مرض سے قبل بحالت صحت بھی اتنا قوی نہ تھا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا اس معصیت میں مبتلا ہو کر مسلسل تین سو سال تک توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری کرتے رہنا (جیسا کہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے) بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں:

﴿وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝﴾ (طٰہٰ)

ترجمہ: "آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی کی۔ پس ان کی عیش مکدر* ہو گئی۔ پھر خدا نے ان کو برگزیدہ بنایا اور ان پر خاص توجہ فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔"

---

* اشارہ اس طرف ہے کہ غوی کے معنی گمراہ ہونے کے نہیں بلکہ عیش کا مکدر ہونا مراد ہے۔ (لسان العرب مادہ غوایت)

کیا ہر معصیت سے انسان معاذ اللہ خدا کا مجتبیٰ اور برگزیدہ بندہ بن جاتا ہے۔ حاشا ثم حاشا ہاں ایسی معصیت کے بعد خُدا کے فضل و رحمت سے مجتبیٰ اور برگزیدہ بن سکتا ہے جس معصیت کے بعد آدم علیہ السلام جیسی ندامت اور شرمساری اور تضرع اور زاری ظہور میں آئے، ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کو کوئی خاص شانِ امتیازی حاصل نہ تھی۔ بمقتضائے بشریت زنا میں مبتلا ہو گئے۔ مگر بعد میں اس درجہ حمیم قلب اور اخلاص سے توبہ کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس توبہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: "کہ واللہ اگر ماعز کی توبہ تمام مدینہ پر تقسیم کی جائے تو یقیناً سب کی نجات کے لیے کافی اور وافی ہوگی۔" زنا بیشک معصیت تھا مگر ماعز اسلمی کی مضطربانہ اور بے تابانہ ندامت اور شرمساری اور گریہ وزاری نے اس کو عند اللہ ایسا مقبول اور محبوب بنا دیا کہ سارے عالم کی عفت و عصمت اس پر فدا اور قربان ہے۔ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو زنا کے سبب سے جو عند اللہ تقریب حاصل ہوا وہ اب بڑے سے بڑے ولی کو نماز سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ خوب سمجھ لو کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ اس مثال سے معاذ اللہ یہ مقصد نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس قسم کے کبائر میں مبتلا ہو سکتے ہیں اس لیے کہ میں ابتداء ہی میں بتلا چکا ہوں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کبائر سے بالکلیہ معصوم ہوتے ہیں۔ اس مثال سے صرف اتنا بتلانا مقصود ہے کہ بعض مرتبہ زَلت اور معصیت کا صدور طاعت سے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے اور وہ معصیت بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اس زَلت اور لغزش سے حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ توبہ اور استغفار کے مقرون ہو جانے کی وجہ سے ان کی شان اور بلند ہوگئی اور گویا کہ بزبانِ حال حضرت آدم علیہ السلام سے اس وقت یہ کہا جا رہا تھا:

یا اٰدم لا تجزع من کاس زلل کانت سبب کیسك فقد استخرج منك داء لا یصلح ان تجاور نا به و البست به حلة العبودیة.

ترجمہ: "اے آدم (علیہ السلام)! تو اس لغزش کے پیالہ سے مت گھبرا کہ جو تیری ہوشیاری اور احتیاط کا سبب بنا اسی کی وجہ سے تجھ سے وہ عجب کی بیماری نکال دی گئی جس کے ساتھ ہماری مجاورت ناممکن ہے اب اس کے بعد تم کو عبودیت اور بندگی کا حلہ اور خلعت عطاء کیا گیا۔"

ع لعل عتبك محمود عواقبه و ربما صحت الاجسام بالعلل

ترجمہ: "اُمید ہے کہ تیرے عتاب کا انجام نہایت محمود اور بہتر ہوگا اور بسا اوقات بیماریوں سے اجسام پہلے سے زائد تندرست ہو جاتے ہیں"۔

یا اٰدم ذنب تذل به لدینا احب الینا من طاعة تدل بها علینا یا اٰدم انین المذنبین احب الینا من تسبیح المدلّین. (مدارج السالکین ص ۱۶۶ ج ۱)

ترجمہ: "اے آدم (علیہ السلام)! وہ گناہ جس سے تو ہمارے نزدیک ذلیل ہو وہ اس طاعت سے بدرجہا محبوب ہے جس پر تو ناز کرے اور اے آدم (علیہ السلام) گنہگاروں کی آہ وزاری ہمارے نزدیک نازوالوں کی تسبیح و تہلیل سے بدرجہا بڑھ کر محبوب ہے۔"

مرکب تو بہ عجائب مرکبست بر فلک تازو بیک لحظہ زپست
چوں برارند از پشیمانی انین عرش لرزد از انین المذنبین

وَلی اور رسُول میں فرق

ولایت تقویٰ اور طہارت کی ایک سند (ڈگری) ہے جو بندہ کی جدوجہد اور سعی اور اکتساب سے ملتی ہے اور نبوت ورسالت ایک عہدہ اور منصب ہے جو بدون حکم شاہی کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ولایت بمنزلہ ایک سند کے ہے کہ جو امتحان سے فراغت کے بعد مل جاتی ہے اور نبوت ورسالت بمنزلہ عہدہ کے ہے محض قابلیت سے خود بخود کوئی وزیر اور سفیر نہیں بن جاتا جب تک حکم شاہی نہ ہو۔ ﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولیاء کی تعریف میں حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے۔ ﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الانفال: ۳۴) اور رسول کی تعریف میں یوں فرماتے ہیں: ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (الجن) غرض حاصل ولایت اتقاء ہے (جو بندہ کا فعل ہے) اور اتقاء مبنی للفاعل۔ اتقاء مبنی للمفعول کو مستلزم نہیں۔ تیر اور تلوار سے ہر ایک بچنے کی اپنی سی تدبیر کرتا ہے مگر اس پر بھی کبھی زخمی ہو ہی جاتا ہے اور حاصل رسالت کا ارتضاء ہے کیونکہ ﴿مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ بیان ہے ﴿مَنِ ارْتَضٰى﴾ کا۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کا مرتضیٰ ہوتا ہے اور ارتضاء فعل خداوندی ہے کیونکہ ارتضیٰ کا فاعل ضمیر راجع الی اللہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اطاعت سے راضی ہوتے ہیں اور معصیت سے ناخوش۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (التوبہ: ۹۶) معلوم ہوا کہ رسول کے لیے من کل الوجوہ مرتضیٰ ہونا ضروری ہے اور من کل الوجوہ ارتضاء یہی حاصل معصومیت کا ہے۔ (اجوبۂ اربعین ص ۹۱ حصہ دوم)

فائدہ: حق جل شانہٗ نے قرآنِ کریم میں انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کو اس لیے بیان فرمایا ہے کہ ان حضرات کی شان اور مرتبہ معلوم ہو کہ یہ حضرات خدا تعالیٰ کے اس درجہ مقرب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر مؤاخذاہ ہوتا تھا اور وہ خداوند ذوالجلال کے مؤاخذہ سے لرزاں اور ترساں رہتے تھے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی یہ لغزشیں ہی درحقیقت ان کی معصومیت کی دلیل ہیں جس شخص کا مرتبہ جس قدر بلند ہوتا ہے اسی قدر اس کی معمولی سی بات بھی غیر معمولی بن جاتی ہے۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام اور حفاظتِ اولیاء میں فرق

شیخ اکبر فرماتے ہیں: کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہر وقت بارگاہِ خداوندی میں مقیم رہتے ہیں کسی وقت حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت اور جلال ان کی نظروں سے اَوجھل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام معاصی سے معصوم ہوتے ہیں اور اولیاء اللہ بارگاہِ خداوندی میں آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقیم نہیں اس لیے اولیاء معاصی سے محفوظ تو ہوتے ہیں مگر معصوم نہیں ہوتے اور عصمت اور حفاظت میں یہ فرق ہے کہ اولیاء بسا اوقات مباحات اور جائز اُمور کو محض حظ نفس اور طبعی میلان اور خواہش کے لیے کر گزرتے ہیں۔ مگر حضرات انبیاء علیہم السلام کسی وقت بھی طبعی میلان اور حظ نفس کے لیے مباح اور جائز امر کا ارتکاب نہیں فرماتے۔ ہاں جب کسی شے کی عنداللہ اباحت اور اس کا خدا کے نزدیک جائز ہونا بتلانا مقصود ہوتا ہے تب اس مباح کو استعمال فرماتے ہیں تاکہ اُمت کو نبی کے کرنے سے اس فعل سے اس کا مباح اور جائز ہونا معلوم ہو جائے اور جس طرح نبی پر فرض کی تعلیم فرض ہے اسی طرح فعل مباح اور امر جائز کی اباحت اور جواز کا بتلانا بھی فرض ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کو ایک فعل مباح پر بھی فرض ہی کا ثواب اور اجر ملتا ہے اس لیے کہ نبی کے ذمہ مباح کی اباحت کا بتلانا

بھی فرض ہے۔

اب ہم حضرات انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے کچھ دلائل ذکر کرتے ہیں۔ جو زیادہ تر امام فخر الدین رازی قدس اللہ سرہٗ کی تفسیر کبیر سے لیے گئے ہیں۔

دلائل عصمتِ انبیاء کرام علیہم السلام

دلیل اوّل: قال اللہ تعالیٰ:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:۸۰)

ترجمہ: "جس شخص نے رسول کی اطاعت کی پس تحقیق اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔"

﴿وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ (آل عمران:۱۳۲)

ترجمہ: "اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

پہلی آیت میں رسول کی اطاعت کو اپنی ہی اطاعت قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی نہیں کیا جا سکتا۔ اطاعت رسول اور اطاعت خداوندی میں اتحاد اور عینیت جب ہی ممکن ہے جب رسول حق جل وعلاء کی معصیت کے شائبہ سے بھی بالکلیہ پاک ہو اور تاکید و تحقیق کے لیے کلمۂ قد کا اضافہ فرمایا۔ تا کہ کوئی شخص اطاعت حق جل شانہٗ اور اطاعت رسول میں کسی قسم کی تفریق نہ قائم کرے۔ کما قال اللہ سبحانہ و تعالیٰ:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ﴾ (النساء)

اور دوسری آیت میں رسول کی علی الاطلاق اطاعت کا حکم دیا ہے، اور اس پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم شخص کی اطاعت کا علی الاطلاق کسی طرح حکم نہیں دیا جا سکتا اور اسی وجہ سے کہ خلفاء اور امراء معصوم نہیں۔ علی الاطلاق ان کی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ان کی اطاعت کا یہ معیار مقرر ہوا۔

((السمع و الطاعة حق مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة)). (بخاری)

ترجمہ: "امیر کی سننا اور اس کی اطاعت ضروری ہے جب تک معصیت کا حکم نہ کیا جائے اور امیر جب معصیت کا حکم کر لے تو پھر اس کی اطاعت نہیں۔"

اور جن آیات میں نبی کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے۔ ان میں کسی جگہ مالم یؤمر بمعصیة (جب تک معصیت کا حکم نہ دیا جائے) کی قید نہیں اضافہ کی گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی کا کوئی فعل معصیت ہوتا ہی نہیں تا کہ امراء اور خلفاء کی طرح ان کے اتباع میں یہ قید لگائی جائے اور علیٰ ہذا غیر معصوم شخص کی علی الاطلاق اطاعت بلا قید مذکور رحمت خداوندی کا سبب بھی نہیں ہو سکتی۔

دلیل دوم: نیز اگر انبیاء کرام علیہم السلام معاصی سے معصوم نہ ہوں تو عیاذاً باللہ انبیاء کرام علیہم السلام کا غیر مقبول الشہادۃ ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ عاصی فاسق ہوتا ہے اور فاسق کی شہادت مقبول نہیں لقولہٖ تعالیٰ ﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ (الحجرات:۶) تو پھر

قیامت کے دن بمقابلہ اُمَم حضرات انبیاء علیہم السلام کی شہادت کیسے مقبول ہوگی۔ حالاں کہ قرآنِ عزیز میں ہے کہ ہر نبی قیامت کے دن اپنی امت پر گواہی دے گا۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ (النساء)

ترجمہ: "پس کیا حال ہوگا جب کہ ہم بلائیں گے ہر اُمت میں سے گواہی دینے والا اور حال کا بیان کرنے والا اور آپ کو ان سب پر گواہ بنائیں گے۔"

دلیل سوم: نیز صورت مفروضہ میں نبی کا مستحق عذاب اور مستحق لعنت ہونا لازم آتا ہے جو ایک عاصی اور گنہ گار کا حکم ہے۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ① ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدًا فِيْهَا﴾ (النساء:۱۴)

ترجمہ: "جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو یقیناً اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

② ﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾

ترجمہ: "خبردار! کہ اللہ کی لعنت ہے نافرمانوں پر۔"

حالانکہ کوئی نبی علیہ السلام کسی کے نزدیک مستحق عذاب اور مستحق لعنت نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ جو شخص عذابِ الٰہی اور لعنت خداوندی کا مستحق ہو وہ نبی اور رسول تو درکنار متقی اور صالح بھی نہیں ہوسکتا۔

دلیل چہارم: نیز حضرات انبیاء علیہم السلام کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو حق جل شانہ کی اطاعت کی طرف بلائیں پس اگر وہ خود اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے نہ ہوں تو وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴﴾

ترجمہ: "کیا تم دوسروں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب اللہ کو پڑھتے رہتے ہو۔ پس کیا تم عقل نہیں رکھتے۔"

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصّف)

ترجمہ: "کیوں کہتے ہو وہ باتیں جو تم خود نہیں کرتے دوسروں کو کہنا اور خود نہ کرنا یہ اللہ کے نزدیک سخت مذموم اور اس کے غضب اور ناراضی کا سبب ہے۔"

حالانکہ یہ بات ایک ادنیٰ واعظ اور معمولی عالم کے لیے بھی مناسب نہیں۔ حضرات انبیاء ومرسلین کی شایان شانِ تو کیسے ہوسکتی ہے۔

دلیل پنجم: نیز اگر انبیاء کرام علیہم السلام سے کبائر ومعاصی کا صدور جائز رکھا جائے تو پھر معاذ اللہ انبیاء کو معاصی پر تنبیہ اور زجر وتوبیخ اور ایذاء رسانی بھی جائز ہونی چاہیئے جو خدائے عزوجل کے نافرمانوں کے لیے لازم اور ضروری ہے حالانکہ نبی کو کسی قسم کی ایذاء اور تکلیف پہنچانا دُنیا اور آخرت کی لعنت اور عذابِ الیم کا سبب ہے۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ① ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (الاحزاب:۵۷)

ترجمہ: "بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ ان پر دُنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہو۔"

② ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (التوبہ:۶۱)

ترجمہ: "جولوگ اللہ کے رسول کوایذاء پہنچاتے ہیں ان کے لیے نہایت ہی دردناک عذاب ہے۔"

دلیل ششم: نیز انبیاء کرام علیہم السلام کا تمام گنہگاروں سے زائد مستحق عذاب ہونا لازم آئے گا۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب سے بلند ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام سے معصیت کا صدور بھی بہت بڑا سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جاریہ پر بمقابلہ حرّہ نصف حد آتی ہے اور زانی محصن پر رجم اور غیر محصن پر فقط جلد ہے۔ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے ارشاد ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ (الاحزاب:۳۰)

ترجمہ: "اے نبی کی عورتو! تم میں سے جوصریح بے حیائی کا کام کرے تو اس کو دوچند مار ہوگی۔"

اور ظاہر ہے کہ نبوت اور رسالت سے کوئی اعلیٰ اور ارفع مرتبہ نہیں۔ پس اگر نبی علیہ السلام سے بھی معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو پھر نبوت ورسالت کے منصب کے مناسب نبی علیہ السلام کو سب سے زائد معذب اور معتوب اور مغضوب خداوندی ماننا لازم آئے گا۔ اور جب نبی علیہ السلام ہی معاذ اللہ خدا کا معتوب اور مغضوب ٹھہرا تو پھر مقبول الٰہی کون ہوگا۔

دلیل ہفتم: نیز معصیت کا صدور ہمیشہ اتباع شیطان ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس اگر نبی معصوم نہ ہو تو نبی کا متبع شیطان ہونا لازم آئے گا۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (السباء)

ترجمہ: "اور ابلیس نے ان پر اپنے گمان کو سچ کر دکھایا سوائے تھوڑے سے ایمانداروں کے، لوگ اس کے پیرو ہوئے۔"

حالاں کہ نبی کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ شیطاں کے اتباع سے محفوظ رہیں۔

دلیل ہشتم: نیز غیر نبی کا نبی سے افضل ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ آیت بالا میں متبعین شیطان سے مؤمنین کے ایک فریق کو مستثنیٰ فرما دیا گیا ہے لہٰذا یہ فریق جو اتباع شیطان سے محفوظ ہے اگر حضرات انبیاء کا فریق ہے تو اس کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے وھوالمراد۔ اور اگر حضرات انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی اور جماعت ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ایک گروہ مؤمنین کا ایسا ہے جو اتباع شیطان سے بَری ہے مگر عیاذاً باللہ انبیاء علیہم السلام اتباع شیطان سے بَری نہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص اتباع شیطان سے بَری ہوگا وہ اس شخص سے یقیناً افضل ہوگا جو اتباعِ شیطان سے بَری نہیں۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات:۱۳)

دلیل نہم: حق تعالیٰ شانہٗ نے بندوں کو دو قسموں پر تقسیم فرمایا ہے ایک حزب الشیطان یعنی شیطان کا گروہ۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (المجادلہ)

ترجمہ: "یہ شیطان کا گروہ ہے آگاہ ہو جاؤ شیطان کے گروہ والے ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔"

دوسرے حزب اللہ یعنی اللہ کا گروہ۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (المجادلہ)

ترجمہ: "یہ اللہ کا گروہ ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہی کا گروہ کامیاب ہوتا ہے۔"

لہٰذا اگر نبی سے معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو نبی کا عیاذاً باللہ بجائے حزب اللہ اور مفلحین کے حزب الشیطان اور خاسرین کی جماعت اور گروہ میں شمار کرنا لازم آئے گا۔

دلیل دھم: حق تعالیٰ شانہٗ نے خود ابلیس سے نقل فرمایا ہے کہ میرے اغواء سے تیرے مخلص بندوں کا گروہ مستثنیٰ ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝﴾ (صٓ)

ترجمہ: "قسم ہے تیری عزت کی سوائے عباد مخلصین کے سب کو گمراہ کروں گا۔"

اور من کل الوجوہ۔ عباد مخلصین کا مصداق صرف حضرات انبیاء علیہم السلام ہی ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی شان میں ہے۔ ﴿اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝﴾ (صٓ) اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے۔ ﴿اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (یوسف: ۲۴)۔

دلیل یازدھم: حق تعالیٰ شانہٗ نے جابجا قرآن عزیز میں انبیاء کرام علیہم السلام کا بلا کسی تخصیص کے مصطفیٰ اور مجتبیٰ ہونا ذکر فرمایا ہے یعنی یہ نبی ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ یہ کسی جگہ نہیں فرمایا کہ فلاں امر اور فلاں صفت میں یہ ہمارے برگزیدہ ہیں یا فلاں وصف کے اعتبار سے یہ ہمارے منتخب بندے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات کسی خاص صفت یا کسی خاص فعل کے لحاظ سے برگزیدہ نہیں بلکہ تمام افعال واقوال کے اعتبار سے منتخب اور برگزیدہ ہیں۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝﴾ (صٓ)

ترجمہ: "اور تحقیق وہ ہمارے نزدیک منتخب اور چنے ہوئے اور نیک لوگوں میں سے ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ من کل الوجوہ خدا کا برگزیدہ اور پسندیدہ مصطفیٰ اور مجتبیٰ ہونا صدور معاصی کے بالکل منافی اور مباین ہے۔

دلیل دوازدھم: نیز حق تعالیٰ شانہ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ذکر فرمائی ہے۔

﴿يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ﴾ (المومنون: ۵۶)

ترجمہ: "وہ بھلائیوں اور نیک کاموں میں نہایت تیز رو ہیں۔"

اور الخیرات کو معرف بلام الاستغراق ذکر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے سوائے خیر محض کے کسی امر کا صدور ہوتا ہی نہیں۔

دلیل سیزدھم: ہر عاصی اور گنہگار کو شرعاً اور عرفاً ظالم کہنا جائز ہے اور قرآن عزیز میں بکثرت خدا کے نافرمانوں کو ظالم کہا گیا ہے، لہٰذا اگر نبی سے بھی معاصی کا صدور جائز ہو تو نبی کو بھی معاذ اللہ ظالم کہنا جائز ہوگا۔ حالانکہ ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہوسکتا۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾

ترجمہ: "میرا منصب ظالموں کو نہیں ملتا۔"

کیونکہ اس آیت میں اگر عہد سے نبوت ورسالت مراد ہے تو صاف ظاہر ہے کہ گنہگار اور ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ولایت یا امامت ہے تب بھی مدعا حاصل ہے اس لیے کہ جب امامت اور ولایت جس کو نبوت ورسالت سے وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہے جب وہی ظالم اور عاصی کو حاصل نہیں ہوسکتی تو نبوت ورسالت کا عظیم الشان اور جلیل القدر منصب کہاں حاصل

ہوسکتا ہے۔

دلیل چہاردھم:

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ﴾ (الجمعہ:۲)

ترجمہ: "اسی نے اَن پڑھوں میں ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک اور صاف کرتا ہے۔"

پس اگر نبی علیہ السلام خود معصیت سے پاک نہیں تو وہ دوسروں کو کیسے مزکّی اور پاک اور مطہر یعنی پاک اور صاف بنا دیتا ہے۔

دلیل پانزدھم: نیز نبی تو اللہ جل جلالہٗ کی جانب سے امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور حق تعالیٰ شانہٗ کی اطاعت اور اخلاق خداوندی کا بہترین نمونہ ہوتا ہے تا کہ لوگ بے چون و چرا اس کا اتباع کریں اور اس کی ہر حرکت اور سکون اور اس کے ہر قول اور فعل کو اپنے لیے راہ عمل سمجھیں۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا ۝﴾ (الاحزاب)

ترجمہ: "تمہارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے ان کو دیکھ کر اللہ کی اطاعت کرو۔ یہ اس کے لیے ہے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرے اور اللہ کو بہت یاد کرے۔"

اور اخلاق خداوندی اور اطاعتِ ربانی کا نمونہ اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے اسوۂ حسنہ وہی شخص ہوسکتا ہے جو حق جل وعلاء کی معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور منزہ ہو۔

دلیل شانزدھم: کوئی شخص اگر نبی اور پیغمبر کی موجودگی میں کوئی کام کرے اور نبی اس فعل پر سکوت کرے تو نبی کا یہ سکوت بالاجماع اس فعل کے جواز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ پس جب نبی کا سکوت ہی اس فعل کو معصیت سے خارج کر کے جواز اور اباحت کی حد میں داخل کر دیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نبی کا فعل معصیت سے خارج نہ ہو۔

دلیل ہفدھم: بعض لوگوں نے جب اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا یہ آیت نازل ہوئی:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ﴾ (آل عمران:۳۱)

ترجمہ: "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ یہ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میرا اتباغ کرو۔ اللہ تم کو محبوب رکھے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو اپنی محبت کا معیار قرار دیا ہے۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر دو وعدے فرمائے ہیں۔

ایک یہ کہ اگر تم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو گے تو ہم تم کو محبوب بنالیں گے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گناہوں کی مغفرت کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت کا معیار ایسے ہی شخص کا اتباع ہوسکتا ہے جو معصوم ہو ورنہ ایک عاصی اور گنہگار کا اتباع محبتِ خداوندی کا معیار کیسے بن سکتا ہے؟ اور نہ محبتِ الٰہی اور مغفرت ذنوب کا سبب ہوسکتا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ

ہم نے کہا تم اترو یہاں سے سارے پھر کبھی پہنچے تم کو میری طرف سے راہ کی خبر تو جو کوئی چلا

هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ

میرے بتائے پر نہ ڈر ہو گا ان کو اور نہ ان کو غم اور جو منکر ہوئے اور

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع ۴

جھٹلائیں ہماری نشانیاں وہ ہیں دوزخ کے لوگ وہ اسی میں رہ پڑے۔

اَعادۂ حکم ہبوط

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ ... الیٰ ... هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾

گزشتہ آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا قبول ہونا ذکر فرمایا اب آئندہ آیات میں یہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ توبہ قبول ہونے کے بعد بھی آدم علیہ السلام کو بہشت میں آنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ دنیا میں ہدایت اور حضرات انبیاء و مرسلین کی بعثت کا سلسلہ جاری کرنا ہے تا کہ اطاعت اور نافرمانی کا مادہ ظہور میں آجائے چنانچہ ہم نے ان کو حکم دیا کہ تم فی الحال اسی جگہ رہو جہاں تم کو بہشت سے اتارا گیا ہے، یعنی فی الحال دنیا ہی میں رہو۔ سردست بہشت میں جانے کی اجازت نہیں۔ تم سب کے سب فی الحال اسی جگہ رہو اس لیے کہ اگر تم کو اسی وقت بہشت میں جانے کی اجازت دی جائے تو سب کا اجتماع ایک جگہ نہ رہے گا، تمہارا یکجائی اجتماع مبدل بہ تفرقہ ہو جائے گا۔ حضرت آدمؑ کی پیروی کرنیوالوں کو بہشت میں پہنچا دیا جائے گا اور بدوں اور بدکاروں کو یا تو یہیں چھوڑ دیا جائے گا یا پھر دوزخ میں بھیج دیا جائے گا اور یہ تفرقہ مقصود اور غرض کے منافی ہے۔ اتارنے سے مقصود تکلیفِ احکام اور اطاعت اور فرمانبرداری کا امتحان ہے پس زمین میں اتارنے سے مقصد ہی یہ ہے کہ امر و نہی کے ذریعہ سے تمہارا امتحان کریں۔ پس اے اولادِ آدم خوب سمجھ لو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے، پس جو لوگ میری ہدایت کا اتباع کریں گے ان پر نہ آئندہ کا کوئی ڈر ہوگا کہ مثلاً یہاں سے نکالے جائیں اور نہ گزشتہ پر وہ مغموم و محزون ہوں گے مثلاً یہ حسرت کہ ہم سے فلاں راحت اور لذت فوت ہوگئی وہاں پہنچ کر ایسی لذتیں اور مسرتیں ہیں کہ دنیا کی ساری لذتیں اور مسرتیں ان کے سامنے ہیچ ہو جائیں گی۔

فائدہ: پہلی بار ہبوط کا حکم جنت سے اُترنے کے لیے تھا اور دوسری بار ہبوط کا حکم زمین میں مقیم رہنے کے لیے ہے۔

فائدہ: خدا کی ہدایت پر چلنے والوں کو اس قسم کا خوف نہ ہوگا جیسا کہ مجرمین اور نافرمانوں کو ہوتا ہے کہ دیکھئے اس جرم کی اب کیا سزا ملتی ہے۔ اس آیت میں اس قسم کے خوف کی نفی مراد ہے۔ باقی حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت اور جلال کا خوف وہ سب پر طاری ہوگا انبیاء و مرسلین بھی خدا کی عظمت اور جلال سے کانپتے ہوئے ہوں گے نیز اس آیت میں بالکلیہ خوف کی نفی نہیں کی گئی بلکہ خوف کے احاطہ اور استیلاء کی

ی کی گئی ہے۔اس لیے کہ کلمہ عَلٰی کلام عرب میں استیلاء اور احاطہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔پس ﴿ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ﴾ کے یہ معنی ہوں گے کہ خوف ان پر غالب اور ان کو محیط نہ ہوگا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر خوف اگرچہ غالب نہ ہو مگر کسی نہ کسی قسم کا خوف ضرور ہو گا۔وہ خوف خدا کی عظمت اور جلال کا ہے۔نیز اس میں کافروں کی طرف تعریض بھی ہے کہ قیامت کے دن خوف ان کو محیط ہوگا۔اور ڈر وراندیشہ ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہوگا۔بخلاف اہلِ ایمان کے کہ ان پر خوف غالب نہ ہوگا۔اور جو لوگ میری ہدایت سے منکر ہوئے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ایسے ہی لوگ جہنم والے ہیں ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔کبھی بھی اس سے نہ نکلیں گے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾

ہبوط آدم علیہ السلام کے اسرار و حکم

گزشتہ آیت یعنی ﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ میں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ اور اس کی اجابت کا ذکر تھا کہ ہم نے آدم کی توبہ قبول کی تو ممکن ہے اس سے یہ شبہ ہو کہ ہبوط اور زمین پر اُترنے کا حکم لغزش کی وجہ سے تھا شاید قبول توبہ کہ بعد وہ حکم باقی نہ رہے۔اس لیے ہبوط کے حکم کا پھر اعادہ فرمایا۔اگرچہ توبہ قبول ہو چکی، مگر یہ حکم بحالہٖ باقی ہے تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ہبوط کا حکم لغزش کی وجہ سے نہیں تا کہ قبول توبہ اس کے منسوخ ہونے کا خیال یا شبہ کیا جائے بلکہ وہ حقیقت میں ﴿ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ ﴾ کا وعدہ پورا کرنے کے لیے ہے زمین کی خلافت جس کا حضرت آدم علیہ السلام سے وعدہ کیا گیا تھا۔وہ خود اس کو مقتضی ہے کہ ان کو زمین پر اتارا جائے حضرت آدم علیہ السلام سے جنت کی خلافت کا وعدہ نہ تھا بلکہ زمین کی خلافت کا وعدہ تھا اس لیے ہبوط کا حکم قبول توبہ کے بعد بھی برقرار رہا۔بعض عارفین سے یہ منقول ہے کہ جب حضرت حق جل شانہٗ نے حضرت آدم اور حواء علیہما السلام کو یہ خطاب فرمایا: ﴿ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ تو اس خطاب میں خود اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام اس خطا میں مبتلاء ہو کر جنت سے علیحدہ ہوں گے۔اور جنت کی یہ سکونت چند روزہ ہے دائمی نہیں چنانچہ ﴿ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ ﴾ خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت چند روز کے لیے دارِ سکونت ہے نہ کہ دارِ اقامت اس لیے کہ ہمیشہ رہنے والے کے لیے امر و نہی خطر واباحت (روک ٹوک) کے احکام نہیں جاری ہوتے اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام کے اُتارنے میں اور بھی بہت حکمتیں ہیں۔منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے اسماء حسنیٰ میں سے غفور اور رحیم، عفو اور حلیم، خافض اور رافع، معز اور مذِل بھی ہیں۔اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ کی حکمت بالغہ اس کو مقتضی ہوئی کہ کوئی دار اور محل ایسا ہونا چاہیے جس میں ان اسماء حسنیٰ اور صفاتِ عُلیٰ کے آثار ظاہر ہوں جس کے لیے چاہے مغفرت کرے اور جس پر چاہے رحم کرے جس کو چاہے پست کرے اور جس کو چاہے بلند کرے، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے اس لیے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو جنت سے زمین پر اُتارا تا کہ ان اسماء حسنیٰ کے آثار ظاہر ہوں جن کے ظہور کے لیے دارِ دُنیا ہی مناسب ہے نہ کہ دارِ آخرت۔

نیز حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں وہ لوگ بھی تھے جو جنت میں رہنے کے اہل نہ تھے۔حضرت آدم علیہ السلام کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں نیک و بد ہر قسم کے لوگ سوار تھے۔اس لیے دُنیا میں اترنے کا حکم ہوا تا کہ خبیث کو طیب سے اور شقی کو سعید سے اور مؤمن کو کافر سے جدا اور الگ کیا جائے اور پھر خبیثین کو دار الخبیثین یعنی جہنم میں اور طیبین کو دار الطیبین یعنی جنت میں بسائے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (الانفال:۳۷)

ترجمہ: "تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے جدا کردے۔"

اور تاکہ ان اشقیاء اور خبیثین کے مقابلہ میں انبیاء و مرسلین اور عباد صالحین کا سلسلہ جاری ہو۔ دوستوں کا دشمنوں کے ذریعہ امتحان ہو۔ جب اللہ کے مخلص بندے اس کی راہ میں جان و مال کو خرچ کریں اور اس کے دشمنوں سے اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جہاد و قتال کریں۔ جانبازی اور سرفروشی سے کسی قسم کا دریغ نہ کریں خدا کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی کریں تو حق تعالیٰ شانہٗ ان کو درجاتِ عالیہ اور اپنے تقرب اور رضا و خوشنودی سے سرفراز فرمائے۔

نبوت و رسالت، امامت اور خلافت شہادۃ فی سبیل اللہ اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ خدا کے دوستوں سے محبت اور موالات۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت اور بیزاری اور دشمنی اور معادات یہ تمام فضائل و کمالات زمین ہی پر اتارے جانے کے نتائج و ثمرات ہیں۔ جنت میں رہ کر یہ باتیں کہاں ممکن تھیں۔

ہبوط آدم علیہ السلام کے اسرار و حکم کی اگر تفصیل درکار ہے تو حافظ شمس الدین ابن قیم قدس اللہ سرہٗ کی تصنیف لطیف یعنی مفتاح دارالسعادۃ کا مطالعہ فرمائیں۔ حافظ موصوف مدارج السالکین میں فرماتے ہیں:

یا اٰدم انما ابتلیتك بالذنب لانی احب ان اظهر فضلی وَجُودی و کرمی علی من عصانی. لو لم تذنبوا لذهب الله بکم و لجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفرلهم یا اٰدم اذا عصمتك و عصمت بنیك من الذنوب فعلی من اجود بحلمی و علی من اجود بعفوی و مغفرتی و توبتی وانا التواب الرَّحِیْم یا اٰدم لا تجزع من قولی لك (اخرج منها) فلك خلقتها ولکن اهبط الی دار المجاهدة و ابزر بزر التقویٰ وامطر عَلیه سحائب الجفون فاذا اشتد الحب و استغلظ و استویٰ علی سوقهٖ فتعال فاحصده یا آدم ما اهبطتك من الجنة الا لتوسل الیّ فی الصعود وما اخرجتك منها نفیاً لك عنها ما اخرجتك عنها الالتعود. (شعر)

ان جری بیننا و بینك غب　　فالو داد الذی عهدت مقیم

و تنائت منا و منك الدیار　　والعثار الذی اصبت جبار

(مدارج السالکین ص ۱۶۶ ج ۱)

ترجمہ: "اے آدم (علیہ السلام) میں نے تجھ کو گناہ میں مبتلا کیا اس لیے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فضل اور جود و کرم کو گنہگاروں پر ظاہر کروں۔ حدیث میں ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تم کو فنا کر دیتا اور ایسی قوم کو پیدا کرتا جو گناہ کر کے خدا سے مغفرت طلب کرتے اور خدا ان کی مغفرت فرماتا اے آدم تجھ کو اور تیری ذریت کو اگر معصوم بنا دوں تو اپنا حلم اور عفو و کرم اور مغفرت اور معافی کس پر ظاہر کروں حالانکہ میں تو رحیم ہوں۔ پس ضرور ہے کہ گنہ گار موجود ہوں تاکہ میں انکی توبہ قبول کروں اور ان پر رحم کروں۔ اے آدم میرے ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا﴾ کہنے سے گھبراؤ مت اس لیے کہ جنت کو میں نے تیرے ہی لیے پیدا کیا ہے لیکن اس وقت تم مجاہدہ اور ریاضت کے لیے زمین پر اترو جو تمہارے لیے بمنزلہ خانقاہ یا غار کے ہے اور زمین آسمان کے اعتبار سے بمنزلہ غار ہی کے ہے۔ اور یہاں آکر تقویٰ کے تخم کی کاشت کرو اور چشم گریاں کی بارش سے اس کو سیراب کرو۔

جب یہ دانہ قوی اور مضبوط ہو جائے اور اپنے تنے پر کھڑا ہو جائے تو اس کو کاٹ لو۔ اے آدم تجھ کو اس لیے جنت سے اتارا تا کہ تیرے درجات اور مدارج اور بلند ہوں۔ اور جنت سے چند روز کے لیے اس لیے نکالا تا کہ اس سے بہتر حالت میں جنت کی طرف تو لوٹ کر آئے۔"

ترجمہ: **شعر:** "اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں کوئی رنجش پیش آ گئی ہے اور اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں منزلوں کا فصل ہو گیا ہے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں اس لیے کہ محبت و مودت کا تعلق اسی طرح باقی۔ اور جو لغزش تم سے ہو گئی ہے اس کا تدارک ہو سکتا ہے۔"

فوائد مستنبط از قصۂ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام

فائدہ ①: قرآن کریم کے ظاہر سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اللہ کے نبی اور رسول مکلّم ہیں۔ یعنی ایسے رسول ہیں جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

((اخرج الطبرانی و ابو الشیخ فی العظمة و ابن مردویه عن ابی ذر قال قلت یا رسول الله ﷺ ارایت ادم أنبیًا کان قال نعم کان نبیا رسولا کلمه الله قبله قال ﴿ یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ ﴾ و اخرج عبد بن حمید و الاٰجری فی الاربعین عن ابی ذر قال یا رسول الله ﷺ من کان اولهم یعنی الرسل قال ادم قلت یا رسول الله ﷺ انبی مرسل قال نعم خلقه الله بیده و نفخ فیه من روحه و سواه قبله)).

(کذافی الدر المنثور ص ۵۱ ج ۱)

ترجمہ: "طبرانی اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں اور ابن مردویہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ ہاں نبی بھی تھے اور رسول بھی جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا اور یہ کہا کہ ﴿ یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ ﴾ اور عبد بن حمید اور آجری نے اربعین میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے رسول کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ آدم (علیہ السلام)۔ میں نے عرض کیا: کہ یا رسول اللہ ﷺ حضرت آدم علیہ السلام کیا نبی مرسل تھے؟ فرمایا: کہ ہاں اللہ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی خاص روح ان میں پھونکی اور پھر ان کو ٹھیک بنایا۔"

فائدہ ②: افعالِ خداوندی کے اسرار و حکم سوائے اس علیم و حکیم کے کسی کو معلوم نہیں۔ ملائکہ مقربین کو بھی سوائے ﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲ ﴾ کہنے کے کوئی چارہ نہ ہوا۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ افعالِ خداوندی کے اسرار کے درپے نہ ہو۔ ملائکہ کی طرح ﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ ﴾ کہہ کر بے چون و چرا تسلیم کرے۔

کرا زهرهٔ آں کہ از بیم تو — کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زبان تازہ کردن باقرارِ تو — نینگیختن علت از کار تو

فائدہ ③: حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی ملائکہ کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر کچھ تعلیم مشورہ کی جانب مشیر معلوم ہوتا ہے کہ کام کرنے سے پہلے مشورہ کر لینا چاہیے۔ اگرچہ حق تعالیٰ مشورہ سے بے نیاز ہے۔

فائدہ ④: استحقاق خلافت کے لیے جب ملائکہ نے ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ کہہ کر تسبیح وتحمید، تقدیس وتمجید کو پیش کیا تو حق جل شانہٗ نے ملائکہ کے تسبیح وتقدیس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام کا علمی کمال ظاہر فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم میں مشغول ہونا تسبیح وتہلیل سے افضل اور بہتر ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ علم اللہ کے نزدیک بھی علم ہو۔ اللہ کے نزدیک علم وہ ہے جس سے خدا کی خشیت اور اس کی عظمت دل میں راسخ ہوتی ہو۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۸)

ترجمہ: "جزایں نیست کہ ڈرتے ہیں اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء۔"

معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہو اور جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ اللہ کے نزدیک عالم نہیں اگرچہ سارا عالم اس کو عالم کہے۔ علمے کہ راہ حق ننماید جہالتست۔

فائدہ ⑤: ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ مسجود ساجد سے افضل ہوتا ہے۔

فائدہ ⑥: حدیث میں ہے کہ جب فرشتے صبح اور عصر کی نماز سے یا کسی محفل ذکر سے لوٹ کر جاتے ہیں تو حق تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا تو عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھتے چھوڑا۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک بار کہا تھا۔ ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ اور کلمہ ﴿مَنْ﴾ عام ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ سب ایسے ہی ہوں گے تو فرشتے موجبہ کلیہ کے مدعی تھے، اُن کے جواب کے لیے سالبہ جزئیہ کا ذکر کافی ہو گیا۔ یعنی ایک شخص یا ایک جماعت کا پیش کر دینا جو اللہ کی مطیع کامل ہو اُن کے موجبہ کلیہ توڑنے کے لیے کافی ہے یہ ضروری نہیں کہ سارے ہی مطیع ہوں قیامت تک اسی طرح سوال وجواب ہوتا رہے گا۔

فائدہ ⑦: اعجاب اور استکبار اور اللہ جل جلالہٗ کے حکم پر اعتراض اور خودستائی نے ابلیس کو ملعون اور مطرود بنایا اور اطاعت اور انقیاد اور رضا وتسلیم اور عجز اور انکساری اور ندامت اور شرمساری اور توبہ اور استغفار نے حضرت آدم علیہ السلام کی شان کو بڑھایا۔

فائدہ ⑧: نیز اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جنت پیدا ہو چکی ہے جیسا کہ اہل سُنّت والجماعت کا مسلک ہے معتزلہ کہتے ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ ⑪ فائدہ جلیلہ

فائدہ ⑨: کافر ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے کبھی نجات نہ پائیں گے۔

فائدہ ⑩: غلطی سے خلافِ حکمِ خداوندی کوئی کام کر گزرنا معصیت ہے اور حکمِ خداوندی کو غیر معقول اور خلاف سمجھنا یہ کفر ہے۔

فائدہ جلیلہ ⑪:

ترک اطاعت اور ارتکاب معصیت میں فرق

سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترک امر یعنی امر الٰہی کا امتثال نہ کرنا اور حکمِ خداوندی کو نہ ماننا ارتکاب نہی سے زیادہ سخت ہے۔ ابلیس نے حکمِ الٰہی اور امر خداوندی یعنی حکم سجود سے انحراف کیا۔ مطرود ومردود

ہوا اور آدم علیہ السلام نے ایک نہی کا ارتکاب کیا یعنی جس درخت سے کھانے کی ان کو ممانعت کی گئی تھی اس کو کھایا، بارگاہِ خداوندی سے عتاب ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اس عتاب کی کہاں تاب تھی فوراً ہی توبہ اور استغفار کی اور صد ہزار گریہ وزاری کے ساتھ اپنے رب کریم سے عفو اور مغفرت کی درخواست کی اللہ نے اپنی رحمت سے توبہ قبول فرمائی اور حُلّۂ اجتباء واصطفاء سے سرفراز فرمایا۔

اوّل: یہ کہ ترک امر کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے اس لیے زیادہ سخت ہے کہ ارتکاب نہی کا منشاء ہمیشہ غلبہ شہوت ہوتا ہے اور ترک امر کا منشاء ہمیشہ استکبار اور اعجاب (خود پسندی) ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ جس کے قلب میں ذرا برابر بھی کبر یعنی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں، کبریائی میری رداء ہے اور عظمت میری ازار ہے، جو شخص اس میں میری منازعت کرتا ہے میں اس کو کچل ڈالتا ہوں۔ بخلاف اس شخص کے کہ جو ایمان لانے کے بعد شہوات میں منہمک رہا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جس نے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہا وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ اگرچہ وہ چوری اور زنا کرے۔

دوم: یہ کہ اللہ کے نزدیک امتثال امر اور فعل مامور بہ یعنی حکم الٰہی کا بجالانا بہ نسبت منہیات سے احتراز اور اجتناب کے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ کے نزدیک اپنے وقت پر نماز کا ادا کرنا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ خیر الاعمال یعنی سب سے بہتر عمل ذکر اللہ ہے۔ اسی وجہ سے حق جل شانہٗ نے جا بجا قرآنِ کریم میں اپنی محبت کو امتثالِ احکام اور اوامر کی بجا آوری پر معلق فرمایا ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا﴾ (الصف:۴)۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۴)۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (الحجرات:۹)۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾۔ ان آیتوں میں اللہ نے اپنی محبت کو ان لوگوں کے لیے مخصوص فرمایا ہے جو اس کے ان احکام اور اوامر کو بجالاتے ہیں۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ، احسان، عدل، واقساط اور صبر وتحمل یہ سب اللہ کے احکام ہیں۔ ان کی بجا آوری سے اُس کی محبت حاصل ہوتی ہے اور محظورات اور منہیات کو حق جل شانہٗ نے جب کبھی ذکر فرمایا ہے تو محبت کی نفی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (البقرہ)۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان:۱۸)۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (النساء:۴۸)۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ (النساء:۳۶)۔

سوم: یہ کہ اوامر واحکام کی تعمیل مقصود لذاتہٖ ہے اور منہیات سے بچنا مقصود بالذات نہیں بلکہ فعل مامور بہ کی تکمیل کے لیے ہے اس لیے کہ منہیات اور محظورات کا ارتکاب۔ عبادت اور بندگی اور احکام کی بجا آوری میں مخل ہے۔ چنانچہ حق جل شانہٗ نے تحریم خمر اور تحریم قمار کی علت یہ ذکر فرمائی ہے:

﴿وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝۹۱﴾

ترجمہ: "شراب اور قمار اللہ کے ذکر اور نماز سے تم کو روکتے ہیں پس کیا تم ان سے باز نہ آؤ گے۔"

چہارم: یہ کہ طاعات اور مامورات کی بجا آوری ہی روح کی غذاء ہے۔ بغیر ایمان وتسلیم اور بغیر اطاعت اور انقیاد کے روح کی حیات ناممکن ہے اور محظورات ومنہیات سے بچنا بمنزلہ پرہیز کے ہے۔ پرہیز اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ حیات اور قوت میں فتور نہ آئے۔ اصل مقصود حیات اور پرہیز حیات کی نگہبانی کے لیے ہے۔

پنجم: یہ کہ عبادت جس کے لیے جن وانس کو پیدا کیا گیا۔ وہ امتثال اوامر اور احکام خداوندی کی بجا آوری ہی کا نام ہے جن وانس کو فقط منہیات اور محظورات سے بچنے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا (بلکہ عبادت اور بندگی اور احکامِ خداوندی کی تعمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے) زنا اور سرقہ وغیرہ سے باز رہنے کا نام عبادت نہیں بلکہ جو حکم اس احکم الحاکمین نے دیا اسکو دل وجان سے بجالانے کا نام عبادت اور بندگی ہے۔

ششم: یہ کہ ایک حکم کی تعمیل سے دس گونہ سے لے کر سات سو گونہ بلکہ لا الیٰ نہایۃ ثواب ملتا ہے اور منہی عنہ کے ارتکاب سے صرف ایک گناہ لکھا جاتا ہے، اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ترک امر اور عدم تعمیل حکم کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے کس قدر اعظم ہے۔

ھفتم: یہ کہ طاعت اور عبادت اور احکام کی بجا آوری اور ان کا اجر وثواب تمام تر صفت رحمت سے متعلق ہے، اور محظورات و ممنوعات کا ارتکاب اور ان پر سزا اور عقاب یہ سب صفت غضب اور انتقام سے متعلق ہے، اور صفت رحمت صفت غضب پر سابق ہے۔ غضب، رحمت پر سابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نزدیک رحمت عذاب سے اور عفو انتقام سے زیادہ محبوب ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ:

﴿ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ ﴾ ترجمہ: "تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ لیا ہے یعنی لازم کرلیا ہے۔"

مگر اس ارحم الراحمین نے غضب کو اپنے اوپر لازم نہیں فرمایا: وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ :

﴿ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً ﴾ ترجمہ: "اللہ ہر چیز کو باعتبار رحمت کے محیط ہے۔"

مگر غضب اور انتقام کے اعتبار سے محیط نہیں۔ رحمت اس کی دائمی ہے کبھی منفک نہیں ہوتی مگر غضب دائمی نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ قیامت کے روز فرمائیں گے۔

((ان ربی قد غضب الیوم غضباً لم یغضب قبله مثله ولن یَغْضب بعدهٗ مثله)).

ترجمہ: "میرا پروردگار آج غصّہ ہوا ہے ایسا غصّہ ہوا کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غصّہ ہوا اور نہ اس کے بعد کبھی ایسا غصّہ ہوگا۔"

ھشتم: یہ کہ طاعت وعبادت کے آثار جلد زائل نہیں ہوتے۔ بخلاف منہیات ومحظورات کہ ان کے آثار بہت جلد زائل ہوجاتے ہیں۔ معاصی اور سیئات کے آثار کبھی عفو اور مغفرت سے اور کبھی توبہ اور استغفار سے زائل ہوجاتے ہیں کبھی اعمال صالحہ اور مصائب سے ان کا کفارہ ہوجاتا ہے اور کبھی شفاعت سے اور کبھی اقارب اور احباب کی دعاؤں سے ان معاصی سے درگذر کیا جاتا ہے اور اگر صمیم قلب اور اخلاص کے ساتھ توبہ کرے تو ان سیئات کو حسنات سے بدل دیا جاتا ہے۔

نہم: یہ کہ نجات کا دارومدار احکام کی بجا آوری پر ہے۔ اگر کوئی شخص تمام مناہی اور محظورات سے بچتا ہے مگر احکام خداوندی کو نہیں مانتا تو اس کی نجات ناممکن ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی شخص احکام خداوندی کو تسلیم کرتا ہے مگر زنا اور سرقہ اور کسی فحشاء اور منکر سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی نجات ممکن ہے۔

دہم: یہ کہ اوامر اور احکام سے کسی فعل کا وجود مطلوب ہوتا ہے اور نہی سے کسی شے کا عدم اور ترک مقصود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ عدم میں کوئی کمال نہیں۔ کمال وجود اور ایجاد ہی میں ہے اسی وجہ سے شریعت کی نظر میں اوامر کا امتثال مناہی کے اجتناب سے زیادہ بہتر ہے اور حکم خداوندی سے سرکشی کرنا منہی عنہ کے ارتکاب سے زیادہ جرم ہے ﴿ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ﴾

(کذا فی کتاب الفوائد ص ۱۱۹ للحافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ)

* يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے کیا تم پر اور پورا کرو

بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ

قرار میرا تو میں پورا کروں قرار تمہارا اور میرا ہی ڈر رکھو اور مانو جو کچھ میں نے اُتارا

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ۪ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ

سچ بتاتا تمہارے پاس والے کو اور مت ہو تم پہلے منکر اس کے اور نہ لو میری آیتوں پر

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ

مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو اور مت ملاؤ صحیح میں غلط

تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ

اور یہ کہ چھپاؤ سچ کو جان کر اور کھڑی کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور

ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ

جھکو ساتھ جھکنے والوں کے کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو آپ کو

وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ

اور تم پڑھتے ہو کتاب پھر کیا نہیں بوجھتے اور قوت پکڑو محنت سہارنے سے

وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ

اور نماز سے اور البتہ وہ بھاری ہے مگر انہیں پر جن کے دل پگھلے ہیں جن کو خیال ہے

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع ۵ ۷ ۵

کہ ان کو ملنا ہے اپنے رب سے اور ان کو اسی طرف اُلٹے جانا ہے۔

* مترجم گوید خدا تعالیٰ بنی اسرائیل را نعمتہائے خود یاد داد و معجزہا کہ دریں قوم ظاہر شدہ بود ذکر فرمود آنگاہ شبہات و ہفوات ایشاں را رد کرد بدلائل و ایں قصہ ممتد است تا قولہ تعالیٰ ﴿وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ﴾ ۱۲۔ فتح الرحمٰن

* یعنی در جمیع حاجات و مصائب واللہ اعلم۔ فتح الرحمٰن

تذکیر اجمالی انعامات خاصہ بر اسلاف یہود وامر ایشاں بایفاء عہود ونہی از دین فروشی وحق پوشی

(یعنی) اُن نعمتوں کا بیان جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ ... الیٰ ... وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾

ربط : شروع سورت میں حق تعالیٰ نے متقین اور کافرین اور منافقین کے اوصاف اور احوال بیان کئے۔ بعد ازاں ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ میں خطاب عام فرمایا اور کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا پھر توحید اور رسالت اور قیامت کے دلائل بیان کیے تا کہ عبادت کر کے آخرت کی تیاری کر سکیں بعد ازاں اپنے انعامات کو بیان کیا جو تمام بنی آدم کو عام اور شامل ہیں۔ اب عنان خطاب ایک خاص گروہ یعنی بنی اسرائیل کی طرف پھیرتے ہیں اور ان نعمِ خاصہ کو بیان کرتے ہیں جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں اور منجملہ دیگر قبائل عرب۔ گروہ بنی اسرائیل کو اس لیے خطاب کے لیے مخصوص فرمایا کہ یہ سورت پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی اور مدینہ میں یہود ایک کثیر تعداد میں آباد تھے یہود کو اگرچہ اوس اور خذرج اور دیگر قبائل عرب کے مقابلہ میں عددی اکثریت حاصل نہ تھی لیکن یہود کو دیگر قبائل کے مقابلہ میں علمی تفوق اور امتیاز حاصل تھا یہ لوگ اہل کتاب اور اہل علم کہلاتے تھے اور خاندان نبوت سے تھے اور مشرکین عرب اُمّی اور ان پڑھ تھے اور اہل علم اگر حق کو قبول کر لیں تو عوام پر اس کا بہت اثر پڑتا ہے اس لیے اس رکوع میں خاص بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا اور اولاً ان نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا جو اس خاندان پر مبذول ہوئی تھیں۔ اور دوسرے رکوع سے ان کی تفصیل فرمائی جو دُور تک چلی گئی اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل ان نعمتوں کو یاد کر کے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور اپنے رب کریم اور منعم قدیم کے الطاف و عنایات کو یاد کر کے ایفائے عہد کے لیے دل و جان سے تیار ہو جائیں کیونکہ توریت میں نبی آخر الزمان ﷺ کی بشارتیں اور صفتیں مذکور تھیں اور نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کے عہد کا بھی ذکر تھا اور علمائے یہود اس سے بخوبی واقف تھے اس لیے مناسب ہوا کہ اوّلاً اہل علم کو اسلام کی طرف متوجہ کیا جائے تا کہ اور لوگ بھی ان کی تقلید سے راہ حق پر آ جائیں اور ان کا اتباع اوروں کے لیے حجت بن جائے اور بنی اسرائیل کے خطاب سے پہلے حضرت آدم کا قصّہ ذکر کیا جس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ابلیس نے محض حسد اور تکبر کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو یعنی یہود کو خطاب کیا تا کہ متنبہ اور خبردار ہو جائیں کہ تم کو تکبر اور حسد کا انجام معلوم ہے لہٰذا تم کو چاہئے کہ تکبّر اور حسد کی وجہ سے محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع سے اعراض نہ کرو۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"اے فرزندانِ یعقوب (علیہ السلام) یاد کرو تم میری ان خاص * نعمتوں کو جن کا میں نے خاص تم پر انعام کیا۔"

اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے جو اِسْرَا اور اَیْل سے مرکب ہے۔ اِسراء کے معنے بندہ یا برگزیدہ کے ہیں اور ایل اللہ کا نام ہے لہٰذا اسرائیل کے معنی عبد اللہ یا صَفوۃ اللہ کے ہوں گے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ بجائے یا بنی یعقوب کے یا بنی

---

* ھذہ ترجمۃ الاضافۃ التی فی قولہ تعالیٰ: نِعْمَتِیَ لان الاضافۃ تفید الاختصاص فافھم. ۱۲

اسرائیل فرمانے میں ایک خاص لطافت ہے۔ وہ یہ کہ اس لقب کی طرف مضاف کرنے سے یہ معنی ہوں گے کہ اے اولاد ہمارے مطیع اور فرمانبردار اور برگزیدہ بندہ کی تم کو تو اتباع حق میں اپنے باپ کا نمونہ ہونا چاہیے۔ جس طرح کہتے ہیں یا ابن الکریم افعل کذا "اے مریم کے بیٹے ایسا کر" یا ابن الشجاعِ بَارِزِ الابطال "اے شجاع کے بیٹے بہادروں کا مقابلہ کر۔" یَا ابن العَالِم اطُلبِ العلم۔ "اے عالم کے بیٹے علم حاصل کر۔" پھر اس کے علاوہ تمہارے خاندان میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چار ہزار نبی آئے۔ اس لیے تم کو پیغمبروں کی علامتیں خوب معلوم ہیں لہٰذا تم کو نبی اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظّمہ میں تشریف فرما رہے اکثر مناظرہ اور مکالمہ قریش کے ساتھ رہتا تھا۔ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود سے مناظرہ اور مکالمہ شروع ہوا۔ یہود چونکہ اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے علماء کہلاتے تھے، تمام عرب کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ لوگ اہل علم ہیں ان کے خاندان میں ہزاروں نبی ہوئے، انبیاء علیہم السلام کی علامتوں سے خوب واقف ہیں۔ دیکھیں یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے خاص خاص انعامات کو جو وقتاً فوقتاً بنی اسرائیل پر ہوتے رہے۔ یاد دلایا اس لیے کہ عام نعمتوں کا تذکرہ اتنا مفید اور مؤثر نہیں ہوتا۔ جتنا کہ خاص نعمتوں کا تذکرہ دل میں اثر رکھتا ہے اس لیے اوّلاً اجمالی طور پر حق جل شانہٗ نے اس رکوع میں بنی اسرائیل پر اپنے خاص انعامات کا ذکر فرمایا تا کہ شرما کر ایمان لائیں اس کے بعد دوسرے رکوع میں تفصیلی طور پر اپنے انعامات کا اور بنی اسرائیل کی شرارتوں کو ذکر فرمایا تا کہ لوگ ان کی شرارتوں سے واقف ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ ان کا قول اور فعل قابل اعتبار نہیں۔

"اور پورا کرو تم اس عہد کو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں بھی پورا کرونگا اس عہد کو جو میں نے تم سے کیا ہے۔"

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس عہد سے وہ مراد ہے جو سورۂ مائدہ کی اس آیت میں مذکور ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ (المائدہ:۱۲)

اور بعض کہتے ہیں کہ اس عہد سے وہ عہد مراد ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا کہ تمہارے بھائیوں میں سے یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد مراد ہے۔ اور اہل کتاب سے اللہ کا عہد یہ تھا کہ تم میں سے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے گا اس کو دو اجر ملیں گے۔ جیسا کہ سورۂ قصص کی اس آیت میں ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ (القصص:۵۴)۔ ایک اجر حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے اور دوسرا اجر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ پس اے اہل کتاب تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔ اور اس سے نہ ڈرو کہ ایمان لانے سے تمہارے ہدیے اور نذرانے بند ہو جائیں گے۔ اور قوم تمہاری مخالف ہو جائے گی اور درپے ایذاء و اضرار ہو جائے گی اور قوم تم کو اپنی جماعت سے نکال باہر کرے گی جس سے طرح طرح کے نقصان اٹھانے پڑیں گے بلکہ خاص مجھ سے ڈرو قوم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بھلائی اور برائی سب میرے ہاتھ میں ہے۔

ایمان لانے سے دُنیا کے حقیر اور معمولی اور چند روزہ اور فانی ہی منافع فوت ہوں گے مگر ایمان نہ لانے سے خدا کی رضا اور خوشنودی اور آخرت کے دائمی بیش بہا منافع فوت ہو جائیں گے۔

لكل شيء اذا فارقتهٗ عوض ولیس لله ان فارقت من عوض

ترجمہ: "جس چیز کو بھی چھوڑ دو اس کا عوض مل سکتا ہے مگر خدا کو چھوڑ کر اسکا عوض پانا ناممکن اور محال ہے۔"

اس لیے ارشاد ہوا مجھ سے ہی ڈرو امراء اور رؤسا سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ دُنیا اور آخرت کے نفع اور ضرر کا مالک صرف میں ہی ہوں۔

﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠﴾

اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے محمد ﷺ پر نازل کی درآں حالیکہ وہ کتاب اس توریت کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے۔ یعنی اوّل تو محض اس وجہ سے ایمان لے آنا چاہیے تھا کہ قرآن کو اللہ نے نازل کیا ہے جیسے تم توریت پر اس وجہ سے ایمان لائے کہ اللہ نے اس کو اتارا ہے اسی طرح یہ قرآن بھی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے اسی طرح اس پر بھی ایمان لاؤ۔ علاوہ ازیں یہ کتاب اس توریت کی جو موسیٰ علیہ السلام پر اُتاری گئی۔ اس کے منزل من اللہ اور کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے اس لحاظ سے بھی تم کو اس پر ایمان لانا چاہیے پھر یہ کہ توریت میں نبی آخر الزمان ﷺ کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی کا تم کو بخوبی علم ہے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ سب سے پہلے حضور پرنور پر ایمان لاؤ اور دیدہ دانستہ سب سے پہلے * قرآن کے منکر اور مکذب یعنی جھٹلانے والے نہ ہو کہ قیامت تک قرآنِ کریم کی تکذیب کرنے والوں کا وبال تمہاری گردن پر رہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے بعد پہلا فرقہ یہود کا ہے جو مدینہ اور خیبر میں رہتا تھا اور دوسرا فرقہ نصاریٰ کا ہے جو زیادہ تر شام میں رہتا تھا۔ پس اگر یہود آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار کریں گے تو نصاریٰ بھی ان کے دیکھا دیکھی انکار کریں گے اس لیے فرمایا کہ اے یہود تم پہلے کافر نہ بنو۔

فائدہ: مشرکین مکہ اگرچہ اہل کتاب سے پہلے انکار اور تکذیب کر چکے تھے مگر وہ تکذیب جہالت اور نادانی پر مبنی تھی دیدہ و دانستہ حق پوشی نہ تھی۔ اہل کتاب حق سے خوب باخبر تھے۔ دیدہ و دانستہ حق کو چھپاتے تھے اس لیے ارشاد ہوا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠﴾ یعنی "اے اہل کتاب سب سے پہلے تم حق پوشی کرنے والے نہ بنو۔" اس لیے کہ کفر کی حقیقت حق پوشی ہے۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۠ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱﴾ اور میری آیتوں کے عوض میں ایک نہایت قلیل اور حقیر معاوضہ لینے پر آمادہ اور راضی نہ ہو جاؤ۔ آخرت کے ضرر کو دُنیا کے ضرر سے بڑھ کر جانو اور کثیر اور باقی کے مقابلہ میں قلیل اور فانی کو ہرگز ترجیح نہ دو۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ ساری ہی دُنیا کا کل ساز و سامان ثمن قلیل ہے۔ قال اللہ تعالیٰ ﴿مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ دراہم معدودہ کی طمع میں میری آیتوں میں تحریف اور تبدیلی نہ کرو اور خاص مجھ سے ہی ڈرو۔ عوام الناس سے مرعوب ہو کر حق سے اعراض نہ کرو۔

فائدہ: ظاہر کا مقتضی یہ تھا کہ اس طرح فرماتے: ﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ مَتَاعًا قَلِيْلًا﴾ میری آیات کے بدلے میں تھوڑا سامان مت خریدو اس لیے کہ عرف میں سامان خریدا جاتا ہے۔ ثمن اور قیمت نہیں خریدی جاتی لیکن بجائے اس کے ﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۠﴾ فرمانے سے اس طرح اشارہ ہے کہ تمام دنیا کا ساز و سامان بمنزلہ قیمت کے ہے اور اصل مقصود آخرت ہے اور یہ مسلم ہے کہ معاملہ میں مقصود بالذات قیمت نہیں ہوتی۔ اصل مقصود سامان ہوتا ہے اور قیمت اور زرِ ثمن مقصود کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پس اشارہ اس طرف ہے کہ تم نے اپنی نادانی اور غلط فہمی سے ثمن اور قیمت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور باقی کو دیکر فانی کو خرید لیا۔

---

* اشارۃ الی ان الضمیر فی قولہ بہ عائد الی القرآن الذی تقدم ذکرہ قولہ بما انزلت و اختارہ ابن جریر و قیل الی محمد ﷺ

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۲﴾ اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو کہ حق کو باطل کے ساتھ ملانا اور حق کو چھپانا کس قدر مذموم ہے۔ زہر کو زہر جان کر کھانا انتہائی نادانی ہے۔

گزشتہ آیت میں بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم خود گمراہی سے باز آؤ اور ایمان اور ہدایت کو قبول کرو۔ اس آیت میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کو گمراہ نہ کرو جن لوگوں کے کان کچھ حق سے آشنا ہو چکے ہوں اور کلمۂ حق ان کے کان میں پڑ چکا ہو ان کو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حق اور باطل صدق اور کذب ہدایت اور ضلالت کو ان کے سامنے خلط ملط کر دیا جائے تا کہ حق کے قبول کرنے میں متردد ہو جائیں۔ ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے اور جس شخص نے کلمۂ حق سنا ہی نہ ہو۔ رُشد اور ہدایت سے بالکل بے خبر ہو۔ اس کے گمراہ کرنے کا طریق یہ ہے کہ حق کو اس کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے کہ مبادا وہ حق بات سن کر اس کو قبول نہ کرے اور ﴿تَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

یہاں تک اہل کتاب کو ایمان کی دعوت دی گئی۔ ایمان کے بعد سب سے زائد محبوب عمل اللہ کے نزدیک نماز ہے اس لیے آئندہ آیت میں نماز کا اور پھر زکوٰۃ کا حکم فرمایا کہ جان اور مال کی اطاعت میں لگے رہو۔ یعنی اے بنی اسرائیل ایمان کے بعد اور نماز کو قائم اور درست رکھو یعنی محض کتمان حق اور تلبیس اور خلط ملط سے باز رہنا نجات کے لیے کافی نہیں جب تک کہ احکام خداوندی پر عمل نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ ایمان کے بعد نماز کو قائم رکھو۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ ﴿الصَّلٰوۃَ﴾ میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی ایسی نماز پڑھو کہ جیسی صحابہ کرام پڑھتے ہیں۔ منافقوں کی سی نماز نہ پڑھو۔ جو حقیقت میں نماز نہیں بلکہ فقط صورت اور ہیئت نماز کی ہے اور طیب خاطر اور انشراح صدر کے ساتھ زکوٰۃ دیا کرو۔ جس طرح سے لغت عرب میں ایتان سہولت سے آنے کا نام ہے۔ اسی طرح ایتاء سہولت سے دینے کا نام ہے اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ، یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا شریعت اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود نماز پڑھتے تھے مگر تنہا۔ اس لیے حکم ہوا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھو اس لیے کہ نماز بھی ایک قسم کا جہاد ہے جس میں اجتماع ضروری اور لازمی ہے اور محراب مسجد محاربۂ شیطان کا محل ہے اور قتال کے لیے صفوف کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے صفوف جماعت کے سیدھا رکھنے کی حدیثوں میں بہت تاکید آئی ہے۔

توبیخ عالم بے عمل

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴﴾ کیا تم دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھولتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب یعنی توریت کو پڑھتے ہو جس میں عالم بے عمل کی مذمت جا بجا مذکور ہے۔ پس کیا تم سمجھتے نہیں کہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا راستہ بتلانا اور دیدہ و دانستہ اپنے کو ہلاک اور برباد کرنا یہ عقل اور فراست نہیں بلکہ عین سفاہت اور عین حماقت ہے۔ تعجب ہے کہ تم دوسروں کے ساتھ تو احسان کرتے ہو مگر اپنے نفس کے ساتھ احسان نہیں کرتے حالانکہ وہ احسان کا زیادہ مستحق ہے اپنی بدخواہی اور دوسروں کی خیر خواہی عقل کا اقتضاء نہیں عقل کو عقل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو بُری باتوں سے روکتی ہے اور اس لیے کہ عقل کے معنی لغت میں روکنے کے ہیں۔ پس جب انسان نے اپنے ہی کو گمراہی سے نہ بچایا اور بُری باتوں

سے نہ روکا تو وہ کس طرح عاقل کہلا سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عالم بے عمل کی مثال شمع کی سی ہے کہ دوسروں کو روشنی پہنچاتی ہے اور اپنے کو جلاتی ہے:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت یہود کے بارہ میں نازل ہوئی جو اپنے خویش اقارب کو جو ایمان لے آئے تھے اُن کو یہ کہا کرتے تھے کہ تم دین اسلام پر قائم رہو۔ محمد ﷺ جو فرماتے ہیں وہ حق ہے دوسروں کو ایمان اور اسلام کی ترغیب دیتے اور خود ایمان اور اسلام کو قبول نہ کرتے مطلب یہ ہوا تم توریت کی تلاوت کرتے ہو اور اس میں نبی آخر الزمان کی بشارتیں پڑھتے ہو باوجود اس علم کے تم خود تو ایمان نہیں لاتے اور تمہارے اقارب اور احباب میں سے جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آتا ہے اس کو ایمان اور اسلام پر قائم رہنے کی تاکید کرتے ہو تمہارا عجب حال ہے کہ باوجود کتاب کے پڑھنے اور اہل علم کہلائے جانے کے کہ دوسروں کو تو نیک باتوں کا حکم کرتے ہو مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے۔

تنبیہ : اس آیت شریفہ کا یہ مقصد نہیں کہ عالم بے عمل کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے یا کسی کو راہ حق نہ بتلائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خود بھی ضرور عمل کرے عالم ہو کر بے عمل نہ رہے بلکہ عالم باعمل بنے۔ جب وہ دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے تو اس کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ سب سے پہلے میرا نفس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا محتاج ہے۔

عالم پر دو چیزیں فرض ہیں: ایک ترک معصیت یعنی خود معصیت نہ کرنا، دوم یہ کہ دوسروں کو معصیت سے منع کرنا۔ اگر دونوں فرض نہیں بجالا سکتا تو دونوں کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ ما لا یدرك كله لا يترك كلهٗ. طبیب اگر کسی مرض میں خود مبتلا ہو تو اسی مرض کے مریض کا معالجہ کر سکتا ہے۔ لیکن خود اس کا مرض جب ہی زائل ہوگا جب وہ خود بھی دوا کا استعمال کرے دوسرے مریض کو دوا کا بتلانا بلاشبہ ضروری اور تحسن ہے اور مریض کے لیے غایت درجہ مفید ہے۔ مگر اس بد پرہیز طبیب کو فائدہ جب ہوگا کہ جب خود بھی دوا کا استعمال کرے محض دوسرے کو دوا بتلا دینا اس کے مرض کے ازالہ کے لیے کافی نہیں اور ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ میں انکار فقط قول حق اور امر بالمعروف کی طرف راجح نہیں بلکہ ﴿تَقُوْلُوْنَ﴾ کی قید یعنی ﴿لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ کی طرف راجح ہے یعنی حق کہنے کے بعد اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی شے کسی قید کے ساتھ مقید ہو تو نفی اور انکار فقط قید کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ علماء اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نبی برحق ہیں۔ مگر حُب مال اور حُب جاہ آپ ﷺ کے اتباع سے مانع تھے کہ اگر آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں گے تو ہمارے ہدیے اور نذرانے بھی بند ہو جائیں گے اور رؤساء اور امراء کی نظروں سے ہم گر جائیں گے اور جو عزت اور وجاہت ہم کو حاصل ہے وہ جاتی رہے گی۔ آئندہ آیت میں اس کا علاج ارشاد فرمایا:

اصلاحِ نفس کا طریقہ اور حُبِ مال اور حُبِ جاہ کا علاج

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ اور اگر تم حب دنیا اور ہوا و ہوس کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ہو تو شہوات اور لذات سے پرہیز کرو اور اس کے معالجہ کے لیے یہ دوائیں استعمال کرو یعنی صبر سے مدد طلب کرو یعنی نفس کو صبر اور قناعت کا خوگر اور ترک لذات اور شہوات کا عادی بناؤ تا کہ دنیا کی محبت دل سے زائل ہو۔ اور حق اور باطل میں تمیز کر سکو مرض کا ازالہ جب ہی ممکن ہے کہ اوّل مضرات سے پورا پورا پرہیز ہو اور پھر دوا کا استعمال ہو۔ اسی طرح باطنی امراض کے ازالہ کے لیے صبر بمنزلہ پرہیز کے ہے اور شکر بمنزلہ دوا کے

ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

((اَلْاِیْمَانُ نِصْفَانِ نِصْفٌ فِی الصَّبْرِ وَنِصْفٌ فِی الشُّکْرِ)) "ایمان کے دو حصے ہیں ایک صبر اور دوسرا شکر۔"

یعنی ایمان کی صحت اور سلامتی دو چیزوں پر موقوف ہے ایک صبر پر یعنی مضرات سے پرہیز کرنے پر اور دوم دواء شکر کے استعمال پر۔ جب تک پرہیز کامل نہ ہو اس وقت تک دوا پورا نفع نہیں کرتی اس لیے اوّل پرہیز یعنی صبر کا حکم دیا اور پھر دوا کے استعمال کا حکم دیا یعنی نماز کا کہ حمد وثناء تسبیح وتقدیس رکوع وسجود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کا شکر ہے۔

بر مُرادِ نفس تا گردی اسیر صبر بگزین و قناعت پیشہ گیر

یعنی اگر تم کو اجر اور معاوضہ ہی مطلوب ہے تو حُطام دُنیا اور دراہم معدودہ پر کیوں گرے جاتے ہو آؤ صبر کرو تا کہ بارگاہِ خداوندی سے تم کو بے حساب اور بے شمار اجر ملے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝﴾ اور اگر تم عزت اور وجاہت کے طالب ہو تو عزت اور وجاہت کو ان کے پاس کہاں ڈھونڈتے ہو؟ عزت کی اگر تلاش ہے تو اُس عزیز مقتدر کے پاس تلاش کرو جس کی شان یہ ہے۔ ﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

پس اگر تم عزت کے متلاشی ہو تو آؤ اور اس ذوالجلال والاکرام کی بارگاہِ بے نیاز پر جبین نیاز کو خم کرو تا کہ دُنیا اور آخرت کی عزتیں تم کو حاصل ہوں۔ یعنی نماز پڑھو۔ نماز کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے حق جل شانہٗ کی محبت اور عظمت کو اور دُنیا کی نفرت اور آخرت کی رغبت کو دل میں راسخ کرتی ہے۔ مخلوق سے تعلق کو قطع کرتی ہے اور خالق ذوالجلال سے تعلق کو مستحکم اور مضبوط کرتی ہے۔ مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی امر پیش آتا تو فوراً گھبرا کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اور مسند احمد اور سنن نسائی میں صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو جب پریشانی پیش آتی تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ سفر میں تھے کہ بیٹے کی وفات کی خبر دی گئی تو سواری سے اُترے اور دو رکعت نماز پڑھی اور ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھا اور یہ فرمایا کہ ہم نے ویسے ہی کیا جیسا اللہ نے ہم کو حکم دیا۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ﴾ (اخرجہ سعید بن منصور وابن المنذر والحاکم وغیرھم)

ضرورت اور پریشانی کے وقت جو نماز پڑھی جائے وہ صلوٰۃ الحاجۃ کہلاتی ہے اس آیت میں اسی صلوٰۃ الحاجۃ کی طرف اشارہ ہے۔

﴿وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾ اور تحقیق وہ یعنی صبر اور صلوٰۃ سے استعانت اور استمداد البتہ بہت شاق اور گراں ہے مگر انہیں پر جن کے دل خدا کے خوف سے پگھلے جاتے ہیں۔ جن کو خیال ہے کہ ہم یقیناً خدا سے ملنے والے ہیں اور بلاشبہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یعنی صبر اور نماز حقیقت میں دشوار نہیں کہ جس کا بجالانا ناممکن ہو۔ ہاں ان لوگوں پر جو خُدا سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے نماز ان پر بہت شاق اور گراں ہے وہ اس کو محض مشقت اور محنت خیال کرتے ہیں مگر اُن خاشعین پر جو عذابِ الیم سے ڈرتے ہیں اور ثواب عظیم اور نعیم مقیم کی اُمید رکھتے ہیں ان پر نماز شاق اور گراں تو کیا ہوتی ان کے لیے تو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کی فرحت اور مُسرت ہے۔

فائدہ: جو علم اور ادراک ان علامات سے حاصل ہو جو نہ حسی ہوں اور نہ بدیہی لغت میں اس کو ظن کہتے ہیں کبھی دلائل اور براہین کے انضمام سے اُس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے جو جزم اور یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی اس درجہ ضعیف ہو جاتا ہے کہ شک اور وہم کے قریب پہنچ جاتا ہے اس لیے لفظ ظن کبھی یقین کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی شک کے معنی میں اور کبھی گمان غالب کے معنی میں۔

اس آیت میں اگر ظن سے یقین کے معنی مراد لیے جائیں جیسا کہ مجاہد اور ابو العالیہ اور قتادہ وغیرہم سے منقول ہے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ نماز ان لوگوں پر شاق اور گراں نہیں جو خدا سے ملنے کا یقین رکھتے ہیں اور اگر ظن کے معنی گمان اور خیال کے لیے جائیں تو یہ معنی ہوں گے کہ جس شخص کو خدا کی ملاقات اور اس کی جزاء اور سزا کا گمان اور خیال بھی ہو جائے تو اگر عقل سلیم رکھتا ہے تو صبر اور نماز اور معاصی سے پرہیز اور طاعات خداوندی کا بجالانا اس کو شاق اور گراں نہیں بلکہ سہل اور آسان ہوگا۔ مریض کو جن لذائذ وطیبات کے استعمال سے ضرر کا گمان اور خیال بھی ہو جاتا ہے ان سے پرہیز کرنا اس کو دشوار نہیں معلوم ہوتا اور تلخ سے تلخ دوا کا استعمال کہ جس سے صحت اور شفا کی اُمید ہو آسان اور سہل معلوم ہوتا ہے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں کہ ﴿ اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ خاشعین نماز پڑھتے وقت یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)). ''عبادت کر اللہ کی، اس طرح کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ اگر تم کو نفس کا تزکیہ اور اس کی اصلاح مقصود ہے تو صبر اور نماز سے اس بارہ میں مدد حاصل کرو۔ اور اگر یہ طریق تم کو دشوار معلوم ہوتا ہے تو دوسرا طریق یہ ہے کہ تم نعمائے الٰہیہ کا مراقبہ کیا کرو اور سوچا کرو کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ہم پر کیا کیا نعمتیں برسائیں اور باوجود ہماری نافرمانیوں کے ہم پر کیا کیا احسانات ہوتے رہے۔ اس تفکر اور مراقبہ کا اثر یہ ہوگا کہ قلب میں حق جل شانہٗ کی محبت کا ولولہ اور جوش پیدا ہوگا۔ ((اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ)). ''انسان بندہ ہے احسان کا'' جہاں یہ جوش اور ولولہ پیدا ہوا مقصد حاصل ہو گیا۔

ہر آنکہ عشق یکے دردلش گرفت قرار
روا بود کہ تحمل کند جفائے ہزار
عشق آں شعلست کو چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اس لیے آئندہ آیت میں پھر ان نعمتوں کے یاد کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جن نعمتوں کو پہلے اجمالاً یاد دلایا تھا اب ان کو تفصیلاً بیان فرماتے ہیں:

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ
اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا
عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّ لَا
جہان کے لوگوں پر اور بچو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے ایک ذرہ

يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیں اس کے بدلہ میں کچھ اور نہ ان کو مدد پہنچے

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ

اور جب چھڑایا ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے دیتے تم کو بڑی تکلیف ذبح کرتے

اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

تمہارے بیٹے اور جیتی رکھتے تمہاری عورتیں اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی

عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ

بڑی اور جب ہم نے چیرا تمہارے بیٹھنے کے ساتھ دریا پھر بچا دیا تم کو اور ڈبا دیا فرعون کے لوگوں کو

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ

اور تم دیکھتے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر

اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ

تم نے بنا لیا بچھڑا اس کے پیچھے اور تم بے انصاف ہو پھر معاف کیا ہم نے تم کو

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ

اس پر بھی شاید تم احسان مانو اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور

الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ

چکوتی شاید تم راہ پاؤ اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم تم نے

ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا

نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا لے کر اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو

اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ

اپنی اپنی جان یہ بہتر ہے تم کو اپنے خالق کے پاس پھر متوجہ ہوا تم پر بر حق وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى

معاف کرنے والا مہربان اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم یقین نہ کریں گے تیرا جب تک نہ دیکھیں

اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ

اللہ کو سامنے پھر لیا تم کو بجلی نے اور تم دیکھتے تھے پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو

مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ

مر گئے پیچھے شاید تم احسان مانو اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور

اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ

اُتارا تم پر من اور سلویٰ کھاؤ ستھری چیزیں جو دیں ہم نے تم کو اور

مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا

ہمارا کچھ نقصان نہ کیا پر اپنا ہی نقصان کرتے رہے اور جب کہا ہم نے داخل ہو

هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ

اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو محظوظ ہو کر اور داخل ہو دروازے میں

سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

سجدہ کرکر اور کہو گناہ اُترے تو بخشیں ہم تم کو تقصیریں تمہاری اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى

پر بدل لی بے انصافوں نے اور بات سوائے اس کے جو کہہ دی تھی ان کو پھر اتارا ہم نے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع وَ اِذِ اسْتَسْقٰى ع ۶ ۱۳ ۶

بے انصافوں پر عذاب آسمان سے ان کی بے حکمی پر اور جب پانی مانگا

مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا

موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو کہا ہم نے مار اپنے عصا سے پتھر کو پھر بہ نکلے اس سے بارہ

عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ

چشمے پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ کھاؤ اور پیو

رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾

روزی اللہ کی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے۔

تفصیل انعامات وعنایات خداوند جلیل وشرح جنایات وتقصیرات قوم بنی اسرائیل وحکم مراقبۂ عنایات وملاحظۂ جنایات کہ درحیاء حکم اکسیر دارد

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ... الیٰ ... وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو اجمالی طور پر اپنی نعمتیں یاد دلائیں اب آئندہ آیات میں ان کی تفصیل ہے جو دُور تک چلی گئی اور تفصیل میں سب سے پہلی نعمت تفصیل کو ذکر فرمایا اس لیے کہ تفضیل علی العالمین سب سے افضل نعمت ہے پھر لطف یہ کہ اپنے الطاف و عنایات کے بعد ان کی جنایات اور تقصیرات کو ذکر فرمایا اس لیے کہ جب ایک طرف خداوند کریم کی عنایتوں کو دیکھیں گے اور دوسری طرف اپنی جنایات اور تقصیرات کو دیکھیں گے تو لامحالہ حق تعالیٰ سے شرمائیں گے اور اس وقت اُن کا یہ حال ہوگا اور قال بھی ہوگا ؎

شکر نعمتہائے تو چند انکہ نعمتہائے تو عذر تقصیرات ما چند انکہ تقصیرات ما

اور حیاء ایمان کا ایک درمیانی اور مرکزی شعبہ ہے جس پر ایمان کے باقی شعبے گھومتے ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾

ترجمہ: "اے بنی اسرائیل یاد کرو تم میری ان خاص خاص نعمتوں کو جن کا میں نے خاص تم پر انعام کیا۔"

اور پھر اپنی جنایتوں پر نظر کرو کہ کیا ان نعمتوں کا یہی حق تھا جو تم کر رہے ہو اور ہماری اس تذکیر اور یاددہانی کی نعمت کو بھی یاد کرو کہ ہم نے تم کو خواب غفلت سے جگایا۔

اِنعام اوّل:

﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾﴾ اور سلسلہ انعامات میں سب سے پہلے اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تم کو اس زمانہ میں جہان والوں پر فضیلت دی کہ دُنیا کی بادشاہت کے ساتھ دین کی بادشاہت بھی تم کو دی یعنی تمہارے خاندان میں پیغمبری بھی دی۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٠﴾﴾ (المائدہ)

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٢﴾﴾ (الدخان)

حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمہارے ہی خاندان سے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے اور توریت اور

انجیل اور زبور سب تمہارے ہی خاندان میں نازل ہوئی۔ تمہارا ہی خاندان نبوت و رسالت اور امامت اور حکمت کا مخزن رہا۔ غرض یہ کہ اس وقت تک تم ہی کو تمام عالم پر بزرگی اور برتری اور فضیلت حاصل رہی اب وقت آیا کہ وہ نبی آخر الزمان ﷺ ظاہر ہوں جن کی تمام انبیاء و مرسلین حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام خبر دیتے چلے آئے لہٰذا اگر تم کو اپنی فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا منظور ہے تو فوراً محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لاؤ اور دل و جان سے ان کی اعانت اور امداد کرو۔ اور جس طرح قارون اور سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کر کے خاندانِ یعقوبی کے شرف کو ضائع کیا تم بھی قارون اور سامری کی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کر کے اپنی فضیلت اور بزرگی اور اپنے شرف اور منصب کو ضائع نہ کرو۔ اگر تم محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاتے ہو تو اپنی سابق فضیلت اور گزشتہ منصب پر قائم ہو بلکہ تم سے دو اجر کا وعدہ ہے۔ اور اگر تم ایمان لانے سے انحراف کرتے ہو تو سمجھ لو کہ تم اپنے منصب سے معزول ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے وقت سے اس وقت تک بنی اسرائیل ہی سب سے افضل اور اشرف تھے۔ یہ وقتِ خطاب مضمونِ کلام سے خارج ہے گزشتہ زمانہ سے لے کر اس وقتِ خطاب تک بنی اسرائیل کا ان فضیلتوں میں کوئی شریک اور سہیم نہیں رہا اور یہ وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے۔ گزشتہ فضیلت اور گزشتہ شرف کو باقی رکھنا ہے تو اس نبی برحق کی دعوت کو قبول کرو۔ مگر افسوس ان لوگوں نے اس دعوت کو ٹھکرایا اور ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ اور ﴿ضالين﴾ کے نام سے موسوم ہوئے اور جو لوگ ایمان لائے وہ خیر الامم کے لقب سے سرفراز ہوئے اس تقریر سے یہ شبہ رفع ہو گیا کہ اس آیت سے بنی اسرائیل کا اُمتِ محمدیہ سے افضل ہونا لازم آتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ آیت میں اس وقت کی تفصیل کا ذکر نہیں گزشتہ زمانہ کی تفصیل کا ذکر ہے وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے۔

آئندہ ان کے ایک شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ اگر تم کو یہ خیال ہے کہ باوجود نہ ایمان لانے کے قیامت کے دن ہم اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے تو سمجھ لو کہ قیامت کے دن نمرود اور فرعون سامری اور قارون کی طرح انبیاء اللہ سے انحراف کرنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہ ہوگی چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۸﴾

ترجمہ: "اور ڈرو تم اس دن سے کہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ بھی کام نہ آئیگا اور نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش اور نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔"

البتہ اہل ایمان کی مدد کی جائے گی انسان جب کسی بلا میں گرفتار ہوتا ہے تو شفاعت و سفارش فدیہ دے کر رست گار ہونا چاہتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے اعوان و انصار کو جمع کر کے آمادۂ پیکار ہوتا ہے اور ﴿وَلَهُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ سے یہی مراد ہے کہ تمہارا کوئی حامی اور مدد گار بھی نہ ہوگا۔ جو تم کو زور اور قوت کے ذریعے سے عذاب سے چھڑائے۔

فائدہ: جو لوگ مال کی محبت میں زیادہ گرفتار ہوتے ہیں وہ یہ چاہا کرتے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو سفارش سے کام چل جائے۔ مال نہ خرچ کرنا پڑے اور بعض عزت اور وجاہت کے دلدادہ ہوتے ہیں اُن کو مال خرچ کرنا آسان ہوتا ہے اس لیے حق جل شانہٗ نے اس مقام پر شفاعت کو فدیہ پر مقدم فرمایا اور اسی پارہ کے اخیر میں فدیہ کو شفاعت پر مقدم فرمایا: حیث قال: ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ تاکہ دونوں قسم کی طرف اشارہ ہو جائے۔

تنبیہ: اس آیت شریفہ میں مطلق شفاعت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ فرعون اور ہامان کی طرح انبیاء اللہ علیہم السلام سے انحراف کرنے والوں کی

شفاعت کی نفی مقصود ہے۔ عُصَاۃِ مؤمنین یعنی گنہگار مسلمانوں کی شفاعت جو دیگر آیات اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے اس کی نفی مقصود نہیں تفصیل اگر درکار ہے تو تفسیر کبیر کی مراجعت فرمائیں۔

نیز ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی شخص اپنی وجاہت سے سفارش نہ کر سکے گا اور آیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ میں لفظ اذن اس کی دلیل ہے کہ خدا تعالیٰ کی اجازت سے سفارش ہو سکے گی۔

اِنعام دوم:

﴿وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ... الیٰ ... مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝۴۹﴾

اور یاد کرو اس انعام کو جبکہ ہم نے تم کو قوم فرعون سے نجات دی جو تم کو سخت ترین عذاب کی تکلیف دے رہے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ غیور طبیعتیں سمجھ سکتی ہیں کہ عورتوں کا زندہ چھوڑنا بیٹوں کے ذبح سے سخت ہے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ تم نے دیکھ لیا کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی نے بھی دُنیا میں ان سختیوں میں تمہاری کوئی مدد نہ کی پس سمجھ لو کہ آخرت میں جبکہ نفسی نفسی ہوگی کون تمہاری مدد کر سکے گا۔ فرعون نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے جس نے مصر کا احاطہ کر لیا ہے۔ ہر قبطی کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور اس کو جلاتی ہے۔ بنی اسرائیل سے کوئی تعرض نہیں کرتی۔ کاہنوں نے اس کی یہ تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیرے اور تیری قوم اور تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا اس لیے فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اس زمانہ میں نجوم کا بڑا چرچا تھا، اور نجومیوں کو خواب کی تعبیر کا بھی ملکہ تھا۔ اسی زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ فرعون ہی کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی۔ ؎

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود　　قصۂ فرعون زیں افسانہ بود

اِنعام سوم:

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰﴾

اور اے بنی اسرائیل اس نعمت کو بھی یاد کرو جب کہ ہم نے محض تمہاری وجہ سے دریا کو پھاڑا۔ یعنی محض تمہارے صحیح سالم گذر جانے کی وجہ سے ہم نے اپنے ارادہ اور مشیت سے دریا کو شق کیا۔ اتفاقی طور پر جزر و مدنہ تھا۔ پس تم کو نجات دی دشمن سے بھی نجات ملی۔ اور خدا تعالیٰ کے علم و قدرت میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں جو شبہات تھے ان سے بھی تم کو نجات ملی۔ سارے شبہے رفع ہوئے اور فقط تمہارے نجات دینے پر کفایت نہیں کی بلکہ قوم فرعون کو جو تمہاری دشمن تھی غرق کیا۔ تا کہ آئندہ بھی دشمنوں کا خطرہ دل سے نکل جائے اور پھر غرق بھی ان کو ایسی حالت میں کیا کہ تم ان کو غرق ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس میں اب کسی قسم کے شک و شبہ کی بھی گنجائش نہ رہی تھی اور دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے غرق ہوتے ہوئے دیکھنا یہ بہت ہی بڑی نعمت ہے اور ایسی نعمت کا تو بہت ہی شکر چاہیے۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ دن جس میں بنی اسرائیل کو نجات اور قوم فرعون کو غرق کیا گیا عاشورہ کا دن تھا۔ اس نعمت کے شکر میں موسیٰ علیہ السلام نے اس روز کا روزہ رکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا تو فرمایا کہ تم سے زائد موسیٰ علیہ السلام کا حق دار میں ہوں۔ خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ کا حکم دیا۔ فرعون سے نجات دینا تو نعمت تھا ہی،

لیکن دریا کو ان کے گزرنے کے لیے راستہ بنا دینا ایک مستقل انعام تھا اس لیے فلق بحر کو علیحدہ ذکر فرمایا۔

اِنعام چہارم:

﴿وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱﴾

فرعون کے غرق ہونے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے توریت عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا اور یہ بھی وعدہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چالیس شب کا اعتکاف فرمائیں۔ موسیٰ علیہ السلام تو کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ سامری جو کہ منافق تھا اس نے بعد میں گوسالہ پرستی کا فتنہ کھڑا کر دیا جس کا مفصل قصہ آئندہ آئے گا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: اے بنی اسرائیل اور تم ہمارے اس انعام کو یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ تیس راتیں ذی قعدہ کی اور دس راتیں ذی الحجہ کی۔ رات کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ رات کی عبادت میں مجاہدہ زیادہ ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶﴾ (مزمل)

"تحقیق رات کا اٹھنا نفس کے روندنے اور پامال کرنے اور بات کے سیدھا نکلنے میں شدید موثر ہے۔"

نیز سماء دُنیا کی طرف حق جل جلالہٗ کا نزول اِجلال شب ہی میں ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے اور رحمتیں اور برکتیں بھی اکثر رات ہی میں نازل ہوتی ہیں: كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدخان:۳) ترجمہ: "ہم نے قرآن کو مبارک رات میں اتارا۔"

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ (القدر) ترجمہ: "ہم نے قرآن کو قدر والی رات میں اتارا۔"

علاوہ ازیں قربِ الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے رات سے بہتر کوئی وقت نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

((عَن عمرو بن عنبسة رضی الله تعالی عنه انه سمع النبی ﷺ یقول اقرب ما یکون الرب من العبد فی جوف اللیل الاخر فان استطعت ان تکون ممن یز کر الله فی تلك الساعة فکن)). (رواه الترمذی و اللفظ له و ابن خزیمة فی صحیحه و قال الترمذی حدیث حسن صحیح غریب).

ترجمہ: "عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حق جل شانہٗ بندہ کے ساتھ سب سے زائد قریب اور نزدیک وسط شب میں ہوتے ہیں پس اگر تم سے یہ ممکن ہو کہ تو اس وقت میں اللہ کے ذکر کرنے والوں میں سے ہو تو ضرور ہو جا۔" (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا اور یہ لفظ ترمذی کی روایت کے ہیں اور ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں اس کو روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن اور صحیح اور غریب ہے)

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو قیام لیل کا حکم ہوا۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ﴾ (مزمل) اور رات ہی میں تہجد کا حکم ہوا۔ ﴿وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسرائیل:۷۹) اور رات ہی میں آپ کو آسمان کی سیر کرائی گئی۔ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا .... الاية﴾ (بنی اسرائیل:۱)۔

عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب سفر کرتے تو رات کو چلتے اور دن کو ٹھہرتے اس لیے کہ رات میں راستہ جلد قطع ہو جاتا ہے اسی طرح سیر الی اللہ کے لیے رات کو خاص کیا گیا تا کہ سالک جلد منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ رہا یہ امر کہ چالیس کا عدد کیوں خاص کیا گیا؟ سو اس کی

وجہ یہ ہے اعداد کے مختلف مرتبہ ہیں آحاد (اکائیاں) عشرات (دھائیاں) مأت (سینکڑے) اُلوف (ہزار) جن میں سے دس کا عدد فی حدذاتہٖ فی نفسہٖ کامل اور مکمل ہے جیسا کہ حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے: ﴿ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ﴾ "یہ دس کامل ہیں۔"

پس جس چیز کی خاص طور پر تکمیل مقصود ہوتی ہے تو اس عدد یعنی دس کو چار گنا کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کا خمیر چالیس دن تک کیا گیا اور حدیث میں ہے کہ بطن مادر میں چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے پھر چالیس روز تک علقہ (خون بستہ) پھر چالیس روز تک مضغہ یعنی پارۂ گوشت اس کے بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عدد کو عروج اور ترقی سے کوئی خاص مناسبت ہے۔ پس جس طرح جسمانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد منتخب ہوا اسی طرح حق جل شانہٗ نے اپنی اس قدیم سنت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باطنی اور روحانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد خاص فرمایا: ﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ ﴾

((وروی عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال من اخلص لله اربعین یوما ظهرت ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه ذکره)). (رزین العبدری)(ترغیب و ترهیب ص ۲۵ ج۱)

ترجمہ: "ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو چالیس دن تک عمل خاص اللہ کے لیے کرے تو علم اور حکمت کے چشمے اس کے قلب سے نکل کر اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔"" (رواہ رزین العبدری)

بینی اندر خود علوم اولیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اور اسی طرح نبوت و رسالت پیغمبری اور بعثت کے لیے چالیس کا عدد خاص کیا گیا۔ علاوہ ازیں اصل عمر انسان کی چالیس سال ہے اس کے بعد انحطاط اور زوال ہے جیسا کہ ﴿ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ﴾ (سورۂ احقاف) سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے حضرات اہل اللہ (حشرنا اللہ تعالیٰ فی زمرتهم و اماتنا علی حبهم و سیرتهم. اٰمین) نے مجاہدہ اور ریاضت خلوت اور عزلت کے لیے چلّہ تجویز فرمایا۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ؎

شنیدم رہر وے در سر زمینے همی گفت ایں معما باقرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے

الحاصل: ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے توریت دینے کے لیے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد ہی کہ جن کی ساری عمر ہی مدعی الوہیت کے مقابلہ اور غیر اللہ کی عبادت اور پرستش سے روکنے میں صرف ہوئی اُن کے جاتے ہی تم نے عجلت اور جلد بازی میں ایک عجل (گوسالہ اور بچھڑا) بنا کر کھڑا کر لیا اور لوگوں سے یہ کہا کہ دیکھو تمہارا خدا یہ ہے جو اس گوسالہ کی صورت میں ظاہر اور نمودار ہوا ہے اور جو تمہارے پاس ہے اور موسیٰ علیہ السلام خدا کو کوہ طور پر ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ جیسا کہ آج کل ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ خدا کسی جسم میں حلول کر سکتا ہے۔ اصطلاح متکلمین میں اس فرقہ کا نام فرقۂ حلولیہ ہے سامری نے لوگوں کو یہی سمجھایا کہ تمہارے پروردگار نے اس گوسالہ کی صورت میں ظہور کیا ہے۔ غرض یہ کہ سامری نے گوسالہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ اوّل تو گوسالہ بنانا ہی بُرا تھا اس لیے کہ ذی روح کی تصویر بنانا قطعاً حرام ہے۔ پھر یہ کہ گوسالہ بنا کر کیا کیا وہ زبان پر لانے کی چیز نہیں۔ اندیشہ ہے کہ کہیں زمین اور آسمان نہ پھٹ جائیں اور تم بڑے ہی ظالم تھے کہ خدائے عزوجل کو چھوڑ کر ایسے جانور کہ جو حماقت میں ضرب المثل ہے اس کی محض ایک تصویر کو اپنا خدا بنا لیا۔ بیل

حماقت میں ضرب المثل ہے اور بیل کا بچہ تو بیل سے بھی کم ہے اس لیے کہ وہ بے شعوری اور بے عقلی میں اس سے بڑھا ہوا ہے۔ کیا یہ انتہائی ظلم نہیں؟ ذرا تم اپنے عدل اور انصاف، فہم اور فراست کا کچھ تو اندازہ لگاؤ کیا ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز بھی خدا اور معبود ہو سکتی ہے؟

نیز تم نے یہ نہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب تم کو فرعون کی عبادت سے روکتے تھے حالانکہ وہ کسی درجہ میں نفع وضرر پر بھی قدرت رکھتا تھا تو اس بے عقل اور بے جان حیوان کی عبادت کی کیسے اجازت دے سکتے ہیں۔ آخر فرعون بیل کے بچہ سے تو بہتر ہی تھا۔ اس عمل شنیع کا مقتضا تو یہ تھا کہ تم کو فوراً ہلاک کر دیا جاتا مگر ہم نے اپنی کمال رحمت اور غایت رآفت سے درگزر کیا جیسا کہ آئندہ آیت میں فرماتے ہیں۔

اِنعام پنجم:

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۲﴾

پھر ہم نے اس جرم عظیم کے بعد بھی تم کو معاف کیا تا کہ تم احسان مانو کہ ہم نے اپنے فضل اور رحمت سے تم کو معاف کیا۔ آلِ فرعون کی طرح ہلاک نہ کیا، ورنہ یہ جرم قابلِ عفو نہ تھا۔ عفو سے اس جگہ مراد ترکِ مؤاخذہ ہے کہ تم کو اس جرم کے بعد نیست و نابود کر کے نہیں چھوڑا۔

حکایت : بارگاہِ خداوندی میں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار تو نے بے شمار نعمتیں مجھ کو عطاء فرمائیں اور ان پر شکر کا حکم دیا تیری نعمتوں کا شکر خود ایک عظیم الشان نعمت ہے پھر کس طرح شکر کروں۔ اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) بندہ کا یہ سمجھ لینا کہ جو نعمت بھی ہے وہ میری ہی طرف سے ہے یہی بس اس کے لیے کافی ہے۔ (خازن)

اِنعام ششم:

﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۵۳﴾

اور اے بنی اسرائیل اس انعام کو بھی یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب یعنی توریت دی جو احکام الٰہی کی جامع [1] تھی اور جو حق اور باطل روا اور ناروا میں فرق کرنے والی تھی۔ شاید کہ تم راہ راست پاؤ۔ علامہ زمخشری کے نزدیک اس جگہ الکتاب اور الفرقان دونوں سے توریت ہی مراد ہے۔ اور یہ دونوں توریت کی صفتیں ہیں۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک کتاب سے توریت مراد ہے اور الفرقان سے معجزات مراد ہیں کہ جن سے حق اور باطل کا فرق واضح اور نمایاں ہوتا ہے جب بنی اسرائیل نے سامری کے اغواء سے گوسالہ کی پرستش شروع کر دی تو بنی اسرائیل میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک حضرت ہارون علیہ السلام اور اُن کے متبعین کا کہ خود بھی اس سے علیحدہ رہے اور دوسروں کو بھی منع کیا۔ دوسرا فریق سامری اور اس کے متبعین کا اور تیسرا فریق ساکتین کا کہ نہ خود گوسالہ پرستی کی اور نہ دوسروں کو منع کیا۔ پہلے فریق کو توبہ کی حاجت نہ تھی۔ دوسرے اور تیسرے فریق کو توبہ کا اس صورت سے حکم ہوا کہ تیسرا فریق یعنی ساکتین دوسرے فریق یعنی سامری اور اس کے متبعین اور مرتدین کو قتل کریں تا کہ مقتول ہونے سے مرتدین کی توبہ ہو جائے اور قتل سے ساکتین کی توبہ ہو جائے اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض تھا اس سے سکوت کیسے جائز تھا اس لیے اس سکوت کی توبہ یہ ہے کہ تم اپنے اُن خویش اور اقارب اور احباب و مخلصین کو کہ جو گوسالہ پرستی کی وجہ سے مرتد ہو گئے ہیں ان کو اپنے ہاتھ سے قتل کرو جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے:

---

[1] اشارۃ الی ان اصل الکتاب ھو الجمع و سمی الکتاب کتابا لکونہ جامعًا للعلوم و القواعد واللہ اعلم۔ ۱۲ منہ

اِنعام ہفتم:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ... الایة﴾

اور اے بنی اسرائیل اس انعاک کو بھی یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: کہ اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنی جانوں پر بڑا ہی ظلم کیا اس بچھڑے سے تو فرعون اور ہامان ہی بہتر تھا۔ جب ایک انسان کی پرستش کفر اور شرک ہوئی تو ایک احمق حیوان کی پرستش کیسے کفر اور شرک نہ ہوگی۔ لہٰذا فوراً ہی بلا کسی تاخیر اور مہلت کے اپنے اس خالق کی طرف رجوع کرو۔ جس نے تم کو کفر اور شرک سے پاک اور بری منزہ اور مبرا پیدا کیا اس علیم وحکیم نے تم کو حنیف اور فطرۃً اسلام پر پیدا کیا تھا تم نے اپنی جہالت اور نادانی سے اس کو شرک اور ظلم عظیم کے ساتھ آلودہ اور ملوث کیا۔ لہٰذا تم اپنے خالق کی طرف رجوع کرو اور اسی کو اپنی مرجع * اور اپنا منتہی سمجھو اور پھر اس توبہ کی تکمیل اس طرح کرو کہ اپنے آپ کو قتل کرو یعنی ساکتین مرتدین کو خنجر لے کر قتل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کو یہ حکم خداوندی سنایا تو سب نے کہا کہ ہم دل وجان سے اپنے مولیٰ کے حکم پر راضی ہیں۔ چنانچہ سب ایک میدان میں جمع ہو گئے جن لوگوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی تھی خنجروں اور تلواروں سے گوسالہ پرستی کرنے والوں کو قتل کرنا شروع کیا جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ * اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری اور سعید بن جبیر اور مجاہد اور قتادہ اور ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم سے مروی ہے اور توریت سفر خروج کے بتیسویں باب میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی۔ جب ستر ہزار آدمی قتل ہو گئے تو حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے نہایت تضرع اور ابتہال کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں عفو کی درخواست کی۔ حق تعالیٰ نے دُعا قبول فرمائی مقتولین کی بھی مغفرت فرمائی اور بقیۃ السیف کو بھی معاف فرمایا۔ جو مارا گیا اس نے مرتبہ شہادت پایا اور جو زندہ رہا وہ گناہوں سے پاک ہوا۔

فائدہ: امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ جس طرح ہماری شریعت میں قاتل عمد کی توبہ کی تکمیل اور تتمیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ قاتل اپنے کو اولیاء مقتول کے سپرد کرے کہ چاہیں قتل کریں اور چاہیں معاف کریں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مرتدین کی توبہ جب مکمل ہوگی کہ جب وہ اپنے کو قتل کے لیے سپرد کر دیں اھ (تفسیر کبیر)۔

یہی تمہارے لیے ہر طرح سے بہتر اور نافع ہے تمہارے خالق کے نزدیک۔ جب تم نے اللہ کے حکم کی دل وجان سے تعمیل کی تو اللہ نے تم پر توجہ فرمائی اور تمہاری توبہ قبول کی۔ اگرچہ تمہارا جرم فرعون سے بھی زیادہ سخت تھا اس لیے کہ وہ ابتداء ہی سے کافر تھا اور تم نے ایمان کے بعد کفر کیا اور مرتد ہوئے۔ دین الٰہی کی بے حرمتی اور آبروریزی کی بے شک وہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے اور بڑا ہی مہربان ہے کہ ایک گھڑی کی تکلیف برداشت کر لینے پر ہمیشہ کی عزت اور کرامت عطاء فرماتا ہے۔ وہ حیات جس کی حقیقت لہو ولعب سے زائد نہیں ایسی حیات لے کر حیات سرمدی اور ابدی سے سرفراز فرماتا ہے۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچہ در وَہمت نیاید آں دہد

واقعہ قتل کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے باذن الٰہی ستر آدمیوں کو کوہِ طور پر لیجانے کے لیے منتخب فرمایا تا کہ گوسالہ پرستی کی معذرت

---

* ہذا تفسیر کلمة الی الّتی هی لانتهاء الغایة فی قوله الیٰ بارئکم ۱۲۔

* آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور توریت سب سے یہی ثابت ہے کہ یہ قتل تلواروں اور خنجروں سے تھا لہٰذا ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ سے نفس کشی مراد لینا صحیح نہیں۔ نیز نفس کشی ایک امر خفی ہے جس کا علم بہت دشوار ہے۔

کریں۔سب نے روزہ رکھااور غسل کیااور عمدہ کپڑے پہنے جب کوہ طور پہ پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ بارگاہِ خداوندی میں عرض کیجئے کہ ہمیں اپنا کلام پاک سنائے۔تھوڑی دیر میں ایک نورانی ابر ظاہر ہوا موسیٰ علیہ السلام اس میں غرق ہو گئے اور بنی اسرائیل نیچے کھڑے رہے۔سب نے اللہ کا کلام سنا۔جب کلام الٰہی ختم ہو گیااور موسیٰ علیہ السلام اس ابر سے برآمد ہوئے اور دریافت کیا کہ تم نے کلام الٰہی سنا تو اس پر یہ کہا ہم تو کلام الٰہی ہونے کا اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک علانیہ طور پر خدا کو نہ دیکھ لیں۔آئندہ آیت میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

اِنعام ہشتم:

﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝﴾

اور یاد کرو اے بنی اسرائیل اس وقت کو کہ جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) ہم محض تمہارے کہنے سے اس کا ہرگز یقین نہ کریں گے کہ ہم نے جو کچھ سُنا وہ اللہ جل جلالہٗ ہی کا کلام ہے۔ممکن ہے کہ پس پردہ کوئی اور کلام کرتا ہو جب تک کہ ہم خود اللہ کو علانیہ طور پر نہ دیکھ لیں اس طرح کہ ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ ہو پس آ پکڑا تم کو اس گستاخی پر بجلی نے اور تم اس بجلی کو آتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔بنی اسرائیل اس موقعہ پر دو وجہ سے غضبِ الٰہی کے مورد بنے۔

اوّل تو اس کہنے کی وجہ سے کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے اور محض تمہارے بھروسہ اور اعتماد پر اس کا کلام الٰہی ہونا تسلیم نہ کریں گے۔یہی ایک گستاخی نزولِ عذاب کے لیے کافی تھی اس لیے کہ اللہ کے نبی پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرنا اور حسن ظن کے بجائے اس سے بدظن اور بدگمان ہونا یہ کچھ معمولی گستاخی نہیں نبی پر اعتماد نہ کرنا صریح کفر ہے۔نبی ہی کے اعتماد پر اللہ کی باتوں کو ماننا ایمان ہے اور جو شخص نبی پر اعتماد نہیں کرتا آخر وہ یہ تو سوچے کہ نبی کے بعد پھر کس پر وہ اعتماد کرے گا۔

دوم یہ کہ گستاخانہ اور بے باکانہ طور پر یہ کہہ دینا کہ ﴿حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق جب کریں گے کہ جب اللہ کو علانیہ اور ظاہر طور پر دیکھ لیں۔ہاں اگر ادب کے ساتھ یہ کہتے کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) کہ ہم دیدارِ الٰہی کے مشتاق اور آرزومند ہیں تو مورد غضب نہ بنتے۔اس کا جواب تو یہ ہوتا کہ تم ابھی اس نعمت کے قابل نہیں آخرت میں جب آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک ہو جاؤ گے تب دیکھو گے غرض یہ کہ اس گستاخانہ اور بے باکانہ سوال کی وجہ سے عذابِ الٰہی نے آ گھیرا۔اور موسیٰ علیہ السلام کا ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ کہہ کر دیدارِ الٰہی کا سوال کرنا سو اوّل تو وہ سوال تھا یعنی عاجزانہ اور مؤدبانہ ایک استدعاء اور درخواست تھی مطالبہ نہ تھا۔دوم یہ کہ وہ ایک والہانہ اور عاشقانہ استدعاء نیاز تھی جو سراسر محبت اور اشتیاق پر مبنی تھی۔حاشا بنی اسرائیل کی طرح تعنت اور عناد اس کا منشا نہ تھا۔پھر موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر جس کا مفصل قصہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔ہم نے تم کو زندہ کیا تمہارے مرجانے کے بعد یعنی حقیقتاً تم مر چکے تھے غشی اور سکتہ کی حالت نہ تھی اور نہ کوئی خواب تھا۔حقیقتاً مرنے کے بعد ہم نے تم کو اپنی رحمت سے دوبارہ زندہ کیا شاید کہ تم شکر کرو کہ حق جل شانہٗ نے اپنی رحمت سے ہمارا قصور معاف فرمایا اور اپنی عبادت اور بندگی توبہ اور استغفار انابت اور اعتذار کے لیے اور مہلت عطاء فرمائی اور بعث بعد الموت کا نمونہ آنکھوں سے دکھلا دیا تا کہ بعث بعد الموت کے بارہ میں تم کو ذرہ برابر شبہ نہ رہے اور تم اس ایمان شہودی کا شکر ادا کرو۔ایمان استدلالی میں تزلزل آ سکتا ہے مگر ایمان شہودی میں تزلزل ممکن نہیں گویا کہ قیامت تم کو آنکھوں سے دکھلا دی گئی۔

اِنعام نہم:

﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ﴾

جب بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ہوا تو بہت شاق اور گراں ہوا اور بالآخر یہ کہہ دیا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام)! تم اور تمہارا رب جا کر جہاد اور قتال کرلو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اس جرم میں چالیس سال تک ایک میدان میں حیران و پریشان پھرنے کی سزا ملی اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے ایک سفید ابر سایہ کے لیے بھیجا تا کہ دھوپ کی تکلیف نہ ہو اور کھانے کے لیے من وسلویٰ نازل فرمایا اور ایک نور کا ستون عطا فرمایا جو اندھیری راتوں میں چاند کا کام دیتا تھا۔ آئندہ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور اے بنی اسرائیل سایہ کیا وادی تیہ میں ہم نے تم پر ابر کا۔ سیدنا قتادہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ غمام اس اَبر کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ ابر نہایت ٹھنڈا اور پاکیزہ تھا ویسا اَبر نہ تھا جو لوگوں میں معروف ہے بلکہ وہ اس قسم کا اَبر تھا کہ جس میں بدر کے دن فرشتے نازل ہوئے۔ اور جس میں قیامت کے دن ملائکہ اور حق جل شانہٗ نزولِ اجلال فرمائیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾

اَبر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو بخار یا دخان وغیرہ کے انجماد سے ظاہر ہو۔ دوسرا وہ جو عالم غیب اور عالم مثال سے بدون کسی سبب ظاہری کے ظہور میں آئے۔ لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ اَبر دوسری قسم کا تھا اور اسی طرح قیامت کے دن جو اَبر ظاہر ہوگا وہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔ اور اُتارا ہم نے وادی تیہ میں خزانۂ غیب سے تم پر من سلویٰ۔ من ایک شیریں چیز تھی۔ دھنیے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ رات کو اوس میں برستی۔ صبح کو ہر شخص اپنی ضرورت کے موافق چن لیتا، اور سلویٰ ایک پرند کا نام ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں یا اور کوئی پرند ہے جو مشابہ بٹیر کے ہوتا ہے شام کو لشکر کے گرد ہزاروں جانور جمع ہو جاتے اندھیرا ہونے کے بعد پکڑ لاتے اور کباب بنا کر کھاتے۔ مدت تک اسی طرح کرتے رہے۔

فائدہ: اطباء نے من یعنی ترنجبین کے بہت فوائد بیان کئے ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ اسکو باریک پیس کر سونگھا جائے تو مالیخولیا اور وہم اور وساوس اور دماغی ریاح فاسدہ کے لیے بہت مفید پڑتا ہے۔ عجب نہیں کہ بنی اسرائیل کے دماغوں کے تنقیہ کے لیے من تجویز کی گئی ہو تا کہ اُن کے دماغ اس قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہو جائیں۔ اور بٹیر کا گوشت دل کو نرم کرتا ہے یہ اُن کی قساوت قلبی دُور کرنے کے لیے تجویز کیا گیا ہو۔ واللہ اعلم

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۵۷﴾

اور کہا ہم نے اُن سے کہ کھاؤ تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دیں یعنی یہ چیزیں محض تمہارے کھانے کے لیے اُتاری ہیں ذخیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ بنی اسرائیل نے اس حکم کی تعمیل نہ کی اور باوجود اس کے کہ خدا کی رأفت و رحمت کا کرشمہ روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے پھر بھی خدا پر بھروسہ اور اعتماد نہ کیا۔ انجام یہ ہوا کہ جو ذخیرہ رکھتے وہ سڑ جاتا۔ اللہ فرماتے ہیں: "اور ہمارا کچھ بھی نقصان نہیں کیا، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے" کہ ایسا رزق کھویا جس میں نہ دُنیا کی مشقت تھی اور نہ آخرت کا حساب تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ اس آیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کے صحابہ پر ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دھوپ اور گرمی میں غزوات اور سرایا کے لیے سفر کئے مگر کبھی اس قسم کے خوارق کے خواہشمند نہ ہوئے کہ بنی اسرائیل کی طرح

ہم پر من وسلویٰ نازل کیا جائے۔اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے اَبر بھیج دیا جائے حالانکہ نبی اکرم ﷺ اگر دُعا فرماتے تو ضرور ایسا ہو جاتا۔

اِنعام دہم:

﴿وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ .... الاية﴾

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قریہ سے بیت المقدس مراد ہے۔اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل چالیس سال کے بعد میدان تیہ سے یوشع بن نون علیہ السلام کی معیت میں نکلے۔ جمعہ کی شام کو بیت المقدس فتح ہوا اور کچھ دیر کے لیے سورج روکا گیا یہاں تک کہ یوشع بن نون علیہ السلام کو فتح حاصل ہوئی۔اس وقت یہ حکم ہوا کہ تم اس شہر کے دروازہ میں سجدۂ شکر کرتے ہوئے اور زبان سے استغفار اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور اقرار کرتے ہوئے داخل ہو۔جیسے حق جل جلالہٗ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا۔

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝۱ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳﴾ (النصر)

ترجمہ: "جب اللہ کی نصرت اور فتح آ پہنچی اور آپ (ﷺ) نے لوگوں کو دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوتا ہوا دیکھ لیا تو اس کے شکر میں اللہ کی تسبیح اور تحمید اور استغفار کیجیے بے شک اللہ تعالیٰ بڑا توجہ فرمانے والا ہے۔"

چنانچہ نبی اکرم ﷺ جب فتح مکہ مکرمہ کے لیے تشریف فرما ہوئے تو مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت خشوع اور خضوع تواضع اور تذلل کے آثار آپ ﷺ سے ظاہر اور نمایاں ہو رہے تھے۔اس شان سے مکہ میں داخل ہوئے اور فتح ہو جانے کے بعد غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز پڑھی بعض علماء کے نزدیک یہ نماز صلوٰۃ الضحیٰ یعنی چاشت کی نماز تھی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صلوۃ الفتح تھی یعنی فتح مکہ کے شکر کی نماز تھی۔سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب ایوان کسریٰ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو محل میں پہنچ کر آٹھ رکعت نماز پڑھی۔آئندہ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔اور یاد کرو اس وقت کو جب کہا ہم نے کہ داخل ہو اس شہر میں پس کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو وسعت اور فراغت کے ساتھ اور داخل ہو اس کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے یہ شکر بدنی ہوا اور بخشش بخشش کہتے ہوئے۔یعنی توبہ اور استغفار کرتے ہوئے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہوئے داخل ہو۔یہ شکر لسانی ہوا اور ان دونوں عملوں کی روح ندامت قلبی ہے۔ پس اگر ایسا کرو گے تو ہم تمہاری تمام خطاؤں کو بخش دیں گے اور اخلاص کے ساتھ نیکی کرنے والوں کے اجر میں بقدر ان کے اخلاص کے اور اضافہ کریں گے۔پس بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس طریقہ کے کہ جو ان سے کہی گئی تھی۔بجائے سجدہ کے سرین کے بل داخل ہوئے اور ﴿حِطَّةٌ﴾ کے بجائے (حَبَّةٌ فی شعرةٍ) "گیہوں کا دانہ جو کے دانہ میں" ایک مہمل لفظ بطور تمسخر کے کہنے لگے۔پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا ایک عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ حکم عدولی کرتے تھے۔یعنی اس درجہ بے باک تھے کہ بجائے اس کے کہ نعمت کا شکر کرتے بے ادبی کی اور توبہ اور استغفار کی جگہ مسخراپن اور ہنسی کا طریقہ اختیار کیا اس لیے عذاب دیئے گئے۔اور بجائے ﴿عَلَيْهِمْ﴾ کے ﴿عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ کہنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ عذاب تمام بنی اسرائیل پر نازل نہیں کیا گیا۔بلکہ خاص ان لوگوں پر نازل کیا گیا جنہوں نے حکم عدولی کی اور اللہ کے حکم کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کیا۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رِجز سے مراد طاعون ہے۔اور سعد بن مالک اور اسامۃ بن زید اور خزیمہ ابن ثابت رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ طاعون رِجز یعنی عذاب ہے، جس سے پہلے لوگوں کو عذاب دیا گیا۔ (رواہ النسائی)

کہا جاتا ہے کہ اس طاعون سے ایک ساعت میں ستر ہزار آدمی مرے۔

تتمۂ اِنعام دہم:

﴿وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ .... الآیة﴾

ربط: گزشتہ آیات میں آسمانی خوراک یعنی من وسلویٰ کا ذکر تھا اب ان آیات میں غیبی پانی اور غیبی چشموں کا ذکر فرماتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے ظاہر ہوئے۔ کھانے کے بعد پانی درکار ہوتا ہے۔ پھر لطف یہ کہ جس طرح کھانا بطور خرق عادت عطا فرمایا اسی طرح پانی بھی بطور خرق عادت عطا فرمایا تا کہ خداوند ذوالجلال کی قدرت اور کلیم اللّٰہی اعجاز نبوت ورسالت ظاہر ہو کر قلوب کے لیے موجب سکینت وطمانیت ہو۔ اور اس غیبی طعام وشراب کے استعمال سے قلب کی حالت درست ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے استسقاء کی دُعاء کی اور خاص اپنی قوم کے لیے خدا سے پانی مانگا۔ یہ قصہ بھی میدان تیہ کا ہے۔ جب بنی اسرائیل پیاسے ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ شانہٗ سے بنی اسرائیل کے لیے پانی کی دعا مانگی۔ پس کہا ہم نے مارا اے موسیٰ (علیہ السلام) اپنے عصاء سے پتھر کو۔ پس مارتے ہی فوراً ہی خوب رواں ہو گئے اور خوب بہ نکلے موسیٰ علیہ السلام کے مارنے سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندان کے مطابق بارہ چشمے۔ تحقیق خوب جان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ اس آیت میں حق جل شانہ نے ﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ فرمایا جس کے معنی خوب رواں ہو جانے کے ہیں۔ اور سورۂ اعراف میں ﴿فَانْۢبَجَسَتْ﴾ فرمایا، جس کے معنی رسنے اور تھوڑا تھوڑا پانی نکلنے کے ہیں۔

عطاء فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اس پتھر پر بارہ مرتبہ عصا مارتے جس سے ہر جگہ پر عورت کے پستان کے مثل ایک شے ظاہر ہوتی پھر اس سے پانی رسنا شروع ہوتا اس کے بعد وہ رواں ہوتا اور خوب بہتا۔ (معالم التنزیل)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ جب ضرورت زیادہ ہوتی ہو اس وقت زیادہ بہتا ہو اور جب ضرورت کم ہوتی ہو تب تھوڑا بہتا ہو۔ اور یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا متعدد اعتبارات سے معجزہ تھا۔ اوّل تو پانی کا پتھر سے نکلنا۔ دوسرے یہ کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے اس قدر کثیر پانی نکلنا۔ تیسرے یہ کہ پانی کا بقدر حاجت نکلنا۔ چوتھے یہ کہ محض عصا کے مارنے سے پانی کا بہہ پڑنا۔ پانچویں یہ کہ ضرورت پوری ہو جانے پر پانی کا بند ہو جانا۔ ان اعتبارات سے یہ واقعہ قدرتِ الٰہیہ کا ایک خاص نشان اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا اور اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے لیے ایک عظیم الشان نعمت تھی کہ جس کے بغیر حیات اور زندگی کا بقاء ناممکن ہے وہ بغیر کسی مشقت کے عطا فرمائی۔

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعائے استسقاء خاص اپنی قوم کے لیے تھی اس لیے صرف پتھر سے پانی جاری کیا گیا۔ بخلاف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے کہ انہوں نے خاص اپنی اپنی قوم کے لیے استسقاء کی دُعا نہیں کی بلکہ تمام جہان کے لیے پانی مانگا اس لیے آسمان سے پانی برسایا گیا اور اُس بارانِ رحمت سے مؤمن اور کافر دوست اور دشمن سب ہی منتفع ہوئے۔

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام کا استسقاء کے لیے فقط دُعا پر اکتفاء فرمانا مسئلہ استسقاء میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تائید کرتا ہے کہ استسقاء کے لیے خاص نماز ضروری اور لازم نہیں فقط دعاء پر بھی اکتفاء کیا جا سکتا ہے۔ نماز استسقاء سُنّت ہے واجب نہیں۔

اور کہا ہم نے بنی اسرائیل سے کھاؤ اور پیو تم اللہ کے خاص رزق سے جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر بغیر ظاہری اسباب کے توسط کے تم کو عطاء فرمایا ہے، اور دل وجان سے اللہ کا شکر کرو اور اللہ کا رزق کھا کر اس کی معصیت اور نافرمانی پر دلیر مت بنو۔ اور زمین میں فساد مچاتے اور پھیلاتے نہ پھرو یعنی زمین پر اللہ کی معصیت نہ کرو۔

فائدہ: ﴿وَلَا تَعْثَوْا﴾ عثٌی سے مشتق ہے جس کے معنی سخت فساد مچانے کے ہیں۔ یعنی مفسد اور فسادی تو تم پہلے ہی سے ہو مگر خیر اس فساد کو تم اپنی ہی ذات تک محدود رکھو۔ اس میں اور کسی قسم کا اضافہ نہ کرو اور نہ لوگوں میں اس کو پھیلاؤ۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم نہ ٹھہریں گے ایک کھانے پر سو پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَ

کہ نکال دے ہم کو جو اُگتا ہے زمین سے زمین کا ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور

عَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ

مسور اور پیاز بولا کیا تم لیا چاہتے ہو ایک چیز جو ادنیٰ ہے بدلے ایک چیز کے جو

خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے اترو کسی شہر میں تو تم کو ملے گا جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی ان پر

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا

ذلت اور محتاجی اور کما لائے غصہ اللہ کا یہ اس پر کہ وہ تھے

يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا

نہ مانتے حکم اللہ کے اور خون کرتے نبیوں کا ناحق یہ اس سے کہ

عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع ۷ ۲ ۷

بے حکم تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔

ذکر شنائع بنی اسرائیل و بیانِ تعنّت ایشان با نبیاء رب جلیل

شناعتِ اوّل کفرانِ نعمت بنا بر دناءت و خاست

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ... الیٰ ... ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾

ربط: یہاں تک حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے انعامات اور احسانات کا ذکر فرمایا، آئندہ بنی اسرائیل کی شرارتوں اور عادات شنیعہ اور

انبیاء اللہ علیہم السلام کے ساتھ ان کے تعنت اور عناد کو بیان فرماتے ہیں کہ جس قدر ہماری طرف سے ان پر نعمتیں برستی رہیں اسی قدر ان کے تمرد اور سرکشی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور پھر اس سلسلہ میں سب سے پہلی شناعت جو ذکر فرمائی تو وہ کفرانِ نعمت اور ان کی طبعی دناءت اور حست کی ذکر فرمائی کہ جو خسیس کو نفیس پر ترجیح دینے کا باعث بنی اس لیے اب انعامات کے بعد ان کی شناعتوں اور شرارتوں اور عقوبتوں کو بیان کرتے ہیں تا کہ گزشتہ انعامات کو یاد کر کے اللہ کی محبت اور اس کی اطاعت کی رغبت پیدا ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "اور یاد کرو اس وقت کہ جب تم نے کمال بے ادبی سے موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر پکارا، اور تم نے یہ کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) مقتضائے ادب یہ تھا کہ یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ اور یا کلیم اللہ کہہ کر ان سے عرض و معروض کرتے۔ دوسری گستاخی تم نے یہ کی کہ یہ کہا کہ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے یہ کلام بھی تمہاری اندرونی خباثت اور باطنی شرارت کی خبر دے رہا ہے کہ صبر اور تحمل کر تو سکتے تھے مگر قصداً ہرگز ایسا نہیں کریں گے ورنہ اگر حقیقتاً صبر کی طاقت ہی نہ تھی تو یہ کہنا تھا۔ ﴿لن نستطیع الصبر﴾ یعنی ہم میں صبر کی طاقت نہیں بلکہ مناسب تو یہ تھا کہ بصد شکر اللہ کی نعمت کو قبول کرتے اور پھر بصد ادب رب العزۃ سے یہ درخواست کرتے ﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ "اے اللہ! ہم تیرے عاجز اور ناتواں بندے ہیں ہم کو صبر اور تحمل عطا فرما۔"

غرض یہ کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر یہ کہا کہ ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے۔ اس لیے آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کیجیے کہ نکالے ہمارے واسطے ان چیزوں میں سے کہ جن کو زمین اُگاتی ہے۔ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہنا کہ آپ اپنے رب سے دُعا کیجیے اس کلام سے بیگانگی کی بُو آتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے تو رب ہیں مگر ان کے رب نہیں ہیں۔ اس طرح کیوں نہ کہا ﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّنَا﴾ "اے موسیٰ علیہ السلام ہمارے لیے ہمارے رب سے دُعا کیجیے۔" موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "کیا تم ادنیٰ چیز کو بہتر اور عمدہ شے کے بدلہ میں لینا چاہتے ہو؟" اتنا نہیں سمجھتے کہ مسور اور وہ پیاز جس کی بدبُو سے ملائکۃ اللہ کو نفرت ہے اور پیاز کھانے والے کو بیت اللہ کے پاس آنے کی بھی ممانعت ہے۔ بھلا ایسی چیزوں کو من وسلویٰ سے کیا نسبت۔ پھر یہ کہ من وسلویٰ براہِ راست خدائے عزوجل کا آسمان سے اُتارا ہوا رزق ہے۔ دُنیا میں کمانے کی محنت اور مشقت نہیں اور آخرت میں اس پر کوئی حساب نہیں۔ خیر اگر تم اپنی پست ہمتی اور طبعی دناءت سے اس بہترین رزق کے بدلہ میں ایک ادنیٰ اور معمولی ہی چیز لینا چاہتے ہو تو کسی شہر میں جا کر اُترو پس تمہارے لیے ہوگا جو تم مانگتے ہو۔ سبزی منڈی میں مسور اور پیاز وغیرہ بغیر حاجت دعاء کے تم کو مل جائیں گی اور میرے لیے یہ لائق نہیں کہ بارگاہِ خداوندی میں ایسی چیزوں کی درخواست کروں جو پستی اور کم ہمتی پر دلالت کرے۔

فائدہ: ہبوط لغت میں بلندی سے پستی کیطرف آنے کو کہتے ہیں۔ انسان جب تک سفر میں رہتا ہے تو علی العموم سواری پر سوار رہتا ہے جب شہر میں پہنچتا ہے تو سواری سے اتر کر قیام کرتا ہے اس لیے سفر سے شہر میں واپس آنے کو ہبوط اور نزول اور فروکش ہونے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس لفظ میں ان کے معنوی ہبوط کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بلند حالت سے پست حالت کی طرف نزول کیا اور اعلیٰ رزق سے ادنیٰ رزق کی طرف تنزل اختیار کیا۔ ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ اور خیمہ کی طرح ذلت اور رسوائی اور بے چارگی اور بے نوائی ان پر لگا دی گئی۔ خیمہ کی طرح ذلت اور بے نوائی نے ان کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے یا اس طرح کہیے کہ ذلت اور مسکنت کی مہر ان پر لگا دی گئی کہ اب وہ کسی طرح ان سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ یہود جہاں بھی ہیں وہاں دوسروں کے محکوم اور باج گزار ہی ہیں۔ یہ تو ذلت ہوئی کہ دوسروں کی نظر میں ذلیل ہوئے اور مسکنت یہ کہ خود ان کی طبیعت میں دناءت اور پستی پیدا ہو گئی۔ سرکاری محاصل کے خوف سے ہمیشہ اپنے کو مسکین اور فقیر ظاہر کرتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے مال کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس ذلت اور

مسکنت سے بڑھ کر یہ ہے کہ اللہ کے غضب کو کمایا۔ جس کو کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ﴾ یہ ذلت اور مسکنت اور خُدا کا غضب اس لیے ہوا کہ وہ خُدا کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یعنی خود بھی ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کے قتل کی کوئی وجہ نہ تھی محض عناد اور سرکشی اس کا باعث ہوئی۔ انبیاء اللہ علیہم السلام کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے ان کے جُرم کی شدّت بتلانے کے لیے بطور تاکید بغیر الحق کا لفظ ذکر کیا گیا جیسا کہ ﴿رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ "اے پروردگار! حق کے مطابق حکم دیجیے۔" اس آیت میں ﴿بِالْحَقِّ﴾ کا لفظ محض تاکید کے لیے ہے یہ مقصد نہیں کہ معاذ اللہ، اللہ کے حکم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حق اور ایک ناحق۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کا حکم ہمیشہ حق پر ہوتا ہے اسی طرح انبیاء اللہ علیہم السلام کا قتل بھی ہمیشہ ناحق ہوتا ہے، یہود بے بہبود کے جرم کی شدت بیان کرنے کے لیے بغیر الحق کا لفظ محض تاکید کے لیے بڑھایا گیا حاشا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کا قتل کبھی حق ہوتا ہے اور کبھی ناحق۔ یا بعنوان دیگر اس طرح سمجھیے کہ بغیر الحق سے ظلم اور تعدّی مراد ہے، یعنی سوائے ظلم اور تعدّی اور سوائے جور و ستم اور سوائے تمرد اور سرکشی کے اور کوئی امر انبیاء علیہم السلام کے قتل کا باعث نہ تھا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے تو ان کو حق کی دعوت دی اور نصیحت کی اور فلاح دارین کی طرف بلایا اور اُن لوگوں نے ان کا ناحق مقابلہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو قتل کرتے تاکہ رشد و ہدایت کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے اور فیض عام کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ اسی لیے ذلت و مسکنت اور غضبِ الٰہی کے مورد بنے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زائد سخت عذاب والا قیامت کے دن وہ شخص ہوگا کہ جس کو کسی نبیؑ نے قتل کیا یا اس نے کسی نبیؑ کو قتل کیا یا کسی گمراہی کا پیشوا یا تصویر بنانے والا۔ (مسند احمد)

فائدہ: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جن پیغمبروں کو حق جل شانہٗ نے کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم دیا انہی سے دشمنوں کے مقابلہ پر فتح و نصرت کا وعدہ کیا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا﴾ وہ پیغمبر صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنصر عبدهٗ وهزم الاحزاب وحدهٗ کے مصداق بنے۔ وہ کبھی دشمنوں کے ہاتھ سے مقتول نہیں ہوئے اس لیے کہ حق جل شانہٗ کا ان کو جہاد کا حکم دینا پھر ان کی صیانت اور حفاظت نہ فرمانا بظاہر شان حکمت کے مناسب نہیں معلوم ہوتا ایسے ایسے حضرات ہمیشہ مظفر و منصور اور اُن کے دشمن ہمیشہ خائب و خاسر ہوئے اور جن پیغمبروں کو جہاد و قتال کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ اُن سے حق جل و علا نے کوئی عصمت اور نصرت کا وعدہ فرمایا ان میں سے جس کو چاہا جام شہادت پلایا۔

نشو و نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت　　سرد و ستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تاکہ اُن کے مدارج اور مراتب میں عزت اور وجاہت میں اور قربتِ الٰہی اور رفعتِ شان میں اضافہ ہو۔ اور ان کے دشمنوں پر ذلت اور مسکنت خواری اور رسوائی گدائی اور بے نوائی کی مہر لگے۔ کذا فی روح البیان [1] وجامع الاحکام الامام القرطبی ص ۴۳۲ ج ۱۔

---

[1] قال ابن عباس والحسن لم يقتل قط من الانبياء الا من لم يومد بقتال و كل من امر بقتال نصر فظهر انه لا تعارض بين قوله تعالى و يقتلون النبيين بغير الحق و قوله تعالى انا لننصر رسلنا و قوله تعالى ولقد سبقت كلمتنا لعبادنا المرسلين ۱۲ روح البيان ص ۱۰۳ ج ۱۔ جامع الاحكام للقرطبى.

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾ یہ یعنی آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ علیہم السلام کے قتل کی جرأت اور دلیری ان میں اس طرح پیدا ہوئی کہ وقتاً فوقتاً اللہ کی نافرمانیاں کیں اور حدودِ الٰہیہ سے تجاوز کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ معصیت اور نافرمانی دلوں میں راسخ ہوگئی اور اس نے آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ علیہم السلام کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ لیکن اب بھی اگر تم صمیم قلب سے ایمان لے آؤ تو توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے، توبہ کر لینے سے تمہارا ہر قسم کا کفر اور پیغمبروں کے قتل کرنے کا جرم بھی معاف ہو سکتا ہے۔ اگر یہ چاہتے ہو کہ ذلت سے نکل کر عزت میں آ جاؤ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کفر سے توبہ کرو اور ایمان اور عمل صالح اختیار کرو۔ ﴿وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ
یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین جو کوئی یقین لایا
بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس
وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾
اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں

ذلت سے نکلنے اور عزت میں داخل ہونے کا طریقہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿... الیٰ ...﴾

تحقیق وہ لوگ کہ جو ایمان لائے پہلے انبیاء علیہم السلام پر * یا وہ لوگ جو محض زبان سے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان کے مدعی بنے اور دل سے اس دین کو سچا نہیں سمجھتے اور وہ لوگ کہ جو یہودی ہوئے جن کی قباحتیں حد سے گزر چکی ہیں یہاں تک کہ جسم حیوانی میں خداوند قدوس کے حلول کے قائل ہوئے۔ اور خدا کے بعض نبیوں کو قتل کیا اور زنا اور جادو کی تہمت ان پر لگائی اور نصاریٰ جنہوں نے حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کو خدا بنایا، اور فرقۂ صابئین بے دین لوگ جنہوں نے کواکب کی پرستش کی باوجود ان شنائع اور قبائح کے اور باوجود حق سے بعید ہو جانے کے جو شخص بھی ان میں سے اخلاص کے ساتھ اللہ پر بغیر تشبیہ اور بغیر تعطیل اور بغیر تشریک اور تجسیم کے اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اس کے لیے خدا کے یہاں ثواب اور اجر ہے اور نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ڈر ہے یعنی اس سے نہ

---

* اور بعض مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ظاہراً رسول اللہ ﷺ پر زبانی ایمان لائے۔ عام اس سے کہ ایمان دل میں داخل ہوا یا نہیں اس تقدیر پر اس میں منافقین بھی داخل ہوں گے۔ اور اخیر آیت ﴿مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ﴾ میں اخلاص کے ساتھ ایمان لانا مراد ہوگا۔ لہٰذا ایمان کا ذکر آیت میں مکرر نہ ہوگا۔

ڈریں کہ گزشتہ کفر نقصانِ اجر کا باعث ہوگا اس لیے کہ ((الاسلام یھدم ما کان قبلہ)) اسلام لانا ان تمام گناہوں کو ڈھا دیتا ہے جو اسلام لانے سے پیشتر کیے جا چکے ہیں اور نہ وہ غم کھاویں کہ افسوس ہماری تمام زندگی یوں ہی ضائع اور برباد گئی، اعمالِ صالحہ سے گذشتہ کی تلافی ہو جائے گی۔

خلاصہ مطلب یہ کہ کسی فرقہ کی تخصیص نہیں جو بھی ایمان لے آئے وہ عذابِ الٰہی سے نجات پا جائے گا۔

تنبیہ: آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقط اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی ہے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ قرآنِ کریم کی صدہا نصوص اس بات پر صراحتاً دال ہیں کہ جو شخص انبیاء اور ملائکہ کا انکار کرے وہ قطعاً کافر ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سلسلۂ ایمان میں جن جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اوّل سے آخر تک سب پر ایمان لائے چونکہ سلسلۂ ایمان کی ابتداء اللہ سے ہوتی ہے اور انتہاء آخرت پر ہے اس لیے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کی تخصیص کی گئی۔ جیسا کہ ﴿رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ میں ابتداء اور انتہاء کو ذکر کر کے تمام سلسلہ مراد ہے۔ نیز اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ اور صحف سماویہ پر ایمان نہ لائے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور آخرت کے احوال کی معرفت کا ذریعہ انبیاء علیہم السلام اور صحفِ الٰہیہ ہی ہیں اور وحی اور صحیفۂ ربانی کا نزول فرشتہ کی وساطت سے ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرت موقوف ہے۔ ایمان بالانبیاء اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب پر اس لیے ان تین چیزوں پر ایمان لانے کو علیحدہ بیان نہیں کیا گیا۔

فائدہ: صابئین ایک فرقہ ہے کہ جو کسی آسمانی دین اور شریعت کا قائل نہیں خدا اور بندہ کے درمیان میں روحانیات کو واسطہ قرار دیتے ہیں کہ بندہ کو جو فیض بھی حاصل ہوتا ہے وہ روحانیات کے واسطہ سے ہوتا ہے نبوت ورسالت کے سرے سے قائل نہیں۔ کہتے ہیں کہ پیغمبروں کی کوئی حاجت نہیں تفصیل اگر درکار ہو تو تفسیر ابن کثیر وغیرہ کا مطالعہ فرمائیں۔

علامہ شہرستانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ملل ونحل میں حنفاء اور صابئین کا ایک مناظرہ ذکر فرمایا ہے جو قابلِ دید ہے۔ اس ناچیز نے اپنے ''علم الکلام'' میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے جو بحمدہٖ تعالیٰ شائع ہو چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صابئین کے بارہ میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کا مذہب کیا ہے۔

① قول اوّل: مجاہد اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں: کہ صابئین ایک قوم اور فرقہ ہے جس کا دین یہودیت اور مجوسیت سے مل کر بنا ہے۔

② قول دوم: قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتی ہے اور سورج کی طرف منہ کر کے روزانہ پانچ نمازیں پڑھتی ہے اور قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ دین پانچ ہیں جس میں سے چار تو شیطان کے لیے ہیں اور ایک دین رحمٰن کے لیے سو صابئین جو فرشتوں کو پوجتے ہیں اور مجوس جو آتش پرست ہیں اور مشرکین جو بتوں کو پوجتے ہیں اور اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ۔ ان سب فرقوں کے دین شیطان کے لیے ہیں۔

③ قول سوم: صابئین وہ گروہ ہے جو ستاروں کی عبادت کرتے ہیں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ یہی قول اقرب الی الصواب ہے اور

اس فرقہ کے دوعقیدے ہیں ایک تو یہ کہ خالقِ عالم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اُس نے حکم دیا ہے کہ ان ستاروں کی تعظیم کی جائے اور ان کو نماز اور دعا کا قبلہ ٹھہرایا جائے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے افلاک اور کواکب کو پیدا کیا پھر تمام عالم کے خیر وشر۔ صحت ومرض کے مدبر یہی کواکب ہیں اور یہی ان سب چیزوں کے خالق ہیں اس لیے بشر پر ان کی تعظیم اور عبادت فرض ہے کیونکہ عالم کے اِلٰہ اور معبود یہی ہیں اور یہی عالم کے مدبر ہیں۔ پھر یہ کواکب اللہ کی عبادت کرتے ہیں کیدانیوں کا یہی مذہب تھا جن کے رد اور ابطال کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ (تفسیر کبیر ص ۳۸۱ ج ۱)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ صابئین کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ موحد تھے مگر تاثیر نجوم کے قائل تھے اور کواکب کو مدبر عالم سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے جب خلیفہ قادر باللہ نے صابئین کے متعلق ابوسعید اصطخری سے دریافت کیا تو ابوسعید نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا۔ (تفسیر قرطبی ض ۴۳۵ ج ۱)

اور اہل لغت اس شخص کو صابی کہتے ہیں جو ایک دین سے خارج ہو کر دوسرے دین میں داخل ہو گیا ہو۔ اسی واسطے اہل عرب مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ آبائی دین چھوڑ کر ایک نئے دین یعنی دین اسلام میں داخل ہو گئے اور اس فرقہ کو صابئین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دین موسوی اور دین عیسوی سے نکل کر فرشتوں اور کواکب کی عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر حقانی ص ۱۹۰ ج ۱ میں لکھتے ہیں: صابی ایک قدیم فرقہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں اس فرقہ کا بڑا زور تھا۔ شہر بابل اور نینویٰ کے لوگ بھی یہی مذہب رکھتے تھے یہ معلوم نہیں کہ اس گروہ کی ابتداء کب سے ہوئی اس کا اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ جو ہر مجرد ہے بندہ کی جو مادی ہے کس طرح رسائی ممکن نہیں اس کی پرستش اس کے مظاہر کی پرستش ہے۔ پھر اس کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جو ستاروں اور آفتاب اور ماہتاب اور عناصر کی پرستش کرتے تھے۔ دوم وہ جو اصنام کو رَبّ کا مظہر سمجھ کر پوجتے تھے۔ اس لیے یونان میں زہرہ وغیرہ ستاروں کے نام کے معبد بنے ہوئے تھے۔ پھر آگے چل کر اور بہت سی شاخیں ہو گئیں۔

ایران کے آتش پرست اور ہندوستان کے قدماء وید ماننے والے بھی اسی گروہ کی شاخ ہیں۔ پھر ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں اس مذہب نے ایک نیا رنگ بدلا اور نیا نام پیدا کیا۔ انتہیٰ کلامہ

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ
اور جب لیا ہم نے قرار تم سے اور اونچا کیا تم پر پہاڑ پکڑو جو ہم نے دیا تم کو
بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
زور سے اور یاد کرتے رہو جو اس میں ہے شاید تم کو ڈر ہو پھر تم پھر گئے اس کے بعد
ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۴﴾
سو اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا تم پر اور اس کی مہر تو تم خراب ہوتے۔

شناعت دوم (۲)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ ... الٰی ... وَ رَحْمَتُہٗ لَکُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۶۴﴾

ربط : گزشتہ آیات میں ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے اجر کا وعدہ فرمایا اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رغبت اور خوشی سے احکام خداوندی پر عمل کرنا محبین اور مخلصین کا کام ہے۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ ہے کہ جب تک ان پر تشدد اور سختی نہ کیا جائے اس وقت تک وہ عمل نہیں کرتے۔ نیز گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے جس استبدال کا ذکر تھا وہ نافرمانی کا آغاز تھا اب ان آیات میں اُن کی اُس نافرمانی کا ذکر ہے جو ان سے علانیہ طور پر ظاہر ہوئی۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ ہم کو کوئی کتاب عطاء کی جائے جس میں عبادت اور بندگی کے طریقے مذکور ہوں تو ہم ضرور اس پر عمل کریں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے توریت نازل فرمائی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ توریت کو قبول کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں۔ بنی اسرائیل نے بعض احکام شاقہ کی وجہ سے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایک پہاڑ لا کر ان کے سروں پر قدآدم اُونچا کھڑا کر دو جبرئیل نے حکم الٰہی کے مطابق پہاڑ ان کے سروں پر لا کھڑا کر دیا اور یہ کہا اگر تم تورات کو قبول نہ کرو گے تو یہ پہاڑ تم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ (معالم التنزیل)

بنی اسرائیل فوراً سجدہ میں گر گئے اور توریت پر عمل کرنے کا اقرار کیا۔ اس آیت میں حق جل شانہٗ نے اسی واقعہ کو یاد دلایا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اس وقت کو یاد کرو، جب ہم نے تم سے توریت پر عمل کرنے کا پختہ عہد لیا، اور اٹھایا تم پر کوہ طور کو تا کہ تم توریت کو قبول کرو۔ یعنی مضبوط پکڑو تم اس چیز کو جو ہم نے تم کو عطاء کی یعنی توریت اس کو مضبوطی اور قوت کے ساتھ پکڑو اور فقط ظاہر توریت پر عمل کرنے پر اکتفاء مت کرو بلکہ جو توریت میں ہے اس کو بار بار کرو اور اس کے اسرار اور فوائد میں غور اور فکر کرو شاید تم دُنیا اور آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ اور مقام تقویٰ تم کو حاصل ہو جائے۔

فائدہ: بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے بار بار اس کی درخواست کی کہ آپ اللہ سے استدعا کیجیے کہ ہم کو کوئی ایسی کتاب عطا فرمائے جو احکام الٰہیہ کی جامع ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے اس کا پختہ عہد لیا کہ جب وہ کتاب عطا ہو تو ضرور اس پر عمل کرنا اگرچہ اس کے احکام تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہوں۔ بنی اسرائیل نے اقرار کیا کہ ہم ضرور اس پر عمل کریں گے جب اللہ تعالیٰ نے توریت عطاء فرمائی تو اس کے قبول کرنے سے اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے سرتابی کی اس عہد شکنی سے باز رکھنے کے لیے کوہ طور کو ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ پہاڑ کا ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دینا ایمان لانے پر مجبور کرنے کے لیے نہ تھا اس لیے کہ ایمان تو وہ پہلے ہی سے لا چکے تھے۔ فقط نقض عہد سے روکنے کے لیے تھا جیسے مسلمانوں پر حدود اور قصاص اور تعزیرات کا قائم کرنا از قبیل اکراہ نہیں بلکہ زنا اور سرقہ اور شرب خمر، خونریزی اور رہزنی اور اس قسم کے تمام فواحش سے روکنے کے لیے ہے ہاں اگر پہاڑ کا معلق کرنا دین قبول کرنے کے لیے ہوتا تب آیت ﴿ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ﴾ کے خلاف ہوتا۔ پہاڑ کا سر پر لا کھڑا کرنا محض عہد شکنی اور بدعہدی اور ایک ناشائستہ حرکت سے روکنے کے لیے تھا نہ کہ دین قبول کرنے کے لیے۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۶۴﴾

تم نے پھر اس کے بعد بھی روگردانی کی۔ یعنی پھر تم ان تاکیدوں اور پختہ عہدوں کے بعد بھی احکام توریت سے منحرف ہو گئے پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔ تمہاری بدعہدی اور عہد شکنی کا اقتضا تو یہ تھا کہ تم کو فوراً عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا مگر اس کے فضل اور رحمت نے تم کو عذاب سے بچایا اور تم کو توبہ اور استغفار کے لیے مزید مہلت دی اور اب تک توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے لہٰذا نبی آخر الزمان ﷺ کی متابعت کی سعادت حاصل کرو اور اگر تم اس نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان نہ لائے اور کفر پر مر گئے تو پھر اس خسران اور نقصان کی تلافی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ توریت میں جو تم سے نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا جا چکا ہے، اس کو پورا کرو ورنہ تم بھی عہد شکنی کرنے والوں میں شامل سمجھے جاؤ گے اور عہد شکنی کی سزا کے مستحق ہو گے۔ آئندہ آیت میں بطور نظیر حکم شریعت سے انحراف کے دینوی زیاں اور نقصان کو بیان فرماتے ہیں کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ پہلے لوگوں نے ہفتہ کے بارہ میں توریت کے حکم سے عدول کیا اور پیغمبر کی متابعت سے انحراف کیا، سوائے مسخ اور لعنت کے کیا ملا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا
اور جان چکے ہو جنہوں نے تم میں زیادتی کی ہفتے کے دن میں تو ہم نے کہا ہو جاؤ
قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝۶۵ۚ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ
بندر پھٹکارے پھر ہم نے وہ دہشت رکھی اس شہر کے روبرو والوں کو اور پیچھے والوں کو اور
مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۶۶
نصیحت رکھی ڈر والوں کو

شناعت سوم (۳)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ ... الٰى ... وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۶۶﴾

اور البتہ تحقیق تم خوب جان چکے ہو حال ان لوگوں کا کہ جنہوں نے ہفتہ کے دن حد سے تجاوز کیا پس کہا ہم نے ان سے کہ بن جاؤ بندر ذلیل یعنی دھتکارے ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شہر دریا کے کنارہ آباد تھا جس میں بنی اسرائیل کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت تھی۔

بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے ہفتہ کے روز مچھلیاں دریا کے کنارہ پر بکثرت جمع ہو جاتیں اور ہفتہ گزرنے کے بعد یہ حالت ہوتی کہ ایک مچھلی بھی نظر نہ آتی، بنی اسرائیل نے جب یہ حالت دیکھی تو شکار کرنے کا ایک حیلہ نکالا کہ لبِ دریا چھوٹے چھوٹے حوض

بنائے اور دریا سے پانی اور مچھلیاں آنے کے لیے نالیاں بھی بنائیں ہفتہ کے روز جب وہ حوض مچھلیوں سے بھر جاتے تو وہ نالیاں بند کر دیتے اور یک شنبہ کو اُن کا شکار کرتے۔ عرصہ تک اسی طرح کرتے رہے اُسی بستی میں اُن کے علاوہ بنی اسرائیل کے اور دو فریق تھے ایک فریق ان کو اس حیلہ سے منع کرتا اور دوسرا فریق یہ سمجھ کر کہ ان کو نصیحت کرنا بے سود ہے اس لیے خاموش رہتا نصیحت کرنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو بستی کو تقسیم کر لیا اور درمیان میں ایک لمبی دیوار کھینچ لی اس طرح سے شہر دو حصوں پر منقسم ہو گیا اور آمد و رفت کے لیے درمیان میں دروازہ رکھ لیا اور ہر فریق علیحدہ رہنے لگا۔ جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت فرمائی۔ نبی کی بددُعا سے بندر بنا دیئے گئے۔ مرد بندر اور عورتیں بندریاں بنا دی گئیں۔ جب صبح ہوئی اور کوئی چلتا پھرتا نظر نہ آیا تو وہ لوگ جن کو اللہ نے اس عذاب سے محفوظ رکھا تھا آپس میں کہنے لگے کہ کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے جو بنی اسرائیل نظر نہیں آتے اور سخت متردد ہوئے جا کر دیکھا تو مکانات کے دروازے بند تھے۔ کسی طرح دروازے کھول کر اندر داخل ہوئے دیکھا سب بندر بنے ہوئے ہیں جو شخص ان کو دیکھنے آتا تو بطور توبیخ اور ملامت یہ کہتا کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو وہ کمال حسرت سے سر ہلاتا کہ بے شک تم نے منع کیا تھا۔ اور یہ لوگ آنکھوں سے پہچانے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہے اور وہ فلاں تین دن تک اسی حالت میں رہے پھر سب مر گئے یہ تمام تفصیل امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حقیقتاً بندر بنا دیئے گئے تھے۔ یعنی صورتیں اور شکلیں بندروں کی بن گئیں ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝﴾ اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں اور آثار صحابہ اور تابعین بھی اس کی شہادت دے رہے ہیں اور اسی پر تمام امت کا اجماع ہے کہ وہ لوگ حقیقتاً بندر بنا دیئے گئے تھے۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ حقیقتاً بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ اُن کے اخلاق اور عادات بندروں جیسے ہو گئے تھے تو یہ صریح خطا ہے۔ ظاہر قرآن اور ظاہر روایات اور اجماع سلف کے خلاف ہے۔ کافروں کے اخلاق تو ہر زمانہ میں بندروں سے بھی بڑھ چڑھ کر رہے اور اب تو ترقی کا دور ہے اور اس زمانہ کے کافر تو اخلاق میں بندر اور سور سے بھی بڑھ کر ہیں یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کی خصوصیت نہیں۔

فائدہ: مسخ کی تین قسمیں ہیں:

اول: مسخ حقیقی۔ یعنی حقیقت اور ماہیت کا بدل جانا جیسے گوشت کا پتھر ہو جانا جیسا کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے۔

دوسرے: مسخ صوری۔ یعنی حقیقت انسانیہ تو باقی رہے اور فقط صورت اور شکل بدل جائے جیسے اس قصہ میں ہوا کہ بنی اسرائیل کی فقط صورتیں اور شکلیں مسخ کی گئیں کہ بجائے صورت انسانی کے بندر کی صورت بنا دیئے گئے مگر حقیقت انسانی جس کے ذریعہ سے انسان ادراک اور احساس کرتا ہے وہ بحالہ باقی تھی گویائی اور بولنے کی قوت سلب کر لی گئی تھی مگر عقل باقی تھی جس کے ذریعہ سے اپنی صورت بدلنے کا ادراک کرتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ ہماری نافرمانی کی سزا ہے مسخ سے فقط اُن کی انسانی صورت زائل ہوئی اور فہم اور شعور انسانی سب باقی رہا۔ اسی لیے ﴿خٰسِـِٕيْنَ﴾ ذوی العقول کی جمع لائی گئی تا کہ ادراک انسانی کی بقاء پر دلالت کرے۔

﴿قِرَدَةً﴾ کے لفظ سے بندر کی صورت ہونا معلوم ہوا اور ﴿كُوْنُوْا﴾ کے خطاب اور ﴿خٰسِـِٕيْنَ﴾ سے عقل اور انسانی شعور کا باقی رہنا معلوم ہوا۔ اور جب ڈارون کی تحقیقات پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک بندر ترقی کر کے انسان ہو سکتا ہے تو اگر انبیاء اللہ علیہم السلام کے مقابلہ میں ترقی معکوس ہو کر انسان سے بندر بن جائے تو کیوں محال ہے حرکت کی مسافت ایک ہے حیوانیت سے انسانیت کی طرف ہو

یا انسانیت سے حیوانیت کی طرف ہو۔ حیوان کو انسان بنتا تو کسی نے دیکھا نہیں اور ہزارہا انسانوں کو بندر بنتے ہوئے لاکھوں انسانوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قرآن اور حدیث نے اس کی خبر دی۔

﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ﴾ (الکہف:۲۹)

ترجمہ: "جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔"

عطاء خراسانی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آواز دی گئی۔

یا اھل القریۃ : ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝﴾

ترجمہ: "اے بستی والو! ہو جاؤ بندر ذلیل۔"

اس کے بعد لوگ اُن کے پاس آتے اور یہ کہتے کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو سر سے اشارہ کرتے کہ بے شک۔

تیسرے۔ مسخ معنوی: یعنی صفات نفسانیہ کا بدل جانا۔ مثلاً قناعت کا حرص اور طمع سے فہم و فراست کا سفاہت و بلادت سے بدل جانا کہ پہلے قانع تھا اب حریص بن گیا۔ پہلے متواضع تھا اب متکبر ہو گیا اس کو مسخ معنوی کہتے ہیں۔ جس کو حق تعالیٰ نے ختم اور طبع کے ساتھ تعبیر کیا ہے اور آیت ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ﴾ (الجمعہ:۵) اور ﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ (الاعراف:۱۷۶) میں۔ گدھے اور کتے کی مثال سے مسخ معنوی مراد ہے۔

بنی اسرائیل کا مسخ معنوی پہلے ہو چکا تھا اس وقت تو فقط مسخ صوری ہوا کہ بجائے شکل انسانی کے بندر کی شکل بنا دیئے گئے۔ اس لیے کہ مسخ معنوی تو اُسی وقت ہو چکا تھا کہ جب انبیاء اور علماء کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ﴾ اور ﴿كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ کا مصداق بن چکے تھے۔

آئندہ آیت میں اس مسخ صوری کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے بندر بنائے گئے تا کہ نافرمانوں کو عبرت اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ نافرمانوں کو مسخ صوری ہی سے عبرت ہو سکتی ہے۔ مسخ معنوی میں تو دوسرے نافرمان بھی انہی کے شریک اور ہم پلہ ہیں۔

فائدہ: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بندر بنایا وہ تین دن سے زائد زندہ نہیں رہے اور نہ ان کی نسل چلی اور یہ بندر جو فی الحال موجود ہیں ان کی نسل سے نہیں بلکہ یہ اصل بندر ہیں۔ (ابن کثیر)

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

پس بنایا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان بستیوں کے لیے جو اس شہر کے سامنے اور پیچھے آباد تھیں اور نصیحت بنایا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے یعنی تا کہ نافرمانوں کو اس واقعہ سے عبرت ہو اور فرمانبرداروں کو نصیحت ہو۔ مثل مشہور ہے:

العبد یقرع بالعصا والحر تکفیہ الملامۃ.

ترجمہ: "غلام کو لکڑی سے تنبیہ کی جاتی ہے اور شریف کو ملامت ہی کافی ہوتی ہے۔"

ربط: اب آئندہ آیات میں ان کی روگردانی کا ایک اور واقعہ ذکر فرماتے ہیں کہ وحی الٰہی پر اطمینان نہ کیا اور معاندانہ سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ فرماتا ہے تم کو کہ ذبح کرو ایک گائے بولے

اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

کیا تو ہم کو پکڑتا ہے ٹھٹھے میں کہا پناہ اللہ کی اس سے کہ میں ہوں نادانوں میں

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کر دے ہم کو کہ وہ کیسی ہے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے

لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾

نہ بوڑھی اور نہ بن بیائی میانہ ہے ان کے بیچ اب کرو جو تم کو حکم ہے

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کر دے ہم کو کیسا ہے رنگ اس کا کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے

صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ

زرد ڈھڈھا رنگ اس کا خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو بیان کر دے

لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

ہم کو کس قسم میں ہے وہ گایوں میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم اللہ نے چاہا تو

لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ

راہ پا لیں گے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے محنت والی نہیں کہ باہتی ہو زمین کو

وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ

یا پانی دیتی ہو کھیت کو بدن سے پوری ہے داغ کچھ نہیں اس میں بولے اب لایا تو

بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾ ع ۸ ۱۰

ٹھیک بات پھر اُس کو ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ کریں گے

شناعت چہارم: معاندانہ سوالات

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ ... الٰی ... وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴾

اور یاد کرو اس وقت کو کہ بنی اسرائیل میں ایک متمول اور مالدار شخص جس کا نام عامیل کہا جاتا ہے سوائے بھتیجے کے اور کوئی اسکا وارث نہ تھا ایک مدت تک اسکے مرنے کا منتظر رہا۔ جب دیکھا کہ وہ مرتا ہی نہیں تو ایک روز موقعہ پا کر قتل کر ڈالا اور شب میں اس کی نعش کو محلہ میں لا ڈالا جب صبح ہوئی تو اہل محلہ پر خون کا دعویٰ کیا۔ تا کہ ترکہ کے علاوہ اہل محلہ سے مقتول چچا کی دیت اور خون بہا بھی وصول کرے۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں قسامت کا حکم ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل محلہ سے دریافت کیا تو اہل محلہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ واللہ نہ ہم نے قتل کیا اور نہ ہم کو قاتل کا کوئی علم ہے۔ اے نبی اللہ اور اے کلیم اللہ آپ ہی بارگاہِ خداوندی میں عرض معروض کیجیے تا کہ اس واقعہ کی حقیقت منکشف ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس وقت اللہ کی یہ وحی نازل ہوئی کہ تحقیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ تم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس گائے کا ایک ٹکڑا اس مقتول پر لگا دو تھوڑی دیر کے لیے وہ مقتول زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام اور پتہ بتلا دے گا۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ انکار کی گنجائش نہ رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر بذریعہ وحی اس کا نام بتا دیتے تو ممکن تھا کہ یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرتے اور ان کی بات کا یقین نہ کرتے اور کفر میں مبتلا ہوتے۔ اور جب ایک مردہ زندہ ہو کر خبر دے گا تو اس میں نہ تو کذب کا احتمال ہوگا اور نہ کسی کو چون و چرا کی گنجائش ہوگی۔ اس لیے کہ جو شخص ابھی عالم غیب سے آیا ہو وہ کیسے جھوٹ بول سکتا ہے نیز اس میں ایک حکمت یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھ جائیں کہ گائے اور بچھڑا جس کو بنی اسرائیل نے معبود بنا لیا تھا وہ اس قابل نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے وہ تو ذبح ہونے کے قابل ہے۔

﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ ﴾

بنی اسرائیل یہ حکم سن کر بولے کیا آپ ہم سے تمسخر کرتے ہیں۔ بھلا گائے کے ذبح کرنے اور قاتل کے معلوم ہونے میں کیا مناسبت۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ بتلاؤ اور آپ فرماتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کرو۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے اس کی کہ میں نادانوں سے ہوں۔ سوال کے مطابق جواب نہ دینا اور استہزاء اور تمسخر کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ معاذ اللہ انبیاء اللہ علیہم السلام کا کام نہیں، اور پھر وہ بھی احکام الٰہیہ میں۔

بنی اسرائیل اپنے زعم میں اس سوال کو فلسفہ سمجھے مگر حقیقت میں سراسر جہل اور سفہ تھا۔ یہ نہ سمجھا کہ احکام الٰہیہ کے اسرار سوائے مقربین بارگاہِ خداوندی کے کس کو معلوم ہو سکتے ہیں اور اسباب اور مسببات کے ارتباط اور مناسبت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ گائے کے پارچہ لگا دینے سے مردہ کا بول اُٹھنا گائے کا ذاتی اور طبعی خاصہ نہیں بلکہ قدرت الٰہیہ کا کرشمہ اور بارگاہ کلیم اللّٰہی کا معجزہ ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ ○﴾ کہنے کے بعد یہ سمجھے کہ یہ حکم تو اللہ کی طرف سے آ ہی چکا ہے جس کی تعمیل ناگزیر ہے اس لیے یہ خیال ہوا کہ جس گائے کے ذبح کا حکم ہوا ہے غالباً وہ کوئی عجیب وغریب گائے ہوگی اس لیے بار بار سوالات کیے کہ وہ کیسی گائے ہے اُس کا رنگ کیسا ہے اس کی عمر کیا ہے وغیرہ ذلک۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کسی گائے کو بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا لیکن انہوں نے تشدد کیا تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی اس لیے کہ حق تعالیٰ نے کسی

خاص اور معین گائے کے ذبح کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ میں لفظ ﴿بَقَرَةً﴾ نکرہ مستعمل ہوا ہے جس سے صاف ظاہر تھا کہ تعین مقصود نہیں بلکہ تعمیل مقصود ہے اگر تخصیص اور تعیین مطلوب ہوتی تو ﴿اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ الف لام کے ساتھ معرفہ لایا جاتا۔

آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کے تعنت آمیز سوالات کا ذکر ہے:

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝۶۸﴾

کہا انہوں نے کہ آپ اپنے پروردگار سے درخواست کیجیے کہ بیان کرے کہ وہ گائے کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے کیونکہ یہ خاصیت نہ تو متعارف گائے کی ہے نہ نیل گائے کی۔ معلوم ہوا کہ جس گائے کی یہ خاصیت ہے اس کی حقیقت ہی کچھ اور ہوگی اگرچہ نام اس کا گائے ہوگا مگر ماہیت نوعیہ اس کی بالکل جدا ہوگی۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے۔ یعنی اسی جنس کی ہے کسی دوسری جنس کی گائے نہیں اور نہ اس کی کوئی نئی حقیقت ہے اسی قسم کی ایک گائے ہے حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں البتہ سن اور عمر کے اعتبار سے کچھ فرق ہوگا وہ یہ کہ وہ نہ بوڑھی نہ جوان بلکہ متوسط اور بین بین ہو یعنی میانہ سال ہو جس کو اُدھیڑ کہتے ہیں۔ پس فوراً کر گزرو جو حکم دیئے گئے ہو۔ کوئی دشوار امر نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام تو خواب کے اشارہ پر بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے اور تم ایک گائے کے ذبح میں ہزار حجتیں کر رہے ہو۔ رہا خواص اور آثار کا پیدا ہونا سو وہ محض اللہ کے ارادہ اور مشیت پر ہے۔ حقیقت اور ماہیت کے اقتضاء پر موقوف نہیں۔ وہ جب چاہے اپنی قدرت سے یہ خواص پیدا کر سکتا ہے مگر ان کو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور مکرر سوال کیا۔

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝۶۹﴾

کہا انہوں نے کہ آپ اپنے پروردگار سے استدعاء کیجیے کہ ہمارے لیے بیان فرمائے کہ اسکا رنگ کیا ہے۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ تحقیق اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے زرد رنگ والی ہے رنگ اس کا تیز اور کھلا ہوا ہے۔ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور پھر سوال کیا۔

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝۷۰ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۱﴾

کہا انہوں نے کہ آپ دعا کیجیے اپنے رب سے کہ بیان فرمائے ہمارے لیے کہ اس گائے کی حقیقت شخصیہ کیا ہے جس کی یہ خاصیت ہے۔ اگرچہ اس کا سن اور سال رنگ اور جمال سب بتلا دیا گیا لیکن اب بھی آپ کو پورا انکشاف نہیں ہوا تحقیق گائیں ہم پر مشتبہ ہو گئیں ہیں۔ یہ اوصاف بہت سی گایوں میں پائے جا سکتے ہیں کوئی وجہ ترجیح بیان فرمایئے کہ یہ خاصیت اس گائے میں کس بناء پر ہے لہٰذا مزید توضیح کے لیے کچھ اوصاف بیان فرما دیئے جائیں۔

اور ان شاء اللہ تعالیٰ یعنی اگر خدا نے چاہا تو ہم ضرور پتہ چلا لیں گے کہ اس گائے میں یہ خاصیت عجیبہ کس بنا پر ہے۔ حدیث

شریف میں ہے کہ اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی پتہ نہ چلتا یعنی اس کلمہ کی برکت سے ان کا تحیر اور تردّد رفع ہوا۔ جب تک اپنے عجز کا اقرار واعتراف اور اس کی قدرت اور مشیت سے استعانت نہ ہو کوئی عقدہ حل نہیں ہوسکتا۔

فائدہ ①: ﴿مَا هِيَ﴾ یہ پہلے سوال کا اعادہ ہے۔ مزید توضیح اور مزید انکشاف کے لیے دوبارہ سوال کیا گیا کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے ہے محنت والی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو اور نہ پانی دیتی ہو کھیتی کو یعنی نہ ہل جوتنے کی محنت اس سے لی گئی ہو اور نہ آب پاشی کی مشقت اس پر ڈالی گئی ہو۔ بے عیب ہو اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ کہا انہوں نے کہ اب لائے آپ حق بات کو یعنی واضح اور مفصل بات آپ نے اب فرمائی جس سے ہمارا تردد رفع ہوا کہ ایسا حیوان تمام حیوانوں میں حیات کا مظہر اتم ہوگا۔ پس ممکن ہے کہ اس کی حیات کے اثر سے دوسرے میں بھی حیات کا اثر آ جائے پس ایسی گائے کو خرید کر ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ وہ کریں گے۔ اُن کے تعنت آمیز استفسارات سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ غالباً ذبح نہ کریں گے۔ مگر خیر ان نشاء اللہ کہنے کی برکت سے کر گزرے۔

فائدہ ②: بنی اسرائیل چونکہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوئے تھے اور یہ سمجھا تھا کہ معاذ اللہ یہ جانور خُدا ہوسکتا ہے تو اس کے رد کرنے کے لیے بھی گائے کے ذبح کا حکم دیا گیا۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ ﴿۷۲﴾
اور جب تم نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو۔ پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو نکالنا ہے جو تم چھپاتے تھے
فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
پھر ہم نے کہا مارو اُس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا اسی طرح جلا دے گا اللہ مردے اور دکھاتا ہے تم کو اپنے نمونے
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾
شاید تم بوجھو۔

شناعت پنجم (۵)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ ... الیٰ ... وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾﴾

اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ تم نے ایک محترم نفس کو قتل کر ڈالا پھر اس قتل کو ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا اور وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا۔ اور جن چیزوں کو تم دلوں میں چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ اُن کو اندر سے باہر نکالنے والا ہے۔ جس سے تمہارے اندرونی خطرات اور دلی خیالات اس طرح عیاں اور آشکارا ہو جائیں جیسے کسی محسوس شے کو کسی بند صندوق سے نکال کر مجمع میں لا کر سب کے سامنے رکھ دیا جائے۔ کہ سب اس کو اچھی طرح دیکھ لیں۔ پس کہا ہم نے کہ لگاؤ اس مردہ پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا زبان یا دم میت پر رکھ دو جی اٹھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مقتول فوراً زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل کا نام بتا کر گر پڑا اور مر گیا۔ قاتل کو پکڑا گیا اور قصاص

لیا گیا اور میراث سے بھی محروم رکھا گیا۔ اور اسی وقت سے یہ حکم ہو گیا کہ قاتل ہمیشہ میراث سے محروم رہے گا اگرچہ قاتل مقتول کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

فائدہ ①: مقتول کا قول مر کر زندہ ہونے کے بعد اس وجہ سے معتبر مانا گیا کہ وہ عالمِ برزخ کو دیکھ چکا ہے۔ لہٰذا اس کے قول میں اب کذب کا احتمال باقی نہیں رہا اور نہ وہم وخیال اور خطاء اور نسیان کا جیسے شجر اور حجر کا گواہی دینا نبی علیہ السلام کا معجزہ ہے اسی طرح مردہ کا زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلانا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں: کہ جس طرح اس واقعہ میں اللہ نے محض اپنی قدرت سے عدل اور قصاص جاری کرنے کے لیے عارضی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ایک خاص ضرورت اور مصلحت کے لیے ایک مردہ کو تمہارے روبرو زندہ فرمایا اور اس مردہ کا کلام تم نے اپنے کانوں سے سنا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن محض جزاء دینے اور عدل قائم کرنے کے لیے اور انصاف کے لیے دوبارہ اپنی قدرت کاملہ سے مردوں کو محض اپنی قدرت سے زندہ فرمائے گا اور سب کا انصاف کرے گا اور مظلوم کا ظالم سے قصاص اور بدلہ لے گا اور وقتاً فوقتاً اپنی قدرت کے نمونے اور کرشمے دکھلاتا رہتا ہے تا کہ تم سمجھو کہ اس قسم کے خوارق اور عجائب وقتاً فوقتاً قدرت کا انکار بے عقلوں کا کام ہے۔

امام المتکلمین عبدالکریم شہرستانی ملل ونحل میں فرماتے ہیں کہ جس طرح بیل اور گدھے انسانوں کے عجیب وغریب افعال کو بنظر استعجاب تکتے ہیں فلاسفۂ دوران اور بڑے بڑے سائنسدان، انبیاء ومرسلین کے آیات بینات اور خوارق ومعجزات کو اس سے کہیں زائد حیرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی فلسفی اور سائنسدان کا اپنی ناقص اور ہوا پرست عقل سے انبیاء ومرسلین کے معجزات کا انکار حجت ہے تو بیل اور گدھوں کا انسانی عجائب قدرت سے کیوں حجت نہیں خوب سمجھ لو کہ شعور انسانی کو شعور پیغمبری سے وہی نسبت ہے جو شعور حیوانی کو شعور انسانی سے ہے۔ عجب نہیں کہ یہ نسبت بھی نہ ہو۔ انتہی کلامہ مُشَرحًا۔

فائدہ ②: اس آیت میں جو مضمون مذکور ہے وہ قصۂ مذکورہ بالا کا ابتدائی حصہ ہے۔ اس تقدیم وتاخیر کی وجہ یہ ہے کہ اگر قصہ کو ترتیب سے بیان کیا جاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ فقط ایک واقعہ کا بیان مقصود ہے۔ ترتیب کے بدلنے سے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ اوّل اس طرف کہ حکم الٰہی کا فوراً امتثال کیوں نہیں کیا اور حکم خداوندی میں معاندانہ حجتیں کیوں نکالیں۔ ایک صریح اور واضح حکم سُن لینے کے بعد اس قسم کے گستاخانہ اور تعنّت آمیز سوالات کیوں کیے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کی کوئی عظمت اور وقعت تمہارے دلوں میں نہیں اور یہی سخت بیماری ہے جو تباہی اور بربادی کی نشانی ہے۔

اور ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا..... الآیۃ﴾ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ تم نے اموالِ دُنیا کے طمع میں ایسے محترم نفس کو قتل کیا کہ جو تمہارے لیے بمنزلہ باپ کے تھا اس لیے کہ چچا بھی بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

((عم الرجل صنو ابیه)) "انسان کا چچا اس کے باپ کی مانند ہے۔"

اور پھر اس کوشش میں پڑے کہ یہ خون دوسروں کے سر لگا دیا جائے۔

ربط: یہاں تک بنی اسرائیل کی عادات شنیعہ کا بیان فرمایا کہ ہمیشہ احکامِ خداوندی میں حیلے اور بہانے کرتے رہے۔ آئندہ آیات میں اس کا منشاء بیان فرماتے ہیں کہ منشاء اسکا قساوت قلب ہے اور اُس قساوت پر اظہارِ تعجب بھی فرماتے ہیں کہ لیل ونہار آیات قدرت اور معجزات نبوت کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو مگر پھر بھی دل نرم نہیں ہوتے کہ نصیحت قبول کریں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد سو وہ ہیں جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ

اور پتھروں میں تو وہ بھی ہیں جن سے پھوٹتی ہیں نہریں اور ان میں تو وہ بھی ہیں جو پھٹتے ہیں

فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا

اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں تو وہ بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے اور

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے

استعجاب برقساوت بعد مشاہدۂ عجائب قدرت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ... الٰى ... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾﴾

پھر تمہارے دل خدا کی ان عجیب نشانیوں کے دیکھنے کے بعد بھی سخت ہو گئے حالانکہ ہر ایک نشانی رقت قلب کے لیے ایک نسخۂ جامعہ تھی خصوصاً مقتول کا زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتلانا ایک عجیب وغریب کرشمہ تھا۔ یہ نشانی دلیل قدرت بھی تھی اور دلیل نبوت و رسالت بھی تھی اور دلیل قیامت بھی تھی مگر پھر بھی دل نرم نہ ہوئے پس وہ مثل پتھروں کے سخت ہیں یا سختی میں پتھروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ تشبیہ اور تمثیل میں لوہے اور تانبے کا اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ لوہا اور تانبا آگ پر رکھنے سے پگھل جاتا ہے مگر ان کے دل اس قدر سخت ہیں کہ تخویف اور ترہیب کی آگ سے بھی نہیں پگھلتے پتھر کی طرح ہیں کہ جو کسی حال میں بھی نرم نہیں ہوتا یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں اس لیے کہ بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں اگرچہ اُن سے نہریں تو نہیں جاری ہو جاتیں لیکن پھٹ جاتے ہیں پھر اُن سے پانی آہستہ آہستہ نکلتا رہتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح بعض قلوب ایسے ہیں کہ جن سے علوم ومعارف کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں کہ جن سے دنیا سیراب ہوتی ہے۔ یہ علماء راسخین اور ائمہ ہادین کی شان ہے کہ جن کے کلمات طیّبات نے مردہ دلوں کے حق میں آب حیات کا کام دیا۔ اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ ان سے نہریں تو نہیں مگر علم وحکمت کے چشمے رواں ہو گئے اور لاکھوں اور ہزاروں کو اُن سے نفع ہوا۔ یہ علماء ربانیین کی شان ہے اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ اللہ کی عظمت اور جلال کے سامنے پست ہیں۔ تکبّر اور غرور سے پاک ہیں کبھی اسکے حکم کے خلاف سر نہیں اٹھاتے یہ عُبّاد اور زُہاد کی شان ہے۔ مگر ان کافروں کے دل پتھر سے بھی زائد سخت ہو گئے ہیں کہ غرور اور تکبّر عناد اور سرکشی سے کبھی حق کے سامنے جھکتے بھی نہیں

اللہ کی ہدایت کو قبول کرنا تو درکنار اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

بعض سلف سے منقول ہے کہ ﴿وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو خوف خداوندی سے بکثرت روتے ہیں اور ﴿وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو کم روتے ہیں اور ﴿وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دل سے تو روتے ہیں مگر آنکھوں سے آنسوں جاری نہیں ہوتے۔ ہم سب کو اللہ سے یہ دُعا مانگنی چاہیے۔

عیش و عشرت سے دو عالم کے نہیں مطلب مجھے
چشم گریاں سینہ بریاں کر عطا یا رب مجھے (آمین)

فائدہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سوائے اللہ کے ذکر کے اور کثرت سے کلام نہ کیا کرو اس لیے کہ زیادہ کلام کرنا قلب میں قساوت (سختی) پیدا کرتا ہے اور سخت دل ہی خُدا سے سب سے زائد دُور ہے۔ (ترمذی)

اس مقام پر بھی بنی اسرائیل کی جس قساوت کا ذکر ہے وہ بھی اسی سبب یعنی کثرت کلام کی وجہ سے ہے کہ جب گائے کے ذبح کا حکم ہوا تو معاندانہ سوالات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ان بیہودہ سوالات کا یہ نتیجہ نکلا کہ دل پتھر سے بھی زائد سخت ہو گئے۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں: کہ اے بنی اسرائیل اگرچہ تم اپنی قساوت قلبی کی وجہ سے خدا سے غافل ہو گئے ہو مگر خوب سمجھ لو۔ ﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ کہ اللہ تمہارے اعمال و افعال سے غافل اور بے خبر نہیں۔

قساوت قلبی کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ خدا سے غافل بناتی ہے اس لیے حدیث میں آیا ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَ الْغَفْلَةِ)) **ترجمہ:** "اے اللہ! میں دل کی سختی اور غفلت سے پناہ مانگتا ہوں۔"

ایک شبہ: پتھروں میں تو فہم اور ادراک ہی نہیں پھر خدا کے خوف سے پتھروں کے گرنے کا کیا مطلب؟

جواب: اہلسنت والجماعت کے نزدیک حیوانات اور جمادات میں بھی روح اور حیات ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا شعور اور ادراک ہے جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے جیسا کہ امام قرطبی اور علامہ بغوی اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں جا بجا حیوانات اور جمادات کی تسبیح و تحمید اور صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ① ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾ (بنی اسرائیل: ۴۴)

ترجمہ: "ساتوں آسمان اور زمین اور اُن میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔"

② ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ﴾ (النور: ۴۱)

ترجمہ: "ہر شے کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے۔"

③ ﴿وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝﴾ (الرحمٰن: ۶)

ترجمہ: "گھاس اور درخت اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔"

④ ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدہ :۲۱)

ترجمہ: "کفار قیامت کے دن اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی۔ وہ جواب میں کہیں گی کہ ہم کو اس خدا نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے۔"

⑤ ﴿يَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝﴾ (الزلزال)

ترجمہ: "اُس روز بیان کرے گی (زمین) اپنی خبریں اس وجہ سے کہ اس کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہوگا۔"

اور اسی طرح اشجار و احجار حیوانات و جمادات کا انبیاء و مرسلین کی اطاعت اور فرمانبرداری اور اُن سے کلام کرنا احادیث صحیحہ اور متواترہ سے ثابت ہے۔

① ستونِ حنانہ کا واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری میں مذکور ہے جس میں کسی مؤوّل متفلسف کو تاویل کی ذرہ برابر گنجائش نہیں۔ عارف رومی فرماتے ہیں:

اُستُنِ حنّانہ از ہجرِ رسول — نالہ میزد ہمچو ارباب عقول
فلسفی کو منکر حنّانہ است — از حواسِ انبیاء بے گانہ است

② صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جبلِ اُحد کو دیکھ کر یہ فرمایا: ((هذا جبل يحبنا و نحبه)) یہ پہاڑ ہم کو محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں اور محبت بدون معرفت اور ادراک کے ممکن نہیں۔

③ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "میں اب بھی اس پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جو نبوت سے پیشتر مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔"

④ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم جبل اُحد یا حراء پر چڑھے تو پہاڑ کو جنبش ہوئی تو آنحضرتؐ نے اپنا قدم مبارک پہاڑ پر مارا اور یہ فرمایا: کہ اے پہاڑ ٹھہر۔ تجھ پر ایک نبی ہے اور ایک صدیق اور دو شہید۔

⑤ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ ہم جب کبھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ سے باہر جاتے تو جس درخت یا پہاڑ پر گزر ہوتا تو یہ آواز آئی۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰه. (اخرجہ البغوی باسنادہ فی المعالم)

اس قسم کے اور صدہا واقعات ہیں جو کتب حدیث اور سیر میں مذکور ہیں۔ بطور نمونہ ہم نے چند واقعات ذکر کر دیتے ہیں۔

عارف رومی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

بادو خاک و آب و آتش بندہ اند — بامن و تو مردہ باحق زندہ اند
آب و باد و خاک و نار پر شرر — بے خبر با ما و باحق باخبر
ما بعکس آن ذغیر حق خبیر — بیخبر از حق و از چندیں نظیر
پیش تو آن سنگریزہ ساکت ست — پیش احمد او فصیح و ناطق است
پیش تو استونِ مسجد مردہ است — پیش احمد عاشقِ دل بردہ است
جملہ اجزائے جہاں پیش عوام — مردہ و پیش خدا دانا ورام
مردہ زیں سویند روز انسو زندہ اند — خامش اینجا وانطرف گویندہ اند

اور اسی پر تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع ہے کہ جمادات میں ایک روح مجرد ہے جو حق تعالیٰ شانہٗ کو پہچانتی ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل کرتی ہے ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے بے تعلق اور بے خبر ہونا عقلاً ممکن بلکہ واقع ہے۔

لیکن مخلوق کا خالق سے بے تعلق ہونا عقلاً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ عارف رومی فرماتے ہیں

ع بے تعلق نیست مخلوقے ازو

اور بے شمار آیات اور احادیث اس کی شاہد ہیں جو اہل علم پر مخفی نہیں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ
اب کیا تم مسلمان توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ایک لوگ تھے اُن میں کہ سنتے تھے
كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾
کلام اللہ کا پھر اس کو بدل ڈالتے بوجھ لے کر اور ان کو معلوم ہے۔

شناعت ششم (۶)

متضمن بدفع کلفت ناصحین مشفقین از انتظار و طمع ایمان معاندین

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ ... الیٰ ... وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾﴾

گزشتہ آیات میں یہود کی قساوت کو بیان فرمایا۔ اب اُن مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ جو از راہِ شفقت ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ یہ کسی طرح ایمان لے آئیں مسلمانوں کو گمان یہ تھا کہ یہود توحید اور انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت کے قائل ہیں شاید یہ لوگ ایمان لے آئیں اللہ تعالیٰ نے ان کی اُمید قطع کرنے کے لیے فرمایا کہ ان کی قساوت انتہاء کو پہنچ چکی ان سے ایمان کی طمع مت رکھو۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾﴾

اے مسلمانو! کیا تم بنی اسرائیل کی اس شدید قساوت کے بعد بھی توقع رکھتے ہو کہ وہ شخص تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے۔ حالانکہ ان میں کا ایک فرقہ بلا واسطہ اللہ کے کلام کو سنتا تھا۔ اور پھر خوب سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف و تبدیل کر ڈالتا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اللہ کے کلام میں تحریف کر رہے ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ کلام خداوندی میں تحریف کرنا کس قدر جرم عظیم ہے۔ اس فریق سے وہ ستر لوگ مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر گئے اور بلا واسطہ اللہ کے کلام اور اس کے اوامر و نواہی اور احکام کو سنا۔

جب واپس آئے تو یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرما دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو کرنا اور نہ ہو سکے تو نہ کرنا۔ کلام الٰہی میں سے کچھ گھٹانا یا اپنی جانب سے کچھ اضافہ کر دینا اسی کا نام تحریف ہے۔ پس ان لوگوں نے کلام الٰہی میں اپنی طرف سے حروف اور الفاظ کا اضافہ کیا اور ایجاب اور لزوم کو تخییر سے بدل ڈالا۔

اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ سے توریت مراد ہے اور ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ سے بواسطہ انبیاء کرام سننا مراد ہے۔ اور تحریف سے آیات توریت میں لفظی اور معنوی تحریف کرنا مراد ہے۔ مثلاً توریت میں جو آپ کا حلیہ مبارک مذکور تھا اس میں ابیض کے بجائے آدم بنا دیا اور ربعة مائلا الے الطول کے بجائے طوالا بنا دیا اور بہت سی جگہ تاویل فاسد کر کے معنی میں تحریف کی اور پہلی تفسیر پر ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ سے ستر آدمیوں کا اللہ کے کلام کو بلا واسطہ سننا مراد تھا اور تحریف سے یہ مراد تھی کہ ان ستر آدمیوں نے جب قوم سے جا کر اللہ کا کلام نقل کیا تو اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ:

((ان استطعتم ان تفعلوا هٰذه الا شياء فافعلوا وَان لم تفعلو ا فلا بأس)).

ترجمہ: "یعنی یہ چیزیں اگر تم سے ہو سکیں تو کر لینا اور اگر نہ کرو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

فائدہ: جاننا چاہیے کہ توریت میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے اور معنوی تحریف بھی۔ اور یہی علماء محققین کا مسلک ہے۔ اور اصل تحریف تو تحریف لفظی ہے اس لیے کہ تحریف کے معنی حروف اور الفاظ کے بدل ڈالنے کے ہیں اور تاویل فاسد کر کے معنی کو بدل ڈالنا مجازاً اس کو تحریف کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں جہاں کہیں توریت کی تحریف کا ذکر آیا ہے اس سے تحریف لفظی ہی مراد ہے کیونکہ تحریف معنوی تو قرآن میں بھی ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اور حق جل شانہٗ کا یہ ارشاد:

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ اور ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ﴾

اس قسم کی آیتیں صراحتاً تحریف لفظی پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر ابن جریر اور تفسیر در منثور میں ان آیات کے شان نزول سے صاف ظاہر ہے۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ
اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب اکیلے ہوتے ہیں ایک دوسرے پاس
قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ
کہتے ہیں تم کیوں کہدیتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر کہ جھٹلاویں تم کو اس سے تمہارے ربّ کے آگے
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾
کیا تم کو عقل نہیں

شناعت ہفتم (۷)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ ... الیٰ ... عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۷۶﴾

اور جب منافقین یہود مسلمانوں سے ملتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تصدیق کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی رسول اور پیغمبر ہیں جن کی بشارتیں توریت میں مذکور ہیں اور جب تنہا ایک دوسرے کے پاس ہوتے ہیں تمام مجمع میں ان کے سوا مسلمانوں میں سے کوئی نہیں ہوتا تو پھر علماء یہود جو اعلانیہ طور پر کافر ہیں وہ ان منافقین سے یہ کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں سے خوشامد میں وہ چیزیں کہہ ڈالتے ہو جو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں۔ اور وہ خزائن علمیہ جو توریت اور زبور اور دیگر صحف انبیاء علیہم السلام میں مخزون ہیں کہ جن میں نبی کریم ﷺ اور آپ کی امامت کے اوصاف اور آپ کے اتباع اور اطاعت کی تاکید اکید مذکور ہے تم مسلمانوں کو ان خزائن علمیہ کا کیوں پتہ دیتے ہو۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ اس اقرار اور اعتراف کی وجہ سے مسلمان خدا کے نزدیک تم سے حجت کرینگے اور تم کو ملزم ٹھہرائیں گے کہ باوجود اس اعتراف واقرار کے پھر بھی ایمان نہ لائے کیا تم اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے کہ:

((الانسان ماخوذ باقرارہ)). ترجمہ: "یعنی انسان اپنے اقرار میں پکڑا جاتا ہے۔"

یعنی تمہارا زبان سے اقرار کرنا اور پھر نہ ایمان لانا قیامت کے دن یہ زیادہ رسوائی کا باعث ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص زبان سے اقرار یا دستاویز لکھ دینے کے بعد حاکم کے سامنے انکار کرے تو زیادہ رسوائی ہے اور اگر حاکم کو معلوم ہو اور گواہ بھی موجود ہوں مگر اس شخص نے اقرار نہ کیا ہو تو حاکم کے سامنے انکار کرنے سے رسوا تو ضرور ہوگا مگر اتنی رسوائی نہ ہوگی جتنی کہ اقرار کے بعد ہوتی۔

اَوَ لَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۝۷۷
کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو چھپاتے ہیں اور جو کھولتے ہیں

تحمیق یہود بے بہبود

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اَوَ لَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ ... الیٰ ... وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۝۷۷﴾

یعنی کیا ان کو یہ گمان ہے کہ اس چھپانے سے اللہ کے نزدیک ان پر کوئی حجت قائم نہ ہوگی اور کیا ان کی یہ ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویزیں (یعنی توریت اور زبور کی وہ آیتیں جس میں نبی کریم ﷺ کی صریح صریح بشارتیں مذکور ہیں۔) خداوند ذوالجلال کو قیامت کے دن بہم نہ پہنچ سکیں گی۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو خوب جانتا ہے جنکو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ جو جلوت میں آپ کی نبوت ورسالت کا اقرار کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے اور جو خلوت میں اعتراف کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے۔ خلوت کا اقرار اگرچہ مسلمانوں کی نظر سے مخفی ہے مگر ہماری نظر سے تو مخفی اور پوشیدہ نہیں ہوسکتا۔ تم نے اگرچہ بندوں کے سامنے اقرار نہ کیا مگر اس خداوند ذوالجلال کے سامنے تو اقرار کرلیا جو کہ ہر جلوت اور خلوت غیب اور شہادت کا حاضر وناظر ہے۔ یہ احمق اتنا نہیں

سمجھتے کہ اصل معاملہ تو خدا کے ساتھ ہے جس کے یہاں ظاہر و باطن سرّ اور عَلَن جلی اور خفی سب یکساں ہے۔

تنبیہ : توریت اور انجیل کی تحریف کے متعلق حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''اعجاز عیسوی'' ملاحظہ فرمائیں جو اس باب میں بے نظیر ہے۔

رسالہ موصوفہ میں اس امر کو نہایت بسط و شرح سے ثابت فرمایا ہے کہ توریت اور انجیل میں ہر قسم کی تحریف ہوئی ہے لفظی بھی اور معنوی بھی۔ کمی اور بیشی زیادتی اور نقصان۔ تغیر اور تبدیل غرض یہ کہ تحریف کی کوئی نوع ایسی نہیں کہ جس سے توریت و انجیل خالی ہو۔

یہ رسالہ اُردو زبان میں ہے۔ مولانا موصوف کی دوسری کتاب اظہار الحق جو عربی زبان میں ہے اس میں بھی تحریف توریت و انجیل کی کافی اور شافی تحقیق فرمائی۔ اور بہت سے علماء یہود نصاریٰ بھی تحریف لفظی کے مقر اور معترف ہیں۔ حضرات اہل علم اس کی مراجعت فرمائیں۔

ربط : ان آیات میں یہود کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں ان کے ناخواندوں کا ذکر کرتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

اور ایک ان میں اَن پڑھے ہیں خبر نہیں رکھتے کتاب کی مگر باندھ لی اپنی آرزوئیں اور ان پاس نہیں مگر اپنے خیال

شناعت ہشتم (۸)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾﴾

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا

سو خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر کہتے ہیں یہ

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ

اللہ کے پاس سے ہے کہ لیویں اس پر مول تھوڑا سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھ کے لکھے

اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

سے اور خرابی ہے ان کو اپنی کمائی سے

شناعت نہم (۹)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ... الیٰ ... وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾

اور بعض ان میں سے ناخواندہ اور ان پڑھ ہیں۔ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ویسے ہی ہیں۔ اسی وجہ سے ان پڑھ کو اُمی کہتے ہیں کہ اس کو صرف اُم یعنی ماں سے نسبت ہے۔ باپ سے لکھنا اور پڑھنا کچھ نہیں سیکھا۔ کتاب کو جانتے ہی نہیں نہ الفاظ سے واقف نہ معنی سے آگاہ۔ سوائے آرزوؤں کے کچھ معلوم نہیں کہ جو تحریف کرنے والوں نے ان کی خواہش کے مطابق ان کے دلوں میں بٹھلا دی ہے۔ مثلاً:

﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾

ترجمہ: "کہ جنت میں سوائے یہود یا نصاریٰ کے اور کوئی نہ جائے گا۔"

اور اگر بالفرض جہنم میں گئے بھی تو ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ یعنی صرف چند روز جہنم میں رہیں گے یہ آرزوئیں ان جاہلوں کے علماء سوء نے ان کے دل خوش کرنے کے لیے دل نشین کر دی ہیں جس پر کوئی دلیل نہیں اور نہیں ہیں یہ لوگ مگر محض گمان اور خیال کی پیروی کرنے والے۔ خود بھی ان کو اس کا یقین نہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اس لیے ان کو بہ نسبت علماء کے کم عذاب ہوگا ان پر عذاب فقط اپنی گمراہی کا ہوگا اور علماء پر اپنے گمراہ ہونے اور دوسرے کے گمراہ کرنے کا بھی عذاب ہوگا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے پس خرابی اور بربادی ہے ان لوگوں کے لیے کہ جو کتاب کو خود اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا لکھا ہوا اللہ ہی کی طرف سے ہے خوب جانتے ہیں کہ یہ تحریف ہے نادان اور بے خبر نہیں اس لیے کہ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

یہ محض اس لیے کرتے ہیں تا کہ اپنے رؤسا اور عوام سے اس ذریعہ سے کچھ قلیل معاوضہ حاصل کریں پس ایسے لوگوں کے لیے دو وجہ سے عذاب ہے ایک عذاب اس وجہ سے کہ ان کے ہاتھوں نے تحریف کی کتابت کی ہے اور دوسرا عذاب اس وجہ سے کہ اس تحریف کے ذریعہ سے لوگوں سے روپیہ کماتے ہیں۔ اوّل تو لوگوں کے خوش کرنے کے لیے کتاب الٰہی میں تحریف کی اور پھر چند پیسوں کی طمع میں آخرت کے اجر عظیم کو برباد کیا۔ ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ سے دراھم معدودہ مراد نہیں بلکہ مال کثیر مراد ہے اس لیے کہ اگر بالفرض حق اور ہدایت کی قیمت لگائی جائے تو روئے زمین کے خزانے اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ
اور کہتے ہیں ہم کو آگ نہ لگے گی مگر کئی دن گنتی کے تو کہہ کیا لے چکے ہو
عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا
اللہ کے ہاں سے اقرار تو البتہ خلاف نہ کریگا اللہ اپنا اقرار یا جوڑتے ہو اللہ پر
لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ
جو معلوم نہیں رکھتے کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

سو وہی ہیں لوگ دوزخ کے وہ اسی میں رہ پڑے اور جو یقین لائے اور

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۹/۱۱/۹

عمل کیے نیک وہ لوگ ہیں جنت کے وہ اسی میں رہ پڑے۔

شناعت دہم (۱۰)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ ... الٰى ... هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

اور یہود یہ بھی کہتے ہیں کہ دوزخ ہم کو ہرگز نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے۔ آپ کہہ دیجیے کہ کیا تم نے اللہ سے اس بارہ میں کوئی عہد لیا ہے۔ کہ تم کو فقط اس قدر مدت عذاب ہوگا۔ اس لیے کہ عذاب کی مدت دلیل عقلی سے معلوم نہیں ہوسکتی اس کے لیے دلیل سمعی چاہیے ایسا عقیدہ بغیر عہد خداوندی کے نہیں ہوسکتا تو بتلاؤ کہ کیا خدا نے تم سے کوئی ایسا عہد کیا ہے کہ اللہ اپنے اس عہد کے ہرگز خلاف نہ کریگا۔ یا اللہ پر افتراء کرتے ہو، بے سند باتیں جن کی سند تم کو معلوم نہیں اور خود اپنی طرف سے ایسی من گھڑت باتیں کرتے ہو بتلاؤ کس کتاب میں اللہ نے یہ حکم نازل کیا ہے۔ آئندہ آیت میں حق جل شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں: کہ یہود کا یہ عقیدہ کہ ہم جہنم میں صرف چند روز رہیں گے بالکل غلط ہے۔ جنت میں داخل ہونا اللہ اور پیغمبر آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے پر موقوف ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

کیوں نہیں تم جیسے پیغمبر آخر الزمان ﷺ سے سرکشی کرنے والے ضرور جہنم میں جائیں گے۔ اس لیے کہ جس شخص نے بھی گناہ کو کمایا اور گناہوں نے اس کا ہر طرف سے احاطہ کرلیا۔ اور کوئی جانب گناہ سے خالی نہیں رہی۔ جدھر دیکھے گناہ ہی گناہ ہے نیکی کا نام ونشان نہیں۔ گناہوں نے ہر طرف سے ایسا گھیرا کہ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہی پس ایسے ہی لوگ دوزخ کے ہمیشہ کے ساتھی ہیں۔ یہ دوزخ سے جدا نہ ہوں گے اور دوزخ ان سے جدا نہ ہوگی ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے یعنی ابدالآباد تک اسی میں رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور اُن کے دل نور ایمان سے منور اور روشن ہوئے اور نیک عمل کیے جس سے اعضا اور جوارح روشن ہوئے ایسے لوگ جنت کے ساتھی ہیں کہ یہ جنت سے علیحدہ نہ ہوں گے اور جنت ان سے علیحدہ نہ ہوگی۔ ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے۔ کبھی جنت سے نہ نکلیں گے۔

فائدہ ① : احاطہ کی جو تفسیر بیان کی گئی وہ کافر ہی پر صادق آسکتی ہے کہ کافر دولت ایمان سے تہی دست ہونے کی وجہ سے فقیر اور گدائے بے نوا ہے۔ اعمال صالحہ اگر کچھ ہیں تو وہ نہ ایمان لانے کی وجہ سے سب بیکار ہیں۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۠ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾﴾ (المائدہ)

ترجمہ: "اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے یعنی ایمان کے بعد مرتد ہو جائے تو اس شخص کے تمام اعمال غارت اور برباد ہوئے۔ اور وہ شخص آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا۔"

اور جو شخص ایمان نہیں لایا خواہ وہ کتنے ہی صدقات اور خیرات کرے اُس کے صدقات و خیرات کو اعمال صالحہ نہ سمجھنا چاہیے بلکہ ان اعمال کو شیر قالین کی طرح اعمال صالحہ کی ہم شکل اور ہم صورت سمجھنا چاہیے حقیقتاً اعمال صالحہ نہیں۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ (النور:۳۹)

ترجمہ: "اور کافروں کے اعمال سراب کی طرح بے حقیقت ہیں۔ دیکھنے والا ان کو پانی کی طرح اعمال صالحہ سمجھتا ہے اور حقیقت کچھ بھی نہیں۔"

خلاصہ یہ کہ جس کے پاس ایمان نہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ گناہوں میں ہر طرف سے گھرا ہوا ہے بخلاف مؤمن کے کہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو۔ گناہوں میں گھرا ہوا نہیں بالفرض کوئی عمل صالح اس کا معین اور مددگار نہ ہو تو ایمان تو ضرور اس کا نگہبان اور پاسبان بنا ہوا ہے۔ جو شیطان کے قاتلانہ وار کو روکے ہوئے ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ گناہ کے گھیر لینے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا۔ اھ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حال کافر ہی کا ہو سکتا ہے۔ مومن کا نہیں ہو سکتا۔

فائدہ ②: اہلسنت والجماعت کے نزدیک جو فریق ایمان لایا اور اعمال صالحہ بھی کئے اس کا ثواب دائمی اور غیر متناہی ہے اور جو فریق نہ ایمان لایا اور نہ اعمال صالحہ کئے اس کا عذاب دائمی اور غیر متناہی ہے۔ فریق اوّل میں ایمان اور عمل صالح دونوں موجود ہیں اور فریق ثانی میں دونوں نہیں۔ اس لیے فریق اول کا ثواب دائمی ہے اور فریق ثانی کا عذاب دائمی ہے۔ اور جو فریق ایمان تو لایا مگر اعمال صالحہ نہیں کیے اس کی جزا ثواب اور عقاب سے مرکب اور ملی جلی ہے، لیکن اوّل عذاب دیں گے اور بعد میں بہشت میں داخل کریں گے۔ بہشت میں داخل کر کے پھر بہشت سے نکالنا اور دوزخ میں ڈالنا خلاف حکمت ہے۔ عزت دینے کے بعد ذلت کے گڑھے میں ڈالنا لطف اور عنایت کے خلاف ہے۔ یہ تین احتمال ہوئے۔ چوتھا احتمال یہ ہے کہ اعمال صالحہ تو ہوں مگر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ صورت شرعاً محال ہے اس لیے کہ شریعت میں کوئی عمل صالح بدون ایمان کے معتبر نہیں۔ ہر عمل صالح کے لیے ایمان شرط ہے۔

((وَاِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ)).

ترجمہ: "جب شرط فوت ہوئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔"

اسی وجہ سے کفار کے صدقات کو صرف صورۃً اعمال صالحہ کہا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت میں اعمال صالحہ نہیں۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ (النور:۳۹)

ترجمہ: "کافروں کے اعمال سراب کی مانند ہیں کہ دور سے پیاسا ان کو پانی گمان کرتا ہے۔"

جس طرح لکڑی کا گھوڑا اور شیر قالین اصلی گھوڑے اور اصلی شیر کی صورت میں مشابہ ہے اسی طرح کافر کا عمل ظاہر صورت میں عمل صالح کے مشابہ ہوتا ہے مگر حقیقۃ میں نیک نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ عمل صالح کی روح ایمان ہے اور وہ موجود نہیں۔

فائدہ ③: ہر شریعت میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ کافر مخلد فی النار ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ اور ابدالآباد تک جہنم میں رہے گا۔ اور مؤمن عاصی چند

روز دوزخ میں عذاب پا کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ (النساء:۴۸)

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جاوے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے۔"

اور یہود جو یہ روایت کرتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد کیا کہ تمہاری اولاد کو عذاب نہ دوں گا مگر تحلۃً للقسم یعنی محض قسم پورا کرنے کے لیے یا یہ فرمایا کہ فقط چند روز کے لیے جہنم میں رہیں گے۔ یہ روایت بالفرض اگر صحیح ہو تو اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے صلبی بیٹے مراد ہیں جنہوں نے یوسف علیہ السلام سے اپنا قصور معاف کرایا اور بارگاہِ خداوندی میں بہ ہزار عجز و نیاز توبہ اور استغفار کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ یہ تائبین جہنم میں نہیں جائیں گے اور ان کی اولاد میں سے جو چند روز کے لیے جہنم میں جائے گا اس سے مومن عاصی مراد ہے جیسا کہ تمام شریعتوں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص مومن ہو اور گناہ گار ہو اس پر دائمی عذاب نہیں۔

بنی اسرائیل یہ سمجھے کہ یہ حکم ذاتی طور پر ہمارے لیے مخصوص ہے اس لیے ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۚ﴾ کا دعویٰ کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ فرمایا کہ یہ حکم بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو دین حق کا اتباع کرے اس کا یہی حکم ہے گزشتہ زمانہ میں چونکہ بنی اسرائیل ملت حقہ اور دین حق کے متبع تھے۔ اگرچہ گناہوں اور خطاؤں میں ملوث تھے اس لیے یہ حکم تھا کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کی طرح ہمیشہ جہنم میں نہ رہیں گے بلکہ صرف چند روز کے لیے جہنم میں جائیں گے جیسا کہ مؤمن عاصی کا حکم ہے اور اب وہ صورت باقی نہیں رہی اس وقت تم دین حق اور نبی برحق کے اتباع سے انحراف کئے ہوئے ہو۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر ہو اور نبی کی نبوت کا انکار کفر ہے۔ اس لیے تمہارا عذاب دائمی ہوگا۔ جیسا کہ کافر کا تمام شریعتوں میں یہی حکم ہے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہے گا۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫ وَ
اور جب ہم نے لیا اقرار بنی اسرائیل کا بندگی نہ کرو مگر اللہ کی اور
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا
ماں باپ سے سلوک نیک اور قرابت والے سے اور یتیموں سے اور محتاجوں سے اور کہو
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا
لوگوں سے نیک بات اور کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ پھر تم پھر گئے مگر
قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾
تھوڑے تم میں اور تم کو دھیان نہیں

شناعت یازدہم (۱۱)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ... الیٰ ... وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں یہود کے اس زعم فاسد کا کہ ہم کو سوائے چند گنتی کے دنوں کے دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں اور فرمایا کہ یہ خیال خام ہے۔ نجات کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ خاندانِ نبوت سے تعلق پر نہیں۔ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے خواہ وہ کسی خاندان اور کسی قوم کا ہو اس کی نجات ہوگی اور جو کفر کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا۔ جیسے نوح علیہ السلام کا بیٹا۔ یہ آخرت کا معاملہ ہے۔

ع کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

علاوہ ازیں تمہاری عہد شکنیوں کا مقتضیٰ بھی اس کے خلاف ہے کہ تم کو صرف چند روزہ عذاب دیا جائے جس قوم نے خدا تعالیٰ سے پختہ عہد اور پیمان کر کے توڑے ہوں اس قوم کو چند روز عذاب دیکر چھوڑ دینا خلاف حکمت ہے۔ خصوصاً جب کہ عہد شکنی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو اور نیت بھی یہ ہو کہ ہمیشہ ان گناہوں پر قائم رہیں گے۔ اس لیے آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں کا ذکر فرماتے ہیں: اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے توریت میں بنی اسرائیل سے چند باتوں کا پختہ عہد لیا۔ اوّل یہ کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہیں کرو گے۔ دوم یہ کہ والدین کے ساتھ خاص احسان کرو گے جو احسان کی تمام انواع واقسام کو شامل ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں: ① ترک ایذاء ② خدمت مالی ③ خدمت بدنی۔ سوم اہل قرابت کے ساتھ حسب قرابت احسان کرنا۔ اور چہارم یتیموں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا۔ اور پنجم عام غرباء اور محتاجوں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اور ششم یہ کہ تمام لوگوں کے ساتھ خواہ مومن ہوں یا کافر اچھی طرح اور نرمی سے بات کرنا۔ حسن خلق اور مداراۃ میں کسی کی تخصیص نہیں اور ہفتم یہ کہ نماز کو قائم رکھنا اور ہشتم یہ کہ زکوٰۃ ادا کرتے رہنا۔ یہ وہ عہد تھے جو تم سے لیے گئے پھر تم نے ان مضبوط اور محکم عہدوں سے روگردانی کی۔ مگر تم میں کے بہت ہی تھوڑے افراد ان عہدوں پر قائم رہے اور تم احکام خداوندی سے اعراض اور انحراف کے عادی اور خوگر ہی ہو گئے ہو اور یہ اعراض تمہاری عادت ثانیہ بن گئی ہے۔ اور پھر اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے محب اور محبوب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں چند روز رکھنے کا تو تم سے کوئی عہد نہیں کیا تھا۔ البتہ تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ احسان کرنا اور یتیموں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنا اور لوگوں کے ساتھ عمدہ اخلاق سے پیش آنا مگر تم نے یہ عہد بھی توڑ ڈالا اور بہت ہی قلیل لوگ تم میں سے اس عہد پر قائم رہے مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

فائدہ ①: والدین کی تربیت تربیتِ خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔ ① والدین عالم اسباب میں اس کے وجود کے ایک ظاہری سبب ہیں۔ ② ماں باپ اولاد کے ساتھ جو کچھ احسان کرتے ہیں وہ کسی غرض اور عوض کے لیے نہیں۔ ③ اولاد کی تربیت سے ماں باپ کسی وقت ملول نہیں ہوتے۔ ④ اولاد کے لیے جو کمال ممکن ہو والدین دل وجان سے اس کی آرزو کرتے ہیں۔ ⑤ اولاد کی ترقی اور عروج پر کبھی حسد نہیں کرتے ہمیشہ اپنے سے زیادہ اولاد کو ترقی اور عروج پر دیکھنے کے خواہش مند اور آرزومند رہتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد تعظیم والدین کا حکم دیا اور انہی وجوہ کی بناء پر والدین کی تعظیم تمام شریعتوں میں واجب رہی اور چونکہ یہ حق محض ماں باپ ہونے کی وجہ سے ہے اس لیے ﴿وَ بِالْوَالِدَیْنِ﴾ میں ایمان کی قید نہیں لگائی گئی۔ اشارہ اس طرف ہے کہ والدین کی تعظیم والدین

ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں واجب اور لازم ہے۔ والدین خواہ کافر و فاجر ہوں یا منافق و فاسق ہوں۔ اسی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام نے آذر کی دعوت و تلقین میں ہمیشہ تلطف اور نرمی کو ملحوظ رکھا۔ جیسا کہ سورۂ مریم میں مفصل قصہ مذکور ہے۔ اور قرآن اور حدیث میں جا بجا کافر اور مشرک ماں باپ کے ساتھ بھی سلوک اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ ② : محتاج تو یتیم اور مسکین دونوں ہی ہیں۔ مگر یتیم کم سن ہونے کی وجہ سے کمانے کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے یتیم کو مسکین پر مقدم فرمایا۔

فائدہ ③ : مالی سلوک اور احسان زیادہ تر اقارب کے ساتھ ہوتا ہے مالی احسان ہر ایک کے ساتھ ممکن نہیں اس لیے ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ میں اجانب کے ساتھ قولی احسان کا ذکر فرمایا اس لیے کہ تواضع اور حسنِ خلق کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ ممکن ہے۔

فائدہ ④ : دعوت اور تذکیر یعنی وعظ و نصیحت کے موقعہ پر نرمی اور ملاطفت معہود ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝﴾ (طٰہٰ) وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل:۱۲۵) وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ﴾ (آل عمران:۱۵۹) وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (حٰمٓ السجدہ:۳۴) غرض یہ کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ و مناظرہ میں تلطف اور لین مناسب ہے جیسا کہ ان آیات سے صاف ظاہر ہے۔ البتہ جہاد اور قتال میں غلظت اور شدت مناسب ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ (التحریم:۹) جہاد اور نصیحت کے فرق کو خوب سمجھ لو۔

فائدہ ⑤: دربیان فرق مدارات و مداہنت

بہت سے لوگ مداراۃ اور مداہنت میں فرق نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اپنی دنیوی اور جسمانی راحت اور منفعت کو دوسرے کی دنیوی راحت اور منفعت کے خیال سے چھوڑ دینا اس کا نام مداراۃ ہے۔ اور کسی دنیوی لحاظ کے خاطر اپنے دین کو چھوڑ دینا اور اس میں سستی کرنا اس کا نام مداہنت ہے۔ مداراۃ شریعت میں مستحسن اور پسندیدہ ہے اور مداہنت قبیح اور مذموم ہے۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ (القلم:۹)

خلاصہ یہ کہ دین میں سُستی اور نرمی کا نام مداہنت ہے اور دنیوی امور میں نرمی اور سُستی کا نام مدارات ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ
اور جب لیا ہم نے اقرار تمہارا کہ نہ کرو گے خون آپس میں اور نہ نکال دو
اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾
گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے اقرار کیا اور تم مانتے ہو

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ

پھر تم ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقے کو

دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى

ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ سے اور ظلم سے اور اگر وہی آویں تم پاس کسی کی قید میں پڑے

تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ

تو ان کو چھڑائی دیتے ہو اور وہ بھی حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا پھر کیا مانتے ہو تھوڑی

الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ

کتاب اور منکر ہوتے ہو تھوڑی سے پھر کچھ سزا نہیں اس کی جو کوئی تم میں یہ کام کرتا ہے

اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ

مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن پہنچائے جاویں سخت سے سخت

الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا

عذاب میں اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے وہی ہیں جنہوں نے خرید کی

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ

دُنیا کی زندگی آخرت دے کر سو نہ بلکا ہو گا ان پر عذاب اور نہ ان کو

يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع ۱۰ ۴ ۱۰

مدد پہنچے گی۔

شناعت دوازدہم (۱۲)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ ... اِلٰى ... وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾

ربط : علاوہ ازیں تمہاری دوسری عہد شکنیوں کا بھی مقتضی یہی ہے کہ تم کو چند روز عذاب نہیں بلکہ دائمی عذاب دیا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تم سے اس امر کا پختہ عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرو گے اور نہ ایک دوسرے کو

گھروں سے نکالو گے۔ اپنے ہم مذہبوں کو قتل کرنا اور ان کو جلا وطن کرنا درحقیقت اپنے ہی کو قتل کرنا اور جلا وطن کرنا ہے۔ اسی وجہ سے بجائے ﴿اَقَارِبَكُمْ وَاَهْلَ مِلَّتِكُمْ کے اَنْفُسَكُمْ﴾ کا لفظ استعمال فرمایا اور پھر تم نے اس کا اقرار بھی کرلیا کہ یہ عہد اور پیمان ہم کو منظور اور قبول ہے اور فقط اقرار پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ تم اس پر شہادت اور گواہی بھی دیتے ہو کہ بے شک ہمارے بزرگوں نے یہ عہد کیا تھا اور پھر اس صریح اقرار اور صریح شہادت کے بعد تم ہی وہ لوگ ہو کہ باہم ایک دوسرے کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنی قوم کے ایک فریق کو جلا وطن بھی کرتے ہو۔ اس طرح کہ تم ان کے مقابلہ میں اللہ کے گناہ اور معصیت اور بندوں پر ظلم اور تعدی کے ساتھ قتل کرنے اور جلا وطن کرنے میں اُن کے مخالفین کی امداد کرتے ہو۔ توریت کے ان دو حکموں کو تم نے پسِ پشت ڈالا۔ اور تیسرا حکم جو آسان تھا اس پر عمل کرنے کے لیے تیار رہتے ہو اور وہ یہ کہ اگر تمہارے ہم مذہب لوگ اسیر اور گرفتار ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر ان کو قید سے چھڑاتے ہو اور حالانکہ تم پر ان کا نکالنا اور جلا وطن کرنا بھی تو قطعاً حرام تھا اور قتل کرنا تو اس سے بھی بڑھ کر جرم تھا۔ مگر تعجب ہے کہ جو جرم شدید تھا اس کو تو ارتکاب کرتے رہے اور جو جرم ذرا خفیف تھا اس سے اجتناب کیا اور وہ اجتناب بھی اتباع شریعت کی بناء پر نہ تھا بلکہ اس بناء پر تھا کہ وہ حکم غرض اور طبیعت کے موافق تھا۔ لہٰذا ایسے شخص کے لیے چند روزہ عذاب کافی نہیں دائمی عذاب چاہیے۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو فریق تھے۔ ایک بنی قریظہ اور دوسرے بنی نضیر۔

اسی طرح مدینہ میں مشرکین کے بھی دو فریق تھے۔ ایک اوس اور دوسرے خزرج۔ اور ہر فریق دوسرے فریق کا دشمن تھا آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بنی قریظہ تو قبیلۂ اوس کے حلیف اور دوست تھے اور بنی نضیر قبیلۂ خزرج کے حلیف اور دوست تھے۔ جب کبھی اوس اور خزرج میں لڑائی ہوتی تو حلف اور دوستی کی وجہ سے بنو قریظہ تو اَوس کی حمایت اور مدد کرتا اور بنی نضیر قبیلۂ خزرج کی حمایت اور امداد کرتا اور ہر قبیلہ اپنے خلفاء کے ساتھ مل کر اپنے دشمن کو مارتا اور جلا وطن کرتا۔ اور اگر کوئی یہودی جنگ میں اسیر ہو جاتا تو سب مل کر روپیہ جمع کرتے اور زر فدیہ دے کر اس کو قید سے چھڑا کر لاتے اور اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ تم آپس میں جنگ وجدال اور قتل وقتال کرتے ہو اور ایک دوسرے کو گھروں سے نکالتے ہو تو پھر انہی قیدیوں کو جن کو گھروں سے نکالا تھا زر فدیہ دے کر کیوں چھڑاتے ہو؟ تو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ توریت میں حق تعالیٰ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے کہ جس وقت تمہارے ہم مذہب بھائی کسی کے ہاتھ میں قید ہو جائیں تو ان کو قید سے چھڑانا ہم پر واجب ہے۔ اور رہی آپس کی جنگ تو وہ دنیوی مصالح کی بناء پر ہے اس میں اگر اپنے حلفاء کا ساتھ نہ دیں تو موجب عار وننگ ہے۔ حق جل شانہٗ نے اس آیت میں یہود کی اس شناعت کو ذکر فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ تم کو توریت میں قتل کرنے اور جلا وطن کرنے کی اور ظلم اور تعدی میں مدد کرنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ اور قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان تمام احکام میں سے تم نے فقط فداء اسیران کے حکم پر عمل کیا اس لیے کہ وہ تمہاری نفسانی خواہش کے موافق اور مطابق تھا۔ یہ درحقیقت خدا کی اطاعت نہیں بلکہ اپنے نفس کی اطاعت ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی حماقت ہے کہ اپنے بھائیوں کے قتل کو اور گھروں سے نکالنے کو تو جائز سمجھتے ہیں اور اگر کسی غیر کے ہاتھ میں اسیر ہو جائیں تو فدیہ دیکر اُن کو چھڑانے کو واجب سمجھتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تم شریعت کے بعض عہدوں اور بعض حکموں کو بے دھڑک توڑتے ہو اور شریعت کا وہ حکم جو تمہاری خواہش نفس اور طبیعت کے موافق ہو اس پر عمل کرتے ہو۔ پس کیا تم کتاب خداوندی یعنی توریت کے بعض حکموں پر تو ایمان لاتے ہو۔ اور بعض احکام کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ ایمان میں تجزی اور تقسیم جاری نہیں ہوتی۔ سارے ہی حکموں کے ماننے کا نام ایمان ہے جو شخص ایک حکم کا بھی

انکار کردے وہ کافر ہے اور کافر کی سزا دائمی ہے نہ کہ ایام معدودہ پس کیا جزاء ہے اس شخص کی جو ایسا شنیع کام کرے کہ اللہ کے بعض حکموں کو مانے اور بعض کو نہ مانے۔ خصوصاً تم میں سے جو اپنے کو اہل کتاب اور اہل علم بتلاتے ہیں مگر خواری اور رسوائی دنیاوی زندگانی میں جیسے قتل وغارت اور کمالِ ذلت واہانت کے ساتھ ان سے جزیہ اور خراج وصول کرنا اور نکے جرم کے لحاظ سے یہ سزا کوئی بڑی سزا نہیں۔ البتہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پہنچائے جائیں گے اور خوب سمجھ لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ تو اس سے غافل اور بے خبر نہیں ہاں تم ہی غفلت اور بے خبری میں ہو۔ دیکھ لو بے عقل لوگوں کا گروہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جنہوں نے اس دنیائے دنی اور فانی کی حقیر زندگی کو آخرت کے عوض میں بصد رغبت خرید لیا ہے پس یہ نادان آخرت کے منافع سے تو کیا منتفع ہوتے۔ ان سے تو عذاب اُخروی ہلکا بھی نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کی کسی قسم کی مدد کی جائے گی کہ کوئی زور آور بزور اللہ کے عذاب کو ان سے دفع کردے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ لوگ دائمی عذاب کے مستحق ہیں اس لیے کہ کفر نے ان کا ہر طرف سے احاطہ کیا ہے لہٰذا یہ لوگ اپنے قول ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ میں جھوٹے ہیں۔

فائدہ: معلوم ہوا کہ جو شخص شریعت کے اس حکم کو تو مانے جو اسکی طبیعت اور مزاج کے موافق ہو اور جو حکم مخالف طبیعت ہو اس کو قبول نہ کرے وہ کافر ہے مسلمان نہیں دنیاوی حکومتوں میں بھی ایک قانون کا انکار بغاوت ہے جو شخص حکومت کے کسی حکم کے ماننے سے انکار کر دے اس پر بغاوت کی دفعہ لگ جاتی ہے۔ اور کفر اللہ کی بغاوت ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۪ وَ اٰتَيْنَا
اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول اور دیئے ہم نے
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا
عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح پاک سے پھر بھلا
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا
جب تم پاس لایا کوئی رسول جو نہ چاہا تمہارے جی نے تم تکبر کرنے لگے پھر ایک جماعت کو
كَذَّبْتُمْ ۪ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾
جھٹلایا اور ایک جماعت کو مار ڈالتے۔

شناعت سیزدہم (۱۳)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ ... الیٰ ... وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾﴾

اور البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کی ہدایت اور اصلاح کا بڑا اہتمام کیا چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو ایک روشن کتاب یعنی توریت عطاء کی اور پھر ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل کی اصلاح اور تربیت کے لیے مسلسل یکے بعد دیگرے پیغمبروں کو بھیجا کہ اللہ کے عہدوں کو یاد دلاتے رہیں اور شریعت موسویہ کی پیروی اور اس پر استقامت کی تلقین کرتے رہیں اور پھر خاندان بنی اسرائیل کے اخیر میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو نبوت و رسالت کے واضح اور روشن دلائل دیکر بھیجا اور خاص طور سے روح القدس یعنی جبرائیل امین سے ان کو قوت دی۔ جو ہر وقت اُن کے ساتھ رہتے تھے اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کرتے تھے ولادت سے لے کر رفع الی السماء کے وقت تک جبرائیل آپ کے محافظ رہے اور اس کے آثار و ثمرات و انوار و تجلیات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے تو کیا اس کے بعد بھی تم نرم نہ پڑے او جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسا حکم لے کر آیا کہ جس کو تمہارے نفس پسند نہ کرتے تھے تو تم نے تکبر اور سرکشی کی حالانکہ عقل کا مقتضی یہ تھا کہ اللہ کے نبی اور رسول کی دل و جان سے اطاعت کرتے اور نفس سرکش کی مخالفت کرتے۔ تم جیسے نادان یہ تو کیا کرتے پس تم نے اُلٹی ہی راہ اختیار کی اور پیغمبروں کے ایک گروہ کو جھٹلایا اور انبیاء کی ایک جماعت کو مار ڈالتے ہو اور ظاہر ہے کہ جو مریض بجائے اسکے کہ طبیب کی ہدایت پر چلے۔ اُلٹا طبیب کی بے حرمیت کرے اور اسکو جھٹلائے بلکہ اس کو قتل کر ڈالے وہ کہاں شفایاب ہوسکتا ہے اور ایسے روحانی مریض کے لیے ایام معدودہ کی سزا کافی نہیں بلکہ دائمی اور ابدی سزا چاہیے۔

فائدہ: یہود انبیاء علیہم السلام کی تکذیب تو ایک مرتبہ کر چکے اور قتل کا سلسلہ جاری ہے۔ اب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درپے قتل ہیں اس لیے ﴿كَذَّبْتُمْ﴾ بصیغہ ماضی لائے اور ﴿تَقْتُلُوْنَ﴾ کو بصیغہ مضارع لائے جو ان کے فعل قتل کے حال اور استقبال میں جاری اور مستمر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نیز قتل کا واقعہ اگرچہ گزشتہ زمانہ میں ہو چکا ہے مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کا قتل نہایت ہی عظیم اور سخت ہے اس لیے اس کی عظمت اور شناعت کے ظاہر کرنے کے لیے صیغۂ مضارع سے تعبیر کیا تا کہ وہ پیش نظر ہو جائے گویا کہ وہ اب ہو رہا ہے اور یہ ہولناک اور حیرتناک واقعہ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہے۔

ربط: یہاں تک بنی اسرائیل کے اس معاملہ کا ذکر تھا جو انبیاء علیہم السلام سابقین اور گزشتہ کتب منزلہ کے ساتھ تھا اب آئندہ آیات میں ان بدبختوں کے اُس معاملہ کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ساتھ کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
وہ کہتے ہیں ہمارے دل پر غلاف ہے یوں نہیں لعنت کی ہے اللہ نے ان کے انکار سے سو کم یقین لاتے ہیں۔

شناعت چہاردہم (۱۴)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ ... الیٰ ... فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾

اور ان کے غرور اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ خدا کے پیغمبروں سے بطور فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں سوائے اپنے دین کے کسی نئی بات کا اثر ہمارے دلوں تک نہیں پہنچتا یعنی ہم اپنے دین پر نہایت پختہ اور مضبوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ وجہ

نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے انکار اور تکذیب کی وجہ سے ان پر لعنت فرمائی ہے اور اپنی رحمت اور عنایت سے دور ڈال دیا ہے اس لیے حق بات ان پر اثر نہیں کرتی اور ان کے دل حق اور نصیحت کو قبول نہیں کرتے۔ اور حق سے متنفر اور بیزار ہیں یہ غلاف نہیں بلکہ اللہ کی لعنت کی نشانی اور علامت ہے۔ کفر اور لعنت کے زنگ نے ان کے دلوں کو اس قدر سیاہ اور زنگ آلود کر دیا ہے کہ آئینہ دل میں شاید ہی کوئی جز ایسا باقی رہا ہو کہ ایمان اور ہدایت کی روشنی کو قبول کر سکے۔ اس لیے یہ لوگ بہت ہی قلیل ایمان لاتے ہیں یعنی شریعت کے کسی حکم کو کبھی مان بھی لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ایمان قلیل قابل قبول نہیں مثلاً اگر توحید و رسالت کا اقرار بھی کر لیا۔ اور اجمالی طور پر جنت و جہنم پر بھی ایمان لے آیا اور شریعت کے دوسرے احکام کا انکار کر دیا تو ایسے ایمان سے کوئی فائدہ نہیں ایمان قلیل تو کیا معتبر ہوتا۔ نجات کے لیے تو ایمان کثیر بلکہ ایمان اکثر بھی کافی نہیں کہ دین کی کثیر اور اکثر باتوں کو مانے اور بعض کا انکار کر دے۔ ایمان اللہ کے تمام احکام کے ماننے کا نام ہے محض قلیل و کثیر کے ماننے سے شریعت میں مؤمن نہیں کہلاتا۔

فائدہ: حضرات مفسرین نے ﴿غُلْفٌ﴾ کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ اوّل یہ کہ غلف اَغْلَفُ کی جمع ہے جیسے احمر اور اصفر کی جمع حُمْرٌ اور صُفْرٌ آتی ہے اور اَغْلَفُ اسی شے کو کہتے ہیں جو کسی غلاف اور پردہ میں محفوظ اور مستور ہو۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے دلوں پر غلاف اور پردہ پڑا ہوا ہے اس لیے آپ کی بات ہمارے دلوں تک پہنچتی نہیں۔ جیسا کہ دوسری آیت میں ہے ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ﴾ "اور کہا کافروں نے ہمارے دل پردوں میں ہیں۔" مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی منقول ہیں۔

دوم یہ کہ غُلْفٌ غلاف کی جمع ہے دراصل غُلُفٌ بضم اللام تھا جیسے کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ آتی ہے مگر تخفیف کی وجہ سے لام کو ساکن کر دیا گیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما غُلُفٌ بضم لام پڑھتے تھے۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمارے دل علم کے غلاف اور برتن ہیں جن میں ہر قسم کا علم بھرا ہوا ہے۔ تمہارے علم کی ضرورت نہیں۔ اللہ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا کہ جھوٹ بولتے ہیں۔ نہ اُن کے دلوں پر پردہ ہے اور نہ ان کے دل علم کے غلاف اور ظرف ہیں بلکہ ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا ہے اور ان کے دلوں سے قبول حق کی استعداد کو سلب کر لیا ہے اس لیے ان کے دل حق کو قبول نہیں کرتے ﴿فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝۲۳﴾ (محمد) اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے اور وہ مالک مطلق ہے جس کو چاہے ظاہر کا اندھا بنائے اور جس کو چاہے باطن کا اندھا بنائے کسی کی مجال کیا ہے جو یہ پوچھ سکے کہ اس کی ظاہر یا باطن کی آنکھ کیوں پھوڑی؟

((اخرج احمد بسند جيد عن ابي سعيد رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم القلوب اربعة قلب[1] اجرد فيه مثل السراج يزهر و قلب[2] اغلف مربوط على غلافه و قلب[3] منكوس و قلب[4] مصفح۔ فاما القلب الاجرد فقلب المؤمن سراجه فيه نوره و اما القلب الا غلف فقلب الكافر و اما القلب المنكوس فقلب المنافق عرف ثم انكرؤ اما القلب المضفح فقلب فيه ايمان و نفاق فمثل الايمان فيه كمثل البقلة يمدها الماء الطيب و مثل النفاق فيه كمثل القرحة يمدها القيح۔ فائ المادتين غلبت على الاخرى غلبت عليه)). (در منثور ص ۸۷ ج ۱)

ترجمہ: "امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند جید کے ساتھ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دل چار قسم کے ہیں۔ ایک دل تو وہ ہے جو آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہے اور اس میں کوئی چراغ روشن ہے اور ایک دل وہ ہے جو

غلاف میں بند ہے اور غلاف کا منہ تاگے یا رَسّی سے بندھا ہوا ہے اور ایک دل الٹا اور اوندھا اور ایک دل وہ ہے جس کے دو صفحے یعنی دو جانبیں ہیں۔ ایک سفید ہے اور ایک صفحہ سیاہ۔ پس صاف و شفاف دل تو مؤمن کا دل ہے جس میں ایمان کا چراغ روشن ہے اور غلاف میں بند کافر کا دل ہے اور الٹا اور اوندھا دل منافق کا ہے۔ کہ جس نے حق کو پہچانا اور پھر اس کا انکار کیا اور دو رویہ دل وہ ہے کہ جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں۔ پس ایمان اس دل میں مثل سبزہ کے ہے کہ پاکیزہ پانی اس کو بڑھاتا ہے اور اس کے دل میں نفاق مثل ناسور کے ہے کہ جو دم بدم پیپ اور خون کو بڑھاتا ہے۔ پس ان دو مادوں میں سے کون سا مادہ غالب آجائے اسی کا اعتبار ہے۔"

اللّٰھُمَّ نور قلوبنا بانوار طاعتك و معرفتك . اٰمین یا ارحم الراحمین.

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا

اور جب پہنچی ان کو کتاب اللہ کی طرف سے سچ بتاتی ان پاس والی کو اور

مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا

پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر پھر جب پہنچا ان کو جو پہچان رکھا تھا

كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ

اس سے منکر ہوئے سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر برے مول خرید کیا اپنی جان

اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى

کو کہ منکر ہوئے اللہ کے اتارے کلام سے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے جس پر

مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ

چاہے اپنے بندوں میں سے سو کما لائے غصہ پر غصہ اور منکروں کو

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

عذاب ہے ذلت کا

شناعت پانزدہم (۱۵)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ . . . الٰی . . . وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾﴾

ربط : گزشتہ آیات میں قلب اغلف کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں قلب منکوس کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ یہ یہود۔ آنحضرت ﷺ کو خوب پہچانتے تھے کہ یہی نبی آخر الزمان ﷺ ہیں۔ مگر عناد اور حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسی کتاب آئی یعنی قرآن شریف جس کے اعجاز کو دیکھ کر خود ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے اور پھر مزید برآں وہ قرآن جو منجانب اللہ اُن کے پاس آیا اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو اُن کے پاس پہلے سے موجود ہے۔ یعنی توریت کی تصدیق اور موافقت کرتا ہے حالانکہ آپ اُمّی ہیں۔ آپ تو عربی خط اور عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جو کتاب عبرانی خط میں ہو اس کے مضامین کی واقفیت کیسے ہو سکتی ہے سوائے وحی کے اور کوئی ذریعہ علم نہیں اور تعجب ہے کہ یہ لوگ آپ کی نبوت میں تردّد کرتے ہیں۔ حالانکہ نزول قرآن اور آپ کی بعثت سے پہلے ہی لوگ کافر اور بت پرستوں کے مقابلہ میں آپ کے نام اور برکت سے فتح و نصرت اللہ سے مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ یہود مدینہ اور یہود خیبر کی جب عرب کے بت پرستوں سے لڑائی ہوتی تو یہ دعا مانگتے:

اللّٰھم ربنا انا نسألك بحق احمد النبی الامی (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) الذی و عدتنا ان تخرجه لنا فی اٰخر الزمان و بکتابك الذی تنزل علیه اٰخرما تنزل ان تنصرنا علی اعدائنا. اخرجه ابو نعیم والحاکم والبیهقی و غیر هم عن ابن عباس و ابن مسعود (رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا) و غیرهم بالفاظ مختلفة. (در منثور)

ترجمہ: "اے اللہ! ہم تجھ سے اس احمد مصطفیٰ نبی اُمی (ﷺ) کے حق سے سوال کرتے ہیں جس کے ظاہر کرنے کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور اس کتاب کے واسطہ اور برکت سے سوال کرتے ہیں، جس کو تو سب سے اخیر میں نازل کرے گا کہ ہم کو ہمارے دشمنوں پر فتح اور نصرت عطاء فرما یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بالفاظ مختلفہ مروی ہے۔" (در منثور)

غرض یہ کہ آپ ﷺ کے ظہور سے پہلے ہی یہود آپ کو خوب پہنچانتے تھے اور آپ کے نام مبارک اور قرآن کریم کے واسطہ اور برکت سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعا مانگتے تھے اور فتح پاتے تھے اور آپؐ کے توسل کو موجب خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پس جب ان کے پاس وہ چیز خود بخود آ پہنچی یعنی نبی اُمّی اور قرآن جس کو آنے سے پہلے ہی خوب پہچان چکے تھے اور اس کے ظہور کے منتظر تھے آتے ہی محض حسد اور عناد کی وجہ سے ان کا انکار کر بیٹھے۔ ایسے لوگوں کے عذاب میں کیسے تخفیف ہو سکتی ہے یا ایسے لوگوں کا عذاب ایام معدودہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پس لعنت ہو اللہ کی ایسے کافروں پر جنہوں نے دیدہ و دانستہ حق کو محض حسد اور عناد کی وجہ سے چھپایا۔ حق تو یہ تھا کہ جن کے نام کی برکت سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے اور فتح یاب ہوتے تھے آج دل و جان سے اس نبی اُمّی اور اس کے دین کی نصرت اور اعانت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے اور سب سے پہلے اس نبی اور اس کتاب پر ایمان لاتے نیز جب یہ کتاب توریت کی مصدق تھی تو اس کی تصدیق عقلاً لازم تھی اس لیے کہ اس کی تکذیب توریت کی تکذیب کو مستلزم ہے۔ بہت ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ [1] ڈالا یا اپنے گمان میں اُن کو خرید لیا اور اپنے خیال اور زعم فاسد کی بنا پر ان کو عذاب الٰہی سے چھڑا

---

[1] یعنی حسد اور طبع کی وجہ سے کفر کے بدلہ میں اپنی جانوں کو فروخت کر ڈالا گویا کہ دوزخ کے فرشتوں کے ہاتھ ہلاکت کے لیے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ اس تفسیر میں اشتراء بمعنی بیع کے ہے اور ان کی جان بمنزلہ بیع ہے اور کفر بمنزلہ ثمن ہے اور دوسری تفسیر میں اشتراء خریدنے کے معنی میں ہے۔ جمہور کے نزدیک مختار پہلا ہی قول ہے۔ ۱۲ منہ

لیا وہ یہ کہ انکار کرنے لگے اس چیز کا جو اللہ نے اپنے نبی پر نازل کی محض اس حسد اور عناد کی بناء پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور عطاء یعنی وحی سے جس بندہ پر چاہے کچھ نازل فرمائے پس یہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہوئے کہ طرح طرح سے اسباب غضب کے مرتکب ہوئے۔

① جس توریت پر ایمان کے مدعی تھے اس میں سے نبی آخر الزمان ﷺ کی بشارتوں کے چھپانے کی خاطر تحریف کی۔

② باوجودیکہ اس نبی اُمی اور قرآن کے واسطہ سے بار بار فتح ونصرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا پھر جب وہ نبی اُمی اور وہ کتاب معجز سامنے آئی تو اقرار اور اعتراف کے بعد اس سے انحراف کیا۔

③ نبی برحق ﷺ پر حسد کیا اور در پردہ اللہ پر اعتراض کیا کہ یہ منصب رسالت کے اہل نہ تھے ان کو یہ منصب کیوں عطا کیا ان وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے قسم ہا قسم کے غضب اور غصّہ کے مورد بنے۔ پس جو شخص غضب خداوندی کے پشتارہ کا حامل ہو نہ اس کے عذاب میں تخفیف ہوسکتی ہے اور نہ اس کا عذاب چند روز میں منقطع ہوسکتا ہے اور اگر ان تمام وجوہ غضب سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو دائمی عذاب کے لیے فقط ایک کفر ہی کافی ہے جو ان میں موجود ہے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے اور گنہگار مسلمانوں کو جو عذاب ہوگا وہ اہانت اور تذلیل کے لیے نہ ہوگا بلکہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوگا۔ جیسا کہ میلا اور گندہ کپڑا بھٹی پر میل کچیل صاف کرنے کے لیے چڑھایا جاتا ہے جلانے کے لیے نہیں دشمن کو مارنا تذلیل اور تحقیر کے لیے ہوتا ہے اور بیٹے اور شاگرد کو مارنا اصلاح اور تادیب کے لیے ہوتا ہے ایک مار تعذیب کے لیے ہے اور ایک تہذیب کے لیے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ
اور جب کہیے اُن کو مانو اللہ کا اتارا کلام کہیں ہم مانتے ہیں جو اترا
عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ
ہم پر اور وہ نہیں مانتے جو پیچھے آیا اس سے اور وہ اصل تحقیق ہے سچ بتاتا ان پاس والی کو
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾
کہہ پھر کیوں مارتے رہے ہو نبی اللہ کے پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے۔

شناعت شانزدہم (۱۶)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا ... الیٰ ... اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾﴾

اور دلیل اس امر کی (کہ یہود کا یہ معاملہ آپ کے ساتھ محض حَسَدْ کی بنا پر ہے) یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ ہر اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے خواہ کسی پیغمبر پر اس کا نزول ہوا ہو جو چیز بھی خدا نے نازل کی اس پر ایمان لانا واجب ہے خواہ وہ

توریت وانجیل ہو یا قرآنِ کریم۔ وجوب ایمان کی علت حکم خداوندی ہوتا ہے جو تمام کتب الٰہیہ میں مشترک ہے وہ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو فقط اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ جو خاص ہم پر ہمارے نبی کے واسطہ سے نازل کی گئی۔ اس قید سے ان کا حسد صاف ظاہر ہے کہ جو کتاب بنی اسرائیل پر اتری اس پر تو ایمان لائیں گے اور جو کتاب بنی اسمٰعیل پر اتری اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور محض حسد کی بنا پر اپنی کتاب کے سوا تمام کتابوں کا انکار کرتے ہیں حالانکہ توریت کے سوا اور جو کتابیں خدا تعالیٰ نے نازل کیں وہ فی نفسہٖ حق ہیں یعنی سچی اور واقع کے مطابق ہیں اور ان کے تمام مضامین محقق اور مدلل ہیں اور فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہیں جو ان کے ساتھ ہے لہٰذا جو چیز فی حد ذاتہٖ حق اور واقع کے مطابق ہو اور پھر اس کے علاوہ اس چیز کے ساتھ مطابق ہو جس کو وہ سچا اور برحق سمجھتے ہیں تو ایسی چیز کو نہ ماننا سراسر خلاف عقل ہے اس لیے کہ مطابق کا مطابق بھی مطابق ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک مطابق کو ماننا اور دوسرے مطابق کو نہ ماننا تناقض کو مستلزم ہے اور اگر اس پر بھی وہ توریت پر ایمان کے مدعی ہیں تو آپ ﷺ اُن سے یہ کہیے کہ اچھا تم یہ بتلاؤ کہ تم اللہ کے پیغمبروں کو کس لیے پہلے ہی سے قتل کرتے چلے آ رہے ہو حالانکہ وہ پیغمبر توریت ہی کے مطابق حکم دیتے تھے اور شریعت موسویہ کی تائید اور تجدید کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ جیسے حضرت شعیا اور حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام اگر تم حقیقتاً توریت پر ایمان رکھنے والے تھے۔ معلوم ہوا کہ تم توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ توریت اور شریعت موسویہ پر تمہارا ایمان کا دعویٰ غلط ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور آ چکا تم پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر تم نے بنا لیا بچھڑا اس کے پیچھے

وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور تم ظالم ہو

شناعت ہفدہم (۱۷)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ... الیٰ ... وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾

اور انبیاء علیہم السلام کے قتل کا واقعہ تو موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس سے بڑھ کر کفر کر چکے ہو وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس توحید و رسالت کی نہایت واضح اور روشن دلیلیں لے کر آئے جو اس بات پر صاف طور پر دلالت کرتی تھیں کہ عبادت اور بندگی اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں پھر بھی تم نے ان کے جانے کے بعد ہی ایک گو سالہ بے عقل کو اپنا معبود بنا لیا اور جب خدا ہی ایک بے عقل حیوان ٹھہرا تو اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ بے عقل حیوان کے بندے کس درجہ بے عقل اور حیوان ہوں گے۔ ہندوستان کے ہندو جو گوسالہ پرستی کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سلسلۂ سند سامری سے ضرور ملتا ہوگا اور تم بڑے ہی ظالم ہو کہ اپنے ہاتھ سے ایک بے عقل حیوان کی بنائی ہوئی صورت کو تم نے خُدا بنا لیا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہو

سکتا ہے۔

فائدہ: گوسالہ کو معبود بنانا اس لیے تھا کہ یہ لوگ غایت حماقت کی وجہ سے یا تو مجسّمہ تھے یا حلولیہ تھے یعنی خدا تعالیٰ کا کسی جسم میں حلول کرنا جائز سمجھتے تھے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ

اور جب ہم نے لیا اقرار تمہارا اور اونچا کیا تم پر پہاڑ پکڑو جو

اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ

ہم نے تم کو دیا زور سے اور سنو بولے سنا ہم نے اور نہ مانا اور رچ رہا

قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ

ان کے دلوں میں وہ بچھڑا مارے کفر کے تو کہہ بُرا کچھ سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾

اگر تم ایمان والے ہو۔

شناعت ہشتد ہم (۱۸)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ ... الیٰ ... اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾﴾

اور ایک اور قصہ سنو جس سے توریت کے ساتھ یہود کے ایمان کا حال معلوم ہوگا۔ جب ہم نے تم سے اس بات کا عہد لیا کہ جب توریت تمہارے پاس پہنچے تو دل وجان سے اس کو قبول کرنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا مگر تم اپنے اس عہد سے پھر گئے۔ اور توریت پر عمل کرنے میں حیلے اور بہانے شروع کیے۔ اس وقت ہم نے تمہارے سروں پر کوہِ طور لا کھڑا کیا اور حکم دیا کہ جو احکام ہم نے تم کو دیئے ہیں ان کو نہایت مضبوطی اور پختگی کے ساتھ پکڑو اور گوشِ ہوش سے ان کو سنو مبادا کوئی حکم تم کو یاد نہ رہے اور پھر تمہاری یہ غفلت معصیت کا سبب بن جائے۔ اس کے جواب میں انہوں نے یہ کہا کہ احکام توریت کو سُن لیا ہے مگر مانا نہیں اور اگر ان کے تمرد اور عصیان کا سب سے بڑا نمونہ دیکھنا چاہو تو یہ ہے کہ ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت پلا دی گئی تھی۔ اس لیے ان کو گوسالہ پرستی لذیذ اور خدا پرستی تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ ظاہر نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے اسی حالت میں بھی ﴿سَمِعْنَا﴾ اور ﴿عَصَیْنَا﴾ دونوں کلمے زبان سے کہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ ایسی خوفناک حالت میں زبان سے ﴿عَصَیْنَا﴾ کہنا بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ بالفرض والتقدیر اگر کسی حالت میں زبان سے ﴿عَصَیْنَا﴾ نکالتے تو اسی وقت کوہِ طور گرا کر ان کو چور چور کر دیا جاتا

اور سب کے سب ہلاک کر دیئے جاتے کیونکہ کوہ طور کو سروں پر لا کر کھڑا کرنا اس لیے تھا کہ وہ توریت کو قبول کریں ایسی حالت میں بھی اگر زبان سے ﴿عَصَيْنَا﴾ کہا تھا تو پھر کوہ طور کھڑا کرنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اسی اشکال کی بنا پر بعض مفسرین نے توجیہ کی ہے کہ ﴿سَمِعْنَا﴾ کہنا بزبان قال تھا اور ﴿عَصَيْنَا﴾ کہنا بزبان حال تھا زبان سے تو فقط ﴿سَمِعْنَا﴾ ہی کہا تھا۔ لیکن جب اقرار کے بعد فوراً ہی عصیان اور نافرمانی کرنے لگے تو ان کی حالت کے اعتبار سے ﴿عَصَيْنَا﴾ کہنا ان کی طرف منسوب کیا گیا گویا کہ وہ اسی حالت میں بزبان حال ﴿عَصَيْنَا﴾ کہہ رہے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقت امر یہ ہے کہ بنی اسرائیل باوجود یہ کہ کوہ طور کو اپنے سروں پر معلق دیکھ رہے تھے مگر یہ گمان کیا کہ یہ محض ڈرانے کے لیے ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی شفاعت سے اور بلاؤں کی طرح یہ بلا بھی ٹل جائے گی۔ اس لیے انہوں نے ابتداء احکام توریت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور صاف ﴿عَصَيْنَا﴾ کہہ دیا کہ کیوں توریت کے احکام شاقہ کی ذمہ داری اپنے سر پر لیں۔ اس گمان پر انہوں نے یہ کلمہ اپنی زبان سے کہا لیکن جب دیکھا کہ پہاڑ ان کے سروں کے نزدیک ہوتا جا رہا ہے تو سمجھے کہ یہ حیلے اور بہانے چلیں گے نہیں اس لیے چار و ناچار سجدہ میں گرے اور زبان سے الفاظ قبول کہے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے۔ ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ﴾ (الاعراف:۱۷۱)

جب یہ یقین ہو گیا کہ پہاڑ ٹلنے والا نہیں اس وقت مجبور ہو کر قبول کیا۔ مگر کچھ مدت بعد پر منحرف ہو گئے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قبول کے ایک مدت بعد انحراف کیا اور اس مقام پر ان کے ابتدائی حال کا بیان ہے کہ ابتداء میں انہوں نے قبول نہیں کیا اور ﴿سَمِعْنَا﴾ کے ساتھ ﴿عَصَيْنَا﴾ بھی کہا لیکن بعد میں مجبور ہو کر قبول کیا اور پھر ایک زمانہ کے بعد اس سے انحراف کیا۔ بحمد اللہ اس تقریر پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اِنْتَهٰى كَلَامُهٗ مُحَصَّلًا وَمُوَضَّحًا۔

خلاصہ یہ کہ جس ایمان کے وہ مدعی ہیں اس ایمان کی حقیقت اور کیفیت یہ ہے جو بیان ہوئی اے ہمارے نبی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مختصراً بس اتنا کہہ دیجیے کہ بہت ہی بُری ہے وہ چیز جس کے کرنے کا تم کو تمہارا ایمان حکم دیتا ہے اگر حقیقتاً تم مؤمن ہو۔ اور دعوائے ایمان میں سچے ہو۔ یعنی یہ محض تمہارا ساختہ اور پرداختہ ایمان ہے جو ایسے افعال شنیعہ اور اقوال قبیحہ کا حکم دیتا ہے حقیقی ایمان کبھی ایسی قبیح اور شنیع باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ اگر تمہارا ایمان تم کو ایسی ہی باتوں کا حکم دیتا ہے تو بہت بُرا ایمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایمان اگر تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ قادر مطلق کو چھوڑ کر ایک بے زبان اور لایعقل جانور کو خدا بنا لو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم الشان رسول کی تکذیب کرو۔ پس ایسا ایمان جو تمہیں کفر کا حکم کرتا ہے یہ تو بہت ہی بُرا ایمان ہے۔ ایسے لوگ تو دائمی سزا کے مستحق ہیں ایسوں کے لیے ایام معدودہ کا عذاب ہرگز کافی نہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ

تو کہہ اگر تم کو ملنا ہے گھر آخرت کا اللہ کے یہاں الگ سوائے

النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ

اور لوگوں کے تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر سچ کہتے ہو اور یہ آرزو

اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَ

کبھی نہ کریں گے جس واسطے آگے بھیج چکے ہیں ہاتھ ان کے اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو اور تو

لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ

دیکھے ان کو سب لوگوں سے زیادہ حرص جینے کی اور شریک پکڑنے والوں سے بھی

اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ

ایک ایک چاہتا ہے کہ عمر پاوے ہزار برس اور کچھ اس کو سرکا نہ دے گا عذاب سے

اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۱ ۱۰ ۱۱

اتنا جینا اور اللہ دیکھتا ہے جو کرتے ہیں۔

شناعت نوزدہم (۱۹)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾

یہود باوجود ان شنائع اور قبائح کے یہ کہتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا اور آخرت کی نعمتیں ہمارے لیے مخصوص ہیں تو اے ہمارے نبی آپ ﷺ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ اگر دار آخرت فقط تمہارے ہی لیے اللہ کے یہاں خاص ہے اوروں کے لیے نہیں یعنی بہشت اور نعمائے آخرت میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو پھر مرنے کی تمنا اور آرزو کر کے دکھلاؤ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اس لیے کہ دار آخرت کی وہ لازوال اور بے مثال نعمتیں کہ جن میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں اُن تک پہنچنے کا راستہ سوائے موت کے اور کوئی نہیں لہٰذا اگر تم کو یہ یقین ہے کہ اس دار جاودانی کی نعمتیں تمہارے لیے مخصوص ہیں تو پھر اس دارِ فانی اور کلبۂ احزان و پریشانی سے خلاصی اور نجات کی تمنا کرو۔ قصر عالی شان اور اعزاز شاہی کے مقابلہ میں جیل خانہ کی ذلت اور مشقت کو ترجیح دینا کسی عاقل کا کام نہیں خصوصاً جبکہ جدال و قتال کا بازار گرم ہے اور یہود کے مرد مارے جا رہے ہیں اور بچے اور عورتیں غلام بنائے

جارہے ہیں۔ مال واسباب لوٹا جارہا ہے اور جزیہ اور خراج ان پر قائم کیا جارہا ہے تو ایسی حیات سے بلاشبہ موت افضل اور بہتر ہے تم کو معلوم ہے کہ لذائذ دنیوی۔ نعمِ اخروی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور تم اس وقت مسلمانوں سے جنگ وجدال کی وجہ سے تکلیف اٹھارہے ہو تو موت کی تمنا کروتا کہ اس رنج ومحن سے چھٹکارا ملے اور چونکہ اپنے دعوے کے موافق خاصانِ خدا سے ہو اس لیے تمہاری دعا بھی ضرور قبول ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اور ہم موت اور حیات کے مالک ہیں۔ جس وقت بھی تم موت کی تمنا کروگے اسی وقت موت واقع کردیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو پانی ہی کے گھونٹ سے گلا گھٹ کر مرجاتے وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شے ممکن الوقوع ہو۔ تحدی اور اظہار معجزہ کے وقت اس کا وقوع اور تحقق واجب اور لازم ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ وجوب اور لزوم اُن کی تمنا اور آرزو پر موقوف تھا۔ لہٰذا جب انہوں نے تمنا نہ کی تو موت بھی متحقق نہ ہوئی اور چونکہ ان کو یقین تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی تحدی کے بعد اگر ہم نے موت کی تمنا کی تو موت ضرور آجائے گی اس لیے ڈر کے مارے موٹ کی تمنا نہیں کی۔ خوب جانتے تھے کہ موت کی تمنا کرنے سے آنحضرت ﷺ کا معجزہ ظاہر ہوجائے گا اس لیے موت کی تمنا کرنے سے عاجز رہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں اور ہم ابھی سے خبر دیتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اُن اعمال شنیعہ کے خوف کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ پہلے کرچکے ہیں یہ جملہ بطور پیشین گوئی اور غیب کی خبر کے ہے جو حضور ﷺ کا معجزہ اور یہود کے عجز کی دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے اگرچہ وہ موت کی تمنا نہ کریں اور موت سے کتنا ہی بھاگیں۔ ایک نہ ایک دن ضرور موت آئے گی اور ان سب اعمال کفریہ کی ان کو سزا ملے گی۔

فائدہ ①: جاننا چاہیے کہ یہ ایک قسم کا مباہلہ تھا۔ حق اور باطل کا فیصلہ اکثر مناظرہ اور مجادلہ سے ہوتا ہے اور کبھی مباہلہ سے۔ اس لیے کہ فیصلہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ معتاد اور ایک طریقہ غیر معتاد۔ معتاد طریقہ یہ ہے کہ مناظرہ اور مباحثہ سے فیصلہ کیا جائے۔ اور غیر معتاد طریقہ یہ ہے کہ فیصلہ ایسے طریقہ سے کیا جائے جو خارق للعادۃ اور اسباب ظاہری کے دائرہ سے بالا اور برتر ہو یعنی بطریق معجزہ اور کرامت اس کا فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ اس مقام پر جب حجت اور دلیل اور نظر اور فکر کے تمام مراحل ختم ہوگئے تو خصم کے افحام اور الزام کے لیے ایک خارق عادت طریق اختیار کیا گیا وہ یہ کہ ایک مرتبہ زبان سے یہ کہہ دیں کہ اے اللہ ہم کو موت دے اسی وقت ان کا صدق و کذب ظاہر ہوجائے گا اور اگر یہود کو اس کا یقین نہ ہوتا تو جوش عداوت میں ضرور کہہ ڈالتے تاکہ حضور کا معجزہ ظاہر نہ ہو۔

فائدہ ②: خطاب اور یہ تحدی ان یہودیوں کے ساتھ مخصوص تھی جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے اور خوب جانتے تھے کہ یہی وہ نبی ﷺ برحق ہیں جن کی پیشین گوئی توریت میں ہے اور ہر زمانہ کے یہود سے یہ خطاب نہیں جیسا کہ روح المعانی ص ۲۹۶ ج ۱ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور ابداً کا لفظ انہی کے عمر کے لحاظ سے فرمایا گیا۔

فائدہ ③: یہود نے نہ زبان سے تمنا کی ورنہ ضرور منقول ہوتی اور نہ دل سے تمنا کی ورنہ اگر دل سے تمنا کرتے تو خجالت اور الزام کے دور کرنے کے لیے زبان سے ضرور اسکا اظہار کرتے۔

ایک شبہ: اگر یہ کہا جائے کہ یہ سوال تو یہود کی طرف سے مسلمانوں پر بھی وارد ہوسکتا ہے کہ تم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ سوائے مسلمانوں کے اور کوئی جنت میں نہیں جائے گا لہٰذا تم کو بھی چاہیے کہ موت کی تمنا کرو۔

ازالہ: جواب یہ ہے کہ یہود کا عقیدہ فقط یہی نہیں تھا کہ ہم اہل حق ہیں اور ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا بلکہ ساتھ یہ بھی اعتقاد

تھا کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں کَمَا قَالَ اللہ تَعَالٰی: حاکیا عنھم ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ﴾ (المائدہ:۱۸) ہمارے اعمال وافعال اور اقوال واحوال کیسے ہی ناشایستہ اور ناگفتہ ہوں ہم ضرور جنت میں جائیں گے۔ جنت ہماری جدی اور خاندانی میراث ہے۔ مرتے ہی ہم بہشت میں داخل ہوجائیں گے اور مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ اور جنت ہمارے لیے مخصوص ہے ہمارے اعمال اچھے ہوں یا بُرے ہر حال میں ہم جنت میں جائیں گے۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اس لیے مسلمان ہمیشہ اپنی نازیبا افعال واقوال سے ڈرتے رہتے ہیں بخلاف یہود کے کہ وہ بے دھڑک گناہ کرتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں۔ ﴿سَيُغْفَرُ لَنَا﴾ یعنی ہم کوئی گناہ کرلیں سب بخشے جائیں گے کسی قسم کی معصیت ہمارے لیے مضر نہیں اور نہ ہم سے کوئی حساب وکتاب ہوگا اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا۔ اس لیے ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ زندگی اور بڑھ جائے تاکہ گزشتہ تقصیرات کی توبہ اور استغفار سے کچھ تلافی کرسکیں اور کچھ اعمال صالحہ کرکے سفرِ آخرت کے لیے زاد اور راحلہ تیار کرسکیں۔

موت کی تمنا کا حکم شرعی

احادیث میں بلاضرورت موت کی تمنا کرنے کی یا دُنیاوی مصائب سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ عمر کا زیادہ ہونا اور توبہ اور اعمال صالحہ کے لیے وقت کا میسر آجانا ایک نعمت عظمیٰ اور غنیمت کبریٰ ہے۔ البتہ اگر قلب پر لقاء خداوندی کا شوق غالب ہو تو پھر موت کی تمنا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ فرطِ شوق سے اس درجہ مغلوب الحال ہوجائے کہ دُنیاوی منافع اس کی نظروں سے اُوجھل ہوجائیں اور غلبۂ شوق میں اس کو اس کا بھی خیال نہ رہے کہ جس قدر عمر زیادہ ہوگی اسی قدر قربِ خداوندی کے اسباب زیادہ حاصل کرسکوں گا۔ اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو اس قسم کی آرزو منقول ہے سو وہ اس وقت میں تھی کہ جب اسباب موت کے سامنے آگئے اور دُنیا کی زندگی سے مایوسی ہوگئی اس وقت موت کی فرحت اور مسرت میں کچھ کلمات زبان سے نکلے اور یہ وقت محل بحث سے خارج ہے۔ تفصیل کے لیے تفسیر عزیزی اور تفسیر مظہری کی مراجعت کی جائے اور یہ لوگ موت کی تمنا اور آرزو ہرگز نہیں کرسکتے اس لیے کہ البتہ تحقیق آپ ان کو سب لوگوں سے زیادہ اس فانی زندگی پر حریص پائیں گے حتیٰ کہ ان لوگوں سے بھی زیادہ حریص پائیں گے۔ جو لوگ مشرک اور بت پرست ہیں اور اخروی حیات کے بالکل قائل نہیں دنیوی ہی حیات کو حیات سمجھتے ہیں اور یہود باوجود یہ کہ حیاتِ اُخروی اور آخرت کے ثواب اور عقاب کے قائل ہیں ان کا سب سے زیادہ زندگی پر حریص ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ ان کو اپنے مجرم ہونے کا یقین کامل ہے ہر ایک ان میں سے یہ چاہتا ہے کہ اسکو ہزار برس کی عمر دیجائے حالانکہ ہزار برس کی عمر دیا جانا بھی اللہ کے عذاب کو دفع نہیں کرسکتا ہزار برس کے بعد پھر موت ہی ہے اور ان لوگوں کو اگر ہزار برس سے بھی زیادہ عمر ملجائے تب بھی کوئی فائدہ نہیں جس قدر ان کی عمر زیادہ ہوگی اسی قدر ان کا کفر زیادہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے کہ دمبدم کفر اور معصیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اُن کے حق میں تخفیف عذاب کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

تو کہہ جو کوئی ہو گا دشمن جبریل کا سو اس نے اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

سچ بتاتا اس کلام کو جو اس کے آگے ہے اور راہ دکھاتا اور خوشی سناتا ایمان والوں کو

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ

جو کوئی ہو گا دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا

شناعت بستم (۲۰)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ... الٰى... فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾﴾

ان آیات میں یہود کے نہ ایمان لانے کے لیے ایک خاص بہانہ کو ذکر کر کے اس کا رد فرماتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم قرآن پر اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ اس کو جبریل لے کر آتے ہیں اور وہ ہمارے دشمن ہیں وہی ہم پر ہمیشہ اللہ کا عذاب لے کر آتے ہیں اس لیے ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔ البتہ میکائیل ہمارے دوست ہیں جو رحمت اور بارش کے فرشتہ ہیں وہ اگر وحی لے کر آتے تو ہم مان لیتے اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ اے محمد ﷺ! اگر یہودی یہ کہیں کہ ہم قرآن کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ جبریل کے واسطہ سے نازل ہوا ہے اور جبریل علیہ السلام ہمارے دشمن ہیں۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ کو ہمارے پوشیدہ اسرار سے مطلع کرتے ہیں اور اس سے پہلے بھی جس قدر بلائیں اور مصیبتیں اور احکام شاقہ نازل ہوئے وہ سب جبریل علیہ السلام ہی لے کر آئے۔ اس لیے ہم قرآن کو نہیں مانتے بخلاف توریت کے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو بلا واسطہ عنایت ہوئی۔ تو آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجیے کہ جو شخص جبریل علیہ السلام کا دشمن ہو وہ درحقیقت اللہ کا دشمن ہے۔ اس لیے کہ جبریل علیہ السلام نے اس قرآن کو آپ ﷺ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اُتارا ہے جس میں جبریل علیہ السلام کا کوئی دخل اور اختیار نہیں۔ وہ تو محض سفیر یعنی ایلچی ہیں تم تو اس پر نظر کرو کہ نازل کرنے والا کون ہے۔ حق جل شانہ اگر بجائے جبریل علیہ السلام کے یہ کام میکائیل علیہ السلام کے سپرد فرماتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

ع او بجز نائی و ماجزنی نیم

نیز اس قرآن کے اوصاف پر نظر ڈالو کہ وہ کیسا ہے سو اس میں تین صفتیں ہیں۔ اول یہ کہ وہ تمام پچھلی کتابوں کا تصدیق کرنے والا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی تصدیق تمام کتب الٰہیہ کی تصدیق ہے اور اس کی تکذیب تمام کتب الٰہیہ کی تکذیب ہے۔ دوم یہ کہ وہ خدا تک

پہنچنے کا سیدھا راستہ بتلاتی ہے اور سیدھا راستہ تو اگر دشمن بھی بتلائے تو اسے فوراً قبول کرنا چاہئے۔ سوم یہ کہ یہ کتاب اہل ایمان کے لیے جو خداوند ذوالجلال کے لقاء کے مشتاق اور متمنی ہیں، ایک عظیم بشارت ہے۔ پس اب تم ہی بتلاؤ کہ جو فرشتہ تمہارے لیے خداوند ذوالجلال کی طرف سے ہدایت کے الوان نعمت کا خوان لے کر آیا ہو اور پھر محبین اور مشتاقین کے لیے ساتھ ساتھ خوشخبری بھی لے کر آیا ہو وہ کمال محبت اور غایت الفت کا مستحق ہے یا دشمنی اور عداوت کا۔ افسوس ان لوگوں نے نہ اللہ کے پیغام ہدایت کو قبول کیا اور نہ بشارت میں داخل ہوئے یہ نہ سمجھا کہ اللہ کے فضل کو لے کر آنے والے سے دشمنی کرنا اللہ سے دشمنی کرنا ہے اور جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور اس کے فرشتوں اور پیغمبروں کا اور خاص کر جبریل اور میکائیل علیہما السلام کا تو اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام کافروں کا دشمن ہے۔ لہٰذا جو شخص جبریل علیہ السلام کا دشمن ہوگا وہ خدا اور اُس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کا دوست کیسے ہوسکتا ہے؟ سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ جو شخص بھی ان میں سے کسی سے عداوت رکھے وہ کافر ہے اور اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے دوستوں سے دشمنی کرنا اللہ سے لڑائی مول لینا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب یہودیوں نے یہ کہا کہ جبریل (علیہ السلام) ہمارے دشمن ہیں میکائیل (علیہ السلام) ہمارے دوست ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ سوال کیا کہ یہ بتلاؤ کہ جبریل (علیہ السلام) اور میکائیل (علیہ السلام) کو بارگاہِ خداوندی میں کیا مرتبہ اور کس درجہ کا قرب حاصل ہے۔ یہود نے کہا کہ جبریل (علیہ السلام) اللہ کے دائیں جانب ہیں اور میکائیل (علیہ السلام) بائیں جانب۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس خدا کی قسم یہ ناممکن ہے کہ جبریل علیہ السلام۔ میکائیل علیہ السلام کے دشمن ہوں۔ اور یہ بھی ناممکن ہے کہ میکائیل علیہ السلام۔ جبرئیل علیہ السلام کے دشمنوں سے دوستی اور صلح کریں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ان دونوں کو خدا سے یہ قرب ہے تو یہ ناممکن ہے کہ یہ دونوں آپس میں دشمن ہوں۔ (کذا فی الدر المنثور ص ۹۰ ج ۱)

نکتہ:

کسی کلام کے نازل ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کلام اوّل کان پر پہنچے اور پھر کان سے دل تک پہنچے یہ طریقہ عام اور متعارف ہے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ اوّل دل پر اُترے اور لفظ اور معنی سب سے پہلے دل میں اُتریں اور پھر دل سے کان اور زبان پر پہنچیں۔ یہ طریقہ اہل اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن کریم کا نزول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طریق پر ہوتا تھا اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے یاد کرنے اور بار بار پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی تھی بلکہ ایک ہی مرتبہ سُن کر آپ کو یاد ہو جاتا تھا۔ اس لیے ﴿فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ﴾ فرمایا۔ بخلاف امت کے کہ ان کو قرآن۔ معروف اور معتاد طریقے سے پہنچا ہے کہ اوّل کانوں سے سنا پھر دلوں تک پہنچا۔

نیز نزول وحی کی حالت میں حواس ظاہری بالکل معطل ہو جاتے ہیں اور بیخودی طاری ہو جانے کی وجہ سے حواس ظاہری اپنا کام نہیں کرتے اس لیے ایسی حالت میں الفاظ وحی کا تمام تر ورود اور نزول قلب ہی پر ہوتا ہے جس طرح انسان خواب میں الفاظ بھی سنتا ہے مگر ان الفاظ کا اصل مدرک قلب ہی ہوتا ہے اس لیے کہ خواب کی حالت میں حواس ظاہری ان کے معطل ہو جاتے ہیں یا قلب پر نازل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن آپ کے قلب میں ایسا محفوظ ہو جاتا ہے کہ پھر آپ اس کو بھولتے نہیں اور نہ آپ کو اس کی مراد اور معنی میں کوئی اشتباہ لاحق ہوتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے اتاریں تیری طرف آیتیں واضح اور منکر نہ ہوں گے ان سے مگر وہی جو بے حکم ہیں

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا

کیا اور جس بار باندھیں گے ایک اقرار پھینک دے گی اس کو ایک جماعت ان میں سے بلکہ وہ اکثر

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

یقین نہیں کرتے اور جب پہنچا ان کو رسول اللہ کی طرف سے سچ بتاتا ان

مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۗ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ

پاس والی کو پھینک دی ایک جماعت نے کتاب پانے والوں میں کتاب اللہ کی اپنی

ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى

پیٹھ کے پیچھے گویا کہ ان کو معلوم نہیں اور پیچھے لگے ہیں اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلطنت

مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا

میں سلیمان کی اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ

لوگوں کو سکھاتے سحر اور اس علم کو جو اترا دو فرشتوں پر بابل میں ہاروت

وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ

اور ماروت پر اور وہ نہ سکھاتے کسی کو جب تک نہ کہتے کہ ہم تو ہیں آزمانے کو

فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ

سو تو مت کافر ہو پھر ان سے سیکھتے جس چیز سے جدائی ڈالتے مرد میں اور اس کی عورت میں

زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ

اور وہ اس سے بگاڑ نہیں سکتے کسی کا بغیر اذن اللہ کے اور

يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ

سیکھتے ہیں جس سے ان کو نقصان ہے اور نفع نہیں اور جان چکے ہیں کہ جو کوئی

اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۫ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ

اس کا خریدار ہو اس کو آخرت میں نہیں کچھ حصہ اور بہت بُری چیز ہے جس پر بیچا

اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ

اپنی جانوں کو اگر ان کو سمجھ ہوتی اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیز رکھتے تو بدلا تھا

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲ ۱۲

اللہ کے ہاں سے بہتر اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

شناعت بست ویکم (۲۱)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ ... الٰى ... لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾

اور آپ کی نبوت فقط قرآن پر موقوف نہیں کہ جس کے متعلق یہ بہانہ کر دیا کہ قرآن تو جبریل علیہ السلام لے کر آئے ہیں جو ہمارے دشمن ہیں بلکہ البتہ تحقیق ہم نے آپ کی نبوت و رسالت کے ثابت کرنے کے لیے نہایت واضح اور روشن دلائل نازل کئے جن میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس نہیں اور نہ ان میں جبریل کو توسط ہے۔ پس اگر قرآن کو دلیل نبوت نہیں سمجھتے کہ جبریل علیہ السلام سے دشمنی ہے تو ان آیات بنیات کا تمہارے پاس کیا جواب ہے جن میں جبریل امین علیہ السلام کا واسطہ نہیں اور ان کو خود بھی معلوم ہے مگر عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابن صوریا یہودی نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم اپنی نبوت و رسالت کی کوئی ایسی نشانی نہیں لاتے جسے ہم بھی پہچانیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم) اور مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت کی ایک نشانی نہیں بلکہ صدہا نشانیاں موجود ہیں اور ان آیات بینات کا نہیں انکار کرتے مگر وہ لوگ جو حد ہی سے گزر گئے ہیں اور مقتضاء عقل و نقل دونوں ہی کو خیر باد کہہ چکے ہیں کیا یہ لوگ اپنے فسق کے منکر ہیں حالانکہ ان کی عادت مستمرہ یہ رہی ہے کہ جب کبھی ان لوگوں نے کوئی عہد و پیمان کیا ہے تو ایک فریق نے تو اس کو بالکل پس پشت ہی ڈال دیا ہے حالانکہ نقض عہد عقلاً و شرعاً ہر طرح قبیح اور مذموم ہے اور فقط بدعہدی ہی نہیں بلکہ اکثر تو ان میں سے توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے اور توریت میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا اس کو واجب العمل نہیں سمجھتے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ بدعہدی تو ادنیٰ درجہ کی چیز ہے بہت سے تو توریت ہی پر ایمان نہیں رکھتے اور جب توریت ہی کو واجب الایمان اور واجب العمل نہیں سمجھتے تو بدعہدی کرنے کو وہ کیا گناہ سمجھیں گے۔ اب آئندہ آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں اور جب ان کے پاس ایک عظیم الشان رسول آیا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو وہ پہچانتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

طرف سے ہے انبیاء سابقین کی بشارتیں اور اس رسول کے معجزات اس کے صدق پر شاہد تھے اور پھر اس کے علاوہ وہ پیغمبر اس کتاب کی تصدیق بھی کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے۔ مثلاً: توریت اور زبور جس میں نبی آخر الزمان کی خبر دی گئی ہے مگر باوجود اس کے اہل کتاب کے ایک فریق نے کتاب اللہ یعنی توریت کو پس پشت ڈالا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اللہ کی کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے اور یا یہ معنی ہیں کہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ غرض یہ کہ یہود نے اللہ کی کتاب کو تو پسِ پشت ڈال دیا جس کی انبیاء کرام علیہم السلام تلاوت کرتے تھے اور اُن منتروں کے پیچھے ہو لیے جن کی شیاطین الانس والجن حضرت سلیمان علیہ السلام کے دورِ حکومت میں تلاوت کیا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت چونکہ عام تھی جن اور انس چرند اور پرند سب ان کے زیر حکم تھے اس لیے شیاطین اور جنات اور آدمی سب ملے جلے رہتے تھے۔ شیطانوں نے آدمیوں کو جادو سکھا رکھا تھا اور معاذ اللہ یہ سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ہرگز ہرگز نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی کسی قسم کا کفر نہیں کیا نہ عملی اور نہ اعتقادی اور نہ قبل النبوۃ اور نہ بعد النبوۃ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے پیغمبر تھے کفر کے مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے سحر کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرنا سراسر افتراء ہے۔ یہود چونکہ سحر کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت ظاہر فرمادی لیکن شیاطین نے از خود یہ کفر کا کام کیا کہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دینے لگے۔ یہود یہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے نبی نہ تھے بلکہ ساحر اور جادوگر تھے۔ اس کے زور سے جنات اور آدمیوں اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس کا رَد فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی یہ کام نہیں کیا اس لیے کہ نبی معصوم ہوتا ہے اس سے کفر کا صادر ہونا ناممکن ہے نبی تو کفر اور شرک کے مٹانے کے لیے آتا ہے نہ کہ کرنے کے لیے اور علاوہ ازیں یہود اُس سحر کا بھی اتباع اور پیروی کرتے تھے جو کہ شہر بابل میں دو فرشتوں پر ایک خاص حکمت کی بنا پر نازل کیا گیا تھا جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا وہ حکمت یہ تھی کہ لوگ سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق معلوم کریں تا کہ پیغمبر اور جادوگر میں کوئی التباس اور اشتباہ نہ ہو کیوں کہ ظاہراً معجزہ کی طرح سحر بھی خارق عادت ہے اس لیے حق تعالیٰ نے دو فرشتے بصورتِ انسان بابل میں اُتارے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت سمجھائیں تا کہ لوگوں کو سحر اور معجزہ میں کوئی اشتباہ پیش نہ آئے اور چونکہ مقصود یہ تھا۔ اس لیے یہ دونوں فرشتے کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ جز ایں نیست کہ ہم تو مخلوق کے لیے فتنہ اور آزمائش ہیں کہ کون سحر سیکھ کر کفر اور معصیت میں مبتلا ہوتا ہے اور کون اس کی حقیقت اور قباحت کو معلوم کر کے اُس سے احتیاط اور پرہیز کرتا ہے۔ سو دیکھو اس کو سیکھ کر کفر کا کام نہ کرنا یعنی سحر نہ کرنا اس سے ایمان جاتا رہے گا۔ لیکن اس کے بعد یہی بعض لوگ ان سے وہ باتیں سیکھتے جن سے میاں اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالتے اور یہ سمجھتے کہ یہ چیزیں بدون اللہ کی مشیت کے ضرر پہنچاتی ہیں اور یہ امر یقینی ہے کہ یہ جادوگر اس سحر کے ذریعہ سے کسی کو بھی بغیر اللہ کی مشیت اور ارادہ کے ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے سحر میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے تو اعمال کی تاثیر کو بند کر دیتا ہے اور سحر کو بے اثر بنا دیتا ہے اور اگر بالفرض والتقدیر سحر میں کوئی کفر اور شرک بھی نہ ہوتا تب بھی عقل کا مقتضیٰ یہی تھا کہ سحر سے احتراز کرتے کیونکہ یہ ایسے علم کو سیکھ رہے ہیں جو دُنیا اور آخرت میں ان کے لیے ضرر رساں ہے اور اگر بالفرض مضر نہ ہو تو نافع بھی نہیں اور عاقل کا کام یہ ہے کہ جو چیز نقصان دے اور نفع نہ دے اس سے احتراز کرے اور ان کا سحر میں یہ اشتغال اور انہماک لاعلمی اور نادانی کی بناء پر نہیں کہ اس کے ضرر سے بیخبر ہوں۔ البتہ خدا کی قسم ان کو خوب معلوم ہے کہ جو کفریات کو خریدے گا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ البتہ بہت ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کر ڈالا کاش اس

بات کو جانتے کہ ہمسعادت ابدیہ کو فروخت کر کے شقاوت ابدیہ کو خرید رہے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہود نے اپنے دین اور کتاب کے علم کو تو پس پشت ڈال دیا اور علم سحر کے پیچھے ہو لیے اور سحر کا علم لوگوں میں دو طرف سے پھیلا ایک تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں چونکہ جنات اور انسان آپس میں ملے جُلے رہتے تھے اس لیے آدمیوں نے جنات اور شیاطین سے سحر سیکھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کر دیا کہ یہ سحر ہم کو انہی سے پہنچا اور اسی کے زور سے حضرت سلیمان علیہ السلام جنات اور ہوا پر حکومت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رَدّ فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے کبھی نہیں کیا۔ اُن کے زمانہ میں شیطانوں نے آدمیوں کو سکھایا ہے۔ دوسرے ہاروت اور ماروت کی طرف سے پھیلا کہ وہ دو فرشتے تھے۔ انسان کی شکل میں شہر بابل میں رہتے تھے اُن کو علم سحر معلوم تھا جو کوئی ان سے جادو سیکھنا چاہتا وہ پہلے ہی اس سے کہہ دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا لیکن جب وہ اصرار کرتا تو سکھا دیتے اور صاف کہہ دیتے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے ایسے علم سے آخرت میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ دُنیا اور آخرت دونوں ہی میں نقصان ہے بغیر اللہ کے حکم کے کچھ نہیں کر سکتے اگر علم دین سیکھتے تو اللہ کے یہاں ثواب پاتے اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے ان پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا جیسا کہ آئندہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور بجائے سحر کے اللہ کی کتاب کا اتباع کرتے اور علم سحر اور کتب سحر اور مضر اور بے فائدہ علوم سے پرہیز کرتے جیسے اس زمانہ میں ناول اور باتصویر رسالے جو تخریب اخلاق میں جادو کا اثر رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو بدلا ملے اگرچہ وہ تھوڑا ہو دُنیا اور دُنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے چہ جائیکہ سحر میں بطور مزدوری برائے نام کچھ مل جائے کاش ان کو اتنی عقل ہوتی تو سمجھتے کہ دُنیا کے تمام منافع آخرت کے ایک نفع کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

فائدہ: شیاطین جس سحر کی تعلیم دیتے تھے وہ صریح کفر اور شرک تھی۔ ارواح کو خدا تعالیٰ کے برابر جانتے تھے اور ان کے لیے وہ افعال اور تاثیرات ثابت کرتے تھے جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کی مدح میں ایسے منتر پڑھتے تھے کہ جیسے خدا تعالیٰ کی عموم علم اور احاطۂ قدرت اور غایت عظمت وجلال ظاہر کرنے کے لیے حمد وثناء کے کلمات پڑھے جاتے ہیں اور فرشتوں کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی۔ نہایت احتیاط کے ساتھ تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ساتھ نصیحت کرتے تھے اور کفر کرنے سے منع کرتے تھے ان کا مقصد حقیقت سحر کو واضح کرنا تھا تا کہ نبی اور متنبی میں اشتباہ نہ ہو اور سحر اور معجزہ کا فرق معلوم ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ موثر حقیقی سوائے باری تعالیٰ کے کوئی نہیں اور شیاطین کا مقصد اغواء اور اضلال تھا۔

قصہ ہاروت وماروت:

تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر اور در منثور میں عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر اور مجاہد ارقتادہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہم سے منقول ہے کہ جب ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں اولادِ آدم کے بُرے اعمال کے دفتر کے دفتر آسمان پر جانے لگے تو فرشتوں نے بنی آدم کے حق میں تحقیر اور طعن آمیز کلمات کہے کہ یہ کیسے بندے ہیں کہ اپنے مالک حقیقی کی نافرمانی کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: میں نے بنی آدم کے خمیر میں غصّہ اور شہوت رکھا ہے اس لیے ان سے گناہ ہوتے ہیں۔ اگر تم میں یہی قوت شہویہ اور قوت غضبیہ رکھدوں اور زمین پر اتاروں تو تم بھی ایسے ہی گناہوں میں مبتلا ہوؤ گے۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار ہم ہرگز تیرے گناہ کے پاس بھی نہ جائیں گے حق تعالیٰ نے فرمایا: کہ اچھا تم اپنے میں سے دو شخصوں کو منتخب کر لو۔ فرشتوں نے ہاروت اور ماروت کو جو فرشتوں میں کمال عبادت میں مشہور اور ممتاز تھے منتخب کیا۔ حق تعالیٰ نے قوت شہویہ اور غضبیہ کو اُن میں پیدا کر کے حکم دیا کہ زمین پر جاؤ اور لوگوں کے مقدمات کا عدل وانصاف

کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔ اور شرک اور خون ناحق اور زنا اور شراب سے پرہیز کرنا۔ حسب ارشاد خداوندی دونوں فرشتے آسمان سے زمین پر اترے صبح سے لے کر شام تک قضاء کے کام میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے ایک مہینہ اسی حالت میں گزرا یک امتحان خداوندی پیش آیا کہ ایک عورت مسماۃ زُہرہ جو حسن و جمال میں شہرہ آفاق تھی اس کا مقدمہ ان کے اجلاس میں پیش ہوا۔ یہ دونوں فرشتے اس عورت کے حسن و جمال کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئے اور اس کو پھسلانا شروع کیا۔ اس عورت نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک تم بت پرستی اختیار نہ کرو اور میرے خاوند کو قتل نہ کرو اور شراب نہ پیو میں تمہارے پاس نہیں آسکتی۔ آپس میں دونوں نے مشورہ کیا کہ شرک اور قتلِ ناحق تو بہت بڑے گناہ ہیں اور شراب پینا اس درجہ کی معصیت نہیں اس لیے اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ غرض یہ کہ اس عورت نے پہلے اُن کو شراب پلائی اور پھر بت کو سجدہ کرایا اور پھر شوہر کو قتل کرایا اور ان سے اسم اعظم سیکھا اور پھر ان کے ساتھ ہم بستر ہوئی۔ بعد ازاں وہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور اس کی روح زہرہ ستارہ کی روح کے ساتھ جا ملی اور اس کی صورت زہرہ کی صورت ہو گئی اور وہ فرشتے اسم اعظم بھول گئے۔ اس لیے آسمان پر نہ جا سکے۔ جب ہوش میں آئے نہایت نادم ہوئے اور ادریس علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر دُعا اور استغفار کی درخواست کی اور بارگاہ خداوندی میں شفاعت کے خواستگار ہوئے۔ بارگاہ الٰہی سے یہ حکم آیا کہ عذاب تو تم کو ضرور ہو گا لیکن اس قدر تخفیف کی جاتی ہے کہ تم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ دینوی اور اُخروی عذاب سے جس کو چاہو اختیار کر لو۔ فرشتوں نے دُنیاوی عذاب کو سہل اور آسان سمجھا کہ یہاں کا عذاب تو عنقریب منقطع ہو جائے گا، اس لیے اس کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ وہ اللہ کے حکم سے بابل کے کنویں میں اُلٹے لٹکا دیئے گئے اور وہیں ان کو آگ سے عذاب دیا جا رہا ہے۔ پھر جو کوئی ان کے پاس جادو سیکھنے جاتا ہے وہ اوّل تو اس کو سمجھا دیتے ہیں اور جب اصرار کرتا ہے تو اس کو سکھا دیتے ہیں۔ (قصہ ختم ہوا)

تحقیق: ہاروت و ماروت کا جو قصہ نقل کیا گیا اس میں علماء کے دو فریق ہیں ایک فریق یہ کہتا ہے کہ یہ قصہ سرتاپا موضوع ہے اور یہود کا من گھڑت قصہ ہے اور انہی کی کتابوں سے ماخوذ ہے حضرات محدثین اس قصہ کو باعتبار روایت کے غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور حضرات متکلمین باعتبار روایت کے اس کو غیر معتبر کہتے ہیں۔ قاضی عیاض اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قصہ کا شد و مد سے انکار کیا ہے اس لیے کہ یہ قصہ اُصول دین کے خلاف ہے۔

① اوّل یہ کہ فرشتے معصوم ہیں اُن سے گناہ کا صدور عصمت کے منافی ہے۔

② دوم یہ کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہیں تو ان کو فرصت کہاں سے ملی کہ لوگوں کو جادو سکھلائیں نیز تعلیم و تعلم کے لیے اختلاط شرط ہے جو محبوس ہونے کی وجہ سے مفقود ہے۔ ان کو لوگوں سے اختلاط کیسے میسر ہوا۔

③ سوم یہ کہ ایک فاحشہ اور بدکار عورت کا دھوکہ سے اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چڑھ جانا سراسر غیر معقول ہے۔ اسماء الٰہی کے لیے تقویٰ اور طہارت شرط ہے۔

④ چہارم یہ کہ مسخ اور تبدیل صورت عقوبت کے لیے ہوتا ہے اور عقوبت کے لیے تحقیر اور اہانت لازم ہے اور آسمان پر پہنچ کر ستارہ بن جانے میں نہ کوئی عقوبت ہے اور نہ کوئی تحقیر اور اہانت ہے۔

⑤ پنجم یہ کہ زہرہ تو ایک مشہور ستارہ ہے جو ابتداء آفرینش عالم سے موجود ہے اور اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کو مسخ کر کے زہرہ ستارہ بنا دیا گیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ستارہ اس واقعہ کے بعد وجود میں آیا اور اس واقعہ سے پہلے یہ ستارہ موجود نہ تھا اور یہ

سراسر غیر معقول ہے ان وجوہ کی بنا پر ان علماء نے اس قصّہ کا انکار کیا لیکن جلال الدین سیوطی اور ملا علی قاری وغیرہم فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں روایات مرفوعہ اور آثار صحابہ اسانید صحیحہ کے ساتھ اس قدر کثرت سے آئے ہیں کہ جن کا انکار ناممکن ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصّہ بے اصل نہیں۔ انتہٰی۔ لہٰذا اس قصہ کی صحت اور عدم صحت کے بارہ میں توقف اور سکوت مناسب ہے اور جن حضرات مفسرین نے اس قصّہ کو ذکر کیا ہے ان پر تشنیع اور نازیبا کلمات سے ان کا ذکر کرنا سراسر خلاف ادب ہے بہت سے اکابر محدثین اور مفسرین نے بغرض تحقیق و تنقیح اپنی کتابوں میں رطب و یابس کو جمع کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ اس قصّہ کے بارہ میں جس قدر روایتیں آتی ہیں اگر تتبع کر کے ان تمام روایات کو جمع کیا جائے تو ان کا قدر مشترک حد تواتر کو پہنچ جاتا ہے اگرچہ واقعہ کی خصوصیات میں اختلاف ہو لیکن جو قدر مشترک حد تواتر کو پہنچ چکا ہے اس کا انکار دشوار ہے۔ انفرادی طور پر اگرچہ ہر طریق اور ہر سند ضعیف اور واہی ہو لیکن ضعیف روایتوں کا تواتر بھی ترجیح صدق کا موجب ہوتا ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ بجائے انکار اور تکذیب کے قصہ کی کوئی مناسب توجیہ کی جائے جس سے اصول دین کی مخالفت باقی نہ رہے۔

① وہ توجیہ یہ ہے کہ فرشتوں کی عظمت اس وقت تک ہے جب تک فرشتے اپنی اصلی حالت اور اصلی حقیقت پر رہیں اور جب ان میں بھی کسی حکمت اور مصلحت سے شہوت اور غضب کی کیفیت پیدا کر دی گئی تو وہ خالص فرشتے نہ رہے اس لیے اب ان کے لیے عصمت بھی لازم اور ضروری نہ ہوگی۔

② نیز عذاب اور گرفتاری کی حالت میں تعلیم سحر کا جاری رہنا محال تو کیا مستبعد بھی نہیں۔ کیا جیل خانہ میں رہ کر افتادہ اور استفادہ ممکن نہیں۔ ایک حاذق طبیب اگر اس کے ہوش و حواس سالم ہوں تو بیماری کی حالت میں بھی علم طب کی تعلیم دے سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی قوت ادراکیہ انسان کی قوتِ ادراکیہ سے کہیں اکمل اور اتم ہے عذاب اور گرفتاری کی حالت ان کے لیے تعلیم سے مانع نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ غیب سے ان کو مدد بھی پہنچتی ہو۔ کیونکہ آسمان سے اس تعلیم کے لیے اتارے گئے تھے۔ جیسا کہ قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہر سال اُن کے پاس ایک شیطان جاتا ہے اور تازہ سحر سیکھ کر آتا ہے اور لوگوں میں پھیلاتا ہے جس شخص کو کسی علم کا ملکہ ہوتا ہے تو وہ بیماری اور لاچاری کی حالت میں اس علم کی تعلیم دے سکتا ہے اور بسبب مزادلت اور ممارست اور بوجہ ملکہ مہارت اس کو تعلیم و تلقین میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

③ نیز وہ عورت اگرچہ بدکار تھی لیکن مقصود اس کا قربِ الٰہی کو حاصل کرنا تھا اپنے حسن و جمال کو اسم اعظم کے معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ خرابی جو کچھ تھی وہ ذریعہ اور وسیلہ میں تھی۔ اصل مقصد میں کوئی قبح نہ تھا حسن نیت کی برکت سے کامیاب ہوئی۔

④ اور جس طرح بغرض ابتلاء فرشتے بشکل بشر بنا کر آسمان سے زمین پر اتارے گئے اسی طرح ایک ستارہ کی روح ایک حسین و جمیل عورت کی شکل میں ہاروت اور ماروت کی عصمت کے امتحان کے لیے نمودار ہوئی اور امتحان ہو جانے کے بعد اصلی صورت کی طرف لوٹ گئی یعنی صورت بشریہ سے صورت کوکبیہ کی طرف واپس ہو گئی۔ جس طرح جنات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر اپنی اصلی صورت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ لہٰذا جن روایات میں اس عورت کا زہرہ ستارہ کی صورت میں مسخ ہونے کا ذکر آیا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی روح کا تعلق زہرہ کی روح کے ساتھ کر دیا گیا اور یہ مطلب نہیں کہ یہ ستارہ

پہلے ہی سے موجود نہ تھا اور اب اس عورت کے مسخ ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

⑤ اور صورت کو کبیہ اگرچہ کتنی ہی شرافت اور عظمت رکھتی ہو لیکن صورت انسانیہ کے اعتبار سے بہت حقیر اور ذلیل ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ (التین)

خلاصۂ کلام:

بعض علماء نے اس قصّہ کو اصول دین اور قواعد شریعت کے خلاف سمجھا اس لیے اس کو غیر معتبر قرار دیا اور بعض علماء نے کثرۃ طرق اور کثرۃ اسانید کی بنا پر اس قصّہ کا بالکلیہ انکار مناسب نہیں سمجھا۔ بیس سندوں سے زیادہ اس قصہ کا مروی ہونا اس کی خبر دیتا ہے کہ اس قصہ کی اصل ضرور ہے بالکل بے اصل نہیں روایات مختلفہ کا جو قدر مشترک تھا یہ حضرات اس کے قائل ہوئے اور خصوصیات کے بارہ میں توقف اور سکوت کیا اور جو باتیں بظاہر اصول شریعت کے خلاف معلوم ہوتی تھیں ان کی مناسب توجیہ اور تاویل فرمائی اور یہ طریق نہایت اسلم اور معتدل ہے۔ روایت کا دار و مدار طرق اور اسانید پر ہے اگرچہ وہ طرق اور اسانید ضعیف اور واہی کیوں نہ ہوں چند ضعفاء کے مل جانے سے بھی ایک گونہ قوت آ جاتی ہے اس لیے جو ضعیف حدیث متعدد طرق سے مروی ہو اصطلاح محدثین میں اس کو حسن لغیرہ کہتے ہیں۔ لہٰذا کسی ضعیف روایت کے کثرت طرق اور کثرت اسانید سے یک لخت قطع نظر کر لینا اور اپنی مزعوم درایت کی بنا پر اس روایت کا بالکلیہ انکار کر دینا خود خلاف درایت ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو چیز آپ کے نزدیک خلاف درایت ہے وہ دوسرے عالم کے نزدیک بھی خلاف درایت ہو۔ ممکن ہے کہ آپ کی درایت نے غلطی کی ہو۔ ﴿فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ○ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ فَهْمٍ فَهِيْمٌ﴾ اور محض اسرائیلیات میں سے ہونا بھی تکذیب اور انکار کا سبب نہیں بن سکتا الا یہ کہ نصوص کتاب وسنت اور قواعد وشریعت اور اجماعِ امت کے خلاف ہو۔ حدیث میں ہے:

((حَدِّثُوْا عن بنی اسرائیل وَلا حرج)). "اسرائیلی باتوں کے نقل میں کوئی حرج نہیں۔"

میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ قصّہ قطعاً صحیح ہے اور ناظرین بھی اس کو صحیح مانیں میرا مطلب فقط اس قدر ہے کہ بے دھڑک ہو کر روایات کا انکار نہ کریں باقی رہی آیات کی تفسیر تو وہ اس قصّہ کے صحیح ہونے پر موقوف نہیں جیسا کہ ناظرین نے تفسیر کو پڑھ کر دیکھ لیا ہوگا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک وعظ میں فرماتے ہیں: کہ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ سحر تو حرام اور کفر ہے باقی اس کا جاننا اور بضرورت شرعی اس کا سیکھنا خصوصاً جب کہ اس پر عمل کرنے کی مخالفت بھی ساتھ ساتھ ہو تو حرام نہیں جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے مگر اس کی خاصیت معلوم کرنا اور اس کو بیان کرنا حرام نہیں۔ فقہاء نے کلمات کفریہ کے لیے ایک مستقل باب رکھا ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ کن باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے فلسفہ کے بہت سے مسائل کفر ہیں لیکن اس کی تعلیم دی جاتی ہے تا کہ اس کی حقیقت معلوم کر کے اس کا جواب دیا جا سکے۔

ایک اور اشکال اور اس کا جواب:

رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کے لیے فرشتے کیوں نازل کیے گئے۔ انبیاء علیہم السلام ہی سے یہ کام کیوں نہ لے لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہدایت محضہ کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیم سحر میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان سے سیکھنے کے

بعد اسی میں مشغول اور مبتلا ہو جائے تو اس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو اُن کی شانِ ہدایت محضہ کے منافی ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے ان کو ضلالت کا سبب بعید بھی بنانا گوارا نہیں فرمایا بخلاف فرشتوں کے کہ اُن سے تشریع اور تکوین دونوں قسم کے کام لیے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں اسی طرح وہ کافروں کی بھی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں حالانکہ ہمارے لیے شرعاً کافر کی اعانت اور امداد ناجائز ہے انبیاء کرام کے تشریعی نظام سپرد ہوتا ہے اور ملائکہ کے تکوینی نظام سپرد ہوتا ہے اس لیے تعلیم سحر کی خدمت ملائکہ کے سپرد ہوئی کہ اگر وہ اس میں ضلالت کا سبب بن جائیں تو ان کی شان کے خلاف نہ ہوگا۔ اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے لیے گمراہی کا سبب بعید بننا بھی خلافِ شان ہے۔

(کذا فی تعمیم التعلیم ص ۵۱ نمبر ۱۳۔ از تبلیغ)

جس طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے یہ بتلایا کہ رشوت حرام ہے مگر رشوت کی حقیقت نہیں بتلائی اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام نے یہ تو بتلا دیا کہ سحر حرام ہے مگر سحر کی حقیقت نہیں بتلائی۔

فائدہ : معلوم نہیں کہ بحالت عذاب وہ خود لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے ہیں یا جنّات اور شیاطین کے واسطہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (روح المعانی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ						
اے	ایمان والو	تم	نہ کہو	راعنا	اور	کہو	انظرنا	اور	سنتے رہو	اور
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾						
منکروں کو دکھ کی مار ہے۔						

شناعت بست ودوم (۲۲)

متضمن بتلقین احباب بآداب خطاب

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... الیٰ ... وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾﴾

ربط : گزشتہ آیات میں یہود کے اتباعِ سحر کا ذکر تھا آئندہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ سحر کا اتباع یہودیوں کی طبیعتوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہو گیا ہے کہ ان کی گفتگو اور مخاطبت بھی سحر کے اثر سے خالی نہیں۔ جس طرح سحر ایک طمع سازی اور حقیقت کی پردہ پوشی ہے۔ اسی طرح ان کا کلام بھی سحر لسانی ہوتا ہے صورت اس کی تعظیم و تکریم ہے اور حقیقت اس کی اہانت اور تحقیر ہے۔ حقارت پر عظمت کی ملمع کاری کر کے بات کرتے ہیں۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہوتے تو ﴿رَاعِنَا﴾ سے خطاب کرتے جس کے ظاہری معنی نہایت

عمدہ ہیں کہ آپ ہماری رعایت کیجیے اور ہمارے حال پر توجہ فرمایئے۔ لیکن جن معنی کا وہ ارادہ کرتے وہ نہایت فاسد اور گندہ ہیں۔ یہود یہ لفظ بول کر احمق یا چرواہے کے معنی مراد لیتے۔ بہت سے مسلمانوں کو ان فاسد معنیٰ کا علم نہ تھا انہوں نے یہ سمجھ کر کہ علماء اہل کتاب حضرات انبیاء علیہم السلام کے آداب سے بخوبی واقف ہیں جب علماء یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ کلمۂ تعظیم ہے اس لیے مسلمانوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تلبیس اور دھوکہ سے بچو اگرچہ تمہارا ارادہ دھوکہ کا نہ ہو تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کے وقت ﴿رَاعِنَا﴾ کا لفظ نہ کہو جس میں فاسد معنی کا ابہام ہے بلکہ اس کے بجائے لفظ ﴿اُنْظُرْنَا﴾ کہو یعنی ہم پر نظر عنایت فرمایئے اور ہم پر شفقت اور توجہ فرمایئے۔ اور آپ جو ارشاد فرمائیں اس کو نہایت غور سے سنو کہ دوبارہ سوال اور ایسے مُوہم الفاظ کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے اور کافروں کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے کہ جو اس قسم کے الفاظ سے رسول اور اہل ایمان کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور رسول کی ایذاء اور تحقیر بلاشبہ کفر ہے۔

فائدہ ①: قرآنِ کریم میں اٹھاسی جگہ اس امت کے مسلمانوں کو ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب کیا گیا ہے ان میں سے یہ پہلا موقعہ ہے کتب سابقہ میں صرف انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو یہ شرفِ عطا فرمایا کہ قرآنِ کریم میں براہِ راست اس اُمت کو مخاطب بنایا۔ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرمایئے۔ فرمایا: کہ جب تو قرآن پڑھے اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے خطاب کو سنے تو فوراً اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا اور قلب کو حاضر کرنا کہ اللہ تعالیٰ بلاواسطہ تجھ سے خطاب فرما رہا ہے اور کسی اچھی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی بُری چیز سے منع کرتا ہے۔ (رواہ عبداللہ بن احمد فی زوائد المسند والبیہقی فی شعب الایمان)

فائدہ ②: جس لفظ کے استعمال سے فاسد معنیٰ کا ایہام ہوتا ہو اسکا استعمال نہ کرنا چاہیے اگرچہ متکلم کی نیت صحیح ہو۔

فائدہ ③: نبی کی اشارۃً اور کنایۃً تحقیر بھی کفر ہے اس لیے کہ یہود صراحتاً آپ کی تحقیر نہیں کرتے تھے۔ ﴿رَاعِنَا﴾ کہہ کر اشارۃً اور کنایۃً آپ کی تحقیر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کو کافر فرمایا۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ
دل نہیں چاہتا ان لوگوں کا جو منکر ہیں کتاب والوں میں اور شرک والوں میں یہ کہ اُترے
عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
تم پر کچھ نیک بات تمہارے رب سے اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی مہر سے جس کو چاہے
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾
اور اللہ بڑا فضل رکھتا ہے۔

شناعت بست وسوم (۲۳)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ... الٰی ... وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝۱۰۵﴾

شانِ نزول:

مسلمانوں نے یہود سے کہا کہ تم محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ۔ یہودیوں نے کہا کہ خُدا کی قسم ہماری تو دلی خواہش تھی کہ اگر تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ہوتا تو ضرور اس کو قبول کرتے لیکن تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ثابت نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب میں یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ سب غلط ہے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تم پر حسد کرتے ہیں اور کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین مکہ ذرہ برابر دل سے یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر کوئی خیر نازل کی جائے لیکن اُن کے حسد سے کچھ نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُن کا محکوم نہیں اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو چاہے اپنی رحمت سے مخصوص فرمائے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنی نبوت اور وحی سے سرفراز فرمایا اور اپنے فضل سے آپ کو افضل الانبیاء بنایا۔ اور آپ کے دین کا تمام ادیان سے افضل اور اکمل ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

فائدہ: اس جگہ رحمت سے مراد نبوت ہے اور فضل اس احسان اور نکوئی کو کہتے ہیں جو ابتداءً بلا وجہ ہو۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ
جو موقوف کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو پہنچاتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر کیا
تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۱۰۶ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ
تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کو سلطنت ہے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝۱۰۷
آسمانوں اور زمین کی اور تم کو انہیں اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مدد والا۔

شناعت بست وچہارم (۲۴)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ ... الٰی ... مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝۱۰۸﴾

شانِ نزول:

یہود اور مشرکین بطور طعن یہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) اپنے اصحاب کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں اور پھر اسی بات سے منع کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے کہتے ہیں۔ اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔ اس قسم کی باتوں سے کافروں کا

مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ شک وشبہ ڈال دیں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے جو ہم پر نازل ہوا وہ سب خیر ہی خیر ہے تو اس کے منسوخ ہونے کے کیا معنیٰ؟ اگر پہلا حکم خیر تھا تو دوسرا شر ہوگا اور اگر دوسرا حکم خیر ہے تو پہلا حکم شر ہوگا اور وحی الٰہی اور حکمِ خداوندی کا شر ہونا ناممکن اور محال ہے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ نسخ کے معنی تبدیل خیر بالشر کے نہیں۔ یعنی خیر کو شر کے ساتھ بدل دینے کے نہیں تا کہ وحی الٰہی اور خیریت میں منافات لازم آئے بلکہ ناسخ اور منسوخ دونوں ہی خیر ہیں اس لیے کہ ہم جب کبھی کسی آیت کا حکم منسوخ کرتے ہیں کہ اس آیت کے حکم پر عمل نہ کیا جائے اگرچہ اس آیت کی تلاوت باقی رہے یا ہم اس آیت ہی کو ذہنوں سے بھلا دیتے ہیں کہ اس آیت کے الفاظ کو کسی حکمت اور مصلحت کی بنا پر قوت حافظہ سے فراموش کر دیں اگرچہ حکم اس آیت کا برقرار رکھیں کہ اس آیت کے ذہنوں سے نکل جانے کی وجہ سے تلاوت کی عبادت اور لذت تو حاصل نہ کر سکیں اس منسوخ التلاوۃ آیت کے حکم پر عمل کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ بہر حال ہم چاہے کسی آیت کے حکم کو منسوخ کریں یا اُس آیت کو ذہنوں سے بھلائیں نسخ کے بعد اُس آیت منسوخہ یا منسیہ سے کوئی بہتر چیز لاتے ہیں یا اس آیت کے مثل لاتے ہیں یعنی حکم ناسخ حکم منسوخ سے سہولت عمل یا موافقت مصلحت یا کثرۃ ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوتا ہے یا برابر۔ کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کو سب اختیار ہے ہر لمحہ اور ہر لحظہ تو اس کے عجائب قدرت اور غرائب مشیت کا مشاہدہ کرتا ہے جیسے مرض کا صحت سے بدلنا اور فقر کا تونگری سے بدلنا اور عزت کا ذلت سے بدلنا اور روشنی کا تاریکی سے بدلنا پس جو ذات ان تغیرات اور تبدلات پر قادر ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک حکم سے دوسرے حکم کو بدل دے اور جس طرح احکام تکوینیہ میں حسب اقتضاء مصلحت تغیر اور تبدل معاذ اللہ جہالت نہیں بلکہ عین حکمت ہے اسی طرح احکام شرعیہ میں بھی باقتضاء زمان ومکان اور باقتضاء طبع تغیر وتبدل عین حکمت اور عین مصلحت ہے اور الہامی کتابوں میں بھی احکام بدلتے رہے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو توریت کے بعد انجیل کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اس تغیر وتبدل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ پہلے ہی سے یہ سب کچھ اس کے علم میں تھا۔ البتہ اس تغیر اور تبدل سے ہمارے علم میں تغیر ہوتا ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو قصور علم کی وجہ سے اس حکم کی مدت معلوم نہ تھی اور قصور فہم کی وجہ سے اس حکم کو دائم اور مستمر سمجھ بیٹھے۔ جب حکم ناسخ نازل ہوا اس وقت اپنے قصور علم کا علم ہوا اور قصور فہم کا فہم ہوا۔ قوانین حکومت میں بھی تغیر اور تبدل ہوتا ہے لیکن وہاں کسی فرد گذاشت اور لاعلمی کی بنا پر پہلا حکم منسوخ ہوتا ہے اور حق جل شانہ کے احکام میں تغیر وتبدل ہمیشہ حکمت ومصلحت کی بنا پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم غلطی سے پاک ہے۔

﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝﴾ (طٰہٰ) "میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔"

مریض کے حالات بدلنے کی وجہ سے طبیب دوا بدلتا رہتا ہے یہ طبیب کی جہالت نہیں بلکہ دلیل حذاقت ہے کہ ہر وقت کی مصلحت اس کی پیش نظر ہے اور اس قدرت کے علاوہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمینوں کی اور حکومت اور بادشاہت کے لوازم میں سے ہے کہ احکام میں تغیر اور تبدل ہو۔ لہٰذا جس وقت جو حکم دے اسکی تعمیل فرض اور لازم ہے اور اگر اسکے حکم اور فرمان کی تعمیل میں تامل کرو اور یہ کہو کہ ہم تو پہلے ہی حکم کو مانیں گے دوسرے حکم کو نہیں مانیں گے تو سمجھ لو کہ تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں کہ جو تمہیں اس کی گرفت اور باز پرس سے بچا سکے۔

فائدہ ①: لغت میں نسخ کے دو معنی آتے ہیں ایک نقل اور تحویل جیسے نسخ الکتاب (یعنی کتاب نقل کی)۔ دوسرے معنی رفع اور

ازالہ کے جیسے نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ (آفتاب نے سایہ کوزائل کردیا)۔آیت میں دوسرے معنیٰ مراد ہیں یعنی حکم اوّل کواُٹھادینا۔

فائدہ ②: کتاب اللہ کا نسخ چندوجوہ پرآیا ہے: ① ایک تو یہ کہ تلاوت منسوخ ہوگئی اور حکم باقی رہا، جیسے آیت رجم کہ تلاوت تو اس کی منسوخ ہوگئی اور حکم اس کا باقی ہے۔ ② اور ایک یہ کہ حکم منسوخ ہوجائے اور تلاوت باقی رہے جیسے اقارب کے لیے وصیت کرنے کی آیت میراث سے اس کا حکم منسوخ ہوگیا اور تلاوت علی حالہا باقی ہے۔اور مثلاً وہ آیت جس میں ایک سال کی عدت وفات کا حکم مذکور ہے تلاوت اور قراءت اُس کی باقی ہے مگر ایک سال کی عدت کا حکم چار مہینے اور دس روز کی آیت سے منسوخ ہوگیا۔ ③ اور ایک صورت یہ ہے کہ تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوں۔جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ احزاب بقدر سورۂ بقرہ طویل تھی مگر اس کے اکثر حصّہ کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوگئے۔

فائدہ ③: نسخ کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ حکم منسوخ کی جگہ دوسرا حکم نازل کیا جائے جیسے ایک سال کی عدت منسوخ کرکے چار مہینہ اور دس دن کا حکم نازل کردیا گیا۔دوسری قسم یہ کہ پہلا حکم اٹھالیا جائے اور کوئی جدید حکم اس کی جگہ نہ اتارا جائے جیسے ابتداء میں مہاجر عورتوں کے امتحان کا حکم تھا بعد میں اٹھالیا گیا۔

فائدہ ④: نسخ احکام یعنی اوامر اور نواہی میں جاری ہوتا ہے، اخباری یعنی جو چیزیں خبر سے متعلق ہیں ان میں نسخ جاری نہیں ہوتا ہے اور اوامر ونواہی میں باقتضاء مصلحت تغیر وتبدل عقلاء عالم کے نزدیک مسلم ہے۔ بلکہ مصلحت کے بدلنے سے حکم کو نہ بدلنا عقلاً قبیح ہے۔

فائدہ ⑤: ناسخ کا منسوخ سے بہتر یا برابر ہونا باعتبار سہولت عمل یا باعتبار کثرت ثواب مراد ہے۔نظم اور اعجاز کے اعتبار سے ناسخ اور منسوخ کا برابر ہونا ضروری نہیں لہٰذا کتاب اللہ کا حدیث سے منسوخ ہونا۔ ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ (یعنی ہم اس سے بہتر حکم نازل فرماتے ہیں) کے منافی نہ ہوگا۔خوب سمجھ لو۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ
کیا تم مسلمان یہی چاہتے ہو کہ سوال شروع کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے موسیٰ سے پہلے
وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾
اور جو کوئی انکار لیوے بدلے یقین کے وہ بھولا سیدھی راہ سے

شناعت بست وپنجم (۲۵)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ ... الیٰ ... سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾﴾

اے مسلمانو! کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے سوالات کئے گئے اسی طرح تم اپنے رسول سے سوالات کرو۔ بنی اسرائیل کی طرح احکام خداوندی میں قیل وقال کرو اور حجتیں نکالو! جیسے بقرہ کے قصّہ میں گزرا۔مثلاً یہ سوال کرو کہ پہلا ہی حکم برقرار رکھا جائے یا ہم اس حکم سے خوش نہیں، اور جو شخص بجائے ایمان کے کفر کو اختیار کرے وہ سیدھے راستہ سے بہک گیا۔منزل مقصود کو

کیسے پہنچ سکے گا مطلب یہ ہے کہ احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا اور اللہ کے نبیؐ سے الجھنا اور لایعنی سوالات کرنا یا اللہ کے کسی حکم کو غیر مناسب سمجھنا یہ سب کفر کی بات ہے، تمہارا فریضہ تو یہ ہے ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علت از کار تو

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ

دل چاہتا ہے بہت کتاب والوں کا کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہوئے پیچھے

كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ

کافر کر دیں حسد کرکے اپنے اندر سے بعد اس کے کہ کھل چکا ان پر حق

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

سو تم در گذر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم اللہ ہر چیز پر

قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ

قادر ہے اور کھڑی رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو آگے بھیجو گے اپنے واسطے

مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

بھلائی وہ پاؤ گے اللہ کے پاس اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

شناعت بست و ششم (۲۶)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ . . . الٰی . . . اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ ﴾

اے مسلمانو! یہ یہود قرآن اور دین میں طرح طرح کے شبہے نکالتے ہیں کبھی نسخ احکام پر اعتراض کرتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اکثر اہل کتاب کی دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ کسی طرح تم کو ایمان سے پھیر کر کافر بنا دیں کہ اہل کتاب کی طرح تم بھی جدید حکم کا انکار کر دو اور اپنے نبی پر یہ اعتراض کرو کہ تم نے پہلے تو یہ حکم دیا تھا اور اب یہ دوسرا حکم اس کے خلاف کیسا؟ اور اس غرض فاسد کا کوئی محرک اور باعث تمہاری جانب سے وقوع میں نہیں آیا بلا وجہ محض حسد کی بنا پر کہ جو خود اُن کے ناپاک اور گندے نفسوں سے پیدا ہوا ہے اور پھر تعجب یہ ہے کہ ان کی یہ کوشش اور یہ حسد کسی شک اور شبہ کی بنا پر نہیں بلکہ بعد اس کے ہے کہ حق ان کو خوب واضح ہو چکا ہے۔ کہ مسلمانوں کا دین اور اُن کی کتاب اور ان کا رسول سب سچے ہیں۔ نیز ان کو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ ہر شریعت میں علی اِختلافِ المصالح احکام بدلتے رہتے ہیں۔ بقرہ ہی کے قصہ میں دیکھ لو کہ کتنی مرتبہ نسخ ہوا۔ تم اُن کی باتوں کا خیال مت کرو۔ یہ حسد میں مبتلا ہیں خدا کا شکر کرو کہ تم حاسد نہیں

محسود ہو۔ پس تم ان حاسدوں سے معاف کرو اور درگزر کرو۔ یعنی زبان سے بھی ان کو کچھ بُرا بھلا نہ کہو اور فی الحال اُن سے کوئی جنگ و جدال اور قتل وقتال نہ کرو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جہاد وقتال اور جزیہ کا حکم نازل فرمائے۔ اور جہاد وقتال کے حکم میں تاخیر عاجز ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ فی الحال بھی قادر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن اس تاخیر میں کچھ حکمتیں ہیں وہ قادر و توانا جب چاہے گا ضعیف کو قوی پر غالب کر دے گا اور اگر تم کو اپنے ان دشمنانِ ایمان سے جہاد کا شوق ہے تو جہاد بالسیف کا حکم آنے سے پہلے جہاد نفس میں مشغول رہو اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ کو دیتے رہو۔ یہ عبادت مالی اور بدنی نفس پر بہت شاق اور گراں ہے۔ بس اس جانی و مالی جہاد میں لگے رہو۔ اور نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ جو نیکی اور بھلائی بھی تم آگے بھیجو گے تمام جمع شدہ ذخیرہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پاؤ گے۔ یہ ناممکن ہے کہ تمہارا کوئی عمل ضائع ہو جائے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو خوب دیکھتا ہے۔ اس عمل کی کمیت اور کیفیت اور تمہارا اخلاص اور شوق اور نیت سب اُس کے نظروں کے سامنے ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ

وہ کہتے ہیں ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہود یا نصاریٰ یہ

اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ

آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے تو کہہ لے آؤ سند اپنی اگر تم سچے ہو کیوں نہیں جس نے

اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ

تابع کیا منہ اپنا اللہ کے اور وہ نیکی پر ہے اسی کو ہے مزدوری اس کی اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۳ ۹ ۱۳

ان پر اور نہ ان کو غم

شناعت بست و ہفتم (۲۷)

باشتراک نصاریٰ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ ... الیٰ ... وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

اے مسلمانو! یہ اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ تم کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ جنت میں سوائے یہود اور نصاریٰ کے ہرگز کوئی داخل نہ ہوگا تم کو فریب دے کر اور بہشت کا شوق دلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں تم ہرگز ان کی طرف مائل نہ ہونا۔ اور نہ ان کی بات کی طرف التفات کرنا۔ یہ سب ان کی خالی آرزوئیں اور دل کے بہلانے کی باتیں ہیں جس پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی۔ آپ

اُن سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا تو اپنی کوئی دلیل پیش کرو بغیر دلیل کے کوئی دعویٰ مسموع نہیں۔ البتہ جو امر دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے ثابت ہے اور تمام اہل حق کے نزدیک مسلم ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے وجہ یعنی اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اسکے حکموں کے سامنے گردن ڈال دے کہ اللہ کا جو حکم بھی جس وقت پہنچے اس کو سنے اور سر اور آنکھوں پر رکھے اور بے چون و چرا اس کو مانے اور اس اطاعت اور فرمانبرداری میں مخلص اور نیکوکار ہو یعنی جب اللہ کی عبادت کرے تو اس طرح کرے گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے تو ایسے شخص کو اللہ کے یہاں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا اجر ملے گا اور نہ ان پر آئندہ کا کچھ خوف ہوگا اور نہ گزشتہ پر غمگین ہوں گے۔ حاصل کلام یہ کہ جنت میں وہ شخص داخل ہوگا جس میں یہ دو صفتیں پائی جائیں۔ اوّل اسلام لوجہ اللہ اور دوسری احسان۔ اسلام سے صحیح عقائد مراد ہے اور احسان سے اعمالِ حسنہ۔ اور ان لوگوں میں یہ دونوں صفتیں مفقود ہیں۔ پیغمبر وقت پر ایمان نہیں لائے اور جو احکام پہلے حکموں کے نسخ کے لیے نازل ہوئے ان کو قبول نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ ناسخ آ جانے کے بعد حکم منسوخ پر عمل کرنے والا مطیع اور فرمانبردار نہیں ہو سکتا اور نہ احسان عمل اُن کو نصیب ہوا۔ اللہ کی شریعت میں تحریف کی اور اللہ پر جھوٹ بولا۔ ایسی حالت میں دخول جنت کی توقع خیال خام ہے البتہ مسلمانوں نے اللہ کی آخری شریعت کو اخلاص کے ساتھ قبول کیا وہ جنت کے مستحق ہیں۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو خاصان خدا کے انتساب ہی کو مدار نجات سمجھے ہوئے ہیں وہ آگاہ ہو جائیں کہ محض یہ تمنائیں ذریعہ نجات نہیں ہو سکتیں۔ ایمان اور اعمال صالحہ شرط نجات اور مغفرت ہیں۔ اور یہ دونوں ان میں مفقود ہیں۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى						
اور یہود نے کہا نصاریٰ نہیں کچھ راہ پر اور نصاریٰ نے کہا						
لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ						
یہود نہیں کچھ راہ پر اور وہ سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہی						
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ						
ان لوگوں نے جن پاس علم نہیں انہیں کی سی بات اب اللہ حکم کرے گا ان میں دن						
الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾						
قیامت کے جس بات میں جھگڑتے تھے۔						

شناعت بست وہشتم (۲۸)

باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى ... الیٰ ... فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۱۳﴾

ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں نجران کے نصاریٰ آئے۔ علماء یہود بھی ان کو سن کر آ گئے دونوں فریق کی آپس میں بحث شروع ہوگئی۔ جوش میں آ کر ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور جوش میں آ کر یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ کسی صحیح اور قابل اعتبار چیز پر نہیں۔ بالکل بے بنیاد ہے سرے ہی سے کسی بنیاد پر قائم نہیں اور اسی طرح نصاریٰ یہ کہنے لگے کہ یہود کسی چیز پر نہیں یعنی ان کا دین ہیچ اور بے بنیاد ہے اور حالانکہ دونوں فریق اللہ کی کتاب پڑھتے رہتے ہیں یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے رہتے ہیں اور ہر کتاب میں دوسری کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق موجود ہے۔ توریت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تصدیق کرتی ہے اور انجیل موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تصدیق کرتی ہے۔ اصل بنیاد دونوں کی صحیح ہے اگرچہ بعد میں نسخ اور تحریف کی وجہ سے غیر معتبر ہو گئے اور اسی طرح ان جیسی باتیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ جن کے پاس علم نہیں یعنی مشرکین اور مجوس یہی کہتے کہ ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارے سوا سب بے دین اور گمراہ ہیں۔ پس یہ دُنیا ہے یہاں جس کا جی چاہے بے دلیل ہانک لے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان ان تمام اُمور کا عملی طور پر فیصلہ فرما دیں گے جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقت میں صحیح تھیں۔ خاتم الانبیاء ﷺ کے دین اور کتاب سے تمام ادیان منسوخ ہو گئے اور اب قیامت تک سوائے دین اسلام کے اور کوئی دین مقبول اور معتبر نہیں اور عملی فیصلہ سے مراد یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل کے لیے جزاء اور سزا کا حکم سنا دیا جائے گا جس سے حق اور باطل کے امتیاز کا آنکھوں سے مشاہدہ ہو جائے گا اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہ۔ اور فیصلہ میں عملی کی قید اس لیے لگائی کہ علمی طور پر تو دُنیا ہی میں دلائل اور براہین سے حق اور باطل کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اگر طبائع میں تعصب اور عناد نہ ہوتا تو دُنیا ہی میں نزاع اور اختلاف ختم ہو جاتا لیکن دنیا میں عملی طور پر حق اور باطل کے اختلاف کا فیصلہ کر دینا خلافِ حکمت ہے۔ دنیا دار تکلیف اور دارِ ابتلاء وامتحان ہے۔ عملی فیصلہ یوم جزا ہی میں مناسب ہے۔

فائدہ: ﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ﴾ میں قول کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود ہے اور ﴿مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ میں مقولہ کے ساتھ تشبیہ دینا ہی مقصود ہے لہٰذا تشبیہ میں تکرار نہیں رہا۔ نیز تاکید کے لیے تکرار عین بلاغت ہے۔ ﴿فَافهم ذٰلك و استقم﴾

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ

اور اس سے ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ پڑھئے وہاں نام اس کا اور دوڑا ان کے

خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ

اجاڑنے کو ایسوں کو نہیں پہنچتا کہ بیٹھیں ان میں مگر ڈرتے ہوئے ان کو

فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَ لِلّٰهِ

دنیا میں ذلت ہے اور ان کو آخرت میں بڑی مار ہے اور اللہ ہی کی ہے

الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

مشرق اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ برحق اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

گنجائش والا ہے خبر رکھتا۔

شناعت بست ونہم (۲۹)

باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ ... الٰی ... اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾﴾

یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب ہی اس امر کے مدعی ہیں کہ ہم حق پر ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ حق سے کس قدر دور ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے خواہ دل سے اور خواہ زبان سے اور خواہ اعضاء اور جوارح سے اور فقط اس پر کفایت نہ کرے بلکہ اُن کے ویران اور برباد کرنے کی کوشش کرے مساجد کی بے حرمتی کرنا اور اُن کو منہدم کرنا یہ مساجد کی ظاہری تخریب ہے اور عبادت اور ذکر اللہ کی بندش کر دینا یہ مساجد کی معنوی تخریب اور باطنی ویرانی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ﴾ (التوبہ:۱۸)

ترجمہ: "اللہ کی مساجد کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور نماز قائم کی۔"

میں عمارت سے ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی عمارت مراد ہے اسی طرح ﴿وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی تخریب مراد ہے۔ غرض یہ کہ مساجد کو ویران کرنا سب کے نزدیک نہایت قبیح اور فعل شنیع ہے اور یہ تینوں گروہ اس بلا میں مبتلا ہیں۔ یہود اور نصاریٰ نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو ویران کیا اور مشرکین مکہ نے مسجد حرام کو ویران کیا اور اس میں خدا کا نام لینے سے مانع اور مزاحم بنے۔ ان ظالموں کو چاہیے تھا کہ مسجدوں میں اور خدا کے گھروں میں قدم بھی نہ رکھتے مگر ڈرتے ہوئے کہ مبادا خدا کے گھر کے ادب

اور تعظیم میں ہم سے کوئی قصور نہ ہو جائے جس سے خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس گھر کا ادب یہی ہے کہ اس کو اللہ کے ذکر اور عبادت سے آباد کیا جائے۔ خدا کے دربار میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے ہی دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے۔ افسوس کہ یہ لوگ نہ خدا سے ڈرے اور نہ اس کے گھر کا ادب کیا بلکہ ظلم ڈھانے لگے اور اللہ کے بندوں کو اس کے دربار میں حاضری سے روکنے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ دربار شاہی کو ویران کرنے کی کوشش کو نا اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں اس لیے یہ لوگ دونوں جہان میں سزایاب ہوں گے ان کو دنیا میں بھی سخت رسوائی نصیب ہوگی کہ قتل اور قید کئے جائیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑا عذاب ہوگا۔ اور اے مسلمانو! اگر کافر تم کو مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ میں جانے سے روکیں تو ملول نہ ہونا۔ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو تمہارے لیے مسجد بنا دیا ہے ہر جگہ تمہارے لیے نماز اور عبادت درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی جسم اور جسمانی نہیں کہ جو کسی خاص مکان میں موجود ہو اور دوسرے مکان میں نہ ہو وہ تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے البتہ تم زمان اور مکان اور جہت کے ساتھ مقید ہو اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمہاری عبادت کے لیے ایک جہت مقرر فرما دی اور ایک قبلہ متعین کر دیا لیکن اگر تم فرائض میں کسی دشمن کے خوف کی وجہ سے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکو۔ یا اندھیری رات میں قبلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے تم نے تحری کر کے نماز پڑھ لی اور بعد میں معلوم ہوا کہ نماز قبلہ رُخ نہیں پڑھی گئی یا سفر میں سواری پر نوافل پڑھنا چاہتے تھے اور سواری کا منہ قبلہ کی طرف نہ تھا اور سواری سے اترنے میں دشواری تھی تو ان حالات میں نماز پڑھتے وقت جدھر بھی اپنا منہ کر لو گے تو ادھر ہی اللہ کا رخ ہے یعنی وہی جہت اور سمت قبلہ کی ہے اور تمہاری نماز ہر حال میں صحیح اور مقبول ہے اور ہر حال میں اللہ کا قرب اور حضور تم کو حاصل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانی نہیں کہ اگر ایک مکان میں موجود ہو تو دوسرے مکان میں موجود نہ ہو وہ کسی مکان اور جہت کے ساتھ مقید نہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ وسعت اور سہولت اس لیے عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ بڑے ہی وسیع رحمت والے ہیں۔

امام ربانی فرماتے ہیں کہ ﴿وَاسِعٌ﴾ سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی وسعت مراد ہے۔ اس کی ذات کی طرح اس کی وسعت بھی بے چون و چگون ہے جس کی کیفیت حیطۂ ادراک سے باہر ہے اور بندہ کی حاجتوں اور مصلحتوں کے خوب جاننے والے ہیں۔ حسن بصریؒ اور قتادہؒ سے مروی ہے کہ یہ حکم قبلہ متعین ہونے سے پہلے تھا ابتداء میں اختیار تھا کہ جس سمت میں چاہیں نماز پڑھیں بعد میں یہ حکم منسوخ ہوا مگر یہ قول ضعیف ہے اور روایات سے اس پر کوئی سند اور دلیل نہیں اور بعض کہتے ہیں کہ تحویل قبلہ کی تمہید ہے اور یہود اور نصاریٰ کا رد ہے کہ جو ہر ایک اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ مشرق اور مغرب سب اسی کا ہے جس جہت اور جس سمت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے وہی جہت قبلہ ہے اور آیت کریمہ اپنے عموم کی وجہ سے ان تمام صورتوں کو شامل ہے جو اس کے شانِ نزول میں مروی ہیں۔ ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن میں اسی عموم کو اختیار فرمایا ہے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ

اور کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد وہ سب سے پاک ہے بلکہ اس کا مال ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا

میں سب اس کے آگے ادب سے ہیں نیا نکالنے والا آسمان اور زمین کا اور جب حکم کرتا ہے ایک کام کو تو

یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

یہی کہتا ہے اس کو ہو وہ ہوتا ہے

شناعت سی ام (۳۰) ایضًا

باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ ... الٰی ... كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾﴾

اللہ کی مسجدوں کو ویران کرنا بلاشبہ ظلم ہے مگر یہ ظالم اس سے بڑھ کر شرک کے ظلمِ عظیم میں مبتلا ہیں اور وہ ظلمِ عظیم یہ ہے کہ یہ ظالم یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے تھے اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتاتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا احمقانہ اور گستاخانہ کلمہ ہے سب کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ توالد اور تناسل سے پاک اور مُنزّہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا عقلاً ناممکن ہے اس لیے کہ بیٹا باپ کے مماثل اور مشابہ اور ہم جنس ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ بے مثل اور بے چون وچگون ہے ورنہ اگر بیٹا باپ کے ہم جنس نہ ہو تو پھر وہ بیٹا اس باپ کا فرزند نہ ہوگا نیز بیٹے کا باپ کے ہم جنس نہ ہونا ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ نیز باپ اولاد کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد سے پہلے بیوی کا محتاج ہوتا ہے کہ اولاد بغیر زوجہ کے ممکن نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ صمد یعنی بے نیاز ہے کسی کا محتاج نہیں۔ نیز ولادت کے لیے تغیر اور تبدّل اور تجزی اور انقسام لازمی ہے اور یہ خاصہ ممکن اور حادث کا ہے۔ قدیم میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔ نیز اگر بالفرض خدا تعالیٰ کے لیے فرزند ہو تو دو حال سے خالی نہیں یا وہ فرزند بھی خُدا اور واجب لذاتہٖ ہوگا یا نہیں اگر وہ فرزند خدا ہوا تو لامحالہ مستقل ہوگا اور باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا۔ اس لیے کہ خدائی کے لیے بے نیازی لازم ہے حالانکہ بیٹے کا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہونا عقلاً محال ہے بیٹے کا وجود ہی باپ سے ہوا ہے اور جب بیٹا خدا ہونے کی وجہ سے باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو پھر اس کو باپ سے کوئی تعلق بھی نہ ہوگا اور بیٹے کا باپ سے بے تعلق ہونا ناممکن ہے اس لیے کہ فرع کا اصل سے بے تعلق ہونا عقلاً محال ہے۔ علاوہ ازیں جب بیٹا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو باپ خدا نہ رہے گا اس لیے کہ خدا سے کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا وہ خدا ہی کیا ہوا جس سے کوئی مستغنی اور بے نیاز

ہو سکے اور اگر یہ کہو کہ وہ بیٹا خدا اور واجب الوجود نہیں تو لامحالہ وہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہوگا اور اس کا عبد اور مملوک ہوگا لہٰذا فرزند کا عبد اور مملوک ہونا لازم آئے گا اور بیٹا عبد اور مملوک نہیں ہوتا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے ﴿ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی اس کے لیے کوئی اولاد نہیں بلکہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں خاص اسی کی مملوک ہیں اور ملکیت اور ابنیت جمع نہیں ہو سکتی اس لیے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ مملوک اور مخلوق مالک اور خالق کے ہم جنس نہیں اور فرزند باپ کے ہم جنس ہوتا ہے اسی وجہ سے شریعت میں یہ مسئلہ ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ فرزندیت اور عبدیت میں تباین کلی اور منافاتِ تامۃ ہے۔ پس جب کہ بندوں میں فرزندیت اور عبدیت جمع نہیں ہو سکتی تو بارگاہ الوہیت میں یہ دونوں چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں اور علاوہ مملوک ہونے کے آسمان و زمین کے رہنے والے تمام کے تمام جن میں فرشتے اور حضرت عزیر اور حضرت مسیح بھی داخل ہیں۔ سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ بعضے برضا و رغبت جیسے فرشتے اور انبیاء کرام اور مؤمنین صالحین اور بعضے جبراً و قہراً جیسے شیاطین اور کفار و فجار۔ یہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ارادہ اور مشیت کو ٹال سکے اور اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ اور کافر و فاجر جو ظاہراً اس کی معصیت کرتے ہیں وہ تکوینی اور باطنی طور پر اللہ ہی کے ارادہ اور مشیت سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے ان کو معصیت کرنے کی قدرت دی ہے ورنہ اگر وہ قدرت نہ دیتا تو کوئی معصیت نہ کر سکتا۔ غرض یہ کہ تمام موجودات اسی کے قبضہ تصرف میں ہیں جس کو چاہے مارے اور جس کو چاہے جلائے کوئی اس کے تصرّف سے باہر نہیں نکل سکتا اور جس کی یہ شان ہو اس کا کوئی ہم جنس اور مماثل نہیں ہو سکتا۔ اور بیٹے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ باپ کے ہم جنس ہو۔ اور عجب نہیں کہ ﴿ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴾ سے الزام مقصود ہو کہ جن کو تم خدا کا بیٹا اور اولاد کہتے ہو وہ سب اللہ کی عبودیت کے معترف اور مقر ہیں اور ہر وقت اسی کی تسبیح و تنزیہ میں لگے رہتے ہیں۔ پھر تم اُن کو خدا کی اولاد کس طرح بتلاتے ہو۔ نیز ولادت کے لیے مادہ اور مدت اور آلات اور اسباب کی ضرورت ہے اور خدا کی شان یہ ہے کہ ﴿ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی بغیر مادہ کے آسمان اور زمین کا موجد ہے۔ محض اپنی قدرت سے تمام کائنات کو پردۂ عدم سے نکال کر مسند وجود پر لا بٹھلایا ہے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر دے تو اس کے لیے مشکل نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی ایجاد میں کسی مادہ اور مدت اور کسی آلہ اور سبب کا محتاج نہیں اس لیے کہ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو ﴿ كُنْ ﴾ کا حکم دیتا ہے یعنی موجود ہو جا! پس وہ شے فوراً موجود ہو جاتی ہے اور فرشتے اور حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سب اسی طریقہ سے پیدا ہوئے اور ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے پیدا ہونے کا نام کسی کے نزدیک ولادت نہیں پھر کیوں ان کو خدا کی اولاد بتاتے ہو۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام میں یہ قدرت نہ تھی کہ وہ کلمہ کُن سے کسی کو پیدا کر سکیں اور بقول نصاریٰ وہ تو اپنی جان بھی یہود کے ہاتھ سے نہ بچا سکے اور نہ دشمنوں پر غلبہ پا سکے تو پھر وہ خدا کیسے ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود اور نصاریٰ اور مشرکین خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے تھے۔ اوّل حق تعالیٰ نے ﴿ سُبْحٰنَهٗ ﴾ فرما کر اولاد سے اپنا پاک ہونا بیان فرمایا اور بعد ازاں چند وجوہ سے ان کا رَدّ فرمایا۔ اوّل یہ کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ سب اس کی ملک ہے اور اولاد ملک نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ تمام کائنات اسکی تابعدار اور اس کے ارادہ اور مشیت کے مسخر ہے کائنات کے ہر ذرہ سے حدوث اور احتیاج کے آثار اور علامات نمایاں ہیں جو سراسر وجوب ذاتی کے منافی ہیں اور حادث اور ممکن واجب ذاتی کا بیٹا نہیں ہو سکتا لہٰذا کائنات میں سے کوئی شے بھی خدا کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اولاد اگرچہ باپ کے برابر نہ ہو لیکن ہم جنس ضرور ہوتی ہے اور

کائنات کا کوئی ذرہ وجوب ذاتی میں باری تعالیٰ کا شریک اور سہیم نہیں۔

اور اگر چاہو تو جملہ ﴿ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴾ کو جملہ ﴿ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کا تتمہ اور تکملہ بنادو تو اب دونوں جملے مل کر ایک ہی دلیل بنیں گے علیحدہ علیحدہ دلیل نہ بنیں گے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ ﴿ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہے یعنی اللہ تعالیٰ بغیر مادہ کے آسمان وزمین پیدا کرنے والے ہیں اور ولادت کے لیے مادہ اور مدت درکار ہے۔ چوتھے یہ کہ حق تعالیٰ کی ایجاد کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو ﴿ كُنْ ﴾ فرمادیتے ہیں وہ اسی وقت موجود ہوجاتی ہے اور اس کا نام ولادت نہیں یا یوں کہو کہ یہ تمام صفاتِ کمال، خداوند ذوالجلال کے ساتھ مختص ہیں کسی فرشتہ اور نبی میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ خدا کے سوا نہ کوئی آسمان اور زمین کے ذرہ کا مالک ہے اور نہ ایک مچھر کے پَر کی ایجاد اور تخلیق پر قادر ہے پھر کس طرح خدا کے فرزند ہوئے۔ پانچویں یہ کہ بیٹا ہمیشہ باپ کا جزء ہوتا ہے اور جزء کسی مرکب کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے۔

فائدہ: نصاریٰ جب ان دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کے جواب سے لاجواب ہوتے ہیں تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری مراد بیٹے سے حقیقی معنی نہیں بلکہ معنی مجازی مراد ہیں جیسے پیار اور محبت میں کسی کو بیٹا بول دیتے ہیں تو اس سے معنی حقیقی مراد نہیں ہوتے بلکہ محبوب اور برگزیدہ کے معنے مراد ہوتے ہیں اس معنی کو ہم حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔

جواب: اگر ابن اللہ سے خدا کے محبوب اور برگزیدہ کے معنی مراد ہیں تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے سارے ہی انبیاء علیہم السلام خدا کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ ابن اللہ کا اطلاق محبوب اور برگزیدہ کے معنی میں اگرچہ کفر اور شرک نہیں لیکن کفر اور شرک کا ایہام اس میں ضرور ہے جیسے غیر اللہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم وتحیت کفر نہیں بلکہ حرام ہے۔ اسی طرح شریعت محمدیہ میں سجدہ تحیت وتعظیم کی طرح اس لفظ کے اطلاق ہی کو ممنوع قرار دیا۔ بارگاہِ خداوندی کے آداب کے خلاف ہے کہ زبان سے کوئی لفظ ایسا نکالا جائے جس میں خدا تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس کے خلاف کا ابہام بھی ہو۔ پادری صاحبان جب بالکل ہی لاچار ہوجاتے ہیں تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ مسئلہ سرالٰہی اور رمز خداوندی ہے ہم اس کے سمجھانے سے قاصر ہیں۔ لیکن اب اس صریح خلاف عقل عقیدہ کے ماننے والے بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔ سوائے ان پادریوں کے جن کو مشن سے تنخواہ ملتی ہے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا بتلاتے ہیں۔ باقی یورپ اور ایشیاء کے اکثر عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بندہ اور رسول سمجھنے لگے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآنِ کریم کی ساڑھے تیرہ سو برس کی مسلسل پکار کے بعد بنی اسرائیل کی بھیڑوں کی سمجھ میں آیا کہ ابنیت، تثلیث کا عقیدہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔

عذرِ لنگ:

اور بعض سنجیدہ عیسائی جنہوں نے صوفیہ کرام کی کتابوں کا کچھ مطالعہ کیا ہے وہ اپنے اس عقیدہ ابنیت کی اس طرح تاویل کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی صفات صفاتِ خداوندی کا عکس اور پرتو تھیں اور چونکہ اس قسم کا انعکاس سوائے حضرت مسیح علیہ السلام کے کسی مخلوق میں نہیں ظاہر ہوا اور اس بارہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا مرتبہ تمام مخلوق سے بالا اور برتر تھا اس لیے ان کو خدا تعالیٰ سے ایسی نسبت ہے جو اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں اسی نسبت کو ہم ابوّت اور بنوّت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسیح کو ابن اللہ کہتے ہیں۔

جواب: یہ محض ایک اصطلاحی تاویل ہے جس کے تسلیم کرلینے کے بعد عیسائیوں کے پاس مسیح علیہ السلام کی بالخصوص ابن اللہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں رہتی۔ حق تعالیٰ نے اپنے بہت سے برگزیدہ بندوں کو اپنے جلال و جمال کا مظہر بنایا اور ان پر اپنی صفات کمال کا خاص عکس اور

پر تو ڈالا جو اور کسی مخلوق پر نہیں ڈالا تو کیا ان حضرات کو بھی ابن اللہ کہنا جائز ہوگا۔

حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی ذات بابرکات بھی صفاتِ خداوندی کا خاص مظہر اور آئینہ تھی اور سیّدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات تو تمام اوّلین اور آخرین کے کمالات کی جامع تھی۔

نصاریٰ کی اگر یہ تاویل صحیح ہو تو کواکب پرست بھی یہی تاویل کر سکتے ہیں ہم چاند اور سورج وغیرہ کو کامل ترین مخلوق الٰہی یا مظہر جلال خداوندی سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ صابئین چاند اور سورج کو خدا تعالیٰ کا مظہر اتم سمجھے اور نصاری مسیح بن مریمؑ کو اور دونوں گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

شبہ:

بادی النظر میں یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز عدم محض ہو تو پھر اس کو وجود کا حکم کیونکر دیا جا سکتا ہے کیونکہ حکم تو موجود کو دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ موجود کو وجود کا حکم دینا تحصیل حاصل ہے۔

جواب: یہ ہے کہ یہ امر کن۔ امر تکلیفی نہیں جس کے لیے وجود مخاطب اور فہم خطاب ضروری ہو بلکہ یہ امر تسخیری اور تکوینی ہے جس سے معدوم کو موجود کیا جاتا ہے۔ ذات انسانی میں اصل فاعل مختار اس کا اندورنی نفس ناطقہ ہے اور اعضاء اور جوارح اس کے حکم پر حرکت کرتے ہیں۔ نفس ناطقہ جب زبان کو بولنے کا حکم دیتا ہے تو زبان سے وہ کلمات ظہور اور وجود میں آنے لگتے ہیں کہ پہلے سے جن کا وجود خارجی میں کہیں نام ونشان نہ تھا اور نفس ناطقہ قدم کو چلنے کا حکم دیتا ہے جس سے وہ حرکات ظہور میں آتی ہیں جو پہلے سے معدوم تھیں مگر نفس ناطقہ کے علم اور تصوّر میں تھیں۔

اسی طرح سمجھو کہ جو ممکنات خارج میں معدوم ہیں وہ سب علم الٰہی میں موجود ہیں جس معدوم کو حق تعالیٰ اپنے خزانۂ علم سے نکال کر خارج میں موجود کرنا چاہتا ہے اس کو ﴿ كُنْ ﴾ خطاب فرماتے ہیں۔ اسی طرح وہ معدوم وجود علمی سے نکل کر وجود خارجی میں آجاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو ہر شدنی امر کا اس کے ہونے سے پہلے علم ہوتا ہے اس لیے وہ چیزیں جو ابھی عدم سے وجود میں نہیں آئی ہیں وہ سب اس کے علم میں موجود ہیں اور اس کے نزدیک موجود کا حکم رکھتی ہیں اس لیے جب وہ ان کو عدم سے وجود کی طرف نکلنے کا حکم دیتا ہے اور کن کہتا ہے تو موجود ہو جاتی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس معدوم کی صورت علم الٰہی میں پہلے سے موجود ہوتی ہے وہ کن کا مخاطب اور محکوم ہوتی ہے متکلمین کے دو گروہ ہیں ایک اشاعرہ اور ایک ماتریدیہ۔ ماتریدیہ کے نزدیک یہ آیت اپنے ظاہر اور حقیقت پر ہے اور اشاعرہ کے نزدیک یہ آیت مجاز اور تمثیل پر محمول ہے قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار فرمایا کہ آیت میں حقیقتاً کسی شے کو ﴿ كُنْ ﴾ کا خطاب کرنا مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کو حقیقتاً امر فرمایا ہو اور اس نے امتثال کیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت کی یہ ایک مثال دی ہے کہ جس طرح کوئی آمر کسی مامور کو حکم دے وہ فوراً مطیع ہو جائے۔ اسی طرح جب ہم کسی شیء کو پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ شے فوراً موجود ہو جاتی ہے۔ ہمارے ارادہ اور پیدائش میں ذرہ برابر فاصلہ نہیں ہوتا۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ

اور کہنے لگے جن کو علم نہیں کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا ہم کو آوے کوئی آیت

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ

اسی طرح کہہ چکے ہیں ان سے اگلے انہیں کی سی بات ایک سے ہیں دل بھی ان کے

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ہم نے بیان کر دیں نشانیاں واسطے ان لوگوں کے جن کو یقین ہے

شناعت سی ویکم (۳۱) ایضاً

باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ... الیٰ ... لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾﴾

گزشتہ آیات میں اُن کی توحید کا حال بیان فرمایا۔ اب ان آیات میں نبوت کے بارہ میں ان کے شبہ کو بیان فرماتے ہیں اور یہ نادان یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بلاواسطہ کلام کیوں نہیں فرماتا کہ یہ خود بالمشافہ ہم سے کہہ دے کہ یہ ہمارے نبی اور رسول ہیں تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہوجائیں اور ان کی اطاعت کرنے لگیں یا اگر ہم سے کلام نہیں کرتے تو کم از کم من جانب اللہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی آجائے کہ جسے دیکھ کر ہم کو بداہۃً آپ کی نبوت کا یقین آجائے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں یہ کوئی نیا جاہلانہ سوال نہیں جو جاہل ان سے پہلے گزرے وہ بھی ایسی باتیں کہتے رہے ہیں اور یہی اُن کے جاہل اور نادان ہونے کی دلیل ہے کہ باوجود اپنے کمال نالائقی کے اپنے کو خدا تعالیٰ کی ہم کلامی کا اہل سمجھتے ہیں۔ تم تو دُنیاوی بادشاہوں اور امیروں کی ہم کلامی کا بھی رُتبہ نہیں رکھتے۔ اگر ہر شخص خدا کی ہم کلامی کا رتبہ رکھتا تو پھر انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کے بھیجنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا دُنیا میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں وزیر کے حکم کو نہیں مانوں گا جب تک کہ بادشاہ خود بالمشافہ مجھ سے آکر یہ نہ کہہ دے کہ یہ میرا وزیر ہے تم اس کی اطاعت کرنا اور چونکہ ان کی یہ بات بالکل مہمل تھی اس لیے حق تعالیٰ نے اس کا کوئی جواب نہیں ارشاد فرمایا:

ع پس جواب احمقی آمد سکوت

بلکہ اس جاہلانہ سوال کے منشاء کو بیان فرمایا وہ یہ کہ ان اگلے اور پچھلے کافروں کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ان پچھلے نادانوں کے شبہات پہلے نادانوں کے شبہات کے مشابہ ہیں۔ یعنی اس زمانہ کے کافر اگرچہ پہلے زمانہ کے کافروں سے بہت بعد ہیں اور آپس میں کوئی سلسلۂ وصیت بھی نہیں مگر قلوب سب کے ہمرنگ ہیں اسی وجہ سے شبہات میں بھی تشابہ اور ہم رنگی ہے اور آیات اور معجزات کے انکار میں ایک دوسرے کے قدم بقدم ہیں اور من مانے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ تم ﴿اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ﴾ کہہ کر ایک نشانی مانگتے ہو۔ ایک نشانی نہیں تحقیق ہم آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لیے صدہا بلکہ ہزار واضح اور روشن نشانیاں ظاہر کر چکے ہیں مثلاً: شجر اور حجر کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنا اور جانوروں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دینا وغیرہ وغیرہ۔ مگر

افسوس ان نادانوں کو ان روشن اور واضح معجزات سے کوئی نفع نہ ہوا۔ یہ آیات بنیات ان لوگوں کے لیے نافع ہیں جو یقین اور اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ضدی اور معاند نہیں۔

فائدہ: تشبیہ اور تشابہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مختلف المراتب ہوتی ہیں اور تشابہ میں دونوں متشابہ مساوی اور برابر ہوتی ہیں اسی وجہ سے جہاں مساوات کا بیان مقصود ہوتا ہے وہاں بجائے تشبیہ کے تشابہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کما قال قائل ؎

رق الزجاج و رقت الخمر فتشابها و تشاكل الامر

فكا نما خمر ولا قدح و كانما قدح ولا خمر

اسی طرح یہاں ﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ میں تشابہ کا لفظ اختیار فرمایا اس لیے کہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ اگلے اور پچھلے کافروں کے دل یکساں ہیں کوئی فرق نہیں۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ
ہم نے تجھ کو بھیجا ہے ٹھیک بات لے کر خوشی اور ڈر سنانے کو اور تجھ سے پوچھ نہیں
الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ
دوزخ والوں کی اور ہر گز راضی نہ ہونگے تجھ سے تو یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تابع نہ ہو تو
مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ
ان کے دین کا تو کہہ جو راہ اللہ دکھاوے وہی راہ ہے اور کبھی تو چلا
اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ
ان کی پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے
وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ
حمایت کرنے والا اور نہ مدد گار جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے
تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
پڑھنے کا وہ اس پر یقین لاتے ہیں اور جو کوئی منکر ہو گا اس سے سو انہیں کو
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴ ۹ ۱۴
نقصان ہے۔

خاتمۂ کلام واتمامِ حجت والزام وتسلیۂ سیّدانام علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ ... الیٰ ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾﴾

ربط: یہاں تک بنی اسرائیل کی قباحتوں اور شناعتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے شنائع بنی اسرائیل کی تفصیل کی ابتداء کفران نعمت اور دنائت اور خست سے فرمائی:

كَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾

ترجمہ: "اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہ کریں گے۔"

اور پھر درمیان میں اُن کی قساوتِ قلب کو ذکر فرمایا:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ﴾

ترجمہ: "پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اس کے بعد پس وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔"

اور اس قبائح اور شنائع کے سلسلہ کو ان کے کبر ونخوت پر ختم فرمایا کہ اس قدر مغرور اور متکبر ہیں کہ اپنے کو خداوند ذوالجلال کی ہم کلامی کا اہل سمجھتے ہیں اور احکم الحاکمین کے وزراء ونائبین یعنی انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے اتباع اور اطاعت کو اپنے لیے کسر شان سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تکبر اور نخوت سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں تکبر ہی تمام امراض کی جڑ ہے یہی مرض سب سے پہلے دنیا میں آیا اور یہی مرض ابلیس کی لعنت کا سبب بنا۔ اب ان قبائح اور شنائع کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ اے ہمارے نبی آپ مغموم اور رنجیدہ نہ ہوں اور اب اُن کے رشد وہدایت کی طمع دل سے نکال دیجیے جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہوں اور کبر اور نخوت سے لبریز ہوں۔ اُن سے اسلام اور ایمان کی توقع نہ رکھیے۔ حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔ آپ کی نبوت ورسالت کے اتنے واضح اور روشن دلائل ہم نے واضح کر دیئے ہیں کہ جس کے بعد طالب حق کے لیے کسی قسم کے شک اور تردّد کی گنجائش نہیں اور علاوہ ازیں ہم نے آپ کو دین حق دے کر بھیجا ہے جو آپ کی نبوت کی مستقل اور روشن دلیل ہے اور ایسا ثابت اور پختہ ہے کہ جو موجب طمانیت ویقین ہے اور شکوک اور شبہات سے اس میں تزلزل کا امکان نہیں۔ بالفرض اگر آپ سے کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہوتا تو فقط آپ کا دین حق اور آپ کی شریعت حقہ ہی آپ کی نبوت کے ثابت کرنے کے لیے کافی اور وافی تھی، نیز ہم نے آپ کو مخلوق کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے کہ ماننے والوں کو جنت کی بشارت سنائیں اور منکریں کو عذاب سے ڈرائیں اور پھر لوگ اپنے اختیار سے ایمان لائیں اگر ایسے معجزات ظاہر کر دیئے جائیں کہ جن سے مجبور اور لاچار ہو کر ایمان لانا پڑے تو وہ ایمان بے سود ہے مکلف بنانے کا جو مقصد ہے وہ جبری ایمان کی صورت میں باقی نہیں رہتا اور اگر یہ بد نصیب اب بھی ایمان نہ لائیں اور آپ کی دعوت حقہ کو قبول نہ کریں تو آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ آپ نے اپنا فرض منصبی یعنی دعوت وتبلیغ ادا کر دیا۔ آپ سے ان جہنمیوں کے بارہ میں کوئی باز پرس نہ ہوگی از خود انہوں نے کفر اور جہنم کی راہ اختیار کی ہے۔ اگر آپ کا اختیار چلتا تو کبھی ان کو جہنم کی راہ نہ چلنے دیتے اور ان لوگوں کا آپ کی پیروی اور اتباع سے اعراض اس لیے نہیں کہ آپ کے دلائل نبوت میں کسی قسم کا قصور ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ یہود اور نصاریٰ ہرگز آپ سے راضی اور خوش نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ ان کی منسوخ ملت کا اتباع اور پیروی نہ کریں وہ اس غرّہ میں ہیں کہ ہم کتب الٰہیہ کے علوم کے حامل اور علمبردار ہیں۔ ہم کسی کا کیوں اتباع کریں۔ ہم تو سب کے

متبوع اور سردار ہیں۔ لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو متبوع سمجھتا ہو وہ تابع بننے پر کب راضی ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ ان کے اس خیال خام کے جواب میں یہ کہہ دیجیے کہ تحقیق اللہ کی ہدایت ہر زمانہ میں وہی ہدایت ہے جو اُس زمانہ کا نبی اور رسول لے کر آئے اور گزشتہ ہدایتیں اگرچہ اپنے اپنے وقت پر ہدایتیں تھیں مگر منسوخ ہو جانے کے بعد ہدیٰ۔ ہُدیٰ نہیں رہتی بلکہ ہوائے نفس بن جاتی ہے اور نفسانی خواہشوں کا اتباع کبھی ہدایت نہیں ہو سکتا۔ وہ تو صریح ضلالت ہے اور اگر بالفرض محال آپ ان ہوا پرستوں کی نفسانی خواہشوں کا اتباع کریں بعد اس کے کہ آپ کے پاس اس بات کا علم قطعی آ چکا ہے کہ اب ہدایت اس میں منحصر ہے کہ جو اللہ نے آپ پر نازل فرمایا۔ اور گزشتہ کی تمام ہدایتیں منسوخ ہو کر ہوائے نفس بن چکی ہیں۔ پس اگر آپ آخری حکم اور آخری ہدایت کو چھوڑ کر کسی پہلی ہدایت اور کسی پہلے حکم کا اتباع کریں تو اللہ کے مقابلہ میں کوئی آپ کا حمائتی اور مددگار نہیں جو اللہ کے عذاب سے آپ کو بچائے۔ حتیٰ کہ اگر آپ توریت اور انجیل پر عمل کریں تو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام بھی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ان بے چاروں کا تو ذکر ہی کیا۔

فائدہ: یہ تہدیدی خطاب ظاہراً حضور ﷺ کو ہے لیکن سنانا معاندین کو ہے۔ عناد کی بناء پر ان کو مخاطب بھی نہیں بنایا اور ان کے خطاب سے اعراض فرمایا۔

یہاں تک ان اہل کتاب کا ذکر تھا کہ جو برائے نام اہل کتاب ہیں اور فی الحقیقت اپنی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے اور عناد اور تعصب کی وجہ سے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے۔ آئندہ آیت میں ان اہل کتاب کی مدح ہے جنہوں نے دل و جان سے حق کا اتباع کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی توریت اور انجیل عطا کی اور ان کی حالت یہ ہے کہ اس کتاب کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ہے یعنی نہ اُس میں لفظی تحریف کرتے ہیں اور نہ معنوی تحریف اور نبی آخر الزمان ﷺ کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں ہیں ان کو چھپاتے نہیں ایسے ہی لوگ حقیقتاً اپنی کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور اپنی کتاب کی ہدایت اور بشارت کے مطابق نبی آخر الزمان ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں اور جو لوگ نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان نہیں لاتے وہ درحقیقت اپنی اپنی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے اور جائز ہے کہ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ میں ﴿بِهٖ﴾ کی ضمیر بجائے کتاب کے ہُدیٰ یا قرآن کی طرف راجع کی جائے۔ یعنی جو لوگ توریت اور انجیل کی کماحقہٗ تلاوت کرتے ہیں وہی اس ہدایت کو قبول کرتے ہیں جو نبی آخر الزمان ﷺ پر نازل ہوئی اور وہی اس آخری کتاب پر ایمان لاتے ہیں جس کی بشارت اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور فلاح دارین حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی کتاب کا انکار کرتے ہیں یعنی توریت اور انجیل میں تحریف کرتے ہیں اور حضور ﷺ کے ظہور کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں مذکور ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔ پس یہی لوگ خسارہ والے ہیں کہ اپنی کتاب پر جو ایمان رکھتے تھے وہ بھی ہاتھ سے گیا اور جائز ہے کہ ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ﴾ میں ﴿بِهٖ﴾ کی ضمیر ہُدیٰ اور قرآن کی طرف راجع ہو یا حضور ﷺ کی طرف راجع ہو یعنی جو لوگ حضور ﷺ کی نبوت یا آپ کی ہدایت یا آپ کے قرآن کے منکر ہیں وہ انتہائی خسارہ میں ہیں اس لیے کہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور قرآن آخری کتاب ہے۔ جب اس پر بھی ایمان نہ لائے تو آخرت کی نجات کا ذریعہ آخر کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے تو چالیس آدمی اُن کے ہمراہ تھے بتیس ان میں حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے تھے اور بحیرا راہب بھی ان میں تھا اُن کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں اور الکتاب سے قرآن مراد

ہے اور ﴿حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تلاوت کے پورے حقوق ادا ہونے چاہئیں۔ فرض کرو کہ ایک بادشاہ اپنے فرمان کو اپنے سامنے پڑھنے کا حکم دے تو اس وقت یہ حالت ہوگی کہ ہر لفظ کو سنبھل سنبھل کر اور صاف صاف ادا کرو گے اور معنی اور مفہوم کی طرف بھی پوری توجہ ہوگی اور دل میں یہ پختہ ارادہ ہوگا کہ اس فرمان میں جس قدر بھی احکام ہیں حرف بحرف ان کی تعمیل کروں گا۔ اور پڑھتے وقت دربارِ شاہی کے آداب سے بھی ذرّہ برابر غفلت نہ ہوگی۔ اسی طرح تلاوت قرآن کو سمجھو کہ ہم اللہ ربّ العالمین کے سامنے پڑھ رہے ہیں ایک ایک لفظ کو صاف صاف ادا کرو۔ یہ ترتیل اور تجوید ہے اور اس کے اتباع اور تعمیل کے عزم بالجزم کا نام ایمان اور اطاعت ہے اسی وجہ سے ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ فرمایا اور حضرت عمرؓ سے ﴿يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے کہ تلاوت کا حق یہ ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کرتے وقت جنت کے ذکر پر گزرے تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے اور جب آگ کے ذکر پر گزرے تو خدا سے پناہ مانگے کہ اے اللہ اس سے محفوظ رکھنا۔ (ابن ابی حاتم)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے تم پر کیا اور وہ کہ بڑا کیا تم کو

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا

سارے جہان پر اور بچو اس دن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی کے ایک ذرہ اور نہ

يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

قبول ہو اس کی طرف سے بدلا اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور نہ ان کو مدد پہنچے۔

تکریر تذکیر و اعادۂ تحذیر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ ... الٰى ... وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾

ربط: ابتداء سورت میں جب بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا تو اسی عنوان اور اسی آیت سے شروع فرمایا اور طویل تفصیل کے بعد پھر اسی عنوان اور اسی آیت پر خطاب کو ختم فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ اولاً حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا تاکہ شکر کی راہ اختیار کریں اور کفرانِ نعمت سے احتراز کریں۔ بعد ازاں حق تعالیٰ نے اپنے انعامات اور اپنی عنایات اور ان کی جنایات اور تقصیرات کی تفصیل فرمائی جو یہاں آ کر ختم ہوئی اخیر میں حق تعالیٰ نے پھر اسی مضمون کا اعادہ فرمایا جو ابتداء میں اجمالاً ان سے کہا گیا تھا تاکہ تفصیل کے بعد جب اجمال کا اعادہ کیا جائے تو تمام تفصیل بیک وقت نظروں کے سامنے آ جائے اور یہ طریقہ بلغاء کے نزدیک نہایت بلیغ ہے اور تعلیم و تفہیم میں غایت درجہ معین ہے اور ابوحیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اس سورت میں تین مرتبہ ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ کے معزز خطاب سے مخاطب فرمایا اور اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے خطاب سے مشرف اور سرفراز فرمایا اور اس نسبت کو یاد دلا کر شکر

اور اطاعت کی دعوت دی لیکن بنی اسرائیل نے جب اس نداء اور خطاب کے شرف کو ملحوظ نہ رکھا تو حق تعالیٰ نے ان سے اعراض فرمایا اور تین مرتبہ کے بعد ان کو مخاطب نہیں بنایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: کہ اے بنی اسرائیل پھر ایک بار تم کو خطاب کرتے ہیں اور یہ تیسری بار ہے اب اس کے بعد ہم تم کو مخاطب نہ بنائیں گے۔ وہ آخری خطاب یہ ہے کہ میری نعمتوں کو اس حیثیت سے یاد کرو کہ وہ میرا عطیہ تھیں۔ میری نسبت کے شرف اور عزت کو دیکھو اور یاد کرو اور پھر اس حیثیت کو دیکھو کہ اس نعمت کا میں نے تم پر محض اپنی مہربانی سے انعام کیا تھا۔ ذرہ برابر تمہارا استحقاق نہ تھا اور یاد کرو اس امر کو کہ میں نے تم کو محض اپنے فضل سے سارے جہانوں پر فضیلت اور بزرگی دی تھی۔ یہ بزرگی میرا عطیہ تھا تمہاری ذاتی شئ نہ تھی کہ تم سے جدا نہ ہو سکے۔ تم اس غرہ میں نہ رہنا کہ یہ بزرگی تم سے چھینی نہیں جا سکتی۔ اگر اس فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو ہمارے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں کوئی کسی کی طرف سے کام نہ آئے گا اور ایک نفس کی دوسرے نفس کی طرف نسبت بدون ایمان کے کارآمد نہ ہوگی اور نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا کہ جو رہائی کا سبب بن سکے اور نہ بدون ایمان کے کوئی شفاعت اور سفارش نفع دے گی۔ البتہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمۃ اللہ علیہم کی شفاعت سے اہل ایمان کو نفع ہوگا اور نہ ان لوگوں کی کوئی مدد کی جائے گی اس لیے کہ نصرت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے مرسلین اور اہل ایمان سے کیا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝﴾ (المومن) کافروں سے وعدہ نہیں۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ
اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے ربّ نے کئی باتوں میں پھر اس نے وہ پوری کیں فرمایا میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا
اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾
پیشوا بولا اور میری اولاد میں بھی کہا نہیں پہنچتا میرا اقرار بے انصافوں کو

قصۂ کامیابی ابراہیم خلیل علیہ السلام در امتحان خداوندِ جلیل وتحویلِ کلام از ذکرِ بنی اسرائیل بسوئے ذکرِ اسمٰعیل علیہ السلام

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ ... الیٰ ... قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾

ربط: بنی اسرائیل اس بات پر مغرور تھے کہ ہم اہلِ کتاب اور اہل علم اور اولاد ابراہیم ہیں اس لیے ہم ہی سب کے متبوع اور مقتداء اور پیشوا اور امام ہیں۔ امامت اور سیادت ہمارے ہی گھر میں رہے گی۔ ہمیں کسی کے اتباع کی کیا ضرورت۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم کا قصہ ذکر فرمایا جس سے چند امور کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اوّل یہ کہ امام اور مقتدا وہی ہو سکتا ہے جو ظالم اور فاسق نہ ہو۔ اور تمہارا کفر اور ظلم خوب واضح ہو چکا ہے۔ ظالم اور فاسق ہو کر امامت اور متبوعیت کا خیال سودائے خام ہے امامت اور متبوعیت کا مرتبہ جب ہی ملتا ہے کہ جب اللہ کے امتحان میں کامیاب اور درست نکلے۔ دوم یہ بتلانا ہے کہ خانہ کعبہ جو مسلمانوں کا قبلہ ہے وہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے اس کی فضیلت اور بزرگی میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ تا کہ گزشتہ رکوع میں جو یہود کا بعض احکام کے نسخ خصوصاً تحویل قبلہ پر جو اعتراض تھا جس کا ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ﴾ میں کافی وشافی جواب گزر چکا۔ اس اعتراض کا قلع قمع ہو جائے چونکہ تحویلِ قبلہ کے مسئلہ کا اعظمِ ارکان، اسلام سے خاص تعلق ہے اس لیے اس بارہ میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ مفصل کلام کیا۔ اوّل بانی کعبہ کی فضیلت اور پھر ان کی امامت اور پھر خانہ کعبہ کی فضیلت اور پھر اس کی تحویل کی حکمتیں بیان کیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت اور قبلہ وہی ہے جو حضرت ابراہیم کا تھا۔ سوم یہ کہ ملّتِ اسلام وہی ملّتِ ابراہیمی ہے۔ چہارم یہ کہ اُمت مسلمہ اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور بعثت کی دعا سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔ لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر وہی شخص ہو سکتا ہے جو ملّت اسلام کو قبول کرے اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور خانہ کعبہ کو اپنا قبلہ سمجھے۔ پنجم یہ کہ یہ خیال کرنا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے خاندان سے نہیں اس لیے ہم ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے ایک اسحٰق علیہ السلام جن کے بیٹے اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام ہیں ایک مدت تک نبوت اور فضیلت حضرت اسحٰق اور اسرائیل علیہما السلام کی اولاد میں رہی۔ اب وہ فضیلت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کو پہنچی اور وہ نعمت تفضیل جس سے بنی اسرائیل کو سرفراز فرمایا تھا اب وہ بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہوئی۔ اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دونوں ہی بیٹوں کے لیے برکت کی دُعا کی تھی۔ جس طرح اسحٰق علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے برکت کی دُعا مانگی تھی، اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے بھی برکت کی دُعا مانگی تھی۔ جیسا کہ توریت کے سفر پیدائش باب ۱۷ میں ہے۔

''اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔'' انتہیٰ

پس تم کو چاہیے کہ اب اس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ جو ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہے اور اس کا ظہور اور اس کی بعثت دُعائے ابراہیمی کی برکت اور ثمرہ ہے اور اس نبی پر ایمان لا کر اُمت مسلمہ میں داخل ہو جاؤ اور دل وجان سے اس کی اطاعت کرو تا کہ تم کو بھی بقدر اطاعت اس برکت میں سے کچھ حصّہ ملے۔ اور ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح اسلام اور اطاعت اور وفاداری اور محبت اور جانثاری کا داغ اپنے جسم پر لگاؤ یعنی ختنہ کراؤ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کرائی تھی۔ توریت میں ہے کہ ختنہ اللہ کا داغ ہے جس طرح شاہی گھوڑوں پر داغ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل علیہ السلام اور اس کی اولاد کے لیے ختنہ کا داغ تجویز فرمایا۔ اور قوت شہویہ اور بہیمیہ کے محل پر ختنہ کے داغ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عضو سرکاری داغ سے داغی ہے بغیر سرکاری اجازت کے کسی مصرف میں اس کا استعمال جائز نہیں اور موئے لب کٹوانا اور ناخن کتروانا اور موئے بغل لینا اور مضمضہ اور استنشاق کرنا وغیر ذالک یہ بھی اسلام یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے داغ ہیں۔ لہٰذا اے بنی اسرائیل اگر تم نعمتِ تفضیل میں سے حصہ لینا چاہتے ہو تو اب اس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ کہ جو بنی اسمٰعیل میں سے دعائے ابراہیمی کے مطابق مبعوث ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کی تفضیل کا دَور دَورہ ختم ہو گیا اب تا قیامت بنی اسمٰعیل کی تفضیل کا دَور دَورہ رہے گا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے پروردگار نے چند باتوں سے آزمایا۔ ابراہیم علیہ السلام کی یہ آزمائش بھی ربّ کریم کی طرف سے تربیت تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار نے ابتداء ہی سے ابراہیم علیہ السلام کی طرح طرح سے تربیت کی۔ طفولیت میں رُشد عطاء کیا اور پھر مرتبۂ نبوت وخلت تک پہنچایا۔ یہاں

تک کہ بطور آزمائش ان کو چند باتوں کا حکم دیا تا کہ ملائکہ علوی اور سفلی کے سامنے ان کا فضل وکمال اور احسن استعداد اور کمال قابلیت اور اہلیت ظاہر ہو جائے۔ اور یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ جو مرتبہ ہم ان کو عطا کرنا چاہتے ہیں یہ اسی مرتبہ کے لائق اور اہل ہیں حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ سنت مستمرہ ہے کہ محض اپنے علم کی بنا پر کسی کو منصب اور مرتبہ نہیں عطا فرماتے جب تک کہ اس کی استعداد اور قابلیت اور اس کا استحقاق علیٰ رؤسِ الاشہاد ظاہر نہ ہو جائے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کے قصہ میں پیش آیا اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے فضل اور کمال اور استعداد قابلیت کے ظاہر کرنے کے لیے چند باتوں سے ان کا امتحان فرمایا۔ پس ابراہیم علیہ السلام دل وجان سے کمالِ مسرت وبشاشت کے ساتھ بلا کمی وبیشی کے ان تمام باتوں کو بتمام وکمال بجالائے۔ جس سے ان کی قوتِ علمیہ اور عملیہ کا کمال اور روح اور فطرت کی صفائی اور نورانیت اور ظاہر وباطن کی طہارت ونظافت خوب واضح ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم علیہ السلام! میں تجھ کو اس کے صلہ میں تمام لوگوں کا امام اور پیشوا بناؤں گا کہ تمام لوگ تیری پیروی کریں اور تیرا اتباع حقانیت کی دلیل ہو اور تیری مخالفت گمراہی کی دلیل ہو اور تیری ملّت تمام عالم کے لیے بمنزلہ دستور اساسی کے ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا یہود اور انصاریٰ اور مشرکین عرب اور مسلمان سب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں۔ عرض کیا کہ اے پروردگار اور میری اولاد میں سے ہر زمانہ میں کوئی امام رہے زمین کسی وقت بھی میرے سلسلۂ امامت سے خالی نہ رہے۔ غرض یہ تھی کہ تو نے مجھ کو تمام لوگوں کا امام بنایا اور قیامت تک میری بقاء عادۃً ممکن نہیں اس لیے بقائے امامت کی صورت یہ ہے کہ یہ منصب عظیم قیامت تک میری نسل میں باقی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں نے تمہاری یہ دعا قبول کی اور تمہاری ہی اولاد میں پیغمبری اور کتاب رہے گی جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں ہے۔ ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ (العنکبوت: ۲۷) مگر یہ سنائے دیتا ہوں کہ یہ ہر زمانہ میں ممکن نہ ہوگا۔ بعض زمانوں میں تمہاری تمام نسل اور اولاد ظالم ہوگی اور میرا یہ منصب امامت ظالموں اور فاسقوں کو نہیں دیا جاتا۔ اس لیے کہ اس منصب کے لیے عدالت اور تقویٰ شرط ہے اور اس وقت کے یہود اور نصاریٰ اشد انواع ظلم کے مرتکب ہیں۔ شرک اور گوسالہ پرستی اور تحریف توریت وانجیل اور قتل انبیاء اللہ وغیرہ وغیرہ میں مبتلا ہیں۔ منصب امامت کی ان میں بالکل اہلیت نہیں اور جو ان کو باوجود ظالم ہونے کے اپنا امام بنائے وہ خود ظالم ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

فائدہ: جاننا چاہیے کہ ظلم اور فسق کے مقابلہ میں عدالت اور تقویٰ ہے نہ کہ عصمت بمعنی عدم الخطاء فی الفہم وامتناع صدور معصیت اور امامت کے لیے عدالت اور تقوی شرط ہے نہ کہ عصمت۔ لہٰذا اس آیت سے فرقہ امامیہ کا عصمت ایمہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں اور نہج البلاغت میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے نص صریح موجود ہے۔

((لابد للناس من امیر بر او فاجر یعمل فی امرته المومن ولیستمع الکافر ویامن فیه السبل.... الخ))

اقوالِ مفسرین در تفسیر کلماتِ ابتلاء

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جن کلمات سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا حسب ذیل ہیں:

① اپنی قوم سے مفارقت کرنا اور براءت یعنی کفر کی وجہ سے ان سے براءت اور بیزاری اور قطع تعلق کرنا۔

② خدا کے لیے مناظرہ۔ ③ آگ میں ڈالے جانے پر صبر کرنا۔

④ وطن سے ہجرت کرنا اور مجمع عشائر و اقارب کو چھوڑ کر نکل جانا۔ ⑤ مہمان نوازی۔

⑥ ذبح ولد پر تیار ہو جانا۔ (اخرجہ ابن اسحٰق وابن ابی حاتم عن ابن عباس اور منثور ص ۱۱۱ ج ۱)

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ کلمات جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا وہ دس خصال فطرت ہیں پانچ تو ان میں سے سر میں ہیں اور وہ یہ ہیں: ① مونچھیں کتروانا ② مضمضہ یعنی کلی کرنا ③ استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا ④ مسواک کرنا ⑤ سر میں مانگ نکالنا۔

اور پانچ خصلتیں باقی بدن کے متعلق ہیں اور وہ یہ ہیں: ① ناخن ترشوانا ② بغل کے بال لینا ③ موئے زیر ناف مونڈنا ④ ختنہ کرنا ⑤ بول و براز کی جگہ کو پانی سے دھونا یعنی پانی سے استنجاء کرنا۔

اور ایک روایت میں غسل جمعہ اور طواف بیت اللہ اور سعی مابین الصفاء والمروہ اور رمی جمار اور طوافِ افاضہ کا ذکر ہے اور صحیح مسلم میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں: ① مونچھوں کا کتروانا اور ② ڈاڑھی کا بڑھانا اور ③ مسواک کرنا اور ④ ناک میں پانی ڈالنا اور ⑤ ناخنوں کا کتروانا اور ⑥ براجم یعنی جوڑوں کا دھونا اور ⑦ بغل کے بال لینا اور ⑧ موئے زیر ناف اور حلق کرنا اور ⑨ پانی سے استنجاء کرنا۔ راوی کہتے ہیں کہ دسویں خصلت میں بھول گیا شاید وہ مضمضہ ہو۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ کلمات سے وہ تیس خصلتیں مراد ہی کہ جو شرائع اسلام اور سہامِ اسلام کے نام سے موسوم ہیں۔ دس ان میں سے سورۂ براءت * میں مذکور ہیں: ① توبہ ② عبادت ③ حمد و ثناء ④ سیاحت ⑤ رکوع ⑥ سجود ⑦ امر بالمعروف و ⑧ نہی عن المنکر ⑨ محافظۃ ⑩ حدود ایمان۔ اور دس ان میں سے سورہ احزاب * میں مذکور ہیں: ① اسلام ② ایمان ③ قنوت ④ صدق ⑤ صبر ⑥ خشوع ⑦ صدقہ و نیاز ⑧ روزہ رکھنا ⑨ شرمگاہ کی حفاظت ⑩ کثرت ذکر اللہ۔ اور دس خصلتیں ان میں سے سورۂ مؤمنون * اور سأل سائلٌ * میں مذکور ہیں۔ ① ایمان بیوم الجزاء ② خوف و خشیت از عذاب خداوندی ③ خشوع نماز ④ محافظت آداب و سننِ نماز ⑤ لغوبات سے اعراض و احتراز ⑥ ادائے زکوٰۃ بطیب خاطر ⑦ غیر منکوحہ

---

* سورۂ براءت کی آیتیں یہ ہیں: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۲﴾

* سورۂ احزاب کی آیت یہ ہے: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ﴾

* سورۂ مومنون کی آیت یہ ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹ .... الآیات﴾

* اور سأل سائلٌ کی آیتیں یہ ہیں: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝۲۳ وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۝۲۵ وَ الَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۲۶ وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۲۷ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝۲۸ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ ۝۲۹ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۳۰ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۳۱ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۳۲ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝۳۳ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۳۴﴾ ۱۲ منہ

اور غیر مملوکہ سے شرمگاہ کی حفاظت ⑧ ایفائے عہد اور ⑨ امانت اور ⑩ ادائے شہادت۔ کلمات کی تفسیر میں اس کے علاوہ اور بھی کچھ اقوال ہیں، جو تفسیر درمنثور کی مراجعت سے معلوم ہو سکتے ہیں اور آیت قرآنیہ میں لفظ کلمات سب کو شامل ہے جائز ہے کہ سب مراد ہوں یا بعض مراد ہوں لیکن ایک ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مختلف روایات کا آنا اس سے عموم ہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ اور کر رکھو جہاں کھڑا ہوا

اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ

ابراہیم نماز کی جگہ اور کہہ دیا ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک کر رکھو گھر میرا

لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

واسطے طواف والوں کے اور اعتکاف والوں کے اور رکوع اور سجدے والوں کے

قصّہ بنائے خانہ تجلی آشیانہ وفضائل قبلہ اسلام وتلقین آداب بیتِ حرام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ . . . الٰى . . . وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾﴾

گزشتہ آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور فضیلت کو بیان فرمایا اور ظاہر ہے کہ منصب امامت اور امامت کا لقب۔ صاحب قبلہ ہونے کی طرف مشیر ہے اس لیے آئندہ آیات میں قبلۂ ابراہیمی کا ذکر فرماتے ہیں کہ یہ خانہ تجلی آشیانہ وہی گھر ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیل علیہ السلام کی شرکت اور معیت میں بنایا تھا اور اسی معبد کے اِردگرد اسمٰعیل اور اس کی ذریت کو آباد کیا اور طرح طرح کی دُعائیں کیں اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل متنبہ ہو جائیں کہ یہ نبی اُمّی خاندان ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام سے ہے اور یہ خانہ کعبہ جو مسلمانوں کا قبلہ ہے یہ وہی معبد معظم اور سجدہ گاہ محترم ہے جس کے بانی اور معمار امامِ امم اور فخر عالم ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہ السلام ان کے معین و مددگار اور شریک کار رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اس علم کے بعد۔ بنی اسرائیل کو بنی اسمٰعیل کی تفضیل اور قبلۂ اسلام کی فضیلت میں کوئی شبہ نہ رہے گا اور اب آئندہ تحویل قبلہ کے بارے میں زبان طعن نہ کھولیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل یہ تو تم کو معلوم ہو گیا کہ منصب امامت ظالم اور فاسق کو نہیں ملتا۔ دینی منصب اسی کو ملتا ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر چلے اور اگر تم کو خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کے حج مقرر کرنے میں شبہ ہے کہ حج بالکل ایک لغو حرکت ہے جو عرب کے جاہلوں کا طریقہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ نہیں تو اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو مرجع خلائق بنایا کہ لوگ اطراف عالم سے بصد احترام احرام باندھ کر اس گھر کی زیارت اور طواف کے لیے رجوع کریں تا کہ اہل ایمان کے عظیم اجتماع سے ایک خاص نورانیت پیدا ہو جس سے ہر ایک مستفید ہو جس طرح بہت سے چراغوں کے جمع ہو جانے سے بہ ہیئت اجتماعیہ ہر ایک کا نور اضعافا مضاعفہ ہو جاتا ہے جمعہ اور پنجگانہ نماز جماعت میں ایک شہر اور

ایک محلہ کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے اور حج کے اجتماع میں اقطار عالم کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے۔

فائدہ ①: اور جائز ہے کہ مثابۃً کو بجائے ثوب بمعنی رجوع کے ثواب سے مشتق مانیں یعنی لوگوں کے لیے ثواب حاصل کرنے کی جگہ بنائی کہ حج اور عمرہ کر کے ثواب حاصل کریں۔ ایک نماز پڑھیں تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب پائیں اور جماعت سے پڑھیں تو ستائیس لاکھ کا ثواب پائیں اور ہمیشہ کے لیے اس گھر کو خاص طور پر مقام امن بنایا کہ جو وہاں داخل ہو وہ امن سے ہو جائے اور ہم نے یہ حکم دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور اس جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو تا کہ برکت حاصل ہو۔

فائدہ ②: مقام ابراہیم ایک خاص پتھر کا نام ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو بنایا اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشان تھے۔ لوگوں کے ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے وہ نشان اب معلوم نہیں ہوتے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کی اذان دی: كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ .... الآية﴾ (الحج:۲۷) اور یہ پتھر عہدِ نبوی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خانہ کعبہ سے متصل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب سیلاب آیا تو یہ پتھر بہہ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا اور اس کے گرد پتھروں کی دیوار چن دی۔ چنانچہ وہ پتھر اب تک اسی جگہ میں محفوظ ہے اور اس کے اِردگرد جالیاں بنی ہوئی ہیں اور بنائے کعبہ کے وقت ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کو حکم دیا جو مشابہ عہد کے تھا کہ میرے اس مبارک گھر کو ہر قسم کی ناپاکیوں سے پاک رکھنا، طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ یعنی نماز پڑھنے والوں کے لیے اس کو پاک وصاف رکھنا۔

نکتہ: طواف اور اعتکاف چونکہ دو عمل جداگانہ ہیں ایک دوسرے پر موقوف نہیں اس لیے طواف اور اعتکاف کو بذریعہ واؤ عاطفہ ذکر فرمایا اور رکوع اور سجود دونوں مل کر ایک عبادت ہیں الگ الگ عبادت نہیں اس لیے رکوع اور سجود کو بدون عطف ذکر فرمایا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ
اور جب کہا ابراہیم نے اے ربّ کر اس کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے لوگوں کو
الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ
میوے جو کوئی ان میں یقین لاوے اللہ پر اور پچھلے دن پر فرمایا اور جو کوئی منکر ہے
فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾
اس کو بھی فائدہ دوں گا تھوڑے دنوں پھر اس کو قید کر بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں اور بُری جگہ پہنچ ہے۔

دُعائے ابراہیم علیہ السلام برائے حرم وساکنانِ حرم

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا ... الٰى ... وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾﴾

ربط: جب خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کا مکانِ تعظیم اور معبد ابراہیم علیہ السلام ہونا بتلا چکے تو آئندہ اس شہر اور اس کے ساکنین کے حق میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں ذکر فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ بنانے کا پختہ ارادہ فرمایا تو یہ دعا کی کہ اے پروردگار اس لق ودق صحرا کو آباد شہر اور پُرامن بنادے کیونکہ رسم حج کی بقاء بدون شہر کی آبادی کے ممکن نہیں اور شہر کی آبادی بدون امن کے باقی نہیں رہ سکتی۔ بدامنی سے شہر ویران ہو جاتا ہے اور اس شہر کے ساکنین کو قسم قسم کے پھل اور میوے عطا فرما اس لیے کہ ساکنان شہر کی آبادی رزق پر موقوف ہے بغیر رزق کے کوئی باقی اور زندہ نہیں رہ سکتا اور رزق کی درخواست میں ظالموں اور نافرمانوں کے لیے نہیں کرتا بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے رزق طلب کرتا ہوں جو اس شہر کے رہنے والوں میں سے اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق کو امامت پر قیاس مت کرو۔ امامت ایک دینی منصب ہے ظالم اس کا مستحق اور اہل نہیں اور رزقِ دنیوی۔ ایسی شے ہے جو عام ہے۔ میں رب العالمین ہوں سب کا رازق ہوں۔ مومن کو بھی ثمرات سے رزق دوں گا اور کافر کو بھی دُنیا میں رزق دوں گا۔ اور چونکہ یہ کافر ہے اس لیے چند روز یعنی زندگی تک اس کو دنیاوی منافع سے خوب متمتع اور بہرہ مند کرتا رہوں گا اور پھر اس کو لاچار اور بے بس بنا کر کشاں کشاں عذاب نار تک پہنچاؤں گا۔ اور بے شک دوزخ بہت ہی بُری جگہ ہے دُنیا میں کوئی مکان اگر ایک طرف سے بُرا ہوتا ہے تو دوسری طرف سے اچھا بھی ہوتا ہے لیکن وہ دوزخ ایسا مکان ہے جو کسی اعتبار سے بھی اچھا نہیں ہر طرح سے بُرا ہی بُرا ہے۔

وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ
اور جب اٹھانے لگا ابراہیم بنیادیں اس گھر کی اور اسمٰعیلؑ اے ربّ ہمارے قبول کر
مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾
ہم سے تو ہی ہے سنتا جانتا۔

دعائے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام برائے قبولیت خدمت تعمیر بیت اللہ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ... الٰی... اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾﴾

اور اس وقت کو بھی یاد کرو کہ جب ابراہیم خود اپنے ہاتھ سے اس گھر کی بنیادوں کو اُٹھا رہے تھے یعنی اس پر تعمیر کرتے تھے اور دیواریں چنتے جاتے تھے اور اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام بھی اُن کے ساتھ بلند کرنے میں مشغول تھے۔ اور یہ دونوں بزرگ اس وقت نہایت عجز اور انکساری کیساتھ یہ کہتے جاتے تھے کہ: اے ہمارے پروردگار اپنے فضل سے ہماری اس محنت اور خدمت کو قبول فرما تحقیق تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے اور تو ہی ہماری نیت اور ہمارے ذوق وشوق کو جاننے والا ہے محض اپنے لطف وعنایت سے اپنے عاشقانِ نثار کی اس سعی کو مشکور فرما۔

۵۱ ① : قبول اور تقبل میں یہ فرق ہے کہ جو چیز لائق پذیرائی ہو۔ وہاں لفظ قبول استعمال کرتے ہیں اور جو چیز ناقص ہو اور قابل [illegible] وہاں لفظ تقبل استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ لفظ تقبل باب تفعل سے ہونے کی وجہ سے تکلف پر دلالت کرتا ہے اور تکلفِ

قبول اس بات کو مقتضی ہے کہ وہ چیز لائق قبول نہ ہو۔ پس اس مقام پر لفظ تقبل کا استعمال۔ غایت عجز اور کمال تواضع پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ مقبول ہو لیکن اگر تیرے لطف وعنایت اور فضل ورحمت سے قبول ہو جائے تو یہ تیرا محض جود وکرم ہے۔ ؎

گرچہ یہ ھدیہ نہ میرا قابلِ منظور ہے پر جو ہو مقبول کیا رحمت سے تیری دور ہے

اور اگر بالفرض کوئی عمل قابل قبول بھی ہو تب بھی حق تعالیٰ کے ذمّہ اسکا قبول کرنا واجب نہیں اس لیے کہ قبولیت کے لیے مستقل درخواست چاہیے۔ اہلسنت والجماعت کا یہی مذہب ہے۔ معتزلہ کے نزدیک ایسے عمل کا قبول کرنا اللہ کے ذمّہ واجب ہے۔ معتزلہ نے جب بندہ کے افعال اختیاریہ کو بندہ کا مخلوق اور مملوک قرار دیا تو خالق کے ذمّہ انکا قبول کرنا اور ان پر ثواب دینا واجب گردانا اور اپنی نادانی سے یہ نہ سمجھنا کہ اس واجب الوجود پر کسی کا وجوب نہیں چلتا اور نہ اس پر کسی کا حق ہے اور خدا تعالیٰ کے سوا کون ہے جو اس پر کوئی شے لازم اور واجب کر سکے۔

فائدہ ② : جاننا چاہیے کہ بارگاہ خداوندی میں وہی عبادت اور خدمت مقبول ہے کہ جس کو کرنے والا دل وجان سے قابل قبول نہ سمجھے اور کرنے والے کی نظر اپنے عمل پر نہ ہو بلکہ اس کے لطف اور فضل پر ہو۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص وَ

اے رب ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک امّت حکم بردار اپنی اور

اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا

جتا ہم کو دستور حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر تو ہی ہے اصل معاف کرنے والا مہربان اے ربّ ہمارے

وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اور اٹھا ان میں ایک رسول انہیں میں کا پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھا دے ان کو

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ع ۸ ۱۵

کتاب اور پکی باتیں اور اُن کو سنوارے تو ہی ہے اصل زبردست حکمت والا۔

دعائے ابراہیمی برائے وجود اُمّتِ مسلمہ وقوم مسلمانان وظہور رسولِ محترم از ساکنان حرم کہ صاحب قرآن وخاتم پیغمبراں باشد

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ . . . الٰى . . . اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ﴾

ربط : ان دونوں بزرگوں نے اپنی فراست صادقہ اور نور نبوت سے یہ سمجھا کہ جب ہم کو ایسے خانہ تجلّی آشیانہ کی تعمیر کا حکم ہوا ہے تو لامحال

اس کے ہمرنگ کسی ایسی عبادت کا بھی حکم ہونے والا ہے جو عشق اور محبت کا رنگ لیے ہوئے ہو۔ اور ان عبادتوں کا بجالانے والا صورۃً اگرچہ انسان ہوگا۔ مگر معنی ہم رنگ ملائکہ ہوگا گویا کہ دربار خداوندی کا معائنہ اور مشاہدہ کررہا ہے اور جس اُمت کے لیے اس گھر کو قبلہ بنایا جائے گا اس کو ایسے جدید وضع کے کچھ احکام دیئے جائیں گے جنکے اسرار و حِکَم ظاہر نظر میں جلوہ گر نہ ہوں گے۔ ظاہر پرست ان کو صورت پرستی پر محمول کریں گے اس لیے ان دونوں بزرگوں کو اندیشہ ہوا کہ مبادا ہماری ذریت اور اولاد ان جدید وضع کے احکام کے نزول پر اُن کے قبول میں کسی قسم کا توقف اور تردد کرے اس لیے جنابِ الٰہی میں تین دعائیں فرمائیں: اوّل یہ کہ:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ "اے اللہ! ہم کو اپنا مسلم اور حکم بردار بندہ بنا۔"

دوسری دعا یہ فرمائی کہ: "اے اللہ! ہماری ذریت میں ایک امتِ مسلمہ پیدا فرما۔ یعنی ایسی اُمت اور ایسی قوم پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو اور نام بھی اس قوم کا مسلم اور مسلمان ہو یعنی صفت بھی اس کی اسلام یعنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ہو اور اسی نام یعنی اسلام سے پکاری جاتی ہو۔

تیسری دعا یہ فرمائی کہ: اس اُمت مسلمہ میں ایک عظیم الشان رسول بھیج اور اس پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرما۔ یعنی قرآنِ کریم اور پھر وہ رسول اس اُمت کو کتاب وسنت کی تعلیم دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دعاؤں میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ یہ خانہ تجلی آشیانہ جس اُمت کا قبلہ ہوگا، اس اُمت کا نام اُمتِ مسلمہ ہوگا جیسا کہ سورۂ حج میں ہے: ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (الحج:۷۸) اور ملتِ اسلام اس امت کا مذہب ہوگا اور وہ عظیم الشان رسول جو ان میں مبعوث ہوگا وہ ساکنانِ حرم اور اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور بذریعہ وحی کے بتلا دیا کہ جس اولوالعزم رسول کے پیدا ہونے کی تم دعا کررہے ہو وہ آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور خاتم الانبیاء والمرسلین ہوگا اور ملت ابراہیمی کا متبع ہوگا اور اس کی اُمت کا نام اُمت مسلمہ ہوگا۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے بارگاہِ خداوندی میں بصد عجز و نیاز یہ عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا خاص اطاعت شعار اور فرمانبردار بنا کہ ہمارا ظاہر و باطن تیرے لیے مخصوص ہوجائے کہ اس میں تیرے سوا کسی اور کی گنجائش نہ رہے اور ہماری ذریت میں ایک اُمت مسلمہ یعنی ایک ایسی جماعت پیدا فرما کہ جو دل و جان سے تیری حکم بردار ہو اور قلب اس کا سلیم ہو اور مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے سالم اور محفوظ رہیں اور جب تو ان کو اپنے دربار کی حاضری کا حکم دے تو مجنونانہ اور عاشقانہ وضع کے ساتھ برہنہ سر لبیک کہتے ہوئے تیرے درِ دولت پر حاضر ہوجائیں۔ اور اے پروردگار! ہم کو ہماری عبادت اور دربار کی حاضری یعنی حج اور طواف کے مواقع بھی دکھلا دیجیے اور ان کے احکام اور آداب بھی ہم کو بتلا دیجیے تاکہ آداب عبودیت اور آداب دربار میں ہم سے کوئی تقصیر نہ ہوجائے۔ اور اے پروردگار! آخر ہم بشر ہیں سہو اور نسیان سے مرکب ہیں۔ ہم سے اگر آدابِ دربار میں کوئی سہو اور تقصیر ہوجائے تو ہم پر توجہ اور عنایت فرمانا اور ہماری تقصیر سے درگزر فرمانا بے شک آپ ہی بڑی توجہ اور عنایت فرمانے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں۔ اور چونکہ ایک عظیم اُمت کا باوجود اختلاف آراء و عقول کے ایک مسلک اور ایک طریق پر بدون کسی مربی کے قائم رہنا عادۃً محال ہے اس لیے جناب الٰہی میں یہ عرض معروض کی کہ اے ہمارے پروردگار! ان ساکنانِ حرم میں ایک عظیم الشان رسول بھیج جو اس اُمت مسلمہ کو اسلام کا طریقہ بتلائے اور وہ رسول ہم دونوں کی ذریت اور اولاد سے خارج نہ ہو بلکہ انہی میں سے ہو تاکہ دُنیا اور آخرت میں ہمارے لیے عزت اور شرف کا موجب ہو اور اس طرح قیامت تک میری امامت باقی رہے اس لیے کہ میری اولاد کی امامت میری ہی امامت ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ رسول انہی

میں سے ہوگا تو لوگ اس کے مولد اور منشاء سے اور اس کے حسب اور نسب اور اس کی امانت اور دیانت اور اخلاق اور اس کی صورت اور سیرت سے بخوبی واقف ہوں گے اور اس کے اتباع سے عار نہ کریں گے اور جب حق نبوت و رسالت کے ساتھ قرابت کی محبت اور شفقت بھی مل جائے گی تو اس رسول کی اعانت اور نصرت وحمایت اور اس کی شریعت کی ترویج اور اشاعت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے اس نبی کو اپنا سمجھ کر معاملہ کریں گے، اجنبی اور غیر کا معاملہ نہ کریں گے۔ اور رسول ایسا ہو کہ اس پر ایسی جامع کتاب نازل ہو کہ اوّلین اور آخرین میں اس کی نظیر نہ ہو اور پھر وہ رسول تیری اس کتاب کی آیتیں پڑھ کر ان کو سنائے اس لیے کہ آیات کا پڑھ کر سنانا بغیر نزول کتاب کے ناممکن ہے۔ اور بعد ازاں وہ رسول ان کو اس کتاب کے معانی سکھائے اور اس کے اسرار و حکم سے بھی آگاہ کرے تا کہ علم ظاہر اور علم باطن دونوں جمع ہو جائیں۔ تلاوت سے کتاب کے الفاظ اور کلمات کا علم ہوگا اور تعلیم و تفہیم سے اس کتاب کے معانی اور حقائق اور معارف معلوم ہوں گے۔ حفاظ قرآن اور قراء اور مجودین کے سینے اور زبانیں اس کتاب الٰہی کے الفاظ کی حفاظت کریں گی اور علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کی زبانیں اور قلم اس کتاب کے معانی کی حفاظت کریں گے کہ کوئی ملحد اور زندیق اس میں کسی قسم کی معنوی تحریف بھی نہ کر سکے۔ اور وہ رسول اپنی ظاہری تعلیم و تربیت اور باطنی فیض صحبت سے اُن کے دلوں کو گناہوں کے زنگ اور کدورت سے پاک وصاف کر کے مثل آئینہ کے مجلّٰی اور مصفّٰی بنا دے کہ انوار و تجلیات کا عکس قبول کرنے لگیں۔ اور حدیث میں جو ((العلماء ورثه الانبياء)) آیا ہے اس کا صحیح مصداق وہی علماء ربانیین ہیں جو کتاب وسنت کی تعلیم کے ساتھ زنگ آلود نفوس کو صیقل کر کے مثل آئینہ کے بنا دیتے ہوں۔

بے شک تو ہی نہایت عزت والا اور نہایت حکمت والا ہے۔ تو بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ تو ہماری اولاد میں ایسا عظیم الشان رسول بھیج کر لوگوں پر احسان فرمائے اور اس کو ایسی جامع کتاب اور جامع شریعت اور کامل دین عطاء فرمائے کہ اس کے بعد تا قیامت کسی نبی اور رسول کی ضرورت باقی نہ رہے۔ فقط گاہ بگاہ اسی کی تجدید کافی ہو جایا کرے۔ تفسر ابن کثیر میں ابوالعالیہ سے منقول ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب آیا۔

قد استجيب لك هو كائن فى آخر الزمان. (تفسير ابن كثير)

"تمہاری دعا قبول ہوئی اس شان کا نبی آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا" اور یہی قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور اس آیت میں جو سید القراء ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ نبی خاتم الانبیاء ہوگا۔

و قرأ أُبيٌّ وَابْعَثْ فِيْٓ اٰخِرِهِمْ رَسُوْلًا. (روح المعانی ص ۳٤٦ ج۱)

"یعنی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔ وَابْعَثْ فِيْٓ اٰخِرِهِمْ رَسُوْلًا.

یعنی ان کے آخر میں ایک رسول بھیج۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کی دُعا مانگی تھی ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نبی آخری نبی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دُعا قبول فرمائی۔

اخرج احمد و الطبرانى و البيهقى عن ابى امامة قال قلت يا رسول الله ﷺ ما بدء امرك قال دعوة ابى ابراهيم و بشرىٰ عيسىٰ و رأت امى انه يخرج منها نور اضائت له قصور الشام. (در منثور ص ۱۲۹ ج۱)

﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾

"مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی نبوت کی ابتداء

کس طرح سے ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا... الآية﴾ کا مصداق ہوں سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے میری بعثت کی دُعا کی۔ اور پھر میں اپنے بھائی عیسٰی بن مریم علیہما السلام کی بشارت ہوں کہ انہوں نے میری آمد کی بشارت دی۔ اور پھر میں اپنی ماں کا خواب ہوں کہ انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔

اور عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((انی عند الله فی ام الکتاب لخاتم النبیّن و ان اٰدم لمنجدل فی طینة و سانبئکم باول ذالك دعوة ابراهیم)). (الحدیث)

"میں اللہ تعالیٰ کے یہاں لوح محفوظ میں خاتم النبیّین لکھا ہوا تھا اور آدم ہنوز مٹی اور گارے کے پُتلے ہی میں تھے اور میری نبوت کی ابتداء ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ہے۔" (مسند احمد وغیرہ در منثور ص ۱۲۹)

معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس نبی اور رسول کے ظہور کی دُعا کی تھی اس دُعا کا مصداق خاتم النبیّین سرورِ عالم محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں کہ جن کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ ﷺ پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں خاتم النبیّین لکھے ہوئے تھے یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کی بعثت کی دُعا کی اور حضرت عیسٰی علیہ السلام نے خاتم الانبیاء ﷺ کی آمد کی بشارت دی۔

پیغام خدا نخست آدم آورد — انجام بشارت ابن مریم آورد
با جملہ رسل نامۂ بے خاتم بود — احمد برما نامہ و خاتم آورد

لطائف و معارف

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اگرچہ کبائر اور صغائر سے سب سے معصوم ہوتے ہیں مگر خداوند ذوالجلال کی عظمت اور جلال سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق ربوبیت اور حق عبودیت کسی سے ادا نہیں ہو سکتا اور جانتے ہیں کہ جو حق واجب تھا وہ ہم سے ادا نہ ہو سکا۔ اس لیے بصد خشوع و خضوع خدا تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بار الٰہا! تو ہمارے عجز اور قصور کو جانتا ہے ہمیں معاف کر اور تیرے حقوق میں ہم سے جو تقصیریں ہوئیں اُن سے درگزر کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ﴿وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ کہنا اسی قبیل سے تھا۔ دُنیا کے بادشاہوں اور ان کے خواص اور مقربین کے تعلقات پر نظر کرو عام رعایا کے لیے ایک عام قانون ہوتا ہے اور اس کی پابندی ان کے لیے کافی ہوتی ہے مگر خواص مقربین کے لیے ایک خاص قانون اور خاص بندشیں اور خاص ہدایتیں ہوتی ہیں۔

ع موسیا آداب دانا دیگر اند

خواص اور مقربین ہر وقت اپنے آقا اور ولی نعمت کے خوش رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

ع جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے

یہی حال بلکہ اس سے ہزار درجہ بڑھ کر انبیاء علیہم السلام کا خداوند ذوالجلال کے ساتھ ہے۔ اگرچہ خدا تعالیٰ کے یہ سچے عاشقان، باوفا اور محبانِ باصفا اپنے محبوب حقیقی کے خوش رکھنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اللہ جیسے محبوب برحق کے حقوق کوئی عاشق کیا ادا کر

سکتا ہے اس لیے حضرات انبیاء علیہم السلام بصد عجز وزاری بارگاہِ خداوندی میں یہ عرض کرتے ہیں:

﴿وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾

بارِخدایا! ہم سے تیرے حقوق اور واجبات کے ادا کرنے میں تقصیر ہوئی ہم اپنے عجز اور ناتوانی کی وجہ سے تیرا حق ادا نہیں کر سکے تو ہم پر رحم فرما اور ہماری تقصیروں سے درگزر کر۔

یہ تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی توبہ اور انابت کی عام وجہ تھی جو بیان ہوئی لیکن ابراہیم علیہ السلام کی زیر بحث دُعا ﴿تُبْ عَلَيْنَا﴾ کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ آپ نے یہ دُعا صرف اپنے لیے اور اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام ہی کے لیے نہیں فرمائی تھی بلکہ اپنی تمام ذریت کو جو ہونے والی تھی اس کو بھی اس دعا میں شامل کر لیا تھا۔ اس لیے یہ دعا مجموعی حیثیت سے سب کے حق میں ہوئی جیسا کہ آیت کے سیاق اور لحاق سے ظاہر ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ

اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا مگر جو بیوقوف ہوا اپنے جی سے اور

اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ

ہم نے اس کو خاص کیا دُنیا میں اور وہ آخرت میں نیک ہے جب اس کو کہا

لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ

اس کے رب نے حکم بردار ہو بولا میں حکم میں آیا جہان کے صاحب کے اور یہی وصیت کر گیا ابراہیمؑ

بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ

اپنے بیٹوں کو اور یعقوب اے بیٹو اللہ نے چُن کر دیا ہے تم کو دین پھر نہ مریو

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ

مگر مسلمانی پر کیا تم حاضر تھے جس وقت پہنچی یعقوب کو

الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ

موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم کیا پوجو گے بعد میرے بولے ہم بندگی کریں گے

اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ

وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ

اور ہم اسی کے حکم پر ہیں یہ ایک جماعت تھی گزر گئی ان کا ہے جو کما گئے اور

لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

تمہارا ہے جو تم کماؤ اور تم سے پوچھ نہیں ان کے کام کی۔

ترغیب وتاکید اِتباع ملۃ ابراہیمی کہ عین توحید وعین ملت اسلام اَست وفضائل ملت اِسلام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ... الیٰ ... وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾

گزشتہ آیات میں اجمالاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّت کی طرف اشارہ تھا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا ﴿وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ اور ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے پسند کیا اور اس کی دعا کی وہ طریقہ۔ طریقۂ اسلام ہے۔ اب آئندہ آیات میں اس کی تفصیل فرماتے ہیں کہ وہ ملتِ ابراہیم عینِ توحید اور عینِ اسلام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی دل وجان سے بے چون وچرا اطاعت کرنا اپنے آپ کو خدا کے حوالے اور سپرد کر دینا آخیر پارہ تک اسی ملّت اسلام کے فضائل اور اسی کے اتباع کی ترغیب میں کلام چلا گیا ہے جس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب کا رد کرنا مقصود ہے کہ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں اور پھر ان کے خلاف طریقہ پر چل رہے ہیں حالانکہ اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنے لیے دُعا مانگی اور اسی کی وصیّت کی اور اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: وہ کون شخص ہے کہ جو ابراہیم علیہ السلام کی ملّت سے عدول اور انحراف کرے۔ حالانکہ وہ ملت تمام ملتوں سے افضل اور بہتر ہے اور صاحب ملت لوگوں کا امام اور پیشوا ہے اور سب سے پہلے اسی نے نہایت تضرع اور زاری سے اُمت مسلمہ کے وجود اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی دُعا مانگی کہ جو اُمت مسلمہ کو اسلام کا طریقہ بتلائے تو ایسی بہتر ملّت کے اتباع سے کون اعراض اور انحراف کر سکتا ہے مگر وہی شخص کہ جو اپنے ہی نفس سے جاہل اور نادان ہو کہ یہ نہ سمجھتا ہو کہ کون سی ملت فطرتِ سلیمہ کے مناسب ہے اور کون سی غیر مناسب اور کون سی ملّت روح اور قلب کے لیے نافع ہے، اور کون سی مضر، اور کس ملت کے قبول کرنے سے نفس کے لیے کمالات کا دروازہ کھلتا ہے اور کس ملّت سے کمالات کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ اگر یہ سفیہ اپنے نفس سے بے خبر نہ ہوتا تو ملت ابراہیمی سے اعراض نہ کرتا اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دُنیا میں برگزیدہ بنایا اور اپنے مقبول بندوں میں سے اس کو منتخب کیا اور تمام کمالات روحانیہ سے اس کو مکمل کیا یعنی نبوت ورسالت اور ولایت وامامت ان کو عطا کی اور خلت کا خلعت ان کو پہنایا اور جو معبد انہوں نے تعمیر کیا اس کو قبلۂ عالم بنایا اور تحقیق آخرت میں وہ صالحین اور نیکوکاروں سے

ہیں۔ "صلاح" فساد اور خلل کی ضد ہے۔ اور فساد اور خلل، معصیت اور غفلت سے پیدا ہوتا ہے اس بناء پر صلاح کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کا ظاہر و باطن ہر قسم کے فساد اور خلل سے بالکل پاک ہے اور اس جگہ صلاح سے صلاح کامل مراد ہے اور یہ آیت ماقبل کی دلیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص خدا کا برگزیدہ اور منتخب بندہ ہو اور صلاح کامل کے ساتھ موصوف ہو اس کے طریقہ سے سوائے نادان کے کون اعراض کرے گا۔ آئندہ آیت میں اس ملت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے۔ یعنی اسلام ہے بلکہ یہی اسلام ان کے برگزیدہ اور امام ہونے کا سبب ہے جبکہ ان کے پروردگار نے کہا کہ اے ابراہیم (علیہ السلام)! اسلام اختیار کر اور مسلم بن جا، یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے اور سپرد کر دے اور اپنی خواہش اور ارادہ کو اس کی رضا اور خوشنودی میں فنا کر دے ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ میں نے اسلام اختیار کیا اور میں نے اپنے تمام کام رب العالمین کے سپرد کر دیئے اور اپنے نفس کو درمیان سے بالکل نکال لیا۔

سپر دم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

اب اس میں تعین ہوگئی کہ وہ ملّت کیا ہے یعنی اسلام ہے جو تمام کمالات کا تخم اور تمام فضائل کی اصل ہے اخیر پارہ تک اسی اسلام کی فضیلت میں کلام چلا گیا۔

اور جب تک ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے اسی ملت پر قائم رہے اور جب وصال کا وقت آیا تو ابراہیم علیہ السلام نے سب بیٹوں کو جمع کر کے اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیّت کی جن میں حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام بھی تھے۔ اور پھر اسی طرح اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا: اے میرے بیٹو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ دین اسلام پسند کیا ہے۔ اس کو سوا کوئی دین مقبول نہیں پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم اسلام پر پختہ اور قائم ہو۔ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت اور نصرانیت کی وصیت نہیں کی بلکہ ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ پس اے اہل کتاب تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت کی وصیت کی تھی اس کی نہ کوئی سند ہے اور نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی مشاہدہ۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا: کہ بتلاؤ میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے۔ سب نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ ہم صرف اس ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی آپ اور آپ کے آباؤ اجداد ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام عبادت کرتے آئے۔ یعنی ایک خدا کی عبادت کریں گے اور ہم سب اسی ایک خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری پر قائم رہیں گے۔ غرض یہ کہ یہود کا یہ دعویٰ کہ یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی وصیت کی تھی محض افتراء ہے نہ اس کی کوئی سند ہے اور نہ تمہارا مشاہدہ۔

اور اے اہل کتاب! اگرچہ تم ان بزرگوں کی اولاد ہو اور تم اس نسبت پر فخر اور ناز کرتے ہو لیکن یہ خُدا کے برگزیدہ بندوں کی ایک جماعت تھی جو گزر گئی اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم کو وصیت کر گئی اس جماعت کے لیے وہ اعمال کام آئیں گے جو اس نے کیے اور تمہارے لیے تمہارے اعمال کام آئیں گے اور بدون اتباع کے محض بزرگوں کا انتساب تم کو نفع نہیں دے گا۔ اور اگر بالفرض وہ بُرے عمل کرتے تھے تو تم سے ان کے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا، ہر شخص سے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔ غرض یہ کہ انہوں نے اگر کوئی گناہ کیا ہے تو تم سے اس کی باز پرس نہ ہوگی اور اگر انہوں نے نیک عمل کیے ہیں تو تم کو کوئی نفع نہیں۔ باپ کا کھانا اور پینا بیٹے کی بھوک اور پیاس کو دفع نہیں کر سکتا جب تک بیٹا خود نہ کھائے اور نہ پیئے۔

ع بندگی باید پیمبر زادگی درکار نیست

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

اور کہتے ہیں ہو جاؤ یہود یا نصاریٰ تو راہ پر آؤ تو کہہ نہیں بلکہ ہم نے پکڑی راہ ابراہیم کی

حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا شریک والوں میں

یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دینے والوں کو جواب

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا... الٰی... وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾﴾

اور تعجب ہے کہ یہ اہل کتاب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا بھی کہتے ہیں مگر ان کے اتباع اور ان کے طریقہ پر چلنے کو جب ہدایت نہیں سمجھتے بلکہ باعث ضلالت جانتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی بن جاؤ ہدایت پا جاؤ گے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے جواب میں کہہ دیجیے کہ ہم یہودی یا نصرانی نہیں بنیں گے بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیمی پر قائم رہیں گے اور ابراہیم ہی کے طریقہ پر اور مسلک پر چلیں گے جن میں ذرہ برابر کجی نہ تھی وہ تو ماسواء اللہ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف مائل تھے اور کبھی بھی مشرکین میں سے نہیں ہوئے نہ قبل نبوت اور نہ بعد نبوت اور تم باوجودیکہ اتباعِ ابراہیمی کے مدعی ہونے کے کج راہی اور شرک میں مبتلا ہو۔

سلسلۂ کلام نہایت خوبی کے ساتھ چل رہا ہے یہودیوں کو جو اپنے حسب ونسب پر ناز تھا اس کی تردید فرمائی ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور تعمیر کعبہ اور دعا کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول کی اور ان کی دُعا کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا جن کا قبلہ اور جن کی ملت اور جن کا دین وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا تھا اور ان سب نے اپنی اولاد کو اسی کی وصیت کی تھی کہ دین اسلام ہی پر مرنا۔ پھر تعجب ہے (کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جب تمہارے سامنے اسی ملت ابراہیم علیہ السلام اور دین اسلام کو پیش کرتے ہیں تو تم اسے قبول نہیں کرتے۔ اس کے سوا اور کیا وجہ ہے کہ تمہاری عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فائدہ جلیلہ: حق جل شانہٗ نے اس سلسلہ میں سات جگہ اسلام کا ذکر فرمایا: پہلا ﴿وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ﴾ میں، دوسرا ﴿اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ میں، تیسرا ﴿قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ میں، چھوتھے ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں، پانچویں ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ میں، چھٹے ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ میں، ساتویں ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ میں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا مذہب اسلام ہے اُمم سابقہ میں جو لوگ اطاعت کرنے والے تھے ان کی صفت بھی یہی اسلام تھی مگر امت مسلمہ کا نام اور لقب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اُمت کو عطا کیا گیا۔ پچھلی اُمتوں میں بھی اسلام لانے والے گزرے ہیں مگر اسلام ان کا لقب نہ تھا صرف صفت تھی۔ یہ لقب صرف اُمتِ محمدیہ کو عطا کیا گیا ایک زمانہ میں دین حق کا لقب یہودیت رہا۔ اور ایک زمانہ میں عیسائیت اور نصرانیت رہا۔ صفت اسلام سب میں مشترک رہی سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار تھے مگر اُمتِ مسلمہ کا

لقب خاص آپ ہی کی امت کو عطا کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کے غلام تو سب ہی ہیں مگر غلام کا نام ہی غلام رکھ دیا جائے تو صفت اور لقب دونوں جمع ہو جائیں گے۔ صفت بھی غلام اور لقب اور نام بھی غلام۔ اور مثلاً جیسے سب اللہ کے بندے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ اپنا نام ہی عبداللہ اور اللہ بندہ رکھے تا کہ ہر وقت اسی عبدیت اور غلامیت سے لذت حاصل کرتا رہے تو اس کی شان ہی دوسری ہے۔

اور یہ مبارک لقب سب سے پہلے ہمارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تجویز فرمایا: جیسا کہ سورۂ حج میں ہے۔ ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (الحج:۷۸) پس اس عظیم الشان لقب کا حق یہ ہے کہ ہم دل و جان سے اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بن جائیں محض لفظ مسلم اور لفظ مؤمن پر قناعت نہ کریں۔

میم و واؤ میم و نون تشریف نیست　　لفظِ مومن جز پئے تعریف نیست

فائدہ دیگر : جاننا چاہیے کہ ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں:

قسم اوّل : اصول اور عقائد جیسے توحید و رسالت اور قیامت یہ چیزیں تمام انبیاء کرام علیہم السلام میں متفق علیہ ہیں۔ ان میں اختلاف ممکن نہیں اور نہ ان میں نسخ جاری ہوتا ہے۔

قسم دوم : قوائد کلیۂ شریعت کہ جن کی طرف جزئیات اور فروع راجع ہوتے ہیں اور حکم میں اُن کلیات کا لحاظ رہتا ہے اور انہی قواعد کلیہ کا نام ملت ہے جس میں اختلاف بہت کم ہوتا ہے ملت محمدی اور ملت ابراہیمی انہی اصول اور قواعد کلیہ کے لحاظ سے موافق اور متحد ہیں۔

قسم سوم : احکام جزئیہ اور فروع۔ جس کو شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں زمان اور مکان اور امم کے اختلاف سے شریعت کے احکام جزئیہ بدلتے رہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ : ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ (المائدہ:۴۸) پس خلاصہ یہ نکلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت تو ایک مگر شریعت ہر ایک کی جدا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ تمام حنفیہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امام جانتے ہیں مگر باوجود اس کے امام ابو یوسف اور امام محمد اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہم کبھی کبھی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلاف بھی کرتے ہیں مگر قانون حنفی سے کسی حال میں خارج نہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے قواعد مقررہ سے باہر نہیں جاتے۔ مثلاً: قیاس جلی یا قیاس استحسان اور عموم بلویٰ کسی نہ کسی قاعدہ کے تحت میں اس جزئیہ کو درج کرتے ہیں۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
تم کہو ہم نے یقین کیا اللہ کو اور جو اترا ہم پر اور جو اترا ابراہیم اور اسمٰعیل
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ
اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو ملا
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ
سب نبیوں کو اپنے رب سے ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے اور ہم اسی کے

مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ

حکم پر ہیں پھر اگر وہ بھی یقین لاویں جس طرح پر تم یقین لائے تو راہ پاویں اور اگر

تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ

پھر جاویں تو اب ہیں ضد پر سو اب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ اور وہی ہے سنتا

الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ

جانتا ہم نے لیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ ہے اللہ سے بہتر اور ہم

لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اسی کی بندگی پر ہیں۔

تعلیم طریقہ ایمان

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ... اِلٰی ... وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾﴾

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ کہہ دو کہ ہم یہودی اور نصرانی نہیں بلکہ ملت ابراہیمی کے متبع ہیں۔ آئندہ آیت میں طریقۂ ایمان کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں کہ اس طور پر اپنے ایمان کو ظاہر کرو کہ شریعت موسویہ اور شریعت عیسویہ کے کفر اور انکار کا ابہام نہ ہو لہٰذا جب تم اپنے ایمان کا اعلان کرو تو اس طرح کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر یعنی اس کے تمام اسماء و صفات پر اور اس کے تمام احکام پر اور اس کتاب اور شریعت پر ایمان لائے جو ہماری طرف بھیجی گئی اور ان تمام صحیفوں پر ایمان لائے کہ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف بھیجے گئے، جو ان میں نبی ہوئے جیسے عزیر اور اشعیاہ اور یرمیاہ اور سموئیل اور حزقیل علیہم السلام اور اس چیز پر بھی ایمان لائے کہ جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی اور اجمالاً ہم ایمان لائے ان تمام صحیفوں پر اور شریعتوں اور احکام پر کہ جو تمام پیغمبروں کو پروردگار کی جانب سے دیئے گئے۔ اگرچہ ان میں بعض بعض سے افضل ہیں لیکن ہم ایمان لانے میں کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں۔ اور ہم تو خاص اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ سب انبیاء علیہم السلام پر بلا تفریق ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ منسوخ شریعت کا اتباع نہیں کرتے صرف خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہیں کہ جن کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔

تفریع بر مضمون سابق مع توبیخ و تقریع

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی حقیقت یہ ہے اور ایمان کا طریقہ یہ ہے پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں کہ جس طرح

تم ایمان لائے ہو یعنی بلاتفریق تمام انبیاء ورسل کی تصدیق کریں پس تحقیق یہ بھی ہدایت پا جائیں گے اور اگر روگردانی کرتے ہیں تو سمجھ لو یہ لوگ صرف مخالفت اور عداوت میں غرق ہیں۔ آپ ﷺ ان کے عداوت اور مخالفت سے پریشان نہ ہوں۔ عنقریب ہی اللہ تعالیٰ ان کے شر سے آپ ﷺ کی کفایت کرے گا اور خود ہی اللہ تعالیٰ ان سے نمٹ لے گا۔ تم فکر نہ کرو یہ مؤمنین سے حمایت وحفاظت بلکہ غلبہ اور نصرت کا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا بنو قریظہ کو قتل کرایا بنو نضیر کو جلا وطن کرایا اور نصاریٰ پر جزیہ لگایا۔ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ کا وعدہ ہے اور آئندہ کی خبر ہے جو پورے طور پر ثابت ہوئی کہ چند ہی روز میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سر سے یہود اور نصاریٰ کے شر کو دفع کیا اور دین اسلام کے مقابلہ میں یہود ونصاریٰ مغلوب ہوئے اور اللہ کی پیشینگوئی پوری ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ تو سب کی باتوں کو سنتا ہے اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔ دشمنوں کا کوئی کید اور مکر اس سے پوشیدہ نہیں اور یہ یہود اور نصاریٰ دن رات اس کوشش اور سازش میں ہیں کہ تم کو اپنے رنگ میں رنگ لیں۔ اے مسلمانو! تم اُن سے یہ کہہ دو کہ ہم کو تو اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا رنگ ہمارے رگ وریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے جو اس کی طرف نظر کی جائے اور یہ رنگ ہم سے زائل نہیں ہوسکتا اس لیے کہ ہم خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں عبادت کی وجہ سے وہ رنگ اور پختہ ہو جاتا ہے اور اخلاص کی وجہ سے دوسرے رنگ کا اس پر کوئی دھبہ بھی نہیں آنے پاتا۔ عبادت اور اخلاص کی وجہ سے وہ زیادہ چمکتا جاتا ہے۔

جب آفتاب اسلام دُنیا میں طلوع ہوا تو اس وقت یہود ونصاریٰ میں ایک رسم اصطباغ کی جاری تھی پہلے اس رسم کا رواج یہود میں ہوا اور پھر عیسائیوں نے بھی اس رسم کو جاری رکھا اور اب تک عیسائیوں میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے یا کوئی عیسائی بنتا ہے تو اس کو زرد پانی کے حوض میں غوطہ دیتے ہیں یا اس کے سر پر اس میں سے کچھ پانی ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب سچا عیسائی ہو گیا۔ اسی رسم کا نام اصطباغ ہے جس کو آج کل بپتسمہ دینا کہتے ہیں، چونکہ یہود اور نصاریٰ مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ اس لیے گویا وہ انہیں اصطباغ کی دعوت دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ نازل فرمائی اور مسلمانوں کو یہود اور نصاریٰ کی دعوت اصطباغ کا یوں جواب بتایا کہ ان سے کہدو کہ ہم تمہارا اصطباغ لے کر کیا کریں گے؟ ہمیں تو اللہ کے دین کا رنگ کافی ہے اُس سے بڑھ کر اور بہتر اور کون سا رنگ ہوسکتا ہے؟ اور تم لوگ حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو ابن اللہ اور اپنا خداوند سمجھنے کی وجہ سے شرک کے ناپاک رنگ سے ملوث ہو تم اہلِ توحید اور اہلِ اخلاص کو کس رنگ کی دعوت دیتے ہو۔

فائدہ: صبغۃ اللہ کے اعراب میں مفسرین کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے اور تقدیر کلام اس طرح ہے صبغنا اللّٰهُ صبغة جیسے وَعد اللّٰهِ اور صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور معنی یہ ہیں وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اور صُنْعَ اللّٰهِ صُنْعُهٗ۔ علامہ زمخشری اور بیضاوی اور ابوحیان اور علامہ سیوطی نے اسی اعراب کو اختیار فرمایا اور ہمارا ترجمہ اور تفسیر اسی اعراب پر مبنی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ منصوب علی الاغراء ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے الزموا صبغة الله یعنی اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو۔ اس تقدیر پر بھی آیت کے معنی نہایت لطیف ہوں گے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ اے مسلمانو! فقط تصدیق اور شہادت پر کفایت اور قناعت نہ کرو بلکہ اس سے ترقی کرو اور اپنے ظاہر وباطن کو اللہ کے رنگ سے رنگو اور وہ رنگ خداوند ذوالجلال کی اطاعت اور محبت اور رضاء وتسلیم کا

رنگ ہے جس سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔ جب کوئی شخص کسی کی مرضی کے اس درجہ تابع ہوجائے کہ اس کا کوئی حکم اس کو گراں نہ گزرے بلکہ کمال نشاط اور غایت رغبت ومحبت سے اس کی تعمیل کی طرف شاداں وفرحاں دل وجان سے دوڑنے لگے تو محاورہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو فلاں کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ پس اے مسلمانو! تم اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو اور بطور تحدیث بالنعمۃ یا بطور لذت ومسرت یا بطور تعریض اور اتمام محبت یہ کہتے رہو کہ ہم تو خالص اللہ ہی کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تمہاری طرح شرک میں مبتلاء نہیں۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ صبغة الله. ملة ابرٰهمَ حنيفًا سے بدل ہے اور بالفاظ دیگر ملة ابرٰهمَ کی تفسیر ہے۔ یعنی ملت ابراہیم اور ملت اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عجیب وغریب رنگ ہے جس کے مشاہدہ کے لیے آنکھ چاہیے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صبغة الله سے مراد ختنہ ہے جو ملت ابراہیمی کا خاص شعار اور خاص رنگ ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ

کہہ اب کیا تم جھگڑتے ہو ہم سے اللہ میں اور وہی ہے رب ہمارا اور ربّ تمہارا اور ہم کو عمل ہمارے اور تم کو

اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ

عمل تمہارے اور ہم اسی کے ہیں نرے کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور

اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ

اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد یہود تھے یا نصاریٰ

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً

کہہ تم کو خبر زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے ظالم کون جس نے چھپائی گواہی

عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ

جو تھی اس پاس اللہ کی اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے وہ ایک جماعت تھی

قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا

گزر گئی اُن کا ہوا جو کما گئے اور تمہارا ہے جو تم کماؤ اور تم سے پوچھ نہیں

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۲ ۱۶

ان کے کام کی

تلقین جواب از مجادلہ اہل کتاب

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ ... الٰی ... وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

اور اگر اہل کتاب آپ سے اس بارہ میں مجادلہ کریں کہ ہم خدا کے رنگ کے ساتھ رنگین ہیں ہمارا دین اور ہماری کتاب تمہارے دین اور تمہاری کتاب سے مقدم ہے نبوت ورسالت ہمیشہ ہمارے ہی خاندان میں رہی اور ہم اللہ کے محبوب ہیں تو آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجیے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارہ میں مجادلہ کیے چلے جاتے ہو۔ حالانکہ وہ ہمارا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی رب ہے اس کی ربوبیت کسی کے ساتھ مخصوص نہیں سب کو عام ہے جو اس کے حکم کے مطابق طاعت اور عبادت کرے گا وہ قبول ہوگی ورنہ رد۔ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں کہ سراسر اس کے حکم کے مطابق ہیں آخری نبی ﷺ کی زبانی جو آخری حکم نازل ہوا اس پر عمل کرتے ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں کہ ناسخ کے نازل ہونے کے بعد منسوخ حکم اور محرف شریعت پر چل رہے ہو اور تازہ اور محفوظ شریعت سے اعراض اور انحراف کر رہے ہو۔ اور علاوہ ازیں ہمارے اور تمہارے درمیان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہم خالص اللہ ہی کے لیے عبادت کرنے والے ہیں اور تم جو کچھ کرتے ہو وہ تعصب اور نفسانیت اور دنیوی اغراض اور اپنی آبائی رسم کے باقی رکھنے کے لیے کرتے ہو بلکہ صریح شرک میں مبتلا ہو۔ حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو خدا کا بیٹا بتلاتے ہو۔ توحید اور اخلاص کا تم پر کوئی ہلکا سا نشان بھی نہیں۔ لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم خُدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ سراسر غلط ہے تم تو سرتاپا شرک کے رنگ میں رنگے ہوئے ہو تمہارا رنگ تمہارے اعمال سے ظاہر ہے اور ہمارا رنگ ہمارے اعمال سے ظاہر ہے۔ اور کیا تم اس آخری پیغام کی ضد اور اپنی منسوخ اور محرف شریعت کی پچ میں یہ کہتے ہو کہ تحقیق ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام اور ان کی اولاد یہودی اور نصرانی تھے حالانکہ یہ لوگ نزول توریت وانجیل اور یہودیت اور نصرانیت کے ظہور سے پہلے گزر چکے ہیں اور گزشتہ آیات میں ان حضرات کا ملت اسلام پر ہونا بخوبی واضح ہو چکا ہے۔ آپ اُن کے جواب میں یہ کہہ دیجیے کہ تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے؟ کہ جس نے یہ خبر دی ہے۔

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ (آل عمران)

اب بتلاؤ! تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ اور ظاہر ہے کہ اللہ سے زیادہ جاننے والا اور کون ہو سکتا ہے بلکہ نصوص توریت وانجیل اس پر شاہد ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی ملت حنفیت تھی۔ ختنہ اور حج بیت اللہ ان کا شعار تھا یہودیت اور نصرانیت کے خواص مثلاً ہفتہ اور اتوار کی تعظیم ان کی شریعت میں نہ تھی اور یہ سب کچھ انکو معلوم ہے مگر چھپاتے ہیں اور ایسے شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جو ایسی شہادت کو چھپائے اور مخفی رکھے جو اس کے پاس محفوظ ہو اور اس کو خوب یاد ہو اور وہ شہادت اس کو من جانب اللہ پہنچی ہو اور اس کے اعلان اور اظہار کا وہ مامور ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں رسول آخر الزمان ﷺ کے متعلق جو شہادتیں تمہاری کتابوں میں مذکور ہیں تمہارا ان واضح شہادتوں کو چھپانا اور نصوص توریت وانجیل میں تحریف اور تغیر وتبدل کرنا سب اللہ کی نظروں کے سامنے ہے اور تم اس پر غرہ نہ کرنا کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں یہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئی اور مال ومتاع کی طرح تمہارے لیے اپنے اعمال صالحہ کا ذخیرہ چھوڑ کر نہیں گئی کہ جو بوقت ضرورت تمہارے کام آئے اس جماعت کے لیے اس کا کیا ہوا کام آئے گا اور

تمہارے لیے تمہارا کیا ہوا کام آئے گا اور تم سے اُن کے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا لہٰذا جب تم کو ان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں تو پھر ان کے اعمال سے نفع کی امید رکھنا سفاہت اور نادانی ہے۔

فائدہ : یہ آیت قریب ہی میں گذر چکی ہے تاکید اور مبالغہ کے لیے اس کو مکرر لائے کہ پھر کہہ دیتے ہیں کہ عمل کرو آباؤ اجداد کے بھروسہ پر نہ رہو۔ ع

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

الحمد للہ الذی بنعمتہٖ تتم الصالحات والصلاۃ والسلام علیٰ سید البریات و علیٰ اٰلہٖ و اصحابہٖ و ازواجہ الطاہرات۔ مسلسلات و متواتراتً ۴شوال المکرم یوم دو شنبہ ۱۳۶۹ھ مقام بہاول پور.

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کا ہے پر پھر گئے مسلمان اپنے قبلہ سے

كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

جس پر تھے تو کہہ اللہ کی ہے مشرق اور مغرب چلا دے جس کو چاہے

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

طرف سیدھی راہ

اثبات فضیلت قبلۂ ابراہیمی واسرار تحویل قبلہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ . . . الٰى . . . صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾﴾

ربط : گزشتہ آیات میں ملتِ ابراہیمی اور ملت اسلام کا افضل اور اکمل ہونا اور سرور عالم سیّدنا محمد ﷺ کا افضل الرسل ہونا بیان فرمایا۔ اب قبلۂ ابراہیمی اور کعبۂ اسلامی کا تمام قبلوں سے افضل ہونا بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح اس امت کی ملت تمام ملتوں سے افضل اور اکمل ہے۔ اسی طرح اس امت کا قبلہ بھی تمام قبلوں سے افضل اور بہتر ہے اور جس طرح ملّت ابراہیمی سے اعراض سفاہت اور جہالت ہے اسی طرح قبلۂ ابراہیمی سے بھی اعراض سفاہت اور جہالت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ یہود اور نصاریٰ نے ملّت ابراہیمی سے بھی اعراض کیا اور حق کو چھپایا اور اپنے آباؤ اجداد کے انتساب پر اعتماد کر کے اعمال صالحہ سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھا اور اپنی سفاہت اور بے وقوفی ظاہر کی۔ اب عنقریب ایک سفاہت اور ظاہر ہوگی۔ وہ یہ کہ جب بیت المقدس کا استقبال منسوخ ہو کر خانہ کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہوگا تو یہ نادان اور بے وقوف جو محض صورت کے اعتبار سے انسانوں کی جنس سے ہیں عنقریب یہ کہیں گے کہ کس چیز نے ان کو اس قبلہ سے پھیر دیا کہ جس پر اب تک قائم تھے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ﴾ کے بارہ میں علماء کے دو قول ہیں۔

قول اوّل: قفال مروزی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت تحویل قبلہ کے بعد نازل ہوئی اور یہ لفظ اگرچہ بظاہر استقبال کے لیے ہے لیکن اس جگہ ماضی کے معنی مراد ہیں۔

قول دوم : یہ آیت تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے آئندہ پیش آنے والے طعن اور اعتراض کی پہلے ہی سے خبر دے دی۔ اس آیت کے نزول کے وقت تک قبلہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ البتہ ہونے والا تھا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اُس کی خبر دے دی تا کہ مسلمان یہود کے اعتراض کو سن کر گھبرائیں نہیں اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور اس قول پر آیت کے ربط کی تقریر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ گزشتہ آیات اور رکوعات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے اُن اعتراضات کے جواب دیئے گئے جو وہ کر رہے تھے اب اس آیت میں اس اعتراض کا جواب بتلاتے ہیں جو آئندہ چل کر وہ کرنے والے تھے اور مطلب یہ ہے کہ اب تک تو

یہود اور نصاریٰ اور مشرکین تم پر وہی اعتراض کرتے تھے جو بیان ہو چکے۔ اور جن کا جواب بھی ہم دے چکے۔ اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ جب تم کو تحویل قبلہ کا حکم دیا جائے گا تو یہ بے وقوف اور سفیہ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ کیا دین ہے کہ جس کا قبلہ بدلتا رہتا ہے اور یہ کہیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے سابقہ قبلہ کو کیوں چھوڑ دیا۔

شانِ نزول:

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ مکرمہ میں رہے تو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو بحکم خداوندی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ سولہ یا سترہ مہینہ تک اسی طرف نماز پڑھتے رہے اس کے بعد خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا تو یہود اور مشرکین اور منافقین طرح طرح کے طعن کرنے لگے یہود کہنے لگے کہ پہلے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو انبیاء کا قبلہ تھا اب اس کو چھوڑ دیا اور جب آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو اس وقت بعض یہودی یہ کہتے کہ ہمارے دین کو تو مانتے نہیں ہمارے قبلہ کی طرف کیوں نماز پڑھتے ہیں۔ بعض یہودی کہتے کہ محمد (ﷺ) قبلہ سے واقف نہیں اس لیے ہمیں دیکھ کر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ مشرکین کہنے لگے محمدؐ اب سمجھ گئے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنے آبائی دین کی طرف آ رہے ہیں۔ کوئی کہتا کہ آپ ﷺ اپنے دین کے بارہ میں متحیر ہیں آنحضرت ﷺ ان باتوں سے ملول ہوتے اور دل سے یہ چاہتے کہ خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں طعن کرنے والوں کے حال سے خبر دی کہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوگا تو یہ بے وقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا کہ جس کی طرف وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ یعنی یہ جو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اب کیا ہوا کہ وہ اسے چھوڑ کر کعبہ کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ آپ اُن کے جواب میں کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کے لیے ہے مشرق اور مغرب وہی تمام جہات اور مکانات کا مالک ہے اس کو اختیار ہے کہ جس جہت اور جس سمت کو چاہے قبلہ مقرر کرے اور جس کو چاہے منسوخ کرے۔ غلام کو یہ پوچھنے کا حق حاصل نہیں کہ پہلے یہ حکم دیا تھا اور اب یہ حکم کیوں دیا۔ غلام کا آقا سے اس قسم کا سوال بھی اس کی بے عقلی کی دلیل ہے۔ مریض کا طبیب سے پوچھنا کہ نسخہ کیوں بدلا اس کی کمال سفاہت اور غایت حماقت کی دلیل ہے۔ غلام تو مولیٰ کے حکم کا تابع ہے۔ اسے تو حکم کا تباع چاہیے سر اور حکمت سے اس کو کیا بحث۔ خیر اگر تم حکمت ہی معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو! اصل مقصود عبادت ہے اور قبلہ عبادت کی ایک راہ ہے خدا کو اختیار ہے کہ جس راہ سے چاہے اپنے بندوں کی منزل طے کرائے کسی کو کسی راہ سے اور کسی کو کسی راہ سے اور جس کو چاہتا ہے اپنی عبادت کا سیدھا اور قریب راستہ بتلاتا ہے کہ جلد منزل مقصود طے ہو جائے اس لیے تم کو بہترین قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو عبادت اور معرفت کا سب سے قریب اور سیدھا راستہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام جو کہ تمام بنی نوع انسان کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ جو شجرۃ الانبیاء علیہم السلام ہیں اور تمام مذاہب اور ملتیں ان کی ملت کے تابع ہیں ان کے لیے بھی یہی راستہ تجویز ہوا اور خانہ کعبہ ہی ان کے لیے قبلہ بنایا گیا کیونکہ خانہ کعبہ زمین کا مرکزی نقطہ ہے۔ سب سے پہلے یہی مرکزی نقطہ پیدا کیا گیا اور یہیں سے زمین بچھائی گئی اور یہی جگہ انسان کا مبداء ترابی ہے اور یہی جگہ عرش عظیم اور بیت المعمور کے محاذات میں ہونے کی وجہ سے حق جل شانہٗ کے انوار و تجلیات کا مرکز ہے اور انسان چونکہ مٹی سے پیدا ہوا ہے، تو حسب قاعدہ کل شیء یرجع الی اصلہ۔ اس کا اصلی میلان اسی مرکزی نقطہ یعنی خانہ کعبہ کی طرف ہوگا اگرچہ ظاہراً محسوس نہ ہو۔ اس لیے خانہ کعبہ قبلہ عالم مقرر ہوا۔ نیز روایات سے ثابت ہے کہ جب آسمان اور زمین کو یہ خطاب ہوا۔ اِئْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا کہ تم خوشی سے آؤ یا لاچاری سے

تو زمین کے اجزاء اور قطعات میں سے سب سے پہلے اسی جگہ نے اطاعت خداوندی کے قبول میں سبقت کی اس لیے ازراہِ قدردانی حق جل شانہ نے اس جگہ کو قبلہ مقرر فرمایا۔ البتہ چند روز کے لیے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک بنی اسرائیل کے لیے مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنایا گیا کہ جو انبیاء بنی اسرائیل کا موطن اور مسکن اور مقام بعثت اور مقام دعوت ہونے کی وجہ سے مبارک اور مقدس جگہ ہے۔ اسی وجہ سے شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو براق پر سوار کر کے بیت المقدس لایا گیا اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح طیبہ سے ملاقات کرائی گئی اور وہیں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر گئے تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی انوار اور تجلیات کے ساتھ انبیاء سابقین علیہم السلام کے انوار و برکات بھی مل کر "نورٌ علیٰ نور" کا فائدہ دیں اور نبی القبلتین کے لقب سے ملقب ہوں اور توریت اور انجیل کی بشارت پوری ہو کہ وہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم صاحب قبلتین ہوگا۔ لہٰذا اس شکر میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج بیت المقدس سے ہوئی چند روز کے لیے نماز میں بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا کہ یہ مقدس جگہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اور ترقی کا زینہ بنی اس کا حق یہ ہے کہ چند روز اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرمائیں تا کہ سینہ مبارک اس مبارک اور مقدس جگہ کے انوار و تجلیات کو اپنے اندر جذب کر لے اور پھر یہ کمالات آپ کے سینہ مبارک سے آپ کی امت کے علماء کے سینوں کی طرف منتقل ہوں تا کہ آپ کی اُمت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کے وارث کہلا سکیں۔

غرض یہ کہ اس وجہ سے چند روز کے لیے بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا پھر ہمیشہ کے لیے اصل قبلہ کے استقبال کا حکم نازل ہوا۔ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل قبلہ خانہ کعبہ ہے اور یہی جگہ تمام رائے زمین پر سب سے افضل اور اکمل ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ
اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل کہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر
يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ
اور رسول ہو تم پر بتانے والا

تمام اُمتوں پر اُمتِ محمدیہ کی فضیلت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا... الیٰ... وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾

اور جس طرح ہم نے تمہارے لیے بہتر قبلہ تجویز کیا کہ وسط زمین میں ہے اور تمہارا مبداء ترابی ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ کے انوار و تجلیات کا مرکز ہے اسی طرح ہم نے تم کو اُمت متوسط بنایا کہ جو اخلاق اور اعمال اور عقائد کے اعتبار سے متوسط اور معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان میں واقع ہے گویا کہ یہ اُمت اپنے کمال توسط اور کمال اعتدال کے اعتبار سے حلقۂ اُمم کے درمیان عین مسند پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اور تمام اُمتیں اطراف و جوانب سے اس کی جانب متوجہ ہیں اور ہم نے تمکو اس توسط اور اعتدال کی فضیلت اس لیے عطا کی

تا کہ تمہاری عدالت علی وجہ الکمال ثابت ہو جائے اور قیامت کے دن تم لوگوں پر گواہ بن سکو اس لیے کہ شہادت کے لیے عدالت شرط ہے اور جب تم کامل العدالت ہو گے تو ٹھیک شہادت دے سکو گے۔ کامل اعتدال کی وجہ سے کسی ایک جانب تمہارا میلان نہ ہوگا اور تمہاری شہادت حق ہوگی اور طرفداری کے شائبہ سے پاک ہوگی۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ اوّلین و آخرین کو جمع کرے گا اور گزشتہ اُمتوں کے کافروں سے خطاب فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی نذیر یعنی ڈرانے والا نہیں آیا وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا جس سے ہم کو تیرے احکام کی اطلاع ہوتی اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام سے دریافت فرمائیں گے۔ تمام انبیاء علیہم السلام متفق اللفظ یہ عرض کریں گے کہ اے اللہ! ہم تیرے احکام کو پہنچا چکے یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہیں ان کو سب معلوم ہے۔ مگر اتمام حجت کے لیے انبیاء علیہم السلام سے گواہ طلب کریں گے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی گواہی میں اُمتِ محمدیہ کو پیش کریں گے۔ اُمم سابقہ کے کفار کہیں گے کہ ان کو کیا معلوم یہ تو ہم سے قرن ہا قرن بعد میں آئے۔ اُمتِ محمدیہ یہ جواب دے گی کہ اگرچہ ہم اُن کے بعد آئے مگر ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی اُمتوں کو اللہ کے احکام پہنچا دیئے اور شہادت کے لیے علم قطعی اور یقینی کافی ہے۔ خاص مشاہدہ ضروری نہیں اور نبی کی خبر مشاہدہ سے ہزار درجہ زیادہ قطعی اور یقینی ہے۔ مشاہدہ میں غلطی کا امکان ہے نبی کی خبر میں غلطی کا امکان نہیں اس لیے کہ نبی نبأ سے مشتق ہے اور نبأ لغت میں اس خبر کو کہتے ہیں جو بالکل صحیح اور واقع کے مطابق ہو مہتم بالشان بھی ہو۔ اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کو بلایا جائے گا اور آپ سے آپ کی اُمت کی اس شہادت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ تو اے اس اُمت کے مسلمانو اس وقت رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ ہوں گے اور تمہاری عدالت اور صداقت کی شہادت دیں گے اور پھر تمہاری شہادت کے مطابق حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہوگا اور کفار مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

فائدہ: اس اُمت کو متوسط اس معنی کر فرمایا کہ یہ امت عقائد اور اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان ہے۔ برخلاف یہود کے وہ تفریط میں مبتلا ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تنقیص کرتے ہیں ان کو معصوم نہیں سمجھتے جو کہ نبوت کا خاصہ لازمہ ہے اور نصاریٰ افراط میں مبتلا ہیں کہ اپنے نبی کو مرتبۂ بندگی سے درجۂ فرزندی پر پہنچایا اور توسط اور اعتدال ہی باجماع عقلاء اعلیٰ درجہ کا کمال ہے۔ اسی لیے علماء نے اس آیت سے اُمت محمدیہ کے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس اُمت کے اجماع کو نہ قبول کرنا اس کی عدالت سے عدول کرنا ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اُمت محمدیہ کے وسط (درمیان) میں ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ اُمت انبیاء و اولیاء کے درمیان ہے انبیاء سے نیچے اور اولیاء سے اوپر۔ چونکہ اس خطاب کو بالذات مخاطب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اس لیے اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام انبیاء کرام علیہم السلام سے نیچے ہے اور تمام اولیاء رحمۃ اللہ علیہم سے بلند اور اُونچا ہے۔

وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ

اور وہ جو ہم نے ٹھہرایا قبلہ جس پر تو تھا، نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع رہے گا

الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا

رسول کا اور کون پھر جاویگا الٹے پاؤں اور یہ بات بھاری ہوئی مگر

عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

ان پر جن کو راہ دی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا یقین لانا البتہ اللہ

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

لوگوں پر شفقت رکھتا ہے مہربان

تحویل قبلہ پر ایک شبہ مع الجواب

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ ... الٰى ... اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾﴾

آگے ایک شبہ کا ازالہ فرماتے ہیں: کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس امت متوسطہ اور کاملہ کے لیے مناسب یہی قبلۂ کاملہ ہے کہ جو وسط ارض میں ہے تو پھر اس میں کیا مصلحت تھی کہ چند روز کے لیے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا اور پھر اس کو منسوخ کیا۔ آئندہ آیت میں اسکا جواب دیتے ہیں کہ ہمارے علم میں تمہارا اصلی قبلہ تو کعبہ ہی تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔ اور جس قبلہ کی طرف چند روز آپ نماز ادا کرتے رہے۔ یعنی بیت المقدس اس کو ہم نے آپکا اصلی قبلہ نہیں بنایا تھا مگر محض اس مصلحت کے لے چند روز اس کے استقبال کا حکم دیا تھا کہ علانیہ اور ظاہری طور پر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں رسول کی تصدیق اور اطاعت سے تکذیب اور نافرمانی کی طرف پھرتا ہے۔ یعنی بجائے کعبہ کے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانان قریش کا امتحان مقصود تھا کہ کون رسول اللہ کا سچا تابعدار ہے کہ جس قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں اسی طرف نماز ادا کرتا ہے اور کون قومی حمیت کی رعایت کرتا ہے اس لیے کہ قریش کعبۃ اللہ کی تعظیم پر فخر کرتے تھے اور قبلۂ ابراہیمی کی مجاورت اور خدمت پر ناز کرتے تھے۔ اور بیت المقدس سے قبلۂ بنی اسرائیل ہونے کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قومی حمیّت کے امتحان کے لیے بجائے خانہ کعبہ کے بیت المقدس کے استقبال کا حکم دیا۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانانِ قریش کا امتحان تھا اور پھر جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو اس میں مسلمانانِ یہود کا امتحان تھا اور چونکہ بیت المقدس محض چند روز کے لیے امتحاناً قبلہ بنایا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ امتحان اسی چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر شاق اور گراں ہو اس لیے ارشاد فرماتے ہیں: اور بے شک بیت المقدس کا قبلہ ہونا قریش اور عرب پر بت شاق اور گراں تھا۔ اولاد اسماعیل ہونے کی وجہ سے قبلۂ ابراہیمی کو پسند کرتے تھے مگر ان لوگوں پر شاق نہیں کہ جن کو اللہ نے ہدایت اور توفیق دی اہل ہدایت کی نظر ہمیشہ اطاعت پر رہتی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے جس جانب چہرہ کرنے کا حکم ہوگا اسی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ نیز اخص الخواص اپنے ذوق سلیم سے یہ خیال کرتے تھے کہ اگرچہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے افضل ہے۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے جامع ہیں اور آپ کی رسالت تمام عالم اور امم کے لیے ہے اس لیے یہ لوگ اپنی نور فراست سے سمجھتے تھے کہ ضروری ہے کہ کسی وقت استقبال بیت المقدس کی نوبت آئے گی۔ اور بعد چندے اصل قبلہ یعنی کعبہ کی طرف رجوع کا حکم ہو گا۔ جو افضل الرسل کے مناسب ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ﴾ سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا بعد میں علم ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم اور ازلی ہے حاشا وکلا اللہ کا علم حادث نہیں۔

جواب: بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ علم سے تمیز کے معنی مراد ہیں یعنی ممتاز اور جدا جدا کر دینا اور بعض کہتے ہیں کہ علم سے مراد امتحان اور آزمائش ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم مطیع کو نافرمان سے ممتاز اور جدا کر دیں یا یہ معنیٰ ہیں کہ ہم امتحان کرتے ہیں کہ کون اطاعت کرتا ہے اور کون انحراف کرتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مضاف محذوف ہے اور اللہ کے جاننے سے اللہ کے رسول ﷺ کا اور عباد مؤمنین کا جاننا مراد ہے یعنی تا کہ ہمارا رسول ﷺ اور اہل ایمان بھی جان لیں۔ اور بیت المقدس اگرچہ اصلی قبلہ نہ تھا مگر تم نے اس مدت میں جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں ان کو ضائع نہ سمجھنا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ جو تمہارے ایمان اور اطاعت کو ضائع کر دے۔ اس لیے کہ تم نے جو نمازیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں وہ اللہ ہی کے حکم سے پڑھی ہیں تحقیق اللہ تعالیٰ تو تمام آدمیوں پر، نیک ہوں یا بد مؤمن ہوں یا کافر سب ہی پر بہت ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ اپنے حکم کے اتباع کرنے والوں کی نماز اور بندگی کب ضائع کر سکتے ہیں۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪

ہم دیکھتے ہیں پھر پھر جانا تیرا منہ آسمان میں سو البتہ پھیریں گے تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا

اب پھیر منہ اپنا طرف مسجد حرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو

وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ

منہ اسی کی طرف اور جن کو ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں جو کرتے ہیں۔

تحویل قبلہ کا حکیمانہ جواب

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ ... الیٰ ... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۳﴾﴾

گزشتہ آیات میں تحویل قبلہ پر شبہ کا حاکمانہ جواب تھا۔ اب حکیمانہ جواب ارشاد فرماتے ہیں اور تحویل قبلہ کی حکمتوں کی طرف

اشارہ فرماتے ہیں:

حکمتِ اوّل: رأفت اور رحمت کی وجہ سے اگرچہ استقبال بیت المقدس میں بھی اجر کامل مل جائے مگر قبلۂ کاملہ درحقیقت کعبہ معظّمہ ہے اور کامل کا میلان طبعی کامل ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے کہ شاید فرشتہ کامل قبلہ کے استقبال کا حکم لیکر نازل ہو۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ تحقیق ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے چہرہ کا بار بار وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف اٹھنا کہ کب خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نازل ہو اور چونکہ ہم کو آپ کی آرزو اور خواہش کا پورا کرنا منظور ہے۔ پس اس لیے ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپکو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح میری ملّت ابراہیمی ہے اسی طرح میرا قبلۂ عبادت بھی قبلۂ ابراہیمی بنا دیا جائے۔ لو پھر حکم دے ہی دیتے ہیں پس آپ اپنا منہ بجائے بیت المقدس کے مسجد حرام کی طرف کر لیجیے کہ اب ہمیشہ کے لیے وہی آپ کا قبلہ ہے اور یہ حکم آپ کے لیے مخصوص نہیں اگرچہ درخواست آپ کی تھی مگر حکم تمام اُمت کے لیے ہے۔ اُمت سے کہہ دیجیے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اسی جانب اپنے چہروں کو متوجہ کرو حتیٰ کہ اگر بیت المقدس میں بھی ہو تب بھی مسجد حرام ہی کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرو اور تحقیق اہل کتاب بخوبی یہ جانتے ہیں کہ یہ قبلہ حق ہے۔ خود ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ ملت ابراہیمی پر ہوں گے اور ان کا قبلہ قبلۂ ابراہیمی ہوگا۔ اور اہل کتاب یہ بھی بالیقین جانتے ہیں کہ اس نبی اور اس اُمت نے یہ قبلہ اپنی رائے سے نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کے پروردگار کی جانب سے یہی حکم آیا ہے۔ مگر اس کو چھپاتے ہیں ظاہر نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کی ان کارروائیوں سے غافل نہیں وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کے حکم پر چلتا ہے اور کون اپنی رائے اور خیال پر چلتا ہے۔ حاصل اس حکمت کا یہ ہے کہ ہم نے آپ کی خواہش اور خوشی کے موافق قبلہ تبدیل کر دیا تا کہ لوگوں پر آپ کا شرف اور آپ کی عظمت ظاہر ہو جائے۔

وَ لَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ
اور اگر تو لادے کتاب والوں پاس ساری نشانیاں نہ چلیں گے تیرے قبلہ پر
وَ مَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَ
اور نہ تو مانے ان کا قبلہ اور نہ ان میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ اور
لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ
کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ تک پہنچا تو بے شک تو
اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
بھی ہے بے انصافوں میں جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں یہ بات جیسے

يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ

پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور ایک فرقہ ان میں چھپاتے ہیں حق کو

يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَ لِكُلٍّ ع ۱۷ ۱۶ ۱

جان کر حق وہی جو تیرا ربّ کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا اور ہر کسی

وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ

کو ایک طرف ہے کہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم سبقت چاہو نیکیوں میں جس جگہ تم ہو گے کر لاوے گا

اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

اللہ اکٹھا بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے اور جس جگہ سے نکلے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا

منہ کر طرف مسجد حرام کے اور یہی تحقیق ہے تیرے رب کی طرف سے اور

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ

اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے اور جہاں سے تو نکلے منہ کر

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لَ

طرف مسجد حرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو منہ کرو اسی کی طرف

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ قف اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قف

کہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کی جگہ مگر جو ان میں بے انصاف ہیں

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ قف وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ

سو ان سے مت ڈر اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ پورا کروں تم پر فضل اپنا اور شاید تم

تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ لا

راہ پاؤ۔

عناد اہل کتاب دربارۂ قبلہ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ... الیٰ ... وَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾

ربط : گزشتہ آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اہل کتاب کو اس قبلہ کا حق ہونا بخوبی معلوم ہے اور خود اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ کچھ روز بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں گے اور آخر کو کعبہ کی طرف اور یہی اُن کا اصل اور دائمی قبلہ ہے جو ملّت ابراہیمی کے موافق ہے مگر حسد اور عناد کی وجہ سے چھپاتے ہیں۔ آئندہ آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ ان کا عناد کس درجہ پر پہنچا ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور اگر آپ اس قبلہ کی حقیّت اور فضیلت پر ہر قسم کے دلائل اور نشانات بھی لے آئیں تب بھی یہ لوگ آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں گے اور نہ آپ کبھی بھی ان کے قبلہ کا تباع اور پیروی کریں گے۔ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ آپ ان کے تابع بن جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کبھی بھی ان کے قبلہ کا اتباع اور پیروی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ان کا قبلہ منسوخ ہو چکا ہے اور جس قبلہ کا آپ کو حکم ہوا ہے وہ آئندہ چل کر کبھی منسوخ نہ ہوگا اور بیت المقدس کے استقبال کا اب کبھی حکم نہ آئے گا اور عقلاً بھی اہل کتاب کے قبلہ کا اتباع ممکن نہیں اس لیے کہ وہ خود ہی آپس میں قبلہ کے بارہ میں ایسے مختلف ہیں کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے قبلہ کے متبع نہیں ہر ایک نے اپنی نفسانی خواہش سے علیحدہ قبلہ کا اتباع کر رکھا ہے اور اے نبی کریمؐ بالفرض اگر آپ ان کی نفسانی خواہشوں کا اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس قبلہ کے بارہ میں علم صحیح اور قطعی آچکا تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں شمار ہوں گے اس لیے کہ ناسخ کو چھوڑ کر منسوخ کا اتباع کرنا ہوائے نفس ہے اور ہوائے نفسانی کا اتباع آپ سے بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے لہٰذا آپ ﷺ سے اُن کے قبلہ کا اتباع بھی محال ہوگا۔

عناد اہل کتاب دربارۂ صاحب قبلتین ورسول ثقلین ﷺ

حکمت اوّل در تحویل قبلہ:

گزشتہ آیت میں قبلہ کے بارہ میں اہل کتاب کے عناد کا ذکر تھا اب صاحب قبلہ کے بارہ میں ان کے عناد کا ذکر ہے کہ اہل کتاب اسی نبی موعود کو جانتے اور پہنچانتے ہیں مگر مانتے نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ آپ ﷺ کو خوب پہچانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں کہ جن کی توریت اور انجیل میں بشارت دی گئی ہے۔ اہل کتاب آپ کی صورت اور شکل کو دیکھ کر اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو صورت و شکل اور قد و قامت سے پہچانتے ہیں۔ جیسے بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا اسی طرح نبی کریمؐ کی صورت کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی نبی برحق ہے اور یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں اس لیے کہ توریت اور انجیل میں آپ کا حلیہ اور صورت و شکل اور قد و قامت لون وغیرہ سب مذکور تھا اور تحقیق ان میں کا ایک فریق حق کو چھپاتا ہے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ توریت میں آپ کا نبی قبلتین ہونا بھی مذکور ہے پس یہی امر حق ہے جو تیرے ربّ کے پاس سے آیا ہے پس تو اُن کی تلبیس کی وجہ سے ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔ خطاب آپ کو ہے مگر سنانا دوسروں کو ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹوں کی طرح پہچانتے ہو؟ تو جواب دیا کہ ہاں بیٹوں سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ بیٹے میں شک ہوسکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کوئی شک نہیں ہوسکتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور علامات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی ہم نے پہچان لیا کہ آپ نبی برحق ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے سچ کہا اور اللہ نے تم کو خیر کی توفیق دی۔

حکمت دوم در تحویل قبلہ:

اور دوسری حکمت تحویل قبلہ میں یہ ہے کہ ہر امت کے لیے ایک جداگانہ قبلہ ہے جس کی طرف وہ اُمت متوجہ ہوتی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ خانہ کعبہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ بیت المقدس تھا اسی طرح تمہارے لیے بھی ایک مستقل قبلہ تجویز ہوا۔ جس طرح تمہارا دین مستقل اور جداگانہ ہے اسی طرح تمہارے لیے قبلہ بھی مستقل ہونا چاہئے کوئی جہت اور کوئی سمت اپنی ذات سے قبلہ نہیں خدا تعالیٰ نے جس جہت کو قبلہ بنا دیا وہ قبلہ ہوگئی۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک جہت کو قبلہ مقرر کر دیا۔ پس اے مسلمانو! تم اس قبلہ کے مسئلہ میں کنج وکاؤ نہ کرو۔ اصل نیکیوں کی طرف دوڑو جو مقصود بالذات ہیں یعنی نماز اور روزہ وغیرہ۔ نہ کہ قبلہ کہ وہ اصل عبادت نہیں بلکہ ذریعۂ عبادت ہے اور اصل عبادت تو حکم خداوندی کا امتثال ہے اس کی طرف دوڑو۔ جس وقت وہ خداوند ذوالجلال بیت المقدس کے استقبال کا حکم دے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور جس وقت خانہ کعبہ اور مسجد حرام کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے اس طرف متوجہ ہو جاؤ کسی سے منازعت کی ضرورت نہیں۔ تمام خیرات اور نیکیوں کی جڑ، امر خداوندی کے امتثال میں مبادرت اور سبقت کرنا ہے۔ اصل بھلائی حکم کی پیروی میں ہے جس وقت جو حکم ہو اس کی تعمیل کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ جہاں سب عبادتوں پر اجر ملے گا اور اصل عبادت تعمیل حکم ہے وہ احکم الحاکمین ہے جو چاہے حکم دے تم مشرق اور مغرب میں جہاں کہیں بھی ہو گے تم سب کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حساب کے لیے حاضر کرے گا اور تمہارے اعمال کے مطابق تم کو جزا دے گا یعنی اختلاف جہات صرف دُنیا میں ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب کو جہات مختلفہ سے ایک مکان میں جمع کرے گا اور سب کو بھلائی اور برائی کی جزا دے گا اور سب نمازوں کو بمنزلہ ایک نماز کے بنا دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اب آپ آئندہ نماز میں بیت المقدس کا استقبال نہ کریں بلکہ جس جگہ سے بھی نکلیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور یہی حق ہے کہ ہر حال میں خانہ کعبہ کا استقبال کرو اور تیرے رب کی طرف سے یہ حکم آیا ہے جس سے مقصود تیری ہی تربیت ہے اور تکمیل عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں کہ کون اس کے حکم کے موافق نماز ادا کرتا ہے اور کون اس کے خلاف کرتا ہے۔

حکمت سوم در تحویل قبلہ:

اور تیسری حکمت اتمام حجت اور دفع الزام ہے۔ اوّلاً تحویل قبلہ کے حکم کا اعادہ فرمایا اور ثانیاً ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ سے اس حکم کی ایک جدید علت بیان فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور پھر ہم تم کو مکرر کہتے ہیں۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ جس جگہ سے بھی باہر نکلیں تو اپنا منہ نماز میں مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور اے مسلمانو! تم بھی جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کر لیا کرو تا کہ لوگوں کا تم پر کوئی الزام نہ رہے کیونکہ اگر تحویل قبلہ کا حکم نہ نازل ہوتا تو یہود تم کو یہ الزام دیتے کہ توریت میں یہ صاف لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بالآخر قبلۂ ابراہیمی ہوگا۔ اور خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہو جانے کا ان کو حکم آئے گا۔ پس یہود یہ الزام دیتے کہ توریت میں جو

نبی آخرالزمان ﷺ کی علامت لکھی ہوئی ہے وہ آپ میں موجود نہیں۔ اور مشرکین یہ الزام دیتے کہ محمد ﷺ دعویٰ تو کرتے ہیں ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا مگر قبلۂ ابراہیمی سے روگردانی کرتے ہیں۔ اب تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے یہود اور مشرکین کسی کا کوئی الزام نہیں رہا اور ہر دو فریق کی زبان بند ہوگئی مگر جو ان میں ظالم ہیں وہ اعتراض اور طعن سے باز نہ آئیں گے۔ یہود یہ کہیں گے کہ محض حسد کی وجہ سے ہمارے قبلہ کو چھوڑا جو کہ انبیاء علیہم السلام کا قبلہ تھا اور ظالم بت پرست یہ کہیں گے کہ محمد رفتہ رفتہ اپنے آبائی دین کی طرف آرہے ہیں۔ پس تم ان ظالموں اور ان کے طعن سے نہ ڈرو۔ بلکہ فقط مجھ سے ڈرتے رہو اور ان کے طعن کی وجہ سے میرے حکم کو نہ چھوڑو۔ خالق کے حکم کو مخلوق کے طعن سے چھوڑنا موجب خسران وعذاب ہے اور خالق کی حکم برداری کے لیے مخلوق کے طعن پر صبر کرنا موجب فلاح و ثواب ہے مخلوق کا طعن مضر نہیں خالق کی خلاف حکمی مضر ہے۔

حکمت چہارم در تحویل قبلہ:

اور چوتھی حکمت یہ ہے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کروں کہ نماز میں (جو کہ سب سے افضل اور اعلیٰ عبادت ہے) تمہاری توجہ سب سے افضل اور اکمل قبلہ اور بہترین جہت کی طرف ہوتا کہ اس جہت کے انوار و برکات بھی تمہاری نماز کو خوب روشن اور منور بنادیں۔ قبلہ کے باب میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ عبادت میں افضل جہات کے استقبال کا حکم دیا جائے جیسا کہ دین کے بارہ میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ دین کامل عطا کیا جائے۔ كَمَا قَالَ اللهُ تَعَالٰى: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (المائدہ:۳)

حکم پنجم در تحویل قبلہ:

اور پانچویں حکمت یہ ہے کہ تم کو سیدھا راستہ معلوم ہو اور افضل جہات کے استقبال سے تم کو ہدایت کاملہ حاصل ہو اور قریب ہی راستہ سے جلد منزل مقصود تک پہنچ جاؤ۔ جیسا کہ ﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ کی تفسیر میں گزرا۔

تحویل قبلہ کے حکم کو مکرر لانے کی حکمت:

وجہ اوّل: تحویل قبلہ کے حکم ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کو تین بار اس لیے مکرر لایا گیا کہ حق تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی تین علت غائیہ ذکر فرمائیں۔ اوّل یہ کہ آنحضرت ﷺ کی تمنا اور خواہش یہی تھی۔ وحی کے انتظار میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے آپ کی دل جوئی اور اظہار تکریم کے لیے یہ حکم دیا گیا۔ دوم: یہ کہ ہر اُمت کے لیے مستقل قبلہ ہوتا ہے اور اُمتِ محمد یہ بھی ایک مستقل اُمت ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بھی ایک مستقل قبلہ ہونا چاہیے۔ سوم: یہ کہ مخالفین کا الزام دفع کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا۔ كما اشار اليه بقوله: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ اس لیے ہر علت کے ساتھ معلول کی اور ہر دلیل کے ساتھ دعویٰ کی تجدید کردی گئی کیونکہ کلام کی خوبی یہ ہے کہ علت اور معلول اور دعویٰ دونوں ساتھ ذکر کیے جائیں۔

وجہ دوم: بعض اہل علم نے تکرار کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ پہلی آیت خاص ساکنانِ حرم کے حق میں ہے۔ اور دوسری آیت ساکنان جزیرۃ العرب کے حق میں ہے اور تیسری آیت تمام روئے زمین کے باشندوں کے حق میں ہے۔

وجہ سوم: پہلی آیت تعمیم احوال کے لیے ہے اور دوسرے آیت تعمیم امکنہ کے لیے ہے اور تیسری آیت تعمیم ازمنہ کے لیے ہے۔ یعنی تمام احوال اور تمام مکانات اور تمام اوقات میں یہی قبلہ ہے اسکا استقبال ضروری ہے۔

وجہ چہارم: چونکہ شریعت میں سب سے پہلے یہی حکم منسوخ ہوا اس لیے اس کے بیان میں زیادہ اہتمام کیا گیا اور تاکیداً

تین بار اس حکم کا اعادہ کیا گیا۔

وجہ پنجم: کسی حکم کا منسوخ ہونا محل فتنہ اور محل شبہ ہے اور احکام خداوندی میں نسخ جاری ہونا بے وقوفوں کی عقل سے باہر ہے اس لیے اس حکم کا تکرار مناسب ہوا۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ

جیسا بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا تمہارے پاس ہماری آیتیں اور تم کو سنوارتا اور

يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

سکھاتا کتاب اور تحقیق بات اور سکھاتا تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔

بیان وظائف رسول اعظم ﷺ کہ از قبلۂ ابراہیمی وحرم محترم مبعوث باشد

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ ... الٰى ... وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾

ربط: ابتداء قصہ میں بناء کعبہ کا ذکر فرمایا اور بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ذکر فرمائی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ .... الآية﴾

"کہ اے اللہ اس حرم کعبہ کی سرزمین سے ایسا نبی مبعوث فرما کہ جو تیری آیات کی تلاوت کرے اور لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے ..... الٰی آخرہ۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں خانہ کعبہ کو مرجع خلائق اور قبلۂ عالم بنایا اور قبلۂ ابراہیمی کے بارہ میں جو سفہاء کے شبہات تھے تفصیل کے ساتھ ان کا جواب دیا اور خانہ کعبہ کا افضل قبلہ ہونا بیان فرمایا۔ اب آگے اس بحث کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری دُعا یعنی افضل الرسل کی بعثت کے ذکر پر ختم فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم نے قبلہ کے بارہ میں تم پر اتمام نعمت * کیا کہ سب سے افضل قبلہ تمہارے لیے مقرر کیا۔ اسی طرح ہم نے نبوت ورسالت اور ہدایت کے بارہ میں تم پر اس طرح اتمام نعمت کیا کہ سب سے افضل اور اکمل اور عظیم الشان رسول تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا اور پھر اس پر مزید انعام یہ کہ تمہاری قوم میں سے یا تمہاری جنس میں سے بھیجا۔ جو تمہارے لیے دین ودُنیا میں باعث عزت وشرف ہو اور اس طرح تم پر اللہ کی نعمت پوری ہوئی۔ غور تو کرو کہ کس قدر عظیم الشان نعمت ہے اور وہ رسول فقط ہمارے احکام ہی نہیں پہنچائے گا بلکہ تم پر ہماری آیتوں کی تلاوت بھی کرے گا۔ جس سے تم کو کلام الٰہی کے سننے کی نعمت حاصل ہوگی۔ اور اسرار بلاغت اور دلائل اعجاز تم پر منکشف ہوں گے اور چونکہ کلام متکلم کے کمالات کا آئینہ اور مظہر ہوتا ہے اس لیے اس نور السموات والارض کے انوار وتجلیات بواسطہ اس کلام کے بقدر تمہاری استعداد کے تمہارے قلوب پر منعکس ہوں گے اور جو

---

* گزشتہ آیت میں ﴿وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ تھا۔ اس اتمام نعمت کے لفظ سے ﴿وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ﴾ کی طرف اشارہ ہے اور آئندہ سطر میں یہ لفظ تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

قلوب اور صدرور اپنے رب غفور کے اس کلام سراپا نور کی حفاظت کریں گے وہ کوہ طور کا ایک نمونہ ہوں گے اور پھر تم اس کلام کے ذریعہ سے اپنے ربّ اکرم سے قبلہ رو ہو کر مناجات کر سکو گے اور اس کی تلاوت اور استماع سے جو اجر اور لذت تم کو حاصل ہوگی وہ حیطۂ بیان سے باہر ہے اور علاوہ ازیں وہ رسول تم کو اپنی ایک ہی نظر کیمیا اثر میں گناہوں کے زنگ سے آئینہ کی طرح صاف وشفاف بنا دے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس رسول کی نظروں اور قدموں پر تولا کر ڈالو اور اگر تم اس کی نظر ہی سے بھاگ جاؤ تو پھر نظر کیا کام کرے آئینہ جب تک آفتاب کے سامنے نہ ہو تو آفتاب کا عکس اس میں کہاں آئے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آئینہ دل کو آفتاب نبوت کے سامنے کر دیا نور ہدایت سے جگمگا اُٹھا۔ ابوجہل اور ابولہب نے آفتاب نبوت سے منہ پھیر لیا نور ہدایت سے محروم رہا۔ اور وہ رسول تم کو کتاب الٰہی کے معانی اور اسرار و حکم بھی سکھائے گا اور علاوہ ازیں وہ رسول تم کو ایسی عجیب وغریب باتوں کی بھی تعلیم دے گا کہ جن کو تم اپنی عقل سے نہیں جا ن سکتے تھے جیسے نماز کی کیفیت اور زکوٰۃ کی کمیت اور حج کا طریقہ نماز اور زکوٰۃ کی کیفیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلانے سے معلوم ہوئی قرآن میں اجمال تھا۔ حدیث نے اس کی تفصیل کی اور جس عظیم الشان رسول کے مبعوث ہونے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی اس کا ظہور ہو گیا ؎

گر نہ ہوتی ذات پاک انبیاء حق سے باطل کس طرح ہوتا جدا

اور اس طرح اللہ کی نعمت تم پر پوری ہوئی۔ لہٰذا تم اس نعمت عظمیٰ کا شکر کرو۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ع ۱۸ ۵ ۲

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾ ع
تو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔

تلقین ذِکر و شکر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾﴾

پس جب کہ میں نے تم کو ایسی عظیم نعمتوں سے سرفراز کیا اور تم میں ایسا عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیج کر تم کو یاد کیا تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم بھی مجھ کو ہمیشہ یاد رکھو کسی وقت میری یاد سے غافل نہ ہو میں تم کو اپنے لطف وعنایت سے یاد کروں گا اور ملاء اعلیٰ میں تمہارے ذکر کا ذکر کروں گا کہ یہ میرے یاد کرنے والے بندے ہیں جس سے ملاء اعلیٰ اور ملائکہ مقربین کی عنایات تم پر مبذول ہوں گی۔

فائدہ: قلب سے حجابات غفلت دور کرنے کے لیے ذکر الٰہی سے بہتر کوئی شے نہیں۔ جس طرح قلب سے حرص اور طمع کا فاسد مادہ دور کرنے کے لیے انفاق فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں۔ اور میرا احسان مانو اور شکر کرو کہ تمہاری ہدایت کے لیے ایسا عظیم الشان رسول بھیجا۔ شکر سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ (ابراہیم:۷) لہٰذا اگر تم نے ہماری نعمت کا شکر کیا تو تمہاری ہدایت اور کتاب وسنت کے علم اور معرفت میں زیادتی ہوگی اور جتنا ذکر اور شکر کرو گے اسی قدر تمہارے تزکیۂ باطن اور علوم ومعارف میں زیادتی ہوگی۔ اور میری ناشکری مت کرو کہ اس رسول کا انکار کر بیٹھو اور دل وجان سے اس کی اطاعت نہ کرو۔ اور اگر من جانب اللہ علوم ومعارف

منکشف ہوں تو دعوے مت کرو دعوی بھی ناشکری میں داخل ہے۔

نکتہ: دعاءِ ابراہیمی جو پہلے گزر چکی ہے اس میں تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر مقدم تھا اور تزکیہ کا ذکر مؤخر تھا اور اس آیت یعنی ﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ .... الخ﴾ میں تزکیہ کا ذکر مقدم ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر مؤخر ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اصل مقصود تو تزکیۂ نفس ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ اگر تعلیم ہو اور تزکیہ حاصل نہ ہو تعلیم بے فائدہ ہے اور عموماً تزکیہ نفس تعلیم کتاب اور حکمت ہی کے بعد حاصل ہوتا ہے اور تعلیم تزکیہ کے مبادی اور مقدمات میں سے ہے اس لیے دعائے ابراہیمی میں ترتیب وقوعی کے لحاظ سے تزکیہ کے مبادی اور وسائل کو پہلے ذکر کیا اور مقصود کو اخیر میں ذکر کیا۔ اور حق جل شانہٗ نے جب دعا ابراہیمی کی اجابت اور قبولیت کا ذکر فرمایا تو اصل مقصود کو پہلے ذکر فرمایا تا کہ سامعین کو ابتداء ہی سے یہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود تزکیہ ہے اور وہ بارگاہ خداوندی سے منظور ہو چکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ
اے مسلمانو! قوت پکڑو ثابت رہنے سے اور نماز سے بے شک اللہ ساتھ ہے
الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
ثابت رہنے والوں کے

طریقۂ تحصیل ذکر و شکر و بیان فضیلت صبر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ ﴾

ربط: گزشتہ آیت میں ذکر و شکر کا حکم تھا اور کفرانِ نعمت کی ممانعت تھی اور ذکر و شکر میں تمام احکام خداوندی کا بجالانا داخل تھا اور کفرانِ نعمت کی ممانعت میں تمام منہیات اور ممنوعات سے بچنا داخل تھا اور تمام احکام کا بجالانا اور تمام ممنوعات سے بچنا بظاہر بہت دشوار ہے۔ اس لیے آئندہ آیت میں مسلمانوں کو ذکر اور شکر کے حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: اے ایمان والو! اگر ذکر اور شکر اور درجات قرب اور معرفت کے حاصل کرنے میں دشواری معلوم ہو تو صبر اور نماز کی مدد اور سہارے سے اس کو حاصل کرو۔ صبر من جانب اللہ ایک خاص ہتھیار ہے کہ جو خاص انسان کو عطا کیا گیا ہے تا کہ مشکلات میں اس کا معین اور مددگار ہو۔ صبر کی خاصیت یہ ہے کہ رنج و غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ حیوانات میں صرف شہوت ہے عقل نہیں۔ ملائکہ میں صرف عقل ہے شہوت نہیں۔ انسان میں عقل کے ساتھ شہوت اور غضب بھی ہے۔ اس لیے انسان کو شہوت اور غضب کا وار روکنے کے لیے صبر کا ہتھیار دیا گیا اور فرشتہ اور حیوان کو نہیں دیا گیا۔ عقل اور شہوت میں جب کشمکش ہو تو عقل کے اشارہ پر چلنا اور نفسانی خواہشوں پر نہ چلنا اس کا نام صبر ہے۔ اخلاق جمیلہ میں صبر کا مقام نہایت بلند ہے۔ حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں صبر کو ستر ۷۰ یا پچہتر ۷۵ جگہ ذکر فرمایا ہے۔ آیات قرآنیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل صالح کا اجر مقرر ہے۔ مگر صبر کا اجر بے حساب ہے۔ پس اگر نفس پر احکام شرعیہ شاق اور گراں ہوں تو اُن کے آسان ہونے کا ایک علاج تو

صبر ہے اور دوسرا علاج نماز ہے۔ اس لیے کہ نماز ایک تریاق مجرّب ہے جو ذکر اور شکر اور خشوع اور خضوع اور اس قسم کے مختلف اجزء سے مرکب ہے جو ہر بیماری کی دوا اور ہر مشکل کا علاج ہے۔ جیسے بارش کے لیے صلوٰۃ استسقاء ہے اور ہر دینی اور دنیوی مطلب کے لیے صلوٰۃ الحاجت ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو جب مشکل پیش آتی تو نماز میں مشغول ہوتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پریشانی آتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو جاتے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب ظالم بادشاہ نے حضرت سارہ علیہا السلام کو پکڑوایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز میں مشغول ہو گئے۔

اور جریج رحمۃ اللہ علیہ راہب پر جب لوگوں نے زنا کی تہمت لگائی تو جریج رحمۃ اللہ علیہ نماز میں مشغول ہو گئے۔ (بخاری و مسلم)

غرض یہ کہ نماز اُمّ العبادات ہے اور دین کا ستون ہے اور مومن کی معراج ہے جس کی کثرت سے مومن کے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ نماز اگرچہ مختلف اجزاء سے ایک معجون مرکب اور تریاق مجرب ہے لیکن اس کی روح دُعا ہے جو ہر مرض کی دوا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیئے کہ صبر اور نماز سے غافل نہ ہوں اس لیے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اس لیے کہ صبور اور حلیم اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں اور جو اخلاقِ خداوندی کا خوگیر اور عادت پذیر ہو اس کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوگی۔

خداوندِ ذوالجلال کی بے چون و چگون معیت کی حقیقت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ جن اولیاء اور عارفین کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت اور قرب خاص سے سرفراز فرمایا وہ حضرات کچھ قرب اور معیت کے مزہ سے واقف ہوتے ہیں مگر کسی دوسرے کو سمجھا نہیں سکتے۔ بغیر چکھے کسی شے کا بھی ذائقہ نہیں معلوم ہوسکتا۔ اور جس نے کوئی پھل نہ چکھا ہو اس کو یہ حق نہیں ہ وہ اس پھل کا یا اس کے مزہ کا انکار کرے۔

غرض یہ کہ معیت۔ صبر کے ذریعہ حاصل ہے اور معیت کی علامت یہ ہے کہ توفیق خداوندی اس کو کارِ خیر کی طرف لے جاتی ہے۔ رہی نماز سو وہ مؤمنوں کی معراج ہے اس کے عروج کے کیا پوچھنا اس لیے معیت کے بیان میں صبر کا ذکر کیا اور نماز کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ
اور نہ کہو جو کوئی مارا جائے اللہ کی راہ میں کہ مردے ہیں بلکہ وہ زندے ہیں لیکن
لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾
تم کو خبر نہیں۔

بیان حیات شہداء کہ از ثمراتِ صبر است

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾

ربط: گزشتہ آیت میں صبر کی فضیلت کا بیان تھا کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں:

کہ جو مقام صبر میں انتہاء کو پہنچ جائے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینا بھی اس کو شیریں اور لذیذ معلوم ہو تو اس پر خداوندی و قیوم کی بے چون و چگون حیات کا ایک عکس اور پرتو پڑتا ہے جس سے اس کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ جن صابرین نے خدا کی راہ میں جان نثاری کی ہو اُن کی حیات میں تردّد نہ کرو اور جو صابر خدا کی راہ میں مارے گئے۔ اور ان کی اس میں کسی قسم کی دنیوی اور نفسانی غرض نہ تھی ان کو یہ نہ کہو کہ عام مردوں کی طرح وہ مردہ ہیں بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں لیکن تم جانتے نہیں کہ وہ کس طرح کی زندگی ہے۔ وہاں کی زندگی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس حیات کے ادراک کے لیے یہ حواس کافی نہیں۔

فائدہ ①: شہید اگرچہ ظاہراً مر گیا لیکن اس کی موت عام لوگوں کی موت نہیں۔ مرنے کے بعد انسان کی ترقی رُک جاتی ہے اس لیے کہ روح کی ترقی کا ذریعہ بدن ہے۔ جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہوا تو ترقی مراتب بھی ختم ہوئی۔ مگر شہید کی ترقی برابر جاری جاری رہتی ہے جس عمل میں اس نے جان دی ہے اس کا اجر برابر جاری رہتا ہے گویا کہ اب بھی وہ عمل کر رہا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی مرَ جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر مجاہد فی سبیل اللہ کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ ②: احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹ میں رکھدی جاتی ہیں اور جنت میں اُڑتی پھرتی ہیں اور جنت کے میوے کھاتی ہیں اور عرش کی قندیلوں میں آرام کرتی ہیں۔

بظاہر وجہ یہ ہے کہ شہید نے اپنے بدن کو خدا کی راہ میں قربان کیا خدا تعالیٰ نے اس عنصری بدن کے بدلہ میں ایک دوسرا عنصری بدن اس کی روح کی سیر و تفریح کے لیے عطاء فرمایا۔ یہ جسم طیوری اس روح کے لیے بمنزلہ ایک طیّارہ کے ہے جس کے ذریعہ سے روح جنت میں اُڑ کر سیر و تفریح کر سکے۔ اور یہ روح اس نئے جسم میں مدبر اور متصرف نہیں تا کہ تناسخ کا شبہ ہو۔ اس لیے کہ تناسخ کی حقیقت یہ ہے کہ روح ایک جسم سے جُدا ہونے کے بعد دوسرے جسم سے اس طرح متعلق ہو کہ دوسرے جسم میں کوئی اور روح نہ ہو اور یہی روح اس جسم کی نشوونما کا سبب ہو اور یہی روح اس جسم میں مدبر اور متصرف ہو۔ اور ارواحِ شہداء میں یہ بات نہیں اس لیے کہ جسم طیوری کے ساتھ شہید کی روح کا تعلق ہوا ہے اس جسم طیوری کی روح علیحدہ ہے۔ اور شہید کی روح علیحدہ ہے اور جسم طیوری کے نشوونما اور تدبیر و تصرف کا کوئی تعلق شہید کی روح سے نہیں۔ اسکا تعلق پرندہ کی اصل روح سے ہے۔ پرندہ کا جسم اور روح علیحدہ ہے اور شہید کی روح علیحدہ اور وہ اس میں سوار ہے اور وہ سبز پرندہ مع اپنے جسم اور اپنی روح کے شہید کی روح کے لیے سواری ہے۔ خوب سمجھ لو۔

فائدہ ③: جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ شہداء کی حیات جسمانی ہے اس لیے کہ موت اور قتل کا تعلق جسم سے ہے اور یہی ظاہر آیت کا مفہوم ہے اس لیے کہ سیاق آیت۔ شہداء کی خصوصیت بیان کرنے کے لیے ہے اور حیات روحانی شہداء کے ساتھ مخصوص نہیں وہ تو عامۂ مسلمین بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ

اور البتہ ہم آزماویں گے تم کو کچھ ایک ڈر سے اور بھوک سے اور نقصان سے مالوں کے اور

الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ

جانوں کے اور میووں کے اور خوشی سنا ثابت رہنے والوں کو کہ جب ان کو پہنچے کچھ

مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ

مصیبت کہیں ہم اللہ کا مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھر جانا ہے ایسے لوگ انہی پر شاباشیں ہیں

مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ قف وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں راہ پر

بیان امتحان صبر و بشارتِ صابرین و جزاء صبر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ... الٰى ... وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾

ربط: گزشتہ آیت میں صبر کے سب سے بڑے امتحان کا ذکر فرمایا۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا اب آئندہ آیت میں صبر کے کم درجہ کے امتحان کا ذکر فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس امتحان کے علاوہ اور بھی کچھ ہم تمہارے صبر کا امتحان لیں گے جو تم پر زائد شاق اور گراں نہ ہوگا اور خدا کی راہ میں جان دینے کی طرح مشکل نہ ہوگا۔ کبھی تمہارا امتحان کسی قدر دشمنوں کے خوف سے لیں گے کہ تم دشمنوں سے خوف زدہ ہو کر پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے اور کبھی فقر و فاقہ کے ذریعے سے اور کبھی مالوں کے نقصان سے مثلاً مال ضائع ہو جائے۔ اور کبھی جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ مثلاً عزیز و اقارب مر جائیں یا مثلاً کھیتی اور باغ کے پھل کسی آفت سے تلف ہو جائیں۔ تو اے مسلمانو! ان مصائب اور آفات میں صبر کرنا اور ذکر کرنا اور شکر سے غافل نہ ہونا۔ اور جو لوگ اس امتحان اور آزمائش میں پورے اُتریں تو اے نبی کریم ﷺ! آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجیے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے بلکہ اپنی اور احباب کی تسلی کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کے مملوک اور غلام ہیں۔ ہماری جان اور ہمارا مال سب اسی کی مِلک ہے جو چاہے لے اور جو چاہے چھوڑے۔ غلام کو آقا کے سامنے مجال دم زدن نہیں وہ ارحم الراحمین ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے وہ اگر کسی وقت بھوکا رکھے تو اس کی حکمت اور مصلحت ہے۔ طبیب مشفق اگر بدہضمی اور فساد معدہ کی وجہ سے ایک دو وقت کھانے کی ممانعت کر دے تو یہ اس طبیب کے مشفق ہونے کی دلیل ہے۔ اور ہم سب اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہم کو یہ بھی مل جائے گا جو ہم سے لیا گیا ہے اور وہم و گمان سے زائد ہم کو اس کا اجر بھی ملے گا۔

فائدہ : حدیث میں ہے کہ یہ کلمہ خاص اسی اُمت کو ملا ہے۔ دوسری اُمتوں کو عنایت نہیں ہوا۔ چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے غم میں ﴿یٰاَسَفٰی﴾ کہا اور ﴿اِنَّا لِلّٰہِ﴾ نہیں کہا۔ ایسے صابرین پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات اور خاص توجہات ہیں۔ جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی عنایات کے ہم رنگ ہیں جو اُن کے پروردگار کے پاس سے اترتی ہیں اور ان پر خدا کی مہربانی بھی ہے۔ کتاب وسنت میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ صابرین کی بشارت میں صلوٰت کا اس لیے استعمال فرمایا کہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کو ان عنایاتِ خاصہ سے سرفراز فرماتے ہیں۔ جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی صلوٰت وعنایات کی ہم رنگ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ مصائب اور حوادث میں صبر وتحمل سے کام لینا اور کوئی کلمہ شکایت زبان سے نہ نکالنا اور خداوند ذوالجلال کی طرف رجوع کرنا انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف:۳۵) **ترجمہ**: ''سو تو ٹھہرا رہ جیسے ٹھہرے رہے ہیں ہمت والے رسول۔''

اس لیے صابرین کو صلوٰت وعنایات خاصہ سے سرفراز فرمایا اور جان ومال کا جو نقصان ہوا اس کے عوض میں عنایات عامہ یعنی طرح طرح کی رحمتوں اور مہربانیوں سے نوازا۔

ہمارے اس بیان سے صلوٰۃ اور رحمت میں فرق واضح ہو گیا۔ صلوٰت سے عنایات خاصہ مراد ہیں جو دینی اور دنیوی اور ظاہری اور باطنی برکات کا موجب ہیں اور رحمت سے عنایات عامہ مراد ہیں۔ جو دُنیا میں فوت شدہ جان ومال کا عوض اور نعم البدل ہیں۔ خوب سمجھ لو، اور ایسے ہی لوگ علاوہ اس کے کہ وہ عنایات خاصہ اور عنایات عامہ کے مورد ہیں۔ ہدایت یافتہ بھی ہیں کہ عین مصیبت کے وقت میں جب کہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی کلمہ شکایت کا زبان سے نکل جائے اور خداوند ذوالجلال کی ناراضگی اور دوری اور مہجوری کا سبب بن جائے ایسے وقت میں قرب خداوندی اور اس کی خوشنودی کا راستہ نکال لیا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کمال ہدایت یہی ہے کہ ہر طرف سے اپنے مطلب کا کھوج لگائے۔

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ﴾ (التغابن:۱۱)

ترجمہ: ''کوئی مصیبت بغیر اللہ کے حکم کے نہیں پہنچتی اور جو بمقتضائے ایمان مصیبت میں ثابت قدم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر ہدایت اور معرفت کی راہ کھول دیتے ہیں۔''

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے ((نعم العِدْلان و نعم العلاوۃ)) یعنی اس آیت میں حق تعالیٰ نے صابرین کے لیے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ ایک صلوٰت اور دوسرے رحمت اور تیسرے ہدایت۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صلوٰت اور رحمت جو ایک دوسرے کے قرین اور عدیل ہیں۔ یہ دونوں کیا اچھے عدیل ہیں اور ہدایت ان عِدلین کے علاوہ ہے یعنی ایک زیادتی ہے جو صلوٰۃ اور رحمت پر زیادہ ہے۔

فائدہ ① : اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصیبت کے وقت تسلی کے دو طریقے ارشاد فرمائے۔ ایک عقلی اور ایک طبعی عقلی تو یہ ہے ﴿اِنَّا لِلّٰہِ﴾ ہم سب اللہ کی ملک ہیں جس کو چاہے دُنیا میں رہنے دے اور جس کو چاہے آخرت میں بلائے۔ عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ مالک کو اختیار ہے کہ اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے۔ لہٰذا کسی عزیز کے مرنے پر شکایت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کی ملک میں دو گھوڑے ہوں ایک کو یہاں باندھ دے اور دوسرے کو دوسری جگہ باندھ دے تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ یا مالک کسی چیز کو اوپر کی منزل

میں رکھ دے اور کسی کو نیچے کی منزل میں رکھ دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو چاہیں دُنیا میں رکھیں اور جس کو چاہیں آخرت میں رکھیں۔

اور طبعی یہ ہے ﴿وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ یعنی ہم سب کو وہیں جانا ہے اور وہی ہمارا وطن اصلی ہے اور یہ دُنیا تو ایک جیل خانہ ہے اب اگر کسی کو جیل خانہ اور چاہ زندان سے نکال کر گلستان اور بوستان میں لے جا کر ٹھیرا دیں تو حقیقت میں خوشی کا مقام ہے کہ بجائے غم کدہ کے عشرت کدہ مل گیا۔ غرض یہ کہ ایک جملہ یعنی ﴿اِنَّا لِلّٰہِ﴾ میں عقل کی تسلی ہے اور دوسرے جملہ ﴿وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ میں طبیعت کی تسلی ہے یہ تو تسلی ہوئی۔ مگر باایں ہمہ شریعت نے حزن وملال اور رونے اور آنسو بہانے کی ممانعت نہیں کی کہ وہ غیر اختیاری امر ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی فضیلت بھی رکھ دی اور یہ فرمایا کہ ((هُوَ رَحْمَةٌ)) یعنی آنسو بہانا بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ سبحان اللہ شریعت کی خوبی کو دیکھئے کہ عقل کی اور طبیعت کی اور جذبات کی سب ہی کی رعایت ہے۔

(ملخص از وعظ الصلوٰۃ، وعظ دوم از سلسلۃ البشریٰ از مواعظ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ)

فائدہ ②: اگر کسی آنے والی مصیبت کی پہلے ہی سے خبر دے دی جائے تو صبر آسان ہو جاتا ہے دفعتاً مصیبت آنے سے آدمی گھبرا جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان مصائب کی پہلے ہی خبر دیدی تاکہ صبر آسان ہو جائے۔

فائدہ ③: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آیت میں خوف سے خوفِ خداوندی مراد ہے اور بھوک سے رمضان کے روزے اور مالوں کی کمی سے زکوٰۃ اور صدقات مراد ہیں اور ﴿اَنْفُسُ﴾ یعنی جانوں کے نقصان سے امراض اور بیماریاں مراد ہیں اور ثمرات کے نقصان سے اولاد کا مرنا مراد ہے۔ کیونکہ اولاد انسان کی زندگی کا پھل ہے۔

جامع ترمذی میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب فرشتے کسی مرد مؤمن کے بچہ کی روح قبض کر کے لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں:

((اقبضتم ولد عبدی فیقولون نعم فیقول اقبضتم ثمرة قلبه فیقولون نعم)).

ترجمہ: "کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کی روح قبض کر لی؟ کیا تم نے میرے بندہ کے ثمرۂ قلب کو لے لیا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں جی ہاں۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بتلاؤ! میرے بندہ نے اس مصیبت پر کیا کہا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کے بندہ نے ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھی اور آپ کی حمد وثناء کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندہ کے لیے جنت میں ایک محل تیار کر دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ
صفا اور مروہ جو ہیں نشان ہیں اللہ کے پھر جو کوئی حج کرے اس گھر کا یا زیارت
فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ
تو گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی شوق سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

قدر دان ہے سب جانتا ہے

استشہاد بر فضیلت صبر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ ... الٰى ... فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾﴾

ربط : گزشتہ آیات میں صابرین کے لیے اپنی معیت اور صلوات اور رحمت اور ہدایت کا ذکر فرمایا۔ اب آئندہ آیات میں اس کی ایک دلیل اور ایک شاہد ذکر فرماتے ہیں۔ یعنی حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے صبر جمیل کی ایک یادگار ذکر فرماتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی اسی صبر کی یادگار ہے جن کو صبر کی برکت سے معیت خاصہ سے سرفراز فرمایا اور اپنی صلوٰت اور رحمتیں ان پر نازل کیں اور اس یادگار صبر کے بیان سے بحث قبلہ اور مناسک حج وعمرہ کی بھی تکمیل ہو جائے گی اور ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ ... الخ﴾ سے بھی سلسلۂ کلام مربوط ہو جائے گا۔ ابتلاء اور امتحان ہی سے سلسلۂ کلام کا آغاز ہوا اور ابتلاء اور امتحان ہی پر اس کا اختتام ہوا۔ نیز ابتداء قصہ میں امامت کا ذکر تھا۔

﴿اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾ ترجمہ: "میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا۔"

اور منصب امامت کے لیے صبر کامل اور ایقان تام ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (السجدہ)

ترجمہ: "اور کیسے ہم نے ان میں سردار جو راہ چلاتے ہمارے حکم سے جب وہ ٹھہرے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔"

اس لیے سلسلۂ کلام کو صبر کے فضائل اور برکات اور اس کے شواہد اور ثمرات پر ختم فرمایا۔

شانِ نزول:

صفا اور مروہ مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے لوگ ان دو پہاڑیوں کے درمیان میں طواف کرتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں کافروں نے ان پر دو بت رکھ دیئے اور ان کی تعظیم کرتے اور ان کا استلام کرتے اور یہ سمجھتے کہ یہ طواف ان دو بتوں کی تعظیم کے لیے ہے۔ جب زمانہ اسلام کا آیا اور مسلمانوں کی سعی بین الصفا والمروہ کا حکم ہوا تو مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف ان بتوں کی تعظیم کے لیے ہے اور بتوں کی تعظیم اسلام میں ممنوع ہے اس لیے صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ تحقیق کوہِ صفا اور کوہِ مروہ اور پہاڑوں کی طرح معمولی پہاڑ تھے مگر حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اسماعیل علیہ السلام کے رضا بالقضاء کی برکت سے خدا کی یادگاروں میں سے ہو گئے۔ اور ان کا طواف مناسک حج سے بنایا گیا سو جو شخص حج بیت اللہ یا عمرہ کا ارادہ کرے اس پر صفا اور مروہ کی سعی اور طواف میں ذرہ برابر گناہ نہیں تم کافروں کی مشابہت سے شبہ میں مت پڑو۔ صفا اور مروہ دراصل شعائرِ الٰہیہ میں سے ہیں اور ان کا طواف سراسر خیر اور عبادت ہے۔ اور جو شخص کوئی خیر اور نیکی شوق اور رغبت سے کرے تو

اللہ تعالیٰ اس کی قدردانی فرماتے ہیں اور اس کی نیت اور اخلاص کو خوب جانتے ہیں۔ اور بقدر اخلاص کے اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔

فائدہ ① : شعائر:۔ شعیرۃ یا شعارۃ کی جمع ہے جس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں شعائر اللہ ان چیزوں کو کہتے ہیں جس سے عام طور پر کفر اور اسلام میں امتیاز پیدا ہو اور ان کو شعائر اسلام بھی کہتے ہیں۔

فائدہ ② : آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی کے حکم سے بت پرستوں کی مشابہت کا خیال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ صفا اور مروہ اصل میں اللہ کی یادگاریں ہیں۔ اور کافروں کی مشابہت امر عارضی ہے وہ اس میں مؤثر نہ ہوگی۔ جب کہ نیت خالص اللہ کی ہو۔ جیسے خانہ کعبہ چند روز غلبۂ کفار کی وجہ سے "بیت الاصنام" یعنی بت خانہ بن گیا لیکن اس کا قبلہ اور مطاف ہونا ساقط نہ ہوا۔ اس لیے کہ جو شے بالذات ہوتی ہے وہ عوارض کی وجہ سے زائل اور ساقط نہیں ہوتی اس لیے مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی میں کوئی تردد اور تامل نہ ہونا چاہیے۔ مشابہت کفار اس وقت موجب حرمت ہوتی ہے کہ جب کسی شے کا شعائر اللہ میں سے ہونا کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جیسے تعظیم نوروز اور ہولی اور دوالی اور دسہرہ اور نصاریٰ کی کرسمس اور جو افعال اللہ کے نزدیک مشروع اور پسندیدہ ہیں ان میں کفار کی مشابہت مؤثر نہیں جیسے حج اور عمرہ اور ختنہ اور عقیقہ اور قربانی اور کسوف کے وقت صدقہ اور غلاموں کا آزاد کرنا۔ مشرکین عرب میں رائج تھا۔

فائدہ ③ : سعی بین الصفا والمروۃ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فرض ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مستحب ہے جیسا کہ ﴿فَلَا جُنَاحَ﴾ کے لفظ سے بظاہر یہی معلوم ہوا ہے کہ یہ عمل ضروری اور واجب نہیں۔ بخاری اور مسلم میں ہے کہ عروۃ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ ترجمہ: "کوئی گناہ نہیں کہ صفا اور مروہ کا طواف کرے۔"

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اے میرے بھانجے آیت کا یہ مطلب نہیں جو تُو نے سمجھا۔ اگر آیت کا وہ مطلب ہوتا جو تو نے بیان کیا تو عبارت قرآنی اس طرح ہوتی ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یعنی اس شخص پر کوئی گناہ نہیں جو صفا اور مروہ کا طواف نہ کرے۔ اور یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جن کا قصہ یہ ہے کہ انصار قبل اسلام منات کی عبادت کرتے تھے اور جب مسلمان ہوئے اور سعی بین الصفا والمروہ کا حکم ہوا تو کفار کی مشابہت کی وجہ سے دل تنگ ہوئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری و مسلم)

چونکہ انصار پر کفار کی مشابہت کی وجہ سے بین الصفا والمروہ کا کرنا گراں گزر رہا تھا اس لیے اس گرانی کے رفع کرنے کے لیے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ﴾ فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں جس سے ترک کی اجازت دینا مقصود نہیں ورنہ اگر ترک سعی کی اجازت دینا مقصود ہوتی تو ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ﴾ فرماتے۔ یعنی کوئی حرج نہیں کہ سعی بین الصفا والمروہ نہ کرے۔ غرض یہ کہ آیت میں ﴿لَا جُنَاحَ﴾ کا لفظ طواف بین الصفا والمروہ کرنے کے متعلق آیا ہے۔ یعنی کرنے کی اجازت ہے ترک طواف اور ترک سعی کے مطابق ﴿لَا جُنَاحَ﴾ نہیں فرمایا کہ جس سے ترک سعی کی اجازت مفہوم ہوتی۔ علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ﴿لَا جُنَاحَ﴾ کا لفظ محض اباحت پر دلالت کرتا ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ لفظ محض طواف بین الصفا والمروہ کی اباحت اور جواز پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اساف اور نائلہ یعنی بتوں کے ہوتے ہوئے بھی صفا والمروہ کا طواف جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ مسئلہ

دریافت کرے کہ جس کپڑے پر قدر درہم سے کم نجاست لگی ہوئی تو اس کپڑے میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو یہ جواب دیا جائے گا ((لا جناح علیك ان تصلی فیه)) یعنی ایسے کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج اور گناہ نہیں۔ تو اس عبارت سے نفس نماز کی اباحت اور اجازت نہیں سمجھی جاتی بلکہ قلیل نجاست کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت مفہوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اصل سعی واجب ہے اور بحالتِ موجودہ جس کی وجہ سے انصار کو گرانی تھی وہ جائز اور مباح ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا

جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارا صاف حکم اور راہ کے نشان بعد اس کے کہ

بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ

ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں ان کو لعنت دیتا ہے اللہ اور لعنت دیتے ہیں

اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓىِٕكَ اَتُوْبُ

سب لعنت دینے والے مگر جنہوں نے توبہ کی اور سنوارا اور بیان کر دیا تو ان کو معاف

عَلَیْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ

کرتا ہوں اور میں ہوں معاف کرنیوالا مہربان جو لوگ منکر ہوئے اور مر گئے

كُفَّارٌ اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۶۱﴾

منکر ہی انہیں پر ہے لعنت اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

رہ پڑے اس میں نہ ہلکا ہو گا ان پر عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے گی۔

رجوع بخطابِ یہود و وعید بر کتمانِ حق و جحود

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ ... اِلٰی ... وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں یہ ذکر فرمایا تھا کہ یہود حق کو جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ مگر باوجود جاننے اور پہچاننے کے حق کو چھپاتے ہیں۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾﴾ اب اس آیت میں اُس کتمان حق پر وعید ذکر فرماتے ہیں اور توبہ کرنے والوں کے لیے عفو اور رحمت کا ذکر

فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ تحقیق جولوگ خوب جانتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی شعائر اللہ میں سے ہے اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے وقت سے برابر چلی آ رہی ہے مگر باوجود اس کے یہ لوگ ان مضامین کو چھپاتے ہیں جن کو ہم نے نازل کیا اور جو اپنی ذات سے واضح اور روشن ہیں اور شعائر اللہ کی ہدایت اور راہنمائی کرتے ہیں بعد اس کے کہ ہم نے اس کو تمام لوگوں کے لیے عام اور خاص سب کے لیے شعائر اسلام اور کفر کے فرق کو خوب واضح کر دیا ہے اور خبر واحد کی طرح نہیں بنایا کسی کو پہنچے اور کسی کو نہ پہنچے اس کتابِ الٰہی میں داخل کر دیا ہے تا کہ متواتر ہو جائے اور اس کا اخفاء اور پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جائے۔ لیکن یہ لوگ کمال عداوت کی وجہ سے اس کے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت اور رفع جہالت چاہتا ہے اور یہ لوگ گمراہی اور جہالت کا بقاء چاہتے ہیں اور نیز لعنت کرتے ہیں ان پر سب لعنت کرنے والے۔ ملائکہ اور ارواحِ انبیاء و صلحاء تو اس لیے لعنت کرتے ہیں کہ اُن کی کوشش تو یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو بیان کیا جائے اور اُن کی خوب نشر و اشاعت کی جائے اور یہ لوگ ان حضرات کی کوشش کو ضائع کرنا چاہتے ہیں اور عوام اور فساق و فجار اور کفار ناہنجار اس لیے لعنت کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے ان کو حق معلوم نہ ہونے دیا اور چونکہ کتمانِ حق کی وجہ سے طرح طرح کی بلائیں اور مصیبتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں اس لیے تمام حیوانات اور جمادات ان پر لعنت بھیجتے ہیں کہ ان کی وجہ سے مصیبت اور بلا میں گرفتار ہوئے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قحط پڑتا ہے اور بارش بند ہو جاتی ہے تو جانور گناہ کرنے والوں پر لعنت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کم بختوں کی وجہ سے نحوست آئی مگر جن لوگوں نے محض اللہ کی ناراضی کے ڈر سے حق پوشی سے توبہ کر لی۔ اور حق پوشی کی وجہ سے جو خرابی آئی تھی اس کی اصلاح کر لی یعنی جو عقائد اور اعمال اور حقوق اور اموال لوگوں کے حق پوشی کی وجہ سے خراب اور برباد ہوئے تھے ان کی اصلاح کر دی اور گزشتہ غلطیوں کا تدارک کر دیا اور جس حق کو چھپایا تھا اس کو لوگوں کے سامنے بیان کر دیا۔ تو ایسے لوگوں کو میں معاف کر دیتا ہوں اور بجائے لعنت کے ان پر رحمت نازل کرتا ہوں اور میں تو بڑا ہی توبہ کا قبول کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہوں کہ توبہ کرنے سے لعنت کو رحمت سے اور سزا کو انعام سے بدل دیتا ہوں۔ تحقیق جو لوگ حق پوشی کی وجہ سے کفر کی حد تک پہنچ گئے اور بدون توبہ کے کفر کی حالت میں مر گئے ایسے لوگوں پر اللہ کی اور تمام فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی مستمر لعنت ہے۔ حتیٰ کہ خود اس کی بھی اس پر لعنت ہے اس لیے کہ یہ کافر خود یہ کہتا ہے کہ جو دیدہ دانستہ حق کو چھپائے اس پر اللہ کی لعنت اور یہ نہیں سمجھتا کہ میں بھی خود اس عموم میں داخل ہوں۔ اور یہ لوگ ہمیشہ اس لعنت میں رہیں گے۔ یہ لعنت کبھی ان سے منقطع نہ ہوگی کیونکہ بغیر توبہ کے مرے ہیں۔ ذرا برابر ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی بلکہ دم بدم زیادتی ہوتی رہے گی۔ دُنیا میں دن بدن ان کا کفر اور تمرد بڑھتا تھا، آخرت میں عذاب بڑھتا رہے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی کہ کچھ دیر آرام کر لیں اور آئندہ کے لیے عذاب سہنے کی کچھ قوت آ جائے اس لیے کہ عذاب میں تخفیف اور مہلت یہ بھی ایک قسم کا لعنت سے نکالنا ہے جو ان کے حق میں ناممکن اور محال ہے۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع ۱۹/۱۶ ۳

اور تمہارا ربّ اکیلا ربّ ہے کسی کو پوجنا نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے رحم والا

اعلانِ توحید

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع﴾

ربط: گزشتہ آیات میں اللہ کے احکام چھپانے والوں پر لعنت اور عذاب کا ذکر فرمایا۔ آئندہ آیت میں حق تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کا ذکر فرماتے ہیں کہ وہی ایک معبود ہے اس کے سوا کہیں پناہ نہیں جو اس کی لعنت سے تم کو چھڑا سکے اور اس کے سوا کوئی رحمان اور رحیم نہیں جو خدا کی لعنت اور نقمت کو رحمت اور عنایت سے بدل دے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ رحمت عامہ اور خاصہ سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس لیے بدون اس کی رحمت کے لعنت سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں اگر خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ تم کو اس کی لعنت سے نکال لیتا اور تم پر رحمت کرتا لیکن اس کے سوا کوئی خدا نہیں جو رحمت عامہ اور خاصہ کا مالک ہو اور عجب نہیں کہ اس خطاب میں اہل کتاب کو تہدید اور عتاب ہو کر باوجودیکہ توریت اور انجیل میں اللہ کی توحید کی صریح آیتیں مذکور ہیں اور پھر بھی تم حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو خدا کا بیٹا بتلاتے ہو اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو اور اس توحید کو جو تم کو معلوم ہے چھپاتے ہو۔ غرض یہ کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو چھپانے کی وجہ سے بھی مستحق لعنت ہوئے اور توحیدِ خداوندی کے اخفاء اور کتمان کی وجہ سے بھی موردِ لعنت بنے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ

آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور دن کا بدلتے آنا اور کشتی

الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ

جو لے کر چلتی ہے دریا میں جو چیزیں کام آویں لوگوں کو اور وہ جو اللہ نے

السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ

اتارا آسمان سے پانی پھر جلایا اس سے زمین کو مر گئے پیچھے اور بکھیرے اس میں سب

كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ

قسم کے جانور اور پھیرنا ہواؤں کا اور ابر جو حکم کا تابع ہے درمیان آسمان

وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور زمین کے ان میں نمونے ہیں عقلمند لوگوں کو

دلائل توحید

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ... الٰى... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾

ربط: جب آیت ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ نازل ہوئی تو مشرکین نے تعجب سے کہا کہ کیا سارے جہان کا ایک ہی خدا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس پر کیا دلیل ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں جن میں توحید کے دلائل بیان فرمائے کہ علویات اور سفلیات اور متوسطات اور ان کے احوال وصفات سب دعوائے وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق ① آسمانوں اور ② زمین کی پیدائش میں ③ اور دن ورات کی آمدورفت اور اُن کے مختلف ہونے میں ④ اور اُن جہازوں اور کشتیوں میں کہ جو دریا میں لوگوں کی منافع کی چیزوں کو لے کر چلتی ہیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو آدمی اور سامان پہنچاتی ہیں جہاں آدمیوں اور جانوروں کا پہنچنا ممکن نہیں ⑤ اور اس پانی میں کہ جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل کیا اور پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا یعنی خشکی اور قحط سالی کے بعد قسم قسم کے پھول اور پھل اس میں اُگائے ⑥ اور ہر قسم کے جانور اس میں پھیلائے ⑦ اور ہواؤں کے پھیرنے میں کبھی مشرق کا چکر لگاتی ہیں اور کبھی مغرب کا اور کبھی شمال کا اور کبھی جنوب کا ⑧ اور اس اَبر میں کہ جو آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہے، حالانکہ ہزار من پانی سے بھرا ہوا ہے باوجود اس عظیم ثقل کے زمین پر گر نہیں جاتا۔ ان تمام اُمور میں اللہ تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کے عجیب وغریب دلائل اور براہین ہیں ان لوگوں کے لیے جو اپنی عقل کو نظر اور فکر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال حکمت اور اس کی وحدانیت اور رحمت پر مختلف طرح سے دلالت کرتی ہیں۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

① آسمانوں میں غور کیجئے کہ تمام آسمان حقیقت اور طبیعت جِرمیَّہ کے اعتبار سے ایک ہیں مگر کوئی چھوٹا ہے اور کوئی بڑا۔ اور پھر کواکب اور نجوم، ثوابت اور سیارات، شمس اور قمر اور زہرہ اور مریخ اور مشتری میں غور کیجیے۔ ہر ایک کی شان جدا ہر ایک کا رنگ جدا، ہر ایک کی حرکت جدا اور حرکت کی سمت اور جہت جُدا ہر ایک کا بُرج جدا۔ ہر ایک کا طلوع اور غروب جُدا۔ اس عجیب نظام کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کارخانہ خود بخود تو نہیں چل رہا ہے بلکہ کسی علیم وقدیر اور مدبر حکیم کے ہاتھ میں اس کی باگ ہے کہ وہ محض اپنے ارادہ اور مشیت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں۔ اور افلاک اور شمس وقمر کی حرکات سے منافع عالم کا مربوط ہونا یہ اس کی کمال رحمت کی دلیل ہے۔

② اور علی ہذا زمین کی پیدائش بھی اس کی وحدانیت اور رحمت کی دلیل ہے۔ زمین کے قطعات کا مختلف اللون اور مختلف الخاصیت ہونا کہ کسی زمین سے گھانس پیدا اور کسی سے انناس۔ اور کسی سے بادام پیدا ہوا اور کسی سے آم۔ کسی زمین کے بسنے والے عاقل اور کسی جگہ کے بسنے والے ایسے کودن اور نادان کہ بعض چیزوں میں حیوان بھی ان سے بہتر نکلے یہ اختلافات کہاں سے آئے اور کس طرح آئے۔ زمین کا مادہ اور طبیعت تو ایک ہی ہے وہ کون ذات ہے کہ جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کو شور اور بنجر بنایا اور دوسرے کو سبزہ زار اور

مرغزار بنایا یہ سب اسی علیم وقدیر کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ جس کی قدرت اور حکمت کے سمجھنے سے تمام عالم قاصر اور عاجز ہے یہ دلیل تو وحدانیت کی ہوئی اور زمین رحمتِ خداوندی کی دلیل اس طرح سے ہے کہ تمام عالم کے بسنے والے اسی زمین پر چل کر اپنی حاجتیں پوری کرتے ہیں اسی سے پیدا شدہ غذاؤں اور پھلوں اور چشموں اور نہروں سے نفع اٹھاتے ہیں اور تمام سونا اور چاندی وغیرہ وغیرہ سب اسی زمین میں اللہ کی قدرت سے پیدا ہوتا ہے۔ کانوں کا مختلف ہونا اس کی وحدانیت کی دلیل ہے اور ان کا نافع اور مفید ہونا اس کی رحمت کی دلیل ہے۔ آسمان اور زمین علیحدہ علیحدہ بھی رحمت ہیں اور دونوں مل کر بھی رحمت ہیں اس لیے آسمان اور زمین کے اختلاط اور تقابل سے جو منافع اور فوائد پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔

③ اور اسی طرح لیل ونہار کا مختلف ہونا کہ کبھی دن ہے کبھی رات۔ کبھی دن بڑا اور رات چھوٹی اور کبھی اس کا برعکس، کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے یا کسی قادر مطلق کے ہاتھ میں اس کی ڈور ہے۔ اگر دن نہ ہوتا اور فقط رات ہوتی تو تمام عالم مستمر اور دائم ظلمت اور تاریکی کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا اور چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا۔ اور اگر رات نہ ہوتی فقط دن ہی دن ہوتا تو تمام عالم گرمی سے بلبلا اٹھتا اور کھیتیاں جل کر خاک ہو جاتیں اور اس راحت اور آرام سے کہ جو رات کی نیند سے اسے حاصل ہوتا ہے تمام جہان یک لخت محروم ہو جاتا معلوم ہوا کہ لیل ونہار کا اختلاف جس طرح اس کی وحدانیت کی دلیل ہے اسی طرح اس کی رحمانیت کی بھی دلیل ہے۔

④ اور علیٰ ہذا جہاز اور کشتی بھی اس کی قدرت اور رحمت کی دلیل ہے۔ ایک تولہ لوہا یا تانبا ایک منٹ کے لیے پانی پر نہیں ٹھہرتا مگر جہاز اور کشتی کہ جس میں ہزارہا من لوہا اور تانبا لدا ہوا ہوتا ہے ایک ملک سے دوسرے ملک تک ہزارہا میل طے کر کے صحیح وسالم پہنچتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہے۔

⑤ ⑥ اور علیٰ ہذا آسمان سے بارانِ رحمت کا نازل ہونا اور زمین کا اس سے سرسبز اور شاداب ہو جانا اور قسم قسم کے اشجار اور نباتات اور فواکہ اور ثمرات کا اس سے پیدا ہونا اور علیٰ ہذا اس سے حیوانات کا ایسا مختلف اللون پیدا ہونا کہ ایک کی شکل اور صورت دوسرے کی شکل اور صورت سے نہ ملے یہ بھی اس کی وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہے اس لیے کہ یہ اختلاف بے شمار فوائد اور منافع پر مشتمل ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت سے حیوانات دو قسم کے بنائے ایک تو وہ جو بطریق توالد اور تناسل پیدا ہوتے ہیں جیسے انسان اور اُونٹ اور بیل اور بکری۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو بطریق تولید پیدا ہوتے ہیں جیسے ہزارہا حشرات الارض مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور ہزارہا مچھر اور جھینگر برسات کے پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی صورت اور شکل الگ اور ہر ایک کا رنگ الگ جس سے باہمی فرق اور امتیاز کا نفع اور فائدہ ہوتا ہے اور یہ حق تعالیٰ کی عظیم رحمت اور مہربانی ہے ورنہ اگر سب ایک رنگ اور ایک شکل کے ہوتے تو پہچاننا ممکن نہ تھا۔ اگر آدمی اور حیوانات باہم ممتاز نہ ہوتے تو کارخانۂ معاش معطل اور درہم برہم ہو جاتا ایک انسان کے چہرہ میں غور کرو کہ آنکھ بھی ہے اور کان بھی اور ناک بھی ہے اور زبان بھی، سر بھی ہے اور دماغ بھی۔ ایک عجیب وغریب تصویر ہے قویٰ عقلیہ اور حسیہ کا مجموعہ ہے اور خداوند ذوالجلال کی قدرت اور کمال کا بے مثال آئینہ ہے اور آنکھ، کان اور زبان کے جو بے شمار فوائد اور منافع ہیں وہ اُس رحمٰن ورحیم کی رحمت کاملہ کے دلائل اور براہین ہیں۔

حکایت : کسی نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ شطرنج بھی عجیب کھیل ہے کہ باوجود مختصر سا طول وعرض ہونے کے ہزار مرتبہ بھی کھیلا جائے تو ایک بازی دوسری بازی کے موافق نہ پڑے گی۔ تو جواب میں فرمایا کہ انسان کا چہرہ اس سے بھی عجیب ہے کہ باوجود

آنکھ اور ابرو اور کان اور زبان وغیرہ وغیرہ کبھی اپنی معین جگہ سے سرِمُو تجاوز نہیں کرتے مگر باایں ہمہ ہر فرد بشر ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہے۔ خداوند ذوالجلال کی اس تقدیر اور تدبیر بے نظیر سے کارخانۂ عالم چل رہا ہے ورنہ اگر سب ہم شکل ہوتے تو باپ بیٹے کو بھائی بھائی کو نہ پہچانتا۔ (تفسیر کبیر)

⑦ اور علیٰ ہذا ہواؤں کا بدلنا اور گرمی سے سردی کی طرف اور سردی سے گرمی کی طرف ان کا پھیرنا اور کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی شمال سے جنوب کی طرف اُن کا چلانا یہ سب اس کی قدرت اور وحدانیت کی دلیل ہے۔ اور ہوا کا وجود عالم کے لیے عجیب رحمت ہے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ اگر تین دن تک ہوا بند رہے تو سارا علم متعفن اور بدبودار ہو جائے۔

⑧ اور علیٰ ہذا بادل کا آسمان اور زمین کے درمیان معلق رکھنا، یہ بھی اس کے کمالِ قدرت کی دلیل ہے کہ باوجودیکہ بادل ہزار ہا ٹن پانی سے بھرا ہوا ہے مگر نیچے نہیں گرتا۔ بادل سر سے گزر رہا ہے مگر کسی کی مجال نہیں کہ اس میں سے ایک گلاس پانی ہی نکال لے، جہاں حکم ہوگا وہیں جا کر برسے گا۔ یہ آٹھ دلیلیں ہیں جو حق تعالیٰ کی وحدانیت اور رحمانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ
اور بعضے لوگ وہ ہیں جو پکڑتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت رکھتے ہیں جیسے محبت
اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ
اللہ کی اور ایمان والوں کو اس سے زیادہ محبت ہے اللہ کی اور کبھی دیکھیں بے انصاف اس وقت کو جب
يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾
دیکھیں گے عذاب کہ زور سارا اللہ کو ہے اور اللہ کی مار سخت ہے۔

استعجاب واستبعاد بر اتخاذ انداد بعد واضح شدن وحدانیت رب عباد

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ... الیٰ... وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں اہلِ عقل اور اہل نظر کا بیان تھا۔ اب اس آیت میں بدعقلوں کا بیان ہے کہ جب اللہ کی وحدانیت اور اس کی رحمانیت کے دلائل اظہر من الشمس ہیں تو عقل کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کو عبادت اور محبت کے ساتھ مخصوص کرتے۔ اور لیکن بعضے آدمی ظاہراً انسانی عقل وشعور رکھتے ہیں اللہ کی نعمت کو خوب پہچانتے ہیں مگر حدِ آدمیت اور دائرہ انسانیت سے باہر ہیں کہ اللہ کے سوا جو کہ منعم حقیقی ہے ایسے ہم سر اور شریک بناتے ہیں جو خداوند ذوالجلال سے اس درجہ فروتر اور کمتر ہیں کہ خدا سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ دلائل اور براہین سے تو یہ ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک بھی شریک اور ہمسر نہیں ہوسکتا اور یہ لوگ اس درجہ بے عقل ہیں کہ ایک شریک اور ایک ہم سر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خدا کے لیے بہت سے شرکاء اور ہم سر بناتے ہیں، اور خدا کے مثل اور برابر ان کو محبوب رکھتے ہیں، اور خدا کی طرح ان کی

تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں، اور خدا کے حکم کی طرح ان کے حکموں کو بے چون و چرا واجب الاطاعت سمجھتے ہیں، اور ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کی محبت اور اطاعت میں فرق ہونا چاہیے۔ اس لیے اہل ایمان اگرچہ بعض چیزوں کو شرعاً و طبعاً محبوب رکھتے ہیں مگر اس درجہ محبوب نہیں رکھتے کہ ان کو خدا کے برابر کر دیں بلکہ وہ اللہ کی محبت میں بہت سخت اور محکم ہیں اس لیے کہ دُنیا میں جو بھی فضل و کمال یا جُود و نوال ہے اسکا منبع اور سرچشمہ خداوند ذوالجلال ہے اور مخلوق اس کا عکس اور پرتو ہے۔ اس لیے اہل ایمان خالق کو بالذات محبوب اور مخلوق کو بالعرض محبوب رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ محبت، محبوب کی عزت اور کمال کے مطابق ہوتی ہے اور عزت اور کمال اور جود و نوال میں خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں وہی منعم حقیقی ہے۔ اس لیے راحت اور شدت، بیماری اور تندرستی، شادی اور غمی کسی حال میں بھی اہلِ ایمان کی محبت اللہ سے کم نہیں ہوتی۔ بخلاف مشرکین کے جب اپنے معبودوں سے نا اُمید ہو جاتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ﴾ (عنکبوت:۶۵)

اور اگر یہ ظالم کہ جنہوں نے خُدا کا شریک اور ہمسر بنا کر اپنی جانوں پر ظلم و ستم کیا اس آنے والے [1] وقت کو دیکھ لیں کہ جس وقت ان کو عذابِ الٰہی کا مشاہدہ ہوگا تو [2] ان کو خوب معلوم ہو جائے کہ سارا زور اللہ ہی کے لیے ہے اور تمام کائنات ضعیف اور عاجز ہے اور سب اللہ کے قہر اور غلبہ کے نیچے دبے ہوئے ہیں سوائے اس کے کوئی بھی نفع اور ضرر کا مالک نہیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ کوئی بت اور کوئی معبود کسی کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتا۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ
جب الگ ہو جاویں جن کے ساتھ ہوئے تھے اپنے ساتھ والوں سے اور دیکھیں عذاب اور ٹوٹ
بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ
جاویں ان کے سب طرف کے علاقے اور کہیں گے ساتھ پکڑنے والے کاش کہ ہم کو دوسری بار زندگی ہو تو ہم الگ ہو جاویں
مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ
ان سے جیسے یہ الگ ہو گئے ہم سے اسی طرح دکھاتا ہے اللہ ان کو کام ان کے افسوس

---

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ آیت ﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ میں عذاب سے عذاب اُخروی مراد ہے اور ﴿اِذْ﴾ معنی میں ﴿اِذَا﴾ کے ہے اس لیے کہ ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ ... الخ... اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ سے بدل ہے اور ظاہر ہے یہ آخرت میں ہوگی اور بدل اور مبدل منہ متحد ہوتے ہیں۔ لہٰذا ﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ سے بھی عذاب اُخروی ہی مراد ہوگا۔ اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ عذاب سے دنیوی عذاب اور دنیوی مصائب اور تکالیف مراد ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت یہ لوگ دُنیاوی مصائب اور فقر و فاقہ اور دُکھ اور بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس وقت غور و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ امر خوب واضح ہو جائے کہ سارا زور اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ سب عاجز اور درماندہ ہیں اس لیے کہ یہ بت مصیبت اور بلا کو ٹال نہیں سکتے اور جب یہ امر ان پر واضح ہو جائے تو پھر کسی کو خدا کے برابر محبوب نہ رکھیں۔ ۱۲ منہ

[2] اشارۃ الی تقدیر الجزاء: ﴿وَهُوَ يَعْلَمُوْا اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ .... الخ﴾ ۱۲

ع ۲۰ ۲۴

عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

دلانے کو اور ان کو نکلنا نہیں آگ سے

انجام شرک

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا ... الٰى ... وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾﴾

اور اس شدید * عذاب کا وقت۔ وہ وقت ہوگا کہ جب پیشوا اپنے پیروؤں سے الگ اور بیزار ہو جائیں گے اور تابع اور متبوع، گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں فریق عذاب خداوندی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں گے۔ اور دُنیا میں جو باہمی تعلقات تھے وہ اس روز سب منقطع ہو جائیں گے نہ کوئی تابع رہے گا اور نہ کوئی متبوع ہر ایک جرم میں شریک ہوگا۔ سب پر فرد جرم لگ چکی ہوگی۔ ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی لیکن اس وقت یہ تبری اور بیزاری ذرہ برابر مفید نہ ہوگی۔ سب کفِ افسوس ملیں گے۔ اور جن لوگوں نے دوسروں کی پیروی کی تھی اور دوسروں کے بہکانے سے کفر اور شرک کیا تھا وہ اس وقت جھنجھلا کر یہ کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک دفعہ دُنیا میں لوٹنے کا موقع ملے تو ہم بھی ان سے اپنا بدلہ لیں اور ہم بھی ان سے اسی طرح بیزار ہوں جس طرح یہ لوگ ہم سے بیزار ہوئے۔ مگر اس بیزاری سے ان کو سوائے حسرت کے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور قیامت کے دن فقط یہی ایک حسرت نہ ہوگی بلکہ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کو ان پر حسرتیں بنا کر دکھلائے گا۔ قیامت کے دن ان کے تمام صدقات اور قربات ایک ایک کر کے ضائع اور رائیگاں ہوں گے اور حسرتوں کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اور یہ لوگ تو کبھی دوزخ سے نکلیں گے ہی نہیں کیونکہ شرک کی سزا دائمی عذاب ہے۔ البتہ گنہگار مسلمان انبیاء اور صلحاء کی شفاعت سے بعد چندے جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔

فائدہ: چونکہ مسند الیہ کی تقدیم مفید حصر ہوتی ہے اس لیے آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ عدمِ خروج من النار۔ کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ معلوم ہوا کہ کفار کے علاوہ کوئی فریق ایسا بھی ہے جو کہ بعد چندے دوزخ سے نکالا جائے گا وہ گناہ گار مسلمانوں کا فریق ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو حلال ہے اور نہ چلو قدموں پر

الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ

شیطان کے وہ تمہارا دشمن ہے صریح۔ وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو بُرے کام اور

---

* اشارۃ الی ان ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا﴾ دل من ﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ ۱۲

الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ

بے حیائی اور یہ کہ جھوٹ بولو اللہ پر جو تم کو معلوم نہیں اور جو ان کو کہے

اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ

چلو اس پر جو نازل کیا اللہ نے کہیں نہیں ہم چلیں گے اس پر جس پر دیکھا اپنے باپ دادا کو بھلا

لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ

اگرچہ اُن کے باپ دادا نہ عقل رکھتے ہوں کچھ نہ راہ کی خبر اور مثال ان

كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ

منکروں کی جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلاتا ہے ایک چیز کو جو سنتی نہیں مگر پکارنا اور چلانا بہرے

بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

گونگے اندھے ہیں سو اُن کو عقل نہیں۔

خطابِ عام وتذکیر انعام وابطال رسوم شرکیہ وتفصیل حلال وحرام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۫ ... الٰى ... فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں عقیدۂ شرک کی قباحت اور مشرکین کی تقبیح وتجہیل فرمائی۔ اب آئندہ آیات میں رسوم شرکیہ اور اعمال کفریہ کا ابطال اور حلال وحرام کی تفصیل فرماتے ہیں۔

ربط دیگر: گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کا معبود برحق اور رحمٰن ورحیم ہونا بیان فرمایا۔ ان آیات میں حق تعالیٰ کا رازق ہونا بیان فرماتے ہیں کہ وہی رازق ہے اور وہی تمام اَرزاق کا خالق ہے جس چیز کو وہ حلال کرے وہ حلال ہے اور جس چیز کے استعمال کو منع فرمائے وہ حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے لوگو، جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں کا انجام سوائے حسرت کے کچھ نہیں تو اپنے پیشواؤں کی رائے پر مت چلو اور ان کے کہنے سے کسی چیز کو اپنے اوپر حلال اور حرام نہ کرو۔ کیونکہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کی ہمسری ہے حلال وحرام ہونا محض اللہ کے حکم کے تابع ہے اس لیے کہ سب چیزیں اللہ ہی کی مِلک ہیں کسی کو اللہ کی مِلک میں تصرف کا حق حاصل نہیں کہ حلت وحرمت کا حکم لگائے۔ لہٰذا تم اس فعل قبیح سے توبہ کرو اور کھاؤ اس چیز سے جو اللہ کی زمین میں پیدا ہوئی بشرطیکہ وہ حلال بھی ہو اور پاکیزہ بھی ہو۔ اور حلال وہ ہے کہ جس کی شریعت نے ممانعت نہ کی ہو اور طیب وہ ہے جو بالکل پاک اور صاف ہو کسی غیر کا حق اس سے متعلق نہ ہو۔ مثلاً غصب اور خیانت اور رشوت اور سُود یا کسی اور ناجائز طریقہ سے اس کو حاصل نہ کیا گیا ہو۔ اس لیے کہ جو چیز

فی حد ذاتہٖ حلال ہو مگر دوسرے کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو تو اس کا کھانا بھی جائز نہیں جیسے کوئی شے اصل میں تو پاک ہو اور بعد میں نجاست آلود ہو جائے تو اس کا کھانا جائز نہیں رہتا۔ اور حلت اور حرمت میں اللہ کے حکم کا اتباع کرو اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے شیطانی وسوسوں کی بنا پر اس کے کھانے سے پرہیز نہ کرو۔ تحقیق وہ شیطان تمہارا قدیمی اور کھلا دشمن ہے۔ اس کے کہنے میں نہ آنا دشمنی میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتلاتا ہے۔ جزایں نیست کہ وہ تم کو برائی کا حکم دیتا ہے تا کہ عذاب آخرت کے مستحق ہو جاؤ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے تا کہ مخلوق کی نظر میں بھی حقیر ہو جاؤ۔

فائدہ ①: سوء کا تعلق افعال سے ہے اور فحشاء کا تعلق اخلاق سے ہے۔ اور نیز شیطان تم کو اس بات کا بھی حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کا تم کو علم نہیں۔ ایسے عقائد اور اعمال کی تم کو تلقین کرتا ہے جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

فائدہ ②: بدعت کی بھی یہی حقیقت ہے کہ جس کام کو اللہ نے موجب ثواب قرار نہیں دیا اُس کام کو بلا دلیل شرعی موجب ثواب قرار دے۔

فائدہ ③: شیطان کبھی نیک کام کا بھی حکم کرتا ہے جیسا کہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان ان کو تہجد اور صبح کی نماز کے لیے جگانے آیا سو وہ اس آیت کے معارض نہیں اس لیے کہ شیطان اگرچہ ظاہر میں نیکی کا حکم کرتا ہے لیکن مقصود اس کا بدی ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر گناہ نہیں کرتا تو کم از کم اس کو چھوٹی طاعت میں لگا دیا جاوے تا کہ بڑی عبادت کر کے اجر عظیم نہ حاصل کر سکے۔

ع ہر چہ گیرد علتی علت شود

اور یہ لوگ دامِ شیطانی میں اس درجہ گرفتار ہیں کہ آبائی رسوم کو حکمِ خداوندی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں حتیٰ کہ جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ حکم کا اتباع کرو اور اپنے باپ دادا کے طریقہ کو چھوڑ دو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم نہیں جانتے بلکہ ہم اس رسم کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔ دنیاوی اُمور میں اگرچہ بڑے عاقل اور ہوشیار ہیں لیکن دین اور آخرت کی عقل سے کورے ہیں۔ شجر اور حجر کو خُدا بنائے ہوئے ہیں۔ دانایانِ فرنگ کو دیکھ لو جن کی عقل کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے وہ تین میں ایک اور ایک میں تین کے قائل ہیں۔

فائدہ ④: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے روحانی یا جسمانی آباء و اجداد عقل بھی رکھتے ہوں اور ہدایت یافتہ بھی ہوں اور ﴿مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کے اشارات اور کنایات کو خوب سمجھتے ہوں تو ایسے آباء و اجداد کا اتباع اور تقلید عین عقل اور عین ہدایت بلکہ عین ﴿مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کا اتباع ہے۔ حکمِ خداوندی کے خلاف کسی کا اتباع بلاشبہ گمراہی ہے لیکن حکم خداوندی کے سمجھنے کے لیے اگر کم عقل والا اپنے سے زیادہ عقل والے کا اتباع کرے تو عین ہدایت اور مقتضی عقل ہے۔ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں: کہ یہ لوگ فقط بے عقل ہی نہیں بلکہ فی الحقیقت حدودِ انسانیت سے خارج ہیں جانوروں کی طرح ہیں اشیاء کے حسن و قبح اور نفع اور ضرر کو نہیں سمجھتے۔ البتہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ کون سا گھانس اچھا ہے اور کون سا گھانس کڑوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ داعیٔ حق کے اعتبار سے ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بھیڑ بکریوں اور جانوروں کو چلا چلا کر پکار رہا ہو اور وہ جانور سوائے بلانے اور پکارنے کے کچھ نہ سنتا ہو۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے کہ واعظ اور ناصح کی آواز تو سنتے ہیں مگر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ اگرچہ ظاہر میں سنتے ہیں مگر حقیقت میں بہرے ہیں کلمۂ حق سُن

نہیں سکتے باطل کے حق میں بڑے مقرر ہیں لیکن حق کے حق میں گونگے ہیں۔ حق بات زبان سے نہیں نکل سکتی۔ سب کچھ دیکھتے ہیں مگر دل کے اندھے ہیں حق اور باطل کا فرق نظر نہیں آتا۔ پس اس لیے کہ ان کے تمام حواس جو عقل کے مبادی اور مقدمات ہیں وہ سب مختل بلکہ گم ہیں۔ اس لیے یہ لوگ حق اور ہدایت کو کچھ نہیں سمجھتے۔ پس یہ لوگ جانوروں کی طرح عقلِ معاش رکھتے ہیں آخرت کی عقل سے عاری اور کورے ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ

اے ایمان والو! کھاؤ ستھری چیزیں جو تم کو روزی دی ہم نے اور شکر کرو اللہ کا اگر

كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَ

تم اسی کے بندے ہو یہی حرام کیا ہے تم پر مردہ اور لہو اور

لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ

گوشت سور کا اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کا پھر جو کوئی پھنسا ہو نہ بے حکمت کرتا ہے

وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اور نہ زیادتی تو اس پر نہیں گناہ تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خطاب خاص بہ اہل اختصاص

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ... الٰى ... اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

ربط: گزشتہ آیات میں خطاب عام تھا۔ اور اس آیت میں خاص اہل ایمان کو خطاب ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ایمان اور محبت خداوندی کا اقتضاء یہ ہے کہ خدا کے رزق کو کھاؤ اور شکر کرو۔ ﴿كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ... الاٰية﴾ (السباء:۱۵) نعمت کے استعمال سے منعم کی محبت پیدا ہوتی ہے اور شکر کرنے سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔ نیز احادیث سے ثابت ہے کہ اکلِ حلال سے دعا اور عبادت قبول ہوتی ہے اور اکلِ حرام سے دُعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔ اکلِ حلال سے مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! ایمان اور محبت کا یہ مقتضی نہیں کہ تم اپنے خیال سے لذیز اور پاکیزہ چیزوں کو ترک کر دو اور اس کو عبادت سمجھنے لگو بلکہ مقتضائے ایمان اور محبت یہ ہے کہ جو حلال اور پاک چیزیں ہم نے تم کو عطا کی ہیں ان کو رغبت کے ساتھ کھاؤ۔ عاشق تو معشوق کے ہاتھ کی دی ہوئی تلخ چیز کو بھی شیریں سمجھ کر کھاتا ہے تو ہمارے رزق کو اس خیال سے کھاؤ کہ ہم نے تم کو یہ رزق دیا ہے۔ اسباب اور وسائل کو محض پردہ سمجھو اصل مالک اور معطی ہم ہیں۔ عطیہ کے ساتھ بے رغبتی معطی کے ساتھ بے رغبتی کو موہم ہے لہٰذا منعمِ حقیقی کی طرف سے جو نعمت

آئے اس کو بصد شوق و رغبت استعمال کرو۔ تا کہ منعم تم سے راضی ہو۔ اور یہ مت سمجھو کہ پاکیزہ چیزوں کے استعمال سے حظِ نفس میں گرفتا ہو جائیں گے جو عبادت سے غفلت کا سبب بنے گا۔ اس کی تدبیر یہ کرو کہ تم اللہ کا شکر کرو تا کہ تمہاری یہ لذت عین عبادت بن جائے کیونکہ پاکیزہ رزق کھانے سے اللہ کی محبت پیدا ہوگی اور محبت سے شکر نکلے گا اور شکر ایک عظیم عبادت ہے جس سے اللہ کی نعمت اور عنایت میں زیادتی ہوتی ہے اس طرح تم لذت کو عبادت بنا سکتے ہو اگر تم خالص اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اپنے خیال کو اس میں دخل نہ دو اس لیے کہ عبادت سے مقصود رضائے حق ہے وہ جس طرح بھی حاصل ہو۔

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں　　خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

الغرض پاکیزہ چیزوں کا کھانا ایمان اور محبت کے منافی نہیں۔ البتہ حرام چیزوں کا استعمال اللہ کی ناراضی اور اس سے دُوری کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: جز ایں نیست کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف ایسی چیزوں کو حرام فرمایا جو جسمانی اور روحانی حیثیت سے تمہارے لیے مضر ہیں۔ ایک مردار کو جو خود بخود مر گیا ہو یا شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو، اور بہتے ہوئے خون کو، خنزیر کے گوشت کو، کیونکہ یہ جانور حرص اور بے حیائی اور بے غیرتی اور نجاست خوری میں مشہور ہے جو قومیں خنزیر کھاتی ہیں اس سے حیا اور عزت و ناموس رخصت ہو جاتی ہے۔ نیز یہ جانور انسان کے فضلہ کو بہت رغبت کے ساتھ کھاتا ہے اور فضلۂ انسانی خنزیر کی خاص خوراک ہے اور اس کا گوشت پوست زیادہ تر فضلۂ انسانی سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا خنزیر کا گوشت کھانا گویا کہ اپنا ہی فضلہ کھانا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا ﴿فَاِنَّهٗ رِجْسٌ﴾۔ یعنی یہ نجس العین ہے۔

اور حرام کیا اللہ نے اس جانور کو کہ جو بقصد تقرب غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو جس جانور کی جان کو اللہ کے سوا کسی بت یا کسی نبی یا ولی کی روح کے لیے نذر کر دیا جائے اور ان کی رضا اور خوشنودی کے لیے اس کو ذبح کیا جائے تو اس جانور کا کھانا حرام ہے۔ اگرچہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اس لیے کہ جانور کی جان صرف اللہ کی ملک ہے آدمی کی ملک نہیں کہ دوسرے کو بخش دے اس لیے جانور کی جان کو غیر اللہ کے نام زد کر دینا صریح شرک ہے اور ظاہر ہے کہ شرک کی نجاست اور گندگی تمام نجاستوں سے زیادہ سخت ہے لہٰذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے تو اس شرک کی نجاست اور خباثت اس جانور میں اس درجہ سرایت کر جاتی ہے کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام بھی لیا جائے تب بھی وہ جانور حلال نہیں ہوتا۔ جیسے کتا اور سُور خُدا کا نام لے کر ذبح کرنے سے بھی حلال نہیں ہوتا۔ آخر مردار اسی وجہ سے تو حرام ہے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ لہٰذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے وہ بدرجۂ اولیٰ حرام ہوگا۔ البتہ اگر غیر اللہ کے نام زد کرنے کے بعد ذبح سے پہلے ہی اپنی اس فاسد نیت سے توبہ کر لے اور اس ارادۂ فاسد سے رجوع کر لے تو پھر وہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کرنے سے حلال ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیات ہے:

((لعن الله من ذبح لغير الله)).

"اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جو غیر اللہ کی تعظیم اور تقریب کی نیت سے جانور ذبح کرے۔"

﴿لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ نیت غیر اللہ کی ہو۔ خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لے یا نہ لے۔ اسی طرح ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو جس سے مقصود غیر اللہ کی تعظیم ہو وہ حرام ہے خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ یہ لفظ قرآن کریم میں چار جگہ آیا ہے اور سب جگہ ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ فرمایا اور کسی جگہ یہ نہیں فرمایا ما

ذبح باسم غیر اللہ کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا اور ہے اور غیر اللہ کے تقرب اور رضا حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنا اور ہے۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے لغیر اللہ اور باسم غیر اللہ کا فرق معمولی استعداد والوں پر بھی مخفی نہیں۔ ''اِہلال'' کے لغوی معنی عربی زبان میں شہرت اور آواز دینے کے ہیں۔ لفظ اہلال لغت عرب میں ذبح کے معنی میں نہیں آتا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ﴿وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کے بعد ﴿مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ (المائدہ:۳) کو علیحدہ ذکر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ اہلال لغیر اللہ اور شے ہے اور ذبح لغیر اللہ اور شے ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ نے آیت ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر میں ۴۵ صفحہ کا ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا ہے جو فارسی میں ہے اور عجیب وغریب حقائق ومعارف پر مشتمل ہے اس وقت ہم اس کا خاص اور اہم اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ وھو ھٰذا۔

''حلّت اور حرمت کا دارومدار نیت پر ہے اور ذکر لسانی اس نیّتِ قلبی کا ترجمان ہے اس لیے بغیر ذکر لسانی نیت قلبی کی اطلاع ناممکن ہے۔ حدیث میں ہے۔ ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) عمل کی حقیقت یہی نیت قلبی ہے اور حرکات خاصہ صورتِ عمل ہیں اگر عمل ہے اور نیت نہیں تو جسم بے جان ہے اور ﴿كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ (النور:۲۹) کا مصداق ہے۔ معلوم ہوا کہ حلت اور حرمت کی علت ذبح کے وقت فقط زبان سے اللہ یا غیر اللہ کا نام لینا نہیں بلکہ حلت کی اصل علت خاص اللہ کی نیت ہے اور حرمت کی اصل علت غیر اللہ کی نیت ہے اور آیت ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ﴾ (الانعام) میں فقط ذکر لسانی مراد نہیں اس لیے کہ اصل ذکر اور ذکر حقیقی وہ ذکر قلبی ہے اور ذکر لسانی کو اس لیے ذکر کہا جاتا ہے کہ وہ ذکرِ قلبی کا ترجمان ہے اس لیے کہ اگر کوئی شخص دل سے کسی کی یاد میں محو ہو اور زبان سے ساکت ہو تو وہ ذاکر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر زبان سے کسی کا نام لے اور دل میں کوئی اور بسا ہوا ہو تو حقیقت شناس لوگوں کے نزدیک یاد کرنے والوں میں اسکا شمار نہیں ہوسکتا نیت قلبی ایمان کی طرح باطنی ہے اور ذکر لسانی کلمۂ شہادت کی طرح اسکا ترجمان ہے۔ کلمۂ شہادت کو ایمان کی حقیقت نہیں کہا جاسکتا ورنہ لازم آئے گا کہ مؤمن کلمۂ اسلام کے تلفظ کے وقت مومن ہوا اور اس تلفظ سے پہلے مؤمن نہ ہوا اسی طرح جس شخص نے کسی جانور کے متعلق نیت تو غیر اللہ کی کی اور اس جانور کو غیر خدا کے لیے تجویز کر دیا مگر ذبح کے وقت زبان سے نام اللہ کا لیا تو اس کا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ تقربِ غیر اللہ کی نیت کے بعد ذبح کے وقت محض زبان سے اللہ کا نام لینا عملی بے روح ہے۔

مشرکین عرب، نیت بھی غیر اللہ ہی کی کرتے تھے اور ذبح کے وقت بھی نام غیر اللہ ہی کا لیتے تھے اور مؤمنین مخلصین نیت بھی خاص اللہ ہی کی کرتے تھے اور نام بھی خاص اللہ ہی کا لیتے تھے۔ مبتدعین نیت تو کرتے ہیں غیر اللہ کی۔ اور ذبح کے وقت نام لیتے ہیں اللہ کا۔ یہ بین بین صورت شرک بھی ہے اور نفاق بھی ہے کہ صورت توحید کی ہے اور معنی شرک کے ہیں۔ اس تیسری قسم کا مصداق اس اُمت کے مشرک ہیں۔ ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ (یوسف)

بر زبان تسبیح و در دل گاؤخر ایں چنیں تسبیح کے وارد اثر

اوّل کی دو صورتوں میں ظاہر اور باطن میں کوئی تخالف نہیں اس لیے اسکا حکم ظاہر ہے اور اس تیسری صورت میں ظاہر اور باطن میں تخالف ہے اس لیے کہ باطن میں نیت تو ہے غیر اللہ کی اور ظاہر میں ذبح کے وقت نام ہے اللہ کا۔ اس لیے اعتبار ظاہر کا نہ ہوگا۔

ایسا جانور اگرچہ ظاہر میں ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ کی قسم سے معلوم ہوتا ہے لیکن باطن اور حقیقت میں ﴿لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ کے قبیل سے ہے جس کا مقتضیٰ صریح ممانعت اور حرمت ہے ذکر لسانی کو اگر حلت اور حرمت میں دخل ہے تو باعتبار صورت کے ہے اور مرتبۂ ثانیہ میں ہے۔ اور ذکر پنہانی اور نیت اندرونی کو باعتبار حقیقت کے مرتبۂ اولیٰ میں دخل ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ حلت وحرمت میں ذکر لسانی کو تو دخل ہو اور ذکر پنہانی کو اسمیں دخل نہ ہو۔ پس جس جانور میں نیت تو غیر اللہ کی ہو اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے تو اس کی حقیقت تو دوسری قسم کی ہوگی اور صورت دوسری قسم کی ہوگی۔ اور جب صورت اور حقیقت میں تعارض اور تخالف ہوا تو ترجیح حقیقت کو ہوگی۔

نیز جان کی نذر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے غیر اللہ کے لیے جان کی نذر جائز نہیں۔ اور اگر بالفرض جان کی نذر غیر اللہ کے لیے جائز ہوتی تو قربانی من جملہ عبادات کے نہ ہوتی اور قربانی اور غیر قربانی کے احکام نیت کے فرق پر مبنی ہیں۔

بطور احتمال عقلی یہاں ایک چوتھی قسم اور بھی نکل سکتی ہے جو اس قسم ثالث کا بالکل عکس ہے وہ یہ کہ نیت تو ہے خاص اللہ کے لیے نذر کی مگر ذبح کے وقت نام لیا جائے غیر اللہ کا، یہ قسم آج تک کبھی وجود میں نہیں آئی محض احتمال عقلی کا درجہ ہے وجود نفس الامری سے اس کو کوئی حصّہ نہیں ملا۔ نیز جاننا چاہیے کہ آیت شریفہ ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں اہلال باعتبار زمانہ کے عام ہے وقت ذبح کے ساتھ مخصوص اور مقید نہیں اور جن حضرات مفسرین نے عند الذبح زیادہ فرمایا ہے ان کی مراد تقیید اور تخصیص نہیں بلکہ یہ لفظ اس لیے زیادہ کیا ہے کہ نیت سابقہ کا علم اور ظہور ذبح کے وقت ہوتا ہے۔ اگر اللہ کے تقرب کی نیت ہے تو ذبح کے وقت اللہ کا نام لے گا۔ اور اگر غیر اللہ کی نیت کی ہے تو ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لے گا۔ نزولِ آیت کے زمانہ میں اللہ کی نذر اور غیر اللہ کی نذر میں امتیاز اور فرق اسی طرح ہوتا تھا کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ کی نذر ہے اور غیر اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی نذر ہے اور مشرکین امت کی یہ تیسری قسم کہ نیت تو ہو غیر اللہ کی اور ذبح کے وقت نام ہو اللہ کا یہ قسم اس زمانہ میں موجود ہی نہ تھی۔ یہ شرک اور توحید کا معجونِ مرکب بعد میں نمودار ہوا۔ یہ بین بین قسم اگر ظاہر اور صورت کے اعتبار سے جائز ہوگی تو باطن اور حقیقت کے اعتبار سے ناجائز ہوگی۔ حاصل یہ کہ عند الذبح کی قید اس زمانے کے دستور کی طرف اشارہ کے لیے ہے احترازی قید نہیں عند الذبح کی قید اس لیے ذکر فرمائی ہے کہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کسی نے حیوان کو غیر اللہ کے نام زد کیا اور غیر خدا کے تقرب کی نیت کی تو اس جانور کی حرمت اس شرط پر موقوف ہے کہ اس کی یہ نیت ذبح کے وقت تک باقی رہے اور اگر ذبح سے پہلے اس نیت فاسدہ سے توبہ کر لے اور اللہ کے نام پر ذبح کرے تو پھر یہ جانور حرام نہ رہے گا بلکہ حلال ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ عند الذبح کی قید نیت اور فعل ذبح میں مقارنت اور اتصال کے بیان کرنیکے لیے ہے اور تبدل نیت اور تغیر ارادہ سے احتراز کے لیے ہے کہ اگر غیر اللہ کی نیت فعل ذبح کے ساتھ متصل اور مقرون ہے تب تو وہ جانور حرام ہے اور اگر ذبح سے پہلے نیت بدل جائے تو حرمت بھی مبدل بہ حلت ہو جائے گی۔

نیز عند الذبح میں لفظ عند ظرف زمان ہے جو محض اقتران پر دلالت کرتا ہے۔ عِلّیت پر دلالت نہیں کرتا اور حکم حلت وحرمت کا دارومدار علت پر ہے۔ ظرفیت زمانیہ اور مکانیہ پر اس کا مدار نہیں اور یہاں حرمت کی علت اِہلال لغیر اللہ ہے اور عند الذبح کی قید اہلال اور ذبح میں اقتران بیان کرنے کے لیے ہے یعنی درمیان میں کوئی دوسری نیت فاصل اور متخیل نہیں۔ پس اگر علت یعنی نیت غیر اللہ ابتداء سے اخیر تک یعنی وقت ذبح تک مستمر ہے تو حرمت بھی مستمر ہے اور اگر علت یعنی نیت بدل جائے تو معلول یعنی حرمت بھی بدل جائے گی۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کا ما اہل بہٖ لغیر اللہ سے صرف وہی جانور مراد ہے کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے اور تشہیر سابق اور نیت متقدمہ کو حرمت میں کوئی دخل نہیں تب بھی اثبات حلت کے لیے کافی نہیں اس لیے کہ حرمت فقط ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں منحصر نہیں۔ سرقہ اور غصب کا گوشت اور مردار خور جانور کا گوشت بھی حلال نہیں حالانکہ وہ ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں داخل نہیں اسی طرح یہ جانور اگرچہ ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں داخل نہ ہو تب بھی حلال نہ ہوگا اس لیے کہ فقط غیر اللہ کے تقرب کی نیت حرمت کے لیے کافی ہے۔ واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم۔ (ماخوذ از مکتوب سویم از مکاتیب قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ)

الغرض حق جل شانہٗ نے ان چیزوں کو حرام فرمایا کہ یہ چیزیں گندی اور ناپاک ہیں ان چیزوں کے استعمال سے انسان کا قلب اور اس کی روح گندہ اور ناپاک ہو جاتی ہے۔ حلال چیزوں کے کھانے سے قلب میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور حرام چیزوں کے استعمال سے دل سے اللہ کی محبت رخصت ہو جاتی ہے اور قلب میں بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معصیّت کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ گندگی اور نجاست کا کیڑا گندگی ہی سے زندہ رہتا ہے۔ عطر سونگھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے شدید مجبوری کی حالت میں ان چیزوں کی حرمت میں کچھ سہولت اور رخصت عطا فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں: پس جو شخص بھوک سے بہت ہی مجبور اور لاچار ہو۔ اور دل اسکا ان چیزوں کے کھانے سے متنفر اور بیزار ہو پس اگر ایسا شخص ان میں سے کسی چیز کو کھائے بشرطیکہ وہ طالبِ لذت نہ ہو اور مقدار حاجت سے تجاوز نہ کرنے والا ہو یعنی سد رمق سے زیادہ نہ کھائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اس لیے کہ خبیث او گندی چیز کا بقدر ضرورت استعمال بحالت مجبوری، کراہتِ قلب اور دلی نفرت کے ساتھ روح اور قلب کو گندہ نہیں کرتا۔ لیکن آخر گندی چیز تو گندی ہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ اثر اور رنگ ضرور آئے گا مگر چونکہ یہ فعل بحالتِ مجبوری صادر ہوا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ اس سے مؤاخذہ نہ فرمائیں گے۔ اس لیے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں کہ اس ناچاری کی حالت میں جو گندی چیز استعمال کی ہے اس پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ اور بڑے مہربان ہیں کہ اس پر بڑا رحم فرمایا کہ اس بے چارگی کی حالت میں کھانے کی اجازت عطا فرمائی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا
جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر مول
قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ
تھوڑا وہ نہیں کھاتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
قیامت کے دن اور نہ سنوارے گا ان کو اور ان کو دکھ کی مار ہے وہی ہیں جنہوں نے
اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى
خرید کی گمراہی بدلے راہ کے اور مار بدلے مہر کے سو کیا سہار ہے اُن کو

النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا

آگ کی یہ اس واسطے کہ اللہ نے اتاری کتاب سچی اور جنہوں نے کئی راہیں نکالیں

فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱ ع ۹ ۵

کتاب میں وہ ضد میں دور پڑے ہیں

ذکرِ محرماتِ معنویہ مثل دین فروشی وحق پوشی

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ... الیٰ ... لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں محرماتِ حسیہ کا بیان تھا۔ اِن آیات میں محرمات معنویہ کو بیان کرتے ہیں جو حرمت میں محرمات حسیہ سے بڑھ کر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق جو اہل کتاب میتہ اور خنزیر کی حرمت پر اعتراض کرتے ہیں تعجب ہے کہ یہ لوگ اس علم کو چھپاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے اتارا یہ اس علم کو چھپا کر مخلوق کو گمراہ کر رہے ہیں اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اس امانت کی خیانت کے معاوضہ میں دنیا کا معمولی اور حقیر معاوضہ حاصل کر رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو مال دین کو فروخت کر کے اور حق کو چھپا کر حاصل کیا جائے وہ مردار اور خنزیر سے زیادہ ناپاک ہے ایسے لوگ اپنے شکموں میں سوائے آگ کے کچھ نہیں بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بلا واسطہ کلام بھی نہیں کریں گے۔ حالانکہ قیامت کے دن دربار عام ہوگا۔ مومن اور کافر۔ فاسق و فاجر سب جمع ہوں گے اس دن کی ہم کلامی کوئی رتبہ اور شرف نہیں رکھتی۔ وہ دن تو عدالت اور فیصلہ کا ہوگا مجرم اور قصوروار بھی اس کا کلام سنیں گے لیکن یہ لوگ اس دن بھی کلام الٰہی سے محروم رہیں گے۔ غصّہ اور سرزنش بھی بواسطہ فرشتوں کے ہوگی اور نہ اس دن ان کو اللہ تعالیٰ پاک و صاف کرے گا جیسے گنہگار مسلمانوں کو اس لیے عذاب دیا جائے گا کہ وہ پاک وصاف ہو کر دخول بہشت کے قابل ہو جائیں۔ لیکن ان لوگوں کو اس لیے عذاب دیا جائے گا کہ ہمیشہ تکلیف اور دَرد اٹھاتے رہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ اور ان کے لیے ہمیشہ کا دردناک عذاب ہوگا۔ یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں اور عذاب کو مغفرت کے بدلہ میں بہزار رضاء و رغبت خرید لیا ہے یہ اس قابل نہیں کہ ان کو پاک کیا جائے اور اللہ کے کلام سے ان کو عزت بخشی جائے یا کم از کم ان کو دردناک عذاب سے نجات ہی دی جائے۔ ان لوگوں نے خود ہی اپنے لیے آگ کو پسند کیا ہے، پس شاباش ہو ان کی ہمت و جرأت پر۔ یہ لوگ آگ پر بڑے ہی صبر کرنے والے ہیں اور تمام سزائیں اس لیے ہیں کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا تا کہ لوگوں پر حق واضح ہو اور تحقیق جن لوگوں نے ایسی کتاب میں بے راہی اختیار کی کہ اس کے مقصود ہی کو بدل دیا۔ اظہارِ حق کی بجائے کتمانِ حق کرنے لگے، تحقیقِ حق کے بجائے تلبیس حق کرنے لگے تو بلا شبہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی کھلی مخالفت میں ہیں کہ جس کتاب کو ہدایت کے لیے نازل فرمایا تھا اس کو گمراہی کا ذریعہ بنا لیا۔ اور ظاہر ہے کہ جو منشاء خداوندی کی کھلم کھلا مخالفت کرے وہ ایسی ہی سزاؤں کا مستحق ہوگا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ

نیکی یہی نہیں کہ منہ کرو اپنے مشرق یا مغرب کی طرف لیکن

الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ

نیکی وہ ہے جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں

وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ

پر اور دیوے مال اس کی محبت پر ناتے والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور راہ کے

السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ

مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور کھڑی رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ

وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ

اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب قول کریں اور ٹھہرنے والے سختی میں اور تکلیف میں

وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور وقت لڑائی کے وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی بچاؤ میں آئے

ابوابُ البرّ والصّلہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ... الٰى ... وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

یہاں پہنچ کر سورۂ بقرہ نصف ہو جاتی ہے۔ ابتداء سورت سے یہاں تک کے نصف میں اُمتِ دعوت کو خطاب تھا۔ یعنی ان لوگوں کو خطاب اور عتاب تھا جو آنحضرت ﷺ کے منکر تھے اور اس میں بھی زیادہ تر خطاب بنی اسرائیل کو رہا جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے مگر چھپاتے تھے اور اقرار نہیں کرتے تھے۔ اور اس اخیر نصف میں اُمتِ اجابت کو خطاب ہے اور مختلف قسم کے احکام کی تعلیم اور تلقین ہے جو عبادات اور معاملات اور معاشرات وغیرہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس طرح سے یہ تفصیل اخیر سورت تک چلی گئی ہے۔

نیز سورۃ کے نصف اوّل میں زیادہ تر اُصول دین اور ایمانیات کا بیان تھا اور اس اخیر نصف میں زیادہ تر احکامِ عملیہ کا بیان ہے۔ پھر جب ان احکام عملیہ کا آغاز فرمایا تو مجملاً ان تمام احکام کو لفظِ برّ سے تعبیر فرمایا جو برّ بمعنی وسعت سے ماخوذ ہے یعنی احکام عملیہ کا ایک وسیع

اورطویل وعریض سلسلہ جونصف سورت سے شروع ہوکر اخیر سورت تک چلا گیا۔ پھران احکام، عملیہ کے بیان میں عجیب ترتیب کوملحوظ رکھا کہ پہلے اصول برکو بیان فرمایا۔ یعنی ایمانیات اور مکارم اخلاق کو بیان کیا جن کا شروع سورت میں یعنی ﴿ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ...الخ ﴾ میں اجمالاً ذکر تھا اور پھر فروع برّ کو بیان فرمایا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام عملیہ کے مجموعہ ہو ''ابواب البر والصلہ'' سے موسوم اور ملقب کیا جائے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک مستقل کتاب اور باب ہے۔ واللہ الھادی الیٰ سواء الطریق وبیدہٖ ازمۃ التوفیق والتحقیق۔

اُصول برّ

ربط : گزشتہ آیات میں اہل کتاب کی حق پوشی اور رشوت ستانی اور ہدایت کے بدلہ میں ضلالت کوخریدنے کا بیان تھا اب آئندہ آیات میں اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب باوجود ان قبائح اور شنائع کے اپنے کو اہل برّ اور ابرار میں سمجھتے اور اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ نجات کے لیے فقط استقبال قبلہ کافی ہے اور یہ سب غلط ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نیکی اور خوبی فقط اس کا نام نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو لیکن اصل نیکی یہ ہے کہ اپنے دلوں کو اللہ کی طرف پھیر دو اور اس کی رضا اور اطاعت کو اپنا قبلۂ توجہ بناؤ۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک نیک وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے یعنی ذات وصفات میں اس کو یکتا اور یگانہ سمجھے اور آخری دن پر بھی یعنی قیامت کے آنے پر اور فرشتوں پر بھی ایمان لائے۔ فرشتوں پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ سمجھے کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں بغیر اُس کی مرضی کے کچھ نہیں کرتے نور سے پیدا ہوئے کسی کے دو بازو ہیں اور کسی کے تین اور کسی کے چار اور کسی کے زیادہ ہیں۔ معصوم ہیں کھانے اور پینے سے پاک ہیں۔ اور تمام آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر بغیر تفریق کے ایمان لائے کہ جن کے واسطہ سے اللہ کے صحیفے اور اس کے احکام ہم تک پہنچے جن میں بعض احکام۔ گزشتہ بعضا حکام کے ناسخ ہیں۔ ان تمام چیزوں کے اعتقاد میں برِّ ہے اور اخلاق واعمال میں برّ یہ ہے کہ مال کو باوجود محبوب اور ضرورت مند ہونے کے بلا تخصیص قرابت داروں کو محض حق قرابت کی وجہ سے دے تاکہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں کو جمع کر سکے اور یتیموں کو دے کہ جو بوجہ خروسالی کے کسب معاش نہیں کر سکتے اور بوجہ بے پدری کے کوئی ان کا خبر گیراں نہیں اور ان غریب محتاجوں کو دے کہ جن کی آمدنی ان کے ضروری خرچ سے کم ہے اور صبر وسکون ❁ کی وجہ سے نہ وہ کسی سے سوال کرتے ہیں اور نہ اظہار حاجت کرتے ہیں اور مسافروں کو دے جن کے پاس سفر میں خرچ نہ رہا ہو اگرچہ وطن میں مال ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ ابن السبیل سے مسافر مراد ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابن السبیل سے مہمان مراد ہے۔ اور سوال کرنے والوں کو دے خواہ مسلمان ہوں یا کافر۔ اگرچہ ہمیں ان کی حاجت اور ضرورت کا علم نہ ہو۔ اس لیے کہ ظاہر یہی ہے کہ بلا ضرورت کوئی عاقل سوال اور گدائی کی ذلت گوارا نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوال کرنے والے کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر ہو اور مال دے، گردنوں کے چھڑانے میں۔ یعنی غلاموں کے آزاد کرانے یا مسلمان قیدیوں کے چھڑانے میں جو کافروں کے ہاتھ میں گرفتا ہوں۔ یا قرض داروں کو قرض کی قید سے چھڑانے میں یا قیدیوں کے فدیہ دینے میں اپنا مال خرچ کرے۔

❁ سکون کے لفظ میں مسکین کے مادہ کی طرف اشارہ ہے اور عدم سوال میں ﴿لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ نیز حدیث میں ہے: لیس المسکین الذی تردہ التمرۃ والتمرتان واللقمۃ واللقمتان ولکن المسکین الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ۔

یہ تو حقوق العباد میں برّ یعنی نیکی کا بیان ہوا۔ اور حقوق اللہ میں بر اور نیکی یہ ہے کہ نماز کو قائم کرے اور تمام اعضاء سے اللہ کا حق ادا کرے اور زکوٰۃ دے جو کہ مال میں اللہ کا حق ہے۔ یہ وہ خصال برّ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لازم کی ہیں۔ اب آئندہ آیات میں ان خصال برّ کا ذکر فرماتے ہیں کہ جن کو آدمی خود اپنے اوپر لازم کر لے۔ چنانچہ فرماتے اور وہ لوگ بھی نیک ہیں جو اپنے عہد کو وفا کریں جو اللہ سے یا مخلوق سے کیا ہے۔ اللہ سے جو نذر مانی ہے یا کسی سے کوئی عہد کیا ہے اس کا ایفاء لازم ہے۔ لیکن یہ واجب ہے کہ جس وقت عہد کیا ہے اسی وقت نیت وفا کی رکھیں۔ جو شخص عہد کرتے وقت نیت وفا کی رکھے وہ عنداللہ وفا کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ اگرچہ بعد میں کسی مجبوری سے وفائے عہد نہ کر سکے اور جس شخص نے عہد کرتے وقت وفاء کی نیت نہیں کی لیکن بعد میں لوگوں کی ملامت کی وجہ سے اپنے عہد کو پورا کیا تو یہ وفا معتبر نہیں ((انما الاعمال بالنیات)) اور اہل برّ میں ان لوگوں کا خاص طور پر شمار ہے جو صبر اور تحمل کرنے والے ہیں تنگ دستی اور شدتِ فقر میں اور حالتِ مرض میں اور لڑائی کے وقت میں۔ انسان پر تین قسم کی مصیبتیں آتی ہیں: مالی، بدنی اور روحانی۔ فقر مالی مصیبت ہے اور مرض بدنی مصیبت ہے اور لڑائی میں چونکہ جان کا خطرہ ہے تو وہ جانی مصیبت ہے اور صابر کامل وہ ہے جو تینوں مصیبتوں میں صبر کرے اور اگر بعض مصیبتوں پر صبر کرے اور بعض پر نہ کرے تو وہ صابر کامل نہیں ایسے ہی لوگ اعتقادات میں سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی اور پرہیز گار ہیں جن کے اخلاق و اعمال درست ہیں ابرار اور اہل برّ وہی لوگ ہیں جن میں یہ تمام اوصاف جمع ہوں۔ یہود اور نصاریٰ کو نیکوکاری کا دعویٰ زیبا نہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں کا نہ ایمان درست ہے اور نہ اخلاق و اعمال درست ہیں۔ ایمان بالا میں تو یہ قصور کیا کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ نیز یہود نے ﴿یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ (المائدہ: ۶۴) اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ﴾ (آل عمران: ۱۸۱) کہا اور گوسالہ کو معبود بنایا اور ﴿اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ (الاعراف: ۱۳۸) کہا اور نصاریٰ اتحاد اور حلول کے قائل ہوئے۔ اور ایمان معاد میں یہ قصور کیا کہ جنت کو اپنے لیے مخصوص کیا ﴿وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ﴾ کہا اور ایمان بالملائکہ میں یہ قصور کیا کہ جبریل امین علیہ السلام کو اپنا دشمن جانا اور فرشتوں کی عصمت کے منکر ہوئے۔ اور ایمانِ کتب میں یہ قصور کیا کہ دنیاوی منافع کے لیے اللہ کی کتابوں میں تحریف کی اور حق کو چھپایا۔ اور ایمان انبیاء علیہم السلام میں یہ قصور کیا کہ انبیاء علیہم السلام میں تفریق کی اور بہت سے نبیوں کو قتل کیا اور ان پر اطمینان نہ کیا۔ بات بات میں حضرات سے حجتیں اور بحثیں کیں، اور دُنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہوئے کہ احکامِ الٰہی کو رشوت لے کر بدل ڈالا اور دین کو دُنیا کے بدلہ میں فروخت کیا اور گم راہی کو ہدایت کے بدلہ میں خریدا۔ اور بدعہدی تو ان کی معروف اور مشہور ہے اور بے صبری یہاں تک پہنچی کہ ﴿لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ کہہ دیا اور بزدلی اس حد تک پہنچی کہ باوجود وعدہ فتح کے ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۲۴) کہہ کر بیٹھ گئے۔ پھر کس بنا پر نیکوکاری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ صحابہ کو دیکھو کہ ہر چیز میں کامل اور صادق ہیں۔ ایمان میں اور اخلاق میں اور اعمال میں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

فائدہ : اس آیت میں برّ کی چھ قسمیں بیان ہوئیں۔ اوّل: ایمان کے اُصول خمسہ۔ دوم: ایتاء مال محبوب۔ سوم: اقامۃ صلوٰۃ۔ چہارم: ایتاء زکوٰۃ۔ پنجم: وفائے عہد۔ ششم: صبر علی الباساء والضراء و حین البأس۔ پس جس نے ان چھ چیزوں کو مکمل کر لیا اُس نے برّ کو مکمل کر لیا اور ابرار کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ

اے ایمان والو حکم ہوا تم پر بدلا برابر مارے گیوں میں صاحب کے

بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ

بدلے صاحب اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پھر جس کو معاف ہوا اس کے

اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ

بھائی کی طرف سے کچھ ایک تو چاہیے مرضی پر چلنا موافق دستور کے اور پہنچانا اس کو نیکی سے یہ

تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ

آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی پھر جو کوئی زیادتی کرے بعد اس کے تو اس کو

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ

دکھ کی مار ہے اور تم کو قصاص میں زندگی ہے اے عقل مندو

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

شاید تم بچتے رہو۔

فروعِ برّ۔ یعنی احکامِ عملیہ وفروعیہ کا بیان

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ... الٰى... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾

گزشتہ آیات میں اصولِ برّ کا بیان تھا۔ اب اس کے بعد فروعِ برّ یعنی احکامِ عملیہ وفرعیہ کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ جس میں زیادہ تر احکام جزئیہ کا بیان ہے۔

حکم اوّل دربارۂ قصاص:

اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ کے جو احکام تمہارے لیے لکھ دیئے گئے ہیں اُن سے سرِ مو تجاوز نہ کرو خصوصاً خون کے معاملہ میں خاص صبر سے کام لو اور جوش انتقام میں حدود شرع سے تجاوز نہ کرو۔ مقتولین تقتل عمد کے بارے میں تم پر مساوات اور برابری فرض کر دی گئی ہے۔ ایک مقتول کو دوسرے مقتول کے برابر سمجھو۔ حسب اور نسب اور علم وفضل وغیرہ وغیرہ کی وجہ سے قصاص میں تامل نہ کرو۔ جاہلیت کے دستو پر نہ چلو۔ جاہلیت کا دستور یہ تھا کہ شریف النسب لوگوں کے غلام کے بدلہ میں رذیل لوگوں کے آزاد قتل

کرتے تھے اور ایک عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کرتے اور ایک مرد کہ بدلہ میں کئی کئی آدمیوں کو قتل کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امتیاز کو ختم فرما دیا اور حکم دے دیا کہ جانیں سب کی برابر ہیں۔ قصاص کے بارے میں امیر اور غریب، شریف اور رذیل کا کوئی فرق نہیں ورنہ اگر قصاص میں اس قسم کے امتیازات کا لحاظ کیا جائے تو قصاص کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ آزاد برابر ہے آزاد کے۔ اگرچہ ایک امیر یا شریف ہو اور دوسرا فقیر یا رزیل ہو اور غلام برابر ہے غلام کے۔ اگرچہ ایک غلام کسی معمولی آدمی کا ہو اور دوسرا غلام بادشاہ کا ہو۔ اور عورت برابر ہے عورت کے اگرچہ ایک بیگم ہو اور دوسری مزدورنی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ضروری ہے اور جاہلیت کا یہ طریقہ کہ اشراف اپنے غلام کے عوض میں آزاد کو قتل کریں اور اپنی عورتوں کے عوض میں مردوں کو قتل کریں اور ایک مرد کے عوض میں کئی کئی مردوں کو قتل کریں یہ ہرگز درست نہیں۔ جانیں سب برابر ہیں۔

یہ اس آیت کا ظاہری مدلول اور منطوق ہے۔ اور مفہوم مخالف اس آیت کا یہ ہے کہ غلام آزاد کے برابر نہیں اور عورت مرد کے برابر نہیں۔ سو آیت کریمہ اس کے حکم سے ساکت ہے۔ ائمہ دین کا اس میں اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح غلام بدلہ میں آزاد کے اور عورت بدلہ میں مرد کے قتل کی جائے گی۔ اسی طرح آزاد بدلہ میں غلام کے اور مرد بدلہ میں عورت کے قتل کیا جائے گا۔ شوافع یہ کہتے ہیں کہ آزاد کو بمقابلہ غلام اور مرد کو بمقابلہ عورت قتل نہ کیا جائے گا بلکہ دیت لے لی جائے گی۔ حنفیہ کہتے ہیں ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ سے زمانۂ جاہلیت کی رسم کو باطل کرنا مقصود ہے اور یہ مقصود نہیں کہ غلام آزاد کے برابر نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ باندی اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو اور آزاد مرد اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو۔ حالانکہ باندی اور آزاد عورت میں بالاجماع کوئی فرق نہیں اور اسی طرح آزاد مرد اور آزاد عورت میں بالاتفاق کوئی فرق نہیں۔ پس جس طرح باندی کا آزاد عورت سے قصاص لیا جاتا ہے اور آزاد عورت کا آزاد مرد سے قصاص لیا جاتا ہے اسی طرح غلام کا آزاد مرد سے بھی قصاص لیا جائے گا۔

نیز شوافع کا یہ استدلال آیت کے مخالف سے ہے اور مفہوم مخالف کی دلالت اوّل تو ظنی ہے اور دوم یہ کہ مفہوم مخالف کا اعتبار اسی حد تک درست ہے کہ جب تک وہ مفہوم کسی دوسری نص صریح کے منطوق اور عموم کے منافی نہ ہو اور اس آیت کا مفہوم آیت ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ اور حدیث ((المسلمون تتكا فأدماءهم)) "تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں" کے منافی ہے اس لیے اس جگہ مفہوم مخالف کا اعتبار نہ ہوگا اور ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ ... الخ﴾ سے جو بظاہر قصر مفہوم ہوتا ہے وہ قصر اضافی پر محمول ہوگا۔ رسمِ جاہلیت کے مقابلہ میں قصر مراد ہے قصرِ حقیقی مراد نہیں۔

فائدہ: جاننا چاہیے کہ مقتولین میں فقط قصاص یعنی فقط جان لینے کے اعتبار سے برابری اور مساوات ہے قتل کی کیفیت میں مساوات اور برابری نہیں۔ مثلاً یہ جائز نہیں کہ آگ سے جلانے والے کو آگ میں جلایا جائے اور پانی میں غرق کرنے والے کو پانی میں غرق کر کے مارا جائے اور اگر کسی نے کسی کو جادو سے مارا ہے تو اس کو جادو سے مارا جائے۔ اس لیے ﴿فِي الْقَتْلٰى﴾ فرمایا ﴿فِي الْقَتْلِ﴾ نہیں فرمایا۔ مقتولین میں برابری ہے۔ کیفیتِ قتل میں برابری نہیں خوب سمجھ لو۔

اب قصاص کے بعد مسئلہ عفو کا بیان فرماتے ہیں۔ پس جو شخص کہ اس کے لیے اس کے بھائی کی جانب سے اگر پوری معافی نہ ہو بلکہ کچھ تھوڑی سے بھی معافی ہو جائے بایں طور کہ بعض وارث معاف کر دیں اور بعض نہ کریں تو قاتل سے قصاص ساقط ہو جائے گا اور دیت بذمہ قاتل واجب ہو جائے گی۔ اس لیے کہ خون کوئی شے منقسم نہیں کہ اس کا بعض حصہ تو لیا جائے اور بعض حصہ چھوڑا جائے۔ اس

لیے قصاص تو ساقط ہو جائے گا اور جن وارثوں نے خون معاف نہیں کیا ہے۔ ان کو بقدر ان کے حصہ کے دیت دلائی جائے گی۔ ایسی صورت میں قاتل قصاص سے تو بری الذمہ ہو جائے گا۔ البتہ اس کے ذمہ یہ واجب ہوگا کہ معاف کرنے والے کی مرضی کا اتباع کرے جو اس کی مرضی ہو اس کو قبول کرے بشرطیکہ وہ معمول شرع کے مطابق ہو ایسی شرط نہ ہو جو شریعت کے خلاف ہو مثلاً ولی مقتول۔ قاتل سے یہ کہے کہ اس شرط سے معاف کرتا ہوں کہ اپنے لڑکے کو میرا غلام بنائے یا اپنی دختر سے زنا کی اجازت دے۔ پس اس قسم کی غیر معقول شرطیں غیر مقبول ہیں اس میں اتباع ہرگز جائز نہیں اور نیز قاتل کے ذمہ یہ واجب ہے کہ جس چیز کا دینا قبول کیا ہے اس کو نیکی اور سلوک کے ساتھ معاف کرنے والے کی طرف ادا کر دے بلا تاخیر کے وقت مقررہ پر دیت کی پوری رقم ادا کر دے نہ ٹلائے اور نہ اس کو پریشان کرے اور نہ کوئی دغل و فصل کرے۔

یہ دیت اور عفو کی اجازت تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف ہے اور رحمت اور مہربانی ہے ورنہ جرم کے لحاظ سے تو سوائے سزائے قتل کے اور کوئی گنجائش نہ تھی۔ تخفیف یہ کہ یہود کی طرح قصاص کو واجب اور نصاریٰ کی طرح عفو کو لازم نہیں قرار دیا۔ مہربانی یہ ہے کہ قاتل، اولیاء مقتول کی خوشامد کر کے معاف کرا لینے اور اُن کو راضی کر لینے سے زندہ رہ سکتا ہے اور وارثانِ مقتول کو اگر حاجت ہو تو مال لے لیں اور اگر ثواب آخرت کے طالب ہوں تو حسبۃً اللہ خون معاف کر دیں۔ پس جو شخص اس تخفیف اور رحمت کے بعد حد سے تجاوز کرے مثلاً معاف کرنے اور دیت لینے کے بعد جب قاتل مطمئن ہو جائے تو اس کو قتل کر دے یا قاتل دیت کا وعدہ کر کے فرار ہو جائے تو ایسے شخص کے لیے دردناک عذاب ہے اور قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن اس میں تمہاری بہت سی جانوں کی زندگی ہے۔ ایک جان لینے سے بہت سی جانیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یعنی قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن بہت سی جانیں اس سے محفوظ رہتی ہیں۔ قاتل گناہ سے پاک ہوا اور عذاب دوزخ سے رہائی پائی اور حیاتِ ابدی اس کو حاصل ہوئی اور مقتول اگرچہ مارا گیا لیکن جب اس کا عوض اور بدلہ لے لیا گیا تو اس کا مرنا رائیگاں نہیں گیا۔ وارثانِ مقتول کے لیے باعث، عزت و جاہ ہوا اور قصاص لے لینے سے وارثوں کا دل ٹھنڈا ہوا غصہ کی آگ بجھ گئی، اور آئندہ کے لیے کشت و خون کا سلسلہ بند ہوا، فریقین ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے۔ پس اس حکم کا مشروع ہونا خلائق کے لیے موجبِ رحمت اور سرمایۂ زندگی ہوا۔ اے عقل اور فہم والو! اگر تم مغز سخن کو دریافت کرنا چاہو اور پوست پر قناعت نہ کرو تو سمجھ لو کہ قصاص سراسر زندگی ہے۔ البتہ جن لوگوں کی عقل خالص نہیں وہ بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے فقط ظاہر پر اکتفا کرتے ہیں اور قصاص کو اتلافِ جان سمجھتے ہیں اور یہ حکم اس لیے مشروع ہوا کہ شاید تم افراطِ غضب سے پرہیز کرو تا کہ غضب خداوندی سے بچ جاؤ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ

حکم ہوا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت اگر کچھ مال چھوڑے کہ دلوا مرے

لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْ

ماں باپ کو اور ناتے والوں کو دستور سے ضرور ہے پرہیز گاروں کو پھر جو کوئی

بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اس کو بدلے بعد اس کے کہ سُن چکا تو اس کا گناہ انہیں ہی پر جنہوں نے بدلا بیشک اللہ ہے

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ ؕ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ

سنتا جانتا پھر جو کوئی ڈرا دلوانے والے کی طرف داری سے یا گناہ سے پھر ان میں صلح

بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲ ع ۶ ۶

کروا دے تو اس پر گناہ نہیں البتہ اللہ بخشنے والا ہے مہربان

حکم دوم وصیّت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ... الٰى... اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۳﴾ ع﴾

گزشتہ آیات میں قصاص کو حیات فرمایا۔ آئندہ آیات میں وصیّت کا ذکر فرماتے ہیں: کہ جو خاندان کی حیات اور زندگی کا سامان ہے۔ شروع اسلام میں جب تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا تو والدین اور اقارب کے لیے وصیت فرض تھی مقدار کی کوئی تعیین نہ تھی۔ وصیت کرنے والے کی صواب دید پر تھا کہ جتنی مقدار مناسب سمجھے اتنی مقدار کی وصیت کر دے اس کے بعد جو باقی بچے وہ سب اولاد کا ہے۔ اس آیت میں اسی حکم کا ذکر ہے اور چونکہ وصیت اور اقارب کی اعانت امر فطری اور جبلی ہے اور ہر ملت و مذہب میں رائج ہے۔ اس لیے اس آیت کو پچھلی آیت کی طرح ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے شروع نہیں فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے موت کسی کے سامنے آ جائے بشرطیکہ وہ اتنا مال چھوڑے کہ تجہیز و تکفین کے بعد بچ رہے تو اس پر لازم ہے وصیت کرنا والدین اور دیگر اقارب کے لیے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ وہ وصیت شریعت کے مطابق ہو۔ مثلاً یہ نہ کرے کہ والدین کو نظر انداز کر دے اور دور کے رشتہ داروں کو مقدم کر دے یا فقیر رشتہ دار کو محروم کرے اور دولت مند کے لیے وصیت کرے۔ غرض یہ کہ جو وصیت شریعت کے مطابق ہو جاتی ہے اس کا پورا کرنا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ضروری ہے کسی کو اس میں تغیر اور تبدل کا اختیار نہیں۔ پس جو شخص حق لازم کی وصیت سن لینے کے بعد وصیت کے مضمون میں کچھ تغیر اور تبدل کرے تو اس تغیر و تبدل سے جو حق تلفی ہوگی اس کا گناہ تبدیل کرنے والوں پر ہوگا۔ حاکم اور مفتی نے اگر ظاہر اور قواعد شریعت کی بنا پر فیصلہ کیا ہے اور فتویٰ دیا ہے تو حاکم اور مفتی گنہگار نہ ہوگا۔ کیونکہ تحقیق اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں تبدیل کرنے والوں کے اقوال کو سنتے ہیں اور اُن کی نیتوں اور ارادوں کو جانتے ہیں اور حاکم اور مفتی کی معذوری کو بھی جانتے ہیں۔ البتہ ایک صورت میں وصیت میں تغیر و تبدل جائز ہے وہ یہ کہ وصیت کرنے والے سے کسی غلطی کا یا دیدہ دانستہ صریح گناہ کا اندیشہ ہو کہ غیر مستحق کو دے اور مستحق کو محروم کرے یا کسی کو کم اور کسی کو زیادہ دے۔ پس یہ شخص اگر اس وصیت کو درست کر دے یعنی اس وصیت کو شریعت کے مطابق کر دے تو ایسے تغیر و تبدل میں اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے

والے اور بڑی رحمت فرمانے والے ہیں۔ نیت فاسدہ سے گناہ کرنے والوں کو بھی بخش دیتے ہیں اور جو شخص نیک نیتی سے کوئی تغیر اور تبدل کرے اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ
اے ایمان والو حکم ہوا تم پر روزے کا جیسے حکم ہوا تھا تم سے
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ لا اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ كَانَ
اگلوں پر شاید تم پرہیزگار ہو جاؤ کئی دن ہیں گنتی کے پر جو کوئی
مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط وَعَلَى الَّذِيْنَ
تم میں بیمار ہو یا سفر میں تو گنتی چاہیے اور دنوں سے اور جن کو
يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ
طاقت ہے تو بدلا ایک فقیر کا کھانا پھر جو کوئی شوق سے کرے نیکی تو اس کو بہتر
لَّهٗ ط وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾
ہے اور روزہ رکھو تو تمہارا بھلا ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

حکم سوم۔ صوم

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ... الٰى ... اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾

اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بجائے اہل ایمان کے اپنے نفس موذی کو مارو کہ جو ہر وقت تمہاری تاک میں ہے اور تمہارے خدا کے درمیان سدِّ راہ ہے تمہارا دشمن ہے اور تمہارے جانی اور ایمانی دشمن یعنی شیطان کا دوست بلکہ حقیقی اور جڑواں بھائی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ شیطان اور نفس دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ ساتھ پیدا ہوئے اس لیے ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس دشمن کو مارو اور روح کو زندہ کرو جو تمہارے پاس فرشتوں کی جنس کی ایک چیز ہے۔ نفس کے مارنے اور روح کے زندہ کرنے کا بہترین طریقہ صبر ہے اور صبر حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چند روز روزے رکھو قوت شہویہ اور قوتِ غضبیہ جو تمام معاصی کا منبع ہے اس کے کچلنے کے لیے روزہ تریاق اور اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن یہ روزہ ہنود اور صابئین کی طرح نہ رکھو کہ دن میں تو خود رَو اشیاء [1] اور پھل اور میوے کھاتے رہو اور بوقت

---

[1] جیسے گاندھی کا طریقہ تھا کہ برت رکھتا تھا۔ روٹی تو نہ کھاتا تھا مگر انار اور انگور اور سیب کا عرق پیتا تھا گویا کہ پوری کچوری سے تو برت ٹوٹ جاتا تھا مگر عرق انار اور انگور سے برت نہ ٹوٹتا تھا۔ ۱۲ ہندوؤں کی برت کو فاقہ کہنا تو جائز ہے مگر اس کو روزہ کہنا ناجائز ہے۔

شب کھانے سے رکو۔ یہ طریقہ شریعت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا جیسے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا کہ مطلقاً کھانے اور پینے اور عورتوں کی صحبت سے دن میں کامل پرہیز رکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک یہی طریقہ رہا۔ البتہ تعیین ایام میں اختلاف رہا حضرت آدم علیہ السلام پر ہر مہینہ میں تین دن کے روزے یعنی ایام بیض کے فرض تھے۔ یہود پر یوم عاشوراء اور ہفتہ اور اس کے سوا اور چند روز کے روزے فرض تھے۔ نصاریٰ پر ماہ رمضان کے روزے فرض تھے۔

معاذ بن جبل اور ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور عطا اور ضحاک اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے کہ عاشورہ اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مقرر رہے۔ رمضان کے روزوں کے حکم سے یہ حکم منسوخ ہوا۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ واللہ ہر گزشتہ اُمت پر پورے ایک ماہ کے روزے فرض رہے جس طرح ہم پر فرض ہیں۔ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا روزہ اگلی اُمتوں پر فرض کیا تھا۔ (رواہ ابن ابی حاتم)

الغرض روزہ کی فرضیت قدیم ہے کوئی شریعت اس کی فرضیت سے خالی نہیں رہی اس لیے یہ مبارک عبادت تم پر فرض کی گئی تا کہ تم متقی اور پرہیز گار بن جاؤ کیونکہ روزہ کی خاصیت ہی یہ ہے کہ روزہ کی عادت اور کثرت آدمی کو پرہیز گار بنا دیتی ہے اور یہ روزے تم پر شمار کیے ہوئے دنوں کے لیے فرض کئے گئے ہیں جو ایک مہینہ کی مدت ہے نہ بہت کم اور نہ بہت زیادہ اگر بہت کم ہوتی تو تھوڑی مدت کی عبادت سے نفس عبادت کے رنگ سے رنگین نہ ہوتا۔ اور اگر روزہ کی مدت بہت زیادہ ہوتی تو مشقت میں پڑ جاتے۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں کا روزہ تم پر فرض کیا گیا مگر اس میں تمہاری سہولت کی رعایت کی گئی۔ پس ایک سہولت تو یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو جس کی وجہ سے روزہ رکھنا دشوار ہو تو اس کو اجازت ہے کہ روزہ افطار کر لے مگر اتنے دنوں کو شمار کر کے بجائے رمضان کے دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لے خواہ مسلسل یا فاصلہ سے۔ اور دوسری سہولت یہ ہے (جو بعد میں منسوخ ہو گئی) کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں مگر باوجود اس کے روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو اس کے ذمہ اس کا فدیہ یعنی روزہ کا بدلہ دینا ہے اور وہ فدیہ ایک مسکین کی خوراک ہے۔ اس لیے کہ یہ شخص خدا کے لیے خود ترکِ طعام و شراب نہیں کر سکتا تو کسی مسکین ہی کو کھلا دے کہ جب وہ کھا کر عبادت کرے گا تو ثواب میں اس کا بھی حصہ ہو جائے گا اور یہ بدلہ بہت ہی کم ہے۔ ﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ﴾ لیکن جو شخص خوشی سے خیر اور نیکی میں زیادتی کرے، یعنی بجائے ایک مسکین کے کئی مسکینوں کو کھانا دے دے تو وہ بھی بہتر ہے جتنی نیکی زیادہ کرو گے اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا لیکن تمہارا خود روزہ رکھنا فدیہ سے کہیں بہتر ہے اگرچہ فدیہ مقدار واجب سے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اگر تم روزہ کے فضائل اور فوائد کو جانتے ہو کہ روزہ کس درجہ کی عبادت ہے، روح کے زندہ کرنے اور نفس اور شہوات کے کچلنے میں کوئی اس کا بدل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عمل کا اجر محدود ہے مگر صبر اور روزہ کا اجر غیر محدود ہے۔ نماز اور زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی ایک محسوس صورت ہے جو ریاء وغیرہ کے ذریعے سے توڑی جا سکتی ہے مگر روزہ کی کوئی صورتِ محسوسہ نہیں کہ جس کو توڑا جا سکے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ

مہینہ رمضان کا جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت واسطے لوگوں کے اور کھلی نشانیاں

مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ

راہ کی اور فیصلہ پھر جو کوئی پاوے تم میں یہ مہینہ تو اس کو روزہ رکھے اور

مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ

جو کوئی ہو بیمار یا سفر میں تو گنتی چاہیے اور دنوں سے اللہ چاہتا ہے

بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا

تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر مشکل اور اس واسطے کہ پوری کرو گنتی اور بڑائی کرو

اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اللہ کی اس پر کہ تم کو راہ بتائی اور شاید تم احسان مانو

تعیین ایام معدودہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ... الٰی ... وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾﴾

گزشتہ آیات میں بلاتعیین چند دنوں کے روزہ رکھنے کا حکم مذکور تھا۔ اب ان آیات میں حق تعالیٰ شانہٗ اُن ایام معدودات کی تعیین فرماتے ہیں۔ یعنی وہ شمار کیے ہوئے دن جن میں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ وہ ماہِ رمضان المبارک ہے جس میں قرآن کریم اُتارا گیا، جو تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت اور امتیاز حق و باطل کی صاف صاف اور نہایت واضح اور روشن دلیلیں اور نشانیاں ہیں جو سوائے قرآن کے اور کسی کتاب میں نہیں۔ توریت اور انجیل بھی نور اور ہدایت تھی اور حق اور باطل میں فرق کرتی تھی مگر قرآن کی طرح واضح اور روشن نہ تھی۔ قرآن کریم کا ہر ہر حرف ہدایت اور امتیاز حق اور باطل کی واضح اور روشن دلیل ہے اسی وجہ سے بینات کو جمع لایا گیا اور ﴿هُدًی﴾ کو مفرد لایا گیا۔ ہدایت کبھی خفی ہوتی ہے اور کبھی جلی اور کبھی آفتاب کی طرح اجلیٰ اور روشن ہوتی ہے۔ ﴿بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کریم ہدایت اور امتیازِ حق و باطل میں آفتاب کی طرح روشن ہے۔ توریت و انجیل اس درجہ روشن نہ تھیں۔ پس تم میں سے جو شخص یہ مہینہ پائے تو اس کو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے جتنا مہینہ پائے اتنے کے روزے رکھے اگر پورا مہینہ پائے تو پورے مہینے کے روزے رکھے اور اگر کچھ دن پائے تو اتنے دن روزے رکھے غرض یہ کہ جو شخص اس مہینہ کو پائے اس کے ذمہ یہ لازم اور فرض ہے کہ اس مہینہ کے روزے رکھے۔ اور ابتدا میں جو فدیہ کی اجازت دی گئی وہ منسوخ ہوئی،

اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہے اب ان کو افطار کی اجازت نہیں رہی اس آیت سے فدیہ کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور البتہ مریض اور مسافر کے لیے جو سفر اور مرض کی وجہ سے افطار کی رخصت اور اجازت دی گئی تھی وہ ہنوز اسی طرح باقی ہے کہ جو شخص ایسا بیمار ہو کہ جس کو روزہ رکھنا دشوار ہو یا شرعی سفر پر ہو۔ یعنی سفر میں جتنی مسافت شریعت میں معتبر ہے اتنی مسافت کے سفر کا ارادہ ہو تو ایسے شخص کو رمضان میں افطار کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے شمار کے مطابق روزے رکھنا اس پر لازم ہے۔ مریض اور مسافر کے حکم کو اس لیے مکرر بیان کیا گیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ فقط فدیہ کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ معذور کے لیے افطار اور قضاء کا حکم منسوخ نہیں ہوا اور قضا کے حکم میں ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ فرمایا یعنی اور دنوں میں گنتی اور شمار کے مطابق روزے رکھنے چاہئیں اور دنوں کی قید اس لیے لگائی کہ رمضان کے فوت شدہ روزوں کی قضاء آئندہ رمضان میں جائز نہیں۔ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں قضاء کے روزے رکھنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت اور آسانی کرنا چاہتے ہیں اور تم پر سختی اور دشواری نہیں چاہتے اس لیے تم کو مرض اور سفر کی حالت میں افطار کی اجازت دی اور دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے شمار کے مطابق قضاء کا حکم اس لیے دیا کہ تم اپنے روزوں کے شمار کو پورا کر لو تا کہ تمہارے ثواب میں کمی نہ رہ جائے اور تم اس شمار کو پورا کر کے متقی اور پرہیز گار بن جاؤ۔ اور اس میں بھی یہ سہولت ہے کہ فوت شدہ روزوں کی قضا خواہ ایک ہی مرتبہ کر لو یا متفرق کر کے رکھ لو دونوں اختیار ہیں اور تا کہ تم اللہ کی کبریائی اور بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ایسے طریقہ کی ہدایت کی کہ جس سے تم رمضان المبارک کی فوت شدہ خیرات و برکات کی قضاء سے کچھ تلافی کر سکو۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ﴿لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ سے رمضان کے تیس دن پورے کرنا مراد ہیں۔ اور ﴿لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ سے ختم رمضان کے بعد عید کا چاند دیکھ کر اور عید میں جاتے وقت اور عید کی نماز میں تکبیر کہنا مراد ہے جس طرح نماز * اور حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکرِ خداوندی مسنون ہے اسی طرح رمضان کے روزوں سے فارغ ہونے کے بعد تکبیر و تحمید مسنون ہے اور تا کہ تم اللہ کا شکر کیا کرو کہ اس نے تم پر ایک مہینہ کے روزے فرض کیے کہ جو درجاتِ عالیہ کے ملنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور اس پر بھی شکر کرو کہ اس نے حالتِ مرض اور سفر میں تمہیں افطار کی اجازت دی کہ جس میں تمہارے لیے تخفیف اور سہولت ہے۔ غرض یہ کہ عزیمت بھی نعمت ہے اور رخصت بھی نعمت ہے سب نعمتوں کا شکر کرو تا کہ کامل متقی اور پرہیز گار بن جاؤ۔

نزولِ قرآن اور صیامِ رمضان میں مناسبت:

نزولِ قرآن اور صیام رمضان میں مناسبت یہ ہے کہ حق جل شانہٗ نے اس مہینہ کو قرآنِ کریم کے نازل کرنے کے لیے پسند کیا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام معجز نظام کے انوار و تجلیات اور خیرات و برکات کی کوئی حد اور نہایت نہیں۔ محبین اور عاشقین دُنیا میں اللہ کے دیدار سے محروم ہیں لیکن اس کے کلام سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ کلام کے پردہ سے کچھ اس کا جلوہ نظر آ جاتا ہے۔

---

* کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾... وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ پہلی آیت سے نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد ذکرِ خداوندی کا حکم ہے اور دوسری آیت میں حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکرِ الٰہی کا حکم ہے۔ ۱۲

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل و ر برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

چیست قرآں اے کلام حق شناس　　رونمائے ربّ ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنیئے　　معنیئے در معنیئے در معنیئے

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے توریت ،انجیل اور زبور اسی مہینہ میں اُتاری۔ یکم رمضان المبارک کو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے اور چھ رمضان کو توریت نازل ہوئی اور بارہ رمضان کو زبور اتری اور اٹھارہ رمضان کو انجیل نازل ہوئی اور چوبیس رمضان کی شب کو قرآن کریم نازل ہوا۔

غرض یہ کہ ماہ رمضان عجیب مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ کا کلام نازل ہوا اور اللہ کی کتاب اتری جو ایک نعمت کبریٰ اور منت عظمیٰ ہے۔ لہٰذا اس عظیم الشان نعمت کے شکریہ میں کوئی خاص عبادت اس مہینہ میں مقرر ہونی چاہیے جو کلام الٰہی کے مناسب ہو سو وہ روزہ ہے۔ جو روزہ دار کو ترک طعام وشراب اور ترک لذت کی وجہ سے فرشتوں کے قریب بنا دیتا ہے اور قلب میں کلامِ خداوندی کے اسرار و تجلیات کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کیونکہ بشری اور نفسانی کدورتوں اور ظلمتوں کے دور کرنے اور قلب کے جلا اور صیقل کرنے میں روزہ ایک بے مثال تریاق اور بے نظیر اکسیر ہے انوار و تجلیات کے دستر خوان سے وہی شخص کماحقہٗ بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جس نے اس حسّی اور مادی دستر خوان کو کم از کم کچھ دنوں کے لیے لپیٹ کر رکھ دیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر توریت لینے کے لیے گئے تو چالیس دن کے روزے رکھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بیابان میں چالیس روزے رکھے اس وقت اللہ نے ان کو انجیل عطاء کی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حراء میں اعتکاف فرمایا اور روزے رکھے۔ اسی غار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآں کریم نازل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت کا خلعت عطا ہوا۔ معلوم ہوا کہ روزہ کو کلامِ خداوندی کے ساتھ خاص مناسبت ہے اس لیے اس مبارک مہینہ میں دن میں تو روزہ اور رات میں تراویح مسنون ہوئی اور عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف سنت ہوا اور دن اور رات میں قرآنِ کریم کی تلاوت اور دور کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا۔

حدیث میں ہے کہ جبریل امین رمضان المبارک میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کا دور کرتے اور جس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس سال جبریل امین علیہ السلام نے پورے قرآن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ دَور کیا۔ ایک مرتبہ آپ پڑھتے اور جبریل امین علیہ السلام سنتے اور دوسری مرتبہ جبریل علیہ السلام پڑھتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سنتے۔ اس طرح دو قرآن کریم کا دو مرتبہ دَور ہوا۔ اور یہ مہینہ تمام کا تمام ہی مبارک ہے مگر شب قدر اس مہینہ کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ اسی شب میں قرآن اُترا۔ اور اسی میں فرشتوں کا خاص طور سے نزول ہوتا ہے۔ ﴿سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝﴾

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رمضان کا پورا مہینہ نہایت مبارک ہے۔ مگر وہ انوار و برکات جو اس مہینہ کے دنوں سے وابستہ ہیں وہ اور ہیں اور جو خیرات و برکات اس مہینہ کی راتوں سے متعلق ہیں وہ اور ہیں اور ممکن ہے کہ اسی وجہ سے یہ حکم ہوا ہو کہ افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کریں۔ تاکہ دونوں وقتوں میں پورا امتیاز حاصل ہو جائے اور جس طرح قرآن مجید خداوند ذوالجلال کے کمالات ذاتیہ اور شئون صفاتیہ کا مظہر اتم ہے اسی طرح ماہِ رمضان حق تعالیٰ کی خیرات و برکاتِ ذاتیہ کا مظہر اتم ہے اس مہینہ میں جو خیر و

برکت بھی نازل ہوتی ہے وہ براہِ راست بارگاہ ذات سے فائض ہوتی ہے قرآن کریم کی طرح یہ مہینہ بھی اپنی نوع میں حقیقت جامعہ ہے اسی مناسبت سے اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا اور چونکہ درختوں میں کھجور کا درخت شجرہ طیبہ ہے اور کھجور اسکا ثمرۂ طیبہ اور حقیقت جامعہ ہے اور حضرت آدم کے خمیر کا بقیہ ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اذا افطر احد کم فلیفطر علی تمر فانه برکة)).

"جو کوئی روزہ افطار کرے تو کھجور سے افطار کرے کیونکہ کھجور سراسر خیر و برکت ہے۔"

اور خلوِ معدہ میں جب یہ مبارک پھل پہنچے گا تو یہی جامع اور مبارک غذا جزو بدن بنے گی جس سے روزہ کی برکتوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح سے روزہ اور غذائے جامع کی برکتوں کے مل جانے سے قلب نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائے گا اور اسی وجہ سے کہ کھجور ایک نہایت مبارک اور جامع غذا ہے حضور پُرنور ﷺ نے سحری میں بھی کھجور کے کھانے کی ترغیب دی اور ارشاد فرمایا:

((نعم سهور المؤمن التمر)). "کھجور مؤمن کی کیا اچھی سحری ہے۔"

قرآن کریم میں ایمان کو شجرۂ طیبہ یعنی کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور رمضان کا روزہ ایمان کا ایک شعبہ ہے اس لیے رمضان کا افطار اور سحری مرد مؤمن کے لیے کھجور سے مسنون ہوئی۔ اور شب قدر اس مہینہ کا خلاصہ اور زبدہ ہے گویا کہ شب قدر بمنزلہ مغز کے ہے اور یہ مہینہ پوست کے ہے۔ پس جس کا یہ مہینہ جمعیتِ خاطر کے ساتھ گزر جائے اور اس مبارک مہینہ کی خیرات و برکات سے بہرہ اندوز ہو جائے تو اس کا تمام سال جمعیتِ اور خیر و برکت کے ساتھ گزرتا ہے۔ وفقنا الله تعالیٰ للخیرات والبرکات فی هذا الشهر المبارك و رزقنا الله سبحانه النصیب الاعظم منه امین. (مکتوب ۱۶۲ دفتر اوّل)

فائدہ جلیلہ: رمضان کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کے دن اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھے جاتے تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ روزے فرض تھے یا نفل۔ عبداللہ بن عباس اور معاذ بن جبل اور عطاء رضی اللہ عنہم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روزے فرض تھے اور ابن ابی لیلی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نہ تھے بلکہ محض بطور تطوع اور نفل رکھے جاتے تھے۔ اکثر احادیث سے وجوب ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو صوم عاشورہ اور ہر مہینے میں تین روزوں کی فرضیت تو باقی نہ رہی البتہ استحباب باقی رہ گیا اور اس میں بھی ویسا اہتمام نہ رہا جیسا کہ پہلے تھا۔

اسی وجہ سے علماء کا ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض صحابہ اور تابعین اِدھر گئے ہیں کہ ان گنتی کے دنوں سے عاشورہ اور ہر مہینے کے تین دن کے روزے مراد ہیں۔ جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو یہ روزے منسوخ ہو گئے اور جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک یہ ہے کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ سے رمضان کے روزے مراد ہیں اور یہ آیت منسوخ نہیں۔ اور صوم عاشورہ اور ایام بیض کا حکم من جانب اللہ نہ تھا بلکہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اجتہاد سے ان دنوں کے روزوں کو پسند فرمایا۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ وہ عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: کہ یہ دن بہت مبارک ہے اس دن میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دشمن سے نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بطورِ شکر یہ اس دن کا روزہ رکھا۔ اس لیے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کا حق دار ہوں اس لیے حضور ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی روزہ رکھنے کا حکم

دیا۔ (بخاری و مسلم)

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام احمد اور ابوداؤد اور حاکم رحمۃ اللہ علیہم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے عاشورہ کا روزہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کا واجب ہونا روایت کیا لیکن یہ وجوب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا اور اس آیت سے منسوخ ہو گیا۔

پس معلوم ہوا کہ راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ سے رمضان کے روزے مراد ہیں۔ عاشوراء اور ہر مہینہ کے تین روزے مراد نہیں اس لیے کہ افطار کر کے فدیہ دے دینے کی اجازت احادیث اور روایات میں رمضان المبارک کے روزوں کے متعلق آئی ہے۔ عاشورا اور ہر مہینہ کے تین دن کے روزوں کے متعلق فدیہ کا حکم کہیں ثابت نہیں۔ سنن ابوداؤد کی ایک روایت سے یہ ابہام ہوتا ہے کہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ﴾ کا حکم عاشورہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کے متعلق ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ روایت مختصر ہے۔ دوسری مفصل روایت میں رمضان کے روزوں کا مفصل ذکر ہے اور ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا حکم رمضان ہی کے روزوں سے متعلق ہے اس روایت میں رمضان کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے ابہام ہوا۔ واللہ اعلم۔

اقوال علماء کرام در بارۂ تفسیر آیت فدیہ صیام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾

اس آیت کی تاویل اور حکم میں علماء کا اختلاف ہے آیت مذکورہ کے متعلق علماء تفسیر کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے۔ اس فریق سے آیت کی مختلف توجیہات منقول ہیں جن کو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

گروہ اوّل:

اکثر علماء محققین کی رائے یہی ہے کہ آیت میں نسخ ضرور واقع ہے۔ عبداللہ بن عمر اور سلمہ بن الاکوع اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے اور بخاری اور مسلم اور ابوداؤد و بیہقی وغیرہم کی احادیث اور روایات سے بھی یہی ظاہر ہے کہ ابتداء اسلام میں لوگوں کو اختیار تھا کہ اگر روزوں کی ہمت ہو تو روزے رکھیں ورنہ روزہ افطار کر لیں اور روزہ کے بدلہ میں فدیہ دیدیں۔ وجہ یہ تھی کہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہ تھے۔ اگر ابتداء ہی سے روزہ کا قطعی حکم ہو جاتا تو شاق ہوتا بعد چندے یہ اختیار منسوخ ہو گیا اور ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ﴾ سے روزہ رکھنے کا حکم قطعی ہو گیا۔ چنانچہ حافظ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ شرح بخاری میں آیاتِ صیام کی ترتیبِ نزولی اور ناسخ و منسوخ کی تعیین کے بارے میں لکھتے ہیں:

كَانَ فی بدء الاسلام فرض عليهم الصوم فاشتد عليهم فرخص لهم فی الافطار والفدية و قال معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ كان فی ابتداء الامر من شاء صام و من شاء افطر و اطعم عن كل يوم مسكينا حتىٰ نزلت الأية التی بعدها فنسختها. (عینی شرح بخاری ص ۲۷٤ ج ۱)

ترجمہ: "شروع اسلام میں روزے فرض ہوئے لیکن (عادت نہ ہونے کی وجہ سے) لوگوں پر گراں گزرے تو افطار کر کے فدیہ دے دینے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ شروع اسلام میں جو چاہتا روزہ رکھتا

اور جو چاہتا افطار کرتا اور اس کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد کی آیت نازل ہوئی اور یہ حکم منسوخ ہو گیا۔"

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ بروایت ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

((ان رسول الله ﷺ لما قدم عليهم امرهم بصيام ثلثة ايام من كل شهر تطوعا غير فريضة قال ثم نزل صيام رمضان قال و كانوا قوما لم يتعودوا الصيام قال و كان يشتد عليهم الصوم قال فكان من لم يصم اطعم مسكينا ثم نزلت هٰذهِ الاٰية ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ فكانت الرخصة للمريض والمسافر و امرنا بالصيام.

(تفسیر ابن جریر طبری ص ۷۵ ج ۲)

ترجمہ: "آنحضرت ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ آئے تو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہر مہینہ میں تین دن کے روزوں کا حکم دیا۔ مگر بطور فرض نہیں بلکہ بطور نفل حکم دیا۔ اس کے بعد رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا مگر چونکہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہ تھے، اس وجہ سے اُن کو روزہ رکھنا گراں ہوا، تو یہ سہولت کر دی گئی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک لوگ ایسا ہی کرتے رہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھتا وہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دیتا۔ چند روز کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ... الیٰ آخرہٖ﴾ اس وقت سے صرف مریض اور مسافر کو تو روزہ مؤخر کرنے کی اجازت ہو گئی باقی ہم سب کو روزہ ہی رکھنے کا حکم ہو گیا اور افطار کر کے فدیہ کی اجازت نہ رہی۔"

یہی مضمون بخاری شریف اور اکثر کتب تفاسیر میں موجود ہے۔ اس مضمون کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد تمام روایتیں بے تکلف منطبق ہو جاتی ہیں اور آیت کا صحیح مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ کا حکم نازل ہوا۔ اور اس سے رمضان کے روزے فرض ہوئے مگر مریض اور مسافر کو اجازت ہوئی کہ اگر مرض اور سفر کی وجہ سے افطار کریں تو بعد میں اتنے ہی دن روزے رکھ لیں۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم چونکہ روزوں کے عادی نہیں اگر مشقت کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں تو اس کی مکافات کی کیا صورت ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ کہ جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہیں مگر مشقت کی وجہ سے افطار کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اس کی اجازت ہے کہ افطار کر لیں اور ایک فقیر کا کھانا دے دیں لیکن بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھیں۔ ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ اس کے بعد جب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روزہ کے خوگر ہو گئے اور روزہ رکھنا ان پر شاق اور گراں نہ رہا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ یعنی جب رمضان المبارک کا مہینہ آئے تو ہر شخص پر روزہ رکھنا فرض اور لازم ہے اب کسی کو اس کی اجازت نہیں رہی کہ مشقت کی وجہ سے روزہ افطار کر لے اور ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ البتہ مریض اور مسافر کو اجازت دی گئی کہ مرض اور سفر کی وجہ سے روزہ افطار کرے اور بعد میں اس کی قضاء کر لے وہ اجازت اسی طرح اب بھی باقی ہے فقط افطار اور فدیہ کی رخصت منسوخ ہوئی ہے

مریض اور مسافر کی رخصت منسوخ نہیں ہوئی۔ حضور سرور کائنات ﷺ کی وفات تک یہی حکم اور اسی پر عمل درآمد رہا اور حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین سے لے کر اب تک تمام علماء اور فقہاء کا فتویٰ اور تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا یہی عمل رہا۔

ایک شبہ:

یہاں پہنچ کر شاید کسی کو یہ خیال آئے کہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا عطف پہلے جملہ پر ہے اور یہ جملہ پہلے کے ساتھ غایت درجہ مربوط اور متعلق ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اوّل ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ کا حکم نازل ہوا اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے شدت اور مشقت کی شکایت کی تو یہ دوسرا جملہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ نازل ہوا اس جملہ کو پہلے کلام سے جُدا کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

جواب: یہ ایسا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.... الخ﴾ (النساء:۹۵) تو حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں تو نابینا ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوسکتا۔ ان کے شکوہ کے جواب میں ﴿غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ﴾ (النساء:۹۵) کے الفاظ اور نازل ہو گئے اور جس طرح ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے ظاہری معنی سمجھ کر تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھنے شروع کر دیئے تو اس اشتباہ کے زائل کرنے کے لیے ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا نزول ہوا۔

پس جس طرح ﴿غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ﴾ اور ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا باوجود ماقبل کے ساتھ شدید تعلق ہونے کے جداگانہ نزول ہوسکتا ہے اسی طرح ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا بھی باوجود ماقبل سے مربوط ہونے کے علیحدہ نزول ہوسکتا ہے۔ حالانکہ ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ اور ﴿غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ﴾ نہ مسند ہے اور نہ مسند الیہ بلکہ متعلقات میں سے ہے اور ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ تو یہ پورا جملہ ہے۔ پس جب کہ الفاظ مفردہ کا علیحدہ نزول جائز اور واقع ہے تو پورے جملہ کے علیحدہ نزول میں کیوں اشکال ہے۔ حق تعالیٰ ہی آیات کے نازل فرمانے والے ہیں۔ آیات کو متفرقاً نازل فرماتے ہیں اور پھر مطلع فرما دیتے ہیں کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھا جائے اور اس آیت کو فلاں جگہ اور اس مفرد اور اس جملہ کو فلاں مفرد اور فلاں جملہ سے تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نزول کی ترتیب اور ہے اور موجود مصحف کی ترتیب اور ہے اور اس وقت جس ترتیب سے قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے یہ بعینہٖ وہی ترتیب ہے۔ کہ جس ترتیب سے جبریل امین علیہ السلام حضور پرنور ﷺ سے ہر رمضان میں دور فرماتے تھے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی حکمت بالغہ اور رحمت کاملہ سے بہت سے احکام میں بندوں کو بتدریج سہولت کے ساتھ احکام کا مکلف بنایا۔ جس طرح ابتداء اسلام میں نماز میں سہولتیں تھیں۔ سلام و کلام بھی نماز میں جائز تھا بعد میں شریک ہونے والا اپنے قریبی نمازی سے یہ بھی پوچھ لیا کرتا تھا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں۔ مگر بعد میں یہ تمام سہولتیں اور رخصتیں یک لخت منسوخ ہو گئیں۔

اسی طرح روزے کے احکام میں تدریج اور سہولت کو مرعی رکھا گیا بالآخر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نفوس قدسیہ حق جل وعلا کے انوار و تجلیات سے روشن ہو گئے اور روزہ کی طبعی مشقت اور گرانی بھی دل سے بالکل نکل گئی تو اب ہمیشہ کے لیے یہ حکم قطعی آ گیا کہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ اور اس آیت کے نزول کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ کیفیت ہوئی کہ روزہ کی شدت اور مشقت مبدل بہ فرحت و لذت ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضور پرنور ﷺ تو مسلسل روزہ رکھنے کی ممانعت فرماتے ہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صوم وصال اور صائم الدہر ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔

رفع تعارض:

اس مقام پر صحیح بخاری کی روایات میں بظاہر کچھ تعارض کا شبہ ہوتا ہے کہ بعض روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت فدیہ کا ناسخ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ ہے اور بعض روایات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آیت فدیہ کا ناسخ ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ کی آیت ہے۔

جواب: یہ ہے کہ حضرات محدثین بسا اوقات اپنے مدعا کے ثابت کرنے کے لیے آیت کا ابتدائی حصّہ نقل کر کے چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ آیت کے ابتدائی حصّہ کو مدعا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن درحقیقت اس سے پوری آیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھ جاؤ محل استشہاد خود تمہارے سامنے آجائے گا اور تم خود ہی اس کو متعین کرلو گے۔ جیسا کہ امام ترمذی نے ''باب ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ'' میں یہی حدیث لانے کے بعد استشہاد میں آیت ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ... الخ﴾ لکھ کر چھوڑ دی۔ حالانکہ آیت کے اس ابتدائی جملہ کو باب سے کوئی تعلق نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھ لو۔ اور جب تم ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ پہ پہنچو گے تو موقعۂ استدلال خود تمہارے سامنے آجائے گا۔ اسی طرح ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ سے فقط یہی الفاظ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھتے چلے جاؤ اور جب تم ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ پر پہنچو تو محل استدلال کو سمجھ لو اور متعین کرلو کہ فدیہ کا اصل نسخ اس آیت سے ہوا ہے۔ ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اس کی تمہید تھی۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ دونوں ہی آیتیں حکم فدیہ کی ناسخ ہیں۔ یعنی ہر آیت سے فدیہ کا نسخ معلوم اور مفہوم ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ میں لفظ خیر واقع ہوا ہے جو استحباب اور فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ وجوب اور لزوم پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ گزشتہ تخییر کے لیے کیسے ناسخ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ خیر کا لفظ کبھی وجوب اور لزوم کے موقعہ پر بھی مستعمل ہوتا ہے جیسے ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ﴾ (النساء:۱۷۱) تثلیث سے باز آجانے کو خیر فرمایا۔ حالانکہ یہ کسی کا مذہب نہیں کہ جائز تو تثلیث بھی ہے مگر ترکِ تثلیث، تثلیث سے افضل اور بہتر ہے اس آیت میں خیر کا لفظ شر کے مقابلہ میں ہے فرض اور واجب کے مقابلہ میں نہیں۔ خوب سمجھ لو۔

دوسرا گروہ:

اور علماء کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ اس گروہ نے آیت کی مختلف توجیہات کی ہیں۔

توجیہ اوّل: پہلی توجیہ یہ ہے کہ ﴿يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا مادہ طاقت ہے جس کے معنی کسی پر نہایت مشقت اور محنت کے ساتھ قادر ہونے کے ہیں۔ اور سہولت قادر ہونے کو ''وُسع'' کہتے ہیں تو اب آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جو لوگ روزہ رکھنے پر بدقّتِ تمام قادر ہوں جیسا کہ شیخ کبیر اور عجوز یعنی بہت بوڑھا مرد اور بہت بوڑھی عورت۔ ان کے لیے اجازت ہے کہ روزہ افطار کرلیں اور اس کے بدلہ میں فدیہ ادا کردیں اور اس معنی کی تائید ایک قراءت سے بھی ہوتی ہے جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ وہ یہ کہ بجائے ﴿يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کے ﴿يَتَطَوَّقُوْنَهٗ﴾ اور ﴿يَطَّوَّقُوْنَهٗ﴾ پڑھتے تھے جس کے معنی ''بہ تکلف'' اور بہ مشقت روزہ رکھنے کے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ ﴿يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کی قراءت کے بھی یہی معنی لیے جائیں تاکہ دونوں قراءتیں مطابق اور ہم معنی ہوجائیں۔ رہا یہ سوال کہ ﴿يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا لفظ باعتبار لغت کے بھی اس معنی کا متحمل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ سو اس کے لیے علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کا کلام پیش کردینا کافی ہے کہ جو لغت

عربیت میں عرب اور عجم کا مسلم شیخ اور امام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ویجوزان یکون ھذا معنی ﴿یُطِیْقُوْنَہٗ﴾ ای یصومونه جھدھم و طاقتھم و مبلغ وسعھم. (کشاف ص ۲۴۷ ج ۱)

"اور ہوسکتا ہے کہ ﴿یُطِیْقُوْنَہٗ﴾ کے معنی لیے جائیں کہ جو لوگ نہایت مشقت اور انتہائی محنت کے ساتھ روزہ رکھ سکیں۔"

اس کے بعد غایت سے غایت کوئی یہ کہے گا کہ یہ معنی مجازی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں حقیقی معنی مراد لینا اگر متعذر ہوں تو بالاجماع مجازی معنی مراد لینا ضروری ہوجاتے ہیں۔ جس کے شواہد قرآنِ کریم اور حدیث نبوی ﷺ اور کلامِ عرب میں بے شمار ہیں اور قرینۂ مجاز اس مقام پر یہ ہے کہ تمام اُمتِ محمدیہ کے علماء اور فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ ایک صحیح سالم تندرست آدمی کے لیے ہرگز اجازت نہیں کہ وہ فی یوم ایک مسکین کو کھانا دے کر روزہ سے رستگاری حاصل کرلے ورنہ روزہ کا حکم فقط غرباء وفقراء کی حد تک محدود ہوکر رہ جائے گا اور امراء اور اغنیاء تمام کے تمام فدیہ دے کر روزہ کی فرضیت سے سبکدوش ہوجائیں گے۔

دوسری توجیہ: شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کی ﴿یُطِیْقُوْنَ﴾ سے پہلے ایک ﴿لَا﴾ مقدر ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے جیسا کہ ﴿یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ میں بالاتفاق ﴿لَا تَضِلُّوْا﴾ کے معنی مراد ہیں اور ﴿لَا﴾ مقدر ماننے کی تائید ایک قراءت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے ﴿لَا یُطِیْقُوْنَہٗ﴾ پڑھا ہے۔ حضرات اہل علم کشف الاسرار * بزدوی ص ۱۵۱ ج ۱ کی مراجعت کریں۔

تیسری توجیہ: حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے اس آیت کی ایک لطیف توجیہ فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک ﴿یُطِیْقُوْنَہٗ﴾ کی ضمیر مفعول، صوم کی طرف راجع نہیں۔ بلکہ یہ ضمیر طعام کی طرف راجع ہے۔ جو گو لفظوں میں مؤخر ہے مگر رتبۃً مقدم ہے کیونکہ ﴿عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ﴾ خبر مقدم ہے اور فدیہ مبتداء مؤخر ہے اور طعام مسکین مبتداء سے بدل ہے۔ پس جس طرح مبتداء رتبۃً مقدم ہے۔ اگرچہ لفظوں میں مؤخر ہے۔ اسی طرح مبتداء کا بدل بھی رتبۃً مقدم ہوگا۔ اور فدیہ سے مراد صدقۃ الفطر ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے روزوں کی فرضیت بیان فرمائی اور اس آیت میں روزوں کے بعد صدقۃ الفطر کا ذکر فرمایا۔ اور اس سے اگلی آیت میں روزوں کے بعد تکبیراتِ عید کی طرف اشارہ فرمایا ﴿وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ﴾ اب آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جو روزہ دار کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہیں رمضان گزرنے کے بعد وہ صدقۃ الفطر بھی ادا کریں۔"

خلاصۂ کلام: یہ کہ اگر یہ آیت صحیح اور تندرست کے بارے میں ہے تو منسوخ ہے اور اگر شیخ فانی اور عاجز کے حق میں ہے تو آیت محکم ہے اور شیخ فانی اور عاجز کے لیے اب بھی یہی حکم ہے۔

---

* کشف الاسرار کی عبارت یہ ہے۔ قال اللہ تعالی: ﴿وَ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ﴾ کان ذٰلك فی بدٰا الاسلام فرض علیھم الصوم ولم یتعودہ فاشتد علیھم فرخص لھم فی الافطار و الفدیۃ و قرأ ابن عباس رضی اللہ عنھما یطوقونه ای یکلفونه علی جھد منھم و عسرٍ وَھُم الشیوخ والعجائز وحکم ھؤلاء الافطار والفدیۃ وھو علیٰ ہٰذا الوجه غیر منسوخ و یجوز ان یکون ھذا معنی یطیقونه ای یصومونه جھدھم وطاقتھم و مبلغ و سعھم کذافی الکشاف و ذکر فی التیسیر و فی قراءۃ ابن عباس رضی اللہ عنھما و علی الذین یطوقونه ای یتکلفونه فلایطیقونه و فی قراءۃ حفصۃ رضی اللہ عنھا ﴿وَ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ﴾ و قیل ھو الشیخ الفانی فعلی ھذا لا یکون منسوخا فانه حکم ثابت مجمع علیه. (کذافی کشف الاسرار ص ۱۵۱ ج ۱)

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے پوچھیں بندے میرے مجھ کو تو میں نزدیک ہوں پہنچتا ہو پکارتے کی پکار کو

اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جس وقت مجھ کو پکارتا ہے تو چاہیے کہ حکم مانیں میرا اور یقین لاویں مجھ پر شاید نیک راہ پر آویں۔

ترغیب دُعا بعد تلقین تکبیر وثناء

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ ... الیٰ ... لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾

گزشتہ آیات میں اللہ کی تکبیر اور ثناء کا بیان تھا اب اس آیت میں دعا کا بیان ہے کہ دعا سے حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور دعا سے پہلے تکبیر اور ثناء کا بیان اس طرف مشیر ہے کہ دعا کا ادب اور طریقہ یہ ہے کہ پہلے خدا تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے اور پھر اپنی حاجت کی درخواست کی جائے انبیاء کرامؑ کا یہی طریقہ رہا ہے اور عجب نہیں کہ اس طرف بھی اشارہ ہو کہ ماہ رمضان قبولیت دعا کا مہینہ ہے اس کو غنیمت سمجھو دعا کو روزہ کے ساتھ خاص مناسبت اور خاص تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ دار کی دعا بہ نسبت غیر روزہ دار کے زیادہ قبول ہوتی ہے جیسا کہ احادیث میں بکثرت آیا ہے۔ اس لیے احکام صیام کے دوران میں دعا کا ذکر نہایت مناسب ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور جب استفسار کریں آپ سے میرے بندے میرے متعلق کہ ہمارا پروردگار ہم سے قریب ہے یا بعید اگر قریب ہے تو اس سے مناجات کریں اور اگر دور ہے تو ہم اس کو پکاریں تو آپ ان کے جواب میں میری طرف سے یہ کہہ دیجیے کہ تحقیق میں تو تم سے بہت ہی نزدیک ہوں تمہاری جان اور وجود سے بھی زیادہ قریب ہوں تم کو دیکھتا ہوں اور تمہاری آواز بلا تشویش علیحدہ علیحدہ سنتا ہوں تم مجھ کو نہیں دیکھتے اس لیے تم مجھ کو دور سمجھتے ہو ورنہ حقیقت میں میں تم سے بہت قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جس وقت بھی وہ مجھ سے درخواست کرے بشرطیکہ وہ مناسب بھی ہو اور کسی حکمت اور مصلحت کے خلاف بھی نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ آیا ہے ﴿بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ﴾ (الانعام:۴۱) ان شاء اللہ۔ اگر خدا تعالیٰ چاہتا ہے تو دعا کو منظور کرتا ہے ورنہ نہیں۔ پس گزشتہ آیت کو جو اجابت دعا کے حق میں مطلق ہے اس دوسری آیت پر جو مقید ہے محمول کرنا چاہیے۔ پس بندوں کو بھی چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین لائیں تاکہ رشد اور ہدایت پائیں اور میں بے نیاز اور غنی مطلق ہوں اور پھر بندوں کی درخواست سنتا ہوں اور اے بندو! تم میرے من کل الوجوہ محتاج ہو تم کو چاہیے کہ میرا قرب اور رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی ہر حاجت میرے سامنے پیش کرو اور میری باتوں پر یقین رکھو اور میرے احکام کو قبول کرو۔ اللہ سے مانگنا یہی ہدایت اور رشد کا راستہ ہے۔

فائدہ ① : جس طرح حق تعالیٰ کی ذات اور صفت بے چون وچگون ہے اور حیطۂ عقل سے بالاتر ہے اسی طرح اس کا قرب بھی بے چون وچگون ہے۔

جاں بتو نزدیک تو دوری ازو　　قرب حق را چوں بدانی اے عمو

فائدہ ②: دعا کا مقتضیٰ تو یہی ہے کہ قبول ہو کیونکہ حق تعالیٰ جواد اور کریم ہیں اور ہر شے پر قادر ہیں۔ ابوداؤد اور ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارا پروردگار بڑا حیا والا اور کرم والا ہے جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے کہ اس کو خالی ہاتھ واپس کر دے۔ انتہیٰ۔ لیکن اگر بندہ ہی آداب دعا اور شرائطِ قبولیت کو ملحوظ نہ رکھے تو مستحقِ قبولیت نہیں ہوتا۔ مثلاً دعا مانگنے میں حدود سے تجاوز کر جائے یا جوش میں آ کر قطع رحمی یا کسی کی ہلاکت اور بربادی کی دعا مانگنے لگے اور اللہ کے علم میں مقدر ہو چکا ہے کہ یہ شخص آئندہ چل کر اس کا دوست بن جائے گا اور اس بددعا کرنے والے کو طرح طرح کے فائدے پہنچائے تو اس دعا کا قبول نہ کرنا اسی کے حق میں مفید ہوگا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (الاعراف:۵۵)

ترجمہ: "اپنے پروردگار سے عاجزی اور پوشیدگی کے ساتھ دُعا مانگو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ جو سفر میں ہے اور پراگندہ بال اور آشفتہ حال ہے اور آسمان کی طرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے (یعنی قبولیت دعا کے اسباب مجتمع ہیں) لیکن حالت یہ ہے کہ کھانا بھی اس کا حرام ہے اور پینا بھی حرام کا اور لباس بھی حرام کا اور غذا بھی حرام کی پھر کہاں دعا قبول ہو؟ (مسلم)

حاصل یہ نکلا کہ اگر یہ موانع نہ ہوتے تو دعا ضرور قبول ہوتی۔ کسی شے کے وجود کے لیے فقط اسباب کا مجتمع ہو جانا کافی نہیں بلکہ ارتفاع موانع بھی لازم ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ قبولیت دعا کے معنی یہ ہیں کہ دعا بھی کبھی ضائع نہیں ہوتی یا تو اللہ تعالیٰ اس کی مانگی ہوئی چیز عطا فرما دیتے ہیں یا دنیا میں کوئی آنے والی بلا اور مصیبت دُور ہو جاتی ہے یا آخرت کے لیے ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں تاکہ وہاں اس کو اس سے ہزار ہا درجہ بڑھ کر عطا فرمائیں۔ جیسا کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ آیت کے الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر مراد خاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دعا مانگنے والے کی دعا ہم قبول کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں جیسا کہ دوسری جگہ ہے۔

﴿فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ﴾ (الانعام:۴۱)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور فرما دیتے ہیں جس کے زائل ہونے کی تم دعا مانگتے ہو۔ اگر چاہیں، یعنی اگر منشا نہ ہوگا تو پھر مصائب کو دفع نہ کریں گے۔"

فائدہ ③: یا آیت کے یہ معنی ہیں کہ میں دعا مانگنے والوں کی آواز اور پکار کو سنتا ہوں۔ بتوں کی طرح غائب نہیں بلکہ بندہ جو مجھ کو پکارتا ہے تو میں جواب دیتا ہوں اور لبیک یا عبدی کہتا ہوں۔ غرض یہ کہ آیت میں اجابت کے معنی قبولیت کے نہیں بلکہ پکار سننے اور جواب دینے کے معنی ہیں۔ رہا یہ امر کہ تمہاری آرزو پوری کروں گا یا نہیں۔ آیت میں اس سے کوئی تعرض نہیں ہے۔

فائدہ ④: دُعا مانگنا اور خدا تعالیٰ سے درخواست کرنا اور شے ہے اور محض زبان سے الفاظِ دُعا کا پڑھ لینا اور شے ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خوب سمجھ لو۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ

حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری

وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ

اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ نے معلوم کیا کہ تم اپنی چوری کرتے تھے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ

سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے پھر اب ملو ان سے اور چاہو جو لکھ دیا

اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ

اللہ نے تم کو اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آوے تم کو دھاری سفید

مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ

جدا دھاری سیاہ سے فجر کی پھر پورا کرو روزہ رات تک

حکم چہارم متعلق بہ سحور وفطار

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ ... الٰى ... ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ﴾

ابتدائے اسلام میں سونے سے پہلے کھانے اور پینے اور عورتوں سے جماع کرنے کی تو اجازت تھی لیکن اگر سو جانے کے بعد آنکھ کھلے تو پھر اجازت نہ تھی۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بغیر کھائے پیے سو رہے اور اسی طرح روزہ رکھ لیا۔ بھوک اور پیاس کی شدّت کی وجہ سے غشی طاری ہوئی اور بعض سونے کے بعد عورتوں سے صحبت کر بیٹھے اور بعد میں سخت نادم اور پشیمان ہوئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ حکم منسوخ ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں جائز اور حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات میں اپنی عورتوں سے مشغول ہونا جیسے روزہ دار کے لیے شب میں کھانا اور پینا جائز کر دیا گیا۔ اسی طرح اپنی عورتوں سے مخالطت بھی جائز کر دی گئی۔ طبعی میلان کی وجہ سے صبر دشوار ہے کیوں کہ عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم اُن کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو۔ اس لیے احتراز مشکل ہے اس لیے روزوں کی رات میں مخالطت کو حلال کر دیا گیا اور گزشتہ ممانعت تم سے ختم کر دی گئی۔ اللہ نے جان لیا کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے یعنی حکم خداوندی میں تقصیر اور کوتاہی کرتے تھے۔ مگر جب تم اپنی اس خیانت پر نادم اور پشیمان ہوئے اور معذرت کی تو اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تمہارا قصور معاف کیا اور تمہاری خیانت سے درگذر کیا۔ پس اب تم کو اجازت ہے بوقت شب کہ ہم بستر ہو تم ان سے اور جو اولاد اللہ نے تمہارے لیے مقدر کی ہے اس کو طلب کرو کہ یہ

مبارک مہینہ ہے۔اس نیت سے اگر صحبت کرو گے تو اس مہینہ کی برکت سے اولاد بھی مبارک ہوگی اور جس طرح تم کو رمضان کی راتوں میں ہم بستری کی اجازت دی گئی اسی طرح تم کو یہ بھی اجازت ہے کہ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ سفید خط یعنی صبح صادق کا نورانی خط، رات کے سیاہ خط سے ممتاز اور جدا ہو جائے۔ یعنی تم کو صبح صادق تک کھانے اور پینے اور عورتوں سے جماع کرنے کی اجازت ہے سابق ممانعت منسوخ کر دی گئی پھر صبح صادق سے لے کر رات کے آنے تک روزہ کو پورا کرو یعنی غروب آفتاب تک پورا کرو۔

فائدہ ①: ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ میں ﴿مِنْ﴾ یا تو تبعیض کے لیے ہے یا تبیین کے لیے ہے اگر تبعیض کے لیے ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ خیط ابیض جو فجر کا ایک حصّہ ہے اور اگر ﴿مِنْ﴾ بیانیہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ خیط ابیض کہ جو بعینہٖ خود فجر ہے اور لفظ خیط کے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ فجر کا اگر ادنیٰ حصّہ مثل تاگے کے بھی ظاہر ہو جائے تو کھانا اور پینا حرام ہو جاتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ﴿مِنْ﴾ سببیہ ہے یعنی فجر کے طلوع ہونے کی وجہ سے خیط ابیض ظاہر ہو جائے۔

فائدہ ②: خیط ابیض اور خیط اسود کا استعمال صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی میں شائع اور ذائع تھا کسی تفسیر اور بیان کا محتاج نہ تھا۔ لیکن جب لوگوں کو محض ظاہری لفظ کی بناء پر آیت کے مطلب میں اشتباہ ہوا تو مزید توضیح کے لیے ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا لفظ نازل ہوا۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ دھاگہ اور ایک سفید دھاگہ لیا اور دونوں کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیا اور دونوں کو دیکھتا رہا۔ رات کی تاریکی میں دونوں میں کچھ فرق نہ معلوم ہوا۔ صبح کو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ یہ واقعہ سن کر ہنس پڑے اور یہ فرمایا:

((انك لعريض القفا)). یعنی تو کم عقل ہے

یہ تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے اور ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا لفظ نازل ہوا۔ تاکہ ظاہر بین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں یعنی خیط ابیض اور خیط اسود سے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ معنی مجازی اور کنائی مراد ہیں اور اسی پر تمام اُمت کا اجماع ہے کہ خیط ابیض سے صبح صادق مراد ہے۔

فائدہ ③: فجر تک جماع کی اجازت ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر جنبی صبح صادق کے بعد غسل جنابت کرے تو اس کا روزہ صحیح ہے۔ جنابت روزہ کے منافی نہیں۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ
اور نہ لگو ان سے جب اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں یہ حدیں باندھیں اللہ کی
فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾
سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کو شاید وہ بچتے رہیں۔

حکم پنجم دربارۂ اعتکاف

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ ... الیٰ ... لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾﴾

روزہ کے بعد اعتکاف کے مسائل بیان فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے فقہاء کرام کتاب الصوم کے بعد کتاب الاعتکاف لاتے ہیں۔ اقتداءً بالقرآن الحکیم اور مت ہاتھ لگاؤ اپنی بیبیوں کو اس حالت میں کہ جب تم مسجد میں اعتکاف میں بیٹھے ہو۔ اگرچہ تم کسی ضرورت سے مسجد سے باہر نکلے ہو اور خواہ دن ہو یا رات ہو بہر حال اعتکاف کی حالت میں بیوی کے پاس جانا حرام ہے۔ روزہ اگرچہ غروب آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے لیکن اعتکاف دن کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اعتکاف رات اور دن دونوں ہی کا ہوتا ہے۔ اور معتکف اگرچہ کسی ضرورت استنجاء وغیرہ کی بنا پر مسجد سے باہر آ جائے لیکن حکماً وہ مسجد ہی میں معتکف اور مقیم ہے اس لیے معتکف کو مسجد سے باہر جا کر بھی صحبت کی اجازت نہیں۔ یہ تمام احکام اللہ کے حدود ہیں جو حلال و حرام میں حد فاصل ہیں پس ذرہ برابر ان سے تجاوز نہ کرو بلکہ ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ قریب جانے سے اندیشہ ہے کہ کہیں حدودِ ممنوعہ میں داخل نہ ہو جاؤ دین کی براءت اور نزاہت اگر چاہتے ہو تو شبہات سے بھی بچو۔ اسی وجہ سے ارشاد ہے ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾ (الانعام:۱۵۲) یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ چہ جائیکہ اس کو ہضم کر جاؤ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کرتے ہیں تا کہ لوگ اللہ کی حدود ممنوعہ میں داخل ہونے سے بچتے رہیں۔ اپنے قدم کو معصیت کی حدود سے بچائے رکھنے ہی کا نام تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔

فائدہ ①: حالتِ اعتکاف میں بیوی سے مباشرت حرام ہے۔ مباشرت سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

فائدہ ②: ﴿وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف سوائے مسجد کے کسی اور جگہ صحیح نہیں۔

فائدہ ③: اعتکاف ہر مسجد جماعت میں درست ہے کسی مسجد کی خصوصیت نہیں۔ اس لیے کہ آیت میں لفظ مساجد عام ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ سوائے مسجد جمعہ کے کسی اور مسجد میں اعتکاف درست نہیں۔

فائدہ ④: اعتکاف رمضان المبارک کے آخیر عشرہ میں سُنّتِ مؤکدہ ہے مگر سُنّت کفایہ ہے محلّہ یا شہر میں بعض کے اعتکاف کرنے سے سُنّت ادا ہو جاتی ہے سب پر لازم نہیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ
اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک
لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳ ع ۶ ۷۰۰
کہ کھا جاؤ کاٹ کر لوگوں کے مال میں سے مارے گناہ کے اور تم کو معلوم ہے۔

حکم ششم منع از مالِ حرام

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ ... الٰی ... وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۸﴾

گزشتہ آیات میں روزہ اور دعا کا ذکر تھا اس آیت میں حرام مال کے کھانے کی ممانعت ہے اشارہ اس طرف ہے کہ روزہ اور دعا کی قبولیت کے لیے اکلِ حلال شرط ہے۔ نیز پہلے افطار اور سحری کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ افطار اور سحری حلال روزی سے ہونا چاہیے نیز اصلی مقصود روزہ سے طہارت نفس ہے تو جب طہارت نفس کے لیے روزہ میں حلال مال کے استعمال کی اجازت نہ رہی تو حرام مال کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ حلال مال سے روزہ تو صرف تیس دن کا ہے اور حرام مال سے روزہ مدت العمر کے لیے ہے یعنی ساری عمر کا صوم وصال ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور مت کھاؤ ایک دوسرے کے مال ناحق طریقہ سے ہر ایک کو چاہیے کہ دوسرے کے مال کو اپنا مال سمجھ کر حفاظت کرے اور مت لے جاؤ مال کے جھوٹے مقدمے حکام کی طرف اس غرض سے کہ کھا جاؤ لوگوں کے مال کا ایک حصہ ظلم اور ستم اور فریب کے ذریعہ سے اور حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم اس معاملہ میں حق پر نہیں رشوت دیکر اپنے موافق فیصلہ کرا لینے سے وہ مال تمہارا نہیں ہوجاتا وہ مال لوگوں ہی کا مال رہتا ہے۔ جیسا کہ لفظ اموال الناس سے مفہوم ہوتا ہے یعنی باطل فیصلہ سے وہ مال لوگوں کی ملک سے نہیں نکلتا جو اس کے اصل مالک ہیں۔ البتہ حکام چونکہ حقیقت حال سے واقف نہیں ظاہر حال کے موافق فیصلہ کر دیتے ہیں۔ وہ معذور ہیں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر حاکم ظاہراً شریعت کے موافق فیصلہ کردے اور دل سے کسی جانب اس کا میلان نہ ہو تو اس کو عنداللہ اجر ملے گا اگرچہ وہ فیصلہ فی نفسہٖ ناحق اور گناہ ہو۔

مسئلہ : اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ قضاء قاضی سے کوئی حرام شے حلال نہیں ہوجاتی جیسا کہ بخاری و مسلم میں اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! میں تمہاری طرح بشر ہوں اور تم میرے پاس اپنے جھگڑے اور مقدمے فیصلہ کرانے کے لیے لاتے ہو اور ممکن ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اظہارِ مدعا میں دوسرے سے زیادہ لَسّان اور فصیح اللسان ہوں اور میں اس کے ظاہری بیان اور برہان پر اس کے موافق فیصلہ کردوں تو تم کو چاہیے کہ اگر میں شہادت کے اعتبار سے اس کو دوسرے مسلمان بھائی کا حق دلا دوں تو اس کو ہرگز نہ لو کیونکہ حقیقت میں میں نے اس کو آگ کا انگارہ دے دیا ہے۔

اور یہی تمام علماء کا مذہب ہے کہ یہ مال اس پر حرام ہے اور قضاء قاضی فقط ظاہراً نافذ ہوتی ہے باطناً نافذ نہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ املاکِ مُرسلہ میں قضاء قاضی فقط ظاہراً نافذ ہوتی ہے باطناً نہیں۔ یعنی جس صورت میں مالک کی پہلے سے مِلک ثابت ہو۔ وہاں اگر کوئی جھوٹا دعوی اور جھوٹی شہادت کے ذریعہ سے اپنے موافق فیصلہ کرالے تو وہ شے اس کے لیے حلال نہ ہوگی لیکن اگر عقود اور فسوخ میں قاضی نے کوئی فیصلہ کر دیا تو قاضی کا حکم ظاہراً (یعنی دنیوی احکام) اور باطناً یعنی عنداللہ یکساں طور پر نافذ اور جاری ہوگا۔ عقود سے معاملات مثل بیع وشراء واجارہ ونکاح مراد ہیں۔ اور فسوخ سے معاملات کا فسخ کرنا اور توڑنا مراد ہے۔ جمہور علماء اس صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو گواہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے گواہی دی کہ فلاں شخص کا فلاں عورت سے نکاح ہوگیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ عورت اس مرد کو دلا دی جائے۔ اس عورت نے کہا اے امیر المؤمنین! میرا اس شخص سے نکاح نہیں ہوا، اگر آپ کو یہی منظور ہے تو میرا نکاح اس کے ساتھ پڑھا دیجیے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان گواہوں نے تیرا نکاح کر دیا۔ واللہ اعلم۔

یہ عورت پہلے سے کسی کی منکوحہ نہ تھی اس لیے یہ شہادتِ زور نکاح کے لیے کافی سمجھ گئی۔ اور اگر کسی کی منکوحہ ہوتی تو بالا جماع اس کے لیے حلال نہ ہوتی۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عقود و فسوخ سے اس قسم کی صورت مراد ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ

تجھ سے پوچھتے ہیں چاند کا نیا نکلنا تو کہہ یہ وقت ٹھہرے ہیں واسطے لوگوں کے اور واسطے حج کے

حکم ہفتم اعتبار حساب قمری

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ﴾

گزشتہ آیات میں روزہ اور افطار اور سحر کا ذکر تھا جس کا تمام تر تعلق رویت ہلال سے ہے اس لیے ان آیات میں رویتِ ہلال کے مسئلہ کو ذکر فرماتے ہیں لوگ آپ سے چاندوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ہلال اوّل باریک ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا بڑھتا بدرِ کامل ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سوال کے جواب میں یہ کہہ دیجیے کہ یہ تغیر اور تبدل لوگوں کے دینی معاملات میں اوقات مخصوصہ اور مدت معینہ معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں اور خصوصاً حج اور روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ کے لیے۔ یعنی اس سے حج اور روزہ اور عدت کے ختم ہونے اور قرض وغیرہ کے معاملات کی مدت اور وقت کا علم ہوتا ہے قمری حساب کا جاننا نہایت آسان ہے۔ ہر شخص چاند کے حساب سے تاریخ شمار کر سکتا ہے شمسی حساب کے لیے جنتری درکار ہے ہر کس و ناکس شمسی حساب کو نہیں سمجھتا۔ علم ریاضی میں بغیر کمال حاصل کیے شمسی حساب کا سمجھنا ممکن نہیں اور چاند کا حساب قدرتی اور آسان ہے جو سہولت قمری حساب میں ہے وہ شمسی حساب میں نہیں اس لیے شریعت نے حج اور روزہ اور زکوٰۃ اور عدت وغیرہ کا مدار قمری حساب پر رکھا ہے۔ حج اور زکوٰۃ میں قمری حساب کا اعتبار ہے شمسی حساب کا اعتبار نہیں۔ شریعت میں مہینہ اور سال قمری ہی معتبر ہے اور اس کا استعمال مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے۔ اگرچہ دنیوی معاملات میں شمسی حساب کا استعمال جائز ہے لیکن اگر سب کے سب قمری حساب کو ترک کر دیں تو گنہگار ہوں گے جیسا کہ فرض علی الکفایہ کا حکم ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ
اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ چھت پر سے لیکن نیکی وہی جو کوئی
اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾
بچتا رہے اور آؤ گھروں میں دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو شاید تم مراد کو پہنچو

حکم ہشتم اصلاح بعض رسوم جاہلیت

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا ... الیٰ ... لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۸۹﴾

گزشتہ آیت میں حج کا ذکر تھا۔ آئندہ میں حج کے متعلق جاہلیت کی ایک غلط رسم کی اصلاح فرماتے ہیں۔ بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب احرام باندھ لیتے تو گھروں میں دروازوں سے نہ داخل ہوتے بلکہ مکان کی پشت کی طرف سے داخل ہوتے (نقب لگا کر یا سیڑھی لگا کر) اور اس کو فضیلت اور قربت سمجھتے۔ اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور اس میں کوئی فضیلت اور پرہیزگاری نہیں کہ تم حالتِ احرام میں گھروں میں پشت کی جانب سے آیا کرو لیکن نیکی اور بزرگی یہ ہے کہ حالت احرام میں خاص طور پر اللہ کے محرمات سے بچے اور جب تم کو گھروں میں آنے کی ضرورت ہو تو دروازوں کی طرف سے آؤ اور احکام خداوندی میں تغیر اور تبدل سے بچتے رہو۔ کسی شے کو اپنی رائے سے طاعت اور معصیت سمجھ لینا تقویٰ کے خلاف ہے۔ اُمید ہے کہ تم اپنی مراد کو پہنچو گے۔

فائدہ: مکان میں پشت کی جانب سے داخل ہونا جائز اور مباح ہے لیکن اس کو عبادت اور نیکی سمجھنا بدعت ہے۔ شریعت کی نظر میں وہ برا اور تقویٰ کے خلاف ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی مباح کو نیکی اور بزرگی سمجھ لینا یہ بدعت ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: کہ آیت کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہر کام کو اپنے طریقہ سے کیا کرو۔

اطلبوا الارزاق من اسبابها وادخلوا الابيات من ابوابها

اور اس معنی پر آیت کا ماقبل سے ایک لطیف ربط ہو جاتا ہے کہ بے محل اور لایعنی سوال (جیسا کہ تم نے ہلال کے گھٹنے اور بڑھنے کے متعلق کیا) اس کی مثال ایسی ہے جیسے مکان میں پشت کی جانب سے داخل ہونا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو لڑتے ہیں تم سے اور زیادتی مت کرو اللہ
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۹۰ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ
نہیں چاہتا زیادتی والوں کو اور مارو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو
مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ
جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مارنے سے زیادہ ہے اور نہ لڑو ان سے
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ
مسجد الحرام پاس جب تک وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ لڑیں تو ان کو مارو

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

یہی سزا ہے منکروں کی پھر اگر وہ باز آویں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا

اور لڑو ان سے جب تک نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے اللہ کا پھر اگر وہ باز آویں

فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ

تو زیادتی نہیں مگر بے انصافوں پر حرمت کا مہینہ مقابل حرمت کے مہینے کے اور

الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ

ادب رکھنے میں بدلا ہے پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو

مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

جیسے اس نے زیادتی کی اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیز گاروں کے

حکم نہم متعلق بہ قتالِ کفار

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ... اِلٰى ... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾﴾

گزشتہ آیات میں حج اور روزہ کے لیے خاص خاص مہینہ کا ہونا بیان فرمایا کہ سوائے ان ایامِ مقررہ کے دوسرے ایام میں حج نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ملت ابراہیمی میں یہ حکم تھا کہ چار مہینوں میں قتل وقتال حرام ہے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب یہ چار مہینے اشہر حرم کہلاتے تھے۔ اور یہ چاروں مہینے امن کے کہلاتے تھے۔ ان دنوں میں تمام ملک عرب میں لڑائی موقوف ہوجاتی تھی اور کوئی کسی سے تعرض نہ کرتا تھا اس بناء پر آنحضرت ﷺ نے ذی قعدۃ الحرام ۶ ہجری میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر جماعت کے ہمراہ عمرہ کا قصد فرمایا۔ جب مکہ مکرمہ پہنچے تو مشرکین مکہ لڑنے کے لیے تیار ہوگئے اور مسلمانوں کو عمرہ کرنے اور مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ بالآخر اس پر صلح ہوئی کہ آپ ﷺ اس وقت بدون عمرہ کیے ہوئے واپس ہوجائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ سالِ آئندہ ماہ ذی قعدۃ الحرام ۷ ھ میں مع اصحاب عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لائے تو اندیشہ ہوا کہ اگر مشرکین مکہ اس ماہِ حرام میں خلافِ عہد ہم سے لڑنے پر تیار ہوجائیں تو ہم کیا کریں اور شہر حرام اور بلدِ حرام میں کیوں کر لڑیں؟ اس پر آیت نازل ہوئی کہ اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو مگر ابتداء اور زیادتی تمہاری طرف سے نہ ہونی چاہیے۔

چونکہ گزشتہ آیات میں حج کا ذکر تھا۔ حج کی مناسبت سے عمرۂ حدیبیہ اور زمانۂ حج اور عمرہ میں قتال کا حکم بیان فرمایا اور اس کے

بعد پھر دور تک احکام حج کے بیان کا سلسلہ چلا گیا۔ اصل مقصود عمرۂ حدیبیہ کے متعلق حکم پتلا نا تھا۔ شہر حرام اور حالتِ احرام میں جہاد وقتال کا حکم عمرہ اور احرام کی تبعیت میں ذکر فرمایا اس لیے اس حکم کے بعد پھر حج کے احکام بیان فرمائے اور بے تکلف لڑو تم خدا کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑیں اور حدودِ شریعت سے تجاوز نہ کرو۔ یعنی ماہ حرام اور سرزمین حرم میں اپنی طرف سے لڑائی کی ابتدا نہ کرو اور بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں کو نہ قتل کرو اور نہ کسی کا مُثلہ کرو، یعنی ناک، کان وغیرہ نہ کاٹو اور نہ کسی کی آنکھ پھوڑو، یہ سب حد سے تجاوز کرنا ہے بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے اور اگر وہ خود حد سے تجاوز کریں اور عہد شکنی کریں اور تم سے لڑیں تو پھر تم ان کو مارو جہاں کہیں بھی پاؤ حل میں یا حرم میں اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو تنگ کر کے نکالا ہے۔ یعنی مکہ سے یعنی تم کو اتنا ستایا کہ تم نکلنے پر مجبور ہوئے ایسے لوگوں کو جہاں کہیں بھی پاؤ مارو اور یہ خیال نہ کرو کہ ماہ حرام اور سرزمین حرم میں کیسے قتل وقتال کریں۔ اس لیے کہ کفر وشرک کا فتنہ اور اعداء اللہ کا غلبہ اور ان کی شوکت کا فتنہ اور مفسد سرزمین حرم میں قتل وقتال اور اخراج کے فتنہ سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ ماہ محترم میں مار ڈالنا اتنا گناہ نہیں جتنا کہ خود علی الاعلان کفر وشرک کرنا اور دوسروں کو دین حق سے بچلانا اور گمراہ کرنا گناہ ہے قتل میں تو مصلحتیں اور منفعتیں ہوسکتی ہیں لیکن کفر اور شرک سراسر شر محض ہے۔ اس میں کسی مصلحت اور منفعت کا امکان ہی نہیں لہٰذا تم اس کفر کے شر اور فتنہ کے ازالہ کے لیے کمر بستہ رہو۔ اور اس کا خاص طور پر لحاظ رکھو کہ مسجد حرام کے قریب اُن سے نہ لڑو تاوقتیکہ وہ اس جگہ خود تم سے نہ لڑیں۔ اس لیے کہ مسجد حرام غایت درجہ محترم ہے۔ ﴿مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ (آل عمران:۹۷) جو مسجد حرام میں داخل ہوا وہ امن والا ہو گیا۔

لہٰذا مسجد حرام اور حرم کا احترام بہت ضروری ہے پس اگر وہ کفار نا ہنجار مسجد حرام کی حرمت اور احترام کو ملحوظ نہ رکھیں اور تم سے اس مسجد میں قتل وقتال کریں تو پھر تم کو اجازت ہے کہ تم بے کھٹکے ان کو مارو ایسے کافروں کی کہ جو حرم کی حرمت کو ملحوظ نہ رکھیں یہی سزا ہے۔ یعنی بلاشبہ مکہ جائے امن ہے لیکن جب انہوں نے ابتداء کی اور تم پر ظلم کیا اور محض اللہ پر ایمان لانے کی وجہ سے تمہاری ایذاء رسانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو اب مستحق امن کے نہ رہے جہاں پاؤ مارو پس اگر یہ لوگ اب بھی کفر اور شرک سے باز آ جائیں یعنی تمہارے قتل کے بعد کفر سے توبہ کر لیں اور مسلمان ہو جائیں تو ان کی توبہ قبول ہے اور گزشتہ کیا ہوا سب معاف ہے اسلام اور توبہ کے بعد کسی گزشتہ خون کا مؤاخذہ اور مطالبہ نہ ہوگا اور فقط معافی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ انعام واحسان اور مہربانی بھی فرماتے ہیں اس لیے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والے اور معاف کرنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔ اسلام اور توبہ کے بعد تمام گزشتہ گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں لیکن حالت کفر میں رحمت نہیں فرماتے کیونکہ کفر وشرک محل رحمت نہیں بلکہ موردِ غضب ولعنت ہے۔ اور اے مسلمانو! جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ کفر محل رحمت نہیں تو ان کافروں سے لڑو اور ان اعداء اللہ سے اس وقت تک جنگ کا سلسلہ جاری رکھو جب تک کہ کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد ختم نہ ہو جائے اور خالص حکم اللہ ہی کا چلنے لگے یعنی کفر مغلوب ہو جائے اور اسلام غالب آ جائے کہ کفر کو اسلام کے مقابلہ میں سر اٹھانے کی مجال باقی نہ رہے اور کفر اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور کفر میں اتنی طاقت نہ رہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے کسی دینی یا دنیوی امر میں مزاحمت کر سکے۔ شروع آیت میں اصل قتال کا وجوب بیان فرمایا تھا اور اس آیت میں جہاد وقتال کی غرض وغایت بیان فرمائی کہ جہاد سے مقصد کفر کے فتنہ کو ختم کرنا ہے اس لیے کہ اللہ کی زمین پر کفر سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ پس اگر یہ کافر شرک اور کفر کے فتنہ اور فساد سے باز آ جائیں تو پھر ان سے کوئی زیادتی اور دست درازی نہ کی جائے اس لیے کہ دست درازی سوائے ظالموں اور ستم گاروں کے اور کسی پر روا نہیں اور شر اور فساد سے باز آ جانے کے بعد ظالم نہیں رہے۔ عمرۂ حدیبیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ تردّد تھا کہ اگر کفار سے لڑائی کی نوبت آئی

جیسا کہ بظاہر غالب گمان ہے تو اگر خاموش رہیں تو مشکل اور اگر ان سے جنگ کریں تو ایک تو سرزمینِ حرم کی بے حرمتی اور دوسرے ماہِ محترم یعنی ذی قعدۃ الحرام کی بے حرمتی ذی قعدہ اور ذی الحجہ اور محرم اور رجب یہ مہینے اشہرِ حرم اور اشہرِ حرام کہلاتے تھے ان میں قتل قتال ممنوع تھا۔ مکان محترم یعنی ارضِ حرم کے متعلق جو تردد تھا اسکا گزشتہ آیات میں جواب دیا۔ ان آیات میں زمانِ محترم یعنی شہرِ حرام کی بے حرمتی کا جو تردّد تھا۔ اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں: اور اے مسلمانو! تم کو مکان محترم میں جنگ وجدال کے متعلق جو تردد تھا وہ زائل کر دیا گیا۔ رہا زمانِ محترم یعنی شہرِ حرام میں جنگ کے متعلق جو تردّد ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ اور عوض میں ہے۔ اگر وہ اس مہینہ کی حرمت کا لحاظ اور ادب رکھیں اور تم سے نہ لڑیں تو تم بھی اس مہینہ کی حرمت کا ادب اور لحاظ کر کے اُن سے نہ لڑو اور وجہ یہ ہے کہ حرمت کی چیزوں میں عوض اور بدلہ ہے یعنی برابری ہے۔ پس اگر وہ اس شہرِ حرام کا احترام ملحوظ رکھیں تو تم بھی اس کا احترام ملحوظ رکھو اور اگر وہ اس محترم مہینہ کا احترام نہ کریں تو جیسے تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی اسی پر اسی قدر زیادتی کرو جس قدر کہ اس نے تم پر زیادتی اور دست درازی کی ہے اور زیادتی کا بدلہ لینے میں اللہ سے ڈرتے رہو کہ کہیں زیادتی کا بدلہ لینے میں تم سے زیادتی نہ ہو جائے کہ اپنے حق سے زائد بدلہ لے لو اور مستقبل میں کافروں کے غلبہ کے خطرہ کو خاطر ہی میں نہ لاؤ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے تم یقین رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے اور فتح اور کامیابی کا تمام دارومدار اللہ کی معیت اور اس کی نصرت وحمایت پر ہے اور بغیر تقویٰ اور پرہیزگاری اللہ کی معیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ حاصل ان آیات شریفہ کا یہ ہے کہ حدودِ حرم اور شہرِ حرام میں تم ابتداء بالقتال نہ کرو اگر کفار ابتداء بالقتال کریں تو تم قتال سے دریغ نہ کرو۔ یہ تمہارا قتل وقتال بلدِ حرام اور شہرِ حرام کی حرمت کے منافی نہیں جیسے ابتداءً کسی مسلمان کو قتل کرنا روا نہیں لیکن قصاص میں کسی مسلمان کو قتل کرنا خونِ ناحق نہیں کہلاتا۔

فائدہ ①: ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جہاد کے بارے میں جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ یہ آیت ہے یعنی ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا﴾ ابتداء میں یہی حکم تھا کہ جو لوگ آپ سے قتال کریں آپ ان سے قتال کریں اور جو آپ سے قتال نہ کریں آپ بھی ان سے قتال نہ کریں۔ بعد میں یہ حکم ﴿اقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً﴾ سے منسوخ ہو گیا۔ یعنی تمام مشرکین سے قتال کرو خواہ وہ تم سے قتال کریں یا نہ کریں۔

اور صدیق اکبر اور سعید بن جبیر اور زہری رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ سب سے پہلی آیت جو جہاد وقتال کے بارے میں نازل ہوئی وہ سورۂ حج کی یہ آیت ہے۔ ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ۝۳۹ ... الآیة﴾ (الحج)

امام ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے کہ ابتداء بالقتال کرنے والوں سے قتال کی اجازت میں سب سے پہلی آیت ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ اور عام کافروں سے جہاد وقتال کی اجازت کے بارے میں خواہ وہ ابتداء بالقتال کریں یا نہ کریں، سورۂ حج کی آیت پہلی آیت ہو یعنی تمام کفار سے جہاد وقتال کی اجازت میں پہلی آیت ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ .... الآیة﴾ (الحج:۳۹) ھو کذافی احکام القرآن ص ۷۵۲ ج ۱۔

فائدہ ②: فی سبیل اللہ کا مطلب یہ ہے کہ محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جہاد وقتال ہو۔ قومیت اور وطنیت کی بناء پر نہ ہو حدیث میں ہے کہ جو قتال حمیت اور قومیت اور اظہارِ شجاعت کے لیے ہو وہ فی سبیل اللہ نہیں جو قتال محض اس لیے ہو کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو وہ فی سبیل اللہ ہے۔

فائدہ ③: جمہور ائمہ دین کا مسلک یہ ہے کہ اشہر حرم یں قتل وقتال ابتداء میں ممنوع تھا بعد میں اجازت ہوگئی مگر بہتر اب بھی یہی ہے کہ اشہرِ حرم میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آیت کا حکم اب بھی باقی ہے منسوخ نہیں ہوا اور اب بھی حرم اور اشہر حرم میں ابتداء بالقتال حرام ے اور یہی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ شہر یعنی مکہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے صرف میرے لیے ایک ساعت کے واسطے حلال کر دیا گیا باقی قیامت تک حرام ہے یہاں کا گھانس اور تنکا بھی نہ کاٹا جائے اور نہ یہاں کا شکار بدکایا جائے۔ اور جو لوگ نسخ کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ابن خطل مسجد حرام میں قتل کیا گیا حالانکہ وہ خانہ کعبہ کے پردہ سے لٹکا ہوا تھا۔ جواب یہ ہے کہ یہ قتل اس ساعت میں ہوا کہ جس ساعت میں مکہ میں قتل وقتال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال کر دیا گیا تھا۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ
اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں اور
اَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾
نیکی کرو اللہ چاہتا ہے نیکی والوں کو

حکم دہم انفاق فی الجہاد

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ... الٰی ... اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾﴾

گزشتہ آیات میں بدنی جہاد کا ذکر تھا ان آیات میں مالی جہاد کا ذکر ہے یعنی جو جان سے کفر وشرک کے فتنہ وفساد کا مقابلہ کر سکے وہ اپنی جان سے کرے اور جو مال سے مقابلہ کر سکتا ہے وہ مال سے مقابلہ کرے۔ خدا کی راہ میں جان کی ضرورت ہو تو جان پیش کرو مال کی ضرورت ہو تو مال پیش کرو اور خدا کی راہ میں جو خرچ کر سکتے ہو وہ خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت اور تباہی میں نہ ڈالو۔ یعنی خدا کی راہ میں جان اور مال خرچ کرنے سے دریغ نہ کرو۔ خدا کی راہ میں جان اور مال سے بخل کرنا اپنے کو تباہی میں ڈالنا ہے۔ اگر تم جہاد کو چھوڑ بیٹھو تو تمہارا دشمن تم پر غالب آ جائے گا اور پھر تم ہلاک اور تباہ ہو جاؤ گے معلوم ہوا کہ جہاد میں جانا ہلاکت اور تباہی نہیں بلکہ جہاد کو چھوڑ بیٹھنا ہلاکت اور تباہی ہے۔ اور نیکی کرو یعنی اپنے اعمال واقوال واحوال کو خوب صورت بناؤ یا یہ معنی کہ اپنی جانوں پر احسان کرو کہ خدا کی راہ میں خرچ کرو خدا کی راہ میں خرچ کرنا اپنے ہی اوپر احسان کرنا ہے یا یہ معنی ہیں کہ ہر عبادت اور ہر عمل اس طرح کرو کہ گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔

﴿اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ﴿۱۴﴾﴾ (العلق) **ترجمہ:** "کیا انسان کو یہ علم نہیں ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔"

بے شک اللہ نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

فائدہ: ﴿بِاَیْدِیْكُمْ﴾ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی حکم عدولی نہ کرو جو تمہاری

ہلاکت کا باعث بنے البتہ اگر بے مقصد اور بے اختیار کوئی غلطی ہو جائے تو معاف ہے۔ (روح المعانی)

ابوداؤد اور ترمذی میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے جب اسلام کو فتح دی تو ہم آپس میں سرگوشی کرنے لگے کہ اب تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دے دیا (یعنی اب چنداں جہاد کی ضرورت نہیں) لہٰذا ہمارے جو مال لڑائیوں میں پہلے تباہ ہو چکے ہیں ان کی کچھ دیکھ بھال کر لیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ہمیشہ جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ قسطنطنیہ کے جہاد میں شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی شہر پناہ کے نیچے مدفون ہوئے۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے پھر اگر تم روکے گئے تو جو میسر ہو

الْهَدْيِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ

قربانی بھیجو اور حجامت نہ کرو سر کی، جب تک پہنچ نہ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر پھر جو کوئی

كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ

تم میں مریض ہو یا اس کو دکھ دیا اس کے سر نے، تو بدلا دیوے روزے

اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۪ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى

یا خیرات یا ذبح کرنا پھر جب تم کو خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ لیوے عمرہ ملا کر

الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

حج کے ساتھ تو جو میسر ہو قربانی پہنچاوے پھر جس کو پیدا نہ ہو تو روزہ تین دن کا

اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ

حج کے وقت میں اور سات دن جب پھر کر جاؤ یہ دس ہوئے پورے یہ

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ

اس کو ہے جس کے گھر والے نہ ہوں رہتے مسجد الحرام پاس اور ڈرتے رہو اللہ سے اور

اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع ۲۴ ۸/۸

جان رکھو اللہ کا عذاب سخت ہے۔

حکم یازدہم متعلق حج وعمرہ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ ... الیٰ ... اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾﴾

ماہِ صیام کے بعد حج کے مہینے شروع ہوتے ہیں اس لیے روزوں کے بعد حج کا ذکر فرمایا اور پھر حج کی مناسبت سے حج کے مہینوں میں قتل وقتال کا حکم ذکر فرمایا اب پھر حج اور عمرہ کے بقیہ احکام کو بیان فرماتے ہیں۔ نیز حج مبرور وعمرہ اعلیٰ ترین اعمال برّ میں سے ہے اور انفاق فی سبیل اللہ تو احسان الی العباد کا بہترین محل ہے جس کا پہلی آیت میں ذکر ہو چکا ہے۔

﴿وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾﴾

چنانچہ فرماتے ہیں اور حج اور عمرہ کو خاص اللہ کے لیے پورا کرو نہ تو شروع کر کے درمیان میں چھوڑو اور نہ حج کا احرام باندھ کر اس کو فسخ کر کے عمرہ بناؤ جو شروع کیا ہے اسی کو پورا کرو اور حج اور عمرہ کے آداب وسنن کو پورا پورا ملحوظ رکھو بغیر اس کے حج اور عمرہ ناتمام رہے گا اور حج اور عمرہ کا تمام سفر خالص اللہ کے لیے ہو۔ بغیر اخلاص کے عبادت میں حسن * پیدا نہیں ہوتا اور سفر حج میں انفاق فی سبیل اللہ اور احسان سے دریغ نہ کرو سفر حج وعمرہ میں خیرات کرنے سے اضعافا مضاعفہ اجر ملتا ہے۔ پس اگر احرام باندھنے کے بعد تم اس حج اور عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیئے جاؤ کہ جس کے تمام کرنے کا تم کو حکم دیا گیا ہے اور کسی دشمن یا مرض یا خرچ کے ختم ہو جانے کی وجہ سے یا اور کسی عذر کے پیش آ جانے کی وجہ سے تم بیت اللہ تک نہ پہنچ سکو، تو ایسی حالت میں حکم یہ ہے کہ فی الحال حج اور عمرہ کو ملتوی کرو اور احرام سے حلال ہونے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرو کہ جو قربانی تم کو میسر آئے اُونٹ یا گائے یا بکری کی اور بکری ادنیٰ درجہ ہے اس کو سرزمین حرم کی طرف بھیجو تا کہ وہ قربانی حرم میں ذبح کی جائے اور سر منڈا کر اس وقت تک احرام کھول کے حلال نہ ہو جب تک کہ وہ قربانی کا جانور اپنے خاص موقع اور محل پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے اور ہدی کے ذبح کا محل اور موقع حرم ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴿۳۳﴾﴾ (الحج) وَ قَالَ اللّٰہ تعالیٰ: ﴿هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ وجہ اس کی یہ ہے کہ خون بہانا اس وقت تک عبادت نہیں جب تک کہ کسی خاص مکان یا خاص زمان میں نہ ہو۔ چونکہ یہ زمانہ قربانی کا نہیں اس لیے مکان میں بھیجنا ضروری ہوا۔ اس بناء پر محصر کے لیے یہ واجب ہوا کہ اپنی ہدی کو حرم میں بھیجے اور ذبح کے لیے کوئی دن مقرر کر لے تا کہ جب وہ دن آئے تو اس دن سر منڈا کر حلال ہو جائے اور اس فوت شدہ حج اور عمرہ کی بعد میں قضا کرے۔ پھر اگر تم میں سے کوئی مریض ہو جائے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بیماری اور تکلیف کی وجہ سے قبل از وقت ہی سر منڈانا چاہے تو اس کے لیے اجازت ہے۔ مگر اس پر اس جنایت اور تقصیر کا فدیہ اور بدلہ واجب ہے اس طرح سے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو صدقہ اور خیرات دے اور فی مسکین نصف صاع گیہوں یعنی جو صدقۂ فطر کی مقدار ہے وہ دے یا کسی جانور کی قربانی دے جس کا اعلیٰ درجہ اُونٹ ہے اور اوسط درجہ گائے اور ادنیٰ درجہ بکری ہے۔ پس جب تم خاطر جمع ہو جاؤ یعنی احصار سے تم کو امن حاصل ہو جائے یا یہ کہ شروع ہی سے تم مامون اور بے خوف ہو تو جو شخص ایام حج میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر نفع حاصل کرنا چاہے یعنی یہ چاہے کہ حج کے زمانہ میں حج بھی کر لوں اور عمرہ بھی کر لوں خواہ دونوں کا احرام ساتھ باندھے یا یکے بعد دیگرے تو

---

* اس لفظ سے گزشتہ آیت ﴿وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

بیک وقت ان دو عبادتوں سے متمتع اور منتفع ہونے کے شکر میں اس کے ذمہ قربانی واجب ہے جو بھی میسر ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی کہ حج اور عمرہ دونوں سے بہرہ مند ہوا اس نعمت کے شکر میں ایک ہدی واجب ہے جیسی بھی میسر ہو اور جس شخص نے فقط حج یا فقط عمرہ کیا تو اس پر یہ ہدی واجب نہیں۔ پس جو شخص ان ایام میں حج اور عمرہ دونوں سے بہرہ مند ہو لیکن ناداری کی وجہ سے اس کو ہدی میسر نہ آئے تو اس کے ذمہ تین روزے تو زمانۂ حج میں واجب ہیں۔ جن کا آخری دن نویں تاریخ ذی الحجہ ہے اور اگر اس سے پہلے ہی تین روزے رکھ لے تو وہ بھی بالاجماع جائز ہیں اور ان تین کے علاوہ سات روزے جب رکھو کہ جب تم حج سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس ہونے لگو۔ پس یہ پورے دس دن کے روزے ہوئے اور زمانہ حج میں عُمرہ اور حج کو ملا کر متمتع اور منتفع ہونے کی یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو مسجد حرام کے قرب و جوار اور اس کے آس پاس رہنے والے نہ ہوں یعنی حدود حرم اور حدودِ مواقیت سے باہر کے رہنے والے ہوں اور جو لوگ حدود حرم کے رہنے والے ہیں وہ صرف افراد کریں یعنی فقط حج کا احرام باندھیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو مبادا کہ حالت احرام میں کوئی جنایت کر بیٹھو۔ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں۔ احرام کی حالت، دربار کی حاضری کی علامت ہے اور دربار میں حاضر ہو کر جنایت اور معصیت کا مرتکب ہونا سخت جرم ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ

حج کے کئی مہینے ہیں معلوم پھر جس نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے پردہ ہونا نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور

لَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ

نہ جھگڑا کرنا حج میں اور جو کچھ تم کرو گے نیکی اللہ کو معلوم ہو گی

اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي

اور خرچ راہ لیا کرو کہ خرچ راہ میں بہتر ہے گناہ سے بچنا اور مجھ سے ڈرتے رہو اے

الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ

عقلمندو کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَ

پھر جب طواف کو چلو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اس کو

اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

یاد کرو جس طرح تم کو سکھایا اور تم تھے اس سے پہلے راہ بھولے

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں اور گناہ بخشواؤ اللہ سے اللہ ہے

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ

بخشنے والا مہربان پھر جب پورے کر چکو اپنے حج کے کام تو یاد کرو اللہ کو جیسے یاد کرتے تھے

اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ

اپنے باپ دادوں کو، بلکہ اس سے زیادہ یاد۔

تتمۂ احکامِ حج

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ ... الیٰ ... اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ﴾

ربط: گزشتہ آیات میں حج اور عمرہ کے اِتمام کا ذکر تھا مگر چونکہ عمرہ کے لیے کوئی وقت معین نہیں اور حج کے لیے وقت معین ہے۔ نیز حج عمرہ سے افضل ہے۔ اس لیے آئندہ آیات میں اشہرِ حج اور آداب حج کو ذکر فرماتے ہیں (بحر محیط) حج کے احرام اور افعال کا وقت چند مہینے معلوم ہیں۔ شوال اور ذی قعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے باقی اصل ارکان کا وقت یوم عرفہ اور یوم نحر ہے۔ شوال اور ذی قعدہ اور ذی الحجہ یہ خاص فضیلتوں اور برکتوں کے مہینے ہیں اور عشرۂ ذی الحجہ تو اس قدر فضیلت اور برکت والا ہے کہ ایک عشرہ ہی قائم مقام پورے مہینہ کے ہو گیا پس جس شخص نے ان مہینوں میں احرام * باندھ کر اپنے اوپر حج لازم کر لیا تو اس کو چاہیے کہ احرام اور اشہرِ حج کا پورا احترام کرے۔ لہٰذا اُس کو چاہیے کہ نہ کوئی فحش بات زبان سے نکالے اور نہ کوئی گنا کا کام کرے اور نہ رفقاءِ سفر سے کوئی لڑائی اور جھگڑا کرے۔ جب تک حج میں رہے ان باتوں کا خاص طور پر خیال رکھے یہ تو ادنیٰ درجہ ہے کہ رفث اور فسوق اور جدال سے بچا رہے۔ اعلیٰ مرتبہ تو یہ ہے کہ نیک کاموں میں لگے رہو۔ حج کے زمانہ میں نیکی کی تاثیر اور بھی قوی ہو جاتی ہے اور کسی خیر کو معمولی سمجھ کر نہ چھوڑو کوئی معمولی سے معمولی بھی نیکی کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو جان لے گا کہ کس درجہ اخلاص اس کی تہ میں چھپا ہوا ہے اس کے مطابق تم کو اس کی جزاء عطا فرمائے گا اور خیر کے سمجھنے میں غلطی نہ کرنا جیسا کہ یمن کے لوگ حج کو بغیر زادِ راہ لیے آتے ہیں اور اس کو توکل سمجھتے ہیں اور پھر لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں تم کو چاہیے کہ حج کے لیے زادِ راہ لے کر چلو۔ اپنے آپ کو بھیک اور سوال سے بچانا اس خیالی توکل سے کہیں بہتر ہے اور خوب سمجھ لو کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ اور پرہیز گاری ہے اور اپنے آپ کو سوال سے بچانا یہ تقویٰ میں داخل ہے سفرِ آخرت میں اعمال صالحہ

---

* امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احرام کے لیے نیّت کے ساتھ تلبیہ بھی ضروری ہے جیسے نماز میں تکبیر تحریمہ اور امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک فقط قلب سے نیت کرنے کا نام احرام ہے تلبیہ شرط نہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احادیث میں احرام کو لفظ اہلال سے تعبیر کیا ہے اور اہلال کے معنی تلبیہ کے ہیں۔ ۱۲

اور طاعاتِ نافلہ کا توشہ اس درجہ مفید نہیں جتنا کہ تقویٰ کا توشہ مفید ہے اور ہر وقت مجھ سے ڈرتے رہو اے خالص عقل والو۔ عقلِ سلیم کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تقویٰ سے غافل نہ ہو اور بغیر توشہ لیے سفر نہ کرو۔

اباحت تجارت در زمانۂ عبادت:

توشہ لینا تو کیا توکل کے منافی ہوتا زمانۂ حج میں تجارت بھی توکل کے منافی نہیں اس لیے تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم زمانۂ حج میں تجارت کرو اور اللہ کے فضل کو طلب کرو تا کہ وہ تجارت تمہارے لیے موجبِ سہولت و راحت ہو اور تمہاری عبادت میں موجبِ اعانت ہو پھر جب تم میدان عرفات سے لوٹو تو مزدلفہ میں مشعر حرام کے قریب اللہ کو دل اور زبان سے یاد کرو اور اللہ کا ذکر اس طرح کرو جس طرح تم کو ہدایت کی ہے یعنی کفار کی طرح اللہ کے ذکر میں کوئی کلمہ شرک کا نہ ملاؤ۔ خالص اللہ کا ذکر کرو اور تحقیق تم اللہ کی ہدایت اور رہنمائی سے پہلے گمراہوں میں تھے صحیح راستہ ہمارے بتلانے سے تم کو معلوم ہوا پھر ہم تم کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ حج کے بارے میں گمراہوں کے طریقہ پر نہ چلنا صحیح راستہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے اسی طریقہ پر حج کرنا چونکہ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے اور مزدلفہ حدودِ حرم میں ہے اس لیے قریش مکہ نے اپنے لیے یہ طریقہ نکال رکھا تھا کہ مزدلفہ میں ٹھہر جاتے اور عام لوگوں کی طرح عرفات میں نہ جاتے اور یہ کہتے کہ ہم اہل اللہ ہیں اللہ والے ہیں۔ اور اس کے حرم کے رہنے والے ہیں اس لیے حرم سے باہر نہ جائیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ حکم ہوا کہ سب لوگوں کو چاہیے خواہ وہ قریش ہوں یا غیر قریش سب اسی جگہ سے واپس ہوں جہاں سے تمام لوگ واپس آتے ہیں اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے ﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ تم سب اسی جگہ سے لوٹو جہاں سے تمہارے باپ آدم علیہ السلام بھولنے والے واپس ہوئے تھے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام بھی عرفات سے واپس ہوئے تھے اور پھر مزدلفہ آئے اور پھر وہاں سے منیٰ آئے۔

اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کا طریقہ بھی یہی ہے کہ واپسی عرفات سے ہو اور جب عرفات سے واپس ہو تو توبہ اور استغفار کرتے ہوئے واپس ہو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اہل عرفات کی مغفرت کا فرشتوں میں اعلان فرما دیا مگر تم کو چاہیے کہ توبہ اور استغفار سے غافل نہ ہو جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا سلام پھیر کر تین مرتبہ استغفار فرماتے اسی طرح تم کو چاہیے کہ عرفات سے واپسی پر توبہ اور استغفار کرو سابق مغفرت پر مغرور نہ ہو جاؤ عبادت کتنی ہی کامل کیوں نہ ہو مگر ہر حال میں لائق توبہ اور استغفار ہے بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے مہربان ہیں۔ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب حج سے فارغ ہو جاتے تو تین روز منیٰ میں قیام کرتے اور بازار لگاتے اور اپنے آباؤ اجداد کے مفاخر اور مآثر بیان کرتے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور بجائے اس کے اپنے ذکر کا حکم دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: پس جب تم اپنے افعال حج سے فارغ ہو جاؤ رمی جمرہ اور قربانی اور سر منڈا چکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسے ذوق وشوق سے کیا کرو جیسا کہ تم اپنے آباؤ اجداد کا کرتے ہو بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ باپ دادا کا احسان فقط اتنا ہے کہ انہوں نے تم کو پالا اور پرورش کیا مگر وہ تمہارے خالق نہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارا خالق اور مربی بھی ہے جس کی نعمتوں کا شمار ممکن نہیں ایسے متبرک مقامات میں اللہ کو یاد کرنا چاہیے آباء واجداد کا ذکر بے سود ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

پھر کوئی آدمی کہتا ہے اے ربّ ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کو آخرت

مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

میں کچھ حصّہ نہیں اور کوئی ان میں کہتا ہے اے ربّ ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی

وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ

اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے یہ لوگ انہی کو

نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ

ہے کچھ حصہ اپنی کمائی سے اور اللہ جلد لیتا ہے حساب اور یاد کرو کرو اللہ کو کئی

اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ

دن گنتی کے پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو دن میں اس پر نہیں گناہ

مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

اور جو کوئی رہ گیا اس پر نہیں گناہ جو کوئی ڈرتا ہے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو

اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

کہ تم اسی پاس جمع ہو گے۔

اہلِ ذکر اور اہلِ دُعا کی اقسام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا... الٰى... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کا حکم تھا اب اہلِ ذکر کی اقسام بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے اور اس سے دعا مانگنے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جو فقط دنیا کے طالب ہیں۔ یہ لوگ فقط دُنیاوی عزت اور وجاہت اور فقط مال و دولت کی دعا مانگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصّہ نہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں کہ جو دُنیا اور آخرت دونوں کی خوبی اور بھلائی خدا تعالیٰ سے مانگتے ہیں ان کو تمام حسنات سے پورا حصہ ملے گا۔ ایک تیسری قسم اور بھی ہے وہ یہ کہ سوائے آخرت کے کچھ نہ مانگتے۔ سو اوّل تو ایسی قسم بہت ہی قلیل اور نادر بلکہ تقریباً معدوم ہے۔ نیز یہ صورت شرعاً بھی پسندیدہ نہیں۔ انسان ضعیف اور ناتواں

ہے دُنیاوی ضرورتوں سے مستغنی نہیں عبدیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جوتی کا تسمہ بھی خدا سے مانگے۔ انسان کو پیدا ہی مانگنے کے لیے کیا ہے۔ نیز انبیاء کرام علیہم السلام کی سنّت بھی یہی ہے کہ تمام دینی اور دنیوی آفتوں سے پناہ مانگے تا کہ سکون اور اطمیناں کے ساتھ اللہ کی عبادت کر سکے۔ نیز اللہ سے مانگنا عزّت ہے اور مخلوق سے مانگنا ذلّت ہے اللہ سے جتنا مانگو گے اتنا ہی زیادہ خدا کے مقرب بنو گے۔ بخلاف مخلوق کے کہ اس سے جتنا مانگو گے اتنا ہی زیادہ اس سے دُور ہو گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: کہ پس بعضے لوگ کوتاہ نظر جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ایسے متبرک اور مقدس مقامات میں فقط دنیا ہی کی دعا مانگتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو جو کچھ دینا ہے وہ دُنیا ہی میں دے دے اس شخص نے اگرچہ ہم کو پکارا اور ہم کو یاد کیا لیکن ہمارے گھر میں آ کر ہم سے ہم کو نہ مانگا بلکہ دنیائے دوں کو مانگا اس لیے اس شخص کو جو کچھ دینا ہو گا وہ ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصّہ نہ ہو گا۔ اور بعضے آخرت کے شیدائی اور فدائی ایسے ہوشیار ہیں کہ دنیا ہی میں آخرت کے طلبگار ہیں اور اپنی دعا میں یہ کہتے ہیں "اے پروردگار! ہم کو دُنیا میں رہتے ہوئے ایسی بھلائی اور نیکی عطا فرما جو ہمارے * وہم و گمان سے بالاتر اور برتر ہو اور تیری خوشنودی اور رضامندی کا ذریعہ ہو اور آخرت میں بھی ہم کو نیکی اور بھلائی عطا فرما" یعنی ثواب اور رحمت سے سرفراز فرما اور عفو اور مغفرت کے ذریعہ ہم کو عذابِ دوزخ سے محفوظ فرما۔ ایسے لوگوں کے لیے دُنیا اور آخرت میں بہت بڑا حصّہ ہے اس چیز سے جو انہوں نے اپنی دعا اور استدعاء اور اعمالِ صالحہ سے کمایا ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں۔ یعنی قیامت قریب ہے تم اس سے غافل نہ ہو اور ایام تشریق میں اللہ کو یاد کرو جو گنتی کے دن ہیں۔ ایام معدودات سے ذی الحجہ کی گیارھویں بارھویں تیرھویں تاریخیں مراد ہیں جن میں تینوں جمروں کی رمی ہوتی ہے بخلاف دسویں تاریخ کے کہ اس میں فقط جمرۂ عقبہ کی رمی ہوتی ہے۔ اس دسویں تاریخ کے علاوہ تین دن مراد ہیں۔ ان دنوں میں منیٰ میں قیام کا حکم ہے اور یہ بھی حکم ہے کہ نمازوں کے بعد تکبیر کہو اور رمی جمار کے وقت بھی تکبیر کہو اور قربانی کے وقت بھی تکبیر کہو اور دیگر اوقات میں بھی کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور تکبیر پڑھو۔ پس جو شخص منیٰ سے کوچ کرنے میں جلدی کرے اور کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد صرف دو دن منیٰ میں ٹھہر کر بارھویں کو مکہ واپس آ جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اس کا حج پورا ہو گیا حج کے ثواب میں کوئی کمی نہ رہے گی اور جو شخص منیٰ میں ٹھہرا رہا اور تیرھویں تاریخ کی رمی کر کے مکہ واپس آیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ آیت اہلِ جاہلیت کے رد کے لیے نازل ہوئی بعض لوگ جلدی چلے جانے والے کو گنہگار سمجھتے تھے اور بعضے تاخیر کرنے والوں کو گنہگار سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہ تعجیل میں گناہ ہے اور نہ تاخیر میں اگرچہ اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ تین دن قیام کر کے واپس ہو۔ بہر حال تعجیل اور تاخیر ہر صورت میں حج مکمل ہو گیا اس کو حج کا پورا ثواب ملے گا اور تمام گناہ اس کے معاف ہو جائیں گے۔ مگر یہ فضیلت اور یہ رعایت اس شخص کے لیے ہے جو اپنے حج میں رفث اور فسوق اور جدال اور دیگر افعال ممنوعہ سے بچتا رہا اور تقویٰ کے لیے حج کی کوئی خصوصیت نہیں ہر کام میں ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع کیے جاؤ گے اور تمام اعمال کا حساب دینا ہو گا۔

فائدہ جاننا چاہیے کہ آیت شریفہ میں ایام معدودات سے علاوہ یوم النحر (یعنی دسویں تاریخ ذی الحجہ کے علاوہ) تین دن مراد ہیں جن کو ایّام تشریق بھی کہتے ہیں یعنی گیارھویں اور بارھویں اور تیرھویں تاریخیں مراد ہیں اور ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ میں دسویں تاریخ کے

---

* یہ ترجمہ ﴿حَسَنَةً﴾ کی تنوین تنکیر کا ہے۔ نکرہ وہ ہے جو معلوم نہ ہو معرفہ اس کی ضد ہے۔ ۱۲

علاوہ دو دن یعنی گیارھویں اور بارھویں ذی الحجہ مراد ہیں۔ حضرات اہل علم کے لیے امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پیش کرتے ہیں:

"امر الله سبحانه و تعالیٰ عباده بذكره فی الايام المعدودات و هی الثلاثة التی بعد يوم النحر وليس يوم النحر منها لاجماع الناس انه لا ينفر احد يوم النفر و هو ثانے يوم النحر ولو كان يوم النحر فی المعدودات لساغ ان ينفر من شاء متعجلا يوم النفر لانه قد اخذ يومين من المعدودات خرّج الدارقطنی والترمذی و غيرهما عن عبد الرحمن بن يعمر الديلی ان ناسا من اهل نجد اتوا رسول الله ﷺ و هو بعرفة فسألوه فامر منادیا فنادیٰ الحج عرفة فمن جاء ليلة جمع قبل طلوع الفجر فقد ادرك ايامُ منی الثلاثة فمن تعجل فی يومين فلا اثم عليه ومن تاخر فلا اثم عليه ای من تعجل من الحاج فی يومين من ايام منی صارمقامه بمنی ثلاثة بيوم النحر و يسقط عنه رمی اليوم الثالث ومن لم ينفر منها الا فی آخر اليوم الثالث حصل له بمنی مقام اربعة ايام من اجل يوم النهر ... الخ.

(كذافی احكام القرآن للقرطبی ج ۳ ص ۲)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ

اور بعضا آدمی ہے کہ خوش آوے تجھ کو بات اس کی دنیا کی زندگی میں اور گواہ پکڑتا ہے اللہ

عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ

کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب پیٹھ پھیرے، دوڑتا پھرے ملک میں

لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

کہ اس میں ویرانی کرے اور ہلاک کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ خوش نہیں رکھتا فساد کرنا

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ

اور جو کہے اللہ سے ڈر تو کھینچ لاوے اس کو غرور گناہ پر پھر بس ہے اس کو دوزخ

وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ

اور بُری تیاری ہے اور کوئی آدمی ہے جو بیچتا ہے اپنی جان تلاش کرتا

مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

خوشی اللہ کی اور اللہ شفقت رکھتا ہے بندوں پر

تقسیم دیگر

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا . . . الیٰ . . . وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾

ربط: گزشتہ آیات میں اغراض دعا کے اعتبار سے تقسیم کا ذکر تھا اب ان آیات میں اخلاص اور نفاق کے اعتبار سے لوگوں کی تقسیم بیان فرماتے ہیں۔ پہلے ایک منافق کا حال بیان کرتے ہیں جس کا نام اخنس بن شریق تھا۔ یہ شخص بڑا فصیح اللسان اور شیریں بیان اور حسین اور خوبصورت تھا۔ جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بڑی باتیں بناتا اور قسمیں کھاتا کہ مجھ کو حضور ﷺ سے محبت ہے اور جب آپ کے پاس سے جاتا تو فساد پھیلاتا، لوگوں کی کھیتیوں کو جلاتا اور مویشیوں کو ہلاک کرتا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور بعضا آدمی ایسا چرب لسان ہے کہ جب وہ دُنیاوی اغراض اور مقاصد کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو آپ ﷺ کو بھی اس کی بات حیرت اور تعجب میں ڈال دیتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو اپنے دل کی بات پر گواہ بناتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا دل اسلام اور آپ کی محبت سے لبریز ہے اور حالانکہ دل اس کا عداوت سے لبریز ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے ایسی شدید عداوت اور شدید خصوصیت رکھتا ہے کہ جھگڑنے میں کسر اٹھا نہیں رکھتا ایسی شدید خصومت سے صاف ظاہر ہے کہ دل میں محبت کا نام ونشان بھی نہیں یہ حال تو دلی عداوت اور خصومت کا ہوا اور شرارت کا یہ حال ہے کہ جب آپ ﷺ کی مجلس سے پشت پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے کہ زمین میں فساد اور تباہی پھیلائے اور کھتوں اور مویشیوں کو ہلاک کرے اگر حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا محب ہوتا تو ہرگز ایسے کام نہ کرتا معلوم ہوا کہ محب نہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کا مفسد ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے اور ایسا شخص تو اللہ کا محب ہو ہی نہیں سکتا اس لیے کہ اس مغرور کو خدا تعالیٰ کی کوئی پرواہ نہیں اس کا حال تو یہ ہے کہ جب اس سے کہا جاتا ہے اللہ سے ڈر اور فساد نہ مچا اور لوگوں کی کھیتیوں اور مویشیوں کو مت برباد کر تو نخوت اور بڑائی اس کو اور گناہ پر آمادہ کرتی ہے اور ضد میں آکر اور زیادہ فساد برپا کرنے لگتا ہے پس سمجھ لو کہ جس کو تقویٰ اور خدا کے خوف کی نصیحت کافی نہ ہو تو اس کو جہنم ہی کفایت کرے گی۔ اور اس عزت اور نخوت کے بدلہ میں ہمیشہ کی ذلت میں مبتلا رہے گا اور جہنم کا یہ ذلت آمیز فرش بہت ہی بُرا فرش ہے اب آئندہ آیت میں ایک کامل الایمان مخلص کا ذکر فرماتے ہیں یعنی صہیب رضی اللہ عنہ رومی کا جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو قریش نے آکر گھیر لیا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تم کو اپنا تمام مال دے دیتا ہوں تم مجھ کو مدینہ جانے دو۔ قریش نے اس کو منظور کیا اس طرح حضرت صہیب رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے اور حضور پُرنور ﷺ سے تمام واقعہ بیان کیا حضور ﷺ بہت خوش ہوئے اور یہ فرمایا:

((ربح بيعك يا ابا يحيٰى)). "اے ابو یحییٰ تیری بیع بہت فائدہ مند ہوئی۔"

اور اس کے بعد فرمایا کہ تیرے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ . . . الخ﴾ یعنی اور بعض لوگ ایسے عاقل اور دانا ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ عزت اللہ کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی اور تذلل اور خاکساری سے حاصل ہوتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جان کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب اور تلاش میں کرتے ہیں اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں پر جو اس کی راہ میں اپنی جان بھی دے ڈالیں بڑے ہی مہربان ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سچے محب اور مخلص ہیں ان کو اگر خدا تعالیٰ کے تقویٰ کی نصیحت کرے تو ان کا عجب حال ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ کسی نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا ﴿ اِتَّقِ اللّٰہَ ﴾ "اللہ سے ڈرو" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً تواضع سے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا۔

ہارون رشید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی ایک سال تک اپنی ضرورت لے کر ہارون رشید رحمۃ اللہ علیہ کے دروازہ پر حاضر ہوتا رہا۔ حاجت براری نہ ہوئی۔ ایک دن ہارون رشید رحمۃ اللہ علیہ محل سے برآمد ہوئے کہیں جا رہے تھے کہ یہودی سامنے سے آ کر کھڑا ہو گیا اور یہ کہا:

اِتَّق اللہ یا امیر المؤمنین. "اے امیر المؤمنین اللہ سے ڈرو"

ہارون رشید رحمۃ اللہ علیہ یہ سنتے ہی فوراً سواری سے اُتر پڑے اور وہیں زمین پر سجدہ کیا۔ سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد حکم دیا کہ اس یہودی کی حاجت پوری کی جائے۔ چنانچہ اسی وقت اس کی حاجت پوری کر دی گئی۔ جب محل واپس ہوئے تو کسی نے کہا: اے امیر المؤمنین! آپ ایک یہودی کے کہنے سے فوراً زمین پر اتر پڑے۔ فرمایا: کہ یہودی کے کہنے کی وجہ سے نہیں اُترا بلکہ حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ ارشاد یاد آیا۔ ﴿ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ ﴾ اس لیے سواری سے اترا اور سجدہ کیا۔ (تفسیر قرطبی ج ۳ ص ۱۹)

فائدہ: ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ ﴾ میں علماء کے دو قول ہیں ایک یہ کہ یشری سے بیع یعنی فروخت کرنے کے معنی مراد ہیں اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعضے لوگ اپنی جان کو خدا کے ہاتھ بمعاوضۂ جنت فروخت کر دیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یشری بمعنی یشتری یعنی خریدنے کے معنی میں ہے اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض لوگ اعمال صالحہ کے اپنی جان کو خرید لیتے ہیں یعنی خطرات اور خوفناک چیزوں سے اپنی جان کو بچا لیتے ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ یشری سے بیع کے معنی مراد ہیں۔ بعضے لوگ ایسے ہیں کہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے وہ جان پھر انہیں کے قبضہ میں رہنے دیتے ہیں اور جان کی حفاظت انہی کے سپرد کر دیتے ہیں کہ یہ ہماری امانت ہے بغیر ہماری اجازت کے اس میں کوئی تصرف نہ کرنا۔ نیز بندہ کا اپنی جان کو خدا کے ہاتھ فروخت کرنا اور اللہ کا اس کو خریدنا محض ظاہر کے اعتبار سے ہے کہ ظاہراً بندہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی جان کا مالک ہوں ورنہ فی الحقیقت سب چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ ﴾ (التوبہ:۱۱۱) کون کر عوام تو خوش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے بمعاوضہ جنّت ہماری جانیں خرید لیں اب ہم کو اس کے عوض جنت ملے گی مگر خواص شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ ہم میں دعویٰ مالکیّت کا تھا جب ہی تو ﴿ اشْتَرٰی ﴾ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ	
اے ایمان والو! داخل ہو مسلمانی میں پورے پورے اور مت چلو قدموں پر	
الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا	
شیطان کے وہ تمہارا صریح دشمن ہے پھر اگر ڈگنے لگو بعد اس کے کہ	
جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ یَنْظُرُوْنَ	
پہنچے تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا کیا لوگ یہی انتظار رکھتے ہیں؟	

إِلَّآ أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ

کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے اور فیصل ہووے

الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢١٠﴾ ع ۲۵ ع ۱۴ ۹

کام اور اللہ کی طرف رجوع ہیں سب کام

حکم دوازدہم۔ استسلامِ تام وقبول جمیع احکام اسلام

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا... الیٰ... وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢١٠﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں ایمان اور اخلاص کا ذکر تھا۔ اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان اور اخلاص کا مقتضٰی یہ ہے کہ دین اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور اسلام میں داخل ہونے کے بعد دین سابق یعنی یہودیت اور نصرانیت کی رعایت سے کوئی کام نہ کرو ایک دین میں داخل ہونے کے بعد دوسرے دین کی طرف بھی نظر رکھنا یہ اخلاص کے منافی ہے۔ نیز جو شخص [1] اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کرے اور اس کی رضا اور خوشنودی کا طلب گار ہو اور اس کی اُس خاص رحمت ورأفت کا اُمیدوار ہو جو عباد مخلصین پر نازل ہوتی ہے تو اس کو چاہیے کہ اپنے اعمال میں قرآن کے بعد توریت اور انجیل کی رعایت نہ کرے ناسخ کے ہوتے ہوئے منسوخ کی رعایت، بدعت اور ضلالت ہے جو باعث عقوبت ہے۔ یہ آیت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر علماء یہود کے بارے میں نازل ہوئی کہ اسلام لانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ہم کو احکام کی تعمیل کے ساتھ اس کی بھی اجازت دے دی جائے کہ شریعتِ موسویہ کے مطابق ہفتہ کی تعظیم اور اُونٹ کے گوشت اور دودھ سے پرہیز کرتے رہیں اور توریت کی بھی تلاوت کرتے رہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسلام میں ظاہراً اور باطناً، اعتقاداً اور عملاً پورے پورے داخل ہو جاؤ اور اسلام میں کسی اور چیز کو ہرگز نہ ملاؤ۔ مبادا یہودیت اور نصرانیت کی آمیزش سے اسلام کے آب طہور کے رنگ یا بو یا مزہ میں کہیں فرق آ جائے اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو ناسخ کے بعد منسوخ کی رعایت کرنا شیطان کے نشان قدم پر چلنا ہے۔ تحقیق وہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے کہ جو چیز دین نہیں اس کو دین بتا کر تم سے کرانا چاہتا ہے اور بدعت کی حقیقت بھی یہی ہے کہ جو چیز دین نہ ہو اس کو دین سمجھ لیا جائے ان مومنین اہل کتاب کے دل میں شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ شریعتِ موسویہ میں ہفتہ کی تعظیم واجب ہے اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں۔ اور اسی طرح شریعت موسویہ میں اُونٹ کا گوشت اور دودھ حرام ہے اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں۔ اس لیے اگر ہم بدستور عملاً ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اعتقاداً اس کو واجب نہ سمجھیں اور اُونٹ کے گوشت اور دودھ کو عملاً ترک کر دیں اور اعتقاداً اس کو حلال سمجھتے رہیں تو اس میں شریعتِ محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا اور شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے گی اور وہ عمل زیادہ

---

[1] اس بیان میں ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ﴾ اور ﴿ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ﴾ اور ﴿وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

موجب ثواب ہوگا۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس خیال کی اصلاح فرمائی کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد صرف اسلام ہی کی رعایت سے عمل کرنا فرض اور لازم ہے اور جو امر اسلام میں قابل رعایت نہیں، دین سمجھ کر اس کی رعایت کرنا بدعت ہے جو شیطان کا وسوسہ ہے اور ایک دین میں داخل ہونے کے بعد گزشتہ دین کی طرف نظر رکھنا اخلاص کے منافی ہے پس اگر تم واضح اور روشن احکام آنے کے بعد بھی پھسلے اور شیطان کے قدموں پر چلے اور شریعت محمدیہ کے احکام کے اتباع اور تعمیل میں اعتقادی اور باطنی طور پر یہودیت اور نصرانیت کی رعایت کی تو خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب اور زبردست ہے ایسے لوگوں کو سخت سزا دے گا جو ظاہر تو یہ کریں کہ ہم شریعت محمدیہ پر عامل ہیں اور باطن میں یہودیت یا نصرانیت ملحوظ رہے اور بڑی حکمت والا ہے کہ ایسے لوگوں سے انتقام میں جلدی نہیں فرماتا کسی حکمت سے مہلت دے رکھی ہے۔ کیا یہ لوگ جو اپنے باطنی انکار کو ظاہری اقرار کے پردہ میں چھپاتے ہیں اب صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ قیامت قائم ہو۔ اور اوّلین اور آخرین جمع ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کے حساب و کتاب اور جزاء اور سزا کے لیے خود سفید اَبر کے سائبانوں میں نزول اجلال فرمائیں اور فرشتے بھی ساتھ آئیں اور ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا اور سزا دے دی جائے اور اس میں شک اور تردّد کیا ہے تمام اُمور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں نے اپنے باطنی انکار کو ظاہری اقرار کے پردہ میں چھپایا اس لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا قہر، مہر کے پردہ یعنی سفید بادل کی شکل میں نمودار ہوگا۔

فائدہ ① : حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اور فرشتوں کے آنے کا واقعہ قیامت کے دن پیش آئے گا۔ جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے۔

﴿ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَ جِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ ﴾ (الفجر)

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی :

﴿ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ ؕ ﴾ (الانعام:۱۵۸)

((وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یجمع اللہ الاوّلین والاٰخرین لمیقات یوم معلوم قیاما شاخصة ابصارهم الی السمآء ینتظرون فصل القضاء وینزل اللہ فی ظلل من الغمام من العرش الی الکرسی اخرجه ابن مردویه)). (تفسیر ابن کثیر)

تَرجَمہ: "ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اوّلین اور آخرین کو جمع کریں گے۔ تمام لوگ آسمان کی طرف کھڑے دیکھتے ہوں گے اور فیصلہ کے منتظر ہوں گے۔ اتنے میں اللہ تعالیٰ اَبر کے سائبانوں میں عرش سے کرسی کی طرف نزول فرمائیں گے۔" (ابن مردویہ)

اور اسی قسم کا مضمون ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام شفاعت کرنے سے عذر فرماویں گے اور شفاعت کی نوبت مجھ تک پہنچے گی تو میں کہوں گا کہ ہاں ہاں میں شفاعت کے لیے ہوں تمہاری شفاعت کروں گا اور جا کر عرش کے نیچے سجدہ میں گروں گا۔ اور درخواست کروں گا کہ حق تعالیٰ بندوں کے درمیان فصل قضاء کے لیے تشریف لائیں۔

((فیشفعه الله ویاتی فی ظلل من الغمام بعد ما تشقق السمآء الدنیا و ینزل من فیها من الملائکة)).

ترجمہ: "پس اللہ تعالیٰ آپؐ کی درخواست منظور فرمائیں گے اور آسمان کے پھٹنے کے بعد ابر کے سائبانوں میں نزولِ اجلال فرمائیں گے اور فرشتے بھی اُتریں گے۔"

اور عرش بھی اُترے گا اور فرشتے یہ تسبیح پڑھتے ہوں گے:

((سبحان ذی الملك و الملكوت سبحان ذی العزة والجبروت سبحان الحی الذی لا یموت سبحان الذی یمیت الخلائق ولا یموت سبوح قدوس رب الملائکة والروح سبوح قدوس سبحان ربنا الاعلی سبحان ذی السلطان والعظمة سبحانه ابدًا ابدًا)). (تفسیر ابن کثیر)

فائدہ ②: جن آیات اور احادیث میں حق جل شانہٗ کا آنا اور اُترنا اس قسم کے اُمور کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں علماء سلف رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ ان کی تحقیق اور تفتیش میں نہ پڑے اور بلا تشبیہ اور بلا تمثیل کے ان پر ایمان لائے جس طرح اس کی ذات بے چون و چگون ہے اسی طرح اس کے افعال بھی بے چون و چگون ہیں۔ اور علماء خلف رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ وہ عوام کے عقائد کی حفاظت کے لیے کوئی مناسب تاویل کر لیتے ہیں۔ تاکہ ظاہر الفاظ سے عوام کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مثلاً ﴿اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ اللّٰهُ﴾ میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم یا قہر کا آنا مراد ہے وغیر ذالک۔ اور حضرات صوفیۂ کرام رحمۃ اللہ علیہم یہ فرماتے ہیں کہ ﴿يَاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی تجلیات مراد ہیں۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ﴿ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ میں متجلی ہوگا۔ جس طرح کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کی تجلی کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ (الاعراف: ۱۴۳) بے چون و چگون تھی اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی تجلی ابر کے سائبانوں میں ہوگی اور جس طرح آنکھ کی پتلی میں آسمانوں کا جلوہ۔ اور الفاظ کے پردہ میں معانی کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اَبر کے سائبانوں میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا بے چون و چگون جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زید آ گیا۔ اور یہ بات میرے خیال میں آ گئی اور صبح آ گئی۔ آنا سب جگہ پایا جاتا ہے مگر حقیقت ہر جگہ مختلف ہے۔ آنا آنے والے کے تابع ہے۔ زید کا آنا اور قسم کا ہے اور کسی بات کا دل میں آنا اور قسم کا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ کے آنے کو سمجھو کہ اس کا آنا اس کی شان اور عظمت کے مطابق ہوگا جیسے حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات بے چون و چگون ہے اسی طرح اُس کا آنا بھی بے چون و چگون ہوگا۔

فائدہ ③: جب کہ دین موسوی کی رعایت سے اُونٹ کے گوشت کا ترک کرنا اتباع شیطانی ہوا تو سامریانِ ہند کی رعایت سے ذبیحۂ بقر کا ترک کرنا جو اعظم شعائرِ اسلام میں سے ہے بدرجہ اولیٰ اغواء شیطانی ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ

پوچھ بنی اسرائیل سے کتنی دیں ہم نے ان کو آیتیں واضح اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکی اُس کو تو اللہ کی مار سخت ہے۔ رجھایا ہے

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ

منکروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں ایمان والوں سے اور

الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ

پرہیز گار ان سے اوپر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی دیوے جس کو چاہے بے شمار

حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ

تھا لوگوں کا دین ایک پھر بھیجے اللہ نے نبی

مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ

خوشی اور ڈر سناتے اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصل کرے

بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ

لوگوں میں جس بات میں جھگڑا کریں اور کتاب میں جھگڑا ڈالا نہیں مگر انہوں نے

اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ

جن کو ملی تھی بعد اس کے کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے پھر اب راہ دی اللہ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ

نے ایمان والوں کو اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ چلا دے

مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا

جس کو چاہے سیدھی راہ کیا تم کو خیال ہے کہ چلے جاؤ گے

الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ

جنت میں اور ابھی تم پر آئے نہیں احوال ان کے جو آگے ہو چکے تم سے پہنچی ان کو

الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے

مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

کب آوے گی مدد اللہ کی سُن رکھو مدد اللہ کی قریب ہے

تنبیہات وتہدیدات

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿سَلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ ... الیٰ ... اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں دلائل واضحہ آ جانے کے بعد حق کی مخالفت پر تنبیہ اور تہدید تھی۔ آئندہ آیات میں اور چند تنبیہات اور تہدیدات کو ذکر فرماتے ہیں کہ حق جل شانہٗ کے صریح اور واضح حکم کے بعد عدول حکمی موجب عذاب ہے اگر تم کو اس میں کچھ تردد ہے تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ ہم نے ان کو کتنی واضح اور روشن دلیلیں عطا کی تھیں تا کہ حق واضح اور روشن ہو جائے۔ یہ حق جل شانہٗ کی ایک نعمت کبریٰ تھی اس نعمت کا شکر اور حق یہ تھا کہ دل وجان سے حق کو قبول کرتے۔ لیکن دیدہ ودانستہ حق سے انحراف کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عذاب میں مبتلا ہوئے اور طرح طرح کی ذلتیں دیکھنی پڑیں جیسا کہ پہلے پارہ میں اُن کی شناعتوں اور عقوبتوں کا بیان ہوا اور ہمارا قانون یہی ہے کہ جو شخص اللہ کی نعمت کو بعد اس کے کہ وہ نعمت خود اس کے پاس پہنچ چکی ہے۔ یعنی وہ نعمت بلا مشقت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملی ہے۔ پس جو شخص ایسی نعمت کو کفر اور معصیت سے بدلے اور اس کے انعامات اور احسانات کی ناشکری کرے تو اللہ تعالیٰ بھی نعمت کو نِقْمَتْ سے اور انعام کو انتقام سے بدل دیتے ہیں۔ پس تحقیق اللہ تعالیٰ سخت عذاب والے ہیں اور ایسے ناشکرے اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو سخت سزا دی جائے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا پر ایسے شیدا اور فریفتہ ہوئے ہیں کہ دنیاوی زندگانی ان کی نظروں میں اس درجہ مزین اور خوب صورت کر دی گئی ہے کہ آخرت ان کو بدصورت معلوم ہونے لگی اس لیے اپنی ظاہری عیش وعشرت کے نشہ میں اُن لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں جو آخرت پر شیدا اور فریفتہ ہیں اور ان لوگوں سے تمسخر کرتے ہیں جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ ایمان اور تقویٰ کے لباس فاخر سے آراستہ ہیں قیامت کے دن یہی لوگ ان کافروں سے بالا اور بلند ہوں گے۔ جن کو یہ کافر دُنیا میں ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دے دیتا ہے۔ دیکھ لو انہیں فقراء مہاجرین کو جن کو تم حقیر وذلیل سمجھتے تھے کس طرح روم اور فارس کی سلطنت کا مالک بنا دیا معلوم ہوا کہ چند روز کے فانی عیش پر مغرور اور مست ہو کر حق کا انکار کرنا اور اہل حق کو حقیر سمجھنا حماقت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ کے قریب تک تمام لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ سب ایک ہی دین حق پر متفق تھے۔ اور احکام خداوندی پر عمل کرتے تھے۔ دس ۱۰ قرن اسی طرح گذرے اس کے بعد جب لوگ دنیا پر فریفتہ ہوئے اور دنیا ان کو خوب صورت معلوم ہونے لگی تو دنیاوی اور نفسانی اغراض کی بناء پر حق میں اختلاف ڈالا۔ پس حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا تا کہ حق میں کوئی اختلاف نہ ڈالے بلا اختلاف سب مل کر حق پر چلیں اس لیے حق تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا کہ ایمان لانے والوں اور حق کے قبول کرنے والوں کو خوش خبری سنائیں اور حق میں اختلاف ڈالنے والوں کو خدا کے قہر سے ڈرائیں۔ اور ان کے ساتھ حق تعالیٰ نے حق اور سچی کتابیں بھی اُتاریں تا کہ وہ کتابِ الٰہی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے جس حق کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ کتابِ الٰہی کے فیصلہ کو دل وجان سے قبول کرتے اور اس کے حکم کے مطابق اپنے تمام

اختلافات اور نزاعات کو ختم کر دیتے مگر افسوس کہ ان لوگوں نے اسی کتاب میں اختلاف شروع کر دیا کہ جو ان کو اختلاف کے مٹانے اور ختم کرنے کے لیے دی گئی تھی اور یہ اختلاف کسی اشتباہ اور التباس کی بناء پر نہ تھا بلکہ صریح اور واضح احکام اور دلائل آ جانے کے بعد آپس کی ضد اضدی کی بنا پر تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان خود غرضوں اور ہوا پرستوں کو تو اس باہمی اختلاف اور نزاع میں چھوڑ دیا جس کا منشاء سوائے حب دنیا کے اور کچھ نہ تھا۔ اور اُن اہل ایمان کو جن کے قلوب حب دنیا اور حسد وغیرہ سے پاک تھے حق کی راہ دکھلائی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے اور یہ ہدایت محض اس کے لطف اور عنایت سے تھی اور اللہ تعالیٰ مالک اور مختار ہے۔ جس کو چاہے اور جس طرح چاہے سیدھا راستہ بتاتا ہے کسی کو بغیر آیات بینات اور بغیر کسی دلیل و برہان اور بغیر کسی اُستاد اور معلم کے سیدھا راستہ بتلا دیتے ہیں اور کسی کو صاف نشانوں کے بعد بھی گمراہ کر دیتے ہیں۔ ہدایت اس کی ملک ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے لیکن اللہ کی عادت اور سنّت یہ ہے کہ حق کی ہدایت سے اسی کو سرفراز فرماتے ہیں جو شخص دنیا پر فریفتہ نہ ہو اور دنیا کی زینت نے اس کو اپنا گرویدہ اور شیدائی نہ بنا لیا ہو۔ کیونکہ جن کے دل دنیا کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں وہ کبھی حق کو قبول نہیں کرتے اور انبیاء کرامؑ کی ہدایت اور نصیحت کی طرف کان نہیں لگاتے بلکہ ایسے لوگ ہمیشہ اہل حق کو ستاتے ہیں اور طرح طرح کی ایذائیں اُن کو پہنچاتے ہیں۔ اس لیے آئندہ آیت میں مسلمانوں کی تسلی فرماتے ہیں کہ تم اہل باطل اور اہل دنیا کی ایذاؤں سے ہرگز نہ گھبرانا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ سے اہل باطل حضرات انبیاء علیہم السلام اور اہل ایمان کو ایذاء پہنچاتے چلے آئے ہیں، یہ دُنیا دار ابتلاء اور دارِ امتحان ہے۔ یہاں کے چند روزہ مصائب پر نظر نہ کرو صبر پر جو دارِ آخرت میں راحتیں اور نعمتیں ملیں گی ان پر نظر رکھو کیا تم کو یہ گمان ہے کہ جنّت میں بلا محنت اور بلا مشقت داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر ابھی تک وہ احوال اور اہوال نہیں گذرے جو تم سے پہلے حضرات انبیاء اور اہل ایمان پر گذرے۔ دشمنوں کے ہاتھ سے ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور طرح طرح سے جھڑ جھڑائے گئے اور قسم قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے ہلائے گئے۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مددِ الٰہی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے اس زمانہ کے نبی اور ان کے ساتھی شدائد اور مصائب سے مجبور اور لاچار اور بے تاب اور بے قرار ہو کر یہ بول اُٹھے کہ اللہ کی وہ مدد کب آئے گی؟ جس کا اس نے انبیاء علیہم السلام اور اہل ایمان سے وعدہ فرمایا ہے۔ بمقتضائے بشریت انتہائی پریشانی کی حالت میں یہ مایوسانہ کلمات زبان سے نکلے اور حق تعالیٰ کا منشاء بھی یہی تھا کہ ہمارے ماسوا سے بالکل مایوس اور نا اُمید ہو جائیں۔ چنانچہ اس وقت اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور ارشاد ہوا کہ گھبراؤ نہیں ثابت قدم رہو۔ آگاہ ہو جاؤ اور سُن لو کہ اللہ کی مدد بہت نزدیک ہے۔ اے مسلمانو! اسی طرح تمہارا بھی امتحان ہو رہا ہے گھبراؤ نہیں۔ عنقریب اللہ کی مدد تم کو پہنچے گی اور تمام مصائب اور تکالیف کا خاتمہ کر دے گی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ تو کہہ جو چیز خرچ کرو فائدے کی سو ماں باپ کو

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا

اور نزدیک ناتے والوں کو، اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر کو اور جو کرو گے

مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

بھلائی سو وہ اللہ کو معلوم ہے۔

حکم سیزدہم۔ متعلق بمصارف انفاق

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ ... الٰى ... فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾﴾

شروع سے احکامِ عملیہ کا بیان چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں ضمناً ایمان اور اخلاص کی ترغیب اور دنیا کی محبت کی مذمت کا ذکر آیا اب آگے پھر احکامِ عملیہ کی طرف رجوع فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم اپنی جانوں کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ کی راہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان و مال سے کسی قسم کا دریغ نہ کرو اور اس کی راہ میں جو تکلیف پیش آئے اس کا تحمل کرو۔ اب اس کلیہ کے تحت میں کچھ مصارف انفاق اور جہاد اور نکاح اور طلاق اور خلع اور ایلاء کے احکام بیان فرماتے ہیں جو باہمی معاشرت سے متعلق ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔ اے ہمارے نبی! یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کی خوشنودی اور ثواب کے لیے کیا خرچ کریں۔ آپ فرما دیجیے کہ یہ سوال مت کرو کہ کیا خرچ کریں یہ چیز تو بالکل واضح ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کوئی خاص شے اور خاص مقدار معین نہیں جو میسر ہو وہ خرچ کرو ہاں یہ سوال کرو کہ کہاں خرچ کریں سو آپؐ فرما دیجیے کہ جو مال بھی خرچ کرنا چاہو تو سب سے پہلے ماں باپ کی خدمت میں صرف کرو جو تمہارے وجود ظاہری کا سبب بنے اور جس شفقت اور محبت سے تم کو پالا تم اس کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اولاد اگرچہ والدین کی مالی اور بدنی خدمت میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھے۔ لیکن والدین کی شفقت اور عنایت اور نظر محبت کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کر سکتی۔ اور والدین کے قرابت داروں میں خرچ کرو تا کہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں جمع ہو جائیں اور رشتہ داروں کے بعد یتیموں پر خرچ کرو کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے خود کمانے کے قابل نہیں اور ان کے بعد عام محتاجوں پر خرچ کرو اور عام محتاجوں کے بعد مسافروں پر خرچ کرو کہ جو وطن اور عزیز اور اقارب سے دور ہونے کی وجہ سے بمنزلہ محتاج اور فقیر کے ہو گئے۔ اور اس کے علاوہ جو بھی تم خیر اور نیکی کا کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں تمہارے خرچ کی مقدار اور کمیت اور تمہاری نیت کو خوب جانتا ہے۔

فائدہ: یہ آیت نفل صدقات اور خیرات کے بارے میں ہے۔ زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ، مثل صدقۂ فطر کے بارے میں نہیں اس لیے کہ والدین کو زکوٰۃ دینا درست نہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا

حکم ہوا تم پر لڑائی کا، اور وہ بُری لگتی ہے تم کو اور شاید تم کو بُری لگے ایک چیز

وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ

اور وہ بہتر ہو تم کو اور شاید تم کو خوش لگے ایک چیز اور وہ بُری ہو تم کو اور اللہ

ع ۲۶ ۶ ۱۰ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ

جانتا ہے اور تم نہیں جانتے تجھ سے پوچھتے ہیں مہینے حرام کو اس میں لڑائی

فِيْهِ ۗ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۗ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ ۢ

کرنا تو کہہ لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا

بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۙ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ

اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے اس سے زیادہ گناہ ہے اللہ کے ہاں اور

الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى

دین سے بچلانا مار ڈالنے سے زیادہ اور وہ تو لگے ہی رہتے ہیں تم سے لڑنے کو یہاں تک کہ

يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۗ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ

تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر مقدور پاویں اور جو کوئی پھرے گا تم میں

عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى

اپنے دین سے پھر مَر جاوے گا کفر ہی پر تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

دنیا میں اور آخرت میں اور وہ آگ والے ہیں وہ اس میں رہ پڑے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ

يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

اُمیدوار ہیں اللہ کی مہر کے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حکم چہاردہم: متعلق بہ فرضیت جہاد وقتال در شہر حرام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ ... الٰى ... وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾﴾

گزشتہ آیات میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے ابتلاء اور مصائب کا ذکر فرمایا اور یہ بتلایا کہ جنت میں داخل ہونا ابتلاء کے وقت صبر اور تحمل پر موقوف ہے۔ اس سلسلہ میں اوّلاً جہادِ مالی یعنی انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر فرمایا اب اس کے بعد جہادِ جانی کا ذکر فرماتے ہیں کہ جہادِ مالی اور جانی سے مل کر دین قائم ہوتا ہے۔ (کذا فی البحر المحیط)

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: اے مسلمانو! تم پر جہاد فرض کر دیا گیا اور تمہیں طبعاً ناگوار ہے۔ کیونکہ اس میں جان پر مشقت اور مال کا خرچ ہے اور شاید کوئی شے تم کو طبعًا ناگوار ہو اور فی الواقع وہی تمہارے حق میں بہتر ہو اور جہاد فی سبیل اللہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ اس لیے کہ جہاد سے اسلام کو فتح وغلبہ حاصل ہوتا ہے۔ احکامِ خداوندی کی بجا آوری میں کوئی ہارج اور مزاحم باقی نہیں رہتا اور دُنیاوی فائدہ حکومت کا حاصل ہونا اور مالِ غنیمت کا ملنا ہے اور اُخروی فائدہ شہادت کی نعمت سے بہرہ یاب ہونا اور شاید تم کو کوئی چیز طبعًا بھلی معلوم ہو اور فی الواقع تمہارے حق میں وہ بُری ہو جیسے جہاد میں سُستی اور کاہلی جو ظاہر میں راحت معلوم ہوتی ہے مگر ترک کا انجام سوائے ذلت اور مالِ غنیمت اور ثواب سے محرومی کے اور کچھ نہیں۔ اور تمہاری بھلائی اور بُرائی کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور تم اپنی مصلحتوں اور مضرتوں کو نہیں جانتے لہٰذا تم اپنی طبعی رغبت اور کراہت کا اتباع مت کرو بلکہ احکامِ خداوندی کا اتباع کرو اسی میں تمہارے لیے خیر اور بہتری ہے احادیث میں جہاد کو افضل الاعمال اور سنام الاسلام یعنی اسلام کا کوہان قرار دیا ہے اس لیے کہ جہاد اسلام کی اشاعت اور خلق اللہ کی ہدایت اور دین کی عزت اور رفعت کا سبب ہے اور مجاہد کی کوشش سے جو لوگ اسلام میں داخل ہوں گے اُن کی حسنات اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

شانِ نزول:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے عرب میں یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ چار مہینوں یعنی ذی قعدہ اور ذی الحجہ اور محرم الحرام اور رجب میں باہمی قتل وقتال اور جنگ وجدال کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور ان مہینوں میں کسی پر چڑھائی کرنے کو معیوب جانتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے دو ماہ پیشتر ماہ جمادی الاخریٰ ۲ھ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں آٹھ یا بارہ مہاجرین کی ایک جماعت کو جس میں سوائے مہاجرین کے اور کوئی نہ تھا، کافروں کے مقابلہ میں جانے کا حکم دیا اور عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ایک والا نامہ لکھ کر دیا اور یہ فرمایا کہ جب دو دن کا سفر طے کر لو اس وقت اس خط کو کھولنا۔ اور اپنے ساتھیوں کو سنا دینا اور کسی پر زبردستی نہ کرنا، عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کس طرف جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نجد کی طرف جاؤ۔ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ وہاں سے روانہ ہوئے اور دو دن کا سفر طے کرنے کے بعد ایک منزل پر پڑاؤ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ کھولا تو اس

میں یہ مضمون تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امّابعد ! فَسِر علیٰ برکة اللہ بمن تبعك من اصحابك حتی تنزل بطن نخلة فتر صد بها عیر قریش لعلك ان تاتینا منه بخیر.

ترجمہ: "امابعد! اللہ کی برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ اپنے رفقاء کو لے کر چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ جب مقام نخلہ پر پہنچو تو قریش کے تجارتی قافلہ کا انتظار کرو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا مال تم کو عطا کرے اور پھر وہ مال تم ہمارے پاس لے آؤ۔"

عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اس حکم نامہ کو پڑھتے ہی سمعًا و طاعةً کہا اور اپنے ساتھیوں کو سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ فرمادیا تھا کہ کسی پر زبردستی نہ کروں۔ اب جس کو شہادت کا شوق اور رغبت ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جس کا جی چاہے وہ لوٹ جائے یہ سُن کر سب دل و جان سے تعمیل ارشاد پر راضی ہوگئے اور ایک شخص بھی واپس ہونے کے لیے راضی نہ ہوا۔ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان جب مقام نخلہ میں جا کر اُترے تو ابھی ٹھہرنے بھی نہ پائے تھے کہ اتنے میں قریش کا قافلہ دکھلائی دیا جو طائف کی تجارت کا مال زیتون کا تیل اور کشمش اور چمڑے وغیرہ لے کر آ رہا تھا۔ مسلمانوں نے ان پر حملہ کیا۔ عمرو بن الحضرمی کو قتل کیا اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو گرفتار کیا باقی لوگ بھاگ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قیدیوں اور سامان کے اُونٹوں کو لے کر حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یہ تاریخ یکم رجب الحرام تھی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کو جمادی الثانیہ کی تیسویں تاریخ سمجھے ہوئے تھے مگر چاند اُنتیس کا ہو چکا تھا جس کا صحابہ رضی اللہ عنہم کو علم نہ تھا۔ اس لیے کفار نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا کہ یہ لوگ شہر حرام میں بھی لڑتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہر حرام میں قتال کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جواب میں کہہ دیجیے کہ بے شک خاص طور پر ماہ حرام کا ارادہ کر کے قتال کرنا بے شک ایک امر عظیم ہے مگر مسلمانوں نے قصدًا اور ارادۃً ایسا نہیں کیا بلکہ صحیح تاریخ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے یہ لغزش ہوئی۔ مگر مشرکین کو اس اعتراض کا حق نہیں اس لیے کہ شہر حرام میں قتل و قتال بہت سے بہت گناہ کبیرہ ہے اور تم تو کفر اور شرک میں مبتلا ہو جو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکنا یعنی دین حق اور اسلام میں داخل ہونے سے ان کو روکنا اور خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر اور شرک کرنا اور لوگوں کو مسجد حرام سے روکنا کہ وہاں جا کر کوئی بیت اللہ کا طواف نہ کر سکے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور بندگی نہ کر سکے اور جو لوگ مسجد حرام کے واقعی اور حقیقی اہل اور مستحق تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان ان کو حرم اور مسجد حرام سے تنگ کر کے نکالنا سو یہ تمام حرکتیں شناعت اور قباحت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں بلا قصد قتال سرزد ہو جانے سے کہیں بڑھ کر ہیں اور فقط کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد ہی قتل سے بڑھ کر ہے۔ پھر یہ کفار مسلمانوں کی ایک غلطی پر کیوں اعتراض کرتے ہیں۔ غلطی سے درگذر کیا جا سکتا ہے مگر کفر و شرک کا جرم کسی طرح اور کسی وقت بھی قابل معافی نہیں اور یہ لوگ دین حق کی عداوت اور دشمنی میں اس درجہ پختہ ہیں کہ حق کے مٹانے کے لیے ہمیشہ تم سے برسرِ پیکار رہیں گے یہاں تک کہ خدانخواستہ تم کو تمہارے اس پاک دین سے پھیر دیں۔ اگر کچھ قابو پائیں اور دین اسلام سے کسی کو مرتد بنا دینا یہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس

آیت میں دو اشارے ہیں ایک تو یہ کفار دین اسلام کے مٹانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کو متنبہ رہنا چاہیے۔ دوسرا اشارہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر اُن کا قابو چلے گا نہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مرتد نہیں بنا سکیں گے۔ آئندہ آیت میں ارتداد کا انجام بیان فرماتے ہیں۔

انجام ارتداد

اور اے مسلمانو! تم پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ جو شخص تم میں سے دین اسلام سے پھر جائے گا اور اسی کفر کی حالت میں مر جائے گا تو ایسے لوگوں کے تمام عمل دنیا اور آخرت میں حبط (ضائع) اور ضبط ہو جائیں گے۔ دنیا میں اعمال کے حبط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی وجہ سے جو جان و مال محفوظ تھے وہ محفوظ نہ رہیں گے اور نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہو سکیں گے۔ اور آخرت میں حبط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی نیک عمل پر کوئی ثواب نہیں ملے گا اور یہ لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے کبھی بھی دوزخ سے نہیں نکلیں گے۔

مسئلہ ① : امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دین اسلام سے مرتد ہو جائے اور پھر کفر ہی کی حالت میں مر جائے تب تو اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے اور اگر مرتد ہونے کے بعد وہ مرنے سے پہلے تائب ہو گیا اور پھر مسلمان ہو گیا تو اس کے اعمال ضائع نہ ہوں گے، کیونکہ اس آیت میں حبطِ اعمال کے لیے دو چیزوں کا ذکر ہے ایک ارتداد یعنی ﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ﴾ اور دوسرے موت علی الکفر یعنی ﴿فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ﴾ حبطِ اعمال کے لیے ان دونوں باتوں کا پایا جانا شرط ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ محض ارتداد سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں موت علی الکفر شرط نہیں لقولہ تعالیٰ ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾ (المائدہ:۵) وقولہ تعالیٰ ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ (الزمر:۶۵) اور اس آیت میں جس طرح شرط کی جانب میں دو چیزیں مذکور ہیں۔ ایک ارتداد اور دوسرے موت علی الکفر۔ اسی طرح جزاء کی جانب میں بھی دو چیزیں مذکور ہیں ایک حبط اعمال ﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ اور دوسرے دخول نار ﴿وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ... الخ﴾ اعمال تو محض مرتد ہونے سے حبط ہو جاتے ہیں۔ اور جہنم میں جانے کے لیے موت علی الکفر شرط ہے جس طرح شرط کے دو جزو ہیں اسی طرح جزاء کے دو جزو ہیں۔ جزاء کا پہلا جزو شرط کے پہلے جزو سے متعلق ہے اور جزاء کا دوسرا جزو شرط کے دوسرے جزو سے متعلق ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ ہماری اس غلطی پر کوئی مؤاخذہ نہیں تو یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارا یہ سفر جہاد میں شمار ہو گا اور کیا ہم کو اس پر کچھ ثواب بھی ملے گا؟ اس پر یہ آئندہ آیت نازل ہوئی یعنی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... الخ﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا ایسے لوگ اللہ کی رحمت اور عنایت کے اُمیدوار ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور مہربان ہیں۔ غلطی سے درگذر فرماتے ہیں اور ایسے مخلصین کو اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھتے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد وہ مالِ غنیمت جو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ لے کر آئے تھے ابھی تک وہ اسی طرح وحی کے انتظار میں رکھا ہوا تھا آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس نکال کر غانمین پر تقسیم کر دیا۔

مسئلہ ② : اشہر حرام میں قتل و قتال ابتداء میں ممنوع تھا۔ جمہور علماء کے نزدیک بعد میں وہ ممانعت منسوخ ہو گئی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب اور جوئے کا تو کہہ ان میں گناہ بڑا ہے اور فائدے بھی ہیں

لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

لوگوں کو اور ان کا گناہ فائدے سے بڑا ہے۔

حکم پانزدہم۔ متعلق بہ شراب وقمار

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ ... الیٰ ... وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾

ربط: جس طرح خدا کی راہ میں جان و مال کا خرچ کرنا دین اور دنیا کی عزتوں کا سبب ہے (جیسا کہ پہلی آیتوں میں اس کا ذکر ہوا) اسی طرح شراب و کباب اور قمار یعنی جوئے میں مال کا خرچ کرنا دینی اور دنیاوی تباہی کا موجب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور یہ لوگ آپ ﷺ سے شراب اور قمار یعنی جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ ﷺ کہہ دیجیے کہ ان دونوں چیزوں کے استعمال میں فقط ایک گناہ نہیں بلکہ ان کے اندر بہت سے بڑے بڑے گناہ مضمر اور پوشیدہ ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ معمولی فائدے بھی ہیں۔ اس لیے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کہ ان دونوں چیزوں کا استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ فوائد اور منافع کا اقتضاء یہ ہے کہ استعمال جائز ہو اور مفاسد کا اقتضاء یہ ہے کہ استعمال ممنوع ہو آپ ﷺ ان سے یہ اور فرمادیں کہ شراب اور قمار کا گناہ اور ضرر ان کے نفع اور فائدہ سے کہیں زیادہ ہے۔ شراب اور قمار سے اوّل تو دنیا ہی میں بہت مضرتیں لاحق ہوتی ہیں۔ شراب پی کر عقل جیسی بے مثال نعمت ہاتھ سے کھو دینا اور بدمستیوں اور گالیوں میں مبتلا ہو جانا اور بغض و عداوت میں پڑ جانا ہے۔ غرض یہ کہ شراب عقل کو برباد کرتی ہے اور قمار مال کو برباد کرتا ہے۔ اور اگر بالفرض ان چیزوں سے دنیا میں کوئی نقصان نہ ہوتا تو گناہ کی مضرت اُخروی مضرت ہے اور آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں دنیا کے چند روزہ منافع ہیچ ہیں۔ اس آیت سے شراب اور قمار کی حرمت بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان دونوں چیزوں کے ترک کا مشورہ دینا مقصود ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو چھوڑ دو، اس لیے کہ ان کا ضرر نفع سے زائد ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دفع ضرر کو حصول نفع سے مقدم سمجھے۔

فائدہ: شراب کے بارے میں چار آیتیں نازل ہوئیں۔ سب سے پہلی آیت جو مکہ میں نازل ہوئی وہ یہ آیت ہے ﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ﴾ (النحل: ۶۷) اس آیت میں کھجور اور انگور سے فقط شراب بنانے کا ذکر ہے۔ ممانعت کا ذکر نہیں البتہ شراب کی کراہت اور ناپسندیدگی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ ﴿سَكَرًا﴾ کو ﴿رِزْقًا حَسَنًا﴾ کے مقابلہ میں ذکر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جو چیز مُسْکِر ہو وہ رزق حَسَن نہیں۔ غرض یہ کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کی ممانعت نہیں تھی اس لیے مسلمان شراب پیتے رہے۔ بعد ازاں حضرت عمر اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں شراب اور جوئے کے بارے میں فتویٰ دیجیے کیونکہ یہ دونوں چیزیں عقل اور مال کو تباہ کرنے والی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ

عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ﴾ یہ دوسری آیت ہے جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے تو ﴿ اِثْمٌ كَبِيْرٌ ﴾ کا خیال کر کے شراب کو چھوڑ دیا۔ اور بعض ﴿ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ کی بناء پر پیتے رہے۔ ایک روز عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان آ گئے۔ انہوں نے اُن کو شراب پلائی اور خود بھی پی جس سے نشہ ہوا اور مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ کسی نے اسی حالت میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو امامت کے لیے آگے کر دیا۔ نماز میں ﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ شروع کی اور ﴿ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ پڑھا اور اخیر تک اسی طرح بغیر ﴿ لَا ﴾ پڑھتے چلے گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ (النساء: ۴۳) یہ تیسری آیت تھی۔ اس آیت سے فقط نماز کے وقتوں میں نشہ حرام کر دیا گیا۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے تو شراب کو بالکل چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ ایسی چیز میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں جو نماز سے روک دے۔ اور بعض لوگ اوقاتِ صلوٰۃ کے علاوہ دوسرے وقتوں میں شراب پیتے رہے۔ کوئی عشاء کی نماز کے بعد شراب پی لیتا تو صبح کی نماز تک اس کا نشہ اُتر جاتا اور کوئی صبح کی نماز کے بعد پیتا تو ظہر کی نماز تک اس کا نشہ اُتر جاتا۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک روز عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے بہت سے آدمیوں کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد اس قدر شراب پی گئی کہ لوگ مست ہو گئے اور نشہ کی حالت میں ایک دوسرے کو مارنے اور گالیاں دینے لگے اور ایک دوسرے کی مذمت میں اشعار پڑھنے لگے یہاں تک کہ ایک انصاری نے اُونٹ کا جبڑا لے کر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سر پر مارا جس سے سعد رضی اللہ عنہ کا سر پھٹ گیا۔ اس حال کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ اے اللہ! شراب کے بارے میں کوئی صاف اور واضح حکم نازل فرما۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ .... الآية ﴾ (المائدہ: ۹۱) یہ چوتھی آیت تھی جس میں صراحتاً شراب کی حرمت اور ممانعت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہوتے ہی یک لخت شراب کے تمام مٹکے توڑ دیئے گئے اور مدینہ کی گلی اور کوچوں میں شراب بہنے لگی اور تمام مسلمان شراب سے فقط تائب ہی نہیں ہوئے بلکہ بیزار ہو گئے۔ حدیث میں ہے کہ شراب تمام بے حیائیوں کی جڑ ہے۔ چوری اور زنا پر آمادہ کرتی ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت میں جو حکم نازل ہوا وہ آخری حکم تھا۔ اس سے پہلے جس قدر احکام نازل ہوئے وہ سب منسوخ ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے شراب حرام ہو گئی۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ
اور پوچھتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں؟ تو کہہ جو افزود ہو اسی طرح بیان کرتا اللہ تمہارے واسطے
الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ
حکم شاید تم دھیان کرو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

حکم شانزدہم۔ متعلق بمقدار انفاق

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ... الٰى ... فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ ﴾

ربط: گزشتہ آیت میں خمر اور میسر کی حرمت کا ذکر تھا۔ اب ارشاد فرماتے ہیں کہ عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر خرچ کرے دنیاوی

حاجتوں کو پیش نظر رکھے۔ بندہ محتاج ہے بغیر دنیاوی ضرورتوں کے آخرت کا کام بھی نہیں کرسکتا۔ نیز بہت سی دینی حاجتیں یکایک پیش آجاتی ہیں اُن کا بھی خیال رکھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور آپ ﷺ سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ خدا کی راہ میں ہم کیا اور کتنا خرچ کریں؟ آپ ﷺ جواب میں کہہ دیجیے کہ آخرت کی اہمیت اور اس کے لازوال منافع کی عظمت کا اقتضاء تو یہ ہے کہ سب کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرڈالو۔ مگر وہ ارحم الراحمین تم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ تم سارا مال خدا کی راہ میں خرچ کرڈالو۔ بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی دنیوی ضرورتوں اور حاجتوں سے جس قدر مال زائد اور فاضل ہو اتنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ تاکہ تم سارا مال دے کر پریشانی میں نہ پڑ جاؤ۔ البتہ جو خدا کے ایسے عاشق ہیں کہ اُن کو سارا ہی مال فضول اور زائد نظر آتا ہے بلکہ مال کے نہ خرچ کرنے سے اُن کو پریشانی ہوتی ہے جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو ایسے لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایسے عاشق اس حکم میں داخل ہی نہیں۔

موسیا آداب دانا دیگر اند
سوختہ جاناں روناں دیگر اند

ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحابِ صُفّہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوگیا۔ اس کے پاس سے ایک اشرفی نکلی۔ حضور ﷺ نے سُن کر یہ فرمایا کہ دوزخ کی آگ کا ایک داغ ہے۔ بعدازاں ایک اور شخص کا انتقال ہوگیا اس کے پاس سے دو اشرفیاں نکلیں حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ دو داغ ہیں۔ (رواہ احمد والبیہقی)

شرعاً ایک اشرفی اور دو اشرفی کا جمع کرنا حرام نہیں لیکن یہ دونوں حضرات اصحابِ صفہ میں تھے یعنی حضور پُرنور ﷺ کی خانقاہ کے رہنے والے تھے جنہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی طرح زاہدانہ اور درویشانہ زندگی گزاریں گے اور قوت لایموت سے زائد کچھ نہ رکھیں گے۔ اس لیے اصحاب صفہ کے لیے اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی درہم دینار اپنے پاس رکھ سکیں۔ اس بناء پر یہ دونوں معتوب ہوئے۔ مسجد نبوی حضور پُرنور ﷺ کی درس گاہ تھی اور مسجد نبوی کے متصل جو ایک صفہ (چبوترہ) اصحابِ صفہ کے لیے حضور ﷺ نے بنوایا تھا وہ حضور پُرنور ﷺ کی خانقاہ تھی جس میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے زاہد اور درویش رہتے تھے، جن کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ کتنا ہی فقر و فاقہ گذرے مگر حضور ﷺ کی صحبت اور مجلس کی حاضری سے محروم نہ رہیں۔

یک لحظہ زکوئے یار دوری
در مذہبِ عاشقاں حرام است

اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے صاف صاف احکام کو بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں خوب غور و فکر کرلو۔ دُنیوی اور اُخروی حقوق اور مصالح کو دیکھ لو اور اپنے احوال کو بھی دیکھ لو اور پھر شریعت جیسا حکم دے اس کے موافق خرچ کرو تاکہ بعد میں پریشان اور پشیمان نہ ہو۔ اور یہ امر پیش نظر رکھو کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے۔ فانی لذتوں کی بناء پر دائمی اور باقی لذتوں اور راحتوں کو نہ چھوڑ دینا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ

اور پوچھتے ہیں تجھ سے یتیموں کا حکم تو کہہ سنوارنا ان کا بہتر ہے اور اگر خرچ ملا رکھو ان کا تو

فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

تمہارے بھائی ہیں اور اللہ کو معلوم ہے خرابی کرنے والا اور سنوارنے والا اور اگر چاہتا اللہ

لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

تم پر مشکل ڈالتا اللہ زبردست ہے تدبیر والا

حکم ہفدہم۔ مخالطتِ یتیم

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ ... الٰى ... اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾﴾

گزشتہ آیات میں جو احکام تھے یعنی ترک خمر و میسر اور انفاق حسب مصلحت۔ وہ خود ان کے اموال اور احوال کی اصلاح کے لیے تھے۔ اب اس آیت میں دوسروں کی اصلاح کے احکام ذکر فرماتے ہیں یعنی یتیم جو کہ خود اپنی مصالح سے قاصر اور عاجز ہے تم اس کے مال میں جو بھی تصرف کرو اس میں یتیم کی صلاح اور مصلحت کو پیش نظر رکھو اور آپ ﷺ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یتیموں کا خرچ علیحدہ رکھیں یا اپنے ساتھ رکھیں اگر یتیم کا کھانا علیحدہ پکائیں تو بسا اوقات یتیم کا کھانا بچ جاتا ہے اور اس طرح یتیم کا نقصان ہوتا ہے اور اگر ساتھ ملا کر پکاتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم زائد کھائیں اور یتیم کم۔ اور یتیم کا مال کھانا آگ کا کھانا ہے اس لیے آپ ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ یتیموں کے مال کا کس طرح انتظام کریں تو آپ اُن کے جواب میں یہ کہہ دیجیے کہ یتیموں کی مصلحت اور خیر خواہی کو ملحوظ رکھنا بہتر ہے۔ جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کے مال کو بالکل علیحدہ رکھو اور نہایت احتیاط سے اس کا انتظام کرو اور اگر خرچ میں ان کو شریک کرو اور شریک رکھنے ہی میں اُن کی بہتری اور خیر خواہی سمجھو تو کوئی حرج نہیں وہ تمہارے دینی اور نسبتی بھائی ہیں۔ اور ایک بھائی دوسرے بھائی کی خیر خواہی اور امداد سے دریغ نہیں کرتا اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے مال سے کچھ نفع اُٹھالے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور اکثر و بیشتر بھائی بھائی ملے جُلے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تباہ کار کو صلاح کار سے خوب جانتے ہیں کہ کس نے خیانت اور یتیم کا مال خراب کرنے کی نیت سے شرکت کی ہے اور کس نے یتیم کی مصلحت اور خیر خواہی کا قصد کیا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا اور خرچ کو ملا جُلا رکھنے کی اجازت نہ دیتا اور اگر بلا علم اور بلا قصد تم سے کوئی کمی بیشی ہو جاتی تو اس پر مواخذہ کرتا۔ لیکن اُس نے تم پر آسانی کی کہ شرکت اور مخالطت کی اجازت دے دی اور اللہ غالب ہے جو چاہے حکم دے خواہ وہ حکم بندوں پر آسان ہو یا گراں اور بڑی حکمت والا ہے کہ اس کا کوئی حکم حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں اور کوئی حکم بندوں کو ایسا نہیں دیا جو اُن کے لیے مشقت اور دشواری کا باعث ہو۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نکاح میں نہ لاؤ شرک والی عورتیں جب تک ایمان نہ لاویں اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے کسی

مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى

شرک والی سے اگرچہ تم کو خوش آوے اور نکاح نہ کر دو شرک والوں کو جب تک

يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ

ایمان نہ لاویں اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے کسی شرک والے سے، اگرچہ تم کو خوش آوے

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ

وہ لوگ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے جنت کی طرف اور بخشش کی طرف

بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع ۲۷ ع ۵ ۱۱

اپنے حکم سے اور بتاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو، شاید وہ چوکس ہو جاویں

حکم ہشت دہم۔ مناکحت کفار

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ ... الٰى ... عَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں یتیموں کی مخالطت کا حکم بیان فرمایا۔ اس آیت میں مشرکین اور مشرکات کے ازدواجی اختلاط کا حکم بیان فرماتے ہیں کہ ازدواجی تعلق کے لیے دینی اخوت ضروری ہے اور وہ ان میں مفقود ہے لہٰذا اہلِ شرک سے ازدواجی تعلق جائز نہیں۔ کافروں سے نکاحی اختلاط اور ازدواجی تعلقات خمر اور میسر سے زیادہ مضر اور مہلک ہیں کافروں سے ازدواجی اور معاشرتی تعلق کے بعد نہ تو دین باقی رہتا ہے اور نہ اسلامی تمدن۔ چند روز کے بعد نہ اسلامی خصلتیں باقی رہتی ہیں اور نہ عادتیں۔ اپنی قومیّت فنا کر کے دوسری قوم کا فرد بن جاتا ہے اور اسلامی تمدن کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور البتہ ایک مسلمان کنیز یعنی لونڈی اور باندی ایک مشرک عورت سے بدرجہا بہتر ہے اگرچہ وہ مشرک عورت آزاد بھی ہو اور حسین وجمیل اور مال دار بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان کی لازوال دولت کے مقابلہ میں کسی مال اور جمال کی کوئی حقیقت نہیں اگرچہ وہ مشرک عورت اپنے مال یا حسن وجمال یا حسن عادت کی بناء پر تم کو اچھی معلوم ہو۔ اور علیٰ ہذا مسلمان عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں اور البتہ ایک غلام مسلمان ایک آزاد کافر سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ کافر مال ودولت یا عزت ووجاہت کی وجہ سے تم کو اچھا معلوم ہو۔ یہ مشرک لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں یعنی ایسے اقوال وافعال شرکیہ کی طرف بلاتے ہیں جو دوزخ میں

لے جا کر ڈال دیں اور زن وشوئی کا تعلق ان کے دعوت کی تاثیر کو قوی کرنے کا بہت بڑا سبب ہے اندیشہ ہے کہ اس تعلق کی بنا پر عقائد شرکیہ تم میں سرایت کر جائیں اور اسلام کی طرف سے تم کو شبہات میں ڈال دیں اور رفتہ رفتہ تم ہدایت اور گمراہی کو برابر سمجھنے لگو۔ اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے اپنے حکم سے اور لوگوں کے لیے اپنے احکام کو صاف اور واضح طور پر بیان کرتا ہے تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اور سمجھ لیں کہ غلام اور باندی کا تعلق جو جنت اور مغفرت کی طرف لے جائے اُس آزاد اور معزز کے تعلق سے کہیں بہتر ہے کہ جس کا تعلق جہنم کی طرف لے جائے۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کی دعوت اور کافروں کی دعوت میں تضاد اور عداوت ہے خدا تعالیٰ سے اگر تعلق مقصود ہے تو اس کے دشمنوں سے ازدواجی تعلق نہ قائم کرو۔ اجتماع ضدین عقلاً بھی محال ہے۔ نیز مناکحت اور زوجیت کے لیے باہمی محبت اور موانست ضروری ہے اور اختلاف دین کی وجہ سے اگر محبت نہ ہوئی تو زوجیت کا فائدہ کچھ نہ ہوا اور اگر محبت ہوئی اور کفر اور کافری اور شرک سے چشم پوشی کی گئی تو آخرت تباہ اور برباد ہوئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے مناکحت کی قطعاً ممانعت کر دی۔

فوائد : اس آیت میں دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان عورت کا کسی کافر مرد سے نکاح نہ کیا جائے یہ حکم اب بھی ہے۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ مسلمان مرد کو کافر عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں سو اس حکم میں ایک تخصیص ہے وہ یہ کہ اہلِ کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے بشرطیکہ وہ اہل کتاب حقیقتاً اہل کتاب ہوں۔ ملحدانہ اور دہریانہ عقائد نہ رکھتے ہوں اور بشرطیکہ اُس یہودی اور نصرانی عورت کے نکاح سے اس مسلمان مرد کے دین میں خلل آنے کا اندیشہ نہ ہو اس حکم کی تفصیل اور دلیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي

اور پوچھتے ہیں تم سے حکم حیض کا تو کہہ وہ گندی ہے سو تم پرے رہو عورتوں سے

الْمَحِيْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ

حیض کے وقت اور نزدیک نہ ہو ان سے جب تک کہ پاک نہ ہوویں پھر جب ستھرائی کر لیں تو جاؤ ان کے پاس

حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے اللہ کو خوش آتے ہیں توبہ کرنے والے اور خوش آتے ہیں ستھرائی والے

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۪ وَ قَدِّمُوْا

عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تمہاری، سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو اور آگے کی تدبیر کرو

لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو اس سے ملنا ہے اور خوشخبری سنا ایمان والوں کو

حکم نوزدہم۔ حرمتِ جماع درحالتِ حیض

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ ... الیٰ ... وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۲۲۳﴾

ربط: گزشتہ آیت میں نکاح کا حکم مذکور تھا۔ اس آیت میں حالتِ حیض میں جماع اور قربان کا حکم بیان کرتے ہیں۔ یہود میں یہ دستور تھا کہ ایامِ حیض میں عورت سے بالکل علیحدہ رہتے نہ اس کے ساتھ کھاتے اور نہ پیتے بلکہ اس کو علیحدہ مکان میں رکھتے۔ اور اس کے برعکس نصاریٰ میں یہ دستور تھا کہ ایام حیض میں مخالطت تو درکنار مجامعت سے بھی پرہیز نہ کرتے۔ مدینہ منورہ میں ہر قسم کے لوگ رہتے تھے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس مسئلہ میں خلجان پیش آیا اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ حالت حیض میں عورت کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجیے کہ حیض ایک گندگی اور ناپاکی ہے لہٰذا تم اُن سے اس حالت میں علیحدہ رہو یعنی اُن سے صحبت اور مجامعت نہ کرو۔ باقی کھانے اور پینے اور ساتھ بیٹھنے میں کوئی پرہیز نہیں مقصود فقط گندگی سے علیحدہ رہنا ہے اور جب تک وہ حیض سے پاک نہ ہو جائیں اس وقت تک اُن سے قربت یعنی صحبت اور مجامعت نہ کرو۔ پس جب وہ عورتیں اچھی طرح پاک ہو جائیں کہ ناپاکی کا شبہ بھی باقی نہ رہے تو پھر اُن سے مجامعت کرو مگر اس مقام سے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تم کو صحبت کرنے کی اجازت دی ہے یعنی آگے کی جانب سے پیچھے کی جانب سے نہیں اور اگر غلطی سے ایام حیض میں صحبت کر لی ہے تو توبہ کر لو۔ تحقیق اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو گناہ کر گزرنے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں اور جو لوگ سرے ہی سے گندگی سے پاک رہتے ہیں۔ ان سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ یعنی جو لوگ سرے ہی سے ناپاکیوں سے بچتے ہیں مثلاً ایام حیض میں صحبت سے پرہیز کرتے ہیں اور جس جگہ سے صحبت کی ممانعت ہے اس جگہ سے صحبت نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں سے بھی اللہ تعالیٰ محبت رکھتا ہے اور آگے کی جانب سے تم کو صحبت کا حکم اس لیے دیا گیا کہ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتوں کے ہیں۔ اُن کے رحم میں جو نُطفہ ڈالا جاتا ہے وہ بمنزلہ تخم کے ہے اور بچہ بمنزلہ پیداوار کے ہے سو تم کو اختیار ہے کہ اپنی کھیتی میں جس طرح اور جس طرف سے چاہو آؤ بیٹھ کر یا لیٹ کر مگر شرط یہ ہے کہ کھیتی سے باہر نہ جاؤ فقط حرث اور زرع (کھیتی) میں آنے کی تم کو اجازت دی گئی ہے۔ اور جو جگہ حرث (کھیتی) کے قابل نہیں۔ یعنی پیچھے کی جانب اس جگہ میں تم کو جانے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں پیچھے کی جانب سے آنا یہ قوم لوط کا عمل ہے جس پر قہر خداوندی نازل ہوا۔ حدیث میں ہے:

((ملعونٌ من اتٰی امراۃ فی دبرھا)). (رواہ احمد و ابو داؤد)

ترجمہ: "ملعون ہے وہ شخص کہ جو عورت کی دبر میں وطی کرے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے حالت حیض میں وطی کی یا دبر کی جانب میں صحبت کی یا کسی کاہن اور نجومی کے پاس گیا اور اس کی تصدیق کی تو اُس شخص نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ احکام کا کفر کیا۔ (رواہ الترمذی)

شیعوں کے نزدیک بیوی سے اغلام درست ہے جو صریح قرآن کریم کے اس لفظ ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ کے خلاف ہے اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ نکاح سے مقصود اولاد ہے جیسے کھیت سے مطلوب پیداوار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اغلام سے اولاد کا تولد ناممکن ہے۔ چنانچہ ترغیب نکاح کے بارہ میں جو حدیث نبوی مشہور ہے اس میں یہ جملہ ہے کہ ((مکاثر بکم الامم)) یعنی میں

اُمت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ معلوم ہوا کہ ترغیب نکاح سے اولاد کی کثرت مطلوب ہے جس سے حضور پُرنُور ﷺ کو قیامت کے دن سامان افتخار ہاتھ آئے۔ اور یہ یاد رکھو کہ تم کو صحبت کی اجازت محض لذت کے لیے نہیں دی گئی بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس لذت کو ذریعۂ آخرت بناؤ اور اپنے لیے آگے کی کچھ تدبیر کرو یعنی صحبت کے وقت اللہ کا نام لو تا کہ اولاد شیطان کے اثر سے محفوظ رہے اور نیک اولاد کی نیت کرو تا کہ آخرت کی کھیتی بنے اور تمہارے لیے دُعا اور استغفار کرے اور قیامت کے دن تمہارے کام آئے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ یعنی حالت حیض یا بے محل صحبت کرنے سے پرہیز کرو اور یقین رکھو کہ تم کو اللہ سے ملنا ہے ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے اور تمام اعمال کا حساب دینا ہے اس روز تخم کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ بے وقت اور بے محل تو اس کو ضائع نہیں کر دیا تھا اور اہل ایمان کو خوشخبری سُنا دیجیے کہ جنہوں نے اپنے تخم کو بروقت اور برمحل استعمال کیا اُن کو اس تخم کے ثمرات وہاں مل جائیں گے۔ مطمئن رہیں۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا

اور نہ ٹھہراؤ اللہ کو ہتھ کنڈا اپنی قسمیں کھانے کا کہ سلوک نہ کرو اور پرہیزگاری اور صلح

بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ

درمیان لوگوں کے اور اللہ سُنتا ہے جانتا ہے نہیں پکڑتا تم کو اللہ ناکاری

فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

قسموں پر تمہاری لیکن پکڑتا ہے اس کام پر جو کرتے ہیں دل تمہارے اور اللہ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

بخشتا ہے تحمل والا

حکم بستم۔ متعلق بہ احترام نام پاک خداوندِ انام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾﴾

ربط: گزشتہ آیت میں تقویٰ کا حکم مذکور تھا۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے نام پاک کا ادب اور احترام ملحوظ رکھو اور بات بات میں اللہ تعالیٰ کی قسم نہ کھاؤ اور نہ دنیاوی اغراض اور منافع کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام پاک کو استعمال کرو۔ یہ سب ادب کے خلاف ہے۔

شانِ نزول:

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے داماد بشیر بن نعمان رضی اللہ عنہ میں کسی بات پر کچھ تکرار ہوا۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی

کہ میں نہ تم سے ملوں گا اور نہ تم سے کلام کروں گا اور نہ تمہاری کسی بھلائی اور بُرائی میں دخل دوں گا۔ اس کے بعد عبداللہ رضی اللہ عنہ سے جب کوئی اس بارے میں کوئی بات کرتا اور کچھ کہنا چاہتا تو یہ کہہ دیتے کہ میں نے اللہ کی قسم کھالی ہے اس لیے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے لیے آڑ نہ بناؤ یعنی رشتہ داروں میں سلوک اور احسان کرنے کے لیے اور تقویٰ اور پرہیز گاری کا کام کرنے کے لیے اور لوگوں میں صلح کرانے کے لیے قسم کو بہانہ نہ بناؤ اور یہ نہ کہو کہ میں نے قسم کھالی ہے اس لیے میں یہ کام نہیں کرسکتا۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص نیک عمل کے چھوڑنے اور نہ کرنے پر قسم کھالے تو اس پر واجب ہے کہ وہ نیک کام کرے اور اس کا کفارہ دے۔ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز پر قسم کھالے خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اس پر قائم رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور بتلا دیا کہ قسم کی وجہ سے نیک کام کو نہ چھوڑو اور ایسی حالت میں قسم کو توڑ کر کفارہ دے دو اور نیک کام کرو۔ تا کہ تم کو کارِ خیر کا اجر حاصل ہو اور ایسی قسم کے توڑنے میں اللہ تعالیٰ تمہارے عذر کو سننے والا ہے اور تمہاری نیتوں کا جاننے والا ہے کہ تمہاری نیت اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ تھی محض تعمیل حکم اور نیکی کرنے کے لیے قسم کو توڑا ہے اور بصد ہزار ندامت و پشیمانی اس کی تلافی کے لیے کفارہ ادا کیا ہے یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں کو سنتا ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے کہ کس نیت سے قسم کھائی ہے۔ تمہارا لفظ اور قصد کوئی بھی اس سے مخفی نہیں۔ لہٰذا قسم کھاتے وقت لفظوں میں احتیاط رکھو اور نیت اور ارادہ کرنے میں بھی احتیاط رکھو اور قسم کے متعلق ہمارا یہ ضابطہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تم سے اُن قسموں پر مواخذہ اور گرفت نہ کریں گے جو بلا قصد و ارادہ تمہاری زبان سے نکل گئی ہیں یا قصد [1] اور ارادہ تو تھا مگر تم اس کو اپنے گمان میں راست اور صحیح سمجھتے تھے۔ ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ گناہ لیکن اللہ تعالیٰ تم سے ان قسموں پر آخرت میں مواخذہ فرمائیں گے کہ جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے اور معصیت کرنے کا قصد اور ارادہ کیا ہے یا اُس قسم کو کسی بِر اور تقویٰ سے علیحدہ رہنے کا ذریعہ اور بہانہ بنایا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے کہ یمین لغو پر مواخذہ نہیں فرماتا اور بڑا حلیم اور بردبار ہے کہ باوجود بالقصد والا ارادہ جھوٹی قسم کھانے کے مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا شاید توبہ کرلے۔ توبہ کے لیے مہلت دیتے ہیں۔

فائدہ ①: یمین یعنی قسم کی تین قسمیں ہیں:

ایک قسم یمین لغو ہے: اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یمین لغو کے معنی یہ ہیں کہ جو قسم انسان کی زبان سے بلا قصد اور ارادہ نکل جائے جیسے عرب میں لا واللہ، اور بلیٰ واللہ تکیۂ کلام تھا۔ ایسی قسم میں نہ گناہ ہے نہ کفارہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یمین لغو وہ ہے کہ کسی گزشتہ چیز کو سچ سمجھ کر قسم کھالے اور واقع میں اس کے خلاف ہو لیکن اس نے اپنے گمان میں اس کو سچ سمجھ کر قسم کھالی ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ کوئی گناہ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس میں ارادہ ہو اگر وہ نفس الامر کے خلاف ہو تو اس میں کفارہ واجب ہوگا۔ اگرچہ قسم کھانے والے کے گمان میں وہ واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو۔

دوسری قسم: یمین غموس ہے وہ یہ کہ کسی گذری ہوئی بات پر قصداً جھوٹی قسم کھائے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس قسم کی قسم پر حسب ارشاد باری ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ گناہ ہے جس کا علاج توبہ اور استغفار ہے۔ دنیا میں اس پر کوئی کفارہ نہیں اس لیے کہ کسی گزشتہ امر پر دیدہ و دانستہ قسم کھانا جھوٹ ہے اور جھوٹ بولنے پر گناہ ہوتا ہے کفارہ نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ یمین لغو کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "یعنی لا واللہ و بلیٰ واللہ بغیر قصد گوید یا غلط دانستہ سوگند خورد علی اختلاف المذہبین"۔ واللہ اعلم۔

فرماتے ہیں کہ یمین غموس میں کفارہ واجب ہے کیونکہ سورۂ مائدہ میں بجائے ﴿بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ کے ﴿بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ (المائدہ:۸۹) کا لفظ آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ﴿مَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ اور ﴿مَا عَقَّدْتُّمُ﴾ سے ایک ہی معنی مراد ہیں اور سورۂ مائدہ میں کفارہ صراحتاً مذکور ہے معلوم ہوا کہ مواخذہ سے مراد کفارہ دینا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ﴾ اُخروی مواخذہ مراد ہے یعنی دیدہ ودانستہ جھوٹ بولنے پر عذاب دینا مراد ہے کفارہ مراد نہیں۔

تیسری قسم: یمین منعقدہ ہے یعنی آئندہ فعل کے متعلق قصداً قسم کھائے کہ کروں گا یا نہیں کروں گا ایسی قسم کے توڑنے پر بالاتفاق کفارہ واجب ہوتا ہے اور سورۂ مائدہ میں ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ ... الخ﴾ (المائدہ:۸۹) سے یہی یمین منعقدہ مراد ہے کہ جو آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق قسم کھائی جائے اور اس زیرِ تفسیر آیت یعنی ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ میں اسی قسم یعنی فعل آئندہ پر قسم کھانے کا حکم مذکور ہے کہ اگر تم آئندہ کے متعلق کسی گناہ اور خلاف بِرّ اور خلافِ تقویٰ کام کی قسم کھا بیٹھے ہو کہ واللہ اپنے باپ سے یا رشتہ دار سے بات نہ کروں گا تو تم کو لازم ہے کہ ایسی قسم کو توڑو اور کفارہ دو جیسا کہ اس آیت کا شانِ نزول اس معنی کا شاہد عدل ہے۔ لیکن اس آیت میں فقط اُخروی مواخذہ کا ذکر ہے دُنیاوی مواخذہ (یعنی کفارہ) کا ذکر سورۂ مائدہ میں آئے گا۔

اور سورۂ نور کی اس آیت ﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (النور:۲۲) میں بھی اسی قسم کی قسم کا ذکر ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی تھی کہ میں مسطح رضی اللہ عنہ کو خرچ نہ دوں گا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسطح رضی اللہ عنہ کا وظیفہ دوچند کر دیا۔

فائدہ ②: اس آیت یعنی ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۭ﴾ میں فقط لغو اور یمین منعقدہ کا ذکر ہے یمین غموس کا ذکر نہیں۔ یمین غموس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا .... الآیۃ﴾ اس آیت میں یمین غموس پر اُخروی مواخذہ کا ذکر ہے دنیوی مواخذہ یعنی کفارہ کا ذکر نہیں اس لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یمین غموس کی حقیقت جھوٹ اور افتراء ہے جو اعلیٰ درجہ کا گناہ کبیرہ ہے جس میں توبہ اور استغفار واجب ہے مگر کفارہ نہیں۔ اور علیٰ ہذا ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ میں بھی یمین غموس کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ ③: اس آیت میں حق جل شانہٗ نے ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۭ﴾ (المائدہ:۸۹) کے مقابلہ میں ذکر فرمایا ہے اور کسبِ قلب سے بالاجماع کذب اور معصیت کا ارادہ مراد ہے معلوم ہوا کہ یمین لغو جو ﴿بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ کے مقابلہ میں مذکور ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس یمین میں کذب اور جھوٹ کا ارادہ نہ ہو بلکہ اپنے گمان میں سچ سمجھ کر قسم کھائی ہو وہ یمین لغو ہے جس میں کوئی مواخذہ نہیں نہ گناہ اور نہ کفارہ۔ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہما سے یمین لغو کی یہی تفسیر منقول ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ تفصیل کے لیے احکام القرآن للجصاص رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۵۵ کی مراجعت کی جائے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ

جو لوگ قسم کھا رہتے ہیں اپنی عورتوں سے ان کو فرصت ہے چار مہینے پھر اگر

فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ

مل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر ٹھہرایا رخصت کرنا تو اللہ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

سنتا ہے جانتا۔

حکم بست ویکم۔ ایلاء

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ... الٰى ... فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں کچھ احکام عورتوں کے متعلق مذکور ہوئے اور کچھ احکام یمین یعنی قسم کے متعلق مذکور ہوئے۔ آئندہ آیت میں ایک خاص قسم کی یمین یعنی خاص قسم کی قسم کا ذکر فرماتے ہیں جو عورتوں سے متعلق ہے یعنی ''ایلاء'' اس میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایلاء ایک خاص قسم کی یمین ہے جس کے احکام علیحدہ ہیں۔ اس لیے ایلاء کا حکم علیحدہ بیان فرمایا۔ یا یوں کہو کہ گزشتہ آیات میں یہ بیان فرمایا کہ اگر برّ اور تقویٰ اور اصلاح کرنے کے لیے قسم کو توڑا جائے اور کفارہ ادا کر دیا جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔ اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اسی طرح ایلاء کو سمجھو کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے ایلاء کیا یعنی یہ قسم کھائی کہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا تو اگر اس قسم کو توڑ دے اور کفارہ دے دے تو نکاح باقی رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

چنانچہ فرماتے ہیں جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھا بیٹھتے ہیں یعنی یہ قسم کھا لیتے ہیں کہ ہم ان سے صحبت نہ کریں گے ایسے لوگوں کے لیے چار مہینے کا انتظار لازم ہے۔ پس اگر ان چار مہینے کے اندر اپنی قسم کو توڑ کر یہ لوگ اپنی عورتوں کی طرف رجوع کریں یعنی اُن سے صحبت اور مجامعت کریں اور اس طرح اپنی قسم کو توڑ کر کفارہ دے دیں تو ان کا نکاح باقی رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ قسم کے توڑنے اور عورت کو تکلیف پہنچانے کے قصور کو معاف کر دیں گے اور آئندہ کے لیے حقوق زوجیت ادا کرنے کی نیت کر لینے کی وجہ سے اس پر رحمت اور مہربانی فرمائیں گے اور اگر ان لوگوں نے قطع تعلق ہی کی ٹھان لی ہے۔ اس لیے اس نے چار مہینے کے اندر رجوع نہیں کیا اور اسی طرح اپنی قسم پر قائم رہا تو چار ماہ گذرتے ہی اس پر طلاق پڑ جائے گی؛ اور اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سننے والے اور اس کی نیت کو جاننے والے ہیں اس لیے اس کے مناسب یہ حکم دیا۔

فائدہ ①: عرب کا یہ دستور تھا کہ جب بیوی سے خفا ہوتے تو یہ قسم کھا لیتے کہ میں اب تیرے پاس نہ آؤں گا۔ جاہلیت میں عورت

کے ستانے کا یہ ایک طریق تھا، اس سے نہ عورت بیوہ ہوتی اور نہ خاوند والی، شریعت اسلامیہ نے اس کی ایک حد اور مدت معین کر دی۔ یعنی چار ماہ۔ اگر اس مدت میں رجوع کر لیا تو نکاح باقی رہے گا۔ اور اگر اس مدت میں رجوع نہ کیا تو طلاق بائن پڑ جائے گی۔

فائدہ ②: امام مالک اور مام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اگر ایلاء کرنے والا چار ماہ گذرنے کے بعد فوراً رجوع کرے تو وہ رجوع معتبر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر چار مہینے کے اندر اندر رجوع کرے تو معتبر ہے چار ماہ گذر جانے کے بعد رجوع کا اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ﴿فَاِنْ فَآءُوْا فِيْهِنَّ﴾ آیا ہے یعنی ان چار مہینے کے اندر رجوع کریں۔ اور یہ قراءت اگرچہ متواتر نہیں لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر قراءت شاذہ، قراءت متواترہ کے معارض نہ ہو بلکہ اس کی مفسر اور شارح ہو تو وہ بھی حجت اور واجب العمل ہے۔ اور تعارض اس کو کہتے ہیں کہ جہاں دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ﴿فَاِنْ فَآءُوْا فِيْهِنَّ﴾ کی قراءت ﴿فَاِنْ فَآءُوْا﴾ کے منافی نہیں بلکہ اس کی تفسیر اور بیان ہے۔

فائدہ ③: امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک محض چار مہینے گذر جانے سے طلاق نہیں پڑتی۔ چار ماہ گذر جانے کے بعد قسم کھانے والا یا تو طلاق دے یا رجوع کرے، طلاق کا پڑنا اس کے طلاق دینے پر موقوف ہے اور اگر نہ طلاق دے اور نہ رجوع کرے بلکہ سکوت کرے تو حاکم اس سے زبردستی طلاق دلائے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر چار مہینے بلا رجوع کے گذر گئے تو اس پر طلاق پڑ جائے گی۔

فائدہ ④: شریعت میں ایلاء اس قسم کو کہتے ہیں جو شخص یہ قسم کھائے کہ چار مہینے یا چار ماہ سے زائد یا بلا تعیّن مدّت اپنی عورت کے پاس نہیں جاؤں گا اور اگر چار مہینے سے کم کے لیے قسم کھائی تو وہ ایلاء شرعی نہ ہوگا۔ اوّل کی تین صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر رجوع کر لیا تو نکاح باقی رہے گا اور کفارۂ قسم دینا پڑے گا۔ اور اگر چار مہینے بلا رجوع کے گذر گئے تو طلاق بائن ہو جائے گی اب رجوع درست نہیں۔ البتہ جدید نکاح بدون حلالہ کے جائز ہے اور ایلاء کی آخری صورت یعنی چار مہینے سے کم کے لیے اگر قسم کھائی ہے۔ مثلاً تین مہینہ کے لیے قسم کھائی ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تین مہینہ کے اندر عورت کے پاس گیا تو کفارہ قسم دینا ہوگا اور نکاح باقی رہے گا اور اگر اپنی قسم کو پورا کیا یعنی تین ماہ کے اندر عورت کے پاس نہیں گیا تو تب بھی نکاح باقی رہے گا اور نہ طلاق واقع ہوگی اور نہ کفارہ لازم ہوگا۔

فائدہ ⑤: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رجوع کے لیے فقط اتنا کافی ہے کہ میں نے رجوع کر لیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا وطی کے رجوع نہیں ہوتا۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار کروائیں اپنے تئیں تین حیض تک اور ان کو حلال نہیں

اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ

کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں، اگر ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا

پچھلے دن پر اور ان کے خاوندوں کو پہنچتا ہے پھیر لینا اُن کا اتنی دیر میں اگر چاہیں

اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ

طرح کرنی اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ ان پر حق ہے موافق دستور کے اور مردوں کو

عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع ۲۸ ع ۱۲

ان پر درجہ ہے اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

حکم بست ودوم وسوم عدت طلاق ومدت رجعت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾﴾

ربط: ایلاء میں ایک محدود مدت یعنی چار مہینے کے لیے عورت سے علیحدگی ہوتی ہے اور طلاق میں غیر محدود مدّت کے لیے علیحدگی ہوتی ہے اس لیے محدود اور محصور (یعنی ایلاء) کے بعد غیر محدود اور غیر محصور (یعنی طلاق) کا ذکر مناسب ہوا۔ نیز ایلاء میں بعض مرتبہ عزم یعنی ارادہ رجوع کا ہوتا ہے۔ اس لیے ان آیات میں طلاق کے ساتھ رجعت کے احکام بھی بیان فرمائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور طلاق والی عورتیں جن پر کسی طرح سے طلاق پڑ چکی ہے خواہ بذریعہ ایلاء کے یا کسی اور طریقہ سے ان کو چاہیئے کہ تین حیض کے گزرنے کا انتظار کریں یعنی جب تک یہ تین حیض نہ گذر جائیں اس وقت تک کسی دوسری جگہ نکاح نہ کریں تا کہ اگر حمل ہو تو معلوم ہو جائے اور دوسرے کی اولاد اس کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان طلاق والی عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس چیز کو پوشیدہ رکھیں جو اللہ نے اُن کے رحموں میں پیدا کیا ہے۔ یعنی عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے حیض یا حمل کو چھپائیں کہ کسی طرح عدّت جلدی پوری ہو جائے یا شوہر کو طلاق رجعی میں رجعت کا حق باقی نہ رہے۔ غرض یہ کہ عورتوں کے لیے اپنے حمل یا حیض کو چھپانا جائز نہیں اگر وہ حقیقتاً اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ایمان خیانت کی اجازت نہیں دیتا اور طلاق رجعی کی صورت میں ان کے شوہر ان کو اپنی زوجیت میں واپس لانے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ خواہ یہ عورتیں رضامند ہوں یا ناراض۔ مگر یہ یاد رہے کہ شوہروں کو طلاق دینے کے بعد رجعت کی اجازت اس

شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ ان کا مقصود اس رجعت سے اصلاح اور خیر خواہی ہو جاہلیت کی طرح عورتوں کو ستانا اور پریشان کرنا مقصود نہ ہو یا اس طریق سے مہر کا معاف کرانا منظور نہ ہو۔ ستانے کی نیت سے رجعت اگرچہ صحیح ہے لیکن اس نیت سے رجعت کرنا گناہ ہے اور باعثِ سزا ہے ﴿اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ کی قید اور شرط اجازت خداوندی کی شرط ہے صحت رجعت کی شرط نہیں۔

رجعت ہر حال میں صحیح ہے مگر من جانب اللہ رجعت کی اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ نیت خیر خواہی اور اصلاح کی ہو اور اصلاح اور خیر خواہی اُس وقت مکمل ہوگی کہ جب ہر ایک دوسرے کا حق ادا کرے کیونکہ عورتوں کا بھی مردوں پر حق ہے جیسا کہ اُن پر مردوں کا حق ہے۔ دستور کے مطابق لیکن حقوق میں مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے اس لیے رجعت کا حق اور اختیار مردوں کو عطا کیا عورتوں کو نہیں دیا اور اللہ غالب ہے مظلوم کا ظالم سے بدلہ لینے پر قادر ہے پس اگر کوئی عورت پر ظلم کرے گا تو اس سے بدلہ لے گا اور بڑی حکمتوں والا ہے اس کا کوئی حکم حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ حکمت اور مصلحت اسی میں ہے کہ طلاق اور رجعت کا اختیار مردوں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ عورتیں کچھ تو کم عقل ہیں اور کچھ جلد باز اور بے صبری ہیں ان کے ہاتھ میں اگر طلاق اور رجعت کا اختیار دیدیا جاتا تو ہر شہر میں روزانہ ہزار طلاقیں پڑا کرتیں۔ اور پھر جب طلاق دینے کے بعد کچھ ہوش آتا اور اپنا اور اپنے بچوں کا انجام نظروں کے سامنے آتا تو سر پیٹتیں اور روتیں۔ عورتوں کو اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ اختیار نہیں دیا کیونکہ یہ اختیار اُن کی تباہی کا باعث ہوتا۔ بچوں اور عورتوں کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ ان کو اختیار نہ دیا جائے۔

فائدہ ①: آیت میں لفظ مطلقات اگرچہ عام ہے مگر یہاں مطلقات سے وہ خاص عورتیں مراد ہیں کہ جو آزاد ہوں۔ لونڈی اور باندی نہ ہوں اور اُن کو حیض بھی آتا ہو۔ نابالغ یا حاملہ نہ ہوں۔ اور اُن سے صحبت یا خلوتِ صحیحہ بھی ہو چکی ہو جن عورتوں میں یہ صفات پائی جائیں اُن کی عدّت تین حیض ہے اور اگر آزاد نہ ہوں بلکہ لونڈی اور باندی ہوں تو ان کی عدت دو حیض ہے اور ان کی طلاقیں بھی دو ہیں۔ اور اگر مطلقہ صغیر السن ہو یا بہت بوڑھی ہو گئی کہ حیض نہ آتا ہو تو اس کی عدّت تین ماہ ہے اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدّت وضع حمل ہے اور اگر صحبت یا خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دی گئی تو اس پر عدّت نہیں۔

فائدہ ②: لفظ ﴿قُرْءٍ﴾ اضداد میں سے ہے باتفاق ائمہ لغت حیض اور طہر دونوں پر بولا جاتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ﴿قُرُوْٓءٍ﴾ سے طہر کے معنی مراد ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت میں قروء سے حیض کے معنی مراد ہیں۔ خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے بھی یہی منقول ہے کہ قروء سے حیض کے معنی مراد ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

نیز عدت کی مشروعیّت سے غرض یہ ہے کہ رحم کا بچہ سے خالی ہونا معلوم ہو جائے اور یہ بات حیض ہی سے معلوم ہو سکتی ہے طہر سے معلوم نہیں ہو سکتی۔

فائدہ ③: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ سے صاف ظاہر ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے اور جو لوگ مرد اور عورت کی مساوات پر تقریریں کرتے ہیں وہ بے علم ہیں اور بے عقل بھی۔ اور جن پر نفسانی شہوتوں کا غلبہ ہے اُن کے نزدیک عورت کا درجہ مرد سے بڑھا ہوا ہے اللہ تعالیٰ عقل اور ہدایت دے۔ آمین

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌ م بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ م بِاِحْسَانٍ ط

طلاق ہے دو بار تک پھر رکھنا موافق دستور کے یا رخصت کرنا نیکی سے

حکم بست وچہارم۔ عدد طلاق رجعی

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص ...الیٰ... اَوْ تَسْرِيْحٌ م بِاِحْسَانٍ ط﴾

ربط: گزشتہ آیت میں مرد کے لیے حق رجعت کا بیان تھا۔ اب اس آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ رجعت کا حق کب تک رہتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: کہ جس طلاق کے بعد رجعت ہوسکتی ہے وہ دو مرتبہ ہے۔ پھر دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد تم کو دو اختیار ہیں یا تو دستور اور حسن اسلوب کے ساتھ روک لو یعنی رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دو اور یا حسن اسلوب کے ساتھ اس کو چھوڑ دو کہ اس کی عدت گزر جائے اور جہاں چاہے وہ نکاح کرے تم اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ

اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں کو مگر کہ وہ دونوں ڈریں کہ

اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ لا فَلَا

نہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے اللہ کے پھر اگر تم لوگ ڈرو کہ وہ نہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے اللہ کے تو نہیں

جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ج

گناہ دونوں پر جو بدلہ دے کر چھوٹے عورت یہ دستور باندھے ہیں اللہ کے سو اُن سے آگے نہ بڑھو

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کے قاعدوں سے سو وہی لوگ ہیں گنہگار

حکم بست وپنجم۔ خلع

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا ...الیٰ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

ربط: گزشتہ آیت میں طلاق کا ذکر فرمایا۔ اب اس آیت میں خلع کا ذکر فرماتے ہیں جو ایک قسم کی طلاق ہے یا طلاق کی طرح ایک قسم کا فسخ نکاح ہے۔ نیز گزشتہ آیت میں ﴿تَسْرِيْحٌ م بِاِحْسَانٍ ط﴾ کا حکم تھا اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ اگر بیوی سے خلع

کی نوبت آئے تو اس کو حسن سلوک اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کرو۔ یعنی مہر وغیرہ جو کچھ اُس کو دے چکے ہو وہ اُس سے واپس نہ لو۔ دیئے ہوئے کو واپس لینا تسریح باحسان کے خلاف ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ بیبیوں سے چھوڑنے کے وقت اُن سے اس مال میں سے کوئی شے واپس لو جو تم اُن کو نکاح کی حالت میں دے چکے ہو مگر جب کہ میاں بیوی دونوں کو یہ خوف ہو کہ ہم اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے یعنی آپس میں حقوق زوجیت نہ ادا کر سکیں گے تو ایسی صورت میں اگر مرد عورت سے کچھ مال لے کر اس کو چھوڑ دے اور عورت مال دے کر اپنے آپ کو اس کے نکاح سے چھڑا لے تو کوئی گناہ نہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ سو اگر تم کو اندیشہ ہو کہ میاں اور بیوی باہمی منافرت اور کدورت کے باعث حقوق زوجیت کے بارے میں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت کچھ فدیہ یعنی بدلہ دے کر نکاح سے اپنا پیچھا چھڑا لے تا کہ دونوں گناہ سے بچ جائیں ایسی صورت میں عورت کے لیے مال کا دینا اور مرد کے لیے مال کا لینا جائز ہے بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں پس اُن سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ سراسر ظالم ہیں اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے دین اور اخلاق اور عادات پر کوئی عیب نہیں لگاتی مگر میں اور وہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ میں نے برقع اٹھا کر بہت سے لوگوں میں اُن کو آتے ہوئے دیکھا تو سب سے زیادہ سیاہ فام اور پست قد اور بدصورت ثابت رضی اللہ عنہ ہی نظر آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس کو وہ باغیچہ واپس دے سکتی ہو جو اُس نے تم کو دیا ہے؟ کہا ہاں وہ بھی اور کچھ زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا کہ تم اس سے وہ باغیچہ واپس لے لو اور اس کو طلاق دے دو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یہ اسلام میں پہلا خلع تھا۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ

پھر اگر اس کو طلاق دے تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا

پھر اگر وہ شخص اس کو طلاق دے تب گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر مل جاویں اگر خیال رکھیں کہ ٹھیک رکھیں گے

حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

قاعدے اللہ کے اور یہ دستور باندھے ہیں اللہ کی بیان کرتا ہے واسطے جاننے والوں کے

حکم بست و ششم۔ حلالہ در طلاق ثالث

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ ... الٰی ... لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں دو طلاق کا حکم بیان فرمایا یعنی دو طلاق کے بعد تم کو ﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ﴾ اور ﴿اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ﴾

کا اختیار ہے۔ اب اس آیت میں تیسری طلاق کا حکم بیان فرماتے ہیں کہ تیسری طلاق کے بعد تم کو رجعت وغیرہ کا کوئی حق اور اختیار باقی نہیں رہتا بدون حلالہ کے تمہاری طرف واپس نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں پس اگر دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق بھی دیدے تو اس عورت کا تعلق اس سے بالکلیہ منقطع ہوجائے گا اس لیے کہ دو طلاق کے بعد تو رجعت کا امکان تھا۔ اور جب تیسری طلاق بھی دے دی تو اب رجعت کا کوئی موقع نہیں رہا طلاق کی وضع ہی مفارقت اور انقطاع کے لیے ہے تیسری طلاق سے نکاح کی حلت بالکلیہ ختم ہوگئی اور یہ عورت اس کے لیے بالکل حلال نہ رہے گی اب اس عورت سے نہ رجعت صحیح ہے اور نہ نکاح * جدید یہاں تک کہ یہ عورت عدت کے بعد پہلے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔ پھر اگر یہ دوسرا شوہر ہم بستری کے بعد اُس کو طلاق دے دے اور عدت بھی گذر جائے تو پھر کوئی گناہ نہیں کہ یہ عورت اور پہلا شوہر جدید نکاح کر کے بدستور سابقہ حالت کی طرف لوٹ جائیں اور زن وشوئی کے تعلقات قائم کرلیں۔ بشرطیکہ دونوں کو گمان غالب ہو کہ ہم اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے اس لیے کہ آئندہ امور کے متعلق جزم اور یقین کا حاصل ہونا نہایت مشکل ہے اس لیے کہ غیب کا علم کسی کو نہیں کہ آئندہ کیا ہوگا اور یہ یعنی تیسری طلاق کے بعد دوسرے شوہر سے نکاح کرنا اور پھر اس کا ہم بستری کے بعد طلاق دینا اور پھر شوہر اوّل اور عورت کا یہ گمان غالب ہونا کہ ہم دوبارہ نکاح کے بعد ایک دوسرے کے حقوق زوجیت میں کمی کرنے کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں گے۔ غرض یہ کہ یہ امور اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں جن سے تجاوز اور انحراف جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حدود اور احکام کو ایسے لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم اور فہم رکھتے ہیں اور اس بات کو سمجھتے ہیں کہ تیسری طلاق سے زوجیت اور محبت کا تعلق بالکل منقطع ہوجاتا ہے اور محبت اور موانست مبدل بکراہت ومنافرت ہوجاتی ہے اس لیے اس کراہت و منافرت کے ازالہ کے لیے یہ ضروری ہوا کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے اور اس کی لذت چکھنے کے بعد اگر طلاق ہوجائے تو پھر شوہر اوّل سے تعلق کی تجدید ہوسکتی ہے۔

فائدہ آیت قرآنیہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تین طلاق کے بعد رجعت کا حق باقی نہیں رہتا خواہ وہ تین طلاقیں علیحدہ علیحدہ دی ہوں یا اکٹھی دی ہوں۔ تمام صحابہؓ اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین کا اس پر اجماع ہے کہ تین طلاقیں جس طرح بھی دی جائیں خواہ مجتمعاً اور خواہ متفرقاً وہ واقع اور لازم سمجھ جائیں گی۔ صرف بعض اہل ظاہر اور بعض حنبلیوں کا قول ہے کہ تین طلاق دینے سے ایک طلاق پڑتی ہے اور شیعوں کے نزدیک تین طلاق دینے سے ایک طلاق بھی نہیں پڑتی اور داؤد ظاہریؒ سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ دفعۃً تین طلاق دینے سے ایک طلاق بھی نہیں پڑتی۔ (کما سیأتی فی کلام القرطبیؒ) امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کہ جن کی تقلید اور اتباع پر (سوائے چند ظاہر بین اور خودرائے لوگوں کے) امت محمدیہ کے علماء اور فقہاء اور محدثین اور مفسرین متفق ہیں اُن کا متفقہ اور اجماعی فتویٰ یہ ہے کہ تین طلاقیں دینے سے تین ہی طلاق واقع ہوتی ہیں۔ اور اسی کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اختیار فرمایا۔ جس کے لیے صحیح بخاری میں ایک خاص باب منعقد فرمایا۔

"باب من جاز الطلاق الثلاث" بقوله تعالىٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ... الاٰية﴾.

قال الامام القرطبی اتفق ایمة الفتوی علی لزوم ایقاع الطلاق فی کلمة واحدة وهو قول جمهور

---

* طلاق رجعی میں رجعت ہوسکتی ہے اور طلاق بائن میں اسی شوہر سے تجدید نکاح ہوسکتا ہے اور تیسری طلاق کے بعد اسی شوہر سے تجدید نکاح بھی جائز نہیں جب تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کو طلاق دے تب شوہر اوّل سے تجدید نکاح ہوسکتا ہے۔

السلف و شز طاؤس و بعض اهل الظاهر الى ان طلاق الثلاث فى كلمة واحدة يقع واحدة و يردىٰ هذا عن محمد بن اسحاق و حجاج بن ارطاة وقيل عنهما لا يلزم منه شيء وهو قول مقاتل۔ و يُحكى عن داؤدانه لا يقع و جمهور السلف والأمة انه لازم واقع ثلاثاولافرق بين ان يرفع ثلاثا مجتمعة فى كلمة او متفرقة فى كلمات الخ ص ۱۲۹ ج ۳ و قال فى ص ۱۲۸ ج۳ و ترجم البخارى علىٰ هذه الاية باب من اجاز الطلاق الثلاث بقوله تعالىٰ الطلاق مرتٰن نامساك بمعروف او تسريح باحسان۔ وهذا اشارة منه الى ان هذا التعديد انما هو فسحة لهم فمن ضيّق على نفسه لزمه. اھ

بعدازاں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام شبہات کا جواب دیا کہ جولوگ تین طلاق کوایک طلاق بنانے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ حضرات اہل علم اصل کی مراجعت فرمائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تمام فقہا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ اور اتفاق سے یہ حکم دیا گیا کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دے گا وہ تین ہی شمار ہوں گی اور جو اس کے خلاف کرے گا اُس پر دُرّے پڑیں گے اور سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔ اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی یہی فتویٰ ہے تفصیل کے لیے بخاری شریف اور ہدایہ کی شروح کی مراجعت کی جائے۔

نصیحت : مسلمانوں کو چاہیے کہ تین طلاق کے بارہ میں کتاب وسنت اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اور اجماع ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم کا اتباع کریں اس زمانہ کے چند مدعیان عمل بالحدیث کے کہنے سے حرام کے مرتکب نہ ہوں اور اپنے نسب کوخراب نہ کریں۔ جو شخص اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کو حجت نہ سمجھے وہ اہل سنت والجماعت سے نہیں۔

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما:

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں دو سال تک تین طلاقیں ایک شمار کی جاتی تھیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاقیں جاری کردیں بعض ظاہر پرست اس روایت کو دیکھ کر اس طرف چلے گئے کہ تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مصلحت سے تین طلاق کو تین طلاق قرار دے دیا تھا ابن تیمیہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم حنبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے برخلاف اور تمام صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے اجماع کے برخلاف اور ائمۂ مجتہدین کے برخلاف اور تمام اہل سنّت والجماعت کے برخلاف شذوذ اور تفرد میں مبتلا ہوئے اور شیعوں کی طرح تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کے قائل ہوئے۔ اہل سنت والجماعت کا اجماعی مسلک یہ ہے کہ تین طلاق دینے سے تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں اور تین طلاق سے عورت مغلظہ بائنہ ہوجاتی ہے۔ سب سے پہلے شیخ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ اور عز بن جماعہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہما نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا رَدّ کیا جو ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر اور ہم شہر تھے اور یہ واضح کردیا کہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسئلہ طلاق میں تفرد اور شذوذ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اُن مسائل میں سے ہے جن میں ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اور اجماع ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم کے خلاف کیا ہے اور مذاہب اربعہ میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہوا اور ہر زمانہ میں علماء نے اس مسلک کی تردید میں کتابیں اور رسالے لکھے اور بخاری اور مسلم کے شارحین نے خاص طور پر شرح حدیث میں اس مسلک کا بطلان اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تردید کی ہے۔

اہل سنّت والجماعت کے دلائل

① تمام صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم سے ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ اور ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ کی تفسیر اسی طرح منقول ہے کہ دو طلاق کے بعد خواہ مجتمعاً ہوں یا متفرقاً زوج کو رجعت کا حق رہتا ہے اور تین طلاق کے بعد خواہ وہ مجتمعاً ہوں یا متفرقاً رجعت کا حق باقی نہیں رہتا بے شمار روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ شروع اسلام میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ بے حد و حساب طلاقیں دے دیتے تھے حتیٰ کہ سو سو اور ہزار ہزار طلاقیں دے دیتے تھے، اور جب عدت گذرنے کے قریب ہوتی تو اس سے رجعت کر لیتے۔ پھر اسی طرح ستانے کے لیے اس کو طلاق دے دی پھر رجعت کر لی۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ... الیٰ الآخرہ﴾ اللہ تعالیٰ نے طلاق کی حد مقرر کر دی کہ آخری حد تین ہے ایک اور دو طلاق کے بعد تو رجعت کا حق ہے اور تین یعنی تیسری طلاق کے بعد رجوع کا اختیار نہیں رہتا۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۱ ج ۱)

② صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ہے کہ عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کو لفظ واحد میں تین طلاقیں دیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

③ صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور نسائی میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ بعد ازاں اُس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور اس دوسرے شوہر نے اُس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں جب تک دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح صحبت اور مباشرت نہ کر لے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۸ ج ۱)

④ حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا در قصہ رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ جس کا مضمون گزشتہ روایت کے قریب قریب ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں آیت مذکورہ کو اور ان تینوں حدیثوں کو ذکر فرمایا اور ائمۂ اربعہ کے مطابق طلاق ثلاث کے جواز کے لیے ایک ترجمہ منعقد فرمایا: (باب من اجاز الطلاق الثلاث) دیکھو فتح الباری ص ۳۱۵ ج ۹۔ بعد ازاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور باب منعقد فرمایا وہ یہ ہے: باب اذا طلقها ثلاثا ثم تزوجت بعد العدة زوجا غيره فلم يمسها. اور اس باب میں رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل فرمائی۔ (دیکھو فتح الباری ص ۴۰۸ ج ۹)

⑤ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں ایک باب قصة فاطمة بنت قيس رضی اللہ عنہا کے عنوان سے منعقد کیا۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو اس کے شوہر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین طلاقیں دے دی تھیں چونکہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے مزاج میں کچھ حِدَّت تھی اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو دوسرے گھر میں عدت گزارنے کی اجازت دے دی تھی۔ (دیکھو فتح الباری ص ۴۲۳ ج ۹)

⑥ معجم طبرانی اور سنن بیہقی میں سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عائشہ خثعمیہ رضی اللہ عنہا امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ جب علی کرم اللہ وجہہ شہید ہوئے تو خثعمیہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو مبارک باد دی اور یہ کہا: لتهنك الخلافة۔ خلافت آپ کو مبارک ہو امام حسن رضی اللہ عنہ کو سخت ناگوار گذرا اور کہا: کہ کیا تجھ کو علی رضی اللہ عنہ کے قتل سے خوشی ہوئی۔ اذهبي فانت طالق ثلاثا. "جا تجھے تین طلاق۔"

اور امام حسن رضی اللہ عنہ نے بقیہ مہر اس کا بھیج دیا اور مزید براں دس ہزار درہم اور بھیج دیئے عائشہ خثعمیہ رضی اللہ عنہا کو بہت صدمہ ہوا اس پر امام حسن رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ اگر میں اپنے جد امجد یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نہ سنے ہوئے ہوتا تو رجوع کر لیتا وہ قول یہ ہے۔

((ایما رجل طلق امرأته ثلاثا عند الاقراء او ثلاثة مبهمة لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره)).

ترجمہ: "جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے حیض کے وقت یا اور کسی طرح تو وہ اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔"

⑦ مسند امام احمد میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر اُس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور اس نے اس کو طلاق قبل الدخول دے دی تو کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ جب تک شوہر ثانی شوہر اوّل کی طرح مباشرت نہ کرے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۷ ج ۱)

⑧ اور اسی طرح کے مضمون کی ایک حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۷ ج ۱)

حضرت عمر و حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہم:

محلّی ابن حزم میں اور زاد المعاد اور آغاثۃ اللہفان لابن القیم میں۔ اور سنن بیہقی میں حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا باسانید صحیحہ یہ قول نقل کیا ہے کہ تین طلاق دینے سے عورت مغلظہ بائنہ ہو جاتی ہے۔ بدوں حلالہ کے اُس سے نکاح صحیح نہیں شیخ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ خلفاء اور عبادلہ سے صراحۃً یہ ثابت ہے کہ تین طلاق دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

اور اسی پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے کہ تین طلاق دینے سے تین طلاق واقع ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ علامہ زرقانی نے شرح مؤطا میں حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ سے اجماع نقل کیا ہے اور قاضی ابو الولید باجی رحمۃ اللہ علیہ نے منتقی میں اور امام ابو بکر رازی رحمۃ اللہ علیہ جصاص نے احکام القرآن میں اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح معانی الآثار میں اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے اور حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے:

فالراجح فى الموضعين تحريم المتعة وايقاع الثلاث للاجماع الذى انعقد فى عهد عمر رضی اللہ عنہ على ذلك ولا يحفظ ان احدا فى عهد عمر خالفه فى واحدة منهما وقد دل اجماعهم على وجود ناسخ وان كان خفى على بعضهم قبل ذلك حتى ظهر لجميعهم فى عهد عمر فالمخالف بعد هذا الاجماع منابزله والجمهور على عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق والله اعلم. (فتح الباری ص ۳۱۹ ج ۹)

اور حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ جو بچپن سے حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہما کی صحبت میں رہے جب ان پر یہ منکشف ہوا کہ ہمارے استاد ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہما بہت سے مسائل میں سلف صالحین کے خلاف ہیں تو اپنی تصانیف میں انکار کیا۔ اور اس مسئلہ یعنی طلاق ثلاث کے بارہ میں ایک خاص کتاب ان کے ردّ میں لکھی جس کا نام۔ بیان مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلث

واحدۃ رکھا۔اس کتاب مذکور میں حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اعلم انه لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم فى الفتاوى فى الحلال والحرام شيء صريح فى ان الطلاق الثلاث بعد الدخول يحسب واحدة اذا سبق بلفظ واحداه كذانى الاشفاق على احكام الطلاق للعلامة الكوثرى رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۵ وقال ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ لا نعلم من الامة احدا خالف فى هذه المسألة مخالفة ظاهرة ولا حكما...ولا تضاء ولا علما ولا افتاء ولم يقع ذلك الامن نفريسير جدا وقدا نكره عليهم من عاصرهم غاية الانكار و كان اكثرهم يستخفى بذلك ولا يظهر فكيف يكون اجماع الامة على اخفاء دين الله الذى شرعه على لسان رسوله واتباع اجتهاد من خالفه برأيه فى ذلك هذالا يحل اعتقاده البتة۔اھ۔ولعله ظهر بهذا البيان ان امضاء عمر للثلاث حكم شرعى مستمد من الكتاب والسنة مقارنا لا جماع فقهاء الصحابة نضلا عن التابعين ومن بعدهم و ليس بعقوبة سياسية ضد حكم شرعى فالخارج على امضاء عمر خارج على ذلك كله والله اعلم. كذافى الاشفاق على احكام الطلاق للعلامة الكوثرى ص ۵۳.

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب

حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری ص ۳۱۷ ج ۹ میں جمہور کی طرف سے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آٹھ جواب دیئے ہیں جن میں سے چند ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

جواب اوّل: ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت جس کو طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے شاذ ہے آیتِ قرآنیہ اور احادیث صحیحہ ومشہورہ اور اجماع صحابہ اور خلفاء راشدین کے فیصلہ کے خلاف ہے امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ سعید بن جبیر اور مجاہد اور عطا اور عمرو بن دینار اور مالک بن حویرث اور محمد بن ایاس اور نعمان بن ابی عیاش رضی اللہ عنہم اجمعین یہ تمام اکابر ثقات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دے دے تو اس کے بارہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ یہ تھا کہ اس شخص نے خدا کی نافرمانی کی کہ یک دم تین طلاقیں دے دیں۔اس کی بیوی اس سے بائنہ ہوگئی بغیر دوسرے شخص سے نکاح کیے اور طلاق حاصل کیے بغیر پہلے شوہر سے نکاح نہیں کرسکتی ان ائمہ اکابر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو کچھ روایت کیا ہے وہ جماعت صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے مطابق ہے۔اور اس امر کی دلیل ہے کہ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت نقل کی ہے (تین طلاق ایک سمجھی جاتی تھیں) وہ بالکل ضعیف اور کمزور ہے۔یہ ممکن نہیں کہ ابن عباس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف کریں۔حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت وہم اور غلط ہے۔حجاز اور شام اور مصر اور مشرق اور مغرب کے علماء میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں گیا کہ تین طلاق کو ایک قرار دیا جائے۔(تفسیر قرطبی ص ۱۲۹ ج ۳)

نیز یہ امر تواتر کو پہنچا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ فتویٰ دیا کرتے تھے کہ تین طلاق دینے سے تین ہی طلاقیں پڑتی ہیں اور تین طلاق کے بعد عورت مغلظہ بائنہ ہوجاتی ہے۔امام ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ان کے پاس محفوظ ہو اور وہ ہمیشہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے رہیں۔پس اولیٰ اور مقتضائے احتیاط یہی ہے کہ ایک قول کے

مقابلہ میں جماعت کے قول کو ترجیح دی جائے۔ (فتح الباری ص ۳۱۷ ج ۹)

قاضی ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے پس اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں اس کو کیسے مقدم رکھا جاسکتا ہے۔ (فتح الباری ص ۳۱۷ ج ۹)

جواب دوم: یہ کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما منسوخ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ اور اتفاق سے تین طلاقوں کو جاری کرنا اور صحابہ میں سے کسی کا خلاف نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اس حکم کا ناسخ ثابت ہوا ہے جس کی بنا پر یہ حکم جاری کیا امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت کیا ہے کہ غالباً یہ حکم پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ سنن ابی داؤد میں باسناد صحیح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ اپنی اس روایت مذکورہ کے خلاف فتویٰ دیا کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کسی ذریعہ سے اس روایت کا منسوخ ہونا معلوم ہوا جب ہی تو فتویٰ اس کے خلاف دیا کرتے تھے۔ (فتح الباری ص ۳۱۷ ج ۹)

عقلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آمادہ کریں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالاتفاق بلا چون و چرا حدیث کے خلاف ان کے حکم کو قبول کرلیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما (جو تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کے راوی ہیں) وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ بھی یہ عرض نہ کریں کہ اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! آپ کا تین طلاقوں کو تین بنا دینا ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں تو تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی رہیں۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف کیسے حکم جاری کیا اور یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مصلحت سے یہ حکم جاری کیا یہ کمالِ ابلہی اور بے باکی ہے، یہ ناممکن اور محال ہے کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کسی سیاست اور مصلحت کی بناء پر حکم نبوی کے خلاف کوئی حکم جاری کریں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی متنفس زبان بھی نہ ہلائے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان کو یاد نہ دلائے۔

جواب سوم: مان لو کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما دربارۂ وحدت طلاق صحیح ہے لیکن آیت قرآنی ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ... الیٰ... فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ کے صحیح اور صریح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہوسکتا اور علیٰ ہذا دیگر روایات صریحہ میں سے تین طلاق ہونا ثابت ہے۔ ان کے صحیح ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تو حاصل یہ نکلا کہ طلاق ثلاث کے مسئلہ میں ایک مختلف فیہ روایت تو ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور باقی تمام احادیثِ صحیحہ وصریحہ اور آیت قرآنیہ تین طلاق کے تین ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں یہ مسئلہ پیش ہوا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بمشورہ عثمان وعلی ودیگر اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اُن روایتوں کو ترجیح دی جو تین طلاق کے تین طلاق واقع ہونے پر دلالت کرتی تھیں تو امت کا فریضہ یہ ہے کہ احادیث مختلفہ میں جس جانب کو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلا اختلاف اختیار کرلیں۔ اگرچہ وہ حدیث باعتبار سند کے ضعیف ہو اسی جانب کا اتباع ضروری ہوگا اور جس چیز پر خلفاءے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متفق ہو گئے ہوں اُس کی مخالفت ناجائز ہوگی اور یہی ائمہ اربعہ اور تمام محدثین کا مسلک ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تین طلاق دینے سے تین طلاق کا واقع ہونا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور اجماع صحابہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہم کے حکم اور عثمان اور علی اور فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کے اتفاق سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے آنکھ بند کرلینا اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی پروانہ کرنا نزغۂ رافضیہ اور شیوۂ شیعیت ہے اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے۔ آمین ثم آمین

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو، پھر پہنچیں اپنی عدّت تک تو رکھ لو اُن کو دستور سے

اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ

یا رخصت کرو دستور سے اور مت بند کرو اُن کے ستانے کو تاکہ زیادتی کرو اور

مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫

جو کوئی یہ کام کرے اُس نے بُرا کیا اپنا ۔ اور مت ٹھہراؤ حکم اللہ کے ہنسی

وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ

اور یاد کرو احسان اللہ کا جو تم پر ہے اور وہ جو اتاری تم پر کتاب اور کام کی باتیں

يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع ۲۹ ع ۳ ۱۳

کہ تم کو سمجھاوے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب چیز جانتا ہے۔

حکم بست وہفتم۔ منع از اضرارِ نساء وزجر از لعب باحکام خداوندی

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ... الٰی... وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع﴾

ربط: گزشتہ آیت یعنی ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ﴾ میں یہ بیان فرمایا تھا کہ طلاق رجعی میں تم کو دو اختیار ہیں یا تو حُسن اسلوب کے ساتھ اس کو روک لو یا خوبصورتی کے ساتھ اُس کو رخصت کردو۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں: کہ جو کچھ بھی کرو تمہیں اختیار ہے لیکن عورتوں کو تکلیف اور ضرر پہنچانے کے ارادہ سے نہ کرو۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق رجعی دو اور پھر وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں یعنی اُن کی عدّت اور میعاد قریب الختم ہو مگر ابھی ختم نہ ہوئی ہو۔ پس اگر اُن کو اپنے نکاح میں رکھنا منظور ہے تو اچھے طریق سے اُن سے رجعت کر کے اُن کو اپنے نکاح میں روک لو یا اُن کو اپنی زوجیت میں رکھنا مقصود نہ ہو تو پھر خوبصورتی کے ساتھ ان کو رخصت کردو کہ وہ اپنی عدت گذار کر جہاں چاہیں نکاح کریں اور ستانے اور ایذاء دینے کے لیے ان کو نہ روکو یعنی ایذاء پہنچانے کی غرض سے ان سے رجعت نہ کرو تا کہ روک کر اُن پر کچھ ظلم اور زیادتی کرو۔ جیسا کہ جاہلیت کا طریقہ تھا کہ بیوی کو ستانے کی غرض سے طلاق دیتے اور پھر جب عدت پوری ہونے کے قریب ہوتی تو رجعت کر لیتے اور پھر طلاق دیتے اور پھر اسی طرح کرتے رہتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ایسا مت کرو اور جو شخص ایسا کام کرے گا۔ پس بلاشبہ اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا اور اے مسلمانو تم ان جاہلوں کی طرح اللہ کے احکام کو تمسخر اور ٹھٹھا نہ بناؤ۔

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پہلے لوگوں کی حالت یہ تھی کہ اوّل طلاق دے دیتے اور پھر یہ کہتے کہ ہم نے تو مذاق کیا تھا۔ اور اسی طرح غلام اور لونڈی کو آزاد کر دیتے اور پھر کہتے کہ ہم نے تو مذاق کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۘ وَّاذْكُرُوْا﴾ اور حدیث شریف میں ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا جد یعنی حقیقت تو حقیقت ہی ہے۔ مگر ان کا ہزل یعنی اُن کا ہنسی اور مذاق کے طور پر کہنا بھی حقیقت ہی کا حکم رکھتا ہے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: ① نکاح ② طلاق ③ اور رجعت۔ یعنی ان چیزوں میں تمہارے الفاظ کا اعتبار ہے نیت کا اعتبار نہیں۔ بندہ کے جن اعمال کا تعلق فقط حق تعالیٰ سے ہو وہاں شریعت نے نیت کا اعتبار کیا ہے اور جو اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ وہاں الفاظ کی لفظی دلالت کا اعتبار ہے نیت کا اعتبار نہیں۔ طلاق اور رجعت بھی اسی قبیل سے ہیں۔ طلاق اور رجعت میں الفاظ کا اعتبار ہوگا نیت کا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ اگر معاملات اور معاشرات میں ظاہر الفاظ کے خلاف نیت کا اعتبار کیا جائے تو دوسروں کے حقوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ معاشرات اور معاملات میں اگر الفاظ کی دلالت کا اعتبار نہ ہو اور لوگوں کی نیت کے مطابق فیصلے ہونے لگیں تو کارخانۂ عالم درہم برہم ہو جائے۔ خود غرض لوگ طلاقیں دیں گے اور پھر عورتوں کو روکنے کے لیے اپنی نیتوں کو بہانہ بنائیں گے اور اس طرح عورتوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائیں گے۔ اور اللہ کی نعمت کی یاد کرو کہ اُس نے تم پر احسان کیا کہ تم کو عورتوں پر حاکم بنا دیا اور اگر وہ چاہتا تو تم کو عورتوں کے ہاتھ تلے کر دیتا اور پھر وہ بھی اسی طرح تمہارے ستانے پر قادر ہوتیں۔ اس لیے تم کو چاہیے کہ اللہ کی نعمت کا شکر کرو اور اس کی نعمت کو یاد کرو کہ اُس نے تم پر کتاب اور حکمت کو اُتارا یعنی قرآن کریم اور سنت نبوی تم کو عطا کی تا کہ تم اپنے علم اور عمل کی اصلاح کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ کتاب وسنت کے مقتضی پر چلو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے طلاق اور رجعت سے جو نیت بھی کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچ چکیں اپنی عدّت کو تو اب نہ روکو ان کو کہ نکاح کر لیں

اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ

اپنے خاوندوں سے جب راضی ہو جاویں آپس میں، موافق دستور کے، یہ نصیحت ملتی ہے اس کو،

كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ

جو کوئی تم میں یقین رکھتا ہے اللہ پر، اور پچھلے دن پر اسی میں سنوار زیادہ ہے تم کو اور ستھرائی

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حکم بست وہشتم۔ منع از اضرارِ نساء بعد از عدت

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ ... الیٰ ... وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۲﴾

ربط: گزشتہ آیات میں اندرون عدت ضرر پہنچانے کی ممانعت کا بیان تھا۔ اس آیت میں عدت گزرنے کے بعد ضرر پہنچانے کی ممانعت کا بیان ہے کہ عدت گزرنے کے بعد عورتوں کو نکاح سے نہ روکو۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور جب تم یعنی تمہارا کوئی عزیز عورتوں کو طلاق دے دے اور پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی ان کی عدت پوری ہوجائے اور وہ پھر اپنے سابق شوہر سے یا کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو اپنے پہلے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ شریعت اور مروت کے دستور کے مطابق نکاح کرنے پر باہم رضامند ہوجائیں۔ البتہ اگر عورت غیر کفو میں نکاح کرنے لگے یا عدت کے اندر کسی دوسرے سے نکاح کرنے لگے تو پھر خویش اور اقارب کو ایسے نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے۔

یہ آیت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ معقل رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا ایک شخص سے نکاح کر دیا تھا۔ بعد چندے اس شخص نے ان کی بہن کو طلاق دے دی عدت گزرنے پر پھر اسی شخص نے پیغام دیا۔ معقل رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے پہلے تم سے اپنی بہن کا نکاح کیا اور تمہارا گھر بسایا مگر تم نے اس کو طلاق دے دی اور اب پھر پیغام لے کر آئے ہو۔ خدا کی قسم اب وہ تمہارے گھر ہرگز نہیں جاسکتی معقل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ آدمی کچھ بُرا نہ تھا اور میری بہن بھی اس کے یہاں جانا چاہتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ... الآیۃ﴾ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! خدا کی قسم میں ضرور اس سے نکاح کردوں گا۔ اور پھر میں نے اسی شخص سے اپنی بہن کا نکاح کر دیا۔ یہ نصیحت اس شخص کو کی جاتی ہے کہ جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ نصیحت اسی کو فائدہ دیتی ہے جسے خدا کا خوف اور آخرت کا یقین ہو۔ اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو کچھ تم کو نصیحت اور ہدایت کی گئی یہی تمہارے لیے خیر اور برکت اور طہارت اور نزاہت کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ عورتوں کو نکاح سے روکنے میں کیا مضرتیں اور کیا خرابیاں ہیں اور تم پیش آنے والے مفاسد کو نہیں جانتے اگر باوجود باہمی رضامندی اور رغبت کے تم نے عورتوں کو نکاح سے روکا تو شیطان طرفین کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالے گا اور اس طرح سے دلوں کی طہارت اور نزاہت کو مکدر کرے گا اور عجب نہیں کہ نکاح سے روکنا خود اہل خانہ سے ناجائز تعلقات کا ذریعہ نہ بن جائے۔ ﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ﴾ کے یہ معنی ہیں خوب سمجھ لو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ
اور لڑکے والیاں دودھ پلا دیں اپنے لڑکوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ
يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ
پوری کرے دودھ کی مدت اور لڑکے والے پر ہے کھانا اور پہننا ان کا موافق دستور کے

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا

تکلیف نہیں کسی شخص کو مگر جو اس کی گنجائش ہے نہ ضرر چاہے ماں اپنی اولاد کا، اور نہ

مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا

لڑکے والا اپنی اولاد کا اور وارث پر بھی یہی ذمہ ہے پھر اگر دونوں چاہیں دودھ چھڑانا

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ

آپس کی رضا سے اور مشورت سے تو ان کو نہیں گناہ اور اگر تم مرد چاہو

اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ

کہ دودھ پلوا لو اپنی اولاد کو تو تم پر نہیں گناہ جب حوالہ کر دیا جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

موافق دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

حکم بست ونہم۔ متعلق بہ رضاع

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ ... اِلٰى ... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں عورتوں کے احکام کا بیان تھا یعنی طلاق اور عدت اور رجعت کے احکام کا ذکر تھا۔ اب ان آیات میں بچوں کے کام بیان فرماتے ہیں یعنی رضاعت کی مدت اور اس کی اُجرت کے احکام بیان فرماتے ہیں کہ بچہ والی عورتوں کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں۔ اگرچہ ان کے شوہروں نے اُن کو طلاق دے دی ہو اور یہ مدت اس کے لیے ہے کہ جو شیر خوارگی کو مکمل کرنا ہے اور جو مدت رضاعت کو پورا کرنا نہ چاہے تو اس کو اختیار ہے کہ دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑا دے اور باپ پر جس کے لیے ل یہ بچہ پیدا کیا گیا کیونکہ بچہ باعتبار نسب کے باپ ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اُن دودھ پلانے والیوں کا کھانا اور پہنانا دستور کے مطابق واجب ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کسی نفس کو کسی حکم کا مکلف نہیں بنایا جاتا مگر اس کی طاقت اور گنجائش کے موافق لہذا اماں کو بچہ کی وجہ سے کوئی ضرر اور نقصان نہ پہنچایا جائے اور علیٰ ہذا نہ باپ کو لڑکے کی وجہ سے کوئی تکلیف دی جائے یعنی طلاق ہو جانے کے بعد ماں کو یہ نہ چاہیے کہ دودھ پلانے میں نخرے کرے اور شوہر سے نفقہ اور اُجرت دستور سے زیادہ مانگے یا بچہ کی خبر گیری میں کمی کرے اور علیٰ ہذا باپ کو یہ نہ چاہیے کہ ضد میں بجائے ماں کے کسی انّا سے دودھ پلوائے اور اس کو تو اُجرت دے مگر ماں کو دودھ پلانے کی اُجرت نہ دے یا ماں کی اُجرت میں کمی کرے۔

غرض یہ کہ دودھ پلانے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو پھر اسی طرح کا خرچ وارث کے ذمہ ہے۔ وارث کی تفسیر میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وارث سے ذی رحم محرم مراد ہے اس لیے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ﴿وَ عَلَى الْوَارِثِ ذِي الرَّحِمِ الْمَحْرَمِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ آیا ہے۔ اور ایک قراءت دوسری قراءت کی مفسر ہوتی ہے یعنی وارث سے وہ ذی رحم محرم مراد ہے کہ اگر بچہ مر جائے تو یہ اس کا وارث بنے بقدر میراث کے سب پر خرچ لازم ہوگا۔ مثلاً اگر ذی رحم محرم دو بھائی یا دو بہنیں ہیں تو دونوں سے نصف نصف لیا جائے گا اور اگر ایک بھائی اور ایک بہن ہے تو بھائی سے دو ثلث اور بہن سے ایک ثلث لیا جائے گا اور وارثوں پر خرچہ اس صورت میں ہے کہ خود بچہ کے پاس مال نہ ہو ورنہ اگر بچہ کے پاس مال ہے تو پھر تمام خرچ اسی کے مال میں سے دیا جائے گا اور امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ وارث سے خود وہ لڑکا ہی مراد ہے جو اپنے متوفی باپ کا وارث ہے اس کے دودھ پلانے کی اُجرت اسی کے مال میں سے لی جائے گی اور اگر اُس کے پاس مال نہ ہو تو پھر ماں کے ذمہ ہے اور بچہ کے خرچہ کے لیے سوائے والدین کے کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ پس اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورہ سے دو برس سے پہلے ہی دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر اس بارہ میں کوئی گناہ نہیں اور اگر تم کسی ضرورت یا مصلحت کی وجہ سے یہ ارادہ کرو کہ اپنے بچوں کو بجائے ماں کے کسی دایہ کا دودھ پلوانا چاہو بشرطیکہ تم حوالہ اور سپرد کر دو جو کچھ تم نے دینا مقرر کیا تھا دستور کے موافق یعنی دودھ پلانے والی کا حق پورا دے دینا اس میں سے کچھ کمی نہ کرنا کسی کا حق مارنا یا کاٹنا بہت بُری بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ جو احکام ماؤں اور دودھ پلانے والیوں کے متعلق دیئے گئے ہیں اس کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس بات کو پیش نظر رکھو کہ تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے کہ طلاق دے دینے کے بعد ماں سے دودھ پلوانے میں یا ماں کے ہوتے ہوئے کسی انّا سے بچہ کو دودھ پلوانے میں کوئی نفسانی غرض تو شامل نہیں کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مگر حق تعالیٰ تمہارے دل کے خیالات اور نفس کے خطرات کو بھی دیکھتا ہے۔

فائدہ ①: طلاق کے بعد اکثر و بیشتر میاں اور بیوی کے درمیان میں ایک قسم کی عداوت اور منافرت پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص کر جب کہ طلاق ایسی حالت میں ہو کہ گود میں شیر خوار بچہ بھی ہو تو یہ باہمی منافرت اور کدورت ایک قسم کی مخاصمت اور منازعت کا سبب بن جاتی ہے اور پہلے شوہر کو بچہ کی پرورش میں عجب دشواری پیش آتی ہے کبھی مرد یہ چاہتا ہے کہ بچہ کو ماں سے چھین کر کسی اور عورت سے دودھ پلوائے اور اس طرح بے چاری ماں کو فراق میں تڑپائے اور کبھی عورت بچہ کو دودھ پلانے سے اس لیے انکار کرتی ہے کہ ظاہر میں کوئی اور دودھ پلانے والی موجود نہیں۔ پہلا شوہر مجبور ہو کر میری خوشامد کرے گا اور جو معاوضہ مانگوں گی وہ مجبوراً دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں فیصلہ فرما دیا کہ مائیں دو برس تک بچہ کو دودھ پلائیں اور باپ کے ذمہ اس کے معاوضہ میں اس کا کھانا اور پہنانا واجب ہوگا۔ ایک دوسرے کو ضرر اور نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ کرے اور نہ کسی کا حق کاٹے۔

فائدہ ②: مدت رضاعت جمہور کے نزدیک دو سال ہیں اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اڑھائی سال یعنی تیس مہینے ہیں جیسا کہ ﴿حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ میں مذکور ہے۔ تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جائے۔

فائدہ ③: یہ آیت اگرچہ مطلقہ عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی مگر بیوی بھی اس حکم میں داخل ہے اور اگر بچہ کو دودھ پلانے کی وجہ سے بیوی کو کچھ دیا جائے تو حق زوجیت اس کے لیے مانع نہیں۔

فائدہ ④: ماں اگر معذور نہ ہو تو دیانۃً اس کے ذمہ بچہ کو دودھ پلانا واجب ہے اور منکوحہ کے لیے یا اُس مطلقہ کے لیے جو ابھی تک

عدت میں ہو اُجرت لینا جائز نہیں البتہ عدت گزرنے کے بعد اُجرت دینا واجب ہوگی۔

فائدہ ⑤: ماں کا دودھ اگر بچہ کے لیے مضر ہو تو ایسی صورت میں کسی اور عورت سے دودھ پلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ
اور جو لوگ مر جائیں تم میں اور چھوڑ جائیں عورتیں وہ انتظار کرواویں اپنے تئیں
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
چار مہینے اور دس دن پھر جب پہنچ چکیں اپنی عدت کو تو تم پر نہیں گناہ
فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾
جو وہ اپنے حق میں کریں موافق دستور کے اور اللہ کو تمہارے کام کی خبر ہے۔

حکم سی ام۔ عدتِ وفات زوج

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ... اِلٰی ... وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں عدت حیات یعنی عدتِ طلاق کو بیان فرمایا اور اسی کے ساتھ اثناءِ عدت میں مدّتِ رضاعت اور اُجرتِ رضاعت کا حکم بیان فرمایا۔ اب ان آیات میں عدت حیات کے بعد عدت وفات کو بیان فرماتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ عدتِ وفات اور عدتِ حیات الگ الگ ہیں اور جو لوگ تم میں سے اپنی عمر کو پوری کر کے دنیا سے چلے جائیں اور بیبیوں کو دنیا میں چھوڑ جائیں تو ان کو چاہیے کہ چار مہینے اور دس دن اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں جب تک یہ مدت نہ گزر جائے کہیں نکاح نہ کریں۔ پس جب کہ وہ اپنی مدت اور عدت پوری کر لیں تو اے وارثانِ میت تم پر اب کوئی گناہ نہیں اس کام میں جو وہ اپنی ذات کے لیے دستور کے مطابق کریں اب ان کو زینت کرنے کی اور نکاح کرنے کی اجازت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے اگر تم نے کسی امر مشروع پر اُن کو ملامت کی یا اُن کی کسی بات میں ہارج اور مزاحم ہوئے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کی سزا دے گا۔

فائدہ ①: یہ عدت اُس بیوہ کی ہے کہ جو حاملہ نہ ہو اس لیے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل یعنی ولادت ہے۔

کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ﴾ (الطلاق: ۴)

فائدہ ②: آئندہ ایک آیت میں آئے گا کہ عدتِ وفات ایک سال ہے وہ حکم پہلے تھا جو اس آیت سے منسوخ ہو گیا۔ یہ آیت اگرچہ تلاوت کے اعتبار سے مقدم ہے مگر نزول کے اعتبار سے مؤخر ہے۔

فائدہ ③: شریعت نے عدت کا حکم پہلے نکاح کی عزت و حرمت اور نسب اور حمل کی حفاظت کے لیے دیا۔

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ

اور گناہ نہیں تم پر جو پردے میں کہو پیغام نکاح عورت کو یا

اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا

چھپا رکھو اپنے دل میں معلوم ہے اللہ کو کہ تم البتہ ان کا دھیان کرو گے لیکن

تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ وَ لَا تَعْزِمُوْا

وعدہ نہ کرو ان سے چھپ کر، مگر یہی کہ کہہ دو ایک بات جس کا رواج ہے اور نہ باندھو

عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ

گرہ نکاح کی جب تک پہنچ چکے حکم اللہ کا اپنی مدت کو اور جان رکھو کہ اللہ کو

يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع ۳۰ ع ۴ ۱۴

معلوم ہے جو تمہارے دل میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشتا ہے تحمل والا۔

حکم سی ویکم۔ متعلق پیغام نکاح در اثنائے عدت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ ... الٰى ... وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾﴾

ربط: گذشتہ آیات میں عدت کے بعد نکاح کی اجازت مذکور تھی۔ اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ عدت کے اندر اندر نکاح اور نکاح کا وعدہ اور نکاح کا صریح پیغام تو جائز نہیں۔ البتہ نکاح کا اشارہ اور کنایہ جائز ہے اس لیے کہ کسی کے مرتے ہی اس کی بیوہ سے نکاح کا پیغام دینا بے مروتی ہے گویا کہ پیغام دینے والا اس کی موت کا منتظر ہی تھا خصوصاً جب کہ بیوہ صاحبِ کمال اور صاحب جمال بھی ہو تو پیغام والے اور بھی جلدی کرتے ہیں اور علیٰ ہذا عدت کے اندر عورت کا نکاح کے متعلق گفتگو کرنا بے وفائی پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے شوہر کے مرتے ہی اس کے حق رفاقت کو بھول گئی اور سابق نکاح کی عزت اور حرمت کا کوئی لحاظ نہ کیا کہ جس کے گھر میں عدّت گذار رہی اور جس کی میراث تقسیم کرا رہی ہے اس کے مرتے ہی نکاح کی بات چیت کر رہی ہے۔ گویا کہ یہ بے فا عورت اپنے شوہر کے مرنے کی ہی منتظر تھی۔ اس لیے ان آیات میں اس کی بابت حکم فرمایا۔ اور جس طرح عدّت کے بعد نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں اسی طرح تم پر اس بارے میں بھی کوئی گناہ نہیں کہ عدت وفات کے اندر عورتوں کے پیغام کے متعلق بطور تعریض اور کنایہ کچھ اشارہ کرو۔ مثلاً یہ کہو کہ مجھے ایک نیک عورت کی ضرورت ہے یا نکاح کے خیال کو بالکل دل میں مضمر رکھو اور کسی طرح اس کا ذکر نہ کرو نہ صراحتاً اور نہ تعریضاً اور نہ کنایۃً اس کی طرف کوئی اشارہ کرو اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ تم عدت کے بعد ان سے صراحۃً اس کا ذکر کرو گے اور بغیر ذکر کے تم صبر نہ کر سکو

گے اس لیے تم کو تعریض اور کنایہ کی اجازت دے دی۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو بہتر ہے یہ بھی ایک قسم کا عتاب ہے لیکن تم کو چاہیے کہ اجازت سے آگے نہ بڑھو۔ یعنی عدّت کے اندر ایک دوسرے سے مخفی طور پر نکاح کا صریح وعدہ نہ کرلو کہ عدت کے بعد ضرور نکاح کرلیں گے مگر اتنی بات کہو کہ جو قانون شرعی کے مطابق ہے یعنی بطور تعریض اور کنایہ کچھ کہہ سکتے ہو صراحتاً کہنے کی اجازت نہیں اور جب تک عدت اپنی پوری مدت تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک عقد نکاح کا عزم مصمم بھی نہ کرو۔ یعنی یہ ارادہ اور عزم کہ عدت گزرنے کے بعد ضرور نکاح کریں گے یہ بھی ممنوع ہے بسا اوقات عزم کر لینے کے بعد صبر نہیں ہوتا اور عدت کے اندر ہی نکاح کر بیٹھتا ہے اس لیے بطور سَدِّ ذرائع اس ارادہ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ اگرچہ یہ ممانعت تحریم کے درجہ میں نہیں بلکہ تنزیہ کے درجہ میں ہے جیسے ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى﴾ (بنی اسرائیل: ۳۲) میں زنا کے قریب جانے کی ممانعت فرمائی اور حدیث میں ہے کہ جو چراگاہ کے گرد گھومتا ہے عجب نہیں کہ وہ کسی وقت چراگاہ کے اندر گھس بھی جائے اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں عدت کے اندر نکاح کا میلان چھپا ہوا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جانو کہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا ہے کہ میلان اور رغبت پر مواخذہ نہیں فرماتا اور جو قصدً ارادہ کے بعد اللہ کے خوف کی وجہ سے نہ کرے اُس کو معاف کر دیتا ہے اور بڑا تحمل والا ہے کہ خلافِ حکم کرنے والوں پر مواخذہ میں جلدی نہیں کرتا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا

گناہ نہیں تم پر، اگر طلاق دو عورتوں کو جب تک یہ نہیں کہ ان کو ہاتھ لگایا ہو یا مقرر کیا ہو

لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ

ان کا کچھ حق اور ان کو خرچ دو وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر

قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَ اِنْ

اس کے موافق جو خرچ دستور ہے لازم ہے نیکی والوں کو اور اگر

طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً

طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے ہو اُن کا حق تو لازم ہو

فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ

آدھا جو کچھ ٹھہرایا تھا مگر یہ کہ در گذر کریں عورتیں یا درگذر کرے جس کے ہاتھ

عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ

گرہ ہے نکاح کی اور تم مرد درگزر کرو تو قریب ہے پرہیز گاری سے اور نہ بھلا دو بھلائی رکھنی

بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

آپس میں تحقیق اللہ جو کرتے ہو سو دیکھتا ہے۔

حکم سی ودوم۔ بابت مہر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ ... الٰى ... اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۶﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں عدت کے اعتبار سے مطلقہ کے احکام مذکور ہوئے۔ اب اس آیت میں مطلقہ کے احکام باعتبار لزوم مہر کے ذکر کرتے ہیں اس لیے کہ جن عورتوں کو طلاق دی جاتی ہے ان کی چار قسمیں ہیں:

① ایک یہ کہ نکاح کے وقت مہر معین ہوا تھا اور پھر خلوت کے بعد ان کو طلاق دی گئی تو اس صورت میں شوہر کو تمام مہر دینا ہوگا جو نکاح کے وقت مقرر ہوا تھا۔

② دوم یہ کہ مہر تو معین ہوا تھا مگر خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی تو اس صورت میں شوہر کو آدھا مہر دینا لازم ہوگا۔

③ سوم یہ کہ نہ مہر معین ہوا تھا اور نہ خلوت کی نوبت آئی تھی خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ اس صورت میں مہر نہیں بلکہ دستور کے مطابق خرچہ اور جوڑا دینا پڑے گا۔

④ چہارم یہ کہ مہر تو مقرر نہ ہوا تھا مگر خلوت یا صحبت کے بعد طلاق دی ایسی صورت میں مہر مثل دینا پڑے گا یعنی اس خاندان کی عورتوں کا جو مہر رائج ہے وہ دینا پڑے گا۔

چنانچہ فرماتے ہیں: تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم عورتوں کو ایسے وقت میں طلاق دے دو کہ ابھی تک تم نے ان کو چھوا اور ہاتھ تک نہیں لگایا اور نہ اُن کے لیے تم نے نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر کیا ایسی حالت میں اگر تم ان کو طلاق دے دو تو نہ تو کوئی گناہ ہے اور نہ تم سے کوئی مہر کا مطالبہ ہے اور البتہ اس سے جدائی اور مفارقت کے وقت ان کو کچھ نفع اور فائدہ پہنچا دو یعنی پہننے کا کوئی جوڑا اور کچھ خرچہ دے دو۔ وسعت والے پر اس کی حیثیت کے مطابق ہے اور تنگ دست پر اس کی حالت کے بقدر واجب ہے اور یہ فائدہ پہنچانا خوش خوئی اور خوبصورتی کے ساتھ ہونا چاہیے حاکم کی زبردستی سے نہ ہو یہ فائدہ پہنچانا نیکوکاروں پر حق واجب ہے جن کی نظر اللہ پر رہتی ہے وہ خلق خدا کو نفع پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک یہ جوڑا دینا واجب ہے اور قائم مقام مہر کے ہے جیسا کہ صیغۂ امر اور لفظ ﴿عَلَى﴾ اور ﴿حَقًّا﴾ سے وجوب ظاہر ہوتا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ امر استحبابی ہے واجب نہیں اور اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو۔ دراں حالیکہ تم اُن کے لیے مہر مقرر کر چکے تھے تو ایسی صورت میں تم کو اس مہر کا نصف دینا پڑے گا جو تم نے نکاح کے وقت ٹھہرایا تھا اور نصف تم سے معاف ہو جائے گا۔ مگر دو صورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ایک یہ کہ عورتیں اپنا حق (نصف مہر) معاف کر دیں اور شوہر سے کچھ نہ لیں۔ یا یہ کہ مرد جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ اپنا حق معاف کر دے۔ یعنی بجائے نصف مہر دینے کے پورا مہر دے دے اور اگر شوہر پورا مہر دے چکا ہے تو نصف مہر عورت سے واپس نہ لے اور تمہارا اپنے اپنے حق کو معاف کر دینا تقویٰ اور پرہیز گاری کے بہت ہی قریب ہے۔ یہ خطاب مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے اور تم باہمی احسان اور نیکوئی

کو نہ بھولو۔ ہر ایک کو چاہیے کہ اس کی کوشش کرے کہ فضل و احسان میرے ہاتھ سے سرزد ہو۔ دوسرے کے احسان پر نظر کرنا فضل اور فضیلت کے خلاف ہے تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والے ہیں وہ اس کو بھی دیکھتے ہیں کہ کون احسان کی طرف سبقت کرتا ہے اور کون دوسرے کے احسان کی طرف نظر کرتا ہے۔

فائدہ: چار صورتیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ان آیات میں صرف دو کا حکم مذکور ہے ایک یہ کہ مہر نہیں ٹھہرا تھا اور ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ دوسرے یہ کہ مہر تو ٹھہرا تھا مگر طلاق ہاتھ لگانے سے پہلے ہی دے دی اور دو صورتیں باقی رہ گئیں جن کا حکم ان آیات میں ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک یہ کہ مہر مقرر ہوا تھا اور ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی تو پورا مہر لازم ہوگا۔ یہ حکم سورۂ نساء میں مذکور ہے۔

دوسرے یہ کہ مہر نہیں ٹھہرا تھا اور ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی تو اس صورت میں مہر مثل دینا پڑے گا یعنی اُس عورت کے خاندان میں جو رواج ہے اس کے مطابق مہر دینا ہوگا۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

خبردار رہو نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا

پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیادہ پڑھ لو یا سوار پھر جس وقت چین پاؤ تو یاد کرو اللہ کو، جیسا

عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

تم کو سکھایا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔

حکم سی وسوم۔ محافظت صلوٰات عموماً وصلوٰۃ وسطیٰ خصوصاً

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ... الٰى ... كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾﴾

ربط: دور سے سلسلۂ کلام، احکام معاشرت کے بارے میں چل رہا ہے اس کے ضمن میں محافظت صلوٰۃ کا حکم اس لیے ذکر کیا کہ اکثر و بیشتر اہل وعیال میں مشغولی نماز اور نیاز سے غفلت کا باعث ہوتی ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹﴾﴾ (المنافقون)

ترجمہ: "اے ایمان والو! مال اور اہل وعیال کا تعلق تم کو خدا کی عبادت اور بندگی سے غافل نہ کرے اور جو ایسا کریں گے وہ خاسرین میں سے ہوں گے۔"

وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (التغابن:۱۵)

اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ را یاد گیر ال و ملکِ ایں جہاں برباد گیر

یایوں کہو کہ گزشتہ آیات میں حقوق العباد کا ذکر تھا۔ اس آیت میں حق اللہ کا ذکر ہے۔

یایوں کہو کہ گزشتہ آیت میں یعنی ﴿لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ میں یہ حکم تھا کہ باہمی سلوک اور احسان کو فراموش نہ کرو اور اس آیت میں اشارۃً یہ حکم ہے کہ اپنے نفس کو سلوک اور احسان سے نہ بھولو جس نے نماز ادا کی اُس نے اپنے نفس پر احسان کیا اور جس نے نماز سے غفلت برتی اس نے اپنے نفس کو فراموش کیا کہ آخرت کے منافع سے اس کو محروم کیا۔

یایوں کہو کہ گزشتہ آیات میں طلاق کی اجازت مذکور تھی اور احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ طلاق اگرچہ بوجہ ضرورت شرعاً جائز ہے مگر حق تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اور ایک ناپسندیدہ امر کے ضمن میں کتنے ناپسندیدہ امور کا ارتکاب ہو جاتا ہے وہ اللہ ہی کے علم میں ہے اس لیے آئندہ آیت میں نماز کا حکم نازل کیا تا کہ نماز کی محافظت ناپسندیدہ امور کے ارتکاب کا کفارہ بن سکے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (ھود:۱۱۵)

تَرجَمہ: "بیشک نیک کام (نامہ اعمال سے) مٹا دیتے ہیں بُرے کاموں کو۔"

نماز دین کا ستون ہے۔ گناہوں کو مٹاتی ہے اور دلوں کے زنگ کو کھرچتی ہے اہل وعیال کی ملابست سے جو دلوں پر میل کچیل آ جاتا ہے وہ نماز کی محافظت سے صاف ہو جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ دن میں پانچ نمازوں کا ادا کرنا ایسا ہے جیسا کہ کسی کے دروازہ کے آگے نہر بہتی ہو اور وہ ہر روز اس میں پانچ مرتبہ غسل کرے کیا اُس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا؟ یعنی سر اور بدن پر پانی بہا لینے سے بھی غسل ہو جاتا ہے لیکن غسل کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بجائے اپنے اوپر پانی بہانے کے خود نہر کے اندر گھس جائے کہ جس کا پانی تیزی سے بہ رہا ہو۔ ایسی نہر میں جس کا پانی نہایت تیزی کے ساتھ چل رہا ہو غسل کر لینے سے میل باقی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور تمام نمازوں کی محافظت کرو اور خصوصاً درمیانی نماز کی یعنی عصر کی۔ نمازوں کی حفاظت اور نگرانی کے معنی یہ ہیں کہ نمازوں کو اپنے وقتوں پر ادا کرو اور نماز کے ارکان اور واجبات اور سنن اور آداب کا پورا پورا لحاظ رکھو۔ تم نماز کی حفاظت کرو نماز تمہاری حفاظت کرے گی۔ اسی وجہ سے ﴿حٰفِظُوْا﴾ باب مفاعلہ کا صیغہ لایا گیا جو مشارکت پر دلالت کرتا ہے جس درجہ تم نماز کی حفاظت اور خبر گیری کرو گے اسی درجہ نماز تمہاری حفاظت کرے گی اور کھڑے رہو اللہ کے سامنے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ نماز میں نہایت خاموشی کے ساتھ کھڑے رہو کسی سے کوئی بات نہ کرو۔ نگاہ نیچی رکھو۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھو۔ دنیاوی خیالات سے قلب کو محفوظ رکھو۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم (ابتداء میں) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے پیچھے نماز میں بات چیت بھی کر لیتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ تو ہم کو خاموش رہنے کا حکم ہو گیا۔ اور نماز میں باتیں کرنے سے ہم کو منع کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم وغیرہ)

اس لیے کہ نماز کی حقیقت مناجاتِ خداوندی ہے آپس میں باتیں کرنے سے خدا تعالیٰ سے مناجات باقی نہیں رہ سکتی۔

حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرح وضو کرے اور پھر دو رکعت نماز اس طرح ادا کرے کہ اس نماز میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ (بخاری شریف)

معلوم ہوا کہ نماز تو وہ ہے کہ جس میں دل سے بھی باتیں نہ ہوں چہ جائیکہ زبان سے باتیں اور آنکھوں سے اشارے ہوں۔

پس اگر تم کو کسی دشمن وغیرہ کا خوف ہو جس کی وجہ سے تم نماز کے آداب اور سنن کی پوری حفاظت نہ کر سکو تو پھر جس طرح بھی ممکن ہو۔ پیادہ یا سوار نماز پڑھ لو اور اس طرح اصل نماز کی حفاظت کر لو۔ اگرچہ اس خوف کی حالت میں رکوع اور سجود اور خشوع اور خضوع اور استقبال قبلہ کی پوری رعایت اور حفاظت نہ کر سکو تو پھر جب تم کو امن اور سکون حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو پورے سکون اور اطمینان اور آداب کے ساتھ یاد کرو جس طرح اس نے تم کو اپنی بندگی اور یاد کے طریقے سکھلائے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ خوف کی حالت مجبوری کی حالت ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اس حالت میں بغیر رکوع وسجود کے اشارہ سے نماز کی اجازت دے دی اگرچہ تمہارا منہ بھی قبلہ کی طرف نہ ہو۔

فائدہ ①: صلوٰۃ وسطیٰ کی تعیین میں اقوال مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نماز صبح مراد ہے۔ جورات کی نماز یعنی عشاء اور دن کی نماز یعنی ظہر کے درمیان ہے ابوقبیصہ بن زویب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطی سے مغرب کی نماز مراد ہے کیونکہ یہ نماز ثلاثی ہے (تین رکعت والی ہے) ثنائی اور رباعی کے درمیان ہے یعنی دو رکعت والی سے زائد اور چار رکعت والی نماز سے کم ہے۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ پانچ نمازوں میں سے ایک نماز بلا تعیین کے صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔ اسم اعظم اور شبِ قدر اور ساعتِ جمعہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے اُس کو پوشیدہ رکھا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہے اور بہت سی احادیثِ صحیحہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مختار ہے۔

فائدہ ②: عصر کی تخصیص، تاکید اور اہتمام کے لیے کی گئی کیونکہ یہ وقت لوگوں کے بازاروں میں مشغول رہنے کا ہے۔ اس لیے اندیشہ ہے کہ یہ نماز فوت نہ ہو جائے یا بغیر جماعت کے ادا کی جائے یا تاخیر سے پڑھی جائے۔

فائدہ ③: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خوف کی حالت میں نماز پیروں پر کھڑے ہو کر یا سواری پر جائز ہے مگر چلتے چلتے نماز جائز نہیں اس لیے کہ رِجالاً۔ راجل کی جمع ہے اور راجل کے معنی لغت میں چلنے والے کے نہیں بلکہ لغت میں راجل پیروں پر کھڑے ہونے والے کو کہتے ہیں اور اس آیت میں راجل کو مقابلہ میں راکب کے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راجل سے مراد وہ شخص ہے کہ جو سوار نہ ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر دشمن کا خوف شدید ہو تو چلتے چلتے بھی نماز درست ہے جس طرح بن پڑے نماز پڑھ لے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر خوف اتنا شدید ہے کہ ایک جگہ کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو پھر نماز کو مؤخر کرے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق میں نمازوں کو مؤخر فرمایا اور چلتے چلتے نمازیں نہیں پڑھیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ

اور جو لوگ تم میں مر جاویں اور چھوڑ جاویں عورتیں وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے

مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

خرچ دینا ایک برس، نہ نکال دینا پھر اگر وہ نکل جاویں تو گناہ نہیں تم پر،

فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

جو کچھ کریں اپنے حق میں دستور کی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

حکم سی و چہارم۔ وصیت برائے سکونت بیوہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾﴾

ربط: احکام معاشرت کے ضمن میں محافظت صلوات پر متنبہ فرمایا۔ اب اُس تنبیہ کے بعد پھر کچھ احکام بیان فرماتے ہیں گزشتہ آیات میں مطلقات کے متعہ کا ذکر فرمایا اب اس آیت میں بیوہ کے متعہ کا ذکر فرماتے ہیں اور جو لوگ تم میں سے اپنی عمر پوری کر کے دارِ دُنیا سے دارِ آخرت کی طرف انتقال کر جائیں اور عورتوں کو دنیا میں چھوڑ جائیں تو ان پر یہ شرعاً واجب ہے کہ وہ بیبیوں کے لیے ایک سال تک خرچ دینے کی وصیت کر جائیں۔ اس طرح پر کہ وہ عورتیں انہیں کے مکان میں رہیں اور ایک سال تک ان کو نان و نفقہ ملتا رہے بغیر اس کے کہ ان کو ایک سال کے اندر گھر سے نکال دیا جائے۔ شوہر کو چاہیے کہ وصیت نامہ میں اس کی بھی تصریح کر دے کہ ان عورتوں کو ایک سال تک گھر سے نہ نکالا جائے۔ پھر اگر وہ عورتیں ایک سال پورا کئے بغیر ہی چار ماہ اور دس دن کے بعد یا وضع حمل کے بعد خود بخود ہی کسی ضرورت کی وجہ سے بغیر وارثوں کے نکالے ہوئے نکل جائیں تو اے وارثو! اس چیز پر کہ جو یہ عورتیں شریعت کے دستور کے مطابق اپنے بارے میں کریں۔ مثلاً زیب و زینت کریں یا نکاح کریں تو تم کو منع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ البتہ ورثہ کو یہ حق ہے کہ گھر سے چلے جانے کے بعد عورت کا خرچ اگر بند کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اور اللہ غالب ہے خلاف حکم کرنے والوں سے بدلہ لینے پر قادر ہے۔ حکمت والا ہے مروت اور مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔

فائدہ: عورتوں کے لیے ایک سال کی وصیّت کا حکم ابتداء اسلام میں تھا کہ جب وارثوں کے حصّے مقرر نہ تھے اور آیتِ میراث ابھی نازل نہ ہوئی تھی بلکہ مردہ کے اختیار پر تھا کہ وہ جس قدر وارثوں کو دلوانا چاہے اس کے مطابق وصیّت کر جائے۔ شروع اسلام میں والدین اور اقارب کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا۔ مرنے والے پر وصیت واجب تھی۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚ ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ .... الآية﴾

اسی طرح مرنے والوں پر اپنی بیویوں کے لیے وصیّت کرنا واجب تھا کہ وہ ایک سال تک اُن کے مال میں سے کھانے پہننے کا فائدہ اٹھاتی رہیں اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا۔ اس لیے اُس کو اختیار تھا کہ چاہے سال بھر شوہر کے گھر میں رہ کر ورثہ سے اپنا حق وصول کرے یا چار مہینہ اور دس دن پورے کر کے چلی جائے اور اپنا حق چھوڑ دے عورت کے لیے اپنے اختیار سے چلا جانا جائز تھا مگر وارثوں کو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا۔ غرض یہ کہ اس آیت کی رو سے مرنے والوں پر اپنی بیویوں کے لیے ایک سال کے نفقہ اور سکنی کی وصیّت واجب تھی بعد میں جب آیت میراث نازل ہوئی اور والدین اور اقارب اور بیوی کا حصہ میراث میں مقرر ہو گیا تو بیوی وغیرہ کے لیے وصیّت کرنے کا حکم منسوخ ہو گیا اور آنحضرت ﷺ نے اعلان فرما دیا:

((الا لا وصية لوارث)).

ترجمہ: "آگاہ ہو جاؤ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"

غرض یہ کہ شروع اسلام میں عورت کی عدت ایک سال تھی اور عورت کے لیے کوئی میراث نہ تھی صرف یہی ایک سال کا نان و نفقہ تھا۔ آیتِ میراث کے نازل ہونے کے بعد نان ونفقہ کی وصیت کا حکم منسوخ ہو گیا اور آیت ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ سے جو پہلے گزر چکی ہے ایک سالہ عدت کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور یہ آیت اگرچہ تلاوت میں مقدم ہے مگر نزول میں مؤخر ہے۔ جیسا کہ آیت ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ... الخ﴾ تلاوت میں مقدم ہے اور آیت ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ﴾ نزول میں مقدم اور تلاوت میں مؤخر ہے۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کہ یہ آیت یعنی ﴿مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ﴾ محکم ہے منسوخ نہیں۔ اصل عدت تو چار مہینے اور دس دن ہے۔ اس عدت کا پورا کرنا واجب اور لازم ہے اور ایک سال کی عدت کا حکم استحبابی اور اختیاری ہے۔ چار ماہ اور دس دن کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ چاہے سال بھر پورا کرے یا نہ کرے اس لیے کہ اس آیت سے عورت پر ایک سال کی عدت کا واجب ہونا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ شوہروں پر ایک سال کی وصیّت کا وجوب مفہوم ہوتا ہے کیونکہ اس آیت میں تربص (عدت نشینی) کا ذکر نہیں۔ جیسا کہ آیت عدت میں ہے اس آیت میں تو صرف وصیت کا ذکر ہے اور شوہروں کو حکم ہے کہ تم مرتے وقت بیویوں کے لیے ایک سال کی وصیّت کر جاؤ اب ان کو اختیار ہے کہ چاہے اس وصیت کے موافق ایک سال تک رہیں اور چاہیں تو چار مہینہ اور دس دن پورے کر کے چلی جائیں۔ پس مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر عدت کی دو میعادیں ہو گئیں ایک ضروری اور حتمی جو اَقل میعاد ہے یعنی چار مہینہ اور دس دن۔ اور دوسری اختیاری میعاد جو زائد اور اکثر ہے یعنی ایک سال۔ لہٰذا اس صورت میں نہ اس آیت کو منسوخ ماننے کی ضرورت ہے اور نہ اس آیت کو ﴿اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ والی آیت سے نزول میں مقدم ماننے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جب دو آیتوں کو دو حالتوں پر محمول کر لیا تو تعارض ہی نہ رہا تو پھر نسخ کی کیا ضرورت رہی۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں عدت ایک سال تھی جو بعد میں چار مہینہ اور دس دن کی آیت سے منسوخ ہوئی۔ اور احادیث صحیحہ سے بھی یہی ثابت ہے اور اسی پر تمام علماء اسلام کا اجماع ہے اور کسی امام اور فقیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی موافقت نہیں کی اور صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی سے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے موافق منقول نہیں بلکہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے جمہور کے مطابق ایک قول نقل کیا ہے۔ پس الحمد للہ کہ اجماع مکمل ہوا اور خلاف مرتفع ہوا۔ (احکام القرآن للامام القرطبی ص ۲۲۷ ج ۳)

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ
اور طلاق والیوں کو خرچ دینا ہے موافق دستور کے لازم پرہیز گاروں کو اسی طرح
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع
بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے اپنی آیتیں شاید تم بوجھ رکھو۔

ع ۳۱ ۷ ۱۵

حکم سی و پنجم۔ متعہ برائے مطلقات

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۟ ...الیٰ... لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲۴۲﴾

ربط: گزشتہ آیت میں ان مطلقات کے متعہ (جوڑا) کا ذکر تھا جن کا مہر نہ مقرر ہوا ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے اُن کو طلاق دے دی ہو۔ اب اس آیت میں عام طلاق والی عورتوں کے متعہ کا ذکر فرماتے ہیں اور تمام طلاق والیوں کے لیے دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ نفع پہنچانا ہے من جانب اللہ یہ حق گردانا گیا ہے۔ پرہیزگاروں پر یعنی تمام مسلمانوں پر جو کفر اور شرک سے پرہیز کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کو بیان کرتا ہے تا کہ تم سمجھو اور اس کے احکام کی حکمتوں میں غور و فکر کرو کہ اس کے احکام کیسی کیسی حکمتوں اور مصلحتوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک نکاح اور طلاق کے احکام تمام ہوئے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

فائدہ ①: جس عورت کا کوئی مہر نہ ٹھہرا اور ہاتھ لگانے سے پہلے اس کو طلاق دے دی گئی ہو اس کو جوڑا دینا واجب ہے جیسا کہ گزشتہ آیت میں گذرا۔ باقی اور طلاق والی عورتوں کو جوڑا دینا واجب نہیں صرف مستحب ہے اس لیے کہ جو عورت مستحق مہر کی ہے وہ مستحق متعہ کی نہیں جس کے لیے پورا مہر یا آدھا مہر واجب ہے اس کے لیے متعہ واجب نہیں۔

فائدہ ②: اس آیت میں تمام مطلقات کے متعہ کا ذکر ہے جو واجب اور غیر واجب سب کو شامل ہے اور بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ ﴿وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ﴾ میں ''الف لام'' عہد کا ہے اس سے وہی مطلقات مراد ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یعنی جن کا مہر نہ مقرر ہوا ہو اور خلوت سے پہلے اُن کو طلاق دے دی گئی ہو۔ اُن کے لیے متعہ واجب ہے۔ اب یہ آیت عام نہ ہوگی بلکہ پہلی ہی آیت کے حکم کی تاکید ہوگی اس لیے کہ پہلی آیت کے اخیر میں یہ تھا۔ ﴿مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۟ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ جس سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ شبہ ہوا کہ یہ متعہ دینا محض احسان اور تبرع ہے واجب اور لازم نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۟ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۴۱﴾ جس میں حق لازم ہونے کی عام مومنین پر تصریح فرما دی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪
تُو نے نہ دیکھے وہ لوگ جو نکلے اپنے گھروں سے، اور وہ ہزاروں تھے، موت کے ڈر سے
فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى
پھر کہا ان کو اللہ نے مر جاؤ پیچھے ان کو جلایا اللہ تو فضل رکھتا ہے
النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۲۴۳
لوگوں پر اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

خاتمۂ احکام معاشرت بر تذکیر آخرت

حکایت قصہ گریزندگاں از موت و وباء برائے تنبیہ شیفتگان حیات دُنیا و تمہید تشجیع بر جہاد و قتال و ترغیب انفاق مال

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ ... الٰی ... وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝٢٤٣﴾

ربط: یہاں تک ابواب البر والصلہ کے متعلق مختلف الانواع اور مختلف الاقسام احکام مذکور ہوئے مگر ان احکام میں سب سے زیادہ اہم اور مہتم بالشان اور نفس پر شاق اور گراں دو حکم ہیں ایک جہاد و قتال کا اور دوسرا انفاق مال کا۔ چنانچہ اُصول بِر کے بیان میں ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ اور ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ انسان کو خداوندِ ذوالجلال کی اطاعت سے روکنے والی زیادہ تر دو ہی چیزیں ہوتی ہیں ایک حبِ دنیا اور ایک کراہتِ موت، بلکہ یہی دو چیزیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں مخل اور مزاحم ہوتی ہیں اس لیے حق جل شانہٗ نے اولاً بنی اسرائیل کا ایک قصہ ذکر فرمایا جو موت اور وباء کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے اور غضبِ خداوندی سے سب ہلاک ہوئے اور پھر حضرت حزقیل علیہ السلام کی دُعا سے دوبارہ زندہ ہوئے تاکہ اس بلاسبب موت اور بلاسبب حیات کے مشاہدہ سے یہ یقین کرلیں کہ موت اور حیات کسی ظاہری سبب پر موقوف نہیں۔ موت اور حیات کا خالق اور مالک صرف خدا تعالیٰ ہے وہ بغیر وباء اور طاعون کے اور بغیر میدانِ کارزار کے بھی موت دے سکتا ہے۔ لہٰذا موت کے خوف سے بھاگنا بے سود ہے۔ نیز اس بلاسبب موت اور بلاسبب دوبارہ زندگی کے مشاہدہ سے گویا کہ آخرت اور حشر اور نشر اور قیامت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا جس سے آخرت کے بارے میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی اور اب تک آخرت اور قیامت کے بارے میں جو ایمان استدلالی اور بُرہانی تھا اب وہ اس دوبارہ زندگی کے مشاہدہ کے بعد بمنزلہ شہودی اور عیانی کے ہوگیا جس میں ارتداد کا احتمال نہیں۔ استدلال میں احتمال کی گنجائش ہے مشاہدہ اور معاینہ میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

پس یہ قصہ اُن دو حکموں کی تمہید ہے جو آئندہ آیات میں مذکور ہوں گے۔ ایک جہاد و قتال کا حکم جو اس قصہ کے متصل مذکور ہے یعنی ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٢٤٤﴾ دوسرا حکم انفاقِ مال کا ہے جس کو ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا .... الخ﴾ سے بیان فرمایا۔ پھر ان دو حکموں کے بعد اوّلاً جہاد و قتال کی ترغیب اور تاکید کے لیے قصۂ طالوت و جالوت ذکر فرمایا اور ثانیاً خدا کی راہ میں صدقہ اور خیرات کے احکام اور فضائل بیان فرمائے جو دور تک چلے گئے اور پھر احکام صدقات سے فراغت کے بعد ربا اور سود کے احکام بیان فرمائے اس لیے کہ ربا اور سود صدقہ اور خیرات کی ضد اور نقیض ہے اور پھر اس سورت کو ایمان اور اطاعت اور دعاء رحمت و مغفرت پر ختم فرمایا۔

اس سورت کا آغاز بھی ایمان اور ہدایت اور تقویٰ اور فلاح سے ہوا تھا۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ... الٰی ... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ اور خاتمہ بھی ایمان اور اطاعت اور دعاء رحمت پر ہوا جو کہ عین فلاح اور عین ہدایت اور عین سعادت ہے۔

بیانِ ربط بطریق دیگر:

دور سے نکاح اور طلاق کے احکام کا سلسلہ چلا آ رہا تھا یہاں آ کر احکام معاشرت پورے ہوئے۔ اس لیے اب احکام معاشرت کے بعد ایک قصہ تذکیرِ آخرت کے لیے ذکر فرمایا جس کو عدتِ وفات کے احکام سے خاص مناسبت ہے۔ یعنی اگر تم بے کس عورتوں کا عرصۂ حیات تنگ کرو گے اور اُن کے مہر اور متعہ کے دینے میں کوتاہی کرو گے تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عدول حکمی کی سزا میں تمہارے اموال اور ذخائر کو اور تمہاری مستعار حیات کو تم سے واپس لے لے جیسا کہ پہلی امتوں میں اس قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: کیا اے دیکھنے والے اور اے سننے والے تو نے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سُنا مگر کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل گئے تھے پس اللہ تعالیٰ نے بطور سزا اور تنبیہ یہ حکم دیا کہ مر جاؤ یہ حکم تکوینی تھا اسی وقت سب مر گئے اور جس موت کے ڈر سے بھاگے تھے اسی میں اچانک پکڑے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک نبی کی درخواست اور استدعاء پر دوبارہ زندہ کر دیا۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ یہ لوگ طاعون سے بھاگ کر نکلے تھے۔ ایک بیابان میں جا کر اُترے اور یہ گمان کیا کہ اب ہم سلامتی اور تندرستی کی جگہ پہنچ گئے۔ تب بحکمِ خداوندی سب کے سب وہیں مر گئے۔ اور ایک ہفتہ یا کچھ عرصہ بعد حزقیل علیہ السلام جو انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے وہاں سے گذرے اور یہ منظر دیکھا کہ ہزاراں ہزار آدمی مرا پڑا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور اُن سب کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح منقول ہے۔

ضحاک اور مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ سے یہ منقول ہے کہ یہ لوگ جہاد سے بھاگے تھے کہ غنیم سے لڑنا نہ پڑے موت کے ڈر سے وطن چھوڑ کر نکل گئے۔ بھاگ کر جہاں پہنچے اللہ کے حکم سے موت بھی وہیں پہنچ گئی اور سب کا کام تمام کیا۔ پھر بعد چندے اُس زمانہ کے پیغمبر علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوئے۔

نکتہ:

قاضی ابوبکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ موت موتِ عقوبت تھی یعنی بطور سزا اور تنبیہ تھی۔ موتِ اَجل نہ تھی جو کہ عمر پوری ہونے کے بعد آتی ہے اس لیے سزا اور تنبیہ کے بعد دوبارہ حیات عطا کر دی گئی تا کہ اپنی عمروں کو پورا کر لیں اور اگر یہ موتِ اَجَل ہوتی یعنی عمریں پوری کر چکے ہوتے تو پھر حیات واپس نہ ہوتی۔ اس لیے کہ موتِ اجل کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیا جاتا۔ (تفسیر قرطبی ص ۳۳۱ ج ۳)

فائدہ: اللہ کے یہاں عام قاعدہ تو یہی ہے کہ کوئی مرنے کے بعد قیامت سے پہلے دنیا میں نہیں آتا لیکن بطور خرق عادت کبھی احیانا اللہ تعالیٰ مردہ کو دُنیا میں زندہ کرتے ہیں تا کہ اس کی قدرت کا کرشمہ ظاہر ہو اور منکرین قیامت پر حجت تمام ہو۔

اور تحقیق بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے کہ اس طرح دوبارہ زندہ کر کے اپنی قدرت کا کرشمہ اور قیامت کا نمونہ ایک نبی کی نبوت کی دلیل اور معجزہ لوگوں کو دکھلا دیا تا کہ ملاحدہ اور منکرینِ قیامت اور مکذبین نبوت و رسالت عبرت حاصل کریں اور سمجھ جائیں کہ نہ تو مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا محال ہے اور نہ خدا تعالیٰ کے کسی برگزیدہ بندے کے ہاتھ پر کسی خارق عادت کرشمہ کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔ اور ایمان کے اصل اصول بھی یہی تین امر ہیں۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت جو اس واقعہ سے ثابت ہوئے اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ میں جو قصہ ذکر کیا گیا وہ بھی اسی طرح ان تین اُمور کی دلیل تھا۔ اور آئندہ پارہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو قصہ آنے والا ہے وہ بھی ان ہی تین اُمور کی دلیل واضح ہے۔ اب دیکھ لو کہ کس طرح سے سورت کا اوّل اور

آخر اور اوسط باہم متناسب اور مرتبط ہیں۔ ملاحدہ کو چاہیے تھا کہ اس واقعہ کو سامانِ ہدایت سمجھتے اور اس کو خدا کی نعمت جان کر شکر ادا کرتے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور ایسے واقعات سے عبرت اور ہدایت حاصل کرنے والے بہت کم ہیں۔ یہ واقعہ کوئی معمولی نعمت نہ تھا کہ ایمان بالغیب کو شہودی اور عیانی بنا دیا۔ اور ارتداد کے خطرہ سے نکال دیا اس نعمت پر تو اگر لاکھوں اور کروڑوں جانیں بھی قربان ہو جائیں تو بہت کم ہیں۔ اور اُن نبی علیہ السلام پر بھی اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں جن کی توجہ اور دعا سے یہ نعمت ظہور میں آئی۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین وعلیٰ سیدنا ومولانا محمد خاتم النبین وعلیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین وعلینا معھم یا ارحم الراحمین۔

فائدہ ①: ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کے معنی ''کیا تو نے نہیں دیکھا'' مگر محاورہ میں اس کے معنی ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ﴾ کے ہیں کیا تم کو معلوم نہیں۔ ظاہراً چونکہ رؤیتِ بصری علم کا ذریعہ ہے۔ اس لیے لفظ رؤیت بول کر علم کے معنی مراد لیے گئے۔ فصحاء اور بلغاء کے نزدیک یہ لفظ تنبیہ اور تشویق کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ یعنی متنبہ کرنے اور شوق دلانے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کے معنی (تَنَبَّهْ اِلٰی امر الذین) کے ہیں۔ (تفسیر القرطبی ص ۲۳۰ ج ۳)

یعنی یہ واقعہ عجیب وغریب ہے اس قابل ہے کہ اس کو شوق اور رغبت کے ساتھ سنا جائے یہ چیز قابلِ دید تھی۔ اور چونکہ یہ واقعہ شہرت اور تواتر کی وجہ سے بمنزلہ محسوس اور مشاہد کے تھا اس لیے بجائے ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ﴾ کے لفظ ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ لایا گیا۔ جیسا کہ حضرات فقہا اور محدثین رحمۃ اللہ علیہم نے لکھا ہے کہ خبر متواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ بمنزلہ مشاہدہ اور رؤیت بصری کے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جو اُمورِ خبر متواتر سے ثابت تھے۔ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں جا بجا اُن کو ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

فائدہ ②: یہ بھاگنے والے بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی جو واسط کے قریب قصبہ دَاوَرْدَانُ میں رہتی تھی۔

فائدہ ③: ﴿وَهُمْ اُلُوْفٌ﴾ اور یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ چالیس ہزار تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ تیس ہزار تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آٹھ ہزار تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ چار ہزار تھے اور بعض کہتے ہیں تین ہزار تھے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والصحیح انھم زادو اعشرۃ آلاف لقولہ تعالیٰ وھم الوف وھو جمع الکثرۃ ولا یقال فی عشرۃ فما دونھا الوف.

ترجمہ: ''صحیح ہے کہ دس ہزار سے زیادہ تھے اس لیے کہ الوف جمع کثرت ہے۔ اس کا اطلاق دس اور دس سے کم پر نہیں آتا۔'' (تفسیر قرطبی ص ۲۳۱ ج ۳)

فائدہ ④: حدیث میں ہے کہ جب تم یہ سُنو کہ فلاں زمین میں وباء اور طاعون ہے تو تم اس زمین میں داخل نہ ہونا اور اگر وباء اور طاعون اُس زمین میں پھیل جائے جس میں تم رہتے ہو تو تم اس سے بھاگ کر نہ نکلنا۔ (بخاری ومسلم وغیرہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ملک شام تشریف لے گئے تو مقام سرغ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شام میں طاعون اور وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ حدیث سُن کر سرغ سے واپس آ گئے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

أفرارًا من قدر اللہ.

ترجمہ: ''اے امیر المومنین کیا اللہ کی قضاء وقدر سے بھاگتے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لو غيرك قالها يا ابا عبيدة، نعم نفر من قدر الله الى قدر الله.

ترجمہ: "کاش! تیرے سوا کوئی یہ شبہ کرتا (یعنی یہ کلمہ تیری شان کے مناسب نہیں) ہاں ہم اللہ کی ایک قضاء وقدر سے خدا کی دوسری قضاء وقدر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔"

جس طرح بیماری میں علاج کرنا ایک قضاء وقدر سے دوسری قضاء وقدر کی طرف بھاگنا ہے اس لیے کہ بیماری بھی اللہ کی قضاء وقدر سے ہے اور علاج اور دوا بھی اللہ کی قضاء وقدر ہے اسی طرح ہمارا وبائی زمین میں داخل نہ ہونا اور وطن کی طرف لوٹ جانا ایک قدر سے دوسری قدر کی طرف جانا ہے۔

فائدہ ⑤: یہ آیت معاد جسمانی کے ثبوت کے لیے قطعی دلیل ہے معاد جسمانی کا اقرار اصول ایمان میں سے ہے اور معاد جسمانی کا منکر باجماع امت بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾
اور لڑو اللہ کی راہ میں، اور جان لو کہ اللہ سنتا ہے جانتا۔

تشجیع شاکرین بر جہاد وقتال کافرین

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾﴾

گزشتہ آیت میں حکم جہاد کی تمہید تھی۔ اس آیت میں اصل مقصود کو بیان کرتے ہیں۔ نیز گزشتہ آیت شاکرین اور غیر شاکرین کے بیان پر مشتمل تھی۔ اب اس آیت میں شکر گزاروں کو ناشکروں سے جہاد وقتال کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اب تو تم نے دیکھ لیا کہ موت سے بھاگنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ لہٰذا خدا کی راہ میں خوب دل کھول کر لڑو۔ خدا کی راہ میں اگر موت بھی آتی ہے تو حقیقت اس کی حیات ہوتی ہے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جہاد میں جانے اور نہ جانے کی بابت جو باتیں کرتے ہو وہ سب سنتا ہے اور جو نیت دل میں چھپائے ہو اس کو جانتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا
کوئی شخص ہے ایسا؟ کہ قرض دے اللہ کو اچھا قرض، کہ وہ اس کو دُونا کر دے کئی
كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾
برابر؟ اور اللہ تنگی کرتا ہے اور کشائش اور اسی پاس الٹے جاؤ گے۔

ترغیب انفاقِ مال درراہ خداوندِ ذوالجلال

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ . . . الیٰ . . . وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵﴾

گزشتہ آیت میں خدا کی راہ میں جان دینے کا بیان تھا اب اس آیت میں مال دینے کا بیان ہے کون شخص ہے جو اللہ کو نہایت عمدہ اور اچھا قرض دے یعنی حلال مال سے اخلاص اور خوش دلی کے ساتھ دے پس اللہ تعالیٰ اُس کو گونا گوں بڑھا کر دیں گے۔ دُنیا کی طرح برابر سرابر نہ دیا جائے گا۔ خداوندِ ذوالجلال معاذ اللہ حاجت کی بناء پر قرض نہیں مانگتا بلکہ تم سے اس لیے قرض مانگتا ہے کہ تم سے ایک لے کر بے شمار اس کے عوض عطاء کرے۔ باپ کبھی اپنے خوردسال بچے کو ایک پیسہ دیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ بیٹا یہ پیسہ ہم کو قرض دے دو۔ جب وہ بچہ باپ کے ہاتھ پر وہ رکھ دیتا ہے تو باپ بصد ہزار محبت و پیار اس کے ہاتھ پر ایک دینار رکھ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ غنی مطلق اور مالک مطلق ہے اس کو کسی کے قرض کی ذرہ برابر حاجت نہیں وہ اپنے خزانہ سے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے وسعت اور کشائش کے ساتھ دیتا ہے اور جس طرح تم دنیا میں خالی ہاتھ آئے تھے اسی طرح تم خالی ہاتھ اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے قرض کے نام سے بھی نہ مانگتا اور نہ کسی معاوضہ کا وعدہ فرماتا تب بھی تم کو تمام مال اس کے لیے حاضر کر دینا تھا۔ یہ مال اور جان اور یہ وجود سب اسی کا عطیہ ہے۔

فائدہ ① : خدا کی راہ میں دینے کو مجازاً قرض کہا گیا اس لیے کہ قرض دینے کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اپنا مال اس شرط پر دے کہ پھر وہ برابر سرابر اس کے پاس واپس آ جائے اور بندہ حقیقۃً کسی چیز کا مالک نہیں سب چیز اللہ کی ہے۔ آقا کو غلام سے قرض مانگنے کی کیا ضرورت۔ خود غلام اس کا مملوک ہے۔

محض تلطف اور اظہار عنایت کے لیے اس کا نام قرض رکھ دیا کہ خدا کی راہ میں جو خرچ کرو گے من جانب اللہ اس کا معاوضہ ملے گا جیسا کہ ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ﴾ (التوبہ:۱۱۱) میں نفوس اور اموال کے عوض میں جنت دینے کا نام بیع و شراء رکھا۔ حالانکہ جان اور مال اور جنت سب کے وہی مالک ہیں۔ بیع و شراء کے لیے یہ ضروری ہے کہ بائع اور مشتری کی ملک علیحدہ علیحدہ ہو۔ پس جس طرح اس آیت میں درحقیقت وہی بائع اور وہی مشتری ہیں۔ محض ظاہر کے اعتبار سے بندہ کو بائع اور اپنے کو مشتری مجازاً قرار دیا اسی طرح اس آیت میں سمجھو کہ لینے والے اور دینے والے سب وہی ہیں مجازاً اس کو قرض سے تعبیر کر دیا تا کہ اس ظلوم و جہول کا دل خوش ہو جائے اور اگر کچھ عقل ہے تو غیرت سے زمین میں گڑ جائے کہ اللہ اکبر خود اپنے فضل و کرم سے مال و دولت ہم کو دیتے ہیں اور پھر ہمارے ہاتھ میں دے کر یہ فرماتے ہیں کہ لاؤ اس میں سے کچھ ہم کو قرض دے دو اور حکم بھی بصورتِ امر نہیں بلکہ استفہام کی صورت میں ہے کہ کون ہے جو خدا تعالیٰ کو قرض دے یہود بے بہبود بڑے ہی نادان تھے کہ اس تلطف اور عنایت کو تو نہ سمجھے بلکہ الٹا یہ سمجھے کہ معاذ اللہ خدا حاجت مند ہے۔ اس لیے ہم سے قرض مانگتا ہے۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ﴾ (آل عمران:۱۸۱)

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ آیت میں مضاف مقدر ہے۔ ای من ذاالذی یقرض عباد اللہ . یعنی کون ہے جو اللہ کے بندوں کو قرضہ دے۔ اللہ کو قرض دینے سے اُس کے بندوں کو قرض دینا مراد ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ

فرمائیں گے۔

((یا ابن اٰدم مرضت فلم تعدنی واستطعمتك فلم تطعمنی و استسقیتك فلم تسقنی قال یا رب کیف اسقیك و انت ربّ العالمین قال استسقاك عبدی فلان قلم تسقه اما انك لوسقیته وجدت ذالك عندی)). (الحدیث۔ اخرجه مسلم والبخاری کذافی تفسیر القرطبی ص ۲٤۰ ج ۳).

ترجمہ: "اے آدم (علیہ السلام) کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہ کی۔ میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھ کو کھانا نہیں دیا۔ میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھ کو پانی نہیں دیا۔ بندہ عرض کرے گا اے پروردگار! آپ کو کیسے پلاتا آپ تو تمام عالم کے مربی اور کھلانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے اسے کھانا نہیں دیا اگر تو اس کو کھانا دیتا تو اس کو ضرور میرے پاس پاتا۔ الیٰ آخر الحدیث

فائدہ ②: حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ نازل ہوئی تو ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے (بطور مسرت اور لذت) عرض کیا:

((یا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اوان الله تعالیٰ یرید منا القرض قال نعم یا اباالدحداح رضی اللہ تعالیٰ عنہ))

ترجمہ: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اے ابوالدحداح رضی اللہ عنہ"

ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس دو باغ ہیں ایک عالیہ میں اور ایک سافلہ میں اور خدا کی قسم ان دو باغوں کے سوا اور کسی چیز کا مالک نہیں۔ دونوں باغوں کو خدا تعالیٰ کے لیے قرض دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک باغ خدا کے لیے دے دے اور ایک باغ اپنے اہل وعیال کے گزرانِ معاش کے لیے رہنے دے۔ ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناتا ہوں کہ ان دو باغوں میں جو سب سے بہتر باغ ہے جس میں چھ سو (۶۰۰) کھجور کے درخت ہیں، وہ اللہ کے لیے دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذًا یَجْزِیَكَ اللّٰهُ بِهِ الْجَنَّةَ)). ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تجھ کو اس کے عوض میں جنت میں باغ دے گا۔"

ابوالدحداح رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اُٹھ کر اپنے اس بڑے اور عمدہ باغ میں پہنچے جسے خدا تعالیٰ کی نذر کر آئے تھے۔ ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کی بیوی اُم دحداح رضی اللہ عنہا اور بچے اُسی باغ میں تھے اور پھل کھا رہے تھے اور درختوں کے سایہ میں کھیل رہے تھے ابوالدحداح رضی اللہ عنہ باغ میں داخل ہوئے اور بیوی (اُم دحداح رضی اللہ عنہا) سامنے آئیں۔ ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے یہ شعر پڑھنے شروع کیے۔

هَدَاكِ رَبِّی سُبُلَ الرَّشَادِ اِلٰی سَبِیْلِ الْخَیْرِ وَالاسَدَادِ

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تجھ کو رشد اور ہدایت اور خیر اور ثواب کے راستے پر چلائے۔"

وَبِیْنِیْ مِنَ الْحَائِطِ بِالْوِدَادِ فَقَدْ مَضیٰ قَرْضًا اِلیٰ التَّنَادِ

ترجمہ: "اس باغ سے فرحت اور مسرت کے ساتھ ابھی علیحدہ ہو جاؤ اور باہر چلی جاؤ۔ یہ باغ اللہ تعالیٰ کو قیامت تک کے لیے قرض دے دیا ہے۔"

أَقْرَضْتُهُ اللّٰهَ عَلٰى اعْتِمَادِىْ بِالطَّوْعِ لَا مَنٌّ وَّلَا ارْتِدَاءْ

ترجمہ: "یہ باغ میں نے اللہ تعالیٰ کو نہایت شوق اور رغبت کے ساتھ قرض دیا ہے جس کا نہ کوئی احسان ہے اور نہ جس کو واپس لینا ہے۔"

اِلَّا رَجَآءَ الضِّعْفِ فِى الْمَعَادْ فَارْتَحِلْ بِالنَّفْسِ وَ الْاَوْلَادْ

ترجمہ: "صرف اضعافا مضاعفہ اجر اور ثواب کی امید پر قرض دیا ہے لہٰذا اسی وقت تو خود مع بچوں کے باغ سے باہر نکل جا اب یہ باغ خدا تعالیٰ کا ہو چکا ہے ہمارا نہیں رہا۔"

وَالْبِرُّ لَا شَكَّ فَخَيْرُ زَادْ قَدَّمَهُ الْمَرْءُ اِلَى الْمَعَادْ

ترجمہ: "اور آخرت کا بہترین توشہ وہ خدا کی راہ میں نیکوئی ہے یعنی اپنی محبوب چیز کو خدا کی راہ میں دے دینا ہے۔"

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (آل عمران:۹۲)

اُم دحداح رضی اللہ عنہا نے شوہر کا یہ کلام سُنتے ہی اوّل تو مبارک باد دی اور یہ کہا:

رَبِحَ بَيْعُكَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْمَا اشْتَرَيْتَ.

ترجمہ: "تیری تجارت نفع مند ہوئی اللہ تعالیٰ برکت دے اُس میں جو تو نے خریدا ہے۔"

بعد ازاں شوہر کی نظم کا جواب نظم میں دیا اور یہ شعر پڑھنے شروع کیے ؎

بَشَّرَكَ اللّٰهُ بِخَيْرٍ وَ فَرَحْ مِثْلُكَ اَدّٰى مَالَدَيْهِ، وَنَصَحْ

ترجمہ: "تجھ کو خیر اور فرحت کی بشارت ہو تجھ جیسا ہی ایسے حوصلے کے کام کرتا ہے۔"

قَدْ مَتَّعَ اللّٰهُ عِيَالِىْ وَ مَنَحْ بِالْعَجْوَةِ السَّوْدَآءِ وَالزَّهْوِ الْبَلَحْ

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے میرے بچوں کو قسم قسم کی کھجوریں دی ہیں۔ اگر ایک باغ خدا کو دے دیا تو کیا ہوا۔"

وَالْعَبْدُ يَسْعٰى وَلَهٗ مَا قَدْ كَدَحْ طُوْلَ اللَّيَالِىْ وَ عَلَيْهِ مَا اجْتَرَحْ

ترجمہ: "بندہ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اپنی ہی منفعت اور آخرت کی درستی کے لیے کرتا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں نیکی سے بندہ کو ثواب ملتا ہے اور گناہ کا وبال اس پر پڑتا ہے۔"

بعد ازاں اُم دحداح رضی اللہ عنہا بچوں کی طرف متوجہ ہوئیں بچے جو پھل دامنوں میں لے رہے تھے وہ دامن جھٹک دیئے اور جو کھجوریں بچوں کے منہ میں تھیں وہ انگلی ڈال کر نکال دیں اور بچوں سے کہا کہ اس باغ سے نکلو اور اسی وقت دوسرے باغ میں منتقل ہو گئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا:

((كَمْ مِنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَدَارٍ فَيَاحٍ لِاَبِى الدَّحْدَاحِ)). (تفسیر قرطبی ص ۲۳۸ ج ۳)

ترجمہ: "نہ معلوم ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کے لیے آخرت میں کتنے بے شمار کھجور کے لمبے لمبے درخت ہیں اور کتنے وسیع اور کشادہ مکان ہیں۔"

فائدہ ③: قرض دینے میں بڑا اجر عظیم ہے مسلمان کی پریشانی اُس سے دُور ہوتی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ میں نے شب معراج میں جنت کے دروازہ پر لکھا ہوا دیکھا۔

((الصدقة بعشر امثالها والقرض بثمانية عشر)).

ترجمہ: "صدقہ کا اجر دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔"

میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ قرض کو صدقہ سے افضل قرار دیا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا سائل سوال کرتا ہے اور اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا بغیر حاجت کے قرض نہیں مانگتا۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۴۰ ج ۳)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا

تو نے نہ دیکھی ایک جماعت بنی اسرائیل میں موسیٰ کے بعد؟ جب کہا

لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ

اپنے نبی کو کھڑا کر دے ہم کو ایک بادشاہ، کہ ہم لڑائی کریں اللہ کی راہ میں، وہ بولا کہ یہ بھی

عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ

توقع ہے تم سے، کہ اگر حکم ہو تم کو لڑائی کا تب نہ لڑو، بولے ہم کو کیا ہوا

اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ

ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں، اور ہم کو نکال دیا ہے، ہمارے گھر سے اور بیٹوں سے

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

پھر جب حکم ہوا ان کو لڑائی کا پھر گئے مگر تھوڑے ان میں سے اور اللہ کو معلوم ہیں

بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ

گنہگار اور کہا ان کو ان کے نبی نے اللہ نے کھڑا کر دیا تم کو طالوت

مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ

بادشاہ بولے کہاں ہو گی اس کو سلطنت ہمارے اوپر اور ہمارا حق زیادہ ہے سلطنت میں

مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ

اس سے اور اس کو ملی نہیں کشائش مال کی کہا اللہ نے اس کو پسند کیا

عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ

تم سے اور زیادہ کشایش دی عقل میں اور بدن میں اور اللہ دیتا ہے اپنی سلطنت

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ

جس کو چاہے اور اللہ کشایش والا ہے سب جانتا اور کہا ان کو اُن کے نبی نے نشان ان کی

مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ

سلطنت کا یہ کہ آوے تم کو صندوق جس میں ہے دل جمعی تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی چیزیں

مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

جو چھوڑ گئے موسیٰ اور ہارون کی اولاد، اٹھا لاویں اس کو فرشتے اس میں

لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ ۳۲ ع ۶ ۱۶

نشانی پوری ہے تم کو اگر یقین رکھتے ہو۔ پھر جب باہر ہوا طالوت فوجیں لے کر

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ

کہا اللہ تم کو آزماتا ہے ایک نہر سے ۔ پھر جس نے پانی پیا اس کا وہ میرا نہیں اور

مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ

جس نے اس کو نہ چکھا وہ ہے میرا، مگر جو کوئی بھرے ایک چُلّو اپنے ہاتھ سے

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

پھر پی گئے اس کا پانی مگر تھوڑے ان میں پھر جب پار ہوا وہ اور ایمان والے

مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ

اس کے ساتھ کہنے لگے قوت نہیں ہم کو آج جالوت کی اور اس کے لشکروں کی بولے جن کو

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً

خیال تھا کہ اُن کو ملنا ہے اللہ سے بہت جگہ جماعت تھوڑی غالب ہوئی ہے جماعت

كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ

بہت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ ساتھ ہے ٹھہرنے والوں کے اور جب سامنے ہوئے جالوت کے

وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ

اور اس کی فوجوں کے بولے اے رب ہمارے ڈال دے ہم میں جتنی مضبوطی ہے اور ٹھہرا ہمارے پاؤں اور

انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ

مدد کر ہماری اس کافر قوم پر پھر شکست دی ان کو اللہ کے حکم سے اور مارا

دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ

داؤد نے جالوت کو اور دی اس کو اللہ نے سلطنت اور تدبیر اور سکھایا اس کو جو چاہا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ

اور اگر دفع نہ کروا دے اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے تو خراب ہو جاوے ملک

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا

لیکن اللہ فضل رکھتا ہے جہان کے لوگوں پر یہ آیتیں اللہ کی ہیں ہم تجھ کو سناتے

عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

ہیں تحقیق اور تو بے شک رسولوں میں ہے۔

قصہ طالوت وجالوت

برائے ترغیب جہاد وقتال ورعایت آداب جہاد

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ ... الى ... وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾﴾

ربط: حق جل شانہٗ ان آیات میں بنی اسرائیل کا دوسرا قصہ بیان فرماتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تخمیناً اور اندازاً اگیارہ * سو سال

* کما فی التفسیر الحقانی ۱۲

پہلے گذرا ہے۔اس قصہ سے جہاد وقتال کی ترغیب اور آدابِ جہاد کی تعلیم اور صبر وتحمل کی تلقین مقصود ہے۔نیز گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کا قابض اور باسط ہونا مذکور ہوا ﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵﴾ اب ان آیات اور اس قصہ میں جو یہاں مذکور ہوا اس کے قبض اور بسط کی دلیل ہے کہ وہ مالک الملک ایسا قابض اور باسط ہے کہ جب چاہتا ہے۔فقیر کو بادشاہ اور بادشاہ کو فقیر بنا دیتا ہے۔ بادشاہت کا دینا اور چھیننا سب اس کے ہاتھ میں ہے۔چنانچہ فرماتے ہیں: کیا اے مخاطب! تو نے بنی اسرائیل کے سربرآوردہ [1] اور اشراف لوگوں کی جماعت کو نہیں دیکھا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ایک زمانہ بعد اپنے زمانہ کے ایک نبی جن کا نام شمویل [2] تھا یہ کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے جس کے ساتھ ہو کر ہم راہ خداوندی میں جہاد وقتال کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک مدت تک بنی اسرائیل کا حال درست رہا اور ان کا کام بنا رہا۔رفتہ رفتہ جب وہ احکامِ تورات سے دور ہو گئے تب اللہ تعالیٰ نے اُن کے دشمنوں کو ان پر مسلّط کیا اور عمالقہ ان پر غالب آ گئے اور جالوت جو کافر بادشاہ تھا اُس نے بنی اسرائیل کے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا اور سینکڑوں بچوں کو پکڑ کر لے گیا اور ان کو غلام اور لونڈی بنا لیا۔اور بنی اسرائیل سے توریت بھی چھین کر لے گئے۔جب ذلت اور رسوائی یہاں تک پہنچ گئی تو بنی اسرائیل کے اشراف اور سرداروں کو خیال پیدا ہوا کہ اس ذلت کا کوئی مداوا ہو اس لیے اپنے نبی سے جن کا نام شمویل علیہ السلام تھا بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی حضرت شمویل علیہ السلام نے ان کو یہ جواب دیا کہ کیا تم سے اس کی توقع ہے کہ اگر تم کو جہاد وقتال کا حکم ہو جائے تو نہ لڑو یعنی تمہاری حالت سے مجھے توقع نہیں کہ اگر تم پر جہاد و قتال فرض ہو جائے تو تم بادشاہ کے ساتھ ہو کر جہاد وقتال کرو۔بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں جہاد وقتال نہ کریں اور حالانکہ جہاد کے لیے اس وقت ایک خاص داعیہ اور سبب بھی موجود ہے وہ یہ کہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے جدا کر دیئے گئے۔غرض یہ کہ اس طرح لوگوں نے جہاد پر اپنی پختگی اور آمادگی کو ظاہر کیا پس جب ان کے اصرار اور اظہار پختگی کے بعد ان پر جہاد وقتال فرض کیا گیا تو سوائے چند آدمیوں کے سب پھر گئے اور وہ چند آدمی وہ تھے کہ جو نہر سے پار اُترے جس کا بیان عنقریب آئے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں اور ستم گاروں کو خوب جانتا ہے ظلم اور معصیت آدمی کو بزدل بنا دیتی ہے۔اور ظلم وستم کی اصل جڑ نبی پر اعتراض کرنا ہے جس نے نبی کی بات کو بے چون وچرا قبول کیا اس نے اپنی جان پر رحم کیا اور جس نے نبی کی بات پر اعتراض کیا اس نے اپنی جان پر ظلم عظیم کیا۔چنانچہ جس وقت ان کے نبی نے ان کے جواب میں کہا کہ (اوّل) تو یہ ہے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یعنی تمہاری عزت اور سرداری کے حصول کے لیے طالوت بادشاہ مقرر کیا ہے سنتے ہی نبی پر اعتراضات شروع کئے اور یہ کہا کہ طالوت کو ہم پر حکومت اور سلطنت کا کیا حق حاصل ہے۔طالوت ایک فقیر آدمی ہے قوم کا سقاء یا رنگریز ہے۔شاہی خاندان سے نہیں۔اور ہم سلطنت کے اُس سے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ ہم شاہی خاندان سے ہیں اس لیے کہ ہم یہودا کی اولاد میں سے ہیں جس میں بادشاہت چلی آ رہی ہے اور علاوہ ازیں طالوت کو مال ودولت کی فراخی اور فراوانی بھی حاصل نہیں اور ہم دولت منداور اصحابِ ثروت ہیں۔لہٰذا ایسے شخص کو کہ جس کو نہ خاندانی وجاہت حاصل ہو اور نہ مالی عزت حاصل ہو بادشاہ بنانا کسی طرح مناسب نہیں اللہ کے نبی نے ان کے اعتراض کے جواب میں

---

[1] یہ ترجمہ لفظ ملأ کا ہے اس لیے ملا لغت میں اشراف اور سرداروں کی جماعت کو کہتے ہیں جو اپنی عظمت اور ہیبت سے مجلس کو بھر دے۔

[2] جمہور کا قول یہی ہے کہ ان کا نام شمویل علیہ السلام تھا بعض کہتے ہیں کہ وہ نبی شمعون علیہ السلام تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام یوشع بن نون علیہ السلام تھا اور یہ صحیح نہیں اس لیے کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے قریب زمانہ کا ہے اور یوشع بن نون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے تھے۔۱۲

ارشاد فرمایا کہ تمہارے یہ اعتراض سب مہمل اور لایعنی ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے طالوتؑ کو محض تمہارے نفع اور فائدہ کے لیے پسند کیا ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جس کو سلطنت کے لیے پسند فرمائیں گے اُس سے بڑھ کر کوئی شخص سلطنت اور حکمرانی کا اہل نہیں ہوسکتا اور خصوصاً جب کہ ارادۂ خداوندی تمہارے نفع اور خیر کا ہے جیسا کہ لفظ لکُمسے صاف ظاہر ہے تو ایسی صورت میں تو کسی شر اور فساد کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ معلوم ہوا کہ طالوت کی سلطنت تمہارے لیے سراپا خیر و برکت ہوگی اور دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے تمہارے لیے باعثِ عزت ہوگی۔

حق جل شانہٗ جب کسی قوم کی تباہی اور بربادی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس پر ظالموں اور ستمگاروں کو حاکم بناتے ہیں اور جب کسی قوم کی فلاح اور بہبودی کا ارادہ فرماتے ہیں تو پاکیزہ اور پسندیدہ حکمران اُن کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ غرض یہ کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری خیر اور نفع اور مصلحت کے لیے پسند کیا ہے اور تم اپنی مصلحتوں کو کماحقہٗ نہیں سمجھ سکتے اس لیے اس انتخاب خداوندی میں تم کو خدشہ اور وسوسہ نہ کرنا چاہئے اور دوسرے یہ کہ سلطنت اور بادشاہت کا اصل دارومدار عقلِ سلیم اور جسم سلیم پر ہے حسب ونسب اور مال و دولت پر نہیں جس شخص کے قوائے عقلیہ ادراکیہ اور قوائے جسمانیہ صحیح اور تندرست ہوں وہی بادشاہ بنائے جانے کا مستحق ہے اور یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت علیہ السلام کو عطا کی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم وفہم اور عقل و دانش میں وسعت اور فراخی عطا کی ہے اور قوتِ جسمانیہ اور بدنیہ میں بھی اس کو زیادتی عطاء فرمائی ہے اور بادشاہ ہونے کے لیے انہی دو صفتوں کی ضرورت ہے علم اور فہم سے ملکی انتظام پر قدرت ہوگی اور بدنی قوت اور جسامت شجاعت اور بہادری کی علامت ہے اور ظاہر ہے کہ جب فہم وفراست کے ساتھ شجاعت بھی مل جائے گی تو کارخانۂ سلطنت نہایت خیر وخوبی کے ساتھ چلے گا۔ اس لیے کہ سلطنت چلانے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ بادشاہ کی عظمت اور ہیبت لوگوں کے قلوب میں راسخ ہو۔ اگر دلوں میں بادشاہ کی عظمت اور ہیبت نہ ہو تو لوگ اطاعت اور فرمانبرداری نہ کریں گے اور کارخانۂ سلطنت نہ چلے گا اور حقیقی عظمت اور ہیبت کا مدار فہم وفراست اور قوت وشجاعت پر ہے اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطاء کی ہیں طالوت علم اور فہم میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے اور قوتِ جسمانیہ کا یہ حال تھا کہ طالوت تمام بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور قدآور اور بہادر تھے اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے طالوت ﴿مُلْهَمٌ مِنَ اللّٰهِ﴾ بھی تھے۔ یعنی صاحب الہام بھی تھے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم میں جس کسی کو شان، اصطفاء سے حصّہ ملا ہے وہ ضرور صاحبِ الہام اور صاحب کشف وکرامت ہوا ہے اور ﴿فِي الْعِلْمِ﴾ کا لفظ اپنے عموم اور اطلاق کی بنا پر علم ظاہری اور علم باطنی اور علم شریعت اور علم سلطنت اور علم سیاست سب کو شامل ہے کیونکہ ایسی سلطنت جس سے دین اور دنیا دونوں ہی درست ہوں وہ جب ہوسکتی ہے کہ جب بادشاہ اوصافِ مذکورہ کا حامل ہو۔ اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہیں اس کی عطاء اور بخشش کے لیے کسی اہلیّت اور قابلیت کی شرط نہیں بلکہ اہلیت اور قابلیت کے لیے اس کی عطاء شرط ہے کسی کی مجال کیا ہے جو اس خداوند ذوالجلال سے سوال کرسکے وہ مالکِ مطلق ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں بادشاہی عطا کرتے ہیں اور اگر وہ شخص بادشاہت کی ذرہ برابر لیاقت بھی نہ رکھتا ہو تو اس کو سلطنت کی لیاقت اور قابلیت عطا فرمادیتے ہیں اور غیب سے اس کی مدد فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت اور کشائش والے ہیں اس کے خزائن کی کوئی حد اور نہایت نہیں انہیں کسی فقیر کو امیر بنادینا کیا مشکل ہے اور سب کچھ جاننے والے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کون بادشاہت کے لائق ہے اور کون اس کے لائق نہیں حق تعالیٰ نے اس آیت میں طالوت کی بادشاہی کے چار سبب بیان کیے۔ **اوّل**: اس کی خداداد صلاحیتیں جس کو اصطفاء سے تعبیر کیا۔ **دوم**: وسعت علم جس پر حکمرانی اور تدبیر ملکی کا دارومدار ہے۔ **سوم**: توانائی جسم جو شجاعت اور ہیبت اور قدرت علی المدافعت کا موجب ہے۔ **چہارم**: تائید غیبی

جس کو ﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور ﴿اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ .... الخ﴾ سے ظاہر فرمایا۔

چونکہ بنی اسرائیل کے سرداروں نے طالوتؑ کے بادشاہ بنانے کو بہت بعید سمجھا اس لیے ان کے رد میں قدرے تفصیل فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

① کہ بادشاہت کا اصلی اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش اور اس کا اصطفاء اور پسندیدگی ہے خدا تعالیٰ جس کو بادشاہت کے لیے پسند فرمالے وہی بادشاہ ہے اور خدا تعالیٰ جس کو پسند فرمائے وہ کبھی ناپسندیدہ نہیں ہوسکتا۔

② اور اگر تمہاری نظر ظاہری اسباب پر ہے تو سمجھ لو کہ سلطنت کا مدار حسب ونسب اور مال ودولت پر نہیں اس لیے کہ مال آنے جانے والی چیز ہے صبح آتا ہے اور شام جاتا ہے۔ بلکہ سلطنت کا ظاہری سبب یہ ہے کہ علم اور فہم ہو اور اس کے ساتھ قوتِ بدنیہ ہو تا کہ اس قوتِ جسمانیہ سے علم اور فہم کے موافق عمل کرنے کی قدرت حاصل ہوسکے ورنہ علم بغیر قدرت اور قوت کے بیکار ہے خصوصاً کارخانۂ سلطنت محض علم سے بدون قدرت کے نہیں چلتا۔ اور تیسرے یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے بعد کسی کو مجال دم زدنی نہیں۔ وہ تمام مصلحتوں کو تم سے زیادہ جانتا ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے وہ تم پر تم سے زیادہ مہربان ہے۔ اس لیے اب تم کو طالوت کی بادشاہت میں کوئی حجت نکالنا روا اور زیبا نہیں۔ مگر یہ ظالم [1] کب خاموش ہونے والے تھے۔ اللہ کے نبی نے ان ظالموں کے اعتراض کا نہایت شافی اور کافی جواب دے دیا لیکن یہ لوگ اپنے وسوسوں کی وادی تیہ میں بھٹکتے رہے اور بالآخر ان لوگوں نے حضرت شمویل علیہ السلام سے یہ کہا کہ اچھا ہمیں طالوت علیہ السلام کی بادشاہت اور اُن کے برگزیدہ ہونے کی کوئی ظاہری نشانی بتلایئے جسے دیکھ کر ہمیں اُن کے بادشاہ ہونے کا بالبداہت یقین آجائے اور قلب مطمئن ہوجائے۔ اس وقت اُن کے پیغمبر علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ تحقیق طالوت کے من جانب اللہ بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس بلا کسی ظاہری سبب کے وہ صندوق آجائے گا جو تم سے چھن گیا تھا۔ اس صندوق کے اس طرح آنے میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری دل جمعی اور سکونِ قلب اور آرام دل کا سامان ہوگا اور اس صندوق میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے خاندان کے کچھ تبرکات بھی ہوں گے جن کو وہ چھوڑ گئے ہیں۔ اُن تبرکات کا تمہیں مل جانا صد ہزار خیرات وبرکات کا موجب ہوگا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ اور سدّی اور عکرمہ اور ربیع بن انس اور ابوصالح رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے کہ اس تابوت میں توریت کی دو تختیاں اور کچھ اُن تختیوں کے ٹکڑے تھے جو ٹوٹ گئی تھیں اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے عصا اور ان کے عمامے اور جوتے وغیرہ تھے۔ اور اس صندوق کی آمد بھی عجب شان سے ہوگی۔ وہ یہ کہ فرشتے اس تابوت کو اٹھا کر لائیں گے اور طالوت کے سامنے لاکر رکھ دیں گے۔ تحقیق اس صندوق کے اس طرح آنے میں تمہارے لیے ایک نشانی ہوگی جو طالوت کی بادشاہت اور میری نبوت کی صداقت کی دلیل ہوگی۔ اگر تم باور کرو۔ صندوق کا اس خارقِ عادت طریق پر آنا جس طرح طالوت کی بادشاہت کی دلیل ہوگا۔ اسی طرح حضرت شمویل علیہ السلام کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہوگا کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے جس طرح خبر دی تھی اسی طرح ظہور ہوا اور فرشتوں نے وہ تابوت لاکر طالوت کے سامنے رکھ دیا۔ بنی اسرائیل خوش ہوگئے اور اُن کو بادشاہ مان لیا اور سب کے سب جہاد کے لیے فوراً تیار ہوگئے۔ پس جب طالوت ان فوجوں کو لے کر شہر سے باہر نکلا تو

---

[1] اس لفظ ظالم میں گزشتہ آیت ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔

فوجوں سے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ ایک نہر سے تمہارے صبر اور تحمل کی آزمائش فرمائیں گے ان لوگوں نے اللہ کے نبیؑ پر اعتراضات کیے اور طالوت کی بادشاہت کی نشانی طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک آزمائش میں مبتلا کیا۔ بظاہر یہ ابتلاء اور آزمائش کا حکم بذریعہ وحی حضرت شمویل علیہ السلام پر نازل ہوا اور پھر حضرت شمویل علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق طالوت نے اس حکم کا اعلان کیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت طالوت کو اس کا الہام ہوا ہو۔ اس لیے کہ حضرت طالوت خدا کے پسندیدہ تھے اگرچہ نبی نہ تھے مگر ولی ضرور تھے۔ الہام یا خواب کے ذریعہ سے اس کا القاء ہونا کوئی مستبعد نہیں اور ولی کا الہام اگرچہ فی حد ذاتہٖ ظنی ہے مگر جب نبیؑ اس کی تصدیق کر دے تو وہ قطعی ہو جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان امر کے متعلق طالوت کو کوئی الہام ہو اور وہ اپنے اس الہام کا بغیر حضرت شمویل علیہ السلام کی تصویب اور اجازت کے اعلان کریں۔ نبی علیہ السلام کی تصدیق اور تصویب تو بہت بڑی چیز ہے کسی چیز کو ہوتے دیکھ کر نبیؑ کا انکار نہ کرنا یہ بھی اس امر کے جائز ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

اصطلاح شریعت میں اس کو تقریر نبوی کہتے ہیں۔ یعنی نبی کے سکوت اور عدم انکار نے اس امر کو جائز اور درست قرار دیا جو باجماع اُمّت حجت ہے۔ اب آئندہ آیت میں اس امتحان کی تفصیل ہے۔ پس جو شخص اس نہر سے سیر ہو کر پانی پی لے گا اس کا میرے سے کوئی تعلق نہیں یعنی میرے گروہ سے نہیں رہا اور جس شخص نے اس کا مزہ بھی نہ چکھا۔ یعنی پینا تو درکنار منہ سے بھی نہ لگایا تو وہ بلاشبہ میرے سے وابستہ ہے اور میرے خاص رفقاء اور ساتھیوں میں سے ہے۔ مگر وہ شخص جو اپنے ہاتھ سے ایک چلّو بھر لے سو وہ میرے گروہ سے خارج نہ ہوگا۔ عزیمت اور اصل حکم تو یہی تھا کہ پانی کو بالکل نہ چکھنا۔ بمقدار ایک چلّو کے رخصت ہے۔ یعنی جس نے سیر ہو کر تو پانی نہیں پیا اور صرف جان بچانے کے لیے ہی برائے نام پی لیا تو وہ بھی فی الجملہ مقبول ہے اور غنیمت ہے۔ پس جب اس نہر پر پہنچے تو سب نے بے تحاشا اس نہر سے منہ لگا کر پانی پی لیا۔ مگر تھوڑے آدمیوں نے جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی انہوں نے عزیمت اور رخصت پر عمل کیا اور اجازت سے تجاوز نہ کیا۔ جن لوگوں نے چلّو سے پانی پیا اُن کی پیاس بُجھ گئی اور ان کا دل قوی ہو گیا اور جن لوگوں نے زیادہ پیا وہ بزدل اور نامرد ہو گئے اور نہ ان کی پیاس بجھی اور نہ وہ اس قابل رہے کہ نہر سے پار ہو سکیں۔ پس جب طالوت اور ان کے رفقاء مومنین نہر سے پار ہو گئے اور دیکھا کہ ہم ایک مٹھی بھر جماعت ہیں اور جالوت کا لشکر ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہے اس لیے بعض ضعیف القلب یہ کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ دشمن کی طاقت بہت ہے اور ہم بہت تھوڑے ہیں۔

البتہ ان میں کے جو لوگ اولوالعزم اور اہلِ ہمّت تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک دن خدا سے ملنا ہے اور اس کو منہ دکھانا ہے اور خدا تعالیٰ نے جو فتح اور نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ بالکل حق ہے۔ ان لوگوں نے کمزوروں کو ہمت دلائی اور یہ کہا کہ گھبراؤ نہیں فتح و نصرت کا دارومدار قلت و کثرت پر نہیں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ بہت تھوڑی اور چھوٹی سی جماعت بڑی سے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور خدا تعالیٰ جس کے ساتھ ہو وہ کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے کے لیے میدان میں نکلے تو اپنی ہمت اور شجاعت پر نظر نہیں کی بلکہ خداوند ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ دُعا مانگنی شروع کی۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کو پانی [1] کی طرح بہا دے کہ سر سے پیر تک صبر کے پانی میں نہا جائیں اور صبر کی

---

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ ﴿اَفْرِغْ عَلَيْنَا﴾ میں استعارہ ہے۔ افراغ اصل میں پانی بہا دینے کو کہتے ہیں اور کلمہ علی علینا میں استعلاء کے لیے ہے۔ یعنی وہ صبر ہماری کمزوری پر غالب آ جائے۔ ۱۲

برودت اور سکینت ہمارے ظاہر اور باطن میں سرایت کر جائے اور کافروں کے مقابلے میں ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما اور ہم کو فتح دے۔ پس اس صبر اور تحمل اور اللہ پر اعتماد اور توکل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تھوڑے آدمیوں نے جالوت کی فوجوں اور لشکروں کو اللہ کی تائید سے شکست دی اور داؤد علیہ السلام نے جو اس وقت مع اپنے والد اور چھ بھائیوں کے طالوت کے لشکر میں تھے اور ابھی تک اُن کو نبوت نہیں ملی تھی جالوت کو قتل کر ڈالا۔ داؤد علیہ السلام اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے تھے۔ جب میدان کارزار سامنے آیا اور جالوت نہایت کروفر کے ساتھ زرہ اور خود پہن کر میدان میں آیا اور بنی اسرائیل سے مبارز اور مقابل طلب کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام بغیر تلوار اور بغیر ہتھیار کے صرف تین پتھر لے کر اس کے مقابلہ کو نکلے۔ جب سامنے آئے تو اُن پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر جالوت کی پیشانی پر مارا وہ پتھر جالوت کی کُدی کی جانب سے نکل گئے۔ اور جالوت منہ کے بل زمین پر گر پڑا فوراً اس کی تلوار نکال کر اس کا سر قلم کیا۔

کہا جاتا ہے کہ راستہ میں داؤد علیہ السلام کو ایک پتھر نے آواز دی۔

یا داؤد خُذْنِیْ فبی تقتل جالوت.　　اے داؤد! مجھ کو اٹھالو۔ میرے ذریعہ سے تم جالوت کو مارو گے۔

پھر اسی طرح ایک اور پتھر نے آواز دی۔ اور پھر ایک اور پتھر نے آواز دی داؤد علیہ السلام نے تینوں پتھروں کو اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور روانہ ہوئے۔ جب جالوت گھوڑے پر سوار ہو کر اور زرہ اور تلوار لگا کر میدان میں نکلا تو داؤد علیہ السلام فقط یہ تین پتھر لے کر آگے بڑھے اور یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ مدد نہ کرے تو تلوار اور گھوڑا اور ہتھیار بھی بے کار ہے۔ جالوت نے داؤد علیہ السلام سے کہا کہ تم تو فقط پتھر لے کر میرے سامنے آرہے ہو جیسے کوئی کتے کے مارنے کے لیے نکلتا ہے۔ فرمایا تو کتے سے بھی بدتر ہے۔ اور اللہ کا نام لے کر وہ تینوں پتھر جالوت کے مارے جو ماتھے میں لگے اور گدّی کے پیچھے سے نکل گئے۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۵۷ ج ۳)

طالوت نے اس خوشی میں اپنی بیٹی حضرت داؤد علیہ السلام کے نکاح میں دے دی اور پھر اللہ تعالیٰ نے طالوت کے مرنے کے بعد داؤد علیہ السلام کو سلطنت عطا کی اور طالوت کے مرنے کے بعد باتفاقِ بنی اسرائیل داؤد علیہ السلام بادشاہ مقرر ہوئے۔ داؤد علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کسی کی بادشاہت پر اتنے مجتمع نہیں ہوئے جتنا کہ داؤد علیہ السلام کی بادشاہت پر ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو سلطنت اور بادشاہت کے ساتھ علم اور حکمت یعنی نبوت بھی عطا کی اور داؤد علیہ السلام سے پہلے کبھی کسی آدمی میں سلطنت اور نبوت جمع نہیں ہوئیں۔ سلطنت شاہی خاندان میں رہتی تھی اور نبوت نبی کے خاندان میں رہتی تھی اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو جو اُمور چاہے سکھائے۔ جیسے بغیر آلات کے زرہیں بنانا سکھایا اور لوہے کو مثل موم کے اُن کے لیے نرم کر دیا۔ پس اپنے ہاتھ سے کام کرتے اور اس کی مزدوری سے کھاتے اور پرندوں اور چیونٹیوں کی بولی اور زبان سکھائی اور خوش آوازی عطا کی۔

فائدہ: نبی اگرچہ نبی ہونے سے پہلے نبی نہیں ہوتا مگر ولی ضرور ہوتا ہے اور اولیاء کی کرامتیں حق ہیں۔ جیسا کہ کتاب اللہ اور سنتِ متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ محض تین پتھروں سے جالوت کو مارنا یہ داؤد علیہ السلام کی کرامت تھی اور آئندہ نبوت کا ارہاص یعنی پیش خیمہ تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ کرامت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کا نمونہ تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگِ حنین میں ظاہر ہوا کہ ایک مشتِ خاک سے ہوازن سراسیمہ ہو گئے۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۵۸ ج ۳)

اور اسی صبر و استقلال کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک عظیم الشان سلطنت عطا کی جو داؤدؑ کی سلطنت کا نمونہ تھی۔

بیانِ حکمتِ مشروعیت جہاد

اب اس واقعہ جہاد کے ذکر کے بعد جہاد کی عام حکمت اور مصلحت کو بیان فرماتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں یعنی کافروں کے شر اور فساد کو اپنے بعض خاص بندوں یعنی مومنین کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو زمین میں فساد پھیل جائے اور کفر اور شرک غالب آ جائے اور مسجدیں ویران ہو جائیں اور کوئی خدا کا نام لینے والا باقی نہ رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں تمام لوگوں پر اس لیے اس نے تم پر جہاد فرض کیا تا کہ کفر کا فتنہ اور فساد دفع ہو اس لیے کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی فتنہ اور فساد نہیں جہاد سے اسی فساد کا دفع کرنا اور اسی شر اور فتنہ کا ازالہ مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر مسلمانوں کو کافروں سے جہاد کا حکم نہ دیتے تو بڑا فساد پھیل جاتا۔ جہاد اسی فساد کی اصلاح اور انسداد کے لیے مقرر ہوا ہے۔ اس لیے جہاد کو اللہ کا بڑا فضل سمجھو۔

اثباتِ رسالت محمدیہ ﷺ

یہ واقعات جن کا ذکر کیا اللہ کی آیتیں ہیں جن کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر ہم آپ کو سناتے ہیں جس میں ذرہ برابر شک نہیں۔ یہ واقعات جس طرح ہم نے بیان کیے اسی طرح حق اور صدق ہیں اہل کتاب جس طرح بیان کرتے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں اور یہ تمام واقعات اللہ کی قدرت اور پھر آپ ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں۔ کیونکہ ایسے قدیم زمانہ کے واقعات کا بغیر کسی سے پڑھے اور بغیر کسی سے سنے صحیح صحیح بیان کرنا بغیر وحی خداوندی کے ممکن نہیں۔ اور آپ ﷺ بلا شبہ خدا کے رسولوں میں سے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے دشمنوں سے جہاد کا حکم دیا اور باوجود بے سروسامانی کے کافروں کے بڑے بڑے لشکروں کو اُن کے خدام اور غلاموں کے ہاتھ سے تہ و بالا کرایا۔ جہاد انبیاء علیہم السلام کی سُنّت ہے اور وہ لوگ نادان ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جہاد و قتال نبیوں کا کام نہیں۔ جہاد ہمیشہ رہا ہے اگر جہاد نہ ہو تو مفسد لوگ مُلک کو ویران کر دیں۔

الحمد للہِ الذی بنعمتہٖ تتم الصالحات. والصلوٰۃ والسَّلَامُ علیٰ سید الموجودات و خلاصۃ الکائنات و علیٰ اٰلِہٖ واصحٰبہٖ و ازواجہٖ الطاھرات المطھرات.

۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ۔ بعد صلاۃ المغرب ـــــ جامعہ اشرفیہ ـــــ لاہور

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ

یہ سب رسول بڑائی دی ہم نے ان میں ایک کو ایک سے کوئی ہے کہ کلام کیا اس سے اللہ نے

وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ

اور بلند کیے بعضوں کے درجے اور دی ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو نشانیاں صریح اور

اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ

زور دیا اُس کو روح پاک سے اور اگر چاہتا اللہ، نہ لڑتے ان کے پچھلے

بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

بعد اس کے کہ پہنچے ان کو صاف حکم لیکن وہ پھٹ گئے

مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَ لٰكِنَّ

پھر کوئی ان میں یقین لایا اور کوئی منکر ہوا۔ اور اگر چاہتا اللہ نہ لڑتے لیکن

اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ ع ۳۳ ۵ ۱

اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

ذکر فضائل رسل وبیان حال اُمم

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ ... الٰى ... وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾﴾

ربط: گزشتہ آیت ﴿وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا اور اُن کی اُمتوں کے معاملات کا ذکر فرمایا اور کافروں سے اُن کے جہاد اور قتال کے واقعے اور اُن کی بے مثال اور خارقِ عادت فتح ونصرت اور تائید غیبی کا ذکر کیا۔ اسی طرح اب آئندہ آیات میں رُسل کے فضائل و درجات اور ان کے کمالات اور معجزات کے ساتھ اُن کی اُمتوں کے احوال اور انبیاء ورسل علیہم السلام کے ساتھ اُن کے اختلاف کو بیان فرماتے ہیں کہ باوجود آیاتِ بینات اور دلائل واضحات کے دیکھ لینے کے پھر بھی ایمان نہ لائے اور حق سے اختلاف کیا۔ اور انبیاء ورسل علیہم السلام کی مخالفت کی اور حق کی دعوت اور تبلیغ میں مزاحم ہوئے اور اس لیے حق تعالیٰ نے اُن کا شر اور فساد دفع کرنے کے لیے حضرات مرسلین علیہم السلام کو جہاد کا حکم دیا۔ اہل باطل کی طرف سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی مخالفت جہاد وقتال کی مشروعیّت کا سبب بنی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اُن کے اصحاب نے دین حق اور ہدایت کی بقاء اور حفاظت کے لیے اور متقی اور پرہیزگاروں اور خدا کے

پرستاروں کے تحفظ کے لیے جہاد کیا تا کہ اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب اور اس کی نازل فرمودہ ہُدیٰ یعنی ہدایت اور اس کی ہدایت پر چلنے والے متقی اور پرہیز گار اور نماز گذار بندے کفار نا ہنجار کی مزاحمت سے محفوظ اور مامون ہو جائیں اور کفر کی یہ مجال نہ رہے کہ دین حق کی طرف نظر اٹھا سکے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ گزشتہ آیات میں کافروں سے جہاد وقتال کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں کافروں سے جہاد وقتال کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مخالفت اور اُن کی بے چون و چرا اطاعت سے سرتابی اور گردن کشی کی وجہ سے کافروں کی سرکوبی اور گردن کشی کا حکم نازل ہوا۔ اس تقریر سے ان شاء اللہ تعالیٰ ان آیات کا سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ کے ساتھ بھی ربط ظاہر ہو جائے گا۔ جو مزید غور وفکر کا بھی محتاج نہیں۔ اور آئندہ آیات یعنی ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ میں چونکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر ہے جس میں جہاد میں مالی امداد کرنا بھی داخل ہے۔ اس لیے ان آئندہ آیات کو بھی جس طرح گزشتہ آیاتِ جہاد وقتال سے ربط ہے۔ اسی طرح ان آیات کو سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیت ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ سے بھی ربط ہے۔

اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ سے دور تک صدقات اور راہِ خداوندی میں خرچ کرنے کی ترغیبات کا سلسلہ چلا گیا ہے اور اس کے بعد حق تعالیٰ نے ربا (سود) کے احکام ذکر فرمائے چونکہ سود، صدقہ اور خیرات کی ضد ہے اس لیے صدقات اور خیرات کے بعد سود کے احکام بیان فرمائے اور سودی کاروبار کرنے کو خدا اور اس کے رسول سے اعلانِ جنگ قرار دیا۔ اس لیے عجب نہیں کہ سود خوری کا انجام دلوں پر مہر لگ جانا ہو کہ جس سے حق اور باطل اور حلال اور حرام کا فرق اس کو نظر نہ آئے۔ پس جس طرح آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ سورۂ بقرہ کی اس ابتدائی آیت یعنی ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ سے مرتبط ہے اسی طرح عجب نہیں کہ ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا... الخ﴾ کی آیتوں کا ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ﴾ کے ساتھ کوئی خاص ربط ہو اور تجربہ اور مشاہدہ بھی کچھ اسی کا شاہد ہے اس لیے دیکھا یہ گیا ہے کہ سود خوروں کو کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی اُن کی حالت ﴿سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ کا نمونہ ہوتی ہے۔

ع بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند

نیز اوّل پارہ میں زیادہ تر یہود بے بہبود کی شناعتوں کا بیان تھا۔ اور قرآنِ کریم میں ہے کہ یہود کے ملعون اور مغضوب ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ان کی سود خوری بھی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَاَكْلِهِمُ الرِّبٰوا﴾ اور ﴿اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ﴾ اور حرام مال آدمی کو قسی القلب، سنگ دل اور بے رحم بنا دیتا ہے اور قساوتِ قلب سے بڑھ کر دین دنیا کو تباہ کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس امت کو سود سے نہایت سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ خدانخواستہ یہود کی طرح قسی القلب اور سنگدل نہ ہو جائیں اور اس اعتبار سے آیاتِ ربا کا تعلق ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ﴾ سے بھی کوئی بعید نہیں۔ الحمد للہ کہ ان آیات کا ربط گزشتہ آیات سے بھی ظاہر ہو گیا اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں سے بھی مرتبط ہونا معلوم ہو گیا۔

ربط دیگر: گزشتہ آیت ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں حضور پُرنور ﷺ کی رسالت کا بیان تھا کہ آپ ﷺ اللہ کے بلاشبہ رسول ہیں۔ مگر معاندین باوجود دلائل نبوت اور شواہد رسالت کے مشاہدہ کے آپ ﷺ کی رسالت کو نہیں مانتے۔ ان آیات میں آپ

ﷺ کی تسلی کا مضمون مذکور ہے کہ آپ ﷺ ان معاندین کی تکذیب سے رنجیدہ نہ ہوں۔ پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو قسم قسم کے دلائل نبوت اور شواہدِ رسالت دیئے گئے مگر پھر بھی سب ایمان نہیں لائے۔ آپ کا انکار کوئی نئی بات اور کوئی قابل تعجب امر نہیں۔ کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا کہ جس پر سب ایمان لے آئے ہوں۔ لہٰذا آپ معاندین کی تکذیب اور کفر سے رنجیدہ نہ ہوں۔ یہ آپ ﷺ کی رسالت کا قصور نہیں۔ یہ تقدیر خداوندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی اسی طرح ہے کہ کوئی ایمان لائے اور کوئی کفر کرے۔

درکارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است　　دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

باقی رہا یہ امر کہ اس میں حکمت اور مصلحت کیا ہے سو وہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ یہ قضاء وقدر کا سربستہ راز ہے جو آج تک کسی پر منکشف نہیں ہوا۔ وہ مالک مطلق ہے جس کو چاہے بینائی (ہدایت) دے اور جس کو چاہے نابینا (گمراہ) بنائے۔ ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء)

کر از ہرۂ آں کہ از بیمِ تو　　کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زباں تازہ کردن باقرارِ تو　　نینگیختن علت از کارِ تو

یہ سوال کرنا کہ اس کو مؤمن اور اس کو کافر کیوں بنایا یہ ایسا ہی سوال ہے کہ اس کو بینا اور اس کو نابینا کیوں بنایا جو جواب اس کا ہے وہی اس کا ہے۔

اب آئندہ آیت میں خبر دیتے ہیں کہ ہم نے بعض رُسل کو بعض پر فضیلت دی تاکہ خدا کی قدرت کا کرشمہ اور ہر رسول کی شان اعجاز کا ایک نیا نمونہ دنیا کو نظر آئے۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

یہ پیغمبروں کی جماعت [1] جن کا ہم نے ابھی ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں ذکر کیا۔ جن میں آپ ﷺ بھی داخل ہیں اگرچہ وصف نبوت ورسالت میں سب مشترک ہیں لیکن ہم نے علاوہ نبوت ورسالت بعض کو بعض پر ایک خاص فضیلت دی ہے۔ یعنی ہر رسول علیہ السلام کو کسی خاص خصوصیت اور خاص فضیلت کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ جو دوسرے میں نہ پائی جائے تاکہ ہر ایک کا فضل وکمال الگ الگ نظر آئے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل) اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج میں آسمانوں پر انبیاء کرام علیہم السلام کو درجہ بدرجہ دیکھا۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اگرچہ نفسِ نبوت کی حیثیت سے برابر ہیں مگر مدارج اور مراتب کے اعتبار سے مختلف ہیں اور ان کے درجات جُدا جُدا ہیں۔ فضائل وکمالات میں تمام انبیاء علیہم السلام برابر نہیں۔ چنانچہ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن سے اللہ نے بلاواسطہ فرشتہ کے کلام فرمایا جیسے موسیٰ علیہ السلام اور ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام سے بلاواسطہ فرشتوں کے کلام فرمایا جیسا کہ ﴿يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ﴾ میں گزرا اور اخیر میں خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ سے شب معراج میں بلاواسطہ کلام فرمایا اور بعضوں کو اپنی ہم کلامی کا شرف تو نہیں عطا کیا لیکن ان کو دوسرا شرف عطا کیا کہ اور طرح طرح سے اُن کے درجے بلند کیے جیسے داؤد علیہ السلام کو نبوت ورسالت کے ساتھ بے مثال بادشاہت بھی عطا کی۔

---

[1] یعنی ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ﴾ کا اشارۂ تانیث جماعت رسل کی طرف ہے۔

فائدہ ① : بعض علماء کا قول ہے کہ ﴿رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾ میں بعض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں کہ اللہ نے اُن کو اپنا خلیل بنایا اور مقام خلّت سے اُن کو سرفراز فرمایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام مراد ہیں۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تعالیٰ: ﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ اور ابن عباس اور شعبی اور مجاہد رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ ﴿بَعْضَهُمْ﴾ سے سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایک درجہ میں نہیں تمام درجات اور فضائل وکمالات میں بلند اور برتر کیا۔ ① آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء علیہم السلام کا امام اور خطیب اور سردار بنایا۔ ② اور تمام اُمتوں کا شفاعت کرنے والا ③ اور تمام نبیوں کا خاتم اور آخر بنایا ④ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے افضل اور اکمل کتاب عطا کی ⑤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو سب شریعتوں سے زیادہ جامع بنایا ⑥ اور تمام انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر آپ کو معجزات عطا کیے ⑦ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم جن اور انس کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ⑧ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو تمام انبیاء علیہم السلام کے پیروؤں سے زیادہ ہوں گے ⑨ اور سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمّت کو لے کر پل صراط سے گزریں گے۔ ⑩ اور سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کو لے کر جنت میں داخل ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ

اور ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو اُن کی نبوت ورسالت کی صریح اور واضح نشانیاں عطا کیں تاکہ اُن کی نبوت ورسالت میں کسی کو شبہ نہ رہے اور روح القدس یعنی جبریل امین علیہ السلام کو ان کی تائید اور تقویت کے لیے مقرر کیا کہ ہر وقت یہود سے اُن کی حفاظت کریں تاکہ مُردوں کے زندہ کرنے اور مادرزاد نابینا اور کوڑھیوں کے تندرست کرنے سے کسی کو اُن کی الوہیت (خدائی) کا شبہ نہ ہو اس لیے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہوتے تو اوّل تو دشمنوں سے کیوں ڈرتے؟ دوم یہ کہ اُن کو جبریل امین علیہ السلام کی حفاظت کی کیا ضرورت ہوتی معاذ اللہ کیا خدا بھی کسی کی حفاظت کا محتاج ہوتا ہے؟ چونکہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت کے قائل نہ تھے اور نصاریٰ اُن کی الوہیت کے قائل تھے۔ اس لیے پہلے جملہ ﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ میں یہود کے رد کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت کو بیان کیا اور دوسرے جملہ ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ میں اُن کی الوہیت کا رد کیا جس کے نصاریٰ قائل تھے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو دین حق پر متفق کر دیتا اور پھر لوگ پیغمبروں کے بعد دین میں اختلاف نہ کرتے اور نہ آپس میں لڑتے خصوصاً دلائل واضحہ کے بعد تو اختلاف کا نام ونشان بھی نہ رہتا اس لیے کہ دلائل واضحہ کا اقتضاء یہ تھا کہ سب حق پر متفق ہو جاتے۔ لیکن باوجود دلائل واضحہ کے پھر حق کے قبول کرنے میں اختلاف کیا سو بعض ان میں سے ایمان لائے اور بعضوں نے کفر اختیار کیا اور نوبت قتل و قتال اور جنگ وجدال تک پہنچی اور اگر اللہ چاہتا تو باوجود ایمان اور کفر کے اختلاف کے پھر بھی یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں لیکن اللہ کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ یہ دنیا حق اور باطل کا میدان کارزار بنی رہے وہ حکیم مطلق حاکم مطلق ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اس پر اعتراض کر سکے کہ یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا؟

اس تمام کلام سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت بھی دلائل اور براہین اور آیات بینات سے ثابت ہے اور جس طرح بہت سے لوگ انبیاء سابقین علیہم السلام پر باوجود آیات بینات ایمان نہیں لائے۔ اسی طرح اگر بہت سے معاندین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی تصدیق نہ کریں تو تعجب نہ کیجیے ایمان عام کسی اُمت میں نہیں ہوا۔ کسی نے تصدیق کی اور کسی نے تکذیب اور اس میں اللہ کی حکمتیں ہیں جن کا علم سوائے اس کے کسی کو نہیں۔ ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ

لَاۡمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّهُمۡ جَمِیۡعًا﴾ (هود:۱۱۸) (تفسیر غرائب * البیان للنیسابوری ص ۴ ج ۳)

فائدہ ②: شروع آیت ﴿وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِیۡنَ.... الخ﴾ اور پھر اخیر آیت میں ﴿وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا﴾ فرمایا مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک یہ آیت تاکید کے لیے مکرر لائی گئی ہے اور شیخ الاسلام ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تکرار تاکید کے لیے نہیں بلکہ اس تنبیہ کے لیے اس آیت کو مکرر لایا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ لوگوں کا اختلاف اور باہمی قتل وقتال سب اللہ کے ارادہ اور مشیت سے ہے کوئی شے بغیر اللہ کی مشیت کے نہیں ہو سکتی۔

فائدہ ③: اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ پیغمبروں کے درمیان تفضیل اور مفاضلہ نہ کرو اُس سے مراد اُس تفضیل کی ممانعت ہے جو محض عصبیت اور قومی حمیت کی بناء پر ہو یا ایسی تفضیل کی ممانعت مراد ہے جو دوسرے نبی کی تنقیص اور تحقیر کا سبب بنے اس طرح بحمدہٖ تعالیٰ آیت اور حدیث میں کوئی تعارض نہ رہے گا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ								
اے	ایمان	والو	خرچ	کرو	کچھ	ہمارا	دیا	پہلے	اس	دن
لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۴﴾								
کے آنے سے جس میں نہ بکنا ہے اور نہ آشنائی ہے اور نہ سفارش اور جو منکر ہیں وہی ہیں گنہگار۔								

ترغیبات وترہیبات دربارۂ صدقات ونفقات

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا... الیٰ... وَ الۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۴﴾﴾

ربط: دور کوع پیشتر حق تعالیٰ شانہٗ نے دو حکم دیئے تھے ایک جہاد * اور دوسرا خدا تعالیٰ کو قرض * دینے کا۔ پہلے حکم کی تائید اور تقویت کے لیے طالوتؑ اور جالوت کا قصہ ذکر فرمایا۔ اب دوسرے حکم کی تائید اور تقویت کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیبات اور ترہیبات کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ بیان دور تک چلا گیا ہے۔

نیز گزشتہ آیت ﴿فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ کَفَرَ﴾ میں مکلفین کو دو قسموں پر منقسم فرمایا۔ مومن اور کافر اب اس آیت میں اہلِ ایمان کو اپنے خطاب سے عزت دی اور ان کو اہلِ ایمان کے لقب سے مخاطب فرمایا اے ایمان والو! اس رزق میں سے جو ہم

---

* والمعنی علی ما قال النیسابوری ﴿تِلۡکَ الرُّسُلُ... الیٰ.... وَ اَیَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ﴾ ومع ذالك قدرنا لهم من قومهم ما ذكرنا ذالك بعد مشاهدة المعجزات وانت رسول مثلهم فلا تحزن على ما ترى من قومك ولو شاء الله لم يختلف امم اولئك ولكن مُا قضاه الله فهو كائن وما قدره فهو واقع. تفسیر نیسابوری ص ۴۲ ج ۲)

* قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ۔ ۱۲

* مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا۔

نے تم کو دیا ہے۔ کچھ ہماری راہ میں بھی خرچ کر لو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں قصور کی تلافی کی کوئی سبیل نہیں یعنی مرنے سے پہلے اس لیے کہ قیامت میں نہ کوئی خرید و فروخت ہے اور نہ کوئی دوستی کار آمد ہے۔ اور نہ کوئی سفارش کارگر ہے اور کافر ہی ظالم ہیں کہ جان اور مال سب بے موقع صرف کر رہے ہیں پس اے ایمان والو! تم ان کافروں کی طرح اپنی جانوں اور مالوں پر ظلم نہ کرنا۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اللہ! اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ جیتا ہے سب کا تھامنے والا ہے نہیں پکڑتی اس کو اونگھ اور نہ نیند

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ

اسی کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ کون ایسا ہے کہ سفارش کرے اس کے پاس

اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ

مگر اس کے اذن سے جانتا ہے جو خلق کے رو برو ہے اور پیٹھ پیچھے اور یہ نہیں گھیر سکتے

بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

اس کے علم میں سے کچھ مگر جو وہ چاہے گنجائش ہے اس کی کرسی میں آسمان اور زمین کو

وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

اور تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے اور وہی ہے اوپر سب سے بڑا۔

اثباتِ توحید ذات و کمالِ صفات

آیتُ الکُرسی

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ ... الیٰ ... وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾﴾

گزشتہ رکوع کی آیت ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ میں اثباتِ رسالت کا ذکر تھا۔ اور اس آیت میں اثباتِ توحید کا بیان ہے نیز ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ﴾ میں حق تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کا ذکر تھا اور اس کا بیان تھا کہ قیامت کے دن کوئی سفارش اور کوئی دوستی کام نہ آئے گی جس سے خدا تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت مفہوم ہوتی ہے کہ اس کے سامنے کسی کو مجال دم زدن نہیں۔ اس لیے اس آیت میں حق تعالیٰ کی توحید ذات اور کمال صفات بیان فرماتے ہیں۔ نیز گزشتہ آیت ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ میں کافروں کو ظالم بتلایا تھا۔ اب اس آیت میں ان کے ظلم کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ کافر اور مشرک اس لیے ظالم ہیں کہ خدا

تعالیٰ کے ساتھ شریک گردانتے ہیں۔ اور صحیح عقیدۂ توحید کو بیان فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم کافروں کی طرح شرک کر کے ظالم نہ بنو بلکہ عقیدۂ توحید کو حرز جان بناؤ۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اللہ وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں صرف وہی عبادت کا مستحق ہے استحقاق عبادت میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں اس لیے کہ صرف خدا تعالیٰ اپنی ذات سے خود بخود زندہ اور موجود ہے اس کی حیات اور بقاء ذاتی اور ابدی ہے اس کی حیات کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہاء اور اس کے سوا ہر چیز اپنی ذات سے مُردہ اور معدوم ہے اور اس کی حیات مستعار کی ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی۔ اس لیے کہ کوئی شے اپنی ذات سے قائم نہیں خدا تعالیٰ ہی ہر شے کا قائم رکھنے والا ہے۔ ہر شے اپنی حیات اور بقاء اور وجود میں اس کی محتاج ہے جیسے سایہ اپنی اصل کا محتاج ہوتا ہے ممکنات اپنے وجود اور بقاء میں اس سے کہیں زائد خدا کے محتاج ہیں۔ ممکنات کی حیات اور وجود اسی واجب الوجود کی حیات کا ایک ادنیٰ سا عکس اور پرتو ہے ؎

کل ما فی الکون وھم او خیال او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

غرض یہ کہ حق تعالیٰ تمام عالم کا قائم رکھنے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا ہے ایک لمحہ بھی تدبیر سے غافل نہیں اس لیے کہ اُس کو اونگھ اور نیند نہیں پکڑتی اس لیے کہ نیند ایک قسم کا تغیر ہے جو وجوب کے منافی ہے اور حیات کو ضعیف اور کمزور بناتا ہے۔ پس جس کو اونگھ اور نیند آئے گی اس کی حیات بھی ناقص اور کمزور ہوگی اور دوسروں کی تدبیر بھی نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ نیند موت کی بہن ہے لہٰذا نیند کی وجہ سے اس کی حیات بھی ناقص ٹھہرے گی اور اس کی شان قیومت میں بھی قصور اور نقصان لازم آئے گا اور چونکہ وہی سب کے وجود اور حیات کا قائم رکھنے والا ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی کی ملک ہے اوپر سے لے کر نیچے تک اسی کی حکومت اور بادشاہی ہے اس لیے کہ اصل مالک وہ ہے جو وجود اور حیات کا مالک ہو اور اس کی عظمت اور جلال اور شان کبریائی کا یہ عالم ہے کہ اس کی بارگاہِ عالی میں کسی کی مجال نہیں کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارش کر سکے۔ چہ جائیکہ کوئی اس کے حکم کو ہٹا سکے یا ٹلا سکے۔ یہ تو اس کی عظمت اور جلال کا حال ہوا اور اس کے علم کی یہ شان ہے کہ وہی مخلوقات کے تمام اگلے اور پچھلے احوال کو خوب جانتا ہے تمام عقلاء عالم مل کر بھی معلومات خداوندی میں سے کسی ایک معمولی چیز کے علم اور ادراک کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنی مقدار وہ تم کو علم دینا چاہے۔ فقط اتنی مقدار تم اس چیز کو جان لیتے ہو اصل کُنہ اور حقیقت کا علم اور اس کا علمی احاطہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۸۵) ترجمہ: "اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔"

غرض یہ کہ خداوندِ ذوالجلال کا علم ذاتی اور تام ہے اور مخلوق کے تمام احوال کو محیط ہے جو اس کی وحدانیت اور قیومیت اور کمال عظمت پر دال ہے اور بندوں کا علم نہایت قلیل اور ناتمام بلکہ برائے نام ہے بندہ بدوں اس کی تعلیم کے ایک ذرہ کو بھی نہیں جان سکتا اور ایک ذرہ کے بھی تمام احوال اور کیفیات اور جہات اور حیثیات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اگر ایک حال کو جان لیتا ہے تو سو حال سے جاہل اور بے خبر رہتا ہے اور اس علم ناتمام کے ساتھ اس بارگاہ میں شفاعت کرنا جس کا علم ذاتی اور تام ہو اور تمام اشیاء کی حقیقت اور کنہ اور تمام احوال کو محیط ہو بغیر اس کی اجازت کے ممکن نہیں۔ اس لیے کہ شفاعت وہاں ہوتی ہے جہاں شفاعت کرنے والا بادشاہ کو ایسی چیز سے آگاہ کرے جس کی بادشاہ کو خبر نہ ہو یا اس کو عفو کی مصلحت کی خبر نہ ہو اور بارگاہِ خداوندی میں یہ ناممکن ہے کہ اس کو کسی شے کا علم نہ ہو اور اس کی مالکیت تمام کائنات کو محیط ہے اس لیے کہ اس کی کرسی جو اس کے عرش سے کم ہے وہی تمام آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے اور اپنے اندر سمائے ہوئے ہے جس طرح چاہے زمین اور آسمان میں تصرف کرتا ہے کسی کی مجال کیا ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارش

کا کلمہ زبان سے نکال سکے شافع اور مشفوع لہٗ سب اسی کی ملک ہیں اور اس کی قدرت اور قیومیت کا یہ حال ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی حفاظت اور نگہبانی اس پر ذرہ برابر شاق اور گراں نہیں اور کیسے اس پر گراں ہوسکتی ہے۔ وہ بڑا عالی شان اور بلند مرتبہ ہے۔ ذات اور صفات میں کوئی بھی کسی طرح اس کے برابر نہیں وہ اتنا بلند مرتبہ ہے کہ اس کی شان کے مطابق کوئی حمد وثنا بھی نہیں کرسکتا۔ بڑی عظمت والا ہے کہ ہر چیز اس کے سوا حقیر اور قبیح ہے۔ وہ اپنے افعال میں کسی کا محتاج نہیں عظمت وجلال کی وجہ سے سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ پس جس ذات پاک کی یہ صفات ہوں کیا اس کا انکار کرنا یا اس کے ساتھ کسی کو شریک گرداننا ظلم عظیم نہ ہوگا۔ کما قال اللہ تعالیٰ فی الآیۃ الاولیٰ : ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

فوائد ولطائف

اس آیت کو آیت الکرسی کہتے ہیں۔ جس میں حق تعالیٰ شانہٗ کی توحید ذاتی اور صفاتی کا ذکر ہے۔ توریت اور انجیل اور کتب سابقہ کے دیکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی کمال ذات اور کمال صفات کے متعلق جیسا اس آیت میں ذکر ہے اس کا شمہ بھی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔

اس آیت میں سب سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی توحید ذاتی کو بیان فرمایا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ﴾۔ بعد ازاں ان صفات کو بیان فرمایا۔

① اَلْحَیُّ

کمالات وجودیہ میں سب سے پہلا حیات ہے۔ ((حَیٌّ)) لغت میں اس زندہ شے کو کہتے ہیں جو واقف ہو اور سنتا اور دیکھتا اور قادر ہو۔ پس صفت حیات تمام صفات کمال کا مبدء ہے۔

② اَلْقَیُّوْمُ

یعنی کائنات کو قائم اور باقی رکھنے والا۔ حَیٌّ سے خدا کا واجب الوجود ہونا بیان کیا اور قَیُّوْمٌ سے خدا کا واہب الوجود ہونا بیان کیا یعنی بذاتہٖ اور بنفسہٖ وہ واجب الوجود ہے اور دوسروں کو وجود اور حیات ہبہ اور عطا کرنے والا ہے ممکن میں جو وجود بھی ہے وہ اسی واجب الوجود کا ہبہ اور عطیہ ہے۔ صفت حیات کو ذکر کر کے کمال وجود کو بیان فرمایا۔ اور صفت قیومیت کو ذکر کر کے کمال ایجاد کو بیان فرمایا۔

③ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اس کو نہ اُونگھ پکڑتی ہے اور نہ نیند۔ اس سے حق تعالیٰ کا تغیرات اور حوادث اور خصائص ممکنات سے پاک اور بری ہونا بیان فرمایا۔ یہ جملہ ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ کی تاکید ہے کیونکہ اُونگھ اور نیند سے حیات میں نقصان آتا ہے اس لیے کہ نیند موت کی بہن ہے اور خدا

تعالیٰ موت کے شائبہ سے بھی پاک اور منزہ ہے۔ علاوہ ازیں جس کی حیات ناقص ہوگی اس کی قیومیت یعنی حفاظت اور نگرانی بھی ناقص اور کمزور ہوگی۔ لہٰذا ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایسا قیوم اور مدبر ہے کہ ایک لمحہ بھی تدبیر سے غافل نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی قیومیت میں سہو اور نسیان اور غفلت اور سستی سے پاک اور منزہ ہے۔

④ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

اس جملہ سے صفت مالکیت کو ثابت کرنا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اس لیے کہ مالک حقیقی وہ ہے جو وجود عطا کرے۔ پس جس نے آسمانوں اور زمینوں کو وجود عطا کیا اور جو ان کے وجود کا قائم رکھنے والا اور تھامنے والا ہے وہی ان کا مالک حقیقی ہے۔

⑤ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ

اس جملہ سے اس کی حاکمیت اور جلال اور کبریائی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کی بارگاہِ عالی میں کسی کی مجال نہیں کہ بغیر اس کی اجازت کے لب کشائی کر سکے۔

⑥ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ

اس جملہ میں اس کے علم محیط کو بیان فرمایا کہ اس کا علم مخلوقات کے تمام احوال کو محیط ہے۔

⑦ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ

اس جملہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح مخلوقات کا وجود عطیۂ خداوندی ہے اسی طرح مخلوقات کا علم بھی عطیۂ خداوندی ہے۔ بندے فقط اتنی مقدار جان سکتے ہیں۔ جتنا وہ چاہے بندوں کا علم اس کی مشیت کے تابع ہے۔ بندہ کا علم نہایت ہی قلیل اور محدود ہے۔ اور اس کا جہل بالفعل غیر محدود اور غیر متناہی ہے۔

⑧ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

اس جملہ میں یہ بتلایا کہ حق تعالیٰ کی حاکمیت اور مالکیت آسمانوں اور زمینوں سے بھی متجاوز ہے۔ جہاں تک بندوں کا وہم و خیال بھی نہیں۔

فائدہ ① : احادیثِ نبویہ اور اقوال صحابہ و تابعین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرسی ایک جسم ہے جو آسمانوں اور زمینوں سے بڑا ہے اور عرش سے چھوٹا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ساتوں آسمان کرسی کے اندر ایسے ہیں جیسے کسی ڈھال میں سات درہم ڈال

دیئے جائیں۔

کرسی کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی ہے جیسے عرش اللہ اور بیت اللہ کی نسبت ہے بظاہر یہ کوئی خاص قسم کی تجلی ہے اور جس طرح تجلیات کی انواع اور اقسام میں ہر شے کی تجلی علیحدہ ہے اسی طرح عجب نہیں کہ کرسی اور عرش کی تجلیات علیحدہ علیحدہ ہوں اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوں۔

جمہور سلف رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک آیت میں کرسی سے ظاہری اور متبادر معنی مراد ہیں۔ اور بعض علماء اِدھر گئے ہیں کہ کرسی اس کی عظمت اور سلطنت کی تصویر اور محض ایک مثال ہے، ورنہ درحقیقت نہ کوئی کرسی ہے اور نہ وہاں کوئی بیٹھنے والا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لفظ سے حقیقی ہی معنی مراد لیے جائیں۔ قرآنِ کریم میں صدہا جگہ مجازی اور کنائی معنی مراد لیے گئے ہیں۔

⑨ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ

اور اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین کی حفاظت ذرہ برابر گراں نہیں۔ اس جملہ سے یہ بتلانا ہے کہ اس کی صفت قدرت اور قیومیت ضعف اور نقصان سے پاک اور منزہ ہے۔

⑩ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

اس جملہ میں اللہ کی صفت علو اور عظمت کو بیان فرمایا۔

فائدہ ②: مستدرک حاکم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((سورة البقرة فيها اٰية سيدآى القرآن لا تقرأ فى بيت فيه شيطان الاخرج منها)) . (آية الكرسى)

ترجمہ: "سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو تمام آیات قرآن کی سردار ہے۔ وہ آیت الکرسی ہے۔ جس گھر میں وہ پڑھی جاتی ہے شیطان اُس سے نکل جاتا ہے۔"

صحیح مسلم وغیرہ میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ اے ابوالمنذر رضی اللہ عنہ! قرآن میں سب سے اعظم یعنی سب سے بڑی آیت کون سی ہے؟ میں نے کہا ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ ﴾ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنتے ہی میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا * اے ابوالمنذر رضی اللہ عنہ علم تمہیں مبارک ہو۔

اور اسی طرح حضرت عمر اور حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ تمام آیتوں کی سردار اور سب سے بڑی آیت، آیت الکرسی ہے۔ (درمنثور ص ۳۲۵ ج ۱)

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اسم اعظم ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ ﴾ ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مُردوں کے زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو ﴿يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ﴾ پڑھ کر دُعا فرماتے۔ اور آصف بن برخیا رحمۃ اللہ علیہ نے جب بلقیس کے عرش کو لانے کا ارادہ کیا

---

* حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں: ((ليهنك العلم يا ابا المنذر)). ۱۲

تو ﴿یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ﴾ پڑھ کر دُعا مانگی۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۷۱ ج ۳)

فائدہ ③: حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ آیت الکرسی سورۂ بقرہ کا قلب ہے اور ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ بمنزلہ روح اور جان کے ہے اور باقی آیات بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں۔ اس سورت کے تمام مطالب اسی آیت کے گرد گھومتے ہیں۔ جس طرح اعضاء اور جوارح جان کے شئون اور مظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس سورت کی تمام آیتیں ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ کے شئون اور مظاہر ہیں۔ سورۂ بقرہ کے کل چالیس رکوع ہیں۔ کوئی ایسا نہیں کہ جس میں حیات اور قیومیت اور ہمیشہ کی زندگانی کا مضمون مذکور نہ ہو۔ گویا کہ یہ تمام سورت ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ ہی کی شرح اور بسط اور حیات اور قیومیت ہی کی توضیح اور تلویح ہے۔ ابتداء سورت میں ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ﴾ سے قرآن کریم کا آبِ حیات ہونا بیان فرمایا اور یہ بتلایا کہ ایمان اور تقویٰ سے حیاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے اور کفر اور نفاق سے دائمی ہلاکت۔ پھر تیسرے رکوع میں افرادِ انسانی کی فرداً فرداً حیات کا ذکر فرمایا ﴿وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ﴾ اور زمین و آسمان کی پیدائش اور دنیا کی نعمتوں کی پیدائش کا ذکر فرمایا جو دنیوی حیات کا ذریعہ ہیں اور پھر اپنی عبادت کا حکم دیا جو انسان کی حیات اُخروی اور قیام ابدی کا ذریعہ ہے۔ بعد ازاں ابوالبشر علیہ السلام کی حیات اور منصب خلافت اور ملائکہ پر اُن کی فضیلت کو ذکر فرمایا۔ ﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ بعد ازاں پانچویں رکوع سے ایک خاص خاندان کی حیات کا ذکر شروع فرمایا یعنی بنی اسرائیل کی حیات اور ان پر اپنے ظاہری اور باطنی انعامات کا بیان شروع کیا جو تقریباً اخیر پارے تک چلا گیا جس میں ان کو جہانوں پر فضیلت دینا اور من وسلویٰ کا ان کے لیے نازل کرنا اور اُن کی ہدایت کے لیے توریت کا عطا کرنا اور اس خاندان میں ہزاروں پیغمبروں کو ہدایت کے لیے مبعوث کرنا بیان فرمایا۔ چودھویں رکوع تک جب اس خاندان کی حیات کا قصہ تمام ہوا تو پندرھویں رکوع سے ایک دوسرے خاندان کی حیات کا ذکر شروع فرمایا، یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کا کہ ان کی اقامت اور توطن کے لیے خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی یہ جگہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی جگہ اور یہ قبلہ آخری قبلہ ہے۔ دور تک یہ سلسلۂ کلام چلا گیا جب ان دونوں خاندانوں کی حیات اور قائمی سے فارغ ہوئے تو پھر اس کے بعد چند اقسام حیات کو ذکر فرمایا کہ جو بظاہر حیات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں من جملہ اُن کے شہادت فی سبیل اللہ اور مصائب پر صبر کرنا اور قصاص کو جاری کرنا اور وصیّت کو بغیر تغیّر وتبدیل کے جاری کرنا اور روح کو زندہ رکھنے کے لیے روزہ رکھنا اور دین کی بقاء کے لیے جہاد کرنا اور شعائرِ ملّت کو زندہ اور قائم رکھنے کے لیے حج اور عمرہ کرنا اور مال اور آبرو کی حیات قائم رکھنے کے لیے شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا اور حقوق نکاح اور زوجیت کے زندہ اور قائم رکھنے کے لیے ایلاء اور خلع اور طلاق اور عدت اور حالتِ حیض میں مباشرت اور اجرتِ رضاعت وغیرہ کی حدود کی پوری پوری رعایت رکھنا تاکہ خاندانی اور معاشرتی حیات قائم رہے اور اس کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔

پھر جب ان اقسام حیات کے بیان سے فراغت ہوئی تو ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ سے چند عجیب وغریب قصے بیان فرمائے جن میں خدا نے ﴿حَیٌّ و قَیُّوْمُ﴾ کی طرف سے بلا اسباب ظاہری حیاتِ غیبیہ کا عطا ہونا بیان فرمایا، تاکہ خوب واضح ہو جائے کہ اس کے سوا کوئی حی اور قیوم نہیں۔ جو بھی زندہ اور قائم ہے وہ اس کی دی ہوئی حیات سے قائم ہے حق تعالیٰ نے دو قصے اس کلمۂ حی وقیوم سے پہلے ذکر فرمائے اور تین قصّے اسی مدعا کے اثبات کے لیے آیت الکرسی کے بعد ذکر فرمائے۔

پہلا قصہ حیات بنی اسرائیل کی اس جماعت کا ذکر فرمایا کہ جو وبا سے ڈر کر بھاگے اور پھر ایک نبی کی دعا سے زندہ ہوئے۔

دوسرا قصہ طالوت علیہ السلام اور جالوت اور تابوتِ سکینہ کا ذکر فرمایا جس سے اس خاندان کی گم شدہ حیات پھر واپس آئی۔

اس کے بعد آیت الکرسی کو ذکر فرمایا جس میں حق جل شانہٗ کی حیات اور قیومیت اور ملکیت اور عظمت اور ہیبت اور قدرتِ کاملہ اور علم محیط کا ذکر فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ اسلام اور سیدھا راستہ یہ ہے کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک مانا جائے۔ حق واضح ہے جس کا جی چاہے قبول کرے کسی پر زبردستی نہیں۔

اس کے بعد پھر اپنی حیات اور قیومیت کے اثبات کے لیے تین قصے ذکر فرمائے جس سے حیاتِ اُخروی کا نمونہ معلوم ہو اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ حی و قیوم مُردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے تا کہ لوگ قیامت کے بارے میں شک نہ کریں۔ پھر اس کے بعد صدقات اور خیرات کے احکام بیان فرمائے جو انسان کی دینی اور دنیوی زندگی کے قیام کا سبب ہیں اور سود سے ممانعت فرمائی کہ جو انسان کی دینی اور دنیوی حیات کی تباہی اور بربادی کا سبب ہے۔ پھر اس سورت کو ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ .... الآیات﴾ سے ایمانیات اور اعتقادیات اور دعا اور استغفار کے مضمون پر ختم فرمایا۔ اس لیے کہ ایمان اور توبہ اور استغفار ہی سے مردہ دلوں کو حیاتِ جاودانی حاصل ہوتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ یہ تمام سورت حق تعالیٰ کے اسم حی و قیوم کی شرح اور تفصیل ہے اور آیت الکرسی اس سورت کے لیے بمنزلہ دل کے ہے اور یہ اسم حی و قیوم بمنزلہ جان کے ہے اور باقی آیتیں بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں۔ واللہ اعلم

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ

زور نہیں دین کی بات میں کھل چکی ہے صلاحیت اور بے راہی اب جو کوئی منکر ہو

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا

مفسد سے اور یقین لاوے اللہ پر اس نے پکڑی گہہ مضبوط جو

انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ

ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سنتا ہے جانتا اللہ کام بنانے والا ہے ایمان والوں کا

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ

نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے اُجالے میں اور وہ جو منکر ہیں ان کے رفیق ہیں

الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ

شیطان نکالتے ہیں ان کو اُجالے سے اندھیروں میں وہ ہیں

ع ۳۴ ۴۲ ۲

النَّارِ ج هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿۲۵۷﴾ ع

دوزخ والے، وہ اسی میں رہ پڑے۔

حق اور باطل نُور اور ظلمت کا فرق واضح ہے

کسی پر کوئی زبردستی نہیں جو چاہے اختیار کرے

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قف ... الیٰ ... هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿۲۵۷﴾ ع﴾

ربط: گزشتہ آیت ﴿وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں اثبات رسالت کا ذکر تھا اور آیت الکرسی میں اثباتِ توحید کا ذکر تھا اور یہی دو باتیں دین اسلام کا اصل الاصول ہیں جو دلائلِ واضحہ سے ثابت ہیں جس سے کافروں کے لیے کوئی عذر اور گنجائش باقی نہیں جس کا جی چاہے حق کو قبول کرے دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں۔ تحقیق ہدایت گمراہی سے بالکل جدا اور ممتاز ہو چکی ہے۔ حق کا حسن و جمال اور باطل کا قبح خوب ظاہر اور نمایاں ہو چکا ہے اور زبردستی اس امر پر ہوتی ہے جو ناپسندیدہ ہو اور کرنے والے کا دل اس سے خوش نہ ہو اور اسلام کا حسن و جمال ایسا بے مثال ہے کہ عقل سلیم اُس پر عاشق اور فریفتہ ہے البتہ نفس پر اسلام کے احکام شاق اور گراں ہیں نفس تو نجاست خور اور شہوت پرست ہے اس کی گرانی اور ناگواری کا اعتبار نہیں کتے کو قے اور گندا پانی ہی لذیذ معلوم ہوتا ہے مگر سلیم الطبع کو اس تصور سے بھی تکدر اور انقباض ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلام میں اکراہ اور زبردستی ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اسلام کے لیے تصدیق قلبی اور دلی اذعان کا اعتبار ہے اور دل پر کسی کی زبردستی چل نہیں سکتی۔

یا آیت کے یہ معنی ہیں کہ دین کے بارے میں تم کسی پر زبردستی نہ کرو کیونکہ یہ دُنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے۔ مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اختیار سے ایمان لائیں۔ اس لیے کہ جزاء وسزا کا مدار اختیاری افعال پر ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ خبریہ انشائیہ کے معنی میں ہوگا یعنی ﴿لَآ اِكْرَاهَ﴾ کی نفی معنی میں نہی کے ہوگی اور ﴿لَآ اِكْرَاهَ﴾ معنی میں ﴿لَا تُكْرِهُوْا﴾ کے ہوگا۔ جیسا کہ آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت حُصَیْن انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی حُصَیْن انصاری رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے عیسائی تھے۔ ایک روز حصین انصاری رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ پر ان کا نصرانی ہونا بہت گراں ہے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دیں تو میں اُن کو اسلام پر مجبور کروں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ یعنی کسی پر اسلام میں داخل ہونے کے لیے جبر اور زبردستی نہ کرو ہم نے ہدایت اور ضلالت کا فرق واضح کر دیا ہے اب لوگوں کو اختیار ہے جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے۔

ایک شُبہ اور اس کا ازالہ

اس قسم کی آیات اُن آیات کے معارض نہیں جن میں کافروں سے جہاد وقتال کا حکم آیا ہے اس لیے کہ جہاد شر اور فساد کے رفع اور دفع کرنے کے لیے ہے۔ کفار چونکہ خدا کی زمین میں فساد مچاتے ہیں اور خدا کی نازل فرمودہ ہدایت اور شریعت کے اجراء اور نفاذ میں حارج اور مزاحم ہوتے ہیں اور بندگان خدا کو عبادت سے روکتے ہیں اس لیے جہاد کا حکم نازل ہوا۔ جہاد سے مقصود احکم الحاکمین کے دین متین کی حکومت قائم کرنا ہے بجبر کسی کو مسلمان بنانا مقصود نہیں۔ کافر اگر اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو جزیہ دے کر بھی اپنے مذہب پر رہ سکتا ہے اور چونکہ جہاد دفع فساد کے لیے ہے اس لیے بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور راہبوں کے قتل کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا اس لیے کہ ان لوگوں سے فتنہ اور فساد کی اُمید نہیں اور جس طرح موذی جانوروں سانپ اور بچھو کا ایذا رسانی کے بعد قتل کرنا جائز ہے اسی طرح سانپ اور بچھو کو ڈنگ مارنے سے پہلے ہی ختم کر دینا عقل اور دانائی ہے اسی طرح اگر مسلمانوں کو کسی کافر حکومت سے کوئی خطرہ ہو تو پہلے ہی سے اس کا خاتمہ کر دینا عین تدبر اور عین سیاست ہے اصطلاح شریعت میں اس کا نام جہاد اقدامی ہے۔

علاوہ ازیں جس طرح انسان ایمان اور کفر کے قبول کرنے میں مختار ہے مجبور نہیں اسی طرح تمام اعمال خیر اور اعمال شر کے کرنے اور نہ کرنے میں بھی مختار ہے مجبور نہیں لیکن اچھے اور بُرے افعال پر ان کے مناسب جزا اور سزا کا مرتب ہونا جبر و اکراہ کو مستلزم نہیں۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹا جانا اور زانی محصن کا سنگسار کیا جانا اور خون ناحق کا قصاص لیا جانا یہ تمام تر اس کے افعال اختیاریہ کی سزا ہے جبر اور اکراہ نہیں۔ اس شخص نے اپنے اختیار سے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا اس لیے یہ سزا بھگتنی پڑی۔ پس اسی طرح جو مسلمان مرتد اور سزائے ارتداد میں قتل کیا گیا تو یہ جبر اور اکراہ نہیں بلکہ اس کے فعل اختیاری (ارتداد) کی سزا ہے اور کافروں سے جہاد وقتال اُن کے فعل اختیاری یعنی کفر کی جزاء ہے۔

حیرت کا مقام ہے کہ قانونی سزائیں تو عین مصلحت اور عینِ تدبر اور عین سیاست بن جائیں اور شرعی حدود و قتل مرتد اور رجم زانی وغیرہ وغیرہ یہ سزائیں جبر اور اکراہ قرار دی جائیں اور وحشیانہ سزائیں کہلائیں قتل مرتد کے مسئلہ میں اشکال ہے اور مارشل لا میں کوئی اشکال نہیں۔ کیا قانونِ مارشل لا میں ووٹ کی قائم شدہ حکومت کے مرتدین کا قتل نہیں؟ کیا افسوس کا مقام نہیں کہ مجازی اور جعلی حاکم کے مرتدین کا قتل تو عین تہذیب اور عین تمدن ہو اور خدائے احکم الحاکمین کے مرتدین کے قتل پر ناک بھوں چڑھائیں اور اس کو وحشیانہ فعل قرار دیں۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ ہماری بغاوت تو جرم ہے اور خدا تعالیٰ کی بغاوت جرم نہیں۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو عقل دے جو بندوں پر اپنا حق خدا تعالیٰ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

پس حق اور ہدایت کے روز روشن کی طرح واضح ہو جانے کے بعد جو شخص طغیان اور ضلال کی طرف بلانے والی چیزوں سے تعلق قطع کر لے اور ایمان لا کر خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کرے تو اس نے نہایت مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا اور اپنے آپ کو گمراہی اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا اور وہ ایمان باللہ کا حلقہ ایسا مضبوط ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا البتہ غفلت کی وجہ سے ہاتھ سے چھوٹ سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایمان اور کفر کے دعووں کو سننے والا ہے اور نیتوں کا جاننے والا ہے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لائے اور خدا سے

وابستہ ہوئے اُن کو اپنی خاص ہدایت اور توفیق کے ذریعہ شکوک اور شبہات اور وساوس اور خطرات کی تاریکیوں اور اندھیریوں سے نکال کر نورِ ہدایت کی طرف لے جاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور خدا تعالیٰ سے تعلق قطع کر لیا اُن کے دوست اور رفیق جن اور انس کے شیاطین ہیں جو ان کو نورِ ہدایت اور نورِ دلائل سے نکال کر شبہات اور نفسانی خواہشات کی تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جو انبیاء اور علماء اور صلحاء اور دلائل عقل سے بھاگتے ہیں اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ دوزخ کے باشندے ہیں یہ لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

فائدہ: حق تعالیٰ نے کافروں کے حق میں دوزخ کی وعید کو ذکر فرمایا اور اس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کے لیے کسی خاص وعدہ اور بشارت کا ذکر نہیں فرمایا اس لیے کہ اللہ کی ولایت اور محبت اور کارسازی ہر وعدہ اور بشارت کو متضمّن ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ
تو نے نہ دیکھا وہ شخص جو جھگڑا ابراہیم سے اس کے رب پر؟ واسطہ یہ کہ دی تھی اس کو اللہ نے سلطنت ، جب
قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ
کہا ابراہیم نے میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بولا میں ہوں جلاتا اور مارتا،
قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ
کہا ابراہیم نے اللہ تو لاتا ہے سورج کو مشرق سے پھر تو لے آ اس کو
الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾ ج
مغرب سے، تب حیران رہ گیا وہ منکر اور اللہ نہیں راہ دیتا بے انصاف لوگوں کو۔

ذکر مبدأ و معاد

گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کو بیان فرمایا اس کے بعد تین قصے اس کے مناسب ذکر فرماتے ہیں اوّل قصہ وجودِ باری کے اثبات کے لیے ہے۔ اور دوسرا اور تیسرا قصہ اثبات حشر و نشر یعنی اثباتِ قیامت کے لیے ہے تاکہ مبدأ اور معاد کی معرفت مکمل ہو جائے اور خدائے ذوالجلال کی حیات اور قیومیت خوب واضح ہو جائے اور نورِ ہدایت اور ظلمتِ ضلالت کا نمونہ نظر آ جائے کہ خدا تعالیٰ کس طرح ہدایت دیتا ہے اور کس طرح گمراہ کرتا ہے اور جہاد و قتال کی مشروعیت کی وجہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ کفار ناہنجار خدائے کردگار کی صحیح معرفت کو مٹانا چاہتے ہیں اور لوگوں کو خدا تعالیٰ سے باغی بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان سے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا اور اگر خود جہاد میں شریک نہ ہو سکیں تو مالی امداد کریں۔

قصہ اوّل : دربارۂ اثبات وجود باری عزاسمہ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کا نمرود بن کنعان سے مناظرہ اور مکالمہ بیان کرتے ہیں۔ نمرود دھری تھا یعنی وجود باری تعالیٰ کا منکر تھا اور اپنے آپ کو ملک کا رب اور خدا اور مالک بتاتا تھا (اے مخاطب!) کیا تو نے اُس طاغوت کو نہیں دیکھا جس نے خدا کے ولی ابراہیم علیہ السلام سے اپنے پروردگار کے وجود کے بارے میں مباحثہ اور مجادلہ کیا۔ یہ جھگڑنے والا شخص نمرود تھا جس نے سب سے پہلے سر پر تاج رکھا اور بادشاہت کے گھمنڈ میں خدائی کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نمرود کا خدا کے بارے میں یہ مجادلہ محض اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت اور بادشاہی عطا کی۔ اس نعمتِ عظیمہ کے شکر کا ادنیٰ درجہ یہ تھا کہ جس خدا نے یہ سلطنت بخشی تھی اس کے وجود کا تو اقرار کرتا۔ مگر اس نے برعکس اُس مُنعم کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ شکر تو درکنار جس وقت کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا کہ خدائے پروردگار پر ایمان لا۔ نمرود نے کہا وہ کون سا خدا ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس کا وصف بیان کرو؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میرا پروردگار جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں۔ اُس کی شان یہ ہے کہ وہ موت اور حیات کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے زندہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مارتا ہے اور تو زندہ کرنے اور موت دینے سے عاجز ہے۔ لہٰذا تو مستحق ربوبیت کا نہیں ہو سکتا۔ نمرود نے اسی وقت دو آدمیوں کو بلایا اور ایک کو قتل کیا اور ایک کو چھوڑ دیا اور بولا میں بھی جِلاتا اور مارتا ہوں یعنی مارنے اور زندہ کرنے سے عاجز نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بڑا ہی کُوڑ مغز ہے کہ احیاء اور اماتت کے معنی بھی نہیں سمجھتا احیاء اور اماتت کے معنی جسم میں جان ڈالنے اور جان نکالنے کے ہیں اور یہ سوائے خدا کے کسی کی قدرت میں نہیں۔ اس نادان نے فقط گردن اڑا دینے اور چھوڑ دینے اور حلق میں چھری چلانے اور نہ چلانے کا نام احیاء اور اماتت رکھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تو احیاء اور اماتت۔ یعنی جسم میں جان ڈالنے اور نکالنے پر تو کیا قادر ہوتا تُو تو احیاء اور اماتت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا اچھا ایک بات اور سُن اللہ تعالیٰ تو آفتاب کو اپنے ارادہ اور اختیار سے مشرق سے نکالتا ہے، حالانکہ وہ اگر چاہے تو مغرب اور شمال اور جنوب سے بھی نکال سکتا ہے ہر افق اور ہر نقطہ اس کی قدرت کے اعتبار سے یکساں ہے بس اگر تجھ کو دعوائے ربوبیت ہے تو آفتاب کو مغرب سے نکال کر دکھا تا کہ تیری قوت اور قدرت کا اندازہ ہو تو احیاء اور اماتت مارنے اور جلانے پر تو کیا قادر ہوتا۔ تیرے عجز اور درماندگی کا تو یہ عالم ہے کہ تو ایک جسم کی حرکت کے تغیر پر بھی قادر نہیں۔ حالانکہ حرکت، حیات کا ایک نہایت معمولی سا اثر ہے پس جو شخص ایک جسم کی حرکت میں تغیر کرنے سے عاجز ہوگا وہ احیاء اور اماتت سے بدرجۂ اولیٰ عاجز ہوگا۔ پس خدا کا منکر اس روشن اور نورانی دلیل کو سُن کر حیران اور بھونچکا رہ گیا اور کسی قسم کی کوئی تاویل اور تلبیس بھی نہ کر سکا اور ایسا مدہوش ہوا کہ کچھ بھی نہ بول سکا۔

مطلب یہ کہ نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس روشن دلیل کو سن کر ھکا بکّا رہ گیا اور بطور معارضہ یہ نہ کہہ سکا کہ اگر تیرا معبود ایسا زبردست ہے تو اُس سے کہو کہ وہ آفتاب کو کسی دن بجائے مشرق کے مغرب سے نکال دے۔ اس لیے کہ اس نے خوب سمجھ لیا کہ اگر ابراہیم علیہ السلام اپنے خدا سے یہ دعا مانگیں کہ اے خدا اس آفتاب کو بجائے مشرق کے مغرب سے نکال دیجیے تو یقیناً ایسا ہی ہو جائے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کا خدا جس طرح آگ کو برد اور سلام بنا سکتا ہے اسی طرح ابراہیمؑ کا خدا سورج کو بجائے مشرق کے مغرب سے بھی نکال سکتا ہے لیکن نمرود باوجود اس نورانی اور روشن دلیل کے کفر کی ظلمت اور تاریکی سے نہ نکلا۔ اس لیے اپنے عناد پر قائم رہا اور ایمان نہ لایا اور اللہ تعالیٰ بے

انصافوں کو گمراہی کی ظلمتوں * سے نکال کر نورِ ہدایت کی طرف نہیں لے جاتے معاند کتنے ہی معجزات اور نشانات دیکھے وہ ظلمت سے نور ہدایت کی طرف نہیں آتا چنانچہ نمرود کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ ع پشۂ کارش کفایت ساختہ

فائدہ: بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ قصہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے بعد کا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بُتوں کے توڑنے کے بعد کا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا۔ وہ اپنے تئیں سجدہ کرواتا تھا سلطنت کے غرور سے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس کو سجدہ نہ کیا اُس نے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے رب ہی کو سجدہ کرتا ہوں۔ اس نے کہا رب تو میں ہوں۔ انہوں نے کہا میں رب حاکم کو نہیں کہتا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اس نے دو قیدی بلائے جس کو جلانا پہنچتا تھا مار ڈالا اور جس کو مار ڈالنا پہنچتا تھا چھوڑ دیا۔ تب انہوں نے آفتاب کی دلیل سے اُس کو لاجواب کیا۔ (۱۲ منہ)

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سن کر بے اختیار نمرود کے دل میں یہ بات آ گئی کہ خدا ضرور ہے اور آفتاب کا مشرق سے نکالنا اس کا فعل ہے اور وہ خدا مغرب سے بھی نکال سکتا ہے اور یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ شخص اسی خدا کا پیغمبر ہے اور اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو عالم میں انقلاب برپا ہو جائے گا اور ساری دُنیا اسی کی راہ پر ہو لے گی اور میرے ہاتھ سے سلطنت جاتی رہے گی۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی

یا جیسے وہ شخص، کہ گذرا ایک شہر پر اور وہ گرا پڑا تھا اپنی چھتوں پر، بولا کہاں

یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ

جِلا وے گا اس کو اللہ مر گئے پیچھے؟ پھر مار رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس، پھر

بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ

اٹھایا کہا تو کتنی دیر رہا؟ بولا میں رہا ایک دن یا دن سے کچھ کم

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ

کہا نہیں بلکہ تو رہا سو برس اب دیکھ کھانا اپنا اور پینا، سڑ

یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَی

نہیں گیا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور تجھ کو ہم نمونہ کیا چاہیں لوگوں کے واسطے، اور دیکھ

---

* اس عبارت میں اس آیت کا گزشتہ آیت ﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔

الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ

ہڈیاں کس طرح ان کو ابھارتے ہیں پھر ان پر پہناتے ہیں گوشت ۔ پھر جب اس پر ظاہر ہوا،

قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

بولا، میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قصہ دوم : برائے اثبات معاد یعنی برائے اثبات حشر ونشر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ ... الیٰ ... اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ ﴾

یا اے مخاطب کیا تو نے اُس جیسے شخص کی طرف نظر نہیں کی جن کا ایک بستی پر گذر ہوا۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ گذرنے والے حضرت ارمیاء علیہ السلام نبی تھے اور حضرت علی اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام تھے۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ نمرود کے ساتھ ذکر کرنے سے مفہوم ہوتا ہے کہ وہ گذرنے والا شخص کافر تھا۔ جس کو بعث میں شک اور تردد تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں اس لیے کہ کافر ایسی عزت اور کرامت کا مستحق نہیں جس کا آیت میں ذکر ہے اور قریہ سے بیت المقدس مراد ہے جس کو بخت نصر نے ویران اور برباد کیا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا اور بہت سوں کو قید کر کے لے گیا۔ ان میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی تھے حضرت عزیر علیہ السلام جب قید سے چھوٹ آئے اور اس ویران بستی پر گزر ہوا جس کے تمام آدمی مرے پڑے ہیں اور عمارت بھی سب گری ہوئی تھی۔ اور اس وقت وہ بستی ایسی حالت میں تھی کہ وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی پڑی تھی یعنی اس کی چھتیں گر کر پھر اُن پر دیواریں گر گئی تھیں اس ویرانی کو دیکھ کر بطور حسرت اور تعجب یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو مرے پیچھے کس طرح زندہ کرے گا۔ مقصود اس کہنے سے بستی کے دوبارہ زندہ اور آباد ہونے کی طلب اور تمنا تھی مگر چونکہ عادۃً ایسا ہونا بعید تھا اس لیے یہ خیال گزرا کہ کیا میری یہ دعا قبول ہوگی۔ معاذ اللہ خدا کی قدرت میں کوئی شبہ اور تردّد نہ تھا۔ بعث کا یقین کامل تھا۔ لیکن تمنا یہ تھی کہ کاش میں بھی اس کا نمونہ دیکھ لوں۔ پس حق تعالیٰ نے اسی جگہ ان کی روح قبض کر کے ان کو سو برس تک مردہ رکھا۔ اور اس عرصہ میں بخت نصر بھی مر گیا اور بنی اسرائیل کو اس کے ظلم وستم سے رہائی ملی اور شہر بیت المقدس ازسرنو آباد ہو گیا۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے اُن کو زندہ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور پھر سو برس کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا تا کہ واضح ہو جائے کہ جو خدا سو برس کے مردہ کو زندہ کر سکتا ہے وہ سو ہزار برس کے مردہ کو بھی زندہ کر سکتا ہے اس کی قدرت کے لیے کوئی خاص مدت شرط نہیں جس وقت اٹھے سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود یا بذریعہ فرشتہ کے پوچھا کہ کتنی دیر ٹھہرا؟ اور اس حالت میں کتنی مدت تک رہا۔ بولے کہ میں اس حالت میں ایک دن رہا یا ایک دن سے کچھ کم اگر یہاں کل اسی وقت آیا تھا تو ایک دن ہوا اور اگر آج ہی آیا تھا تو ایک دن سے بھی کم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ تم اس حالت میں سو سال ٹھہرے ہو یعنی تم حقیقتاً مر چکے تھے۔ سو سال کی موت کے بعد ہم نے تم کو اپنی قدرت سے زندہ کیا ہے یہ طویل مدت خواب میں نہیں گذری اور تم خواب سے بیدار نہیں ہوئے بلکہ موت سے دوبارہ زندہ ہوئے ہو پس اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ باوجود اتنی طویل مدت گزرنے کے میرے جسم میں کوئی تغیر نہیں ہوا تو اپنے کھانے

پینے کی چیز کو دیکھ لو کہ باوجود اتنی طویل مدت گذرنے کے اس میں ذرہ برابر تغیر نہیں آیا حالانکہ کھانے پینے کی چیز میں بہت جلد تغیر آجاتا ہے اور موسم گرما میں تو صبح کا کھانا شام ہی تک خراب ہو جاتا ہے۔ پس جو خدا کھانے پینے کی چیز کو اتنی مدت تغیر سے محفوظ رکھ سکتا ہے وہی خدا تمہارے جسم کو بھی اتنی مدت تغیر سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس کے مقابل اپنی سواری کے گدھے کی طرف نظر کیجیے کہ وہ گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اور اس کی ہڈیاں اس قدر بوسیدہ ہو چکی ہیں کہ ہاتھ لگانے کی بھی تاب نہیں رکھتیں۔ گدھے کی یہ حالت ایک دن میں نہیں ہو سکتی۔ ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کے لیے ایک مدت مدید چاہیے اور اب ہم عنقریب تمہارے سامنے ہی اس مردہ گدھے کو زندہ کریں گے اور دوبارہ اس کو گوشت اور پوست عطا کریں گے تا کہ تم اپنی آنکھوں سے مردہ کو زندہ ہوتا ہوا دیکھ لو اور ہم نے تم کو سو برس کی موت کے بعد اس لیے زندہ کیا تا کہ ہم تم کو تمہارے طعام اور شراب میں اور تمہاری سواری (حمار) میں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں اور تمہارے تعجب اور استبعاد ظاہری ﴿ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ ﴾ کو دُور کریں اور تا کہ ہم تم کو لوگوں کے لیے قیامت کی ایک نشانی بنائیں کہ قیامت کے دن بھی اسی طرح اللہ کی قدرت سے مُردے قبروں سے زندہ ہو کر اٹھیں گے اور لوگ جب تم کو دیکھیں تو قیامت کی ایک مجسم دلیل اور برہان سمجھیں اور یقین کریں کہ قیامت میں بھی مردے اسی طرح جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اپنی ذات کے علاوہ احیاء موتیٰ کی کیفیت کا مشاہدہ کرو تو اس مرے ہوئے گدھے کی ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ کس طرح ہم اُن کو جوڑتے ہیں اور پھر کس طرح ان پر گوشت چڑھاتے ہیں اور پھر کس طرح ان میں جان ڈالتے ہیں اسی طرح وہ گدھا زندہ ہو کر ان کے روبرو کھڑا ہو گیا اور گدھوں کی طرح بولنے لگا۔ پس جب مردہ کا زندہ ہونا مشاہدہ سے ظاہر اور واضح ہو گیا تو بے اختیار جوشِ مسرت میں یہ بولے کہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مردہ کے زندہ ہونے کا علم الیقین تو پہلے بھی تھا لیکن اس مشاہدہ اور معاینہ کے بعد عین الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا یعنی مجھ کو پہلے ہی سے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ پس جس چیز کو پہلے سے جانتا تھا اب اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیا اور جو چیز پہلے سے یقینی تھی اب وہ مشاہدۂ عینی بن کر سامنے آ گئی حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنی قدرت کا کرشمہ مجھ کو میری آنکھوں سے دکھلا دیا۔

فائدہ: اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو چار نشانیاں دکھلائیں۔ دو اُن کی ذات میں اور دو خارجی۔ ① سو سال مردہ رکھ کر ان کو دوبارہ زندہ کرنا ② سو سال تک ان کے جسم کا صحیح سالم محفوظ رہنا۔ حدیث میں ہے:

((ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء)).

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے بدن کا کھانا حرام کر دیا ہے۔"

اور خارجی دو نشانیاں یہ تھیں: ① ایک طعام و شراب کی کہ سو سال میں تغیر نہ آیا جس طرح حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم مبارک میں کوئی تغیّر نہ آیا۔ ② اور دوسری نشانی حمار (گدھے) کی کہ مر کر ہڈیوں کا ڈھیر ہو گیا اس کو دوبارہ زندہ کر کے دکھایا تا کہ کیفیت احیاء موتیٰ کی معلوم ہو جائے راکب اور مرکوب دونوں سو سال کے بعد زندہ ہوئے حضرت عزیر علیہ السلام یہاں سے اُٹھ کر اسی حمار پر سوار ہو کر بیت المقدس واپس ہوئے اور شہر کو آباد پایا اور اپنے محلہ اور گھر پہنچے تو کسی نے نہ پہچانا اس لیے کہ بچے تو بوڑھے ہو چکے تھے اور حضرت عزیر علیہ السلام جوان رہے اللہ تعالیٰ نے اُن کی حیات اور جوانی کو محفوظ رکھا۔ پھر علامتیں دیکھ کر سب نے پہچانا اور یقین کیا کہ یہ عزیر علیہ السلام ہمارے باپ ہیں۔ تفصیل کے لیے امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ص ۲۹۴ ج ۳ کو دیکھیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ

اور جب کہا ابراہیم نے اے رب! دکھا مجھ کو کیونکر جلا دے گا تُو مردے؟ فرمایا کیا تُو نے یقین نہیں کیا

قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ تسکین ہو میرے دل کو فرمایا تو پکڑ چار جانور اُڑتے

فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر اُن کو ہلا اپنے ساتھ سے، پھر ڈال ہر پہاڑ پر اُن کا ایک ایک ٹکڑا، پھر ان کو پکار

یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع ۳۵ ۳۳ ۳

کہ آویں تیرے پاس دوڑتے، اور جان لے کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

قصہ سوم : نیز برائے اثبات حشر ونشر

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ ... الٰی ... وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع﴾

اور اسی گذرنے والے شخص کے قصہ کے مانند حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیجیے جس وقت کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے پروردگار! آپ مجھ کو یہ دکھلا دیجیے کہ آپ کس طرح مُردوں کو زندہ کرتے ہیں؟ تا کہ مجھ کو معلوم ہو جائے کہ آپ قیامت کے دن کس طرح اور کس کیفیت کے ساتھ مُردوں کو زندہ فرمائیں گے۔ آپ کی قدرت کی کوئی نہایت نہیں آپ جس کیفیت کے ساتھ چاہیں مُردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ آپ کے زندہ کرنے کی عقلاً بیشمار کیفیتیں ممکن ہیں۔ معلوم نہیں کہ قیامت کے دن مُردوں کے زندہ کرنے کی کیا کیفیت ہو گی؟ اس لیے اس کی تعیین چاہتا ہوں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ کس کیفیت کے ساتھ مُردے زندہ ہوں گے۔ کیونکہ کیف کے ذریعہ سے جو سوال کیا جاتا ہے اگرچہ اکثر اور بیشتر وہ کیفیت دریافت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اصل شے تو یقینی ہوتی ہے فقط کیفیت کی تعیین مطلوب ہوتی ہے لیکن بعض مرتبہ کیف کا استعمال انکار اور تعجب کے موقع پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں یہ بوجھ اور وزن اُٹھا سکتا ہوں اور تمہارا گمان یہ ہو کہ یہ شخص اس وزن کے اُٹھانے سے قاصر ہے تو ایسے موقع پر اس سے یہ کہتے ہو۔

ارنی کیف تحمل ھٰذا۔ "مجھ کو دکھلاؤ کہ تم اس بوجھ کو کس طرح اٹھاؤ گے۔"

اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ تم نہیں اٹھا سکو گے۔ اور اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا قلب سلیم اس احتمال کے شائبہ سے بھی پاک اور منزہ ہے اس لیے سوال فرمایا ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ اے ابراہیم (علیہ السلام)! کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے تا کہ ابراہیم علیہ السلام جب اس سوال کا جواب دیں تو ان کی مراد اور ان کا مقام اور مرتبہ معلوم ہو جائے اور کسی کم عقل کو خلیل اللہ علیہ السلام کی مراد کے سمجھنے میں کوئی غلطی نہ پیش آئے چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا اے پروردگار! کیوں نہیں مجھے آپ کے کمال قدرت کا یقین کامل ہے آخر مجھ کو بھی

تو آپ نے اپنی قدرت سے زندہ کیا ہے۔ لیکن یہ درخواست یقین حاصل کرنے کے لیے نہیں کی بلکہ اس لیے کی ہے تا کہ میرے قلب کو سکون اور اطمینان ہو جائے اس لیے کہ جب یہ مشاہدہ گزشتہ اذعان اور ایقان کے ساتھ مل جائے گا تو مزید اطمینان کا موجب ہوگا اور مشاہدہ سے احیاء کی کیفیت بھی متعین ہو جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ خبر مشاہدہ اور معاینہ کے برابر نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر خبر دی کہ آپ کی قوم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوگئی۔ تو اس اطلاع پانے پر الواح توراۃ یعنی توریت کی تختیوں کو ہاتھ سے نہیں پھینکا اور جب شہر میں واپس آ کر ان کی گوسالہ پرستی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا تو غصہ میں آ کر تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں۔ کما رواہ احمد والطبرانی بسند صحیح۔

وقال اللہ تعالیٰ: ﴿وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ﴾ (الاعراف:۱۵۰)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال شک اور تردد کی بنا پر نہ تھا بلکہ مشاہدہ اور معاینہ کے ساتھ خاص اطمینان اور سکون کا حاصل کرنا مقصود تھا کیونکہ جو سکون اور اطمینان مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے وہ خبر اور استدلال سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں یعنی ''عین الیقین می خواہم واللہ اعلم یعنی برای العین مجھ کو احیاء۔ موتیٰ کی کیفیت دکھلا دے اور کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ولٰكن للعيان لطيف معنًى لَهُ سأل المشاهدة الخليلُ

یاد رہے کہ بارگاہِ خداوندی میں اس قسم کا سوال وہی کر سکتا ہے کہ جس کو اُس بارگاہ میں خاص تقرب حاصل ہو جوش محبت اور مقام اُنس اور مقام ناز اس کو اس عرض و نیاز پر آمادہ کرے۔ باقی جس شخص کو خدا کی قدرت ہی میں شک اور شبہ ہو اس کا اس بارگاہِ عالی میں گزر ہی ممکن نہیں ''سوال را چہ مجال''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا پس چار پرندے لے لو اور پھر اُن کو اپنے نزدیک * کرلو یعنی ان کی صورت پہچان کر اپنے پاس کرلو اور اپنے سے ہلا لو تا کہ ان کی خوب شناخت ہو جائے اور وہ بھی زندہ ہونے کے بعد تم کو پہچان لیں اور تمہاری آواز پر تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں۔ بعد ازاں ان کو ذبح کر کے اور ان کے گوشت اور پوست کو خلط ملط کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک ٹکڑا رکھ دو پھر ان کو بلاؤ سب زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے تیرے پاس چلے آئیں گے۔ اس طرح سے تم اپنا اطمینان کرلو اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور زبردست ہے کوئی اس کی مشیت اور ارادہ کو روک نہیں سکتا یعنی جس طرح خدا تعالیٰ ان جانوروں کے متفرق اجزا کو دوبارہ جوڑ کر اور گوشت اور پوست چڑھا کر زندہ کر سکتا ہے اسی طرح قیامت کے دن مردوں کے جسموں کے متفرق ریزوں کو جمع کر کے اُن میں روح ڈال سکتا ہے اور بڑی حکمت والا ہے۔ کوئی اس کے افعال کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی حکمت کہ اس نے چار پرندوں کے ذبح کر کے پہاڑوں پر رکھنے کا کیوں حکم دیا اسی کو معلوم ہے کہ اس میں کیا حکمت ہے۔

فوائد ولطائف

① یہ قصہ اور گزشتہ قصہ قریب قریب ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کی تصریح فرمائی اور پہلے قصہ میں گزرنے والے کا نام نہیں ذکر فرمایا۔ بظاہر وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال میں ادب کو خاص طور پر ملحوظ رکھا۔ اور گزشتہ

* یہ ترجمہ ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ کا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''پس بہم آور ہمہ را نزدیک خود''

سوال ﴿ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ ﴾ میں ابہام اور شبہ انکار اور تعجب کا ہوتا تھا۔ اس لیے ان کا نام نہیں ذکر کیا گیا۔ نیز جواب میں امتحان اور تجربہ خود ان پر ہوا۔ اور سو سال مردہ رکھنے کے بعد سوال کا جواب دیا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوری جواب دیا گیا۔

② یہ دونوں * واقعے یعنی حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ قیامت کے دن احیاء موتیٰ اس طرح سے ہوگا کہ اجسام متفرق اجزاء کو جمع کر کے ان میں ان کی روح ڈال دی جائے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ معاد جسمانی ہوگی نہ کہ فقط روحانی۔ اور جو لوگ معاد جسمانی کے منکر ہیں وہ صریح نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے منکر ہیں اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے۔

③ ان دونوں قصوں سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کبھی کبھی بطور خرق عادت اور بطور معجزہ دنیا میں بھی مردوں کو زندہ فرما دیتے ہیں اور اس کے علاوہ قرآنِ کریم کی متعدد آیات سے صراحۃً دنیا میں مردوں کا زندہ کرنا بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کو ایک مرتبہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنا ﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ میں ذکر فرمایا۔

اور علی ہذا بنی اسرائیل کے اُن ہزاروں آدمیوں کا جو موت سے ڈر کر بھاگے تھے مار کر دوبارہ زندہ کرنا ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ ﴾ میں صراحتاً مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا ﴿ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ ﴾ قرآن کریم میں متعدد جگہ صراحتاً مذکور ہے۔

مرزا قادیانی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور دیکھا کہ مسیح بن مریم علیہما السلام کی طرح میں تو مردوں کو زندہ کر کے دکھانے سے عاجز ہوں اس لیے اس نے اپنی فرضی نبوت کے قائم رکھنے کے لیے حضرت عیسیٰ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے اس قسم کے تمام معجزات کا انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو ایک دفعہ مار کر دوبارہ دنیا میں بھیجے۔ اگر یہ اللہ کی عام عادت ہوتی تو لوگ قیامت کے منکر نہ ہوتے۔ بے شک اللہ کا یہ عام قانون ہے مگر ناممکن اور محال نہیں۔ حق تعالیٰ بطور اعجاز اور اکرام کبھی کبھی دُنیا میں بھی کسی مردہ کو اپنے کسی برگزیدہ بندہ کی دعا سے دوبارہ زندہ فرما دیتے ہیں تا کہ خدا کی قدرت اور اس نبی کی نبوت اور قیامت کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

ملحد اور بے دین لوگ جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں وہ اس قسم کے واقعات میں طرح طرح کی تحریفات کیا کرتے ہیں خوب سمجھ لو۔

④ ان چار پرندوں کے نام اگرچہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علماء تابعین سے منقول ہے کہ ان کے نام یہ تھے۔ مور، کبوتر، مرغ اور کوّا اور بعض نے بجائے کوّے کے غرنوق کو ذکر کیا ہے۔

انسان چونکہ عناصر اربعہ سے مرکب ہے اس لیے عجب نہیں کہ اس کے مناسب چار پرند مختلف الطبائع لینے کا حکم دیا گیا ہو تا کہ

---

* وفی الآیة دلیل لمن ذهب الی ان احیاء الموتٰی یوم القیامة بجمع الاجزاء المتفرقة وارسال الروح ایها بعد ترکیبها ولیس هو من باب اعادة المعدوم الصرف لانه سبحانه و تعالٰی بین الکیفیة بالتفریق ثم الجمع واعادة الروح ولم یعدم هناك سوی الجزء الصوری والهیئة الترکیبیة دون الاجزاء المادیة ۱۲ روح المعانی ص ۲۶ ج ۳.

معلوم ہو جائے کہ قیامت کے دن بھی اسی طرح اجزاء عنصریہ متفرق اور جُدا ہونے کے بعد پھر آپس میں مل جائیں گے اور روح ڈال کر زندہ کر دیئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

⑤ ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ کی جو تفسیر ہم نے ذکر کی ہے کہ چار پرندے لے کر ان کو ذبح کرو اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرو اور چار مختلف پہاڑوں پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو اور پھر ان کو آواز دو بحکم خداوندی سب زندہ ہو کر تمہاری آواز پر تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ یہی تفسیر علماء صحابہ اور تابعین سے منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر اور عکرمہ اور ابو مالک اور ابوالاسود دؤلی اور وہب بن منبہ اور حسن بصری اور سدّی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم سے منقول ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۸ ج ۲)

اور یہی معنی مجاہد اور ابوعبیدہ اور ابن الانباری اور زجاج رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے۔ (تفسیر قرطبی ص ۳۰۱ ج ۳)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس تفسیر کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اسی تفسیر پر تمام مفسرین کا اجماع ہے اور یہی ظاہر قرآن کا مدلول ہے۔ صرف ایک ابو مسلم اصبہانی سے منقول ہے کہ وہ اس قصہ کا منکر تھا اور یہ کہتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ کوئی حقیقت اور واقعہ نہیں بلکہ محض تشبیہ اور تمثیل ہے اور مراد یہ ہے کہ چار پرندے لے کر پال لو اور اُن کو اپنے سے مانوس کر لو اور دانہ ڈال کر اُن کو اپنے سے ایسا ہلا لو کہ اگر وہ پہاڑ پر بھی بیٹھے ہوں اور تم اُن کو آواز دو تو وہ فوراً تمہاری آواز پر دوڑے چلے آئیں۔ اسی طرح اے ابراہیم تم لوگوں کو اپنے سے اتنا مانوس بناؤ کہ جب تم ان کو حق کی طرف بلاؤ تو سب دوڑے چلے آئیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابو مسلم کا یہ قول، مفسرین کی اجماعی تفسیر کے خلاف ہے اس لیے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ وہ پرندے ذبح کئے گئے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ لہٰذا ذبح اور قطع سے انکار کرنا اجماع سے انکار کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اگر آیت کا یہ مطلب ہو جو ابو مسلم نے بیان کیا ہے تو پھر احیاء موتیٰ کا کیا معجزہ ظاہر ہوا۔ پرندوں کو دانہ ڈال کر اپنے سے ہلا لینا یہ کام تو وہ لوگ بہت زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ جو مرغ اور بٹیر پالتے ہیں اس میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیا کیفیت ظاہر ہوئی چند جانوروں کو پال لینا اور ہلا لینا اور ان کو بلا لینا اس کا نام احیاء موتی کیسے ہو سکتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ﴿رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ درخواست کی تھی کہ مجھ کو یہ امر دکھلا دیا جائے کہ مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔ ابو مسلم کے قول پر وہ درخواست منظور نہیں ہوئی حالانکہ ظاہر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا درجۂ اجابت کو پہنچی اور ابو مسلم کے قول پر دعا کا اجابت کو پہنچنا نہیں پایا جاتا۔ نیز اس آیت میں ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ کا جو لفظ آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پرندوں کے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ زندہ پرندوں کا بلا لینا مراد نہیں۔ (تفسیر کبیر ص ۴۹۴ ج ۲ تفسیر نیسابوری ص ۳۸ ج ۳)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ ابو مسلم کے اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

وَلا يخفى ان هذا خلاف اجماع المسلمين وَ ضرب من الهذيان لا يركن اليه ارباب الدين وعدول عما يقتضيه ظاهر الاية المؤيد بالاخبار الصحيحة والآثار الراجحة الى ما تمجه الاسماع ولا يدعو اليه داع فالحق اتباع الجماعة وَيد الله تعالىٰ معهم. (روح المعانی ص ۲۶ ج ۳)

ترجمہ: "اہل علم پر پوشیدہ نہیں کہ ابو مسلم کا یہ قول اجماع مسلمین کے خلاف ہے اور ایک قسم کا ہذیان اور بکواس ہے جس کی طرف اہل دین کبھی مائل نہ ہوں گے۔ نیز اس معنی پر آیت کے ظاہری مدلول سے بے وجہ عدول اور انحراف کرنا ہے اور

اخبار صحیحہ اور آثار معتبرہ اس ظاہر کی مؤید ہیں۔ لہٰذا ایسے ظاہر اور صریح کو چھوڑ کر ایسے معنی کی طرف مائل ہونا جس کے سننے سے بھی کانوں کو گرانی ہوتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ بلا کسی وجہ اور بلا کسی داعی کے اس معنی کی طرف رجوع کیا جائے۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ جماعت مفسرین نے آیت کے جو معنی بیان کیے ہیں اسی کا اتباع کیا جائے اور اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہوتا ہے۔"

حکایت: بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو ﴿وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ پر ختم فرمایا۔ اشارہ اس طرف تھا کہ اے ابراہیم علیہ السلام تم نے ہم سے ﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ کی درخواست کی ہم نے اس کو منظور کیا۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ ہم تم سے یہ کہیں گے کہ ﴿عَبْدِيْ اَرِنِيْ كَيْفَ تُمِيْتُ الْاَحْيَاءَ﴾ اے میرے بندے! تو مجھ کو یہ دکھلا کہ تو میرے لیے زندہ کو کس طرح موت دیتا ہے۔ یعنی زندہ بیٹے کو کس طرح میرے لیے قربان کرتا ہے۔ (روح المعانی ص ۲۷ ج ۳)

رجوع باحکام صدقات

ابتداء پارہ میں اہل ایمان ❶ کو حکم دیا تھا کہ وقت کو غنیمت سمجھیں اور موت اور قیامت کے آنے سے پیشتر جو کچھ خدا کی راہ میں خرچ کر سکیں اُس سے دریغ نہ کریں۔ بعد ازاں اس کے مناسب مبدأ اور معاد کے اثبات کے لیے تین قصے ذکر فرمائے۔ اب پھر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر فرماتے ہیں کہ اے اہلِ ایمان جب قیامت کا حق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آخرت کے لیے کوئی توشہ بھی تیار کرو جو قیامت کے دن تمہیں کام آئے۔ نیز نفس پر آخرت کے لیے خرچ کرنا بہت شاق اور گراں ہوتا ہے۔ اور جب قیامت اور آخرت کا یقین ہو جائے تو پھر خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے اس لیے اثبات قیامت اور آخرت کے بعد عالم آخرت کے لیے ساز و سامان تیار کرنے کی ترغیب دی جس کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ
مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں جیسے ایک دانہ اس سے اگیں
سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ
سات بالیں ہر بال میں سو سو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ
چاہتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ

❶ قال اللہ تعالیٰ: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ .... الآية﴾

اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ

میں پھر پیچھے خرچ کرکر نہ احسان رکھتے ہیں نہ ستاتے ہیں انہیں کو ہے ثواب ان کا اپنے

رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ

رب کے ہاں اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غم کھاویں گے بات کہنی معقول اور

مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

درگزر کرنی بہتر اس خیرات سے جس کے پیچھے ستانا اور اللہ بے پروا ہے تحمل والا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ

اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر اور ستا کر، جیسے وہ

يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ فَمَثَلُهٗ

جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور پچھلے دن پر سو اس کی مثال

كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۗ لَا

جیسے صاف پتھر، اس پر پڑی ہے مٹی، پھر اس پر برسا زور کا مینہ تو اس کو کر رکھا سخت

يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

کچھ ہاتھ لگتی نہیں ان کو اپنی کمائی اور اللہ راہ نہیں دیتا منکر لوگوں کو۔

فضیلت انفاق فی سبیل اللہ وذکر بعض شرائط قبول

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ... اِلٰى ... وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾﴾

ان آیات میں عالم آخرت کے لیے ساز وسامان تیار کرنے کی ترغیب کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں جو ضمناً اثباتِ قیامت کی بھی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جو ذاتِ پاک زمین میں ایک دانہ ڈالنے اور سات سو دانے اُگانے پر قادر ہے وہ مُردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اُن کی مثال ایسی ہے کہ ایک دانہ زمین میں ڈالا جائے جو کہ سات بالیں اُگائے اور ہر بال میں سو دانے ہوں اسی طرح صدقہ دینے والا بمنزلہ مزارع کے ہے اور مال

بمنزلہ تخم اور دانہ کے ہے اور سبیل اللہ بمنزلہ زمین زراعت کے ہے جو خدا کی راہ میں مال خرچ کرے گا۔ اور سات سو گونہ کی کوئی تحدید نہیں۔ اللہ تعالیٰ بقدر اخلاص اور بقدر نیت اور مشقت کے جس کے لیے جس قدر چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی کشائش والا ہے اس کی عطا اور بخشش کی کوئی حد اور نہایت نہیں دینے سے اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اور اخلاص اور نیت اور اس کی مقدار اور کیفیت کو بھی خوب جاننے والے ہیں اس کے مطابق بڑھاتے ہیں۔ اور جس طرح پیداوار کے لیے یہ شرط ہے کہ تخم اور دانہ خراب نہ ہو اور زمین تخم ریزی کے قابل ہو اور آئندہ چل کر بھی کھیتی آفتوں سے محفوظ اور مامون رہے تب پیداوار ہوگی۔ اسی طرح صدقہ کے لیے یہ شرط ہے کہ مال حلال ہو اور جس راہ میں خرچ کیا جا رہا ہے وہ بھی خیر اور نیکی کی راہ ہو یعنی صحیح ہو اور آئندہ چل کر وہ صدقہ احسان جتلانے اور ایذا رسانی کی آفت سے بھی محفوظ اور مامون رہے تب اس صدقہ کا سات سو گونہ بدلہ ملے گا۔ چنانچہ آئندہ آیات میں ارشاد فرماتے ہیں: جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو زبان سے احسان جتلاتے ہیں اور نہ کسی اپنے عمل اور برتاؤ سے اس کو ایذاء پہنچاتے ہیں تو ایسے ہی لوگوں کو اُن کے پروردگار کے یہاں صدقہ کا اجر اضعافا مضاعفہ ملے گا اور نہ اُن کو آئندہ ڈر ہے کہ ہمارا صدقہ کسی آفت سماویہ سے ہلاک ہو جائے اور نہ قیامت کے دن غمگین ہوں گے کہ ہمارا صدقہ بیکار گیا۔ اس لیے کہ صدقہ کی کھیتی سماوی آفتوں سے تباہ اور برباد نہیں ہوتی۔ بلکہ خرچ کرنے والے کے نفس کی طرف سے جو ﴿مَنْ﴾ اور ﴿اذیٰ﴾ اور ﴿ریاء﴾ کی آفتیں آتی ہیں۔ اُن سے تباہ اور برباد ہوتی ہے۔ اور صدقہ دینے کے بعد من اور اذیٰ یعنی احسان جتلانے اور ستانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ سائل کو معقول اور مناسب طریقہ سے جواب دے دینا اور نرمی کے ساتھ اپنی ناداری اور نہ دینے کا عذر کر دینا اور اگر سائل اصرار کرے اور کچھ سخت اور سُست کہے تو اُس سے درگذر کرنا اس خیرات سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کے بعد ستایا جائے۔ اس لیے کہ صدقہ اور خیرات سے محتاج اور سائل کی تکلیف کو دُور کرنا تھا۔ پس جب وہ مقصد حاصل نہ ہوا تو وہ صدقہ بیکار ہی گیا۔ ایسی سخاوت سے تو بخل بہتر ہے کہ جس کے بعد اس کو ذلیل اور حقیر کیا جائے سائل کی ایک تکلیف دُور کی اور پھر دوسری تکلیف اسکو پہنچائی۔ یہ ایسا ہے کہ ایک کانٹا نکالا اور دوسرا کانٹا چبھو دیا اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں ان کو کسی کے مال اور خیرات کی ذرہ برابر حاجت نہیں۔ جو خیرات کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے اور بردبار اور تحمل والے ہیں۔ احسان جتانے والے اور ستانے والے کو جلدی سزا نہیں دیتے۔ ان آیات میں مَنّ اور اذیٰ کا بیان تھا۔ اب آئندہ آیات میں ریاء کا بیان فرماتے ہیں کہ صدقہ کی قبولیت کے لیے اخلاص اور نیت شرط ہے۔

اگر دکھاوے کی نیت سے خرچ کیا تو بیکار ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اس پتھر پر دانہ ڈالیے جس پر کچھ مٹی نظر آتی ہو اور ظاہر نظر میں یہ گمان ہو کہ یہ جگہ قابلِ زراعت ہے اور جب اس پر بارش پڑی تو سب بہہ گیا اور کوئی چیز بھی اس کے قبضہ میں نہ رہی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتلانے اور ایذاء پہنچانے سے ضائع مت کرو۔ احسان جتلانا احسان کرنے کے منافی ہے اور نیکی کرنا اور تکلیف پہنچانا ایک دوسرے کی ضد ہیں دونوں جمع نہیں ہو سکتیں۔ خیرات کر کے احسان جتلانے والا اور ایذا پہنچانے والا اس شخص کے مشابہ ہے جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ یعنی اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ذخیرہ کے لیے خیرات نہیں کرتا بلکہ محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے خیرات کرتا ہے جو مومن کی شان نہیں بلکہ منافق کی خصلت ہے۔ پس ریا اور نمود کے لیے خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے کہ ایک صاف پتھر ہو۔ جس پر کوئی چیز نہیں اُگتی اور اس پر کچھ مٹی پڑی ہوئی ہو۔ اس کو دیکھ کر اس میں دانہ ڈالے اور یہ گمان کرے کہ اس میں سات دانے پیدا ہوں گے۔ پھر اس پر ایک

سخت بارش پڑی جس نے اس پتھر کو بالکل صاف کر دیا۔ اور مٹی اور دانہ کا نام ونشان نہ چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ اب اس میں کیا اُگے گا۔ اسی طرح نفاق اور ریاء صدقہ اور خیرات کو بہا کر لے جاتا ہے پس قیامت کے دن ریاء اور نفاق سے خرچ کرنے والے اور خرچ کر کے احسان جتلانے والے اور ستانے والے اپنی کمائی میں سے کسی چیز کا ثواب حاصل کرنے پر ذرّہ برابر قادر نہ ہوں گے۔ کوئی چیز اُن کے ہاتھ نہ لگے گی۔ اس لیے کہ ثواب ملنے کی شرط یہ ہے کہ ایمان اور اخلاص کے ساتھ دیا ہو۔ پس جس نے ریاء اور نفاق سے کچھ خیرات کیا اُس کی مثال تو ایسی ہے کہ جس نے پتھر پر دانہ ڈالا اور بارش اُس کو بہا کر لے گئی اور جس نے اخلاص سے دیا اور بعد میں احسان جتلایا اور ایذاء پہنچائی اُس کی مثال ایسی ہے کہ پودا لگایا اور پھر خود ہی اُس کو اپنے ہاتھ سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور اللہ تعالیٰ کافروں کو اپنی توفیق اور عنایت سے سرفراز نہیں فرماتے اشارہ اس طرف ہے کہ ریا اور دکھلاوے کے لیے خرچ کرنا اور احسان جتانا اور ستانا یہ کافروں کی صفات ہیں۔ مومن کی شان نہیں کہ ایسا کرے۔

فائدہ: جس طرح نماز کے لیے دو قسم کی شرائط ہیں: ایک شرائط صحت، جیسے وضو اور طہارت۔ اور دوسرے شرائط بقاء جیسے نماز میں کسی سے باتیں نہ کرنا اور کھانے اور پینے سے پرہیز کرنا۔ پس اگر وضو ہی نہ کرے تو سرے ہی سے نماز صحیح نہ ہوگی اور اگر وضو اور طہارت کے بعد نماز شروع کی، مگر ایک رکعت یا دو رکعت کے بعد نماز میں کھانا اور پینا اور بولنا شروع کر دیا تو اس کی نماز باقی نہ رہے گی۔

اسی طرح صدقات اور خیرات کے لیے بھی دو قسم کی شرطیں ہیں: ایک شرائط صحت اور دوسری شرائط بقاء۔ اخلاص شرط صحت ہے۔ بغیر اخلاص کے صدقہ صحیح ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو صدقہ ریاء اور نفاق کے ساتھ دیا جائے وہ شریعت میں معتبر نہیں اور مَنّ اور اذیٰ سے پرہیز شرطِ بقاء ہے یعنی صدقہ اور خیرات اس وقت تک محفوظ اور باقی رہیں گے جب تک صدقہ دینے کے بعد نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ سائل کو کسی قسم کی ایذاء پہنچائی جائے۔ اگر صدقہ دینے کے بعد احسان جتایا یا ستایا تو وہ صدقہ ضائع اور باطل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں صدقہ اور خیرات کے مفسدات میں سے ہیں۔ جیسے کھانے اور پینے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اسی طرح مَنّ اور اذیٰ سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ جو صدقہ نفاق اور ریاء سے دیا جائے اس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے اس لیے اس صدقہ کو جو مَنّ اور اذیٰ کی وجہ سے باطل ہو اُس کو اس صدقہ کے ساتھ تشبیہ دی جو کہ ریاء اور نفاق کی وجہ سے باطل ہو۔ اس لیے کہ صدقہ ریاء اور نفاق ابتداء ہی سے باطل ہے کیونکہ شرط صحت مفقود ہے اور صدقہ مَنّ اور اذیٰ اصل سے صحیح تھا۔ بعد میں من اور اذیٰ کی وجہ سے باطل ہوا اس لیے کہ شرط بقاء کی منتفی ہوئی اب اس تقریر کے بعد معتزلہ کا یہ شبہ کافور ہو گیا کہ جس طرح کفر اور ارتداد سے تمام اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر سیئہ اور ہر ہر معصیت کے ارتکاب سے گزشتہ تمام طاعات حبط ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ صدقہ مَنّ اور اذیٰ سے اس لیے باطل ہوا کہ صدقہ جو کہ ایک طاعت تھا اس کی شرط بقاء نہیں پائی گئی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً ہر سیئہ کے ارتکاب سے گزشتہ حسنات بھی حبط ہو جائیں۔

اور جن آیات اور احادیث سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ معاصی اور سیئات سے گزشتہ طاعات اور حسنات حبط ہو جاتے ہیں اُن کا مطلب یہ نہیں کہ معاصی اور سیئات کے ارتکاب سے گزشتہ طاعات باطل ہو جاتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن کے انوار و برکات جاتے رہتے ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے: ((اذا زنی العبد خَرج منه الایمان)). یعنی جب بندہ زنا کرتا ہے تو اُس سے ایمان کا نور زائل

ہوجاتا ہے اور یہ مطلب نہیں کہ زنا کرنے سے کافر ہوجاتا ہے۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا
اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں مال اپنے اللہ کی خوشی چاہ کر اور اپنا
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا
دل ثابت کر کر جیسے ایک باغ ہے بلندی پر، اس پر پڑا مینہ تو لایا اپنا پھل
ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾
دُونا پھر اگر نہ پڑا اُس پر مینہ تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے

مثال نفقات مقبولہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ... الٰی... وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں صدقاتِ غیر مقبولہ کی مثال بیان فرمائی۔ اب ان آیات میں صدقات مقبولہ کی مثال بیان فرماتے ہیں اور مثال ان لوگوں کی جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں محض خدا تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی طلب کرنے کے لیے اور دلی تصدیق [1] اور یقین کی بنا پر یعنی ان کو یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صدقات پر جزاء اور ثواب کا وعدہ کیا ہے وہ حق ہے اور اُن کے دلوں کو یقین اور اطمینان ہے کہ قیامت کے دن اُن کو پورا بدلہ ملے گا۔ جیسے کہ حدیث میں آیا ہے:

((من صام رمضان ایمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه)).

پس ان لوگوں کے صدقات اور خیرات کی مثال اس باغ کی مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو۔ جو دیکھنے میں نہایت خوبصورت معلوم ہو بلند جگہ پر جو درخت ہوتے ہیں وہ دیکھنے میں نہایت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور بلند جگہ کی آب و ہوا بھی بہت لطیف ہوتی ہے اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو۔ پس لایا ہو وہ باغ اپنا دونا پھل اور اگر اس باغ کو زور کی بارش نہ پہنچے تو شبنم اور اوس ہی اس کو کفایت کرتی

---

[1] یہ ترجمہ ﴿تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کا ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ اور شعبی اور سدی رحمہم اللہ سے منقول ہے اور اسی کو زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قیل معناه تصدیقا و یقیناً قاله ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما و قال ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایضاً و قتادة رحمہ اللہ تعالیٰ معناه واحتسابا من انفسهم. (تفسیر قرطبی ص ۳۱۴ ج ۳)۔ وقال الزجاج تصدیقا للا سلام و تحقیقاً للجزاء من اصل انفسهم جازمین بان الله لا یضیع ثوابهم فمن علی هذا للابتداء، جزمهم بالثواب هو المراد بالتثبیت۔ (تفسیر نیسابوری ص ۵۲ ج ۳۔ وتفسیر کبیر ص ۳۵۳ ج ۲)۔ اور اسی معنی کو ابن جریر اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔ دیکھو تفسیر ابن کثیر ص ۱۶۲ ج ۲ مزید تفصیل آئندہ فوائد کے ذیل میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہے۔ کیونکہ زمین عمدہ ہے اور آب و ہوا نہایت لطیف ہے۔ اس لیے تھوڑا پانی بھی اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔ بہر حال وہ باغ ایسی عمدہ جگہ پر ہے کہ اُس کو تھوڑا پانی پہنچے یا زیادہ وہ باغ خراب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مومن مخلص کی خیرات بمنزلہ باغ کے ہے کہ وہ ضائع اور برباد نہیں ہوتی۔ بقدر اخلاص اور بقدر نیت اور بقدر اس کے خرچ کے اس کو ثواب ملے گا زور کی بارش سے بہت مال خرچ کرنا مراد ہے اور شبنم اور اوس سے تھوڑا مال خرچ کرنا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والے ہیں کہ کون اخلاص کے ساتھ خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے دیتا ہے اور کون ریاء اور نفاق سے دیتا ہے اور کون دینے کے بعد احسان جتلاتا ہے اور حاصل * مثال یہ ہے کہ اہل اخلاص کا عمل ضرور نافع اور مفید ہوتا ہے۔ خواہ اہل اخلاص سابقین اور مقربین میں سے ہوں یا اصحاب یمین میں سے۔

فائدہ ①: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور شعبی اور قتادہ اور ابو صالح اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے کہ ﴿تَثْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کے معنی تصدیق اور یقین کے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ یہ مثال اُن مومنین کی ہے جو اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں تا کہ اُن کو اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو اور ﴿تَثْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اُن کو دل سے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خیرات کی کامل جزاء عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے: ((من صام رمضان ایمانا واحتسابا)). یعنی جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور وہ اس بات پر ایمان رکھے کہ اللہ نے یہ روزے فرض کیے ہیں اور احتسابًا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے ثواب کی توقع اور اُمید رکھے اور اسی معنی کو امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۱۶۲ ج ۲)

اس تفسیر میں ﴿مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کا من ابتدائیہ ہے۔ ای تثبیتا ناشیا من نفوسھم یعنی ایسی تصدیق اور ایسا یقین کہ جو اُن کے دلوں سے نکلا ہو۔ اس بنا پر ہم نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی کہ (دلی تصدیق اور یقین کی بنا پر) شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ﴿تَثْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ''وبسبب اعتقاد ناشی از دل خویش''

فائدہ ②: مجاہد اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ تثبیت سے احتیاط کے معنی مراد ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: معناہ انھم یثبتون این یضعون صدقاتھم۔ یعنی وہ احتیاط کرتے ہیں کہ اپنا صدقہ اور خیرات کس جگہ خرچ کریں۔ (تفسیر قرطبی ص ۳۱۴ ج ۳ و تفسیر ابن کثیر ۱۶۳ ج ۲)

فائدہ ③: اور بعض ائمہ تفسیر اس طرف گئے ہیں کہ ﴿تَثْبِيتًا﴾ کے معنی نفس کو مقام عبودیت اور منزل ایمان میں ایسا ثابت قدم بنا دینا کہ اس کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہ آئے اور حرص اور طمع اور مال کی محبت اس کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور ﴿مِنْ﴾ اس تفسیر پر تبعیضیہ ہے اور ﴿تَثْبِيتًا﴾ کا مفعول ہے یعنی ﴿تَثْبِيتًا بَعْضَ اَنْفُسِهِمْ﴾ اور معنی یہ ہیں کہ جس نے اپنا مال خدا کے لیے خرچ کیا اُس نے اپنے بعض نفس کو ایمان پر جما لیا اور جس نے جان اور مال دونوں خدا کے لیے خرچ کیے اس نے اپنے سارے نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دیا اور اس آیت شریفہ یعنی ﴿تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ﴾ (الصف:۱۱) میں یہی مراد ہے یعنی کل نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دینا مراد ہے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس وجہ کو ذکر کر کے فرماتے ہیں:

هذا الوجه ذكره صاحب الكشاف وهو كلام حسن و تفسير لطيف. (تفسير كبير ص ۳۵۳ ج ۲)

ترجمہ: "اس وجہ کو صاحب کشاف یعنی علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور یہ کلام بہت خوب ہے اور نہایت لطیف تفسیر ہے۔"

---

* شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ لکھتے ہیں: ''حاصل ایں مثل آنست کہ عمل اہل اخلاص۔ فائدہ می دہد از سابقین باشد یا از اصحاب یمین''

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ

بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو؟ کہ ہووے اس کا ایک باغ کھجور اور انگور کا، نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ

اس کے بہتی ہیں ندیاں، اس کو وہاں حاصل سب طرح کا میوہ، اور اس پر بڑھاپا پڑا اور

لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ

اس کے اولاد ہیں ضعیف، تب پڑا اس باغ پر بگولہ، جس میں آگ تھی، تو وہ جل گیا

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع ۳۶ ۴

یوں سمجھاتا ہے اللہ تم کو آیتیں، شاید تم دھیان کرو۔

مثال نفقات وطاعات غیر مقبولہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ ... الیٰ ... عَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾﴾

کیا تم میں سے کوئی یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک ایسا باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا کہ اُس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں اور اس باغ میں علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے اس کے لیے ہر قسم کے پھل اور میوے ہوں اور اس کو بڑھاپا آ پہنچا کہ جس وقت میں چل پھر کر کمانے پر قدرت نہیں رہی اور بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے ضرورت اور لاچارگی بڑھ گئی اور اس کی اولاد ضعیف اور ناتواں ہے جو کمانے پر قادر نہیں اور بجائے اس کے کہ وہ بوڑھے باپ کی خدمت کریں خود محتاج خدمت ہیں۔ یہ وقت باپ کے لیے بڑی پریشانی کا ہے کہ خود بھی عاجز اور مجبور اور بچے بھی کمزور اور ناتواں۔ پس اچانک ایسی حالت میں اس باغ کو ایک بگولا آ لگا، جس میں آگ تھی۔ پس وہ باغ جل کر خاک ہو گیا۔ اسی طرح قیامت کے دن جو انتہائی ضرورت اور پریشانی کا وقت ہوگا صدقات اور خیرات کے وہ تمام باغات جن کو مَنّ اور اذیٰ کا بگولہ پہنچا۔ جس میں غضبِ خداوندی کی آگ پنہاں تھی جل کر خاک ہو جائیں گے اور کفِ افسوس ملتا ہوا رہ جائے گا اور تمام اُمیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو واضح فرماتا ہے تا کہ تم فکر کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ لکھتے ہیں:

حاصل ایں مثل آنست کہ عمل مَنّان و مرائی در وقت شدت احتیاج حبط شود۔ چنانچہ بوستان ایں شخص در وقتِ شدتِ احتیاج بسوخت۔

ترجمہ: "حاصل مثال کا یہ ہے کہ احسان جتلانے والے اور ریاء سے صدقہ دینے والے کے اعمال شدید احتیاج کے وقت حبط ہو جائیں گے جیسے اس شخص کا باغ شدید احتیاج کے وقت جل کر خاک ہو گیا۔"

یعنی یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو احسان رکھ کر اپنی خیرات کو ضائع کرتے ہیں۔ جیسے کسی نے جوانی کے وقت باغ تیار کیا تا کہ ضعیفی اور بڑھاپے میں کام آئے اور اس سے میوہ کھائے۔ پس جب بڑھاپا اور ضرورت کا وقت آیا تو عین ضرورت کے وقت وہ باغ جل گیا۔

اسی طرح صدقہ اور خیرات مثل میوہ دار باغ کے ہیں کہ ان کا میوہ آخرت میں کام آتا ہے جب کسی کی نیت بُری ہو یا احسان جتائے یا ستائے تو وہ باغ جل کر خاک ہو جاتا ہے پھر اس کا میوہ جو کہ ثواب ہے وہ کیونکر نصیب ہو؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا

اے ایمان والو! خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور جو ہم نے نکال دیا

لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ

تم کو زمین میں سے اور نیت نہ رکھو گندی چیز پر کہ خرچ کرو، اور تم آپ

بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

وہ نہ لو گے مگر جو آنکھیں موند لو اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے خوبیوں والا

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگی کا اور حکم کرتا ہے بے حیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے

مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ

اپنی بخشش کا اور فضل کا اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا۔ دیتا ہے سمجھ جس کو

يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جس کو سمجھ ملی بہت خوبی ملی اور وہی سمجھیں

اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ

جن کو عقل ہے اور جو خرچ کرو گے کوئی خیرات یا قبول کرو گے کوئی

نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا

منّت، سو اللہ کو معلوم ہے اور گنہگاروں کو کوئی نہیں مدد گار اگر کھلی دو

الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ

خیرات تو کیا اچھی بات، اور اگر چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو

خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

تم کو بہتر ہے۔ اور اتارتا ہے کچھ گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کام سے

خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

واقف ہے تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لانا لیکن اللہ راہ پر لاوے جس کو چاہے

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ

اور مال جو خرچ کرو گے سو اپنے واسطے جب تک خرچ کرو گے مگر اللہ کی

وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا

خوشی چاہ کر اور جو خرچ کرو گے خیرات پوری ملے گی تم کو اور تمہارا

تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

حق نہ رہے گا دینا ہے ان مفلسوں کو جو اٹک رہے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ

ملک میں سمجھے ان کو بے خبر محظوظ ان کے نہ مانگنے سے تو

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

پہچانتا ہے ان کو ان کے چہرے سے نہیں مانگتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو خرچ

مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ ۳۷ ع ۵

کرو گے کام کی چیز وہ اللہ کو معلوم ہے جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات

وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ

اور دن چھپے اور کھلے تو ان کو ہے مزدوری ان کی اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ان پر نہ وہ غم کھاویں گے۔

بیان بقیہ آداب صدقات وذکر مصارف خیر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ... الٰى ... وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾﴾

ربط: اب ان آیات میں ان امور کو بیان فرماتے ہیں کہ جن کی صدقہ اور خیرات میں رعایت ضروری ہے اور بعد ازاں یہ بیان فرمائیں گے کہ کن لوگوں کو صدقہ دینا جائز ہے اور صدقہ اور خیرات کے اصل مستحق کون لوگ ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جو چیز تم نے اپنی تجارت یا صنعت وحرفت سے کمائی ہے۔ اس میں سے پاکیزہ یعنی حلال اور عمدہ چیز خدا کی رہ میں خرچ کرو۔ اور علیٰ ہذا ہم نے جو چیز تمہارے لیے زمین سے نکالی ہے اس میں سے بھی پاکیزہ اور عمدہ ہی چیز خرچ کرو۔ اور خراب اور گندی چیز کا ارادہ بھی نہ کرو کہ اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ خدا کی راہ میں خبیث اور ناپاک مال خرچ کا ارادہ اور نیت بھی گستاخی ہے۔ البتہ اگر بلا قصد اور بلا ارادہ تمہاری خیرات میں کوئی خراب چیز مل جائے تو اس پر مواخذہ نہیں۔ حالانکہ تمہارا حال یہ ہے کہ اگر تمہارا حق کسی کے ذمہ چاہتا ہو اور وہ تم کو کوئی خراب چیز دینے لگے تو اس خراب کو لینے والے نہیں مگر یہ کہ تم اس کے لینے میں چشم پوشی کرو۔ پس جبکہ تم اپنے حقوق میں خراب چیز لینا پسند نہیں کرتے، تو خدا کی راہ میں خراب چیز دینے کو کیسے پسند کرتے ہو اور تم اس بات کو خوب جان لو کہ تمہارا یہ چشم پوشی کرنا حاجت اور ضرورت کی بنا پر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو بے نیاز اور بے پرواہ ہے۔ اسے تو پسندیدہ اور پاکیزہ کی بھی ضرورت نہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی خوبیوں والا ہے۔ خوب سے خوب کو پسند کرتا ہے اور پاکیزہ ہی چیز کو قبول کرتا ہے۔

شیطان کبھی تم کو تنگ دستی سے ڈراتا ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں خرچ کرو گے یا عمدہ مال خیرات کرو گے تو تنگ دست ہو جاؤ گے۔ اگر دینا ہی ہے تو خراب اور ردی چیزیں خیرات کر دو اور کبھی شیطان تم کو بے حیائی کا حکم دیتا ہے کہ ناجائز کاموں میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے یا ریاء اور دکھلاوے کے ساتھ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے خرچ کرنے پر اور خصوصاً پاکیزہ کمائی سے خرچ کرنے پر اپنی جانب سے بخشش اور فضل اور احسان کا وعدہ کرتا ہے یعنی جو شے ہماری راہ میں خرچ کرو گے اس پر ہم تمہاری مغفرت کریں گے اور دنیا اور آخرت میں اس سے کہیں زائد اضعافاً مضاعفہ تم کو عطا کریں گے جو تمہارے وہم وگمان سے بھی کہیں بالا اور برتر ہو گا۔ کما قال اللّٰهُ تعالٰى: ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾﴾ (سباء) اور اللہ تعالیٰ بڑا کشائش والا ہے۔ اس کے خزانہ میں کوئی کمی اور تنگی نہیں اور بڑا دانا ہے۔ تمہارے اخلاص اور نیت کے بمقدار انعام دے گا۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اُس کو حکمت اور دانائی یعنی صحیح فہم عطا فرماتے ہیں جس سے وہ القاء رحمانی اور خیالِ شیطانی میں فرق کرنے لگتا ہے۔ مثلاً جب اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس رہ جاؤں گا۔ تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ وسوسہ شیطانی ہے۔ شیطان مجھ کو خیرات سے روکنا چاہتا ہے اور جب یہ خیال آتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوگی اور دنیا میں خرچ کیا ہوا آخرت میں کام آئے گا

اور خدا کی راہ میں دینے سے کمی نہیں آتی تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ القاء رحمانی ہے باقی ایسا صدقہ اور خیرات کہ جس سے ظاہر اسباب میں یقیناً یا بظنِ غالب مفلس ہو جانے کا اندیشہ ہو تو شریعت نے خود ایسے صدقات اور تبرعات کو ممنوع قرار دیا ہے۔ البتہ بخیلانہ خیالات اور وسوسوں کے اتباع سے منع کیا ہے آج کل کے متمدن بخیلوں نے اپنے بخل کا نام ''اقتصاد'' رکھ لیا ہے تا کہ خدا کی راہ میں نہ دینے کا بہانہ بن جائے اور جس کو من جانب اللہ حکمت اور دانائی عنایت ہو گئی۔ بلا شُبہ اس کو بڑی خیر اور بھلائی مل گئی۔ اس لیے کہ دُنیا اور آخرت کے سب کام حکمت اور دانائی سے درست اور ٹھیک ہوتے ہیں اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہی لوگ جو خالص عقل والے ہیں۔ یعنی جن کی عقلیں وہموں اور شیطانی وسوسوں اور نفسانی خطرات سے محفوظ اور مامون ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنی خواہشوں کو اللہ کی اطاعت اور رضا مندی میں فنا کر چکے ہیں اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تھوڑا ہو یا بہت، پوشیدہ ہو یا ظاہر، حق میں یا باطل میں یا کوئی منت اور نذر مانو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے اس کے موافق تم کو جزا دے گا۔ اور ظالم اور ستمگاروں کے لیے کہ جو اپنا مال نہ تو راہ مولیٰ میں خرچ کرتے ہیں اور نہ اپنی منتیں پوری کرتے ہیں یا دکھلاوے اور معصیت کے لیے خرچ کرتے ہیں ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں کہ جو قیامت کے دن ان کو عذاب الٰہی سے بچا سکے۔

فائدہ: یہاں تک صدقہ کے آداب اور شرائط کا بیان تھا۔ اب آئندہ آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ صدقہ اعلانیہ بہتر ہے یا پوشیدہ۔ چنانچہ فرماتے ہیں اگر تم اپنے صدقات اور خیرات کو ظاہر کرو یعنی سب کے سامنے لیکن قصد دکھلانے کا نہ ہو تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ تمہارا یہ نیک عمل دیکھ کر دوسرے بھی اتباع کریں گے اور نیک دل لوگ تمہاری اس سخاوت کو دیکھ کر تمہارے لیے دعا کریں گے کہ اے اللہ ایسے سخی کو زندہ رکھ جو تیری راہ میں خرچ کرتا ہے۔ نیز دوسرے مستحقین کو جب تمہاری اعانت اور امداد کا علم ہو تو وہ بھی تمہارے وجود اور جُود کو اپنے لیے سہارا سمجھیں گے اور تمہارے لیے دعا کریں گے۔ اور اگر تم اپنے صدقات کو چھپاؤ اور پوشیدہ طور پر فقیروں کو دے دو تو وہ تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔ تمہارا صدقہ ریاء اور نمود سے محفوظ رہا۔ اور فقیر ندامت اور شرمندگی سے محفوظ رہا اور چونکہ تم نے پوشیدہ دے کر فقیر کی پردہ پوشی کی اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے اس پوشیدہ صدقہ کے صلہ میں تمہارے کچھ گناہوں اور برائیوں کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خوب آگاہ اور واقف ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ صدقہ کا اظہار اور اخفاء دونوں ہی بہتر ہیں مگر صدقہ کا اخفاء بہت بہتر ہے۔ البتہ بعض حالات میں صدقہ کا اظہار زیادہ نافع ہوتا ہے یہ عارضی امر ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے مشرکین رشتہ داروں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنے کو مکروہ سمجھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دی اور اس بارہ میں یہ آئندہ آیت نازل ہوئی یعنی ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ نازل ہوئی۔ (نسائی، طبرانی و بزار وغیرہ)

اور مصنّف ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تھا کہ تم اپنے ہی دین کے لوگوں کو صدقہ دیا کرو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کا راہ راست پر لانا آپ کے ذمہ نہیں۔ جس کے لیے آپ اتنا اہتمام کریں اور یہ خیال کریں کہ شاید اس تدبیر سے یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور لیکن اللہ ہی راہ راست پر لاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے تو وہ تمہارے ہی نفع کے لیے ہے۔ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ تمہارا صدقہ مسلمان کو ملے یا کافر کو صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں۔

اور تم تو خدا کے ایسے مخلص ہو کہ کوئی چیز بھی خرچ نہیں کرتے مگر محض اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے اور جو مال بھی تم خدا کی رضامندی کے لیے خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تم تک پہنچا دیا جائے گا اور تمہارے اجر میں ذرہ برابر کمی نہ کی جائے گی۔ لہٰذا اس فکر میں نہ پڑو کہ تمہارا صدقہ اور خیرات مسلمان ہی کو ملے اور کافر کو نہ ملے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔

گرادمی برد بیش آتش سجود　　تو واپس چرامی کشی دست جُود

حکایت: ایک عالم بڑی خیرات کیا کرتے تھے اور کوئی پوچھتا تو قسم کھاتے کہ خدا کی قسم میں نے کسی کے ساتھ کوئی خیر نہیں کی۔ کسی نے اس عالم سے دریافت کیا کہ آپ خیرات کرتے ہیں اور پھر یہ قسم کھاتے ہیں تو یہ فرمایا کہ خدا کی قسم میں کسی کے ساتھ خیر نہیں کرتا۔ جو خیر کرتا ہوں وہ اپنے ہی لیے کرتا ہوں اور اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ یعنی تم جو بھی خیر کرتے ہو وہ اپنے ہی نفس کے لیے کرتے ہو۔

فائدہ: ان آیات میں صدقات نافلہ اور عام خیرات کا بیان ہے اور نفلی صدقہ اور خیرات دینا کافر کو بھی جائز ہے۔ البتہ زکوٰۃ سوائے مسلمان کے کسی اور کو دینا جائز نہیں۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو یہ فرمایا کہ وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا، اور جب اسلام قبول کرلیں تو ان کو یہ بتلا دینا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو انہی مسلمان امیروں سے لی جائے گی اور انہی کے غریبوں کو دی جائے گی۔ پس جس طرح زکوٰۃ مسلمانوں ہی کے امیروں پر فرض ہے اسی طرح ان سے لے کر مسلمان فقیروں ہی پر تقسیم کی جائے گی۔ کافر فقیروں پر اس کا تقسیم کرنا جائز نہ ہوگا۔

ربط: گزشتہ آیت میں یہ فرمایا کہ صدقہ اور خیرات مومن کے ساتھ مخصوص نہیں کافر کو بھی خیرات دینا جائز ہے اب آئندہ آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ صدقات اور خیرات کے کون لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں صدقات کا اصل استحقاق ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں مقید اور پابند ہیں۔ یعنی دین کی خدمت اور علوم ظاہری اور باطنی کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ قرآن کریم حفظ کرتے ہیں اور علم دین سیکھتے ہیں اور ظاہری اور باطنی دشمنوں کے جہاد میں لگے ہوئے ہیں۔ ظاہری دشمن سے کفار مراد ہیں اور باطنی دشمن سے نفس امارہ مراد ہے جس طرح کافروں کی گردن کشی کے لیے جہاد و قتال بزرگ ترین عبادت ہے اسی طرح نفس کشی کے لیے مجاہدات اور ریاضات بھی عظیم ترین عبادت ہے۔ حدیث میں ہے: ((المجاهد من جاهد نفسه)) اور ایک ضعیف روایت میں جہاد نفس کو جہاد اکبر فرمایا ہے۔ جیسے اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم تجارت اور زراعت کو چھوڑ کر حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے قریب جو ایک صُفّہ (چبوترہ اور سائبان تھا) وہاں لیل و نہار بسر کرتے تھے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں علم سیکھیں اور جب جہاد کا موقع آئے تو جہاد میں جائیں۔ غرض یہ کہ صدقات کے اصل مستحق وہ فقراء اور حاجت مند لوگ ہیں کہ جو علوم دینیہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور علم اور جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے ملک میں تجارت اور مزدوری کے لیے چل پھر نہیں سکتے اس لیے کہ ایک آدمی سے دو کام نہیں ہو سکتے۔

فائدہ: مسلمانوں کو چاہیے کہ صدقات اور خیرات میں ان حاجت مند طالب علموں کا خاص طور پر خیال رکھیں جو علم دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں اگر دنیا میں یہ گروہ نہ رہے تو دنیا سے علم دین اور دین سب رخصت ہو جائے اور لوگ بے دین اور گمراہ ہو جائیں اس لیے کہ کسی چیز کا باقی رہنا اس شے کے علم کے باقی رہنے پر موقوف ہے۔ طبِ جسمانی کی اگر تعلیم نہ ہو اور نہ اس کی کوئی درسگاہ ہو تو نتیجہ

یہ ہوگا کہ دُنیا بیماروں سے پُر ہوگی اور کوئی طبیب اور معالج نہ ملے گا۔ اسی طرح اگر طبِ روحانی یعنی علم دین کی کوئی درسگاہ نہ ہوتو دنیا روحانی مریضوں یعنی کفر اور الحاد اور معصیت کے روحانی بیماروں سے بھری ہوگی اور کوئی طبیب اور معالج نہ ہوگا یعنی ایمان اور کفر اور اطاعت اور معصیت کا فرق بتلانے والا کوئی نہ ملے گا۔ باقی جو شخص کفر اور معصیت کو بیماری ہی نہ سمجھتا ہو اس سے ہمارا خطاب نہیں اور انجان آدمی جو ان کے حال سے ناواقف اور بے خبر ہے وہ ان کو نہ مانگنے کی وجہ سے مالدار اور دولت مند سمجھتا ہے۔ قناعت کی وجہ سے یہ لوگ کسی سے سوال نہیں کرتے اس لیے عام طور پر ان کی حاجتمندی کا علم نہیں ہوتا البتہ تم ان کی حاجت اور تنگی کو کسی وقت ان کے چہرے کی حالت اور قیافہ سے پہچان سکتے ہو اس لیے کہ بعض مرتبہ بھوک اور تنگی کے باعث چہرہ پر پژمردگی اور بدن پر لباس شکستہ ہوتا ہے اس لیے ان کی تنگی کا علم ہو جاتا ہے۔ قناعت کی وجہ سے اوّل تو یہ لوگ کسی سے سوال نہیں کرتے اور اگر شاذ و نادر کبھی مجبور ہو کر سوال کرتے ہیں تو لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے یعنی کسی کے سَر نہیں ہوتے اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے خواہ وہ لوگ سوالی ہوں یا بے سوالی، ان کی حاجت اور تنگی کم ہو یا زیادہ، تو اللہ تعالیٰ تم کو بقدر استحقاق کے اس کی جزاء دے گا۔ اس لیے کہ اس کو تمہاری نیت خوب معلوم ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کسی زمان اور مکان اور وقت اور حال کی قید نہیں۔ جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جس میں مستحق کا پورا پتہ نہیں چل سکتا یا دن میں جس میں ریاء کا اندیشہ ہے اور علیٰ ہٰذا نہ کسی حال کی تخصیص ہے ظاہراً خرچ کریں یا تو پوشیدہ پس ان کے لیے ان کا ثواب ہے ان کے پروردگار کے یہاں۔ جس پروردگار نے ان کے صدقات کی تربیت کی ہے اور ان کو بڑھایا ہے اور نہ اُن پر کوئی خوف و خطر ہے اور نہ یہ لوگ رنجیدہ ہوں گے بلکہ صدقات کے انعامات کو دیکھ کر یہ تمنا کریں گے کہ کاش خدا کی راہ میں سارا ہی گھر لٹا دیا ہوتا۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہ اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے جس کے حواس

الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ

کھو دیئے جن نے لپٹ کر یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہا سودا کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا سود لینا،

وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

اور اللہ نے حلال کیا سودا اور حرام کیا سود پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی

فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ

اور باز آیا تو اس کا ہے جو آگے ہو چکا اور اس کا حکم اللہ کے اختیار اور جو کوئی پھر کرے وہی ہیں

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي

دوزخ کے لوگ وہ اسی میں رہ پڑے مٹاتا ہے اللہ سود اور بڑھاتا ہے

الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

خیرات اور اللہ نہیں چاہتا کسی ناشکر گنہگار کو جو لوگ ایمان لائے

وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ

اور عمل نیک کیے اور قائم رکھی نماز اور دی زکوٰۃ ان کو ہے بدلہ ان کا

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اپنے رب کے پاس اور نہ اُن پر ڈر ہے نہ وہ غم کھائیں گے اے

اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو رہ گیا سود اگر تم کو یقین ہے

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ

پھر اگر نہیں کرتے تو خبردار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تم

فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ كَانَ

کو پہنچتے ہیں اصل مال تمہارے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر اور اگر ایک شخص ہے

ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

تنگی والا، تو فرصت دینی چاہیئے جب تک کشائش پاوے اور اگر خیرات کر دو تو تمہارا بھلا ہے اگر تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ

کو سمجھ ہو اور ڈرتے رہو اس دن سے جس میں الٹے جاؤ گے اللہ کے پاس، پھر پورا ملے گا

نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع ۳۸ ۴۸ ۶

ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

احکام ربا (سود)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا ... الیٰ ... وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں خیرات اور صدقات کا بیان تھا، اب آئندہ آیات میں سود کے احکام ذکر فرماتے ہیں جو کہ صدقات اور خیرات کی ضد اور نقیض ہے۔ اس لیے کہ صدقہ اور خیرات سے اخلاق اور مروت اور خلق اللہ کی نفع رسانی میں ترقی ہوتی ہے اور سود میں سراسر بے مروتی اور ضرر رسانی ہے۔ صدقہ اور خیرات میں صلہ رحمی اور غریبوں کی امداد ہوتی ہے اور سود میں سخت دلی اور غریبوں پر زیادتی ہوتی ہے۔ اس لیے صدقہ کی فضیلت کے بعد سود کی مذمت اور حرمت کا بیان نہایت مناسب ہوا تا کہ سود کی مذمت اور حرمت سے صدقہ کی فضیلت اور پختہ ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ جس درجہ سود میں بُرائی ہے اسی درجہ خیرات میں بھلائی ہے۔ ایک ضد کی قباحت سے دوسری ضد کا حسن و جمال واضح ہوتا ہے۔ نیز صدقہ سے مال ظاہر میں گھٹتا ہے اور حقیقت میں بڑھتا ہے۔ اور سود میں مال ظاہر میں تو بڑھتا ہے اور حقیقت میں گھٹتا ہے۔ نیز گزشتہ آیات میں صدقہ کرنے والوں کا حال بیان فرمایا کہ دنیا اور آخرت میں ان کو خیرات کا عوض اور ثواب ملے گا اور آخرت میں ان کو کسی قسم کا رنج و غم نہ ہوگا۔ اب آئندہ آیات میں سود خواروں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ وہ قبروں سے مدہوش اور وحشت زدہ اٹھیں گے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے حلال اور حرام کو یکساں کر دیا اور سود اور خرید و فروخت کو برابر سمجھا اور ظاہر ہے کہ حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کو یکساں کر دینا مخبوط الحواس آدمی کا کام ہے اس لیے سود خواروں کی سزا یہ تجویز ہوئی کہ قیامت کے دن قبروں سے آسیب زدہ اور مجنوں کی طرح اٹھیں گے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اپنی قبروں سے نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو جنات نے خبطی اور بدحواس بنا دیا ہو لپٹ کر سود خوار مال کے عشق اور خبط میں گرفتار رہا اور اسی خبط اور خیال میں مرا اور اسی خبط کی حالت میں اس کا حشر ہوگا۔ یہ سزا اس لیے تجویز ہوئی کہ یہ سود خوار حلال اور حرام کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور سود کے حلال کرنے کے لیے استدلال میں یہ کہتے ہیں کہ بیع یعنی خرید و فروخت اور سوداگری بھی تو مثل سود کے ہے جس طرح بیع میں زیادتی اور نفع ہوتا ہے اسی طرح سود میں بھی زیادتی اور نفع ہوتا ہے دونوں میں فرق نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ بیع تو جائز ہو اور سود حرام ہو۔

فائدہ: اصل کلام اس طرح تھا کہ انما الربا مثل البیع یعنی سود مثل سوداگری کے ہے لیکن کفار نے حرمت ربوا کی نفی میں مبالغہ کرنے کے لیے اصل کلام کا عکس کر دیا اور یہ کہا ﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ یعنی بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے گویا کہ حلّت یعنی حلال ہونے میں سود اصل ہے اور بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے۔ گویا کہ حلت یعنی حلال ہونے میں سود کے مشابہ ہے۔ غرض یہ کہ ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو حلال سمجھ لیا حالاں کہ بیع اور ربو میں بڑا فرق ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں۔ اور اگر بالفرض والتقدیر کوئی فرق بھی نہ ہوتا تو فرق کے لیے اتنا کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کہ مالک مطلق اور حاکم مطلق ہے اس نے بیع اور تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے اور جب حق تعالیٰ مالک مطلق ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس چیز کو چاہیں حرام کریں۔ کسی کو دریافت کرنے کا بھی حق نہیں۔ ﴿لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ (الانبیاء: ۲۳)

ع اوست سلطاں آں چہ خواہد آں کند

بیع* اور سود میں فرق

بیع میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ مال کے مقابلہ اور عوض میں ہوتی ہے۔ اور سود میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ بلا عوض کے ہوتی ہے۔ مثلاً کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم میں فروخت کیا تو یہ دونوں درہم کپڑے کے عوض اور مقابل سمجھے جائیں گے۔ اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو ایک درہم تو ایک درہم کے مقابلہ میں ہو جائے گا اور دوسرا درہم بلا کسی عوض اور مقابلہ کے ہوگا، کیونکہ سب دراہم ایک جنس ہیں اور کپڑا اور درہم علیحدہ علیحدہ قسم ہیں۔ ہر ایک کا نفع اور ہر ایک کی غرض بھی علیحدہ علیحدہ ہے اس لیے کپڑے اور درہم میں فی نفسہٖ موازنہ اور مقابلہ ناممکن اور محال ہے۔ خرید و فروخت میں مقابلہ حاجت اور ضرورت اور رغبت کا ہوتا ہے۔ کسی کی ضرورت اور رغبت کچھ ہے اور کسی کی کچھ۔ کسی کو ایک درہم کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپیہ کا کپڑا اس کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا اور کسی کو ایک کپڑے کی جس کی قیمت بازار میں ایک درہم ہے اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس درہم کی اس کو اتنی حاجت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر ایسی صورت میں کوئی ایک درہم کے کپڑے کو ایک ہزار درہم میں بھی خریدے تو وہ سود نہ ہوگا یعنی یہ نفع خالی از عوض نہ ہوگا کیونکہ کپڑے اور روپیہ میں فی نفسہٖ تو موازنہ اور مساوات ممکن نہیں اس لیے کہ جنس مختلف ہے۔ لہٰذا معیار اور پیمانہ اپنی اپنی ضرورت اور رغبت ہوگی۔ اور ضرورتوں اور رغبتوں میں بے انتہا تفاوت ہے پس اگر ایک روپیہ کی قیمت کا کپڑا دس روپیہ میں فروخت کیا تو مجموع قیمت کا مجموع مال سے مقابلہ کیا جائے گا اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ نہ ہوگا اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو یہاں مقابلہ مجموعہ کا مجموعہ سے نہ ہوگا بلکہ اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ ہوگا۔ ہم جنس ہونے کی وجہ سے اجزاء میں مساوات اور موازنہ ممکن ہے۔ لہٰذا ایک درہم ایک درہم کے مقابلہ میں ہوگا اور دوسرا درہم خالی از عوض ہو کر سود ہو جائے گا جس کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ بیع میں قابلِ معاوضہ چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے اور ربا اصل قرض پر کچھ زیادہ لینے کو کہتے ہیں جو مہلت اور تاخیر وقت کے عوض میں زیادتی کی جاتی ہے اور تاخیر وقت اور مہلت نہ عقلاً کوئی مال ہے اور نہ عرفاً کوئی ایسی چیز ہے کہ جس پر قبضہ کیا جا سکے اور عوض اور مقابل بن سکے اور جو چیز بلا عوض و بدل حاصل کی جائے وہ باطل اور ناحق ہے۔ پس جس شخص نے بیع اور سود کو برابر قرار دیا اور اُس نے مقابلہ اور معاوضہ میں خبط اور بدحواسی سے کام لیا اس لیے اس کا انجام یہ ہوا کہ سود خوار قبر سے دیوانہ اور مخبوط الحواس بنا کر اٹھایا جائے گا۔ ہر عمل کی جزاء اس کے مناسب ہوتی ہے۔

سود خوار کے استدلال کی ایک مثال:

سود خوار کا اپنے استدلال میں یہ کہنا کہ جس طرح بیع میں نفع اور زیادتی ہوتی ہے اسی طرح سود میں بھی نفع اور زیادتی ہوتی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں اس استدلال کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی یہ کہے کہ جیسے بیوی عورت ہے اسی طرح ماں بھی عورت ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیوی تو حلال ہے اور ماں حرام ہے۔ یا یوں کہے کہ کتّا بھی بکری کی طرح ایک جانور ہے کیا وجہ ہے کہ ایک حلال ہے اور ایک حرام ہے؟

رِبا کی اقسام:

ربا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ربا نسیئۃ اور ایک ربا الفضل۔ ربا نسیئۃ تو وہ سود ہے جو قرض اور ادھار میں ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں

---

* یہ تمام تر قفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی تشریح ہے جس کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر ص ۲۷۳ جلد دوم میں ذکر کیا ہے۔

اسی قسم کا ربوا شائع تھا۔ وہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی کو معیّن میعاد پر قرض دیتا اور اس پر کچھ ماہوار مقرر کر لیتا۔ پھر جب میعاد معیّن پر وہ روپیہ ادا نہ ہوتا تو قرض خواہ اصل میں کچھ اور بڑھا کر اس کو مہلت دے دیتا اور کبھی سود کو اصل میں جمع کر کے اس پر سود لگاتا۔ یہاں تک کہ سود اصل قرض سے اضعافاً مضاعفہ دو چند اور سہ چند اور چہار چند ہو جاتا۔ اور ربا فضل وہ سود ہے کہ جو ایک جنس کی چیزوں میں کمی اور زیادتی کے ساتھ مبادلہ کرنے میں ہو۔

مثلاً: ایک سیر گیہوں کو ڈیڑھ سیر گیہوں کے معاوضہ میں فروخت کیا جائے، یہ ربا فضل ہے۔

آیت قرآنی کا اصل نزول باجماع مفسرین ربا کی قسم اول میں ہوا۔ مگر آیت اپنے عموم کی وجہ سے ربا کی قسم ثانی کو بھی بلاشبہ شامل ہے جس کی تفصیل احادیث متواترہ سے معلوم ہوئی۔ اور مزید تفصیل اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے معلوم ہوئی اور احادیث میں ربا کی جس قدر صورتیں مذکور ہیں آیتِ قرآنی اپنے عموم کی وجہ سے سب کو شامل ہے۔

سُود کے حرام ہونے کی وجہ:

تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ضرورت مند کی اعانت اور امداد عین مروت اور کمالِ انسانیت ہے اور غریب اور فقیر کی ضرورت اور حاجت کو تحصیلِ زر اور حصولِ منفعت کا ذریعہ بنانا کمال دناءت اور غایت خست ہے۔ سوائے بخیلوں اور خود غرضوں کے کسی کا اس مسئلہ میں خلاف نہیں۔

① سود خوار بلا کسی عوض کے اپنے روپیہ سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے جب اصل روپیہ بعینہٖ اور بتمامہٖ واپس آ گیا تو یہ زائد روپیہ کس چیز کا معاوضہ ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ معاوضہ اس مہلت اور تاخیر کا ہے کہ جو قرض خواہ کی طرف سے مقروض کو ملی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ اور مدت کوئی مال نہیں کہ جس کے معاوضہ میں روپیہ لیا جا سکے۔

② نیز سود آدمی کو بے رحم بنا دیتا ہے اور بے ایمانی اور فریب دہی کے عجیب عجیب طریقے اس کے نفس میں القاء کرتا ہے حتیٰ کہ آدمی کو آدمیت سے خارج کر دیتا ہے۔

③ نیز سود سے ملک کی ترقی پر اثر پڑتا ہے اس لیے کہ جب مال دار سود کے ذریعہ سے اپنا مال بڑھائیں گے تو تجارت اور زراعت اور صنعت اور حرفت پر روپیہ نہیں لگائیں گے جس پر ملک کی ترقی کا مدار ہے۔ اس شخص کو بلا مشقت اور بلا محنت اگرچہ فائدہ ہو جائے گا مگر یہ فائدہ انفرادی اور شخصی ہوگا اجتماعی نہ ہوگا۔

④ سود خواری سے صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی اور مروت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

⑤ سود خواری کی وجہ سے مال اور دنیا کی محبت قلب میں اس درجہ راسخ ہو جاتی ہے کہ طمع اور حرص اس کو ہر عیب اور معصیت سے اندھا بنا دیتی ہے۔

⑥ نیز تجارت کا دارومدار باہمی رضامندی پر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ﴾ اور اسی رضامندی کی تکمیل کے لیے شریعت نے خرید و فروخت میں خیار عیب اور خیار شرط اور خیار رؤیت کو مشروع کیا۔

تجارت میں جو شخص مثلاً غلّہ خریدتا ہے تو وہ اپنے کھانے کے لیے یا کاشت کے لیے یا فروخت کرنے کے لیے خریدتا ہے اور یہ

ب حقیقی منافع اور واقعی فوائد ہیں جن کے حصول کے لیے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور بائع اور مشتری کے اختیار اور ان کی رضاء ورغبت سے یہ معاملہ ہوتا ہے اور سود کا جو بھی معاملہ ہوتا ہے وہ مجبوری اور ناگواری کے ساتھ ہوتا ہے جو شخص بھی سو روپیہ لے کر ایک سو دس دینے کا عاملہ کرتا ہے وہ ہرگز ہرگز خوشی سے نہیں کرتا بلکہ مجبوراً اور لاچار ہو کر بصد تلخی وناگواری کرتا ہے اور دل سے یقین رکھتا ہے کہ اس سودی عاملہ سے مجھ کو حقیقی اور واقعی فوائد حاصل نہیں ہوئے آئندہ کے موہوم منافع کی اُمید پر سودی قرض لیتا ہے غرض یہ کہ سود خواری انسانی مدردی اور ترحم کے بھی خلاف ہے اور مصلحت عامہ کے بھی خلاف ہے اور اصول تجارت کے بھی خلاف ہے کہ معاملہ کی بنا مجبوری اور اچاری اور تلخی اور ناگواری پر ہے اس معاملہ میں دل بجائے شادمانی کے پریشانی محسوس کرتا ہے اور اس سودی قرض کو اپنی گردن پر ایک وجھ سمجھتا ہے اور اس کے اظہار سے شرماتا ہے اور اخیر میں پچھتاتا ہے اور اجتماع اور تمدن کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور روحانی اور اخلاقی مفاسد کا ذریعہ ہے جو شریعت کی نگاہ میں نہایت سخت اور بالکل ہی ناقابل درگذر ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام کیا جو کمال ترحم اور کمال مصلحت پر مبنی ہے۔

⑦ نیز سودی کاروبار حکمت کے خلاف ہے اور درہم ودینار کے اصل وضع کے منافی ہے اس بارے میں ہم امام غزالی قدس اللہ سرہٗ کے کلام معرفت التیام کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ جو غایت درجہ لطیف اور لذیذ ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم کی کتاب الشکر ص ۷۹ ج ۴ میں فرماتے ہیں کہ ربا کی حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی روپیہ سے تجارت کر کے نفع اٹھایا جائے اور روپیہ کی روپیہ سے تجارت کرنا اس کی اصل وضع کے خلاف ہے اس لیے کہ درہم ودینار (سونا وچاندی) مقصود بالذات نہیں بلکہ ضروریات زندگی کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اور وسیلہ اور غیر مقصود کو اس کی حد سے نکال کر اس کو مقصود بالذات تک پہنچانا یہ سراسر اس کی وضع کے خلاف ہے جب روپیہ کی روپیہ سے تجارت ہونے لگے تو وسیلہ، وسیلہ نہ رہا بلکہ مقصود بن گیا سونا اور چاندی مقصود بالذات نہیں فقط سونے اور چاندی سے انسان کی زندگی نہیں گزر سکتی جب تک سونے اور چاندی کو کھانے اور پینے اور رہنے سہنے کا ذریعہ نہ بنائے محض سونے اور چاندی سے دنیا کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔ سونا اور چاندی اپنی ذات سے ایک قسم کے پتھر ہیں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے سونے اور چاندی کو ایک میزان (ترازو) بنایا ہے۔ جس سے اشیاء عالم کی قیمتوں کا وزن ہوتا ہے اور یہ سونا اور چاندی خدا کی پیدا کردہ عجیب ترازو ہے جو شخص اس کا مالک ہو گیا وہ دراصل سب چیزوں کا مالک ہو گیا جو چاہے وہ سونے اور چاندی کے ذریعہ خرید سکتا ہے کپڑے سے کھانے کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی اور کھانے سے کپڑے کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی مگر روپیہ سے ہر قسم کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے مگر باایں ہمہ محض سونے اور چاندی کی ذات سے نہ بھوک اور پیاس دفع ہوسکتی ہے اور نہ سردی اور گرمی دور ہوسکتی ہے معلوم ہوا کہ سونا اور چاندی مقصود بالذات نہیں بلکہ ضروریات مقصودہ کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں درہم ودینار۔ نحویوں کے حرف کی طرح ہیں کہ معنی فی نفسہٖ کے لیے وضع نہیں ہوتے بلکہ معنی فی غیرہ کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ آئینہ کی طرح ہیں کہ جس طرح آئینہ دوسری اشیاء کے الوان (رنگتوں) کے دیکھنے کا آلہ ہے خود مقصود نہیں اسی طرح درہم ودینار اشیاء عالم کی قیمتوں اور مرتبوں کے اندازہ کرنے کا ایک آلہ ہے خود مقصود نہیں سونا اور چاندی ظاہر میں سب کچھ ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی نہیں ضرورت کے وقت سوکھی روٹی کا ٹکڑا اور پھٹے ہوئے کپڑے کا چیتھڑا کام دے جاتا ہے مگر سونے کا ٹکڑا کام نہیں دیتا، تندرستی میں غذا مقصود ہے اور بیماری میں دوا مقصود ہے اور سونا اور چاندی اس مقصود کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ اُس کے

ذریعہ اپنی ضروریات زندگی کو حاصل کرو۔ پس جس شخص نے روپیہ کی روپیہ سے تجارت کر کے نفع اٹھایا اُس نے اُس کی اصل وضع کے بالکل خلاف کیا اور بڑا ہی ظلم کیا۔ اور کسی شے کو بے محل رکھنا اور خلاف وضع استعمال کرنے ہی کا نام ظلم ہے۔ (دیکھو احیاء العلوم کتاب الشکر ص ۷۹ ج ۴ اور دیکھو اتحاف شرح احیاء للعلامۃ الزبیدی از ص ۶۳ ج ۹ تا ص ۶۶ ج ۹)

سُود تمام شریعتوں میں حرام رہا ہے:

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سود تمام شریعتوں اور آسمانی دینوں میں حرام رہا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہود کی مذمت میں یہ فرمایا ہے ﴿وَ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ﴾ کہ یہود سود لیتے ہیں حالانکہ توریت میں ان کو سود سے منع کیا گیا تھا۔ (تفسیر قرطبی۔ ص ۳۶۶ ج ۳)

توریت سفر خروج باب ۲۲ درس ۲۵ میں ہے۔

''اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔''

اور علیٰ ہذا انجیل لوقا باب ششم درس ۳۵ میں بغیر سود کے قرض دینے کی ترغیب مذکور ہے۔

سود ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ تنزّل کا ذریعہ ہے:

لوگوں کی زبان پر ہے کہ مسلمان مٹتے جاتے ہیں حالانکہ سود خواری مسلمانوں میں بڑھ رہی ہے اور دن بدن تنزل ہے۔ مسلمانوں کا جو ترقی کا زمانہ گذرا ہے اس میں سود کا نام ونشان نہ تھا باقی مغربی اقوام کی ترقی ان کی صنعت اور حرفت کی وجہ سے ہے نہ کہ سود کی وجہ سے بارہ سو سال تک مسلمانوں کی سلطنت عروج اور اور ترقی پر رہی اور کبھی سود کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی جب سے مسلمان امیروں اور وزیروں نے دین سے منہ موڑا اور عیش ونشاط اور رقص وسرود میں مبتلا ہوئے تب سے زوال شروع ہوا اور پھر ہوا جو ہوا۔

رہا یہ سوال کہ اس زمانہ میں بغیر سود کے کام کیسے چلے؟ جواب یہ ہے کہ جیسے پہلے چلتا تھا اور خوب چلتا تھا۔ رشوت خوار بھی رشوت کے جواز کے لیے یہی دلیل پیش کر دیتے ہیں کہ بغیر رشوت کے کام نہیں چلتا۔

پس جس کو پہنچ گئی نصیحت اس کے پروردگار کی جانب سے یعنی ربٰوا کی حرمت اور اس کی ممنوعیت اس کو پہنچ گئی پس باز آ گیا اس فعل حرام اور قول کفر سے یعنی سود لینا بھی چھوڑ دیا اور ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ کہنا بھی چھوڑ دیا، تو اس کے لیے ہے جو کچھ اس حکم کے آنے سے پہلے لے چکا ہے۔ یعنی سود حرام ہونے سے پہلے جس قدر لے چکا ہے وہ اس سے واپس نہ لیا جائے گا وہ سب اس کی ملک ہے اور نہ اس پر عند اللہ کوئی مواخذہ ہوگا اور دل کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر صدق نیّت سے باز آیا ہے تو اللہ اس کی جزاء دے گا۔ اور اگر کسی دنیاوی مصلحت اور ظاہر داری کی بنا پر توبہ کی ہے تو اس کے مطابق معاملہ ہوگا۔

اور جو شخص اس نصیحت کے بعد پھر اُسی فعل حرام اور قول کفر کی طرف رجوع کرے یعنی حکم تحریم کے بعد بھی سود سے باز نہ آئے بلکہ سود لیتا رہے اور حسب سابق ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ کہتا رہے یعنی سود کے حلال ثابت کرنے کے لیے تقریر کرتا رہے یا مضمون لکھتا رہے تو ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ کیونکہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے جو دوزخ میں ہمیشہ رہنے کا باعث ہے۔

اور سود میں اگرچہ فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے لیکن مآل اور انجام اس کی تباہی اور بربادی ہے۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ کی عادت یہ ہے کہ سود کو مٹاتے ہیں اس میں برکت نہیں ہوتی۔ سود خوار پر کبھی تو دنیا ہی میں بربادی آ جاتی ہے۔ اور اگر دنیا میں اللہ نے ڈھیل دی تو آخرت میں تو تباہی اور بربادی یقینی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ ﴿یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا﴾ کے معنی یہ ہیں کہ سود کے مال میں سے نہ کوئی صدقہ اور خیرات مقبول ہے اور نہ حج اور جہاد اور کوئی صلہ رحمی مقبول ہے۔ یہ دنیا کی بربادی ہوئی کہ سود کے روپیہ کا کوئی عمل مقبول نہ ہوا۔ اور اہل عقل کی نظر میں بھی حرام مال کے ہدیہ کی کوئی وقعت اور قیمت نہیں۔ اور خداوندِ قدوس کے یہاں اگر پاک اور حلال بھی قبول ہو جائے تو اس کا فضل اور احسان ہے۔

اور صدقہ اور خیرات میں اگرچہ مال گھٹتا ہے۔ لیکن حقیقت میں مال بڑھتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ صدقات اور خیرات کو بڑھاتا ہے صدقہ اور خیرات سے جس قدر نکلتا ہے اس سے کہیں زائد اللہ اس میں برکت دے دیتا ہے۔ غافل مال کی ظاہری کثرت کو دیکھتا ہے اور عاقل اور دانا مال کی باطنی طہارت اور نظافت کو دیکھتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ ۚ﴾ (المائدہ:۱۰۰)

ترجمہ: "آپ کہہ دیجیے کہ پاک اور ناپاک برابر نہیں ہوتے۔ اگرچہ (اے نادان) تجھ کو ناپاک کی کثرت اچھی معلوم ہو۔"

ایک پرہیز گار ملازم اپنے سو روپیہ پر قناعت کرتا ہے اور دوسرا سو روپیہ کا رشوت خوار ملازم ایک مہینہ میں سو کے ایک ہزار کر لیتا ہے۔ اوّل کے سو عطر اور گلاب ہیں اور وہ دوسرے کے ایک ہزار پیشاب ہیں۔

صدقہ اور خیرات کی مثال مسہل کی سی ہے کہ مسہل سے بدن دبلا اور پتلا تو ہو جاتا ہے مگر طبیب اور ڈاکٹر جانتا ہے کہ یہ تندرستی ہے۔ بدن سے فاسد مادہ نکل گیا۔ اور سود اور رشوت کی مثال ورم کی سی ہے اگر کسی کے منہ اور ہاتھ اور پیروں پر ورم آ جائے تو نادان اس کو مُٹاپا سمجھتا ہے اور طبیب اور ڈاکٹر اس ورم کو دیکھ کر پیغامِ موت سمجھتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گنہگار سے راضی نہیں جو گناہوں میں منہمک ہو۔ اس سود خوار کی اس سے بڑھ کر کیا ناشکری ہوگی کہ خدا نے اس کو مال دیا اور مال دار ہونے کے باوجود اس سے اتنا نہ ہوا کہ اس نعمت کے شکر میں کسی محتاج کو کچھ صدقہ اور خیرات دے دیتا۔ اور اگر صدقہ اور خیرات پر اس کا دل آمادہ نہ ہوا تھا تو کم از کم بلا سود کے اس کو قرض ہی دے دیتا بھلا اس سے بڑھ کر خدا کی نعمت کی کیا ناشکری ہوگی۔ ایسے ناسپاسوں اور ناشکروں کے مال میں اللہ برکت نہیں دیتا۔ اور صدقات اور خیرات میں جو خیر و برکت ہوتی ہے وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا ثمرہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: تحقیق جو لوگ ایمان لائے یعنی اللہ کے تمام احکام کو مانا اور جس چیز کو خدا نے حلال اور حرام کیا اسی کے مطابق اس کو حلال اور حرام سمجھا اور نیک عمل کئے اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ ادا کی ایسے لوگوں کے مال میں اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے۔ ان کو اپنے اعمال اور خیرات کا بدلہ اور ثواب ملے گا اپنے پروردگار کے پاس یعنی آخرت میں اور قیامت کے دن ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ یہ لوگ غمگین ہوں گے۔ بخلاف ان لوگوں کے کہ جنہوں نے حلال اور حرام میں فرق نہ کیا تھا وہ طرح طرح کی مصیبتوں اور بلاؤں میں گرفتار ہوں گے۔ اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کو ایک نہ بناؤ اور جو سود تمہارا لوگوں کے ذمہ بقایا رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہو۔ یعنی ممانعت سے پہلے جو سود لے چکے وہ لے چکے اب ممانعت کے بعد جو سود بقایا رہ گیا ہے اس کے لینے اور مانگنے کی اجازت نہیں۔ ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جس چیز کی ممانعت کر دی جائے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ پس اگر تم اس حکم کے بعد ایسا نہ کرو یعنی بقایا سود کو نہ چھوڑو تو خبردار ہو جاؤ تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑنے کو یعنی اگر تم اس حکم پر عمل نہ کرو تو سمجھ لو کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے وفاداروں کی

فہرست سے تمہارا نام کٹ گیا اور خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمہاری گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے اور گرفتاری کے بعد تم کو حسبِ قواعدِ شریعت اور حسبِ احکام قتل کیا جائے گا یا قید میں رکھا جائے گا اور اسلامی عدالت ان احکام کو تم پر جاری کرے گی۔ اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو تمہارے اصل مال اور اصل رقم تم کو مل جائے گی اس حکم کے بعد نہ تم کسی پر ظلم اور زیادتی کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم اور زیادتی کی جائے۔ یعنی جو سود تم پہلے لے چکے ہو اگر اس کو تمہارے اصل مال میں محسوب کر لیا جائے تو وہ تم پر ظلم ہے۔ اور ممانعت کے بعد جو سود چڑھا ہے وہ اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے اور تمہارا قرض دار اگر مفلس اور تنگ دست ہے تو اس کو فراخی کے زمانہ تک مہلت دینی چاہیے اور اگر تم اس کو بالکل معاف کر دو تو تمہارا یہ صدقہ کرنا تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہوگا سود تو کیا لیتے اصل ہی معاف کر دیا۔ اگر تم جانتے ہو کہ مہلت دینے اور صدقہ کر دینے اور معاف کر دینے میں کیا فضیلت ہے۔ جس فضیلت کو تم حاصل کر سکو اس میں دریغ نہ کرو اور اس دن کی پیشی سے ڈرتے رہو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی پوری پوری جزاء ملے گی اور ان پر کسی قسم کا ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ لہٰذا جو شخص دنیا میں مقروض کے ساتھ چشم پوشی اور نرمی کا معاملہ کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ساتھ اپنے حقوق میں چشم پوشی اور نرمی فرمائیں گے۔

فوائد ولطائف

① جو شخص سود کو حلال سمجھے وہ باجماع اُمت کافر اور مرتد ہے۔ اور اگر سود کو حلال تو نہیں سمجھتا مگر چھوڑتا بھی نہیں تو بادشاہِ اسلام کے ذمہ ایسے شخص کا قید کرنا واجب ہے۔ یہاں تک کہ توبہ کرے اور اگر کوئی اس قسم کی جماعت اور جتھا ہے جن کا قید کرنا مشکل ہے تو بادشاہ اسلام کے ذمہ ایسی جماعت سے جہاد اور قتال واجب ہے۔ اور یہی حکم ہے ہر اس شخص کا جو فرائض کو چھوڑ دے۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کو یا علی الاعلان گناہ کبیر کا مرتکب ہو اور اس پر اَڑا رہے۔ (تفصیل کے لیے ابوبکر رازی جصاص کی احکام القرآن ص ۴۷۳ ج ۱۔ کی مراجعت کریں یا تفسیر مظہری دیکھیں)۔

② قال جعفر الصادق رحمہ اللہ تعالیٰ حرم اللہ الربا لیتقارض الناس.

ترجمہ: "امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو اس لیے حرام فرمایا تا کہ قرض سے ایک دوسرے کی مدد کریں۔"

((وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرضٌ مرّتین یعدل صدقة مرة اخرجه البزار)).

ترجمہ: "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی کو دو مرتبہ قرض دینا ایک مرتبہ صدقہ دینے کے برابر ہے۔" (تفسیر قرطبی ص ۲۵۹ ج ۳)

③ حرام مال سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ سود اور رشوت کا جو پیسہ اس کے پاس ہے وہ صاحبِ حق کو واپس کرے یا اس سے معاف کرائے۔ اور اگر اُس شخص کو نہ تلاش کر سکے اور نہ کہیں اس کو پا سکے تو اس کی طرف سے خیرات کرے اور ایسے مصرف میں اس کو خرچ کرے جس میں اسلام اور مسلمانوں کا نفع اور فائدہ ہو۔ اور اگر کسی کی کل آمدنی حرام ہو تو سب کا خیرات کرنا واجب اور فرض ہے۔ سوائے سترِ عورت کے کپڑے کے کسی شے کا اپنی مِلک میں رکھنا جائز نہیں۔ جو کیا ہے اس کو بھگتنا پڑے گا۔ تفصیل کے لیے تفسیر قرطبی ص ۳۶۶ ج ۳ کی مراجعت کریں۔

) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ حرام مال پر زکوٰۃ نہیں ،لہٰذا جس شخص کے پاس سود یا رشوت کا کروڑ روپیہ بھی جمع ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔زکوٰۃ حلال مال پر واجب ہوتی ہے۔جو مال سود یا رشوت یا خیانت یا چوری سے حاصل کیا جائے وہ دوسروں کا حق ہے اس پر زکوٰۃ کیسے واجب ہو؟

جو شخص حرام مال کا صدقہ کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے تو اندیشہ کفر کا ہے۔بارگاہ خداوندی میں ناپاک اور گندی چیز ں کرنا اور پھر اس پر اس کی رضا اور خوشنودی کی اُمید رکھنا کمال بے ادبی اور گستاخی ہے۔

) احکام ربّو کو ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ پر ختم فرمایا تا کہ دنیا اور مافیہا کا فناء اور زوال اور آخرت کی طرف سب کا رجوع کرنا اور ذرہ ذرہ کا حساب ہونا نظروں میں گھوم جائے اور دنیا کے حریص اور دلدادہ ہوش میں آ جائیں۔دنیا کے مخبوط الحواس کا علاج سوائے آخرت کی یاد کے کچھ نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

اے ایمان والو! جس وقت معاملت کرو اُدھار کی کسی وعدہ مقررہ تک، تو اس کو

فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ

لکھو اور چاہئے لکھ دے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے ، اور نہ کنارہ کرے لکھنے والا

اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَ

اس سے کہ لکھ دیوے جیسا سکھایا اس کو اللہ نے سو وہ لکھے اور بتادے جس پر حق دینا ہے اور

لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ

ڈرے اللہ سے جو رب ہے اس کا اور ناقص نہ کرے اس میں سے کچھ پر اگر جس شخص پر

الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ

دینا آیا بے عقل ہے، یا ضعیف ہے یا آپ نہیں بتا سکتا تو بتا دے اُس کا

وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ

اختیار والا انصاف سے اور شاہد کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے پھر اگر

لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ

نہ ہوں دو مرد، تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو پسند رکھتے ہو شاہدوں میں

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا يَاْبَ

کہ بھول جاوے ایک عورت تو یاد دلا دے اس کو وہ دوسری، اور کنارہ نہ کریں

الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا

شاہد جس سقت بلائے جاویں اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے چھوٹا ہو یا بڑا،

اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا

اس کے وعدہ تک اس میں خوب انصاف ہے اللہ کے ہاں اور درست رہتی ہے گواہی اور لگتا کہ تم

تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ

کو شبہ نہ پڑے، مگر ایسا کہ سودا ہو رو برو کا پھر بدل کرتے ہو آپس میں

عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَ لَا يُضَآرَّ

تو گناہ نہیں تم پر کہ نہ لکھو اس کو، اور شاہد کر لو جب سودا کرو اور نقصان نہ کیا جاوے

كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

لکھنے والا نہ شاہد اور اگر ایسا کرو، تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر اور ڈرتے رہو اللہ سے

وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ

اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ سب چیز سے واقف ہے اور اگر تم سفر میں ہو

وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

اور نہ پاؤ لکھنے والا تو گرو ہاتھ میں رکھنی پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا

فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا

تو چاہیے پورا کرے جس پر اعتبار کیا اپنے اعتبار کو اور ڈرتا رہے اللہ سے جو رب ہے اس کا اور نہ چھپاؤ

الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا

گواہی کو اور جو کوئی وہ چھپاوے تو گنہ گار ہے دل اس کا ، اور اللہ تمہارے

ع ۳۹ ۲ ۷

تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع

کام سے واقف ہے۔

احکام قرض ورہن

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ ... الٰى ... وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع﴾

ربط: حق تعالیٰ نے صدقہ اور خیرات کے فضائل کے بعد سود کی مذمت بیان فرمائی اور چونکہ سود کی ضرورت اکثر قرض اور اُدھار کی حالت میں پیش آتی ہے اس لیے سود کے بعد قرض اور ادھار کے احکام بیان فرماتے ہیں تا کہ سود سے بچ جائیں اور مال بھی محفوظ رہے۔ نیز صدقہ اور ربا اور دَین تینوں مالی معاملات میں پہلا محض رحمت ہے اور اقتضائے شفقت ہے اور دوسرا محض ظلم ہے اور مقتضائے حرص وہوا ہے اور تیسرا محض عدل اور انصاف ہے اور مقتضائے مروت ہے اس لیے آئندہ آیات میں دَین کے احکام بیان کیے تا کہ حاجت مند کی ضرورت پوری ہو جائے اور قرض دینے والے کا مال ضائع اور تلف ہو جانے سے محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اے ایمان والو! جب تم کسی سے ایک معین مدت تک اُدھار کا معاملہ کیا کرو خواہ قیمت ادھار ہو یا وہ چیز ادھار ہو، جس کا خریدنا مقصود ہے۔ جیسے بیع سلم میں تو اس کو لکھ لیا کرو، تا کہ آئندہ کسی قسم کا جھگڑا پیش نہ آئے۔ جمہور فقہا کے نزدیک یہ امر استحباب کے لیے ہے۔ لہٰذا اگر نہ لکھے تو کوئی حرج نہیں۔ بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ امر وجوبی ہے۔

فائدہ: بیع کی چار قسمیں ہیں: ① بیع الدَّیْنِ بالدَّیْن یعنی مبیع اور قیمت دونوں اُدھار ہو۔ یعنی ادھار کو ادھار کے بدلہ میں فروخت کرنا یہ بیع بالاجماع باطل ہے

② بیع العین بالدَّیْن یعنی مبیع نقد ہو اور قیمت اُدھار ہو۔ یہ صورت بالاجماع جائز ہے۔

③ بیع الدین بالعین یعنی قیمت نقد ہو اور بیع ادھار ہو۔ اسی کو بیع سَلَم کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں [1] کہ یہ آیت خاص طور پر بیع سلم کی اجازت کے لیے نازل ہوئی۔ مگر بیع سلم کے لیے یہ شرط ہے کہ معاملہ کے وقت مدت اور بیع کی نوع اور قسم اور اُس کی مقدار اور نرخ سب مقرر کر لیا جائے تا کہ بعد میں کوئی نزاع پیش نہ آئے۔

④ بیع العین بالعین یعنی بیع اور قیمت دونوں نقد ہوں۔ حق جل شانہٗ نے بیع کی اس قسم کا آئندہ آیت میں تجارت حاضرہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا﴾ جس کا حکم یہ فرمایا کہ تجارۃ حاضرہ میں بیع سلم کی طرح دستاویز لکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ دو گواہوں کی گواہی کرا لینی چاہیے کہ کوئی لکھنے والا تمہارے درمیان یہ دستاویز نہایت انصاف سے لکھے کہ نہ اس میں کوئی کمی کرے اور نہ زیادتی اور نہ کسی کی رعایت کرے۔ اور جو شخص لکھنا جانتا ہو اُس کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو لکھنا سکھایا۔ پس اس نعمت کے شکریہ میں

---

[1] قال ابن عباس رضی اللہ عنہما ھذہ الآیت نزلت فی السلم خاصۃ کذا فی تفسیر القرطبی ص ۳۷۷ ج ۳.

چاہیے کہ دوسروں کو اپنی کتابت سے نفع پہنچائے۔ احسن کما احسن اللہ الیک۔ لہٰذا اور جو شخص اُس سے وثیقہ اور دستاویز لکھوانا چاہے، تو اس کاتب کو چاہیے کہ لکھ دے۔ اور اس دستاویز اور وثیقہ کا املاء وہ شخص کرائے کہ جس کے ذمہ حق واجب ہے۔ یعنی جس کے ذمہ دَین اور قرض ہے وہ خود لکھوائے تا کہ اس کا اقرار آئندہ خود اس پر حجت ہو۔ بخلاف قرض خواہ کے کہ اس کے قول کا اعتبار نہیں، جب تک خود قرض دار یعنی مقروض اور مدیون اقرار نہ کرے یا ثبوت شرعی کے بعد حاکم حکم نہ کرے اور چاہیے کہ لکھوانے والا یا لکھنے والا اپنے پروردگار سے ڈرے اور لکھوانے اور لکھنے میں حق سے ذرہ برابر کمی نہ کرے یعنی ٹھیک ٹھیک لکھے۔ پس اگر وہ شخص جس پر حق واجب ہے یعنی جس کے ذمہ دینا آتا ہے وہ کم عقل ہو۔ یعنی دیوانہ یا دل چلا ہو کہ اندھا دھند خرچ کرتا ہو اور انجام نہ سوچتا ہو، جیسے مُبذّر (بے جا صرف کرنے والا) یا ضعیف البدن ہو یعنی کم عمر ہو یا بہت بوڑھا ہو کہ اس کی عقل میں فتور آ گیا ہو یا کسی اور وجہ سے خود نہ لکھوا سکتا ہو مثلاً: گونگا ہو یا زبان نہ جانا ہو یا قید میں ہو یا بیمار زیادہ ہو یا ایسی جگہ ہو کہ جہاں کاتب نہ ہو یا پردہ نشین عورت ہو کہ وہ کاتب کے سامنے نہیں آ سکتی، تو ایسے حالات میں اس کا مختار اور کارگذار ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوا دے اور لکھوانے اور معاملہ کے قلمبند ہو جانے کے بعد احتیاطاً اپنے مردوں میں سے دو گواہ بھی بنا لو یعنی دو آزاد مسلمان بالغوں کو گواہ بناؤ۔ غلام اور کافر اور بچہ کو گواہ نہ بناؤ۔ کیونکہ جب کتابت کے ساتھ شہادت بھی مل جائے گی تو نزاع اور مخاصمت کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے گا اور اگر گواہی کے لیے دو مرد میسّر نہ آئیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہی کے لیے کافی ہیں۔ بشرطیکہ یہ سب ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم گواہ بنانے کے لیے پسند کرتے ہو۔ یعنی ثقہ اور امین ہوں۔ فسق و فجور اور بے مروتی سے متہم نہ ہوں اور نہ دونوں میں کوئی ایسی قرابت ہو جو کہ شُبہ اور تہمت کا باعث ہو۔ اور ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کا ہونا اس لیے شرط کیا گیا کہ شاید ایک عورت اپنی فطری غفلت اور ذاتی قصور عقلی کی وجہ سے واقعہ شہادت کے کسی جزء کو بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔ اور اس طرح شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے۔

حضرت مولانا قاسم صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں: عجب نہیں کہ مجموعہ بنی آدم میں من اوّلھم الیٰ آخرھم دو تہائی عورتیں اور ایک تہائی مرد ہوں اور حکم ازلی نے باعتبار جہت تقابل کے بھی وہی حساب للذکر مثل حظ الانثیین بٹھا کر ایک مرد کو دو عورتوں کے مقابل رکھا ہو اور گواہوں * کو جب گواہی دینے کے لیے یا گواہ بنانے کے لیے بلایا جائے تو ان کو چاہئے کہ انکار نہ کریں۔ کیونکہ گواہ بننے میں اپنے بھائی کے حق کی حفاظت اور اعانت ہے اور گواہ بننے کے بعد گواہی نہ دینے میں اپنے بھائی کی حق تلفی ہے۔ اور حق کے لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ خواہ وہ حق چھوٹا ہو یا بڑا۔ شروع وقت سے لے کر اخیر میعاد تک اس کو لکھ لیا کرو۔ یہی بات اللہ کے نزدیک نہایت منصفانہ اور عادلانہ ہے اور نیز شہادت کے قائم اور محفوظ رکھنے میں نہایت معین اور مددگار ہے نیز اس بات کے بہت قریب ہے کہ تم گواہی دینے کے وقت کسی شک اور شبہ میں نہ پڑو۔ نہ قرض کی مقدار میں اور نہ اس کی جنس اور نوع میں اور نہ اُس کی مدّت وغیرہ میں۔ ان وجوہ کی بناء پر ہر حالت میں لکھ لینا نہایت بہتر ہے۔ مگر اس وقت کہ جب معاملہ دست بدست ہو جس کا تم آپس میں نقد لین دین کر رہے ہو۔ بیع بھی نقد ہو اور دام بھی نقد ہو۔ تو ایسی صورت میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اس معاملہ کو نہ لکھو کیونکہ جب معاملہ نقد ہے اور بیع اور قیمت کوئی شے ادھار نہیں، تو ایسی صورت میں بظاہر کسی نزاع اور خصومت کا احتمال بعید ہے اس لیے لکھنے کی ضرورت نہیں ولیکن مستحب یہ ہے کہ جب کبھی

---

* قال الحسن جمعت بذہ الآیۃ ﴿ای وَلَا یَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا﴾ امرین و ھما ان لاتابی اذا دعیت الی تحصیل الشھادۃ ولا اذا دعیت الی ادائھا قال ابن عباس رضی اللہ عنھما ۱۲۔ (تفسیر قرطبی ص ۳۹۸ ج ۳)

تم کوئی خرید وفروخت کیا کرو تو احتیاطاً گواہ بنالیا کرو۔ اگرچہ عوضین نقد ہوں، یعنی اگرچہ سودا دست بدست ہو۔ تب بھی یہی بہتر ہے کہ اس پر گواہ بنالیے جائیں تاکہ نزاع اور خصومت کا بالکلیہ سدّ باب ہوجائے اور جس طرح ہم نے کاتب اور شاہد کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کرے، اسی طرح تم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ لکھنے والے اور گواہ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ مثلاً کاتب اور شاہد اپنے کسی ضروری کام میں مشغول ہوں یا بیمار اور ناطاقت ہوں ایسی حالت میں ان کو لکھنے اور گواہی دینے کی تکلیف نہ دی جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو سمجھ لو کہ یہ تمہارے لیے اللہ کی اطاعت سے خروج کرنا ہوگا، جو کسی طرح تمہارے لیے لائق نہیں اور تم کو چاہیے کہ ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہو کہ کہیں اطاعت سے نکلنے پر پکڑ نہ ہوجائے۔ اور تم اللہ کی اطاعت سے کیسے خارج ہوتے ہو اور اللہ تو تم کو دین اور دُنیا کی مصلحتیں سکھاتا اور بتاتا رہتا ہے۔ لہٰذا تم کو اللہ کی اطاعت سے خارج نہ ہونا چاہئے اور اگر کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے جو حکم دے اس کی اطاعت کرو خواہ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ پہلے جملہ میں تقویٰ کی ترغیب دی اور دوسرے جملہ میں اپنی نعمتِ تعلیم کو ذکر فرمایا اور اس تیسرے جملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمتِ شان کو بیان فرمایا۔ اور اگر سفر کی حالت میں قرض اور ادھار کا معاملہ کرو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی لکھنے والا تم کو میسر نہ آئے تو تم کو لازم ہے کہ جس کا تم نے قرض اور اُدھار لیا ہے، قرض کے عوض میں کوئی شے اس کے پاس رہن رکھ دو کہ جو اُس کے قبضہ میں دے دی جائے۔

فائدہ ①: سفر کی قید احترازی نہیں کہ قیام کی حالت میں رہن جائز نہ ہو بلکہ اس وجہ سے ہے کہ بہ نسبت حضر کے سفر میں رہن کی زیادہ حاجت پیش آتی ہے اس لیے آیت میں سفر کا خاص طور پر ذکر فرمایا، ورنہ رہن سفر اور حضر دونوں حالتوں میں بالاجماع جائز ہے اور یہ رہن رکھنے کا حکم اس وقت ہے کہ جب ایک کو دوسرے پر اطمینان نہ ہو اور اگر ایک کو دوسرے پر اطمینان ہو اور ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو۔ اور رہن اور لکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتا ہو۔ پس اُس شخص کو چاہیے کہ جس کا اعتبار کیا گیا اور بلا رہن اور بلا لکھے اُس کو قرض دے دیا گیا وہ اپنی امانت یعنی اپنے قرضہ کو پورا پورا ادا کردے۔ یعنی جس نے اُس کا اعتبار کیا ہے، اُس کا حق پورا پورا ادا کردے۔

فائدہ ②: امانت سے قرضہ مراد ہے۔ قرضہ کو امانت سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ مامون ہونے کی وجہ سے بغیر تحریر اور بغیر رہن کے اس کو قرض دے دیا۔ اور اُس کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرے کہ نہ خیانت کرے اور نہ حق کا انکار کرے۔ اور اے گواہو! جس وقت تمہاری شہادت کی ضرورت ہو اور بغیر تمہاری شہادت دیئے کسی کے حق کے ضائع اور تلف ہونے کا اندیشہ ہو، خصوصاً جس وقت بغیر کسی رہن اور بغیر کسی تحریر کے کسی کو کوئی قرض دیا گیا ہو، تو اس وقت تم اپنی شہادت کو مت چھپانا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شہادت کو دل میں چھپا کر رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت زبان سے اُس کو ظاہر نہیں کرتا تو بلاشبہ اس کا قلب بالذات اور بلا واسطہ گنہگار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کتمانِ شہادت بلا واسطہ قلب کا فعل ہے جس میں کسی عضو اور جارحہ کو بالکل دخل نہیں اور قلب چونکہ رئیس الاعضاء ہے، اس لیے اُس کی معصیت بھی رأس المعاصی ہوگی۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اولادِ آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جس وقت تک وہ درست رہتا ہے، تو سارا بدن درست رہتا ہے، اور جب وہ خراب ہوجاتا ہے تو سارا بدن خراب ہوجاتا ہے۔ اور یاد رکھو کہ وہ ٹکڑا ''دل'' ہے۔ (بخاری ومسلم)

اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے آگاہ اور واقف ہے، تمہارے گواہی دینے اور نہ دینے اور شہادت کے چھپانے اور ظاہر

کرنے کو بھی بخوبی جانتا ہے۔ جو شہادت تم نے دل میں چھپائی ہے اگرچہ لوگوں کو اس کا علم نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔

مسئلہ ① : ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ﴾ میں گواہ بنانے کا حکم استحبابی ہے۔

مسئلہ ② : سوائے شہادت زنا کے ہر امر کی شہادت کے لیے دو ثقہ آدمیوں کی گواہی کافی ہے۔ البتہ زنا کی شہادت کے لیے چار مردوں کی گواہی ضروری ہے کیونکہ زنا کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے اس لیے چار آدمیوں کی گواہی ضروری ہوئی کہ گویا دو گواہ مرد کے زنا کے لیے اور دو گواہ عورت کے زنا کے لیے۔ نیز شریعت کا مقصود پردہ پوشی بھی مطلوب ہے۔

مسئلہ ③ : پھر سوائے زنا کے حدود اور قصاص میں دو مردوں کی گواہی کافی ہے مگر شرط یہ ہے کہ کوئی گواہ عورت نہ ہو۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں زہری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: ((مضت السنة من لدن رسول الله ﷺ والخليفتين بعده ان لا شهادة للنسا فى الحدود)). یعنی نبی کریم ﷺ اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ سے یہ سنت جاری ہے کہ حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

مسئلہ ④ : باقی ان کے سوا اور تمام عملات میں خواہ مالی ہوں یا غیر مالی دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اللہ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ اور اگر کھولو گے اپنے جی کی بات

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ

یا چھپاؤ گے حساب لے گا تم سے اللہ پھر بخشے گا جس کو چاہے، اور عذاب کر گا

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ

جس کو چاہے، اور اللہ سب چیز پر قادر ہے۔ مانا رسول نے جو کچھ اترا

اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

اس کو اس کے ربّ کی طرف سے اور مسلمانوں نے سب نے مانا اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو، اور کتابوں کو

وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ

اور رسولوں کو ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے رسولوں میں اور بولے ہم نے سنا اور قبول کیا،

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ

تیری بخشش چاہیے اے ربّ ہمارے! اور تجھی تک رجوع ہے اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو مگر جو اس کی گنجائش ہے

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ

اسی کو ملتا ہے جو کمایا اور اُسی پر پڑتا ہے جو کیا، اے ربّ ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں

اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ

یا چوکیں، اے ربّ ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا تُو نے

مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وقفة

اگلوں پر اے ربّ ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے جس کی طاقت نہیں ہم کو اور درگذر کر ہم سے

وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وقفة وَارْحَمْنَا ۟ وقفة اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع ۴۰ ع ۳ ۸

اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر تو ہمارا صاحب ہے، مدد کر ہماری قوم کافر پر۔

خاتمہ سورۃ

مشتمل بر تذکیر جلالِ خداوندی وعظمت وتحذیر از محاسبہ آخرت وتلقین ایمان وسمع وطاعت تعلیم دعاء فلاح، دارین، در آخرت عفو ومغفرت ودُنیا فتح ونصرت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ ... اِلٰى ... فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع﴾

ربط : یہ رکوع، سورۂ بقرہ کا آخری رکوع ہے جس پر سورۂ بقرہ ختم ہو رہی ہے۔ یہ عجیب خاتمہ ہے جس کو اوّل سورت سے بھی خاص ربط ہے اور آخر سورت سے بھی اور درمیان سورت سے بھی اور مجموعۂ سورت سے بھی۔

ان آیات سے پہلے جو آیتیں گذریں ان میں کتمان شہادت کو دل کا گناہ بتلایا تھا۔ اب ان آیات میں اس امر کو بیان فرماتے ہیں کہ قلب کے کن افعال پر مؤاخذہ ہے اور کن پر نہیں۔ نیز گزشتہ آیات میں یہ حکم دیا تھا کہ امانت میں خیانت نہ کرو اور اللہ کا خوف دل میں رکھو اور اُس کے عذاب اور مؤاخذہ سے ڈرتے رہو۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور اس کی قدرت اور اُس کے محاسبہ اور مؤاخذہ کو بیان فرماتے ہیں۔ اور ابتداء سورت سے یہ مناسبت ہے کہ ابتداء سورت میں متقین کی صفات کا ذکر تھا کہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ اور ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ سب کی بلا تفریق کے تصدیق کرتے ہیں اور آخرت کا خاص طور پر یقین رکھتے ہیں اور عبادات بدنیہ اور مالیہ کو دل وجان سے بجالاتے ہیں۔ اب اس سورت کے آخری رکوع میں پھر انہی متقین کی مدح ہے۔ اور اُن کی سمع وطاعت اور بارگاہِ خداوندی میں اُن کی والہانہ دعا اور مناجات کا تذکرہ ہے۔ نیز ابتداء سورت میں ایمان بالغیب کا ذکر تھا کہ یہ پرہیزگاروں کا گروہ محض خدا اور رسول ﷺ کے اعتماد پر بے دیکھی چیزوں پر ایمان رکھتا ہے۔ مگر اس میں غیب کی تفسیر مذکور نہ تھی کہ غیب

سے کون کون سی چیزیں مراد تھیں۔ اب اس آخری رکوع میں اُس غیب کی تفسیر کی طرف اشارہ فرمایا کہ غیب سے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور اُس کے نازل فرمودہ صحیفے اور کتابیں اور تمام پیغمبر مراد ہیں۔ گویا کہ ﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ ... الخ﴾ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کی تفسیر ہے۔ یعنی ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ میں لفظ غیب سے ان چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں اس کی توضیح گذر چکی ہے دوبارہ وہاں دیکھ لیا جائے اور ﴿قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ یہ لفظ ﴿يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کی تفسیر ہے اور ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ اور ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ ... الخ﴾ یعنی معافی اور مغفرت اور رحمت کی درخواست یہ سب ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ کی تفسیر ہے اور ایمان اور تقویٰ کے ساتھ قوم کافرین پر فتح اور نصرت۔ یہ ہدایت بھی ہے اور دینی اور دنیوی فلاح اور کامیابی بھی ہے گویا کہ یہ مضمون ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ کی تفسیر ہے۔ اور یہی مضمون درمیانِ سورت بیان کیا گیا تھا۔ یعنی ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ ... الخ﴾ میں یہی مضمون تھا جو اس آخری رکوع میں مذکور ہے۔ غرض یہ کہ سورت کی ابتدا بھی مسئلہ ایمان کی تحقیق اور متقین کی مدح سے ہوئی اور اس کی انتہا بھی اسی مضمون پر ہوئی اور وسط میں بھی ایک عجیب عنوان سے اسی مسئلہ کو بیان فرمایا اور یہ بلاغت کی انتہا ہے کہ ابتداء سے لے کر انتہا تک کلام یکساں ہو۔ اوّل اور آخر اور اوسط سب ایک دوسرے سے مرتبط اور متناسب ہوں۔

اور اسی سورت کا دل آیت الکرسی ہے جس میں حق جل شانہٗ کی صفت حیات اور قیومیت کا بیان تھا اور مومن کی باطنی اور روحانی حیات اور قیومیت کا دارومدار ایمان اور اطاعت پر ہے جس کا اس رکوع میں تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔

اور مجموعۂ سورت کے ساتھ یہ ربط ہے کہ یہ سورت معاش اور معاد کے متعلق ہمیشہ ہمہ قسم کے احکام پر مشتمل ہے اس لیے مناسب ہوا کہ خاتمہ احکام پر حق جل شانہٗ کی مالکیت اور اس کے احاطۂ علم وقدرت اور اس کے محاسبہ اور مواخذہ کو ذکر کیا جائے تا کہ احکام خداوندی کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ ... الیٰ آخر سورۃ﴾ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے جس میں تمہارا دل اور اس کے خطرات بھی داخل ہیں۔ وہی ان سب کائنات کا مالک ہے کیونکہ اسی نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہ ہو۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝﴾ (الملک: ۱۴) اور جب تم یہ سمجھ گئے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خالقیت تمام کائنات کو محیط ہے، اسی طرح اس کا علم قدیم بھی تمام کائنات کو ہر اعتبار سے محیط ہے۔ تو اب یہ سمجھو کہ جو اخلاق اور اعمال تمہارے دل اور ضمیر میں مضمر اور پوشیدہ ہیں، اُن کو زبان یا اعضاء اور جوارح سے ظاہر کرو یا دل ہی میں چھپائے رکھو، اُن سب پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم سے حساب لے گا اور پھر محاسبہ کے بعد جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ جس ظاہر اور پوشیدہ کو چاہے گا معاف کرے گا اور جس پر چاہے گا سزا دے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اگر چاہیں تو صغیرہ پر بھی عذاب دے سکتے ہیں اور چاہیں تو کبیرہ کو بھی بلا توبہ ہی معاف فرما دیں۔ تمام اہلِ سنّت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ اعمال قلبیہ اور قالبیہ اور افعال نفسانیہ اور جسمانیہ خواہ صغائر ہوں یا کبائر سب پر محاسبہ حق ہے اور جزاء اور سزا سب اللہ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شے اُس پر واجب نہیں۔

جب یہ آیت یعنی ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ﴾ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم الفاظ کے

ظاہری عموم کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ اس لیے کہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دل کے خیالات پر بھی حساب ہوگا۔ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پُرنور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ حکم سخت مشکل ہے اختیاری اُمور سے تو بچ سکتے ہیں مگر خطرات قلبیہ اور غیر اختیاری وسوسوں سے بچنا مشکل ہے۔

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اس قول کو سُن کر یہ فرمایا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح انکار مت کرو اور دل و جان سے اس کے حکم کو قبول کرو۔ یعنی اہل کتاب کی طرح ﴿سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا﴾ نہ کہو بلکہ ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ پڑھو۔ اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظار وحی میں از خود آیت کی کوئی تفسیر نہیں فرمائی بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ادب کی تعلیم اور تلقین فرمائی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فوراً ہی ﴿سَمِعْنَا﴾ اور ﴿اَطَعْنَا﴾ کہا اور کلمات ایمان دل و جان سے کہے۔ اللہ تعالیٰ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ بات پسند آئی۔ اس پر آئندہ آیتیں یعنی ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ... الخ﴾ نازل ہوئیں جس میں اوّل کی دو آیتوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح اُتری اور تفصیل کے ساتھ ان کے ایمان اور ان کی اطاعت کو بیان فرمایا تا کہ اُن کے دلوں کو اطمینان ہو جائے اور عشاق اور محبین کے دلوں میں جو خلجان اور اضطراب تھا وہ دُور ہو جائے اور پھر ان کی اس مدح کے بعد اُن کے اس خلجان اور اشکال کا جواب جو اُن کو پیش آیا تھا ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ... الخ﴾ سے ذکر فرمایا کہ جو چیز بندہ کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے بندہ اس کا مکلف نہیں۔ لہٰذا دل میں جو گناہ کا خیال اور خطرہ آ جائے تو اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں جب تک خود اپنے اختیار اور ارادہ سے اس پر عمل نہ کرے یا زبان سے اس کا تکلم اور تلفظ نہ کرے۔ اور علیٰ ہذا بھول چوک پر بھی کوئی مواخذہ نہیں، البتہ جو باتیں بندہ کی قدرت اور اختیار میں ہیں ان پر مواخذہ ہوگا۔

مدح اہلِ ایمان

ایمان لائے پیغمبر تمام اس چیز پر جو ان کے رب کی طرف سے اُن کی جانب اتاری گئی اور آپ کے ارشاد کے مطابق اس زمانہ کے تمام مسلمان بھی اس پر ایمان لائے سب کے سب یعنی رسول اور تمام مؤمنین ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے تمام فرشتوں پر اور اُس کی تمام کتابوں پر اور اُس کے تمام پیغمبروں پر جن کے واسطہ سے ہم تک اللہ کے احکام پہنچے۔ اللہ کی کتابیں اور اس کے پیغمبروں کی شریعتیں اگرچہ فروعی اور وقتی مسائل میں کچھ مختلف ہیں لیکن ہم ایمان لانے میں پیغمبروں کے درمیان تفریق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں۔ جیسا کہ یہود کا شیوہ رہا کہ بعض کو نہ مانا۔ اور جو احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اُن کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تیرے احکام کو سُنا اور دل و جان سے اُن کو قبول کیا۔ اور اے پروردگار! چونکہ ہم سراپا تقصیر ہیں سہو و نسیان ہمارے خمیر میں پڑا ہے اس لیے اے پروردگار تیری مغفرت اور بخشش کے طلب گار ہیں۔ ہمارا کوئی عمل بھی کوتاہی سے خالی نہیں۔ اور کیسے تجھ سے مغفرت کی درخواست نہ کریں کیونکہ مرنے کے بعد آپ ہی کی طرف لوٹنا اور آپ ہی کے سامنے پیش ہونا ہے۔

بیان مدارِ تکلیف بعد از بیان مدح و توصیف

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ﴾

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور توصیف کے بعد تکلیفِ شرعی کے دارو مدار کو بیان فرماتے ہیں تا کہ ان کا شبہ اور خلجان دور ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو شُبہ یہ تھا کہ کیا نفوس اور قلوب کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ سے نفوس کے اختیاری افعال مراد ہیں غیر اختیاری افعال مراد نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کا کسی کو مکلف اور پابند نہیں بناتے مگر بقدر اس کی طاقت اور گنجائش کے اس لیے کہ جس چیز کا مادہ ہی مکلّف میں نہ ہو اس کی تکلیف خدا تعالیٰ کی طرف سے متصور نہیں ورنہ پھر انسان معذور تھا کون نہیں جانتا کہ کان سے آنکھ کا کام نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہر نفس کو ثواب اور عذاب، نفع اور ضرر اس کے مطابق ہوگا جو اس نے اپنی قدرت اور اختیار سے کیا اور کمایا ہے۔ لہٰذا جو باتیں تمہارے دلوں میں بے اختیار گزرتی ہیں ان پر مؤاخذہ اور محاسبہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جس چیز کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس پر نہ ثواب ہے اور نہ عذاب۔

البتہ وہ امور رذیلہ جو تم نے اپنے دلوں میں اپنے اختیار سے چھپا رکھے ہیں جیسے تکبّر اور حسد اور کینہ اور حرص اور طمع اور ریاء اور نفاق اُن پر محاسبہ اور مؤاخذہ ہوگا۔ اور جو اخلاق پسندیدہ ہیں مثلاً اخلاص اور صبر اور توکل اور شکر اور قناعت وغیرہ وغیرہ، قیامت کے دن اُن پر اجر ملے گا۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کی تشفی ہوگئی اور پہلی آیت سن کر جو صدمہ ہوا تھا وہ دور ہوگیا اور خلجان مذکور کافور ہوگیا۔

تعلیم دُعاء جامع متضمن بفلاحِ دارین

گزشتہ آیات میں حق جل شانہٗ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مومن کی شان سمع وطاعت ہے اور اپنی تقصیرات پر طلب مغفرت ہے اور بعد ازاں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ طاقت اور مقدور سے زیادہ کسی کو اپنے احکام کا مکلّف اور پابند نہیں بناتے اور قیامت کے دن محاسبہ اور مؤاخذہ انہی افعال پر ہوگا جو اختیاری ہیں غیر اختیاری امور پر محاسبہ اور مؤاخذہ نہ ہوگا۔

اب آئندہ آیت میں ایک جامع دُعا کی تعلیم فرماتے ہیں: جس میں خطا اور نسیان کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے اس لیے کہ خطاء اور نسیان اگرچہ بظاہر غیر اختیاری ہیں اور داخل تکلیف نہیں لیکن من وجہ اختیاری بھی ہیں، اس لیے کہ بسا اوقات خطاء اور نسیان غفلت اور کوتاہی اور بے توجہی اور بے احتیاطی کی بنا پر پیش آتا ہے اور بے توجہی اور لاپرواہی انسان کا اختیاری فعل ہے۔ اس لیے عقلاً اور شرعاً خطاء اور نسیان پر بھی مؤاخذہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اگر خادم سے کسی غفلت اور بے توجہی کی بنا پر کوئی بھول چوک ہوجائے تو اس پر مؤاخذہ اور باز پرس ہوتی ہے کہ یہ غلطی کیوں ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں حق جل شانہ کا یہ ارشاد ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۵) بھی اس کا مؤید ہے اور اسی وجہ سے شریعت نے بہت سے مواضع خطاء میں دیت اور ضمان کو واجب قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ خطاء انسان کے تساہل اور عدم احتیاط کی بنا پر پیش آئی ہے جو انسان کا فعل اختیاری ہے اور داخل تکلیف ہے اور قابل مؤاخذہ ہے اس لیے حق جل شانہٗ نے ہم کو یہ دعا سکھلائی کہ اپنی تقصیرات کو پیش نظر رکھ کر اس طرح دُعا مانگا کرو۔ اے ہمارے پروردگار! تیرا حق عبودیت اور حق ربوبیت ہم سے کہاں ادا ہوسکتا ہے۔ بھول چوک ساتھ لگی ہوئی ہے اس لیے تجھ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اگر ہم تیرے کسی حکم یعنی امر و نہی کو بھول جائیں اور بھولے سے اُس کی تعمیل نہ کرسکیں یا کسی غفلت اور کوتاہی کی بنا پر چوک جائیں کہ امر کو نہی اور نہی کو امر سمجھ جائیں یا ٹھیک عمل کرنے میں غلطی کر جائیں تو ہم پر مؤاخذہ اور داروگیر نہ فرمانا۔

فائدہ: اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ خطاء اور نسیان پر مؤاخذہ عقلاً وشرعاً ممتنع نہیں۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال سے غیر اختیاری

طور پر افعال کا صدور ہوتا ہے، مگر عقلاً و شرعاً شراب پینے والا مؤاخذہ سے بری نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ افعال اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان غیر اختیاری افعال کا سبب تو فعل اختیاری ہے یعنی نشہ آور چیز کا استعمال۔ اس شخص نے اپنے اختیار کے بے محل استعمال سے حفاظت کیوں نہیں کی اس لیے قابل مؤاخذہ ہے۔ نسیان اگرچہ بالذات غیر اختیاری ہے مگر اس کا سبب عموماً اختیاری ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بسا اوقات بھولنے والے پر لاابالیت اور بے پروائی کا الزام عائد کرتے ہیں اور خطا کار پر سہل انگاری اور بے احتیاطی اور بے توجہی کا الزام رکھتے ہیں۔

عارف رومی قدس سرہٗ السامی فرماتے ہیں ؎

لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ شد گواہ — کہ بود نسیاں بوجھے ہم گناہ
زانکہ استکمال تعظیم او نکرد — ورنہ نسیاں در نیاور دے نبرد
گرچہ نسیاں لا بدونا چار بود — در سبب ور زیدن او مختار بود
چوں تہاون کرد در تعظیمہا — تا کہ نسیاں زاد با سہو و خطا
ہمچو مستے کو جنایتہا کند — گوید او معذور بودم من زخود
گویدش لیکن سبب اے زشت کار — از تو بُد در رفتنِ آں اختیار
بے خودی نامد بخود تش خواندۂ — اختیار از خود نشد تش راندۂ

(مثنوی دفتر پنجم ص ۲۱۷)

ترجمہ: "اے پروردگار! اور مت رکھ ہمارے سروں پر احکام شاقہ کا بار گراں جیسا کہ آپ نے رکھا تھا ہم سے پہلے لوگوں پر۔ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے پہلی امتوں کے متکبرّین اور سرکشوں پر شدید اور سخت احکام اتارے تھے۔ ایسے سخت احکام کے متعلق درخواست ہے کہ اے اللہ! ہم پر پہلی امتوں کی طرح سخت احکام نہ نازل فرما کہ بجالانا ہم کو دشوار ہو۔ اے پروردگار! اور مت رکھ ہمارے سر پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ یعنی ہماری طاقت اور قوت سے بڑھ کر ہم کو مصیبتوں اور بلاؤں میں مبتلا نہ فرما۔"

فائدہ ①: پہلی دُعاء یعنی ﴿لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا﴾ تشریعیات کے متعلق تھی ہم کو تکالیف شاقہ کا مکلف نہ بنا۔ اور پہلی امتوں کی طرح ہم پر سخت احکام نازل نہ فرما۔ اور یہ دوسری دعاء یعنی ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ یہ دُعا تکوینیات کے متعلق ہے یعنی تکوینی اور تقدیری طور پر ہم پر ایسی مصیبتیں اور بلائیں نازل نہ فرما جو کہ ہماری طاقت اور تحمل سے باہر ہوں۔

تشریعیات اور تکوینیات میں فرق یہ ہے کہ انسان تشریعیات کا مکلف ہے اور تکوینیات کا مکلف نہیں مگر دعا کی تعلیم دونوں کے لیے کی گئی۔ اور اے پروردگار چونکہ احکام شاقہ اور نا قابل برداشت مصائب کے نزول کا سبب بھی ہمارے ہی گناہ ہیں۔ اس لیے تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری پردہ پوشی فرما۔ دنیا اور آخرت کی ذلّت سے ہم کو بچا اور عفو اور مغفرت کے بعد آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم پر مہربانی اور احسان بھی فرما۔ آپ ہی ہمارے آقا اور ولی نعمت اور دوست ہیں۔ اور ہم آپ کے غلام اور نام لیوا اور محبّ اور عاشق ہیں۔ وقال اللہ تعالیٰ : ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ (محمد:۱۱)

فِی الحدیث الشریف اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔

پس آپ ہماری اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں خاص مدد کیجیے یعنی کافر قوم کے مقابلہ میں ہم کو فتح ونصرت عطا فرمایئے۔ کافروں کی قوم آپ کی اور آپ کے دین کی اور آپ کے پیغمبروں کی اور آپ کے دوستوں کی دشمن ہے اور مولیٰ اور آقا اپنے غلاموں کا اور محبوب اپنے عاشقوں کا حامی اور مددگار ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ سے یہ درخواست ہے کہ اپنے دوستوں کی دشمنوں کے مقابلہ میں مدد فرمایئے۔ تا کہ بے کھٹکے تیری عبادت کرسکیں اور بلا کسی دغدغہ کے تیرے قانون کو جاری کرسکیں۔

فائدہ ②: حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب دعائیں قبول فرمائیں۔

لَو لَمْ تُرِدْ نَیْل، مَانر جُوْ وَنَطْلُبُہٗ مِنْ فَیْضِ جُوْدِکَ مَا عَلَّمْتَنَا الطَّلَبَا

ترجمہ: "اگر ہماری اس درخواست کے منظور کرنے کا ارادہ نہ ہوتا تو ہم کو درخواست کرنا ہی نہ سکھاتے اور نہ درخواست کرنے کا حکم دیتے۔"

ایں دعا از تو اجابت ہم ز تو لطف تو بر ما نوشتہ صد نکو

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب سورۂ بقرہ ختم کرتے تو "آمین" کہتے۔

الحمد للہ آج ۱۰ جمادی الاوّلیٰ ۱۳۷۵ھ یوم دوشنبہ بوقت چاشت مقام لاہور میں سورۂ بقرہ کی تفسیر ختم ہوئی۔ اے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما اور باقی تفسیر کی تتمیم اور تکمیل کی توفیق عطا فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلَ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّكَ اَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ اٰمِیْن یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ○ یَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

الحمد للہ آج ۱۱ محرم الحرام یوم سہ شنبہ ۱۳۸۳ھ کو نظر ثانی سے فراغت ہوئی۔

فللہ الحمد والمنۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر سورۂ آلِ عمران

آیاتُہا ۲۰۰	③ سُوۡرَۃُ اٰلِ عِمۡرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ ⑧⑨	رُکوعاتُہا ۲۰

یہ سورت مدنیہ ہے جس میں دوسو آیتیں اور بیس ۲۰ رکوع ہیں۔ چونکہ اس سورت میں آلِ عمران کا ذکر ہے اس لیے اس سورت کا نام سورۂ آلِ عمران ہے اور اس سورت کا نام مجادلہ بھی ہے اس لیے کہ یہ سورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے مجادلہ اور مباحثہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ عنقریب شانِ نزول سے واضح ہوگا۔

ربط: اس سورت کو سورۂ بقرہ کے ساتھ متعدد وجوہ سے ربط ہے۔

وجہ اوّل: سورۂ بقرہ کی ابتداء کتاب الٰہی کے ذکر سے ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا کہ کس نے کتاب الٰہی سے ہدایت حاصل کی اور کس نے اُس سے اعراض کیا۔ اسی طرح اس سورت کا آغاز بھی کتاب الٰہی کے ذکر سے ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بیان کیا گیا کہ سلیم الطبع لوگوں نے اُس کی ہدایت کو قبول کیا اور زائغین اور کج طبیعتوں نے بجائے محکمات کے متشابہات کی پیروی کی اور اپنے مطلب اور خواہش اور غرض کے مطابق آیات الٰہیہ کی تاویلیں کیں اور لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کیا ایسے لوگ اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق کہلاتے ہیں اور ملحد اور زندیق شریعت میں منافق کے حکم میں ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں منافقین کا ذکر تھا اور اس سورت میں ملحدین اور زِندیقین کا ذکر ہے جس کو حق جل شانہٗ نے زائغین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

زیغ کے معنی میلان اور انحراف کے ہیں اور ملحد وہ شخص ہے جو دین میں ٹیڑھی راہ پر چلتا ہو۔ صراطِ مستقیم یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی راہ سے ہٹا ہوا اور صحابہ اور تابعین کے خلاف آیات کے نئے نئے معنی بیان کرتا ہو جو شخص آیات قرآنیہ کے ایسے معانی بیان کرے جو ﴿اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ﴾ یعنی صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے سمجھے ہوئے کے خلاف ہوں اور اس زمانہ کے ﴿مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ﴾ اور ﴿ضَآلِّیۡنَ﴾ یعنی یہود اور نصاریٰ کے تہذیب اور تمدن کے مطابق ہوں تو یقین کرلو کہ یہ شخص بلاشبہ صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا ہے اور حسبِ ارشادِ باری ﴿وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ﴾ میں داخل ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایسے لوگوں سے بچتے رہنا چاہیے۔ یعنی ان کی کتابوں کے دیکھنے سے پرہیز کرو۔

وجہ دوم: ربط کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر محاجہ اور مباحثہ یہود سے تھا اور سورۂ آل عمران میں محاجہ اور مباحثہ زیادہ تر نصاریٰ سے ہے اور یہود چونکہ نصاریٰ سے مقدم ہیں اس لیے سورۂ بقرہ کو سورۂ آل عمران سے پہلے لایا گیا۔

وجہ سوم: سورۂ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر تھا اور اس سورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہے۔

وقال تعالیٰ : ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ﴾

وجہ چہارم : ہر سورت کا خاتمہ ایک خاص دُعا پر ہوا سورۂ بقرہ کا خاتمہ کفار کے مقابلہ میں فتح ونصرت کی دعاء پر ہوا جو دین کی ابتدائی حالت کے مناسب ہے اور سورۂ آل عمران کا خاتمہ۔ دُعا حسن ثواب اور جزاء اعمال اور ایفاء مواعید کی درخواست پر ہوا جو مؤمنین متقین کے مناسب ہے جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے شروع میں تھا۔

وجہ چہارم : سُورۂ بقرہ کی ابتداء متقین اور مفلحین کے ذکر سے ہوئی اور اس سورت کا خاتمہ متقین اور مفلحین کے ذکر پر ہوا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ اسی طرح سے اس سورت کی نہایت پہلی سورت کی بدایت میں مندرج ہوگئی اور سورۂ آلِ عمران کا اختتام سورۂ بقرہ کے افتتاح میں مندرج ہوگیا قرآن کریم جس طرح علوم ومعارف اور فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہے اسی طرح باعتبار ربط کے بھی حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہے۔

نکتہ:

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا نام احادیث میں زَهْرَا وَيْن آیا ہے جس کے معنی دو روشن سورتوں کے ہیں۔ سورتیں تو ساری ہی روشن ہیں مگر گمان یہ ہے کہ شاید سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران کے انوار اور تجلیات باہم ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں اس لیے ان دونوں سورتوں کا نام زھراوین رکھا گیا ہو اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سورۂ بقرہ اور آلِ عمران کی قراءت اور تلاوت پر قاری کو ایک نور تام عطا کیا جائے گا۔ نیز سنن ابی داؤد وغیرہ میں اسماء بنت یزید سے مروی ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے۔ سورۂ بقرہ کی یہ آیت ﴿ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴾ (البقرہ: ۱۶۳) اور سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت ﴿ الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ اور یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں بھی ہے۔ نیز اس سورت کا آغاز آیۃ الکرسی سے ملتا جلتا ہے جو قرآن کا دل ہے۔ پس عجب نہیں کہ اس اشتراک کی وجہ سے بھی ان دونوں سورتوں کو زھراوین کہا گیا ہو۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
شروع اللہ کے نام سے، جو بڑا مہربان ہے رحم والا
الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ
اللہ! اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں جیتا ہے، سب کا تھامنے والا۔ اُتاری تجھ پر کتاب
بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ ۝۳
تحقیق، ثابت کرتی اگلی کتاب کو اور اتاری تھی توریت اور انجیل۔

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کو، اور اتارا انصاف جو لوگ مُنکر ہیں اللہ کی آیتوں سے

اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا

ان کو سخت عذاب ہے۔ اور اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا اللہ اس پر

يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ

چھپی نہیں کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہی تمہارا نقشہ بناتا ہے

فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہے۔ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، زبردست ہے حکمت والا۔

اثباتِ توحید و بیانِ محکم در ابطالِ الوہیتِ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام
و مناظرۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم با نصارائے نجران

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲ ... الیٰ ... لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶﴾

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے کہ سورۂ آلِ عمران کے شروع کی تراسی آیتیں نصارائے نجران کے بارے میں نازل ہوئیں۔ نجران علاقہ یمن میں ایک شہر کا نام ہے جو اس زمانہ میں عیسائیوں کا علمی مرکز تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کی خبر جب اطراف اور اکناف میں پہنچی تو یہ خبر سُن کر نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد، مناظرہ اور مباحثہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ اس وفد میں ساٹھ سوار تھے جن میں سے چودہ آدمی خاص طور پر بڑے شریف اور معزز تھے اور ان چودہ آدمیوں میں تین شخص ایسے تھے جو ان کا مرجع الامر تھے یعنی سب کا ماویٰ اور ملجا تھے تمام کام انہیں تین کے مشورہ سے ہوتے تھے۔

ایک ان کا امیر اور سردار تھا جس کا نام عبدالمسیح تھا جو بڑا زیرک اور ہوشیار اور ذی رائے تھا۔ اور دوسرا اس کا وزیر و مشیر جس کا نام اَیہَم تھا۔ اور تیسرا ان میں کا سب سے بڑا عالم اور پادری تھا جس کو وہ حِبرْ اور سقُف کہتے تھے اس کا نام ابو حارثہ بن علقمہ تھا۔ شاہانِ روم اس پادری کی اس کے علم و فضل کی وجہ سے بڑی توقیر و تعظیم کرتے تھے۔ اور عیسائی بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے اس کو بڑی جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ابنیّت کے قائل تھے۔ اُن کو خدا اور خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ جب مدینہ منورہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عیسیٰ کے بارہ میں گفتگو شروع ہوئی، گفتگو کرنے والے یہی تین آدمی تھے۔ ① عبدالمسیح ② ایہم ③ ابو حارثہ۔ ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے استدلال میں یہ کہا کہ:

① عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔

② عیسیٰ علیہ السلام بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔

③ عیسیٰ علیہ السلام غیب کی باتیں بتاتے تھے۔

④ عیسیٰ علیہ السلام مٹی کی مورتیں بناتے اور پھر ان میں پھونک مارتے اور زندہ ہو کر وہ پرند بن جاتے۔

اور ان تمام چیزوں کا قرآنِ کریم نے اقرار کیا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ خدا تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے پر اس طرح استدلال کیا کہ:

① وہ بلا باپ کے پیدا ہوئے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے بیٹے تھے۔

② نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں کلام کیا اُن سے پیشتر کسی نے گہوارہ میں کلام نہیں کیا۔ یہ بھی خدا کے بیٹا ہونے کی دلیل ہے۔

اور مسئلہ تثلیث یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ثالث ثلاثہ ہونے پر یہ استدلال کیا کہ حق تعالیٰ جا بجا یہ فرماتے ہیں: ﴿فَعَلْنَا وَ اَمَرْنَا وَ خَلَقْنَا وَ قَضَيْنَا﴾ ہم نے یہ کام کیا۔ ہم نے یہ حکم دیا ہم نے یہ پیدا کیا ہم نے یہ مقدر کیا۔ یہ تمام صیغے جمع کے ہیں اور جمع کا اوّل درجہ تین ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ ایک ہوتا تو صیغہ جمع کا استعمال نہ ہوتا بلکہ بجائے صیغہ جمع کے مفرد کا صیغہ استعمال ہوتا اور یوں کہا جاتا ﴿فَعَلْتُ وَاَمَرْتُ وَخَلَقْتُ وَقَضَيْتُ﴾ میں نے کہا، میں نے حکم دیا، میں نے پیدا کیا، میں نے مقدر کیا۔ یہ اس مایۂ ناز وفد کے استدلالات تھے جس کو اپنے علم پر فخر اور ناز تھا۔ جن کی حقیقت اہل عقل اور اہلِ فہم کی نظر میں اوہام اور خیالات سے زیادہ نہیں۔ اب آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات اور ارشادات کو سنیے۔

① ((فقال لهم النبی ﷺ الستم تعلمون انه لا يكون ولد الا وهو يشبه اباه قالوا بلٰى)).

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا: کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے وفد نے کہا کیوں نہیں۔"

اور یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ خدا تعالیٰ بے مثل اور بے چون و چگون ہے کوئی شے اس کے مشابہ نہیں۔

① ((قال الستم تعلمون ان ربنا حی لا يموت و ان عيسٰى ياتى عليه انفناء قالوا بلٰى)).

"بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے کہا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ زندہ ہے کبھی بھی اس کو موت نہیں آ سکتی۔"

اور عیسیٰ علیہ السلام کو ضرور موت اور فنا آنے والی ہے۔ یعنی قیامت سے پہلے۔

وفد نے اقرار کیا کہ بے شک یہ صحیح ہے ایک نہ ایک وقت ان پر موت اور فنا ضرور آئے گی۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ پر موت اور فنا کا طاری ہونا ناممکن اور محال ہے۔

تنبیہ: نصاریٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب و مقتول ہو کر مر چکے ہیں لیکن حضور پرنُور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے الزام کے لیے یہ نہیں کہا کہ تمہارے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو موت آ چکی ہے اس لیے کہ یہ امر خلافِ واقعہ ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے اور نہ مصلوب ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے اور چند روز کے بعد وفات پائیں گے۔ جیسا کہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے وہی کلمہ نکلا جو واقع کے موافق تھا۔ خلافِ واقع چیز کا نبی برحق کی زبان سے نکلنا مناسب نہیں اگرچہ اس چیز کا ذکر محض بطور الزام ہو اور عجب نہیں کہ نصاریٰ نے اس کا

اقرار اس لیے کیا ہو کہ وہ اتنی بات کو غنیمت سمجھے اور یہ خیال کیا ہو کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق ہم پر الزام اور حجت اور بھی پوری ہو جائے گی۔ نیز نصاریٰ میں مختلف فرقے ہیں۔ ایک فرقہ کا عقیدہ یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہونے کے بعد وفات پائیں گے۔ پس ممکن ہے کہ اس وفد کے لوگ اسی عقیدہ کے ہوں جو اسلام کے مطابق ہے۔

③ ((قال الستم تعلمون ان ربنا قيم على كل شئ يكلؤهٗ و يحفظهٗ و يرزقه قالوا بلٰى قال فهل يملك عيسٰى من ذالك شيئا قالوا لا)).

"پھر آپ نے فرمایا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہی ہر چیز کے وجود کو تھامنے والے اور اس کے محافظ اور نگہبان اور رزق رساں ہیں انہوں نے کہا بے شک۔ آپ نے فرمایا کہ بتلاؤ کیا عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے کسی چیز کے مالک اور قادر ہیں یعنی کیا عیسیٰ علیہ السلام نے بھی مخلوقات کو وجود عطا کیا ہے اور اپنی قدرت سے ان کے لیے سامان بقاء پیدا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام تو ان چیزوں پر قادر نہیں۔"

④ ((قال افلستم تعلمون ان الله لا يخفى عليه شيء فى الارض ولا فى السماء قالوا بلى قال فهل يعلم عيسى من ذٰلك شيئًا الا ما علم قالوا لا)).

"پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں انہوں نے کہا بے شک آپ نے فرمایا کہ کیا عیسیٰ علیہ السلام کو ان میں سے بجز اس چیز کے جس کا خدا تعالیٰ نے ان کو علم دے دیا تھا کوئی اور شئے بھی جانتے تھے انہوں نے کہا نہیں۔"

⑤ ((قال فان ربنا صوّر عيسى فى الرحم كيف شاء)).

"پھر آپ نے فرمایا کہ پروردگارِ عالم نے عیسیٰ علیہ السلام کی ماں مریم کے رحم میں اپنی مرضی کے موافق صورت بنائی۔"

⑥ ((الستم تعلمون ان ربنا لا يا كل الطعام ولا يشرب الشراب ولا يحدث الحدث قالوا بلٰى)).

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ پاخانہ اور پیشاب کرتا ہے انہوں نے کہا بے شک۔"

⑦ ((قال الستُم تعلمون ان عيسى حملته امه كما تحمل المرآة ثم وضعته كما تضع المرآة ولدها ثم غذى كاما تغذى المرآة الصبى ثم كان يأكل الطعام و يشرب الشراب و يحدث الحدث قالوا بلٰى)).

"پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی طرح حاملہ ہوئیں جس طرح ایک عورت اپنے بچہ کو پیٹ میں رکھتی ہے اور پھر اس کو جنتی ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور بچوں کی طرح ان کو غذا دی گئی اور پھر بڑے ہوئے اور وہ کھاتے تھے اور پیتے تھے اور پیشاب اور پاخانہ کرتے تھے انہوں نے کہا بے شک ایسے ہی تھے۔"

⑧ ((قال فكيف يكون هذا كما زعمتم فعرفوا ثم ابوا الا جحودا فانزل الله. ﴿الٓمّٓ ۝١ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝٢﴾ اخرجه ابن جرير ابن ابى حاتم عن الربيع)). (تفسير در منثور ص ۳ ج ۲)

"آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کو ان سب باتوں کا اقرار ہے تو بتاؤ کہ ایسا ہو کر عیسیٰ علیہ السلام خدا کیسے ہوئے جیسا تمہارا گمان ہے۔ پس آپ ﷺ کے اس ارشاد سے ان لوگوں نے حق کو خوب پہچان لیا۔ مگر جان بوجھ کر انکار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ

آیتیں نازل فرمائیں۔ ﴿الٓمّٓ ۝١ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝٢﴾

﴿الٓمّٓ ۝١﴾ اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ اللہ وہ ذات ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ الوہیت اور خدائی اسی کے لیے مخصوص ہے اس لیے کہ:

① وہ بذاتہٖ زندہ ہے اور اس کی حیات ازلی اور ابدی ہے موت اور فناء کا اس کی ذات اور صفات میں کہیں امکان نہیں۔

② اور وہی تمام کائنات کے وجود اور حیات کو تھامنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔

پناہ بلندی و پستی توئی ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی
قرار ہمہ ہست بر نیستی توئی آنکہ یک برقرار ایستی

اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیات نہ ذاتی ہے اور نہ ازلی اور ابدی۔ اللہ تعالیٰ کے زندہ کرنے سے وہ زندہ ہوئے ان کی حیات اور ان کی زندگی بلاشبہ حادث اور فانی ہے اور جس کا وجود اور جس کی حیات حادث اور فانی ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا اور علے ہذا عیسیٰ علیہ السلام نے نہ تو مخلوقات کو کوئی وجود اور حیات عطا کی اور نہ ان کے لیے کوئی سامانِ حیات پیدا کیا اور نہ وہ کائنات کے وجود کے تھامنے اور قائم رکھنے پر قادر ہیں لہٰذا خدا کیسے ہوسکتے ہیں۔

③ نیز حق تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں۔ جس نے بندوں کی ہدایت کے لیے آپ پر ایک کتاب اتاری جو حق اور سچائی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ جو اس کی صفت کلام کا آئینہ ہے اور اس کے احکام اور قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کی شان یہ ہے کہ وہ گزشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق و توثیق کرنے والی ہے اور اسی طرح حق تعالیٰ نے اس قرآن سے پہلے توریت اور انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اُتارا اور اللہ کی طرف سے پیغمبروں پر کتابوں کا اترنا یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اللہ رب العالمین، احکم الحاکمین ہے اور انبیاء و مرسلین خدا نہیں بلکہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں جو احکامِ خداوندی کے پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اگر خدا ہوتے تو ان پر اللہ کی وحی اور اس کی کتاب نازل نہ ہوتی۔ وحی کا نزول بندہ پر ہوتا ہے خدا پر وحی نازل نہیں ہوتی۔

نیز کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ سب کی سب توحید پر متفق ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝٢٥﴾ (الانبیاء)۔ لہٰذا تثلیث اور ابنیّت کا عقیدہ تمام کتب الٰہیہ کے خلاف ہے۔

④ اور اتارے اللہ تعالیٰ نے معجزات تا کہ حق اور باطل کا خوب فرق ظاہر ہو اور دشمنانِ حق اس کے مقابلہ سے عاجز ہو کر حق تعالیٰ کی قدرت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت و رسالت کا یقین کریں معجزات اور خوارق عادات ایک طرف خداوند یکتا کی وحدانیت اور قدرت کی دلیل ہیں اور ایک طرف انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت و رسالت کی برہان ہیں۔

لہٰذا تحقیق جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی نشانیوں کا انکار کیا اور خوارق عادات کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوّت کے قائل نہ ہوئے یعنی ان کو خدا کا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ اور فرستادۂ خداوندی نہ مانا اُن کے لیے نہایت سخت عذاب ہے۔

⑤ اور اللہ تعالیٰ عزت والا اور زبردست اور صاحبِ انتقام ہے۔ جو شخص اس کے مقابلہ کے لیے سر اٹھاتا ہے اُس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس عزیز مقتدر کے پنجہ قدرت سے نکل نہیں سکتا اور نہ اس عزیز منتقم کے انتقام سے بچ کر بھاگ سکتا ہے۔ اس جملہ میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابطال الوہیت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر لٹکائے گئے

اور ایلی ایلی کہتے جان دے دی اور اپنے آپ کو دشمنوں کے پنجہ ظلم سے نہ چھڑا سکے اور نہ اُن سے کوئی انتقام لے سکے۔ پس ایک عاجز اور مظلوم اور مغلوب کو جس پر اس کے دشمن غالب آ گئے ہوں خدا کہنا یا خداوند قادر مطلق کا بیٹا کہنا کیا کھلی ہوئی نادانی نہیں؟ عقلاء عالم کے نزدیک خدائی اور ذلت کا جمع ہونا ناممکن اور محال ہے خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عزیز مقتدر ہو البتہ نصاریٰ کے نزدیک خدا کا دشمنوں کے ہاتھ سے ذلیل ہونا ممکن ہے۔

⑥ تحقیق اللہ تعالیٰ پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ گزشتہ آیت میں حق تعالیٰ کے اقتدار کامل اور اختیار کامل کو بیان فرمایا اب اس آیت میں اس کے علم کامل کو بیان فرماتے ہیں یعنی جس طرح اس کی قدرت ازلیہ تمام ممکنات کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی محیط ہے کوئی چھوٹی اور بڑی چیز اس کے علم سے غائب اور پوشیدہ نہیں اور ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا علم محیط حاصل نہ تھا صرف اسی قدر جانتے تھے جتنا حق تعالیٰ ان کو بتلا دیتا تھا اور نصاریٰ نجران نے خود اس کا اقرار کیا اور موجودہ انجیل سے بھی یہی ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام عالم الغیب نہ تھے بہت سی چیزیں ان پر مخفی رہتی تھیں اللہ کی وحی اور روح القدس کے راہنمائی سے معلوم ہوتی تھیں۔

⑦ وہی خدا رحموں میں تمہاری صورتیں اور نقشے جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔ کسی کو مرد اور کسی کو عورت کسی کو خوبصورت اور کسی کو بدصورت۔ پس کیا جس کی صورت اور نقشہ رحم مادر میں بنا ہو اور بطنِ مادر کی تاریکیوں سے نکل کر وہ اس دار فانی میں آیا ہو اور عام بچوں کی طرح کھاتا اور پیتا اور پاخانہ اور پیشاب کرتا ہو معاذ اللہ وہ کس طرح خدائے قدوس اور خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے؟ خدا وہ ہے کہ جو اپنے ارادہ اور مشیت سے رحم مادر میں صورتیں اور نقشے بنائے اور جو نقشہ اور صورت رحم مادر میں بنا ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ جو صورت بنتی ہے وہ مخلوق ہے اور خالق کی محتاج ہے اور خدا محتاج نہیں ہوتا اس لیے کہ ان صفات میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں۔ لہٰذا وہی سزاوارِ ربوبیت اور شایانِ عبودیت ہے۔

خلاصہ کلام

یہ کہ خداوند قدوس ایک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی سب پر غالب ہے اور بڑی حکمت والا ہے، جس کی قدرت اور حکمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس نے کسی حکمت اور مصلحت سے حضرت مسیح علیہ السلام کو بدوں باپ کے اور حضرت حوّا علیہا السلام کو بدوں ماں کے اور حضرت آدم علیہ السلام کو بدوں باپ اور ماں کے پیدا کیا۔ جس مخلوق کو جس طرح چاہا پیدا فرمایا۔ اس کی حکمتوں کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔

ع کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

فوائد ولطائف

① امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کا آغاز نہایت عجیب وغریب ہے جو اثباتِ توحید اور اثبات رسالت دونوں پر مشتمل ہے۔

اثباتِ توحید تو اس اعتبار سے ہیں کہ صفاتِ خداوندی کے بیان پر مشتمل ہے کہ خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حی اور قیوم اور عالم الغیب اور عزیز منتقم ہو۔ اور رحم مادر میں اولاد کی تصویر بنانے پر قادر ہو اور عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات موجود نہ تھیں لہٰذا ثابت ہو گیا

کہ وہ خدا نہ تھے۔ (جیسا کہ تفصیل پہلے گذر چکی ہے)

اور اثبات رسالت کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا نبی اور رسول ہونا اور توریت اور انجیل کا ان پر نازل ہونا تم کو بھی تسلیم ہے اب بتلاؤ کہ توریت اور انجیل کے کتاب الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے جو دلیل ان کے لیے ہے۔ قرآن کے لیے اس سے ہزار درجہ بڑھ کر دلائل موجود ہیں اور جس دلیل سے تم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو نبی مانتے ہو اسی طرح کی دلیل سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ ناچیز کہتا ہے اثباتِ توحید اور اثبات رسالت کے علاوہ اثبات قیامت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ﴾ اثبات قیامت کی دلیل ہے کہ جو خدا اپنی قدرت کاملہ سے پہلی مرتبہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ وہ دوسری مرتبہ بھی زندہ کرنے پر قادر ہے۔ اس طرح اس سورت کے مَطلَع میں اسلام کے اصول ثلاثہ توحید اور رسالت اور قیامت کے اثبات کے دلائل کی طرف اجمالی اشارہ ہو گیا۔

② ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کی صورتوں اور شکلوں کا مختلف ہونا مادہ اور طبیعت کا اقتضاء نہیں اور نہ محض اتفاق سے ہے بلکہ یہ اختلاف حق تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے بلکہ یہ تمام قادر علیم اور عزیز حکیم کی کاریگری ہے۔

③ ﴿اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ میں فرقان کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرقان سے معجزات مراد لیے اور بعضوں نے زبور مراد لی ہے اور بعض نے قرآنِ کریم مراد لیا ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ اس آیت میں فرقان سے معجزات مراد لیے جائیں جیسا کہ ہم نے تفسیر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں پکی ہیں سو جڑ ہیں

الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ

کتاب کی، اور دوسری ہیں کئی طرف ملتی، سو جن کے دل پھرے ہوئے ہیں، وہ لگتے ہیں

مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ

ان کی ڈھب والیوں سے، تلاش کرتے ہیں گمراہی اور تلاش کرتے ہیں اُن کی کل بیٹھانی، اور ان کی کل کوئی نہیں جانتا

تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ

سوا اللہ کے، اور جو مضبوط علم والے ہیں، سو کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے، سب کچھ

مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝٧ رَبَّنَا لَا تُزِغْ

ہمارے رب کی طرف سے ہے اور سمجھائے وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے اے رب ہمارے

قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ

دل نہ پھیر، جب ہم کو ہدایت دے چکا، اور دے ہم کو اپنے ہاں سے مہربانی، بیشک

اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝٨ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ

تو ہی ہے سب دینے والا اے رب تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن، جس میں شُبہ نہیں،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝٩ ع ۱ ۹

بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا وعدہ

تقسیم آیات بسوئے محکمات ومتشابہات مع تقسیم سامعین بسوئے زائغینِ فہم وراسخینِ علم

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ... الٰى ... اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝٩﴾

جب دلائل واضح سے توحید کا اثبات اور تثلیث اور ابنیت کا رد اور ابطال ہو گیا تو نصاریٰ نے عاجز ہو کر بطور معارضہ یہ کہا کہ آخر آپ علیہ السلام بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ مانتے ہیں۔ پس یہی الفاظ ہمارے مدعا کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔

حق جل شانہٗ نے ان آیات میں ان کے اس شبہ کا جواب ایک عام ضابطہ اور قاعدہ کی شکل میں دیا جس کے سمجھ لینے کے بعد صدہا اور ہزارہا شبہات اور اشکالات اور نزاعات اور مناقشات کا خاتمہ ہو جاتا ہے وہ یہ کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں آیات خدا وندی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محکمات کہ جن کی مراد واضح اور متعین ہو اور بدنیّت ان کے مفہوم اور معانی میں الٹ پھیر کر کے اور ان آیات کے ظاہری الفاظ کو اپنی غرض پر نہ ڈھال سکتا ہو یہ آیتیں اُمّ الکتاب اور اصل کتاب کہلاتی ہیں جو کتاب الٰہی اور شریعت اور تمام تعلیمات کی جڑ ہوتی ہیں۔ انہی پر دین اور شریعت کا دارومدار ہوتا ہے جیسے آیات توحید وتنزیہ وغیرہ۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن میں ایک گونہ خفا اور ابہام ہوتا ہے اور مراد پوری واضح اور متعین نہیں ہوتی دوسرے معنی کا بھی ان میں احتمال ہوتا ہے۔ ان آیات کا حکم یہ ہے کہ ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہیے جو معنی، محکمات کے مطابق ہوں اُن کو لیا جائے اور جو معنی آیات محکمات کے خلاف ہوں اُن کو نہ لیا جائے۔

بعض آیات کو حق جل شانہٗ نے قصداً مجمل اور متشابہ نازل فرمایا ہے تا کہ بندوں کا امتحان کریں کہ کون صریح اور واضح المراد یعنی

آیات محکمات کا اتباع کرتا ہے اور کون کج روان مجملات اور متشابہات کو اپنی غرض پر ڈھالتا ہے اور محکمات اور آیات واضحات سے پہلو تہی کرتا ہے اور ایک حکمت آیات متشابہات کے نازل کرنے میں یہ ہے کہ جب باوجود جدوجہد کے متکلم کی مراد متعین نہ کر سکیں تو اپنے قصور علم کا اقرار کریں اور بزبان حال جو ہمہ دانی کے دعوے دار بنے ہوئے تھے۔ اس سے توبہ کریں اور جس طرح قصور علم اور قصور فہم کی وجہ سے اور دیگر بے شمار حقائق پر دسترس نہیں اسی طرح آیات متشابہات کو بھی ان کی فہرست میں شامل کر لیں مگر ایسی تاویلات سے پرہیز کریں کہ جو آیات بیّنات اور محکمات اور اسلام کے اصول مسلمہ کے خلاف ہوں۔

پس جن آیات اور عبارات سے نصارائے نجران نے استدلال کیا ہے مثلاً روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے الفاظ سے وہ سب کے سب اقسام متشابہات سے ہیں اور جن آیات میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بندہ اور بشر ہونا صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے وہ آیات محکمات ہیں مثلاً قرآنِ کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تصریح کر دی۔ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ (الزخرف:۵۹) یا مثلاً ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ یا مثلاً ﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝﴾ (مریم:۳۴) یا مثلاً جن بے شمار آیات میں حق تعالیٰ نے یہ امر واضح طور پر بیان فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کے کوئی بیٹا ہے ﴿مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ﴾ (مریم:۳۵) ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ (الاخلاص:۳) ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

پس آیات محکمات میں صاف طور پر غیر اللہ کی الوہیت اور ابنیت کا رد کیا گیا ہے ان سے تو آنکھیں بند کر لینا اور ﴿كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫﴾ جیسی آیات متشابہات کو لے دوڑنا اور ان کی ایسی تاویل کرنا جو صریح بینات اور آیات محکمات کے منافی ہو یہ کج رو اور گمراہ لوگوں کا طریق ہے کہ جو لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے اور سیدھے راستہ سے ہٹانے کے لیے ایسا کیا کرتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ عزیز و حکیم وہی ذات ہے کہ جس نے اپنی حکمت بالغہ سے آپ پر ایک جامع اور کامل کتاب اتاری جس کی کچھ آیتیں محکم ہیں یعنی ظاہر المراد اور واضح المعنی ہیں جن کے معنی اور مفہوم میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس نہیں جو شخص ان کو سنے اور زبان سے اور اصطلاحات شریعت سے واقف ہو اس پر ان کا مفہوم مشتبہ نہیں رہتا۔ یہی آیتیں کتاب الٰہی کی اصل اور جڑ ہیں۔ انہی پر ساری تعلیم کا دارومدار ہے اور یہی آیتیں قرآن کا مغز ہیں۔

اور کچھ آیتیں اس کی متشابہ ہیں۔ جن کی مراد میں کچھ خفاء اور اشتباہ ہے سامع کو باوجود زبان دان ہونے کے اور باوجود غور و تامل کے اور باوجود اصول شریعت سے واقف ہونے کے ان کی پوری پوری مراد واضح نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے بندوں کو جتنا بتلانا چاہتے ہیں اتنی مقدار واضح فرما دیتے ہیں اور جس قدر نہیں بتلانا چاہتے اتنی مقدار اس میں خفا اور ابہام رکھ دیتے ہیں اور اس عزیز حکیم کا حکم یہ ہے کہ جس چیز کو ہم نے ظاہر اور واضح کر دیا اس کا اتباع کرو اور کتاب الٰہی کی جو چیز تم پر مخفی اور مشتبہ رہے اس پر بے چون و چرا ایمان لاؤ اور اس قسم کی آیات کی تفسیر میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھو کہ ان آیات کے کوئی معنی ایسے ہرگز ہرگز نہ بیان کیے جائیں جو آیات محکمات اور شریعت کے اصول مسلمہ کے خلاف ہوں۔ متشابہات کو محکمات کی طرف راجع کرو۔ امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت محکم کی مراد عقل سے معلوم ہوتی ہے اور آیت متشابہ میں بدوں نقل اور روایت کی مدد کے دخل دینا ممکن نہیں پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، طبعی طور پر کسی کفر اور بدعت کی طرف مائل ہیں نام کے مسلمان ہیں دل میں اپنے خیالات اور مزعومات چھپائے ہوئے ہیں سو یہ لوگ کتاب الٰہی میں سے صرف آیات متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔ تاکہ حق اور باطل کو مشتبہ بنا سکیں اتباع متشابہات سے کبھی تو ان

لوگوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو الحاد اور بدعت کے فتنہ میں مبتلا کریں اور لوگوں کے دلوں میں دین کی طرف سے شکوک اور شبہات ڈالیں اور اس طرح مغالطہ دے کر لوگوں کو گمراہی میں پھنسائیں اور کبھی غرض یہ ہوتی ہے کہ اُن آیات متشابہات کی کوئی ایسی تاویل تلاش کی جائے جو ان کی خواہش اور غرض کے مطابق ہو اور کھینچ تان کر کے آیت کا ایسا مطلب بیان کیا جائے جو اُن کی رائے اور ہوائے نفسانی کے موافق ہو ایسے لوگ اپنی مطلب برآری کے لیے آیات محکمات اور احادیث واضحات کی طرف نظر نہیں کرتے اور ہوائے نفسانی کی وجہ سے آیات متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں تا کہ اُن کے خفاء اور ابہام کی وجہ سے ان میں کھینچ تان کر کے اپنا مطلب نکال سکیں اور عوام کو دھوکہ دے سکیں حالانکہ ان متشابہات کی صحیح حقیقت اور یقینی مراد سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔ اس نے اپنے لطف وکرم سے جس قدر حصّہ پر آگاہ کرنا چاہا کر دیا اور جتنا حصّہ اپنی حکمت سے مخفی رکھنا چاہا وہ مخفی اور مشتبہ رکھا اور جو لوگ علم میں پختہ اور ثابت قدم ہیں۔ جب وہ آیات متشابہات کو دیکھتے ہیں کہ ان میں متعدد معانی کا احتمال ہے تو اپنی نفسانی خواہش اور طبعی میلان کا ذرہ برابر بھی لحاظ نہیں کرتے بلکہ متشابہات کو محکمات کے ساتھ ملا کر معنی بیان کرتے ہیں جتنا سمجھ میں آ گیا اُس کو سمجھ گئے اور جو نہ سمجھ میں آیا اُس کو اللہ پر چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم

اللہ ہی بہتر جاننے والا ہم کو تو ایمان سے مطلب ہے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم ان متشابہات پر اللہ کی مراد کے مطابق ایمان لائے سب کچھ یعنی محکم اور متشابہ اور ناسخ اور منسوخ جس کی مراد ہم کو معلوم ہے اور جس کی مراد ہم کو معلوم نہیں یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں محکم اور متشابہ سب سے ہماری تربیت مقصود ہے محکمات کو اس لیے نازل فرمایا کہ اس کے مطابق اعتقاد رکھیں اور عمل کریں۔ اور متشابہات کو اس لیے اتارا کہ اپنی قصور استعداد اور قصور علم کا اعتراف کریں اور ایسے مواقع پر آیات محکمات کا اتباع کریں۔ نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کریں اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہی لوگ کہ جن کی عقل سلیم اور خالص ہے نفسانی خواہشوں کے زنگ سے پاک اور صاف ہے جس بات کا مطلب اُن کی سمجھ میں نہیں آتا اس کو متکلم علیم وحکیم کے حوالہ کرتے ہیں اور لا ادری اور لا اعلم کہہ کر نصف علم حاصل کر لیتے ہیں اور باوجود اس کے وہ خائف رہتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ مبادا کسی پوشیدہ نفسانی خواہش کے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اس لیے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار بعد اس کے کہ تُو نے کتاب نازل فرما کر ہم کو ہدایت دی اور اُس کتاب کے محکم اور متشابہ پر ایمان لانے کی توفیق عطا کی اب اس لطف وعنایت اور اس توفیق اور ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو حق اور ہدایت سے کج اور منحرف مت فرما ہمیں اپنے دلوں پر اطمینان نہیں۔ دلوں کا ہدایت پانا اور حق کو قبول کرنا سب آپ کی توفیق سے ہے اور دے ڈال ہم کو اپنے پاس سے ہم کو خاص الخاص رحمت اور مہربانی یعنی توفیق اور فہم صحیح بے شک تو ہی سب کچھ عطا کرنے والا اور دے ڈالنے والا ہے۔ جس طرح ظاہری نعمتیں تیری بارگاہ سے ملتی ہیں اسی طرح علم صحیح اور فہم صحیح اور تاویل صحیح کی نعمت بھی تیری ہی بارگاہ سے ملتی ہے اور یہ سب تیری رحمت اور مہربانی ہے۔ تجھ پر کوئی شے واجب نہیں اور اے پروردگار چند علوم اور معارف اور متفرق تاویلات کا کسی کے سینہ میں جمع کر دینا تیرے لیے کوئی دشوار نہیں۔ اس لیے کہ تحقیق تو تمام لوگوں کو اکناف عالم سے اس دن کے لیے جمع کرنے والا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک اور شبہ ہی نہیں۔ پس اگر آپ اپنی رحمت سے ہم نابکاروں کے سینہ میں صحیح علوم اور صحیح تاویلات کو جمع فرما دیں تو بعید از رحمت نہیں ہم اگرچہ اس کے اہل اور لائق نہیں مگر آپ کا اہل انابت اور اہل مجاہدہ سے یہ وعدہ ہے کہ جو ہماری طرف رجوع کرتا ہے اُس کو اپنی خاص ہدایت اور توفیق سے سرفراز کرتے ہیں۔

كما قال الله تعالىٰ : ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:۶۹) ﴿وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ (الشوریٰ:۱۳) تحقیق اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں یا یہ معنی ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ تو نے وعدہ فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سب کو جمع کر کے نزاعی مسائل کا دوٹوک فیصلہ فرمائے گا۔ جس میں زائغین اور راسخین فی العلم کے اختلاف کا فیصلہ بھی داخل ہے۔ اس لیے ہمیں ڈر ہے کہ ہم زائغین اور مجرمین کا راستہ نہ اختیار کر لیں۔ کیونکہ ہمیں اپنے دلوں پر اطمینان نہیں اس لیے آپ ہی سے استقامت اور کجی سے محفوظ رہنے کی درخواست کرتے ہیں باوجود راسخین فی العلم ہونے کے اپنے علم پر مغرور نہ ہونا یہ بھی ان کے راسخ فی العلم ہونے کی ایک علامت ہے۔

لطائف ومعارف

① محکم اور متشابہ کی تفسیر میں سلف سے مختلف تعبیرات منقول ہیں۔ سب کا خلاصہ اور لبِ لباب یہ ہے کہ محکمات وہ آیتیں ہیں کہ جن کے معنی ظاہر ہوں اور اُن کی مراد معلوم اور متعین ہو خواہ نفسِ لغت کے اعتبار سے اُن کے معنی ظاہر ہوں یا شریعت کے بیان کر دینے سے ان کی مراد متعین ہو یعنی ان کی مراد یا تو اس لیے متعین ہے کہ لغت اور ترکیب اور سیاق وسباق کے اعتبار سے نظم قرآنی میں کوئی ابہام اور اجمال نہیں اور یا شریعت کے اعتبار سے اس کی مراد متعین ہے۔ مثلاً لفظ صلوٰۃ اور لفظ زکوٰۃ اگرچہ لغت کے اعتبار سے دعاء اور پاکیزگی کے معنی میں جس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن شریعت کے بیان اور نصوص قطعیہ اور اسلام کے اصولِ مسلمہ اور اجماع اُمّت سے یہ قطعاً متعین ہو چکا ہے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے متکلم کی مراد مخصوص طریقہ پر بدنی اور مالی عبادت بجالانا ہے۔ شریعت کے بیان سے ان آیات کی مراد اس قدر صاف اور واضح ہے کہ کوئی بدنیّت سے بدنیت بھی ان کے مفہوم اور معنی میں الٹ پھیر نہیں کر سکتا ایسی آیات کو محکمات کہتے ہیں۔

اور متشابہات ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد اور معنی کے معلوم اور متعین کرنے میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس واقع ہو جائے اور چونکہ اشتباہ اور تشابہ ایک امر اضافی ہے جس کے درجات اور مراتب ہیں۔ اس لیے متشابہ کی دو قسمیں ہیں ایک متشابہ تو وہ ہے جس کی مراد معلوم ہونے کی نہ تو امید ہی باقی رہی ہو اور نہ اس کی مراد معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ اور امکان ہو جیسے مقطعات قرآنیہ ﴿الٓمّٓ ۔ الٓمّٓرٰ ۔ طٰسٓمّٓ﴾ وغیرہ وغیرہ نہ لغت سے ان کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ شریعت نے ان کے معنی بیان کیے ہیں۔ اور دوسری قسم متشابہ کی یہ ہے کہ آیت میں اجمال اور ابہام یا اشتراک لفظی کی وجہ سے اُس کی مراد میں اشتباہ پیش آ گیا ہو۔ متشابہ کے یہ اصطلاحی معنی مجمل اور مؤول کو بھی شامل ہیں۔ پس اگر آیت میں متشابہات سے پہلے معنی مراد لیے جائیں تو اس معنی کو متشابہ کی مراد سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔

اور اگر متشابہات کے دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو اس معنی کو متشابہات کے معنی اور تاویل راسخین فی العلم کو بھی بقدر اپنے علم اور فہم کے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اصل کُنہ اور حقیقت اور پوری کیفیت اللہ ہی کو معلوم ہوتی ہے۔ لیکن راسخین فی العلم۔ جب محکمات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خداداد علم اور فہم سے ان میں غور وفکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جتنی تاویل اور معنی ان پر واضح کرنا چاہتے ہیں اتنی تاویل اور معنی ان پر واضح فرما دیتے ہیں اور متشابہ کی قسمِ اوّل کو اصطلاح میں متشابہ حقیقی کہتے ہیں اور متشابہ کی قسم ثانی

کو متشابہ اضافی کہتے ہیں۔

② سلف صالحین سے آیات متشابہات کی تاویل میں دو قول منقول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں جیسا کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ اور اکثر سلف سے یہی منقول ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ وغیرھم سے منقول ہے۔

ان دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں جن سلف کا یہ قول ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں اُن کی مراد متشابہ کی قسم اوّل ہے جیسے مقطعات قرآنیہ اور جن سلف سے یہ منقول ہے کہ متشابہات کی تاویل راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں اُن کی مراد متشابہ کی قسم ثانی ہے۔ جو مجمل اور مؤول اور محتمل سب کو شامل ہے۔

③ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ... الخ﴾ میں قراء اور مفسرین کا اختلاف ہے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف ضروری اور لازم ہے اور ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ جملہ مستانفہ یعنی کلام جدید ہے ماقبل پر عطف نہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں اور راسخین فی العلم متشابہات کی تاویل اور حقیقت کو محض اللہ پر چھوڑتے ہیں اور جو کچھ خدا تعالیٰ کی مراد ہے اس پر ایمان لاتے ہیں ان کا مسلک محض تفویض و تسلیم ہے۔

اور بعض کا قول یہ ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف جائز ہے ضروری اور لازم نہیں۔ یعنی یہ بھی جائز ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف کیا جائے اور ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ کو کلام جدید قرار دیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف نہ کیا جائے بلکہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ﴾ کا اللہ پر عطف کیا جائے۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد راسخین فی العلم بھی متشابہات کی تاویل اور معنی کو جانتے ہیں۔ سلف صالحین کی ایک کثیر جماعت کا یہی مسلک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے:

انا من الراسخین فی العلم انا اعلم تاویله.

"میں راسخین فی العلم سے ہوں اور میں متشابہ کی تاویل کو جانتا ہوں۔"

غرض یہ کہ وقف اور عطف کے بارہ میں سلف کے یہ دو قول ہیں اور سلف کا یہ اختلاف۔ اور نزاع حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور صوری ہے جن لوگوں نے متشابہ کے پہلے معنی مراد لیے ان کے نزدیک ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف ضروری اور لازم ہے اس لیے کہ مقطعات قرآنیہ جیسے متشابہات کی تاویل سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔

اور جن لوگوں نے متشابہ کے دوسرے معنی مراد لیے جو مجمل اور محتمل اور مؤول کو بھی شامل ہیں ان کے نزدیک ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ﴾ کا عطف لفظ اللہ پر جائز ہے اس لیے کہ ایسے متشابہات کی تاویل اور معنی غور و خوض کرنے اور محکمات کی طرف رجوع کرنے سے راسخین فی العلم کو بھی بقدر ان کے علم اور فہم ان پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اصل حقیقت اور اصل کنہ اللہ ہی کو معلوم ہوتی ہے مگر بقدر علم راسخین فی العلم بھی اُس کی تاویل کو جانتے اور سمجھتے ہیں اور متشابہ کے دوسرے معنی لے کر یہ بھی جائز ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف کیا جائے اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ متشابہات کی اصل تاویل اور صحیح کُنہ اور پوری حقیقت سوائے خدا تعالیٰ کے

کسی کو معلوم نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر متشابہات کے اوّل معنی مراد لیے جائیں تو ﴿اِلَّا اللّٰہُ﴾ پر وقف ضروری اور لازم ہوگا اور اگر آیت میں متشابہات کے دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو آیت میں وقف اور عطف دونوں جائز ہیں جس نے وقف کو ضروری قرار دیا اُس نے متشابہ کے پہلے معنی مراد لیے اور آیت میں وقف اور عطف کی جو قراءتیں آئی ہیں وہ دونوں حق اور صحیح ہیں جس قراءت میں غیر اللہ سے متشابہ کی تاویل کی نفی کی گئی ہے وہاں متشابہ کے اول معنی مراد ہیں اور جس قراءت میں غیر اللہ یعنی راسخین کے لیے متشابہات کی تاویل کے علم کو ثابت کیا گیا ہے وہاں متشابہ کے دوسرے معنی مراد ہیں (خوب سمجھ لو) اور جس نے عطف جائز قرار دیا اس نے متشابہ کے دوسرے معنی مراد لیے اس لیے عرض کیا گیا کہ یہ اختلاف اور نزاع حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور صوری ہے۔

④ لفظ تاویل متقدمین کی اصطلاح میں تفسیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے تفسیر ابن جریر میں جا بجا تاویل کا لفظ تفسیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور متاخرین کی اصطلاح میں کسی قرینۂ دلیل کی بناء پر ظاہر سے غیر ظاہر کی طرف پھیرنے کا نام تاویل ہے اور بلا کسی دلیل اور بلا کسی قرینہ کے ظاہر سے پھیرنے کا نام تحریف ہے لیکن تاویل کے یہ دونوں معنی اصطلاحی ہیں اور قرآن کریم میں جہاں کہیں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے وہاں تاویل سے مخفی حقیقت اور مصداق اور م آل اور انجام اور نتیجہ اور حکمت اور کلام کی غرض اور غایت کے معنی مراد لیے گئے ہیں لفظ تاویل اصل میں اول سے مشتق ہے جس کے معنی اصل کی طرف رجوع کرنے کے ہیں مثلاً: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ﴾ (الاعراف: ۵۳) سے یوم آخرت مراد ہے جس دن وعدہ اور وعید کا مصداق ظاہر ہوگا اور جزاء اور سزا کی حقیقت واضح ہوگی۔

اور ﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ﴾ (یونس: ۳۹) میں تاویل سے خبر خداوندی کے مصداق کا ظہور مراد ہے یا عاقبت اور انجام کے معنی مراد ہیں ہر خبر کا ایک لفظی مفہوم اور مدلول ہوتا ہے اور ایک اس کا خارجی اور واقعی مصداق ہوتا ہے جو وقوع کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانعام: ۶۷) قرآن کریم نے خبر کے اس خارجی اور وقوعی مصداق کو تاویل سے تعبیر کیا ہے۔ بسا اوقات خبر کا لفظی مدلول اور مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور اس کا خارجی مصداق مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ راسخین فی العلم اس خبر کے لفظی اور ظاہری مفہوم کو جانتے ہیں اور اس کے خارجی مصداق کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور هذا تاويل رويای میں تاویل سے تعبیر مراد ہے جو خواب کا مآل اور انجام اور خارجی مصداق ہے اور ﴿وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۳۵) میں تاویل سے م آل اور انجام کا مراد ہونا بالکل ظاہر ہے۔

اور ﴿ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ (الکہف: ۸۲) میں تاویل سے مصداق اور خارجی حقیقت اور حکمت کے معنی مراد ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں یہ دعا فرمائی:

((اللّٰهُمَّ فقهه فی الدين و علمه التاويل)).

ترجمہ: "اے اللہ اس کو دین کی سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما۔"

ظاہر ہے کہ یہاں تاویل سے مخفی حقیقت اور پوشیدہ حکمت کا منکشف کرنا اور م آل اور انجام کا ظاہر کرنا مراد ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

((كان رسول الله ﷺ يقول فى ركوعه و سجوده سبحانك اللهم ربنا و بحمدك اللهم اغفرلى يتأول القرآن)).

آنحضرت ﷺ رکوع اور سجود میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: ((سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ)) گویا کہ آپ اس دعا کے ذریعہ سے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کی تاویل ظاہر فرماتے یعنی اس آیت کا عملی مصداق بیان فرماتے کہ آیت قرآنی میں تسبیح وتحمید اور استغفار کی تاویل یہ ہے کہ رکوع میں اس طرح تسبیح اور استغفار پڑھی جائے۔

معلوم ہوا کہ حدیث میں تاویل سے کلام کا ظاہر سے پھیرنا مراد نہیں بلکہ اس کے خارجی مصداق کا تعین مراد ہے۔

⑤ اس سورت میں آیات قرآنی کی دو قسمیں بیان کی گئیں ایک محکم اور ایک متشابہ۔ اور سورۂ ہود کے شروع میں یعنی ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ میں قرآن کریم کی تمام آیات کو محکم بتلایا گیا۔ اور سورۂ زمر کی اس آیت۔ ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا﴾ (الزمر: ۲۳) میں سارے قرآن کو متشابہ بتایا گیا۔

سو ان آیات میں محکم اور متشابہ کے دوسرے معنی مراد ہیں محکم کے معنی لغت میں مضبوط اور مستحکم کے ہیں۔ چونکہ قرآن کریم نظم اور معنی کے اعتبار سے نہایت مستحکم اور سراسر حق اور سراپا حکمت ہے کہیں جائے انگشت نہیں اس لیے سارے قرآن کو محکم کہا گیا۔ اور متشابہ کے معنی لغت میں مشابہ اور ملتے جلتے کے ہیں اور چونکہ قرآن کی تمام آیتیں حسن اور خوبی۔ اور ہدایت اور فصاحت اور بلاغت میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اختلاف اور تناقض سے پاک ہونے میں ایک دوسرے کے متشابہ ہیں۔ كما قال الله تعالىٰ: ﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء: ۸۲) اس لیے تمام قرآن کو ﴿كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا﴾ فرمایا۔

پس جس جگہ قرآن کی بعض آیتوں کو محکم اور بعض کو متشابہ کہا گیا وہاں محکم اور متشابہ کے اور معنی مراد ہیں اور جہاں سارے قرآن کو محکم یا متشابہ کہا گیا وہاں اور معنی مراد ہیں۔ پس جب ہر جگہ معنی جدا جدا ہوئے تو آیات میں کوئی تعارض اور تناقض نہ رہا۔

⑥ آیت کو راسخین فی العلم سے شروع فرمایا اور ﴿اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ پر ختم فرمایا۔ معلوم ہوا کہ راسخین فی العلم وہ لوگ ہیں جن کی عقل نفسانی خواہشوں سے کج اور خراب نہ ہوگئی ہو جب تک عقل سے نفسانی خواہشوں کا زنگ دور نہ ہو وہ اللہ کے نزدیک راسخین فی العلم میں سے نہیں۔

قال ابن ابى حاتم ثنا محمد بن عوف الحمصى ثنا نعيم بن حماد ثنا فياض الرقى ثنا عبيد الله بن يزيد و كان قد ادرك اصحاب النبى ﷺ اَنَسًا وابا امامة و ابا الدرداء ان رسول الله ﷺ سئل عن الراسخين فى العلم فقال من برت يمينه و صدق لسانه و استقام قلبه و من عف بطنه وفرجه فذلك من الرٰسخين فى العلم. (تفسير ابن كثير ص ۲۰٤ ج ۲)

ترجمہ: "ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے بیان کیا کہ عبید اللہ بن یزید (کہ جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پایا اور انس بن مالک اور ابوامامہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہم کو دیکھا) وہ راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ راسخین فی العلم جن کا آیت میں ذکر ہے وہ کون لوگ ہیں آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی قسم اور نذر میں پورا ہو اور زبان کا سچا ہو اور دل اس کا جادۂ محبت و وفا پر قائم اور مستقیم ہو اور اس کا شکم اور اس کی شرمگاہ حرام اور شبہ سے عفیف اور پاک ہو۔ پس ایسا شخص راسخین

فی العلم میں سے ہے۔"

یعنی علم میں پختہ اور ثابت قدم وہی شخص ہے جس کا حال اور قال یہ ہو جو بیان کیا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ حال اور یہ قال انہیں لوگوں کا ہوسکتا ہے جن کے دل نفسانی خواہشوں کے زنگ سے صیقل ہو چکے ہوں۔ اور انوار و تجلیات کے عکس قبول کرنے کے لیے صاف و شفاف آئینہ بن چکے ہوں۔ اور راسخین فے العلم کے مقابل زائغین کا گروہ ہے جو نفسانی خواہشوں کی وجہ سے کج اور خراب ہو چکے ہیں۔ حق بات ان کے دل میں نہیں اترتی۔

ملحد اور زندیق رافضی اور خارجی اور تمام بدعتی فرقے اس میں داخل ہیں۔ جس طرح تمام اہلِ حق راسخین فی العلم میں داخل ہیں جس کا صحیح مصداق اہلِ سنّت والجماعت ہیں جو کتاب وسنت کے محکمات کو مضبوط پکڑتے ہیں اور متشابہات کو محکمات کے ساتھ ملا کر آیات کے معنی بیان کرتے ہیں۔ اپنی نفسانی خواہشوں کا اتباع نہیں کرتے بلکہ صحابہ و تابعین کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان فرمایا۔ پس جس شخص کا علم اور فہم خلفائے راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اجماع سے ٹکراتا ہو تو سمجھ لو کہ ایسا شخص زائغین میں سے ہے اُس سے بچتے رہو۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ
جو لوگ منکر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے ان کے مال اور نہ اولاد
اللّٰهِ شَیۡـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ۙ﴿۱۰﴾ كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَ
اللہ کے آگے کچھ وہی ہیں چھپٹیاں (ایندھن) دوزخ کی۔ جیسے دستور فرعون والوں کا، اور
الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ
جو ان سے پہلے تھے، جھٹلاتے ہماری آیتیں، پھر پکڑا ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر،
وَ اللّٰهُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَ
اور اللہ کی مار سخت ہے۔ کہہ دے منکروں کو کہ اب تم مغلوب ہو گے اور
تُحۡشَرُوۡنَ اِلٰی جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰیَةٌ فِیۡ
ہانکے جاؤ گے دوزخ کو اور کیا بری تیاری ہے۔ ابھی ہو چکا ہے تم کو ایک نمونہ،
فِئَتَیۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ اُخۡرٰی كَافِرَةٌ
دو فوجوں میں جو بھڑی تھیں۔ ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی راہ میں، اور دوسری منکر ہے

يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

یہ ان کو دیکھتے ہیں اپنے دو برابر، صریح آنکھوں سے اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⑬

اسی میں خبردار ہو جاویں جن کو آنکھ ہے۔

مال واولاد کے نشہ میں حق سے استغنا پر وعید اور تہدید

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ ... الیٰ ... لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⑬﴾

ربط: یہ آیتیں بھی نصارائے نجران کے بارہ میں نازل ہوئیں دلائل اور براہین سے حق ان پر واضح ہو چکا تھا مگر مال و دولت کے غرور اور نشہ نے ان کو قبول حق اور قبول ہدایت سے باز رکھا اس لیے ان ارباب غرور کی وعید اور تہدید کے لیے یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ آخرت میں مال اور اولاد کچھ کام نہ آئیں گے اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ اب ان کافروں سے یہ کہہ دیں کہ یہ لوگ عنقریب دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مغلوب ہوں گے اور قیامت کے دن جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے اور پھر واقعہ بدر کو ان کی عبرت کے لیے ذکر فرمایا۔ محمد بن اسحاق کی سیرت میں ہے کہ نصارائے نجران کا وفد جب بغرض مناظرہ مدینہ منورہ روانہ ہوا تو راستہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ اُن کا بڑا عالم ابوحارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا یکا یک خچر کو ٹھوکر لگی اور وہ عالم سواری سے گرا تو اس کے بھائی کُرز بن علقمہ کی زبان سے نکلا ((تَمِسَ الْاَبْعَدُ)) یعنی ہلاک ہو وہ شخص جس کے پاس ہم جا رہے ہیں اُس نے ((اَلْاَبْعَدُ)) سے آنحضرت ﷺ کو مراد لیا۔ العیاذ باللہ

ابوحارثہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

بَلْ تعِسْت اَنْتَ الَشتم رجلا من المرسلين انه الذی بشر به عيسٰی و انه لفی التوراة و الله انه النبی الذی ننتظرهٗ.

"بلکہ تو ہلاک ہو۔ کیا تو ایسے شخص کی شان میں نازیبا الفاظ کہتا ہے جو رسولوں میں سے ہے تحقیق بلاشبہ آپ وہی نبی ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے بشارت دی ہے اور جن کا تذکرہ توریت میں ہے اور خدا کی قسم یہ وہی نبی ہیں جن کے اخیر زمانہ میں ظہور کے ہم سب منتظر ہیں۔"

اس پر ابوحارثہ کے بھائی کُرز نے کہا۔

فما يمنعك منه و انت تعلم هذا.

"کہ جب تم کو ان کی نبوت و رسالت کا اس درجہ علم اور یقین ہے تو پھر ایمان لانے سے کیا چیز مانع ہے۔"

ابوحارثہ نے جواب دیا۔

لان هٰولاء الملوك اعطونا اموالا كثيرة واكرمونا فلو امنا به لا غذوا منا كل هذه الاشياء.

"کہ ہم ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ ان عیسائی بادشاہوں نے جو بے شمار اموال ہم کو دے رکھے ہیں اور ہمارا اعزاز و اکرام کرتے ہیں۔"

اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو یہ سب ہم سے چھین لیں گے۔

یہ کلمہ کرز کے دل میں اتر گیا اور یہ کہا کہ خدا کی قسم جب تک مدینہ پہنچ کر ایمان نہ لے آؤں گا اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھوں گا۔ اور کُرز اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوا اونٹنی کو تیز کیا اور بطور رجز یہ پڑھتا جاتا تھا۔

اِلَیْکَ تَغدُو قَلِقا وَضَینُھَا مُعْتَرِضاً فِي بَطْنِھَا جَنِیْنُھَا

"آپ ﷺ ہی کی طرف یہ اونٹنی چل رہی ہے دراں حالیکہ اس کا تنگ حرکت کر رہا ہے اور اس کے پیٹ میں اس کا جنین حرکت کر رہا ہے۔"

مُخَالِفًا دِیْنَ النَّصاریٰ دِیْنُھَا

"اب اس اونٹنی کا (یعنی اس کے سوار کا) دین۔ نصاریٰ کے دین کے خلاف ہے۔"

یہاں تک کہ کُرز وفد سے پہلے مدینہ منورہ پہنچا اور مشرف باسلام ہوا اور وفد بعد میں پہنچا۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۰۸ ج ۱۔ وروض الانف ص ۴۵ ج ۴ و اصابہ ص ۲۹۳ ج ۳ ترجمہ کرز بن علقمہ رضی اللہ عنہ) اور مشرف باسلام ہونے کے بعد کرز نے حج بھی کیا۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ یہ آیتیں اسی وفد کے بارہ میں نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں انہی لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس مال کے لالچ میں تم نے ایمان سے روگردانی کی ہے وہ قیامت کے دن کچھ کام نہ آئے گا اور جن سلاطین اور امراء پر تم کو بھروسہ ہے وہ عنقریب مسلمانوں کے ہاتھ سے مقہور اور مغلوب ہوں گے اور تمہارا تو ذکر ہی کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق جن لوگوں نے کفر اور انکار کی راہ اختیار کی اللہ کے مقابلہ میں اُن کے مال اور اُن کی اولاد جس پر ان کو ناز اور فخر ہے۔ ہرگز کچھ بھی کام نہ آئیں گے البتہ مسلمانوں کے مال اور اولاد آخرت میں کام آئیں گے اس لیے کہ مسلمانوں نے اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کیے اور اولاد کو اللہ کی عبادت اور دین کی تعلیم میں لگایا۔ اور ایسے کافر تو مع مال اور اولاد کے دوزخ کا ایندھن ہوں گے اور ان کا حال اور مآل تو فرعونیوں جیسا ہے کہ جس طرح دنیا میں فرعونیوں کو ان کے مال اور اولاد اُن کو اللہ کے قہر سے نہ بچا سکے ان کی بھی ایسی ہی گت بنے گی اور کچھ کام نہ آئے گا۔ اور جس طرح ان سے پہلے لوگوں نے یعنی قوم عاد اور ثمود اور قوم لوط نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس اللہ نے اُن کو اُن کے جرائم کی بناء پر پکڑا اور ہلاک کیا اُن کا سارا مال و متاع اور اولاد دھری رہ گئی اگر تم نے حق کو قبول نہ کیا تو سمجھ لو کہ تمہارا بھی یہی انجام ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے جس کے مقابلہ میں مال اور اولاد کچھ کام نہیں دیتا۔ اے نبی کریم ﷺ! آپ ان کافروں سے جو اپنے مال و دولت اور قوت اور کثرت پر نازاں ہیں یہ کہہ دیجیے کہ تم عنقریب اسی دار دنیا میں ہمارے دوستوں کے ہاتھ سے مغلوب اور مقہور ہوؤ گے اشارہ اس طرف ہے کہ بنو قریظہ اور بنو نضیر جلاوطن کئے جائیں گے اور خیبر اور مکہ فتح ہوگا۔ یہ ذلتیں تو ان منکرین کو دُنیا میں پہنچیں گی اور آخرت کی بابت یہ فرما دیجیے کہ تم جہنم کی طرف جانوروں کی طرح ہانکے جاؤ گے اور دوزخ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ چونکہ کفار اپنے مال

اور اولاد یعنی قوت اور کثرت اور ثروت پر نازاں تھے اور یہ کہتے تھے کہ ﴿نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ﴾ (سباء:۳۵) اور یہ خیال کرتے تھے کہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی مال و اولاد کام آئیں گی۔ کما قال اللہ تعالیٰ حکایۃ عنھم: ﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا﴾ (طٰہٰ) اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان آیات میں متنبہ فرمایا کہ مال و دولت صرف آخرت ہی میں بے سود نہ ہوگی بلکہ بسا اوقات وہ دنیا میں بھی سود مند اور کارآمد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جس کو غلبہ دینا چاہتے ہیں اس کے مقابلہ میں ساری قوت اور ثروت اور کثرت دھری رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو پیش گوئی فرمائی تھی چند روز کے بعد وہ حرف بحرف پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ سے بنو قریظہ اور بنو نضیر کو مقہور اور مغلوب کیا اور خیبر اور مکہ انہی فقراء مسلمین کے ہاتھوں پر فتح ہوا جن کو یہ حقیر سمجھتے تھے۔

ذکرِ استشہاد برائے دفع استبعاد

حق جل شانہٗ نے جب گزشتہ آیت ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ.... الخ﴾ میں مسلمانوں کے غلبہ کی خبر دی تو منافقین نے اس کو مستبعد سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے استبعاد دفع کرنے کے لیے بطور استشہاد واقعۂ بدر کو ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق تمہارے لیے دو جماعتوں کے بارہ میں ایک عبرت اور عجیب نمونہء قدرت ہے کہ جو باہم ایک دوسرے سے لڑیں اس معرکہ اور لڑائی میں ایک جماعت تو وہ تھی کہ جو خدا کی راہ میں لڑتی تھی یعنی مسلمانوں کی جماعت تھی جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور بے سروسامان تھی اور دوسری جماعت کافروں کی تھی جن کی تعداد نو سو پچاس تھی جو جنگی ساز و سامان سے لیس تھی اور جس کو اپنی قوت اور شوکت اور کثرت اور ثروت پر ناز تھا بدر کے میدان میں دونوں جماعتوں کا مقابلہ ہوا عین مقابلہ اور مقاتلہ کے وقت یہ کافر کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دو چند دیکھتے تھے۔ یعنی مسلمان کافروں کو دو چند (تقریباً دو ہزار) دکھائی دیتے تھے جس سے کافروں کے دل مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے اور یہ اس طرح کا دیکھنا صریح اور کھلی آنکھوں سے تھا کوئی خواب و خیال نہ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ قلیل کو کثیر اور کثیر کو قلیل کر کے دکھلائے حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اَخوَل (بھینگے) کو ایک کے دو دکھلاتا ہے یہ کوئی کذب اور دروغ نہیں بلکہ اس کی قدرت کا کرشمہ ہے جس طرح خوردبین اور دوربین سے چھوٹی چیز بڑی نظر آنے لگتی ہے تو یہ جھوٹ نہیں بلکہ کاریگری اور صنعت کا کمال ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ جو بعد میں مشرف باسلام ہوئے انہوں نے یہ بیان کیا کہ مسلمان ہم کو تعداد میں بہت نظر آئے اس طرح سمجھو کہ اگر حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اپنے دشمنوں کو وقتی طور پر دو درجہ کا بھینگا بنا دے کہ بجائے ایک کے تین نظر آنے لگیں تو یہ کوئی کذب اور دروغ نہیں بلکہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔

فائدہ: لڑائی شروع ہونے سے پہلے مسلمان، کافروں کی نظر میں تھوڑے دکھائی دیتے تھے جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے ﴿وَ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ﴾ (الانفال:۴۴) یعنی اے مسلمانو، اللہ تعالیٰ تم کو کافروں کی نظر میں تھوڑا کر کے دکھلاتا تھا۔ لیکن جب اس کے بعد گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو کافر، مسلمانوں کو خود اپنے سے بھی دو چند دیکھنے لگے پس اس آیت میں عین جنگ کے وقت کا ذکر ہے اور سورۂ انفال میں جنگ چھڑنے سے پہلے کا ذکر تھا۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض اور تناقض نہیں رہا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دیتے ہیں اور فتح اور غلبہ کا اصل مدار تائید خداوندی پر ہے تائید خداوندی کے مقابلہ میں کوئی طاقت اور قوت غالب نہیں

آسکتی جیسا کہ تم نے بدر کے معرکہ میں اس کا مشاہدہ کرلیا تحقیق اس بدر کے واقعہ میں آنکھ والوں کے لیے بڑی عبرت اور نصیحت ہے کہ کس طرح ایک کمزور اور بے سروسامان گروہ ایک پوری قوت اور شوکت والے گروہ پر غالب آ گیا وجہ اس کی یہ تھی کہ تائید خداوندی اور امداد غیبی مسلمانوں کے ساتھ تھی اور خدا کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا اس لیے تم کو چاہیے کہ تم اپنے مال و دولت کے غرور سے تائب ہو کر اس جماعت میں داخل ہو جاؤ کہ جن کے ساتھ تائید خداوندی ہے۔

فائدہ: آیت ﴿يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ﴾ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یرون کے ضمیر فاعل ﴿فِئَةٌ كَافِرَةٌ﴾ کی طرف راجع ہے جو قریب ہے اور هُمْ کی ضمیر مفعول مسلمانوں کی طرف راجع ہے اور مِّثْلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور کافروں کی طرف راجع ہے یعنی کافروں کا گروہ مسلمانوں کو اپنے سے دوچند دیکھتا تھا۔ تفسیر میں ہم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ یرون کی ضمیر تو حسب سابق فئۃ کافرۃ کی طرف راجع ہو اور هُمْ کی ضمیر مفعول بھی مسلمانوں کی طرف راجع ہو لیکن مِّثْلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور بجائے کافروں کے مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ کافر مسلمانوں کو مسلمانوں کے اعتبار سے دوچند دیکھتے تھے یعنی مسلمان کافروں کی نظر میں بجائے تین سو تیرہ کے چھ سو چھبیس دکھائی دیتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ کافر جب مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد دیکھیں گے تو مرعوب ہو جائیں گے۔ تیسرا قول یہ ہے يَرَوْنَ کی ضمیر فاعل مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور هُمْ کی ضمیر مفعول كٰفِرُوْنَ کی طرف راجع ہو اور مِّثْلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور مسلمانوں کی طرف راجع ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان کافروں کو اپنے سے دوچند دیکھتے تھے یعنی کافر مسلمانوں کی نظر میں چھ سو چھبیس دکھائی دیتے۔ کفار اگرچہ فی الواقع مسلمانوں سے سہ چند تھے مگر مسلمان اُن کو اپنے سے صرف دوچند دیکھتے اور سمجھتے تھے کیونکہ بہادر اور جری طبیعتیں اپنے سے دوچند سے مقابلہ کرنے کو معمولی بات سمجھتے ہیں لیکن دوچند سے زیادہ کا مقابلہ باعث تشویش اور پریشانی ہوتا ہے۔ چوتھا قول اور یہ درحقیقت قول نہیں بلکہ محض احتمال ہے وہ یہ کہ يَرَوْنَ کی ضمیر فاعل مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور هُمْ اور مِّثْلَيْهِمْ کی دونوں ضمیریں کافروں کی طرف راجع ہوں اور معنی یہ ہوں کہ مسلمان، کافروں سے دوچند دیکھتے تھے۔ یعنی کافر مسلمانوں کو تقریباً دو ہزار دکھائی دیتے تھے اس قول کا کوئی قائل نہیں محض احتمال عقلی ہے جو غیر معقول بھی ہے اس لیے کہ جب مسلمان، کافروں کو دو ہزار کی تعداد میں دیکھیں گے تو طبعی طور پر مرعوب ہو جائیں گے۔ تفصیل کے لیے تفسیر کبیر کی مراجعت کریں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ	
رجھایا ہے لوگوں کو مزوں کی محبت پر، عورتیں اور بیٹے اور ڈھیر	
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ	
جوڑے ہوئے سونے کے اور روپے کے اور گھوڑے پلے ہوئے اور	
الْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ	
مواشی اور کھیتی یہ برتنا ہے دنیا کی زندگی میں ، اور اللہ جو ہے اسی پاس	

حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭

ہے اچھا ٹھکانہ

بیان حقارت لذاتِ دنیویہ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭﴾

ربط: گزشتہ آیات میں کافروں کا حال بیان فرمایا کہ وہ مال و دولت کے نشہ میں چور ہیں اسلیے حق کو قبول نہیں کرتے اب ان آیات میں دنیوی لذات کا ہیچ اور فانی ہونا بیان کرتے ہیں کہ یہ تمام عیش و عشرت کے سامان محض چند روزہ ہیں اور عالم جاودانی کے مقابلہ میں بمنزلہ خواب کے ہیں پھر اس کے بعد آئندہ آیات میں حق تعالیٰ نے آخرت کی عظیم الشان اور جلیل القدر نعمتوں کو ذکر فرمایا جو آخرت میں اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کو عنایت ہوں گی۔

ان تمام آیات میں وفد نجران کی طرف اشارہ ہے کہ مال و جاہ کی محبت نے حق کے اتباع سے باز رکھا اور نصاریٰ کا سب سے بڑا عالم ابو حارثہ باوجود اعتراف اور اقرار کے اسی مال و دولت کی بدولت ایمان و ہدایت کی لازوال دولت سے محروم رہا۔

اور پھر لطف یہ ہے کہ ان آیات میں لذات کے اصول اور شہوات کے انواع اور اقسام کو بیان فرمایا کہ جن پر تمام دنیا کے تمتع اور فوائد کا دار و مدار ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ آراستہ اور خوشنما کر دی گئی ہے عام طور پر لوگوں کے لیے محبت۔ خواہشوں اور نفس کی آرزوؤں کی لوگ شہوات اور نفسانی خواہشات پر اتنے فریفتہ ہوئے کہ ان کا عیب اور نقصان بھی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ ان شہوات کی ظاہری زیب و زینت تو نظر آتی ہے اور باطنی قبح اُن کا نظر نہیں آتا اسی وجہ سے کبھی ان سے کنارہ کشی کا خیال بھی دل میں نہیں آتا۔ بے شک شہوات کی محبت آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے۔ البتہ * جو ﴿اُولِي الْاَبْصَارِ﴾ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے دل کی بینائی عطا کی ہے۔ وہ شہوات اور خواہشات کے پیچھے اندھے نہیں بن جاتے۔ نفس کے مقابلہ میں عقل کا اتباع کرتے ہیں اور اپنی ابصار کو نابینا ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں اور دنیا کے ساز و سامان پر مفتون اور فریفتہ نہیں ہو جاتے بلکہ ان سے عبرت پکڑتے ہیں گزشتہ آیت یعنی ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر تھا اب اس کے بعد ان شہوات اور خواہشات کے انواع اور اقسام کو ذکر فرماتے ہیں جن کی دُھن میں ساری دنیا سرگرداں اور حیران ہے یعنی اُن شہوات اور خواہشات میں کہ جن میں آدمی پھنس کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے ان میں سے سب سے اول عورتیں ہیں کہ دنیاوی لذتوں اور شہوتوں کا منتہیٰ ہیں متاع دنیا میں سے کسی چیز کی محبت۔ عورتوں کی محبت کو نہیں پہنچتی اسی وجہ سے حدیث میں ہے۔ ((ما ترکت * بعدی فتنة أضرّ علی الرّجال من النساء)). حضور ﷺ نے فرمایا: میرے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں جو مردوں کے لیے ضرر رساں ہو۔

---

* اس عبارت سے ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ کا گزشتہ آیت ﴿فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

* یہ ترجمہ ﴿مِنَ النِّسَآءِ﴾ میں سے لفظ ﴿مِنْ﴾ کا ہے اشارہ اس طرف ہے کہ یہ ﴿مِنْ﴾ بیانیہ ہے۔

اور دوسرے درجہ میں بیٹوں کی محبت ہے اور تیسرے درجہ میں سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانوں کی محبت ہے کہ جو تمام خواہشوں اور لذتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور چوتھے درجہ میں خوبصورت اور فربہ گھوڑوں کی محبت ہے جو سفر اور سیر وتفریح کا ذریعہ ہیں اور ظاہری شان وشوکت اور عزت ووجاہت اور فخر ومباہات کا سبب ہیں اور پانچویں درجہ میں چوپاؤں اور مویشی کی محبت ہے یعنی اُونٹ اور گائے اور بیل اور بھیڑ اور بکری کی محبت ہے جو انسان کا ذریعہ معاش ہیں گوشت اور دودھ کی غذا انہیں سے مہیا ہوتی ہے اور اون اور کھال اور چمڑا بھی انہی چوپاؤں سے حاصل ہوتا ہے جس سے کمبل اور جوتے وغیرہ بنتے ہیں اور چھٹے درجہ میں کھیتی کی محبت ہے جس پر انسان کی حیات کا دارومدار ہے۔ زراعت اگرچہ ضرورت کے لحاظ سے سب سے اوّل ہے لیکن شہرت اور لذت کے لحاظ سے سب سے آخر ہے۔ اس لیے اس کو سب سے آخر میں ذکر فرمایا۔ شہوات کی یہ انواع ستہ جو بیان ہوئیں بس یہی چند روزہ دنیاوی زندگانی کا کل سامان ہے۔ جس کا تمتع اور انتفاع عنقریب ختم ہوجائے گا اور اللہ کے نزدیک نہایت عمدہ ٹھکانہ ہے جس کی لذت اور نفاست کی کوئی حد نہیں اور اس کی بقاء اور دوام کی کوئی انتہا نہیں عاقل کا کام یہ ہے کہ اپنی تمام تر ہمت اور توجہ اس متاع آخرت کے حصول میں لگادے اور چند روزہ متاع کے پیچھے لگ کر حقیقی اور دائمی متاع سے غافل نہ ہوجائے۔

لطائف ومعارف

① **شہوات:۔** شہوت کی جمع ہے جس کے معنی خواہش اور رغبت کے ہیں لیکن اس جگہ شہوات سے مراد خواہش اور رغبت کی چیزیں ہیں۔ محض خواہش اور رغبت مراد نہیں اس لیے کہ محبوب اور مزین حقیقتاً وہ مرغوبات اور مشتہیات ہیں۔ خود شہوت اور رغبت محبوب اور مزین نہیں لیکن حق جل شانہ نے توبیخ اور ملامت میں مبالغہ کرنے کے لیے قابل شہوت اور قابل رغبت چیزوں کو شہوات سے تعبیر فرمایا ہے کہ تم ان اشیاء کی محبت میں اس درجہ مستغرق ہوگئے ہو کہ ان شہوات اور خواہشات کی محبت ہی تمہاری نظروں میں محبوب اور مزین بن گئی ہے اور بجائے اشیائے مرغوبہ کے ان کی رغبت ہی تمہاری مرغوب خاطر ہوگئی اور قابل اشتہاء چیزوں کی شہوت کی محبت ہی تمہاری محبوب اور مطلوب بن گئی ہے یہ عشق کا آخری درجہ ہے کہ محبوب کی محبت خود مستقل محبوب بن جائے اسی طرح قابل شہوت چیزوں کی شہوت کا محبوب بن جانا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ شخص لذات اور شہوات کے عشق میں آخری درجہ پر پہنچ چکا ہے اور اس کی نظیر قرآن کریم میں یہ ہے ﴿اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ﴾ (صٓ:۳۲) اور حدیث میں یہ ہے: ((اَللّٰهُمَّ انی اسالك حبك و حب من يحبك و حب عمل يقرب الى حبك)). نیز خواہش اور رغبت کی چیزوں کو شہوات سے تعبیر کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ ان اشیاء سے نفرت دلانا مقصود ہے اس لیے شہوات کا مفہوم ہی خست اور ذلت پر دلالت کرتا ہے اور شہوتوں کا اتباع بہائم کا کام ہے۔

② خیل مسومہ کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں کہ خیل مسومہ سے وہ گھوڑے مراد ہیں جن پر نمبر یا نشان لگا ہوا ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مسومۃ کے معنی موٹے تازے خوبصورت گھوڑے کے ہیں سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسومہ سے چرنے والے گھوڑے مراد ہیں۔ یعنی جو گھوڑے چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑ دئے گئے ہوں۔ اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ علاوہ سواری کے جو گھوڑے چراگاہ میں چرتے ہوں ان پر زکوٰۃ ہے جیسے انعام (چرنے والے) مویشی میں زکوٰۃ ہے اسی طرح نیل سائمہ چرنے والے گھوڑوں میں بھی زکوٰۃ ہے۔ تفصیل کے لیے بخاری شریف اور ہدایہ کی شروح کو دیکھا جائے۔

③ ذہب ذھاب سے مشتق ہے جس کے معنی زوال اور فناء کے ہیں اور فضہ انفضاض سے مشتق ہے جس کے معنی تفرق اور جدا ہونے کے ہیں ان دونوں لفظوں کا اشتقاق ہی ان کے فناء اور زوال کی خبر دیتا ہے اس لیے آیت کو ﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ پر ختم فرمایا یعنی یہ ساری چیزیں محض چند روزہ نفع کی ہیں اور کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

النَّا رُ اٰخر دينار نَطَقْتَ به　　والهم اخر هذا الدرهم الجارى
والمرء بينهما ان كان ذاوَرَع　　مُعَذَّبُ القلب بين الهم والنار

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ

تو کہہ میں بتاؤں تم کو اس سے بہتر؟ پرہیز گاروں کو اپنے رب کے ہاں

جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ

باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں ندیاں، رہ پڑے انہیں میں اور عورتیں ہیں ستھری، اور

رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۱۵ ۚ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ

رضامندی اللہ کی۔ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے

اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۶ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ وَ

ہم یقین لائے ہیں سو بخش ہم کو گناہ ہمارے اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔ وہ محنت اٹھانے والے اور

الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷

سچے، اور بندگی میں لگے رہتے اور خرچ کرتے اور گناہ بخشواتے پچھلی رات کو۔

بیانِ نفاست نعمائے اُخرویہ و مستحقین آنہا

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ ... اِلٰى ... وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷﴾

ربط: گزشتہ آیات میں لذات دنیویہ کی حقارت اور خساست کو بیان فرمایا اب ان آیات میں اُخروی نعمتوں کی نفاست کو بیان فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ ان نفیس اور لازوال نعمتوں کے اہل اور مستحق کون لوگ ہیں۔

نیز گزشتہ آیت میں یہ بتلایا تھا کہ دنیا کے سامان سے فقط دنیا کی چند روزہ زندگی میں نفع اُٹھایا جاسکتا ہے اب آئندہ آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ مستقل اور پائیدار فائدہ اور دائمی فلاح کے حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے نبی ﷺ آپ ان

لوگوں سے جو شہوات اور لذات کی محبت میں گرفتار ہیں یہ کہہ دیجیے کہ آؤ میں تم کو اس چیز کی خبر دوں جو اس متاع دنیا اور اس کی تمام شہوات اور لذات سے کہیں بہتر اور برتر ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ متقی اور پرہیز گار ہیں اور اپنے آپ کو شہوات اور لذات کی محبت اور پیروی سے بچا کر چلتے ہیں جیسے اہل صفہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے حضرات صوفیہ ایسے لوگوں کے لیے ان کے پروردگار کے نزدیک عجیب عجیب قسم کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ لوگ ان باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ داخل ہونے کے بعد کبھی بھی ان سے نہیں نکلیں گے اور ان کے لیے ایسی بیبیاں ہوں گی جو بظاہر اور باطن اور صورت وسیرت ہر اعتبار سے صاف اور ستھری ہوں گی اور ظاہری اور باطنی گندگی سے بالکل پاک ہوں گی اور ان سب نعمتوں سے بڑھ کر ان کو یہ نعمت ملے گی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو رضامندی اور خوشنودی کا پروانہ عطا ہوگا۔ اور جنت بھی فی الحقیقت اسی وجہ سے مطلوب ہے کہ وہ رضاء خداوندی کا محل ہے اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے، خاص بندوں پر خاص نظر عنایت ہے۔

نکتہ: اس آیت میں جنات (یعنی باغات) کا ذکر ان تمام شہوات اور خواہشات کے مقابلہ میں ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ جنت کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ (الزخرف:۷۱) یعنی جنت میں نفس کی تمام خواہش پوری ہوں گی اس آیت میں ﴿مِنَ النِّسَآءِ﴾ کے مقابلہ میں ﴿اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ کا ذکر فرمایا کہ جو حسن و جمال میں آفتاب اور ماہتاب سے بھی بڑھ کر ہوں گی اور حیض ونفاس وغیرہ کی آلائشوں سے بالکل پاک وصاف ہوں گی۔ اور جنت میں ﴿بَنِيْنَ﴾ یعنی بیٹے اور سب رشتے دار بھی جمع ہوں گے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ (طور:۲۱) رہے قناطیر مقنطرہ جو جنت کے مکانات سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنے ہوئے ہوں گے۔ وہاں ایک اینٹ سونے کی ہوگی اور ایک چاندی کی اور گارہ مشک کا ہوگا اور جنت کے برتن اور اس کا سامان بھی سونے اور چاندی کا ہوگا۔ اور موتیوں کے خیمے ہوں گے اور سواری کے لیے حقیقتاً برق رفتار گھوڑے ہوں گے اور لید اور پیشاب سے پاک ہوں گے اور جنت میں اَنعام اور حرث بھی ہوں گے غرض یہ کہ اس آیت میں جنت کا ذکر ان تمام شہوات اور متاع الحیٰوۃ اور دُنیا کے مقابلہ میں ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ اہل ایمان کو آخرت میں یہ چیزیں ملیں گی: ① اپنے مالک خداوند کریم کا قرب نصیب ہوگا۔ ② رہنے کے لیے باغات ہوں گے۔ ③ ہر دم ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ④ ایسی بیویاں ملیں گی جو ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک ہوں گی۔ ⑤ سب سے اعلیٰ اور عمدہ نعمت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ ان سے راضی ہو جائے گا بھلا کہاں یہ نعمتیں اور لذتیں اور کہاں وہ دُنیوی آلائشیں۔

صفاتِ متقین

اور جن عبادِ متقین کے لیے حق تعالیٰ نے سابق الذکر نعمتوں کا وعدہ فرمایا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو خاص طور پر یہ دعا ضرور مانگتے رہتے ہیں۔ کہ اے ہمارے پروردگار! ہم دل وجان سے ایمان لا چکے ہیں۔ ہمارے پاس اگر ایمان کے سوا کوئی بھی عمل صالح نہ ہو تو تیری بارگاہ میں تنہا ایمان ہی مغفرت کا سبب بن سکتا ہے۔ پس تو اپنی رحمت سے فقط ایمان ہی کو کافی قرار دے کہ ہمارے تمام

گناہوں کو بخش دے اور دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچالے اور یہ متقی لوگ بڑے صبر کرنے والے ہیں خدا کی راہ میں شدائد اور مصائب کا تحمل کرنے والے ہیں اور شہوات اور خواہشات سے مغلوب ہونے والے نہیں اور سچے اور راست باز ہیں اپنے اقوال اور افعال اور احوال اور نیتوں اور ارادوں سب میں سچے ہیں اور خشوع اور خضوع پر قائم رہنے والے ہیں اور خشوع اور خضوع ہی تمام عبادتوں کی روح ہے یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبودیت پر بالدوام قائم ہیں۔

فائدہ ①: قنوت کے معنی خشوع خضوع کے بھی آتے ہیں اور اطاعت پر قائم ودائم رہنے کے بھی آتے ہیں۔ آیت میں دونوں معنی بن سکتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی دولت کو خدا کے حکم کے مطابق خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی رات میں اٹھ کر استغفار کرنے والے ہیں یعنی باوجود اس اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کے اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں سے سحر میں دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ! اپنے فضل سے ہم کو معاف فرما۔

فائدہ ②: اخیر شب کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ اخیر شب کی نیند نفس کے لیے غایت درجہ لذیذ ہے ایسے وقت میں اٹھ کر دعا مانگنا شہواتِ نفس کا پورا مقابلہ کرنا ہے جو کمال ایمان کی دلیل ہے۔ نیز یہ وقت دعا کی قبولیت کا بھی ہے اور خدائے ذوالجلال کی بے چون و چگون اور بے مثال نزول اجلال کا وقت ہے۔ یہ وقت دعا کے لیے غنیمت کبریٰ ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا
اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور علم والوں نے وہی حاکم
بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ ﴿۱۸﴾
انصاف کا کسی کو بندگی نہیں سوا اس کے زبردست حکمت والا۔

رجوع بسوئے مضمون توحید

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ ... الیٰ ... لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾

ربط: ابتداء سورت میں نصارائے نجران سے خطاب تھا جس میں توحید کا اثبات اور الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال تھا درمیان میں اور مناسب مضامین کا ذکر فرمایا اب پھر اصل مضمون توحید کی طرف رجوع فرماتے ہیں کہ جو اصل ایمان ہے کیونکہ توحید کی شہادت ایمان کی اصل الاصول ہے اور توحید ہی پر خدا تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا دارومدار ہے گواہی دی اللہ تعالیٰ نے کہ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام کتابوں اور صحیفوں میں برابر اس مضمون کی گواہی دیتا رہا اور صحیفہ کائنات کا ایک ایک ورق اس کی توحید کی شہادت دے رہا ہے۔

و فی کل شیء له شاهد یدل علی انه واحد
ہر گیا ہے کہ از زمیں روید وحدہ لا شریک لہ گوید

اور فرشتوں نے بھی اس کی گواہی دی فرشتوں کی کوئی تسبیح اور تحمید اللہ کی توحید کے ذکر سے خالی نہیں اور علم والوں نے بھی ہر زمانہ میں توحید کی گواہی دی۔ علماء ہمیشہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے توحید کو ثابت کرتے رہے اور شرک کو باطل کرتے رہے یہاں تک کہ توحید کا مسئلہ اس درجہ واضح ہو گیا کہ مشرکین بھی اپنے کو مشرک کہنے سے عار کرنے لگے اور وہ معبود بھی اس شان کا ہے کہ ہر تدبیر کا انصاف اور اعتدال کے ساتھ قائم رکھنے والا ہے اس کی کوئی تدبیر عدل و انصاف سے باہر نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ مالک مطلق ہے اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے ظلم وہ ہے جو دوسرے کی ملک میں تصرف ہو اللہ تعالیٰ کی ہر تدبیر کا عین عدل اور عین حکمت ہونا یہ بھی اس کی توحید کی ایک مستقل دلیل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اللہ کے سوا کوئی لائق بندگی نہیں اس لیے کہ الٰہ یعنی معبود کے لیے عزت اور حکمت کا ہونا ضروری ہے اور وہی عزت والا ہے اور وہی حکمت والا ہے اس کی عزت اور غلبہ کا یہ عالم ہے کہ کوئی اس کے عدل اور تدبیر کو توڑ نہیں سکتا اور حکمت کا یہ عالم ہے کہ اس کی کوئی شے مقتضائے حکمت کے خلاف نہیں۔

نکتہ: عجب نہیں کہ لفظ ﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ کے ابطال کی طرف اشارہ ہو کہ یہ کون سا عدل اور انصاف ہے کہ ساری دُنیا کے جرائم تنہا ایک شخص پر لاد دیئے جائیں اور پھر اس ایک شخص کو بے قصور پھانسی پر لٹکا دیا جائے تا کہ وہ معصوم شخص سارے گنہگاروں کے لیے کفارہ بن جائے۔ خدائے عادل قدوس اس قسم کی گستاخیوں سے پاک اور منزہ ہے۔ ﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝﴾ (الانعام)

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ قف وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری اور مخالف نہیں ہوئے کتاب والے
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ
مگر جب ان کو معلوم ہو چکا آپس کی ضد سے۔ اور جو کوئی منکر ہو اللہ
اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ
کے حکموں سے تو اللہ شتاب لینے والا ہے حساب۔ پھر جو تجھ سے جھگڑیں۔ تو کہہ میں نے تابع کیا
وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ
اپنا منہ اللہ کے حکموں پر اور جو کوئی میرے ساتھ ہے اور کہہ دے کتاب والوں کو اور ان پڑھوں کو
ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ
کہ تم بھی تابع ہوتے ہو؟ پھر اگر تابع ہوئے تو راہ پر آئے۔ اور اگر ہٹ رہے تو تیرا ذمہ یہی ہے
الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۱
پہنچا دینا۔ اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے۔

بیان حقانیتِ اسلام وجواب مجادلہ مخالفینِ اسلام

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ... الٰی ... وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾﴾

ربط: گزشتہ آیت میں توحید کی شہادت کو ذکر فرمایا جو اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اب اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین صرف دین اسلام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: تحقیق وہ دین کہ جو اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہے وہ صرف اسلام ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ اس لیے کہ اسلام کے معنی اپنے آپ کو ایک خدا کے حوالہ اور سپرد کر دینے کے ہیں اور مسلم اور مسلمان اس بندہ کو کہتے ہیں جس نے ہمہ تن اپنے آپ کو خدائے واحد کے سپرد کر دیا ہو اور اس کے احکام کے سامنے گردن ڈال دی ہو اور بالفاظ دیگر اسلام، نام اطاعت اور فرمانبرداری کا ہے اور مسلم اس بندہ کا نام ہے کہ جو خدائے واحد کا فرمانبردار اور اطاعت شعار ہو شروع سے لے کر اخیر تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا یہی دین رہا ہے کہ ایک خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔ پس جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور مسیح اور مریم علیہما السلام کی تصویروں کو پوجتے ہیں یا جو بے وقوف درختوں اور پتھروں اور چاند اور سورج اور ستاروں کو پوجتے ہیں ان کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں توحید اور اخلاص واطاعت کے لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام ادیانِ سماویہ متفق رہے۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾﴾ (الانبیاء:۲۵)

غرض یہ کہ اسلام اور توحید ایک واضح اور مسلم حقیقت تھی اس میں ذرہ برابر اختلاف کی گنجائش نہ تھی مگر شہوات اور لذات کی محبت نے خود غرضوں اور شہوت پرستوں کو اختلاف پر آمادہ کیا کوئی حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا قائل ہوا اور کوئی ان کی ابنیت اور فرزندیت کا قائل ہوا اور کوئی حلول کا قائل ہوا کہ معاذ اللہ خداوند قدوس حضرت مسیح علیہ السلام میں حلول کر آیا ہے اور کوئی اتحاد کا قائل ہوا کہ خدا تعالیٰ اور مسیح ابن مریم علیہما السلام ایک ہیں اور اہل کتاب نے اس بارہ میں لاعلمی کی بناء پر اختلاف نہیں کیا۔ مگر صحیح علم آنے کے بعد جان بوجھ کر اختلاف کیا اہل کتاب کو اس بات کا خوب علم تھا کہ اللہ کے نزدیک اسلام ہی پسندیدہ دین ہے کیونکہ توریت اور انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا ہے اور یہ ان کا اختلاف اشتباہ اور خفاء کی بناء پر نہ تھا بلکہ محض باہمی حسد اور آپس کی ضد سے تھا۔ ابن جریر رضی اللہ عنہ نے محمد بن جعفر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے بارہ میں نازل ہوئی۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کو کسی نے نہیں جنا اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندہ اور رسول ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں جو اختلاف ہوا وہ یہودیوں کی عداوت کی بنا پر ہوا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے انکار کیا اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی اس لیے نصاریٰ ضد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت کے قائل ہو گئے کہ معاذ اللہ یہ خدا کے بیٹے ہیں اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس آیت میں اختلاف سے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں اختلاف کرنا مراد ہے۔ اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار یا اللہ کے حکموں سے انحراف کرے اور اسلام اور توحید کو نہ مانے تو خوب سمجھ لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ ان لوگوں سے اس اختلاف پر محاسبہ کرے گا اور سزا دے گا۔ پس جب کہ دلائل اور براہین سے اسلام کی حقانیت واضح ہو گئی اس کے بعد بھی اگر اہل کتاب آپ سے کٹ حجتی اور مخاصمہ کریں اور اس صریح اور واضح امر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیجیے کہ میں نے اور میرے متبعین نے تو اپنا چہرہ خالص اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے اور اسلام

اور توحید کی راہ اختیار کر لی ہے یعنی میں نے اور میرے متبعین نے تو انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اختیار کر لیا ہے۔ پس اگر تم تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم کے برخلاف کسی کو خدا اور خدا کا بیٹا بناتے ہو تو بناؤ میں اور میرے متبعین اس سے بری ہیں اور آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ جن کو کتاب دی گئی یعنی یہود اور نصاریٰ سے اور ان پڑھوں سے یعنی مشرکین عرب سے بھی جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ان سب سے یہ کہہ دیجیے کہ کیا تم بھی ہماری طرح اسلام میں داخل ہوتے ہو یا نہیں۔ پس اگر یہ لوگ تمہاری طرح اسلام لے آئیں تو وہ تمہاری طرح ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر تمہاری طرح اسلام لانے سے منہ موڑیں اور الوہیت اور ابنیت مسیح علیہ السلام کے عقیدہ پر اڑے رہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نقصان نہیں۔ آپ کے ذمہ فقط حق کا پہنچا دینا اور دلائل اور براہین سے واضح کر دینا ہے سو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے اور اللہ کی نگاہ میں ہیں تمام بندے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

فائدہ: جو شخص دلائل اور براہین کو نہ مانے اور صریح عناد پر اُتر آئے تو ایسے شخص کے سامنے بحث کرنا فضول ہے، اور ناحق اپنے وقت کا ضائع کرنا ہے اس لیے اتمام حجت کے لیے یہ بات کہہ کر کلام ختم کر دینا مناسب ہے کہ ہم تو خالص اللہ کے فرمانبردار بندے بن چکے ہیں اب تم اپنی جانو۔ ہم کسی پر زبردستی نہیں کرتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ
جو لوگ منکر ہیں اللہ کی آیتوں سے اور مار ڈالتے ہیں نبیوں کو ناحق اور
يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ
مار ڈالتے ہیں جو کوئی کہے انصاف کو لوگوں میں سے سو ان کو خوشخبری سناؤ دکھ والی مار
اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫
کی۔ وہی ہیں جن کی محنت ضائع ہوئی دنیا میں اور آخرت میں،
وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ
اور کوئی نہیں ان کا مددگار ۔ تو نے نہ دیکھے وہ لوگ جن کو ملا ہے کچھ ایک حصہ
الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ
کتاب کا ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب پر کہ ان میں حکم کرے پھر ہٹ رہتے ہیں بعض
مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ
ان میں تغافل کر کر۔ یہ اس واسطے کہ کہتے ہیں ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ

اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۚ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

مگر کئی دن گنتی کے۔ اور بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ قف وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا

پھر کیسا ہوگا؟ جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن جس میں شبہ نہیں۔ اور پورا پاوے گا ہر کوئی

كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

اپنا کیا' اور ان کا حق نہ رہے گا۔

ذکر بعض احوالِ شنیعہ یہود بے بہبود

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ ... الٰی ... وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾

شروع سورت میں روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا اور گزشتہ آیات میں اہل کتاب کے عنوان سے یہود اور نصاریٰ دونوں کو خطاب تھا اب ان آیات میں خاص یہود کے بعض افعال شنیعہ کو بیان فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمت کے علماء کو قتل کرنا یہود کا خاص شیوہ ہے۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں یہود کا قاتل انبیاء علیہم السلام ہونا بیان ہوا ہے۔ اس لیے اس آیت سے خصوصیت کے ساتھ یہود کو خطاب شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: تحقیق جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کو دیدہ و دانستہ جان بوجھ کر ناحق قتل کرتے ہیں۔ یعنی خود بھی جانتے ہیں کہ ہمارا یہ فعل سراسر ناحق ہے مگر حق کی عداوت اور دُنیا کی محبت میں اتنے اندھے بنے کہ جو برگزیدہ صفات حضرات' حق اور ہدایت کو لے کر آتے تھے ان کو قتل کرنے لگے اور انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کی اُمت کے علماء اور صلحاء کو بھی قتل کرتے ہیں جو ان کو عدل اور انصاف اور حکمت کی باتوں کا حکم دیتے ہیں۔ جیسا کہ آج کل یہود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قتل سے ان کو دریغ نہیں۔ یہی ان کے اسلاف کا طریقہ تھا جس پر یہ گامزن ہیں۔ سو ایسے قسی القلب لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔ یہی وہ گروہ ہے جس اعمال کے حسنہ دُنیا اور آخرت میں ضائع او ربے کار گئے۔ یعنی دونوں جہان کی کامیابی سے محروم ہوئے اور دُنیا اور آخرت کی ذلتیں سر پر پڑیں اور کوئی ان کا مددگار نہیں کہ ان کے اعمال کو حبط ہونے سے بچائے اور دنیا اور آخرت کی کسی ذلت اور مصیبت کو ان سے دفع کر سکے۔

فوائد

① ابوعبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب کس کو ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جس نے خدا کے کسی نبی کو قتل کیا یا اس شخص کو قتل کیا جس نے اچھی

بات کا علم کیا اور بُری بات سے منع کیا۔ اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ سے وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴾ تک اور یہ ارشاد فرمایا: اے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ! بنی اسرائیل نے شروع دن میں تینتالیس نبیوں کو ایک گھڑی میں قتل کیا۔ اس پر بنی اسرائیل کے ایک سو ستر عابد و زاہد اور صوفی لوگ کھڑے ہوئے اور ان ناہنجاروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا۔ بنی اسرائیل نے اخیر دن میں ان تمام نصیحت کرنے والوں کو بھی قتل کر دیا۔ (اخرجہ ابن جریر)

② علماء چونکہ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور ان کا مرتبہ انبیاء علیہم السلام کے بعد ہے اس لیے علماء کے قتل کا جرم انبیاء علیہم السلام کے قتل کے بعد دوسرے درجہ میں ہے۔

③ آیت میں انبیاء علیہم السلام اور علماء کے قاتلین کی دو سزائیں ذکر کی گئیں۔ ایک حبط اعمال دوسرے ﴿ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴾ انبیاء کرام علیہم السلام چونکہ منبع ہدایت تھے اس لیے ان کے قتل پر حبط اعمال کی سزا ملی۔ اور علماء چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اعوان اور انصار اور معین و مددگار تھے۔ اس لیے علماء کے قتل کی سزا میں ﴿ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴾ فرمایا یعنی ان کو خدا کی سزا سے کوئی بچانے والا اور مدد کرنے والا نہ ملے گا۔

استعجاب پر اعراض اہل کتاب

گزشتہ آیات میں اسلام کی حقانیت کو دلائل اور براہین سے واضح فرمایا اور اہل کتاب کو خاص طور پر اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی مگر ان لوگوں نے اعراض کیا اب آئندہ آیات میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کا اسلام سے اعراض کرنا نہایت عجیب ہے کہ توریت اور انجیل کے عالم ہیں اور نبی کریم کی بشارت اور صفت جو توریت اور انجیل میں مذکور ہے اس سے واقف ہیں مگر پھر بھی اعراض کرتے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن بیت المدراس (یہودیوں کے مدرسہ میں) تشریف لے گئے اور وہاں جا کر ان کو اللہ کے دین کی دعوت دی۔ نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے کہا کہ آپ کا دین کیا ہے؟ حضور پُرنور ﷺ نے فرمایا: کہ جو ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرات ابراہیم علیہ السلام تو خود دین یہود پر تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا اگر یہ سچ ہے تو توریت لے آؤ اور اس میں دکھلا دو یہ مضمون کس جگہ لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام دین یہود پر تھے؟ ان دونوں شخصوں نے توریت لانے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ ... الخ ﴾ یعنی اے نبی کریم ﷺ ! کیا آپ ﷺ نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی کہ جن کو توریت کے علم کا ایک کافی حصہ دیا گیا جس سے حق اور باطل کا فرق ان پر واضح ہو سکے۔ مگر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو اسی اللہ کی کتاب (توریت) * کی طرف بلایا جاتا ہے جس کے یہ حامل اور عالم

---

* اور بعض علمائے تفسیر نے اس جگہ کتاب سے قرآنِ کریم مراد لیا ہے کہ ان کو قرآن کریم کی طرف دعوت دی جاتی جو توریت اور انجیل کی بشارات کے موافق آیا ہے اور تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے۔ پس ان میں علماء کا ایک فریق اعراض کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی طرف دعوت دینا درحقیقت توریت اور انجیل کی طرف دعوت دینا ہے اور قرآن پر ایمان لانا توریت و انجیل پر ایمان لانا ہے۔ مگر محققین نے اس جگہ کتاب اللہ سے توریت مراد لی ہے اس لیے ہم نے تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا۔

ہیں اوراس پرایمان کے مدعی ہیں تا کہ یہ توریت ان کے درمیان فیصلہ کردے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نہیں اور جوان کا مقدمۂ زنا حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا ہے توریت اس کا بھی فیصلہ کردے کہ توریت میں رجم کا حکم مذکور ہے یا نہیں۔ پس یہ لوگ اقرار کرتے ہیں کہ توریت اللہ کی کتاب ہے اور فصل خصومات کے لیے نازل ہوئی ہے۔ مگر باوجود اس اقرار کے پھر بھی ان کا ایک فریق اس سے اعراض اور روگردانی کرتا ہے اور یہ لوگ اس وقتی اور عارضی اعراض پر اقتصار نہیں کرتے کہ اس وقت سے پہلے توریت کے احکام پر عمل کرتے رہے ہوں اور فقط اسی ایک موقع پر اعراض اور روگردانی کر بیٹھے ہوں۔ بلکہ یہ لوگ ہر حال میں اعراض کرنے والے ہیں یعنی اعراض ان کی لازمی صفت اور دائمی عادت ہے۔

فائدہ: ﴿يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ میں تولّٰی سے بالفعل اور وقتی طور پر اعراض کرنا مراد ہے اور ﴿وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اعراض ان کا دائمی اور لازمی وصف تھا۔ اس لیے کہ جملہ اسمیہ اثبات اور دوام کے بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس لیے ﴿يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ کے بعد ﴿وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ کا ذکر غایت درجہ بلیغ اور لذیذ ہوگا اوان کے اس اعراض اور انحراف کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ ہم کو آگ ہرگز نہ لگے گی مگر چند گنتی کے روز یعنی چالیس دن کی مقدار کہ جس میں ان کے بڑوں نے گوسالہ کی پرستش کی تھی فقط اتنی مقدار عذاب ہوگا اور پھر مغفرت ہوجائے گی اور عذاب سے نجات مل جائے گی۔ اسی فاسد اعتقاد کی بناء پر یہ لوگ ایمان اور عمل کا اہتمام نہیں کرتے اگر خدا کے عذاب کو دائمی سمجھتے تو پھر اس کے مطابق اہتمام کرتے چند روزہ سمجھ کر پرواہ نہیں کرتے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے انتساب پر اعتماد کیے ہوئے ہیں اور اپنی نجات کا اعتقاد کیے ہوئے ہیں اس لیے آخرت کی عقوبت کو سہل اور خفیف سمجھتے ہیں اور ایمان اور عمل صالح کا اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اس بات کو بیان کرتے چلے آئے کہ نجات کا دارومدار ایمان اور عمل صالح اور تقویٰ پر ہے۔ بدوں ایمان کے انتساب کچھ کام نہیں آئے گا اور یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان کو دین کے بارہ میں اعتقادات اور خیالات نے جو یہ اپنی طرف سے بناتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے چہیتے بیٹے ہیں اور اس کے نبیوں کی اولاد ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کرلیا ہے کہ ان کی اولاد کو عذاب نہ دے گا مگر برائے نام۔ اور نصاریٰ نے کفارہ کا مسئلہ نکال رکھا ہے کہ سارے عالم کے گناہوں کا حساب ایک اکلوتے بیٹے کے صلیب پر چڑھ جانے سے بے باق ہوگیا۔ پس یہ لوگ اپنی ان افتراء پردازیوں پر آج دنیا میں اپنا دل خوش کرلتے ہیں مگر یہ تو سوچیں کہ اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب ہم سب کو حساب وکتاب کے لیے ایک دن جمع کریں گے جس کے بارہ میں ذرہ برابر کوئی شک وشبہ نہیں اور وہ دن ایسا ہوگا کہ ہر نفس کو اس چیز کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا جو اس نے دُنیا میں کمایا تھا اور ذرہ برابر ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا کہ بلا جرم یا جرم سے زیادہ ان کو سزا دے دی جائے یا ان کی کوئی حق تلفی ہوجائے یعنی نیکیوں کا بدلہ نہ دیا جائے یا کم دیا جائے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ

تو کہہ یا اللہ مالک سلطنت کے تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لیوے

مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ

جس سے چاہے اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے تیرے ہاتھ سب خوبی

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ

بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو لے آوے رات کو دن میں اور تو لے آوے دن کو

فِي الَّيْلِ ۫ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَ

رات میں اور تو نکالے جیتا مردے سے اور تو نکالے مردہ جیتے سے اور

تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

تو رزق دیوے جس کو چاہے بے شمار۔

بشارت غلبہ مؤمنین براعداء بعنوان مناجات ودُعا

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ... الیٰ... وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾﴾

ربط: کفار دُنیا اور سامان دُنیا پر مغرور تھے اور آنحضرت ﷺ کو اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اور احباب کو فقر و فاقہ کی وجہ سے بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ اس آیت میں اسی کے جواب کی طرف اشارہ ہے کہ سلطنت اور دولت کا عروج اور نزول اور عزت اور ذلت سب خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اس طرح دعا مانگو ہم تم کو بے مثال سلطنت عطا کریں گے جس کو یہ مذاق اُڑانے والے بھی دیکھ کر حیران اور دنگ رہ جائیں گے۔ گویا کہ یہ دُعا ایک طرح کی پیشین گوئی تھی کہ عنقریب دُنیا کی کایا پلٹ ہونے والی ہے اور یہ بے سروسامان مسلمان قوم عزتوں اور سلطنتوں کی مالک بنے گی اور جو بادشاہت کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ذلت کے گڑھے میں گرائے جائیں گے او یہ مادی سلطنت کیا چیز ہے جس خداوند ذوالجلال نے نبوت ورسالت کے منصب جلیل کو بنی اسرائیل سے بنی اسرائیل کی طرف منتقل کر دیا تو اسے روم وعجم کی ظاہری سلطنت کا عربی کے خانہ بدوشوں کی طرف منتقل کر دینا کیا مستبعد ہے۔

شانِ نزول:

غزوۂ احزاب میں نبی کریم علیہ السلام نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خندقیں کھودنے کا حکم دیا ہر دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ کھودنے کے لیے مقرر کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے خندق کھودنا شروع کیا اس درمیان میں ایک بڑی چٹان نمودار ہوئی جس پر کدال کچھ کام نہ کرتا تھا۔ جب

آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ اس جگہ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور سلمان رضی اللہ عنہ سے کدال لے کر اس چٹان پر ایک ضرب لگائی جس سے وہ چٹان شق ہوئی اور اس سے ایک ایسی روشنی نمودار ہوئی جس سے تمام مدینہ روشن ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرے میں چراغ روشن ہوگیا ہے۔ حضور ﷺ نے تکبیر پڑھی یعنی اللہ اکبر کہا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ اللہ اکبر کہا۔ پھر حضور پُر نور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں حیرہ کے محلات دکھلائے گئے۔ پھر آپ ﷺ نے دوسری ضرب لگائی اس سے بھی ایک روشنی نمودار ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ مجھے اس روشنی میں روم کے سرخ محلات دکھلائے گئے، یہ کہہ کر آپ ﷺ نے پھر تیسری بار کدال ماری جس سے پھر ویسی ہی روشنی نمودار ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں صنعاء (جو ملک یمن کا دارالسلطنت ہے) کے محلات دکھلائے گئے اور مجھے جبرئیل امین علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ عنقریب ان سب ممالک پر میری اُمت کا تسلط اور غلبہ ہوگا۔ جب کافروں اور منافقوں نے یہ سنا تو کہنے لگے اے مسلمانو! تمہارا نبی بھی خوب ہے کیسی عجیب باتیں کرتا ہے یثرب سے اس کو مدائن اور حیرہ کی عمارتیں نظر آتی ہیں اور خوف کا حال یہ ہے کہ ایک معمولی دشمن کے ڈر سے تم سے خندقیں کھدوا رہے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اے محمد ﷺ آپ ان کفار نا ہنجار کے تمسخر اور استہزاء کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کریں یوں کہو یعنی اس طرح ہم سے دُعا مانگو۔ ہم آپ ﷺ کے غلاموں اور خادموں کو سلطنت عطا کریں گے۔ اس طرح دُعا مانگو اے اللہ! مالک بادشاہی اور سلطنت کے ہم کو بادشاہی اور عزت عطا فرما تا کہ کوئی کافر تیرے دین اور تیرے نام لیواؤں کو ذلیل نہ کر سکے اور شان وشوکت کے ساتھ تیرے دین کے احکام جاری ہوں ہم اگرچہ قلیل اور ظاہر میں ذلیل ہیں مگر آپ کو سب کچھ قدرت ہے اس لیے کہ آپ مالک مطلق اور قادر مطلق ہیں جس کو چاہیں بادشاہی اور سلطنت عطا فرمائیں اور جس سے چاہیں سلطنت چھین لیں تیرے ہاتھ میں ہے ہر بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں اور عزت کو ذلت سے اور ذلت کو عزت سے بدلنا ایسا ہی آپ کی قدرت میں ہے جیسا کہ نور کو ظلمت سے اور ظلمت کو نور سے بدلنا آپ کی قدرت میں ہے اس لیے کہ آپ کو یہ قدرت ہے کہ رات کے ایک حصہ کو دن میں داخل کر دیتے ہیں جس سے دن بڑا ہو جاتا ہے اور کسی فصل میں دن کے کسی حصہ کو رات میں داخل کر دیتے ہیں جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی موسم میں رات چودہ گھنٹے کی ہوتی ہے اور دن دس گھنٹہ کا پھر چند ماہ بعد رات کے چار گھنٹے کاٹ کر دن میں داخل کر دیئے جاتے ہیں جس سے دن چودہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے اور رات دس گھنٹے کی رہ جاتی ہے اور تو ہی نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور تو ہی نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے جیسے بیضہ سے چوزہ اور چوزہ سے بچہ اور عالم سے جاہل اور جاہل سے عالم اور مومن سے کافر اور کافر سے مومن اور تو ہی روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار یہ آپ کی قدرت کاملہ اور جود وکرم کے چند نمونے ہیں اس لیے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے قلوب کو ایمان اور تقویٰ کے نور سے منور فرما اور ہم کو حکومت وسلطنت عطا فرما تا کہ تیرے اتارے ہوئے دستور اور قانون کو شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ دنیا میں جاری کر سکیں۔

فوائد

① طبرانی کی معجم صغیر میں ہے کہ ایک جمعہ کو نبی کریم ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نماز میں نہ دیکھا تو خود اُن کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا: اے معاذ رضی اللہ عنہ! کیا بات ہے آج میں نے تم کو نہیں دیکھا۔ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ایک یہودی کا میرے ذمہ ایک اوقیہ

(چالیس درہم) قرض تھا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے گھر سے نکلا راستہ میں اس یہودی نے مجھ کو روک لیا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اے معاذ رضی اللہ عنہ کیا میں تمہیں ایسی دُعا نہ بتاؤں کہ اگر تمہارے ذمہ پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ادا کردے وہ دُعا یہ ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○
رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ رَحِيْمَهُمَا تُعْطِيْ مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ وَتَمْنَعُ مَنْهُمَا مَنْ تَشَآءُ اِرْحَمْنِيْ رَحْمَةً تُغْنِيْنِيْ بِهَا عَنْ رَّحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ اَللّٰهُمَّ اقْضِ عَنِّي الَّذِيْنَ وَاَغْنِنِيْ مِنَ الْفَقْرِ وَتَوَفِّنِيْ فِيْ عِبَادَتِكَ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِكَ.

(تفسیر قرطبی ص ۵۲ ج ۱ ودر منثور و شرح حصن حصین ص ۲۰۹)

② بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس آیت کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس پر مداومت کرے اللہ تعالیٰ اس کو قرض سے سبکدوش فرماتا ہے۔

③ بعض بزرگوں نے یہ تخصیص بھی کی ہے کہ ہر نماز کے بعد سات سات بار پڑھے اور بزرگوں نے اس عمل کو مجرب لکھا ہے۔

④ معجم طبرانی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسمِ اعظم جس کے ذریعہ سے دعا قبول ہوتی ہے وہ آلِ عمران کی اس آیت میں ہے۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۱۷ ج ۲)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ

نہ پکڑیں مسلمان کافروں کو رفیق مسلمان چھوڑ کر اور

مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ

جو کوئی یہ کام کرے وہ اللہ کا کوئی نہیں مگر یہ کہ تم پکڑا چاہو ان سے

تُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ

بچاؤ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے آپ سے اور اللہ ہی تک پہنچنا ہے، تو کہہ اگر

تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي

تم چھپاؤ گے اپنے جی کی بات، یا ظاہر کرو گے، وہ اللہ کو معلوم ہے اور اُس کو معلوم ہے جو کچھ ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ

آسمان اور زمین میں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے جس دن پاوے گا

كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ

ہر شخص جو کی ہے نیکی رو برو اور جو کی ہے برائی

تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ

آرزو کرے گا کہ مجھ میں اور اس میں فرق پڑ جائے دُور کا اور اللہ ڈراتا ہے تم کو آپ سے

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع ۱۱ ۳

اور اللہ شفقت رکھتا ہے بندوں پر۔

ممانعتِ دوستان از دوستیِ دُشمنان

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ ... اِلٰى ... وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾

ربط: گزشتہ آیت میں یہ بتلایا گیا کہ عزت اور ذلت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں یعنی اہلِ اسلام کو حکم دیتا ہے کہ تم مسلمانوں کو چھوڑ کر دشمنانِ خدا کی موالات اور دوستی کی طرف کوئی قدم نہ اٹھانا اور کافروں کی ظاہری اور وقتی شان وشوکت کو دیکھ کر یہ گمان نہ کرنا کہ شاید ان سے دوستانہ تعلقات رکھنے سے کوئی دنیوی عزت ووجاہت مل جائے گی۔ حاشا وکلاّ۔ ﴿اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (النساء:۱۳۹) کافروں کے پاس جو عزت نظر آتی ہے وہ حقیقی عزت نہیں محض صورت ہے حقیقی عزت اللہ کے پاس سے ملتی ہے۔ البتہ اگر کسی وقت بحالت مجبوری دشمنوں کے شر اور فساد سے بچنے کے لیے ظاہری طور پر ان کی موافقت کرلو تو اس کی ممانعت نہیں۔ تدبیر اور انتظام کے درجہ میں کافروں سے اس قسم کی ظاہرداری بشرطِ ضرورت اور بقدر حاجت موالات کے حکم سے مستثنیٰ ہے اس لیے کہ یہ موالات کی حقیقت نہیں بلکہ محض صورت ہے۔

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حجاج بن عمرو اور ابن ابی الحقیق اور قیس بن زید، اس قسم کے چند یہودی چند انصار سے کچھ خلا ملا رکھتے تھے تاکہ موقع پا کر ان کو دین اسلام سے برگشتہ کردیں (اکثر مسلمانوں کو ان کی اس بدنیتی کا حال معلوم نہ تھا مگر جو صاحب نظر تھے وہ پہچان گئے کہ یہود کا کیا مقصد ہے)۔ چنانچہ رفاعہ بن منذر، عبداللہ بن جبیر اور سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہم نے ان مسلمانوں سے کہا کہ تم یہود کی اس جماعت سے بچتے رہنا کہیں تم کو دین سے برگشتہ نہ کردیں۔ ان انصاریوں نے ان کی بات کو نہ مانا اس پر یہ آیت نازل ہوئی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کافروں کو دوست نہ بنائیں، مسلمان کو چھوڑ کر یعنی سوائے مسلمانوں کے کسی کو ظاہراً اور باطناً دوست نہ

بنائیں اس لیے کہ ایمان نور ہدایت ہے اور کفر، ظلمت وضلالت ہے اور نور اور ظلمت اور ہدایت اور ضلالت اور حق اور باطل میں دوستی ممکن نہیں اجتماع ضدین عقلاً ونقلاً محال ہے اور جو کوئی یہ کام کرے یعنی کافروں کو دوست بنائے تو ایسے شخص کو اللہ سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ کافر اللہ کے دشمن ہیں اور دشمن کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے اور مومن اللہ کے دوست ہیں۔ پس مومن رہتے ہوئے کافر کے ساتھ دوستی رکھنا ممکن نہیں مگر ایک صورت میں محض تدبیر اور انتظام کے درجہ میں کافروں سے ظاہری دوستی کی اجازت ہے۔ وہ یہ کہ تم کافروں کے شر سے بچنا چاہو کسی خاص بچاؤ کے ذریعہ سے یعنی محض ان کے شر اور ضرر سے بچنے کے لیے حفاظتی تدبیر کے درجہ میں اُن سے فقط بقدر ضرورت محض ظاہری تعلق پیدا کرنا جائز ہے۔ باقی دلی تعلق اور قلبی محبت کسی حال میں بھی جائز نہیں اور یہ بھی جائز نہیں کہ اس سلسلہ میں کسی معصیت کا مرتکب ہونا پڑے یا مسلمانوں کی جاسوسی کرنی پڑے اور مسلمانوں کے راز اور خبریں کافروں کو دینے لگے۔ فقط دفع شر اور دفع ضرر کیلیے بقدر ضرورت قواعد شریعت کے ماتحت کافروں سے فقط اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے تعلق رکھنے کی اجازت ہے باقی کافروں سے ایسا تعلق جو مسلمانوں کے لیے یا مسلمانوں کی حکومت کے لیے مضر ہو یہ کسی طرح اور کسی حالت میں جائز نہیں اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے یعنی اپنے ذاتی جلال اور قہر سے ڈراتا ہے کہ جو کافروں سے دوستی کرنے پر مرتب ہوگا اشارہ اس طرف ہے کہ کافروں کی دوستی پر خدائے قہّار کا جو قہر مرتب ہوتا ہے وہ قہر ذاتی ہے قہر فعلی نہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں، اے محمد ﷺ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ تم کافروں کی محبت خواہ اپنے سینوں میں چھپاؤ یا اُسے اپنے کسی قول وفعل سے ظاہر کرو تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے اس لیے کہ اس کے سامنے ظاہر اور باطن سینہ اور زبان سب برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے یعنی اُس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے علم کی طرح اس کی قدرت بھی محیط ہے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اس علیم وقدیر کے دوستوں سے دوستی کرو اور اس کے دشمنوں کی دوستی سے ظاہر و باطن میں احتیاط رکھو اور اس دن کے حساب وکتاب سے ڈرو کہ جس دن ہر نفس اپنے اعمال نیک وبد کو اپنی اصلی شکلوں میں حاضر کیا ہوا پائے گا جب کہ اعمال اپنی اصلی شکلوں میں نمودار ہوں گے اس وقت اُن اعمال کا حسن وقبیح نظروں کے سامنے آجائے گا اور اس وقت یہ تمنا کرے گا کہ کاش میرے اور میرے بُرے اعمال کے درمیان ایک طویل اور دور دراز مسافت حائل ہوتی اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنے قہر اور جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بڑا مہربان ہے کہ ان کو پہلے ہی بتلا دیا کہ دنیا میں کن سے دوستی جائز ہے اور کن سے دوستی ناجائز ہے۔

فوائد

① کافروں سے موالاۃ یعنی محبت کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اُن کو دینی حیثیت سے محبوب رکھا جائے یہ قطعاً کفر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دل سے اُن کے مذہب اور دین کو بُرا سمجھے مگر معاملات دنیویہ میں اُن سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آئے یہ بالاجماع جائز بلکہ ایک درجہ میں مستحسن ہے۔ تیسری صورت ان دونوں صورتوں کے بین بین ہے وہ یہ کہ دل سے تو ان کے مذہب کو بُرا سمجھے مگر کسی قرابت یا دوستی یا دنیوی غرض کی وجہ سے اُن سے دوستانہ تعلقات رکھے اور ان کی اعانت اور امداد کرے یا کسی وقت مسلمانوں کی جاسوسی کرے۔ یہ صورت کفر تو نہیں مگر سخت گناہ ہے۔ حاطب ابن ابی بلتعہ کے قصہ میں یہی صورت پیش آئی کہ انھوں نے اپنی

قرابت کی وجہ سے کفار کی مدد کی اور ان کے ساتھ ایک قسم کا سلوک اور احسان کیا سورۂ ممتحنہ کا نزول اسی قسم کی موالات کی ممانعت کے لیے ہوا ہے۔ (تفسیر کبیر)

② کافروں کی سی وضع قطع اختیار کرنا یہ علامت ہے کہ اس شخص کو کافروں کی وضع پسند ہے اور اسلام کی وضع اس کو ناپسند ہے اس لیے کہ تمام عقلاء کے نزدیک ظاہری حرکات وسکنات، قلبی کیفیات کی ترجمان ہوتی ہیں۔

③ ﴿تُقٰىةً﴾ سے آیت میں کافروں اور دشمنوں کے شر سے بچنے کی تدبیر مراد ہے جیسا کہ بیان ہو چکا۔ باقی رہا شیعوں کا تقیہ سو آیت قرآنیہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی، تو میری راہ چلو کہ اللہ تم کو چاہے، اور بخشے گناہ

ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ

تمہارے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے تو کہہ، حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر

تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

وہ ہٹ رہیں تو اللہ نہیں چاہتا منکروں کو۔

آغاز مضمون رسالت

وبیان آنکہ معیار محبت خداوندی اتباع رسول است

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ... الٰى ... اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾﴾

ربط: ① گزشتہ آیات میں یہود اور نصاریٰ سے موالات کا حکم مذکور تھا اب ان آیات میں یہود اور نصاریٰ کے اس قول کی طرف تعریض ہے کہ جو یہ کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے دوست ہیں۔ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدہ:۱۸) ان آیات میں حق جل شانہٗ نے ان کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم اللہ کی محبت اور دوستی کے دعوے دار ہو تو ہمارے نبیؐ کا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھے گا یعنی اگر تم ہمارے نبی کا اتباع کرو گے تو اس کا صِلہ یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ تم کو محبین کے درجہ سے محبوبین کے درجہ تک پہنچا دے گا اور اس طرح تم محب سے محبوب بن جاؤ گے اور طالب سے مطلوب ہو جاؤ گے۔

② یا یوں کہو کہ گزشتہ آیت میں دُشمنانِ خدا سے موالات اور محبت کی ممانعت کا ذکر تھا اب اس آیت میں انبیاء ورسل علیہم السلام کی محبت اور متابعت کا ذکر ہے اور ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا معیار یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھے اور اس کے دشمنوں سے

دشمنی۔عزّت حضرات انبیاء کرامؑ علیہم السلام کی اتباع میں ہے۔

عزیز یکہ از در گہش سر بتافت

بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

③ یا یوں کہو کہ شروع سورت سے اب تک توحید کا بیان تھا اب یہاں سے نبوت ورسالت کا بیان شروع ہوتا ہے سب سے پہلے پیغمبر آخرالزمان ﷺ کی اطاعت کا ذکر فرمایا اور پھر اس کے بعد والی آیتوں میں یعنی ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۳۳﴾ ... الخ﴾ میں ان مقبول اور محبوب اور پسندیدہ اور برگزیدہ ہستیوں کا ذکر فرمایا کہ جن کی اطاعت اور متابعت اپنے اپنے زمانہ میں خدا تعالیٰ کی محبت کا معیار رہی اور اب نبی آخرالزمان ﷺ کی نبوت ورسالت کا دَور دَورہ ہے جو بلاشبہ خداوندِ ذوالجلال کے حبیب اور خلیل ہیں۔لہٰذا اب جو شخص اللہ کی محبت اور دوستی کا دعویٰ کرے تو اس کا معیار یہ ہے کہ وہ حبیبِ خدا محمد رسول اللہ ﷺ کا بے چون وچرا اتباع کرے ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنالے گا اور تمام پچھلے گناہوں کو معاف کردے گا جس درجہ ہمارے نبیؐ کا اتباع کروگے اسی درجہ خدا کے محبوب بن جاوگے۔

④ یا یوں کہو کہ گزشتہ آیت میں خدا کے دشمنوں سے محبت کی ممانعت تھی اب اس آیت میں خدا تعالیٰ کے بزرگ ترین حبیب اور خلیل کی محبت اور متابعت کا حکم ہے۔

⑤ یا یوں کہو کہ گزشتہ آیت میں تخویف اور تہدید تھی تاکہ معصیت پر جری اور دلیر نہ ہوجائیں اور اس آیت میں تبشیر اور تسلی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہوجائیں۔چنانچہ فرماتے ہیں اے ہمارے نبی آپ لوگوں سے یہ کہہ دیجیے کہ اگر تم اپنے زعم میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو یعنی میری راہ پر چلو کیونکہ محبت کا اقتضاء یہ ہے کہ محبوب کی مرضی اور خوشی کی تلاش ہو اور جن چیزوں سے محبوب کو نفرت ہے ان سے محب بھی نفرت کرے اور یہ بات آپ ﷺ کے اتباع اور پیروی ہی سے ممکن ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا پتہ عقل سے نہیں چلتا بلکہ انبیاء ورسل علیہم السلام ہی کے ذریعہ سے اس کا علم حاصل ہوتا ہے اور حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام ہی کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات وصفات کی صحیح معرفت اور اس کے اوامر اور نواہی کا صحیح علم حاصل ہوتا ہے اور محب اپنے محبوب کی معرفت اور طریقۂ اطاعت کے علم کا حریص اور مشتاق ہوتا ہے تاکہ اس کی محبت کا اہل اور اس کے تقرب کا مستحق ہوسکے۔پس اگر تم اللہ کی محبت کے مدعی ہو تو میری راہ پر میرے پیچھے میرے نقشِ قدم پر چلے آؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب اور مقرب بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔اور ان سے یہ بھی کہہ دیجیے کہ محض محبت پر مغرور نہ ہوجاؤ بلکہ اس اللہ کی اطاعت کرو جس کی محبت کے تم مدعی ہو اور اس کے رسول ﷺ کی بھی اطاعت کرو جو اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے۔محبوب کا محبوب بھی محبوب اور واجب الاطاعت ہوتا ہے۔پس اگر یہ لوگ آپ کی اطاعت اور اتباع سے منہ موڑیں اور یہ گمان کریں کہ ہمیں رسول کی اتباع کی ضرورت نہیں تو خوب سمجھ لیں کہ خدا کے فرستادہ اور محبوب کی اطاعت اور اتباع سے اعراض (گریز) کرنا کفر ہے اور تحقیق اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔یہود اور نصاریٰ یہ کہتے تھے ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ﴾ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ کافر خدا کا محبوب نہیں ہوسکتا۔خدا کا محبوب وہی شخص ہوسکتا ہے جو خدا کے نبی اور رسول کی بے چون وچرا اطاعت کرے۔

نکتہ: ظاہر کلام کا مقتضی یہ تھا کہ ﴿لَا يُحِبُّهُمْ﴾ فرماتے لیکن بجائے ضمیر کے اسم ظاہر لائے اور یہ فرمایا: ﴿لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ تاکہ معلوم ہوجائے کہ نبی ﷺ کی اتباع اور اطاعت سے اعراض کفر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۳۳﴾
اللہ نے پسند کیا آدم کو، اور نوح کو، اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو، سارے جہان سے۔
ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ ج
کہ اولاد تھے ایک دوسرے کی اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

ذکر اصطفاء بعض برگزیدگان خداوند انام علیہم السلام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ ج﴾

ربط: گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے معیار کا بیان تھا اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے چند برگزیدہ بندوں کا ذکر فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حقیقی محب اور محبوب تھے تاکہ ان کے حالات اور واقعات سُن کر ان کے اتباع اور محبت کا شوق دل میں پیدا ہو اور یہ سمجھ لیں کہ حق تعالیٰ سے تعلق اور محبت بدوں ان حضرات کی اتباع اور پیروی کے ناممکن ہے اور ان چند محبین اور محبوبین خدا کا ذکر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے ذکر مبارک کی تمہید ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ بہر حال مقصود اس تذکرہ سے یہ ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں وصول بدوں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ناممکن اور محال ہے انہی حضرات کے اتباع سے حق تعالیٰ کی محبت اور خوشنودی حاصل ہوسکتی ہے۔

سب سے پہلے جس نے دنیا کو خدا تعالیٰ کی محبت کی تعلیم دی اور اس کا طریقہ بتلایا وہ ہمارے محترم ترین باپ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جو خداوند ذوالجلال کے خلیفہ ہیں اور علم اور معرفت میں فرشتوں سے بڑھ کر ہیں۔ اور سب سے پہلے خدا کے نبی اور رسول مکلم ہیں۔

اور پھر حضرت نوح علیہ السلام اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور پھر آل عمران علیہم السلام اور پھر سب سے اخیر میں ہمارے نبی اکرم سرور عالم سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں کہ جن کی بے چون و چرا متابعت اور اطاعت محبت خداوندی کا معیار ہے چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق اللہ تعالیٰ نے آدم کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا کہ اپنی خلافت کا تاج اُن کے سر پر رکھا اور مسجود ملائک بنایا اور جس نے اُن کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور ان کی ہمسری کا مدعی بنا اس کو ملعون اور مغضوب بنا کر اپنی بارگاہ سے نکال باہر کیا اور اُن کے ایک عرصہ دراز کے بعد خاص طور پر نوح علیہ السلام کو برگزیدہ بنایا کہ اُن کے اتباع کرنے والوں کو نجات دی اور ان کی اطاعت اور اتباع سے اعراض کرنے والوں کو یک لخت غرق کیا اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے بعض کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا جیسے حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کو دونوں کے لیے برکت کا وعدہ فرمایا اور علیٰ ہذا خاندان عمران میں سے بھی بعض کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ

﴿وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴾ میں عمران سے کون سے عمران مراد ہیں آیا عمران بن ماثان مراد ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے جد ہیں یا عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی مراد ہیں جو حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے والد ہیں اور آیت کے سیاق اور سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں عمران بن ماثان۔ حضرت مریم علیہا السلام کے والد مراد ہیں اس لیے کہ ان آیات کا نزول نصاریٰ نجران کے بارہ میں ہوا جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی الوہیت کے قائل تھے۔ بہر حال اس عمران سے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد مراد ہیں تو اولاد عمران سے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام مراد ہوں گے اور اگر عمران سے حضرت مریم علیہا السلام کے والد مراد ہیں تو آل عمران سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں گے۔ غرض یہ کہ ان سب حضرات کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا اور تمام جہانوں میں سے ان کو اپنی نبوت و رسالت کے لیے منتخب فرمایا درآں حالیکہ یہ جماعت ایک نسل ہیں جو ایک دوسرے سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک طینت اور ایک خمیر ہیں جو اصطفاء اور اجتباء کے یکے بعد دیگرے وارث ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب اقوال کے خوب سُننے والے اور سب ظاہری اور باطنی احوال کے خوب جاننے والے ہیں کہ کون شخص اصطفاء اور برگزیدگی کے لائق ہے اللہ کا اصطفاء علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں صراحتاً اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان آیتوں کا نزول ان لوگوں کے مقابلہ میں ہوا ہے جو حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام اور آل عمران کی نبوت اور برگزیدگی کو مانتے تھے ان پر حجت پورا کرنے کے لیے ان حضرات کا ذکر کیا گیا جن کی محبت کے وہ دعوے دار تھے۔ اس لیے اس الزام اور توبیخ میں اُن افراد کا ذکر نہیں کیا گیا جن کی نبوت و بعثت کے وہ قائل نہ تھے۔ نیز آیت میں کوئی کلمہ حصر کا نہیں کہ اصطفاء انہی حضرات میں منحصر ہے۔ لہٰذا اگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے اصطفاء کا اس آیت میں ذکر نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں دوسری آیتوں میں ان کا اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ذکر مفصّل آیا ہے جن کا اس آیت میں ذکر نہیں فرمایا۔

نکتہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى﴾ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آل ابراہیم اور آل عمران مثلاً عیسیٰ علیہ السلام سے جو خوارق اور معجزات ظہور میں آئے وہ اُن کی برگزیدگی اور نبوت کی دلیل ہیں۔ نادانی سے ان کو الوہیت کی دلیل نہ سمجھ جانا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا
جب بولی عورت عمران کی، کہ اے رب! میں نے نذر کیا تیری جو کچھ میرے پیٹ میں ہے آزاد
فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ
سو تو مجھ سے قبول کر، تو ہے اصل سنتا جانتا۔ پھر جب اُس کو جنی، بولی
رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ
اے رب میں نے یہ لڑکی جنی، اور اللہ کو بہتر معلوم ہے جو کچھ جنی اور بیٹا نہ ہو جیسے

كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا

وہ بیٹی اور میں نے اس کا نام رکھا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اُس کو، اور اس کی اولاد کو

مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا

شیطان مردود سے۔ پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھی طرح کا قبول کرنا

نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۭ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ

اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا، اور سپرد کی زکریا کو ، جس وقت آتا اُس پاس زکریا حجرے میں

وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ

پاتا اُس پاس کچھ کھانا، بولا اے مریم! کہاں سے آیا تجھ کو یہ ؟ کہنے لگی، یہ

عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

اللہ کے پاس سے۔ اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس۔

قصہ حضرت مریم وحضرت عیسیٰ علیہما السلام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ ... الٰى ... بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾﴾

ربط: گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کے چند محب اور محبوب بندوں کا اجمالاً ذکر تھا اب اس کی تفصیل شروع ہوتی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے آل عمران کا قصہ ذکر فرمایا جس سے مقصود یہ ہے کہ اہل کتاب کے دو بڑے گروہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے خیالات اور مزعوماتِ فاسدہ کا اور ان کی افتراء پردازیوں کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہود بے بہبود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں غایت درجہ تفریط کی اُن کو اُن کی شان عالی سے گھٹایا اور اُن کو کاہن اور جادوگر بتلایا اور نصاریٰ نے افراط کی یعنی ان کی تعظیم میں غلو اور مبالغہ کیا کہ ان کی ابنیت اور الوہیت کے قائل ہوئے اس لیے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور طفولیّت اور ان کی کہولیت اور ان کے بشری احوال کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا تا کہ یہ امر خوب واضح ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنس بشر سے ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت سے ہیں۔ معاذ اللہ خدا اور خدا کے بیٹے نہیں اس لیے کہ احوال بشریت اور اطوار انسانیت سے گزرنا الوہیت اور ابنیت کے قطعاً منافی ہے حق تعالیٰ احوال اور تغیرات سے پاک اور منزہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر خدا ہوتے تو ماں کے پیٹ سے پیدا نہ ہوتے اور نہ ماں کی گود میں پرورش پاتے۔ الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور طفولیت اور کہولیت کو نصارائے نجران کے عقیدۂ الوہیت اور ابنیت کے ابطال کے لیے ذکر فرمایا۔

بعدازاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت اور اُن کے فضائل اور معجزات اور رفع الی السّماء کو یہود کے رَد کے لیے بیان فرمایا تا کہ یہود بے بہبود یہ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو عزت دیتا ہے اور اُن کے دشمنوں کو ذلیل اور خوار کرتا ہے اور مال اور اولاد کی کثرت اُن کے کچھ کام نہیں آتی۔ حق تعالیٰ کو یہ بھی قدرت ہے کہ اپنے کسی دوست کو دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر آسمان پر لے جائے اور دشمنوں ہی میں سے کسی کو اپنے دوست کے ہمشکل بنا کر پھانسی پر لٹکوا دے اور تا کہ ان باتوں سے یہود یہ سمجھ جائیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقبول اور برگزیدہ بندے اور رسول برحق تھے، کاہن اور ساحر نہ تھے۔ غرض یہ کہ اس طریق سے یہود اور نصاریٰ دونوں کا خوب رَد ہو گیا اور دونوں گروہ کے عقیدہ کا فاسد اور باطل ہونا خوب واضح ہو گیا۔

یا یوں کہو کہ ان حضرات انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اور رضا اور خوشنودی کا ذریعہ ان حضرات کا اتباع اور اطاعت ہے اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ نبی کی اطاعت ہے۔ ﴿فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ (الزخرف:٦١) اور صحیح دین بھی وہی ہے جو ان حضرات کا تھا اور وہی دین اسلام ہے اور جو دین تم نے اختیار کیا ہوا ہے وہ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا دین نہیں۔ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا دین بھی دین اسلام ہے۔ جس کی طرف تم کو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں: وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ عمران کی بی بی نے جن کا نام حَنَّہ بنت فاقوذا تھا اپنے زمانہ کے رواج کے مطابق حالت حمل میں یہ منّت مانی کہ اے میرے پروردگار میں نے آپ کے لیے نذر کیا وہ بچہ جو میرے شکم میں ہے تیری عبادت کے لیے اور تیرے گھر کی خدمت کے لیے آزاد ہوگا۔ ماں باپ اُس سے اپنی کوئی خدمت نہ لیں گے۔ باقی تمام دنیوی مشاغل سے آزاد ہو کر فقط تیری عبادت اور تیرے گھر کی خدمت میں لگا رہے گا پس تو اپنی رحمت سے میری اس نذر کو قبول فرما لے۔ تحقیق تو میری عرض ومعروض کو سن رہا ہے اور میری نیّت اور اخلاص کو جاننے والا ہے اس لطیف اور پاکیزہ عنوان سے دعا مانگنے میں اشارہ اس طرف تھا کہ مجھ کو فرزند عطا فرما کیونکہ لڑکیاں اس خدمت کے لیے قبول نہیں کی جاتی تھیں۔ پس جب خلاف توقع لڑکی جنی تو نہایت حسرت سے کہا اے میرے پروردگار میں نے تو اس حمل سے لڑکی کو جنا میری نذر تو اب کیا پوری ہوگی اس لیے کہ لڑکی قبول کرنے کا دستور نہ تھا۔ امرأۃ عمران تو حسرت کر رہی تھیں اور اللہ کو بہتر معلوم ہے جو کچھ اُس نے جنا۔ اور وہ فرزند جس کی وہ خواہش کرتی تھیں اس دُختر کے برابر نہیں جو منجانب اللہ ان کو دی گئی۔

فائدہ: یہ درمیان میں بطور جملۂ معترضہ، قول خداوندی ہے اور مطلب یہ ہے کہ عمران کی بیوی کی حسرت اس بنا پر ہے کہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ لڑکی کس شان اور مرتبہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لڑکی کیسی مبارک اور مسعود ہے اور اس کے وجود میں ایک ایسے عظیم الشان فرزند ارجمند کا وجود مخفی اور مضمر ہے جو خیر وبرکت میں اس کے وہم وگمان سے کہیں بالا اور برتر ہے یہاں تک بطور جملہ معترضہ کلام خداوندی تھا اب آگے پھر عمران کی بی بی کا قول ہے اور تحقیق میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا۔ مریم علیہا السلام کے معنی اُن کی زبان میں عابدہ یعنی عبادت کرنے والی کے تھے۔ حضرت حَنَّہ کا مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ مریم علیہا السلام کو اسم بامسمّٰی بنا دے۔ اور یہ عرض کیا کہ بارالٰہا میں مریم علیہا السلام کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی ہی کو لڑکے کے عوض قبول فرما لیا نہایت عمدہ قبول کے ساتھ۔ یعنی لڑکوں سے بڑھ کر اس لڑکی کو قبول فرما لیا اور مجاورین بیت المقدس نے بھی باوجود خلافِ دستور ہونے کے اس لڑکی کو قبول کر لیا اور مریم علیہا السلام کا لڑکی ہونا قبولیت کے لیے مانع نہ ہوا۔ اور بڑھایا اللہ تعالیٰ نے اُس لڑکی کو اچھی طرح بڑھانا

یعنی اُن کی ظاہری اور باطنی تربیت فرمائی اور ان کی بالیدگی کو ایسا مکمل کیا کہ کوئی چیز اُن کو بگاڑ نہ سکے اور ان کی قبولیت اور انباتِ حسن یعنی اُن کی تربیت کی ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ اپنے ایک مقبول اور برگزیدہ بندہ یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کا کفیل اور خبر گیر بنا دیا اور جب حضرت مریم علیہا السلام کچھ سیانی ہو گئیں تو حضرت زکریا علیہ السلام نے اُن کے لیے مسجد کے قریب ایک حجرہ مخصوص کر دیا جو محراب کے قریب تھا جس میں رہ کر دن بھر اللہ کی عبادت کرتیں۔ جب کبھی حضرت زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے پاس محراب یعنی حجرہ میں آتے تو ان کے نزدیک کچھ کھانا رکھا ہوا پاتے، جس کا ظاہر میں کوئی سبب نہ تھا کیونکہ وہ کھانا نہ تو اُن کے گھر کا تھا اور نہ باہر کا اس لیے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب چلے جاتے تھے تو حجرہ کا دروازہ بند کر دیتے تھے اور پھر تعجب یہ تھا کہ ان کے سامنے غیر موسم کا پھل رکھا ہوا دیکھتے سردیوں کا میوہ گرمیوں میں اور گرمیوں کا سردی میں اس لیے حضرت زکریا علیہ السلام نے تعجب سے کہا: اے مریم علیہا السلام! یہ تیرے لیے کہاں سے آیا؟ مریم علیہا السلام بولی یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جس کو چاہے بغیر قیاس اور بغیر اندازہ اور بغیر وہم و گمان کے روزی دے اس کے رزق دینے کے لیے کسی ظاہری سبب کی ضرورت نہیں۔

فوائد

① صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے پیدا ہوتے وقت شیطان اس کو مَس کرتا ہے یعنی چھوتا ہے جس سے وہ روتا ہے۔ مگر حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سو یہ دونوں اس سے مستثنیٰ رہے اور چونکہ امرأۃ عمران کی یہ دعاء استعاذہ عین ولادت کے ساتھ تھی۔ اس لیے اس وقت تک شیطان کا مَس واقع نہ ہوا تھا اگرچہ قرآن کریم میں امرأۃ عمران کی اس دعاء استعاذہ کا ذکر بعد ولادت کے واقع ہوا لیکن واؤ ترتیب وقوعی پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا اب یہ اشکال نہیں رہا کہ امرأۃ عمران کی یہ دعا تو ولادت کے بعد ہوئی اور مَس شیطان اس سے پہلے عین وضع حمل اور ولادت کے وقت ہوتا ہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ دُعا تو عین ولادت کے وقت تھی مگر قرآن کریم میں ذکر اس دُعا کا بعد میں ہے یہ دُعا ذکر میں مؤخر ہے اور وقوع میں مقدم ہے۔

② ولادت کے وقت شیطان ہر بچہ کو مَس کرتا ہے سوائے مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے کے۔ لیکن عبادِ مخلصین کو یہ مَس شیطانی کوئی ضرر نہیں پہنچاتا اور نہ اس مَس سے ان کی عصمت اور نزاہت میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ اس ایک خاص خصوصیت کی بناء پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی اور انبیاء کرام علیہم السلام پر افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

یہ امر بدیہی اور مسلم ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام شان اور رتبہ میں ابراہیم خلیل اللہ اور موسیٰ کلیم اللہ علیہما السلام سے اعلیٰ اور افضل نہیں۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے بارہ میں یہ نہیں آیا کہ شیطان نے ان کو مَس نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو خلت اور تکلیم سے سرفراز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو مَس شیطانی سے مستثنیٰ فرمایا اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام جو خدا کے مقدس اور معصوم بندے ہیں اگرچہ وہ اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں اس لیے کہ ان عبادِ مخلصین پر شیطان کی کوئی حرکت کارگر نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جس راستہ پر عمر رضی اللہ عنہ چلتا ہے شیطان وہ راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے کیا کوئی خوش فہم اس سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل تھے۔ اور معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ نہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے بھی افضل ہیں۔ بلکہ اس سے مقصود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خاص فضیلت اور خاص خصوصیت بیان کرنی تھی۔ الغرض اس قسم کے خصوصی امتیازات سے فضیلت تو ثابت ہوتی ہے لیکن افضلیت ثابت نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو کوئی خاص خصوصیت دی ہے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً

وہاں دُعا کی زکریا نے اپنے ربّ سے کہا اے ربّ میرے عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے اولاد

طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ

پاکیزہ، بے شک تُو سننے والا ہے دعاء پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے، جب وہ کھڑا تھا

يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ

نماز میں حُجرے کے اندر کہ اللہ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے یحییٰ کی جو گواہی دے گا

مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى

اللہ کے حکم کی اور سردار ہو گا اور عورت پاس نہ جاوے گا اور نبی ہو گا نیکوں میں۔ بولا، اے ربّ کہاں

يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ

سے ہو گا مجھ کو لڑکا؟ اور مجھ پر آیا بڑھاپا اور عورت میری بانجھ ہے فرمایا

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ

اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہے۔ بولا اے رب مجھ کو دے کوئی نشانی کہا

اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ

نشانی تیری یہ کہ نہ بات کرے تو لوگوں سے تین دن مگر اشارت سے اور یاد کر اپنے رب کو

كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع ۴ ۱۱ ۱۲

بہت اور تسبیح کر شام اور صبح

قصہ دُعا زکریا علیہ السلام برائے فرزند ارجمند

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ ... الیٰ ... وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾﴾

حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور اولاد سے نا اُمید ہو چکے تھے۔ جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو یکا یک دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بھی اولاد کی دعا کروں (اللہ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ مجھ کو بھی بے موسم میوہ مل جائے یعنی بڑھاپے میں اولاد مرحمت ہو جائے) کیونکہ مردِ پیر اور زن عاقر سے اولاد کا پیدا ہونا بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ گرمی میں جاڑوں کے پھلوں کا مہیا ہو جانا۔ اس لیے کہ خدا کی قدرت اور ارادہ کے لیے کسی سبب کا پایا جانا شرط نہیں۔ پس اس وقت اور موقع کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی کہ اے پروردگار! جس طرح مریم علیہا السلام پر تیری رحمت کی بارش ہوئی ہے اور قدرت کے کرشمے نمودار ہو رہے ہیں مجھ کو اپنے پاس سے بلا کسی سبب ظاہری کے پاکیزہ اولاد عطا فرما جو نفسانی اور شہوانی خیالات سے پاک اور منزہ ہو اور جسمانی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے میرا فرزند ہو جو میرے بعد ظاہراً اور باطناً میرا قائم مقام اور جانشین ہو تحقیق آپ بڑے دُعا کے سننے والے ہیں۔ یعنی قبول کرنے والے ہیں پس آواز دی ان کو فرشتوں نے درآں حالیکہ حضرت زکریا علیہ السلام محراب میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں کہ آپ کے ایک لڑکا ہوگا جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ جن میں خاص طور پر یہ پانچ صفتیں ہوں گی۔

① پہلی صفت یہ ہوگی کہ وہ کلمۃ اللہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کلمۂ ﴿كُنْ﴾ یعنی حکمِ خداوندی سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ اس وجہ سے اُن کو کلمۃ اللہ کہنے لگے۔ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے تین سال یا چھ ماہ بڑے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام لوگوں کو پہلے سے خبر دیتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہونے والے ہیں۔

② دوسری صفت اس مولود میں یہ ہوگی کہ وہ اپنی قوم کا سردار ہوگا یعنی اپنی قوم میں علم اور حلم اور کرم اور تقویٰ اور زہد اور عبادت اور تمام عمدہ خصلتوں میں سب سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔

③ تیسری صفت ان میں یہ ہوگی کہ وہ عورتوں سے بے رغبت ہوں گے یعنی لذتوں سے اتنے دور ہوں گے کہ جو لذتیں شرعاً و عقلاً جائز اور مباح ہیں۔ مثلاً نکاح ان سے بھی علیحدہ اور یکسو ہوں گے۔

④ چوتھی صفت ان میں یہ ہوگی کہ وہ نبی ہوں گے۔

⑤ پانچویں صفت یہ ہوگی کہ وہ نیکوکاروں میں سے ہوں گے یعنی اس گروہ سے ہوں جو سرتاپا صلاح اور نیکی تھے اور صغیرہ اور کبیرہ سے معصوم تھے۔ جاننا [1] چاہیے کہ یہاں صلاح سے وہ معمولی درجہ کی صلاح مراد نہیں جو عام مؤمنین صالحین کو حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ

---

[1] والصلاح صفة تنتظم الخير كله والمراد به هنا ما فوق الصلاح الذى لا بد منه فى منصب النبوة البتته من اقامى مراتبه كذافى روح البيان ص ۳۰ ج ۲ و روح المعانى ص ۱۳۱ ج ۳ و تفسير كبير ص ۴۶۴ ج ۲۔

اعلیٰ درجہ کی صلاح مراد ہے جو منصب نبوّت کے شایان، شان ہو اور زجاج [1] سے منقول ہے کہ صالح وہ شخص ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو کماحقہٗ ادا کرتا ہو۔ (تفسیر قرطبی ص ۷۹ ج ۴)

اور بعض نے من الصالحین کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ صالحین سے انبیاء علیہم السلام مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اولادِ انبیاء علیہم السلام سے ہوں گے۔

الغرض جب فرشتوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ مژدہ سنایا تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرط مسرت سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے لڑکا کیسے ہوگا اور تحقیق میری حالت تو یہ ہے کہ مجھ پر تو بڑھاپا آچکا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ میری عمر ایک سو بیس ۱۲۰ سال کی ہے اور بیوی کی عمر اٹھانوے ۹۸ سال کی ہے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دریافت کرنے کے طور پر یہ عرض کیا اور مقصود یہ تھا کہ فرزند کے پیدا ہونے کی کیا صورت ہوگی کیا مجھ کو اور میری بیوی کو جوان کر دیا جائے گا یا دوسری بیوی سے یہ بچہ عنایت ہوگا یا ہم دونوں کو اسی پیرانہ سالی کی حالت میں رکھ کر بچہ عنایت ہوگا حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اس کی قدرت و مشیت سلسلۂ اسباب کی پابند نہیں وہ بغیر اسباب کے بھی جو چاہتا ہے کرتا ہے زکریا علیہ السلام نے عرض کیا: کہ اے میرے پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دیجیے جس سے معلوم ہو جائے کہ حمل قرار پا گیا تا کہ آثار ولادت دیکھ کر تیری نعمت کے شکر میں مشغول ہو جاؤں اور شکر کی بدولت اور مزید نعمت کا مستحق ہو سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارہ سے اور اس وقت اگرچہ لوگوں سے بات کرنے کی قدرت نہ ہوگی سو اس وقت تم اللہ کو کثرت سے یاد کرنا اور صبح و شام اُس کی تسبیح میں لگے رہنا۔ سبحان اللہ کیا نشانی ہے نشانی کی نشانی بھی ہے اور نشانی سے جو غرض تھی (یعنی شکر نعمت) وہ بھی پوری حاصل ہے اور پھر اس پر لطف یہ کہ ذکر اور تسبیح کو تو اختیاری رکھا اور لوگوں سے بات کرنے کی قدرت ہی نہ رہی تا کہ سوائے خدا کے ذکر و شکر کے کچھ کر ہی نہ سکیں۔ پس ایک ہی چیز دونوں غرضوں کی علامت بن گئی حصول ولد اور شکر نعمت۔

فائدہ ①: حضرت زکریا علیہ السلام کو حق جل شانہ کی قدرت میں کوئی شک اور تردّد نہ تھا اُن کو یقین کامل تھا کہ حق تعالیٰ بڑھاپے میں بھی اولاد عطا فرما سکتے ہیں لیکن بڑھاپے میں بانجھ عورت سے اولاد کا ہونا خارق عادت ہے۔ اس لیے بارگاہِ خداوندی میں خارق عادت امر کی درخواست کو خلاف ادب سمجھ کر سکوت کیا مگر جب حضرت مریم علیہا السلام کی خارق عادت احوال کا مشاہدہ کیا تو اس نوع کی درخواست کی دل میں ہمت پیدا ہوئی اور عرض کیا کہ اے پروردگار مجھ کو ایک ولد صالح عطا فرمائیں۔ جب حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی تو فرطِ مسرّت سے عرض کیا ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ﴾ معاذ اللہ! حضرت زکریا علیہ السلام کو قدرتِ خداوندی میں کوئی شک نہ تھا، بلکہ چونکہ نا اُمیدی کے بعد ایک خارقِ عادت امر کی بشارت ملی اس لیے اس مسرت میں اُس کی کیفیت دریافت کرنے لگے تا کہ اس کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ اور نیز اس سوال کے جواب میں جب اس کیفیت کو بتلایا جائے گا تو حصولِ ولد کی بشارت اس مکرر بیان سے اور پختہ ہو جائے گی۔ بادشاہ اگر کسی شخص کو کوئی بشارت دے اور وہ شخص جوشِ مسرت میں بادشاہ سے یہ سوال کرے کہ حضور کے اس انعام سراپا اکرام کی کیا

---

[1] قال الزجّاج الصالح الذی یؤدی لله ما افترض علیه والی الناس حقوقهم. (تفسیر قرطبی ص ۷۹ ج ۴)

صورت ہوگی تو اس کا یہ سوال بادشاہ کی قدرت میں شک کی بنا پر نہیں بلکہ بطور لذت وفرحت ہے۔ نیز جو چیز انسان کو تمنا اور آرزو کے بعد بحالت نا اُمیدی ملتی ہے اس کو سُن کر خوشی میں مدہوش ہو جاتا ہے اور مختلف عنوان سے اسکو دریافت کرتا ہے تا کہ قلب کو خوب اطمینان ہو جائے۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کے سوال کو سمجھیے۔

فائدہ ②: بعض ❶ کہتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام عِنِّیْن تھے مگر صحیح یہ ہے کہ وہ عنین نہ تھے۔ اول اس لیے کہ حصور مبالغہ کا صیغہ ہے حصر سے مشتق ہے جو فعل متعدی ہے جس کے معنی اپنے اختیار سے روکنے کے ہیں اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حصور اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے اختیار سے اپنے آپ کو شہوات اور لذات کے اتباع سے روکنے والے تھے۔ دوم ❷ یہ کہ حق تعالیٰ نے حصور کی صفت کو مقام مدح وثناء میں ذکر کیا ہے اور قابلِ تعریف فعل اختیاری ہوتا ہے نہ کہ فعل اضطراری اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے کہ حصور وہ شخص ہے کہ جو باوجود قدرت کے عورت کے قریب نہ جاتا ہو۔ (تفسیر قرطبی ص ۷۸ ج ۴)

فائدہ ③: نکاح نہ کرنا غالباً یہ حضرت یحییٰ کی خصوصیت تھی ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں نکاح کرنا افضل ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً﴾ (الرعد:۳۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اگرچہ رفع الی السماء سے پہلے نکاح نہیں فرمایا لیکن نزول من السماء کے بعد نکاح فرمائیں گے۔ جیسا کہ احادیث میں مصرح ہے۔

نکتہ: بعض ائمہ تفسیر نے لکھا ہے کہ مریم اُس عورت کو کہتے ہیں جس کو مردوں کی حاجت نہ ہو۔ لہٰذا گمان یہ ہے کہ چونکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے فرزند کی یہ دعا حضرت مریم علیہا السلام کے زمانۂ تربیت میں مانگی۔ اس لیے انہیں جیسا ایک فرزند حصور عطا کیا گیا کہ جس کو عورتوں کی ضرورت نہ ہو۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ

ر جب فرشتے بولے اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا، اور ستھرا بنایا اور

اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ

پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے ۔ اے مریم بندگی کر اپنے رب کی اور سجدہ کر

وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ

اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔ یہ خبریں غیب کی ہیں ہم بھیجتے ہیں تجھ کو اور

---

❶ قال ابن مسعود و ابن عباس و ابن جبیر و قتادۃ و عطاء و ابو الشعثاء و الحسن و السدّی و ابن زید الحصور هو الذی یکف عن النساء و لا یقربهن مع القدرۃ و هذا اصح بوجهین احدهما انه مدح و ثناء علیه و الثناء انما یکون من الفعل المکتسب دون الجبلۃ فی الغالب و الثانی

❷ ان فعولا فی اللغۃ من صیغ الفاعلین فالمعنی انه یحصر نفسه عن الشهوات (تفسیر قرطبی ص ۷۸ ج ۴)

مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠

تو نہ تھا ان کے پاس جب ڈالنے لگے اپنے قلم، کہ کون پالے مریم کو؟

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ

اور تُو نہ تھا اُن کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے جب کہا فرشتوں نے اے مریم!

اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے حکم کی، جس کا نام مسیح عیسیٰ، مریم کا بیٹا

وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ۙ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ

مرتبے والا دنیا میں اور آخرت میں اور نزدیک والوں میں۔ اور باتیں کرے گا لوگوں سے

فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ

جب ماں کی گود میں ہو گا اور جب پوری عمر کا ہو گا اور نیک بختوں میں ہے، بولی اے رب کہاں سے ہو گا مجھ کو

وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ

لڑکا اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی آدمی نے کہا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہے۔

اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ

جب حکم کرتا ہے ایک کام کو تو یہی کہتا ہے اُس کو ہو وہ ہوتا ہے۔ اور سکھادے گا اس کو کتاب

وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ۚ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۙ

اور کام کی باتیں اور توریت اور انجیل۔ اور رسول ہو گا بنی اسرائیل کی طرف،

اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ

کہ میں آیا ہوں تم پاس، نشان لے کر تمہارے رب کا کہ میں بنا دیتا ہوں تم کو مٹی کی

كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ

الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ

کرتا ہوں جو اندھا پیدا ہو اور کوڑھی، اور چلاتا ہوں مُردے اللہ کے حکم سے، اور بتا دیتا

بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

ہوں تم کو، جو کھا کر آؤ اور رکھیاؤ اپنے گھر میں۔ اس میں

لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ

نشانی پوری ہے تم کو اگر تم یقین رکھتے ہو۔ اور سچ بتاتا ہوں تورات کو،

مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ

جو مجھ سے پہلے کی ہے اور اسی واسطے کہ حلال کر دوں تم کو بعض چیز جو حرام تھی تم پر، اور آیا ہوں تم پاس

بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ

نشانی لے کر تمہارے رب کی سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو۔ بے شک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا

فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

سو اس کی بندگی کرو یہ سیدھی راہ ہے۔

تتمہ قصہ حضرت مریم علیہا السلام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ ... الٰى ... هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾﴾

یہاں تک حق جل شانہٗ نے آلِ عمران اور آلِ ابراہیم علیہم السلام کے اصطفاء اور ان پر اپنی توجہات وعنایات کے واقعات ذکر فرمائے اب آگے ایک اور قصہ اسی سلسلہ میں بیان فرماتے ہیں جو درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ کا بقیہ تتمہ ہے اس لیے کہ سلسلۂ کلام کا آغاز حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ سے ہوا تھا۔ درمیان میں مناسبت کی وجہ سے ضمناً حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا اب آگے پھر حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ کا بقیہ ذکر فرماتے ہیں۔ اور وہ دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب فرشتوں کے ایک گروہ نے بالمشافہ حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ اے مریم علیہا السلام! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برگزیدہ کیا کہ اپنی کرامات وعنایات کا مورد بنایا۔ اور ابتدا میں باوجود لڑکی ہونے کے تجھ کو اپنی نیاز میں قبول فرمایا اور اب اخیر میں تجھ کو فرشتوں کے کلام اور خطاب سے عزت بخشی اور تجھ کو ظاہری اور باطنی عیوب سے پاک اور منزہ کیا اور اپنے پاک گھر یعنی مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لائق بنایا۔ ظاہری پاکی یہ عطا کی کہ حیض ونفاس سے پاک کیا اور باطنی طہارت و

نزاہت یہ عطا کی کہ مس شیطانی سے تجھ کو محفوظ رکھا اور تمام جہانوں کی عورتوں کے مقابلہ میں تجھ کو بعض خصوصی فضائل اور امتیازات عطا کیے بلامسِ بشر کے حضرت مسیح علیہ السلام جیسا مبارک اور اولوالعزم پیغمبر فرزند تم کو عطا کیا جو تمہارے سوا اور کسی عورت کو نہیں عطا ہوا۔ لہٰذا اے مریم علیہا السلام ان نعمتوں کے شکریہ میں اپنے پروردگار کی بندگی میں لگی رہو اور اپنی نماز میں قیام کو طویل کرو اور سجدہ کرتی رہو تا کہ تم کو اللہ کا قرب حاصل ہو۔ ﴿وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ﴾ (العلق:۱۹) اور رکوع کیا کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو اس لیے کہ رکوع اگرچہ رتبہ میں سجدہ سے کم ہے لیکن راکعین کی معیت کی وجہ سے جب راکعین کے انوار و برکات بھی اس کے ساتھ مل جائیں گے تو یہ رکوع قریب قریب سجود ہی کے قرب خداوندی میں معین اور مددگار ہوگا اور حضرت مریم علیہا السلام کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم یا تو اس بناء پر تھا کہ اس زمانہ کی شریعت میں عورتوں کو نمازِ جماعت میں شریک ہونے کی اجازت تھی یا حضرت مریم علیہا السلام کی خصوصیت تھی۔

نکتہ: جماعت میں شریک ہونے کے لیے غالباً رکوع کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے رکعت کو پالیا جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور اسی پر فقہاء امت کا اجماع ہے اور بعض علماء نے ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴾ (البقرہ:۴۳) کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اے مریم علیہا السلام جس طرح رکوع کرنے والے رکوع کرتے ہیں اسی طرح تم بھی رکوع کیا کرو یعنی رکوع میں مسلمانوں کی موافقت کرو اور جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں اسی طرح تم بھی پڑھا کرو۔

اب حق جلّ شانہٗ ان مضامین کے ضمن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل ذکر فرماتے ہیں جو ان واقعات کے بیان سے مترشح ہوتی ہے۔ یہ باتیں اور یہ قصے جو حضرت حنّہ اور مریم اور حضرت عیسیٰ اور حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کے ہم نے ذکر کیے منجملہ غیبی خبروں کے ہیں جن کی وحی ہم آپ علیہ السلام تک بھیج رہے ہیں یہ دلیل ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق ہونے کی اس لیے کہ کسی شے کے جاننے کی صرف تین صورتیں ہیں۔ ① عقل ② یا خبر کا سننا ③ یا مشاہدہ کرنا۔ قصص اور واقعات میں عقل کو دخل نہ ہونا بالکل ظاہر ہے۔ گزشتہ واقعات کو عقل سے معلوم کر لینا باجماع عقلاء محال ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات کو کسی سے سُنا بھی نہیں اور اگر کسی کو یہ گمان ہے کہ توریت اور انجیل کے فلاں عالم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا ہے تو اس کو چاہیے کہ اُس عالم کو سامنے لائے یا خود اُس سے پوچھ آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اُمّی تھے۔ اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کتاب میں دیکھ کر یہ واقعات بیان فرمائے۔ وہ کون سی کتاب اور کون سا دفتر ہے جس میں یہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ لکھے ہوئے ہوں اور وہ کتاب اور دفتر کہاں ہے اور کس کتب خانہ میں ہے جسے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ کر یہ واقعات بیان کرتے ہیں۔ معترضین خود جا کر اس کتاب اور دفتر کو دیکھ لیں اور دیکھ کر وہ بھی اسی طرح ان واقعات کو بیان کر دیں۔ اب صرف تیسری صورت مشاہدہ کی رہ گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات کو بچشمِ خود دیکھا ہو تو کسی ذی عقل اور ذی ہوش کو اس کا وسوسہ بھی نہیں آ سکتا کہ حضور صدہا سال قبل کے واقعات کے وقت موجود تھے۔ پس جب کہ آپ نے ان واقعات کا نہ بچشمِ خود مشاہدہ کیا اور نہ کسی خارجی طریقہ و ذریعہ سے آپ کو ان کا علم حاصل ہوا پس متعین ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات کا علم بذریعہ وحی کے ہوا کہ آپ اللہ کے برحق نبی ہیں جن پر اللہ کی وحی نازل ہوتی تھی اور بذریعہ وحی کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انباء الغیب سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں اور آپ اُن کے نزدیک نہ تھے جب وہ قرعہ کے لیے اپنے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون شخص

مریم کی پرورش کا کفیل اور خبر گیر ہو جائے اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ مریم علیہا السلام کی پرورش کے بارہ میں جھگڑ رہے تھے حق جل شانہٗ نے جب حضرت مریم علیہا السلام کو نذر میں قبول فرما لیا تو مسجد کے مجاورین میں جھگڑا ہوا کہ مریم علیہا السلام کو کس کی پرورش میں رکھا جائے حضرت مریم علیہا السلام چونکہ سردار کی لڑکی تھیں اس لیے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میری پرورش میں رہے، حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا میں زیادہ مستحق ہوں۔ میری بی بی اس لڑکی کی خالہ ہے وہ نہایت محبت سے اس کی پرورش کرے گی فیصلہ اس پر ہوا کہ ہر ایک اپنا قلم جس سے توریت لکھتے تھے بہتے ہوئے پانی میں ڈالے جس کا قلم پانی کی حرکت کے خلاف الٹا بہے وہ حضرت مریم علیہا السلام کا حق دار سمجھا جائے۔ اس میں قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام کا نکلا اور حق، حق دار کو پہنچ گیا۔ پس جب آپ ان واقعات اور حالات کے وقت موجود نہ تھے تو معلوم ہوا کہ ان امور کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی کے ہوا ہے اور جس پر اللہ کی وحی کا نزول ہو وہ خدا کا نبی ہے۔

آغاز قصہ عیسیٰ علیہ السلام

اس وقت کو یاد کرو جب کہ فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے یہ بھی کہا: اے مریم علیہا السلام تحقیق اللہ تم کو بشارت دیتا ہے اپنے ایک کلمہ کی جو من جانب اللہ ہوگا۔ یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی خوشخبری دیتا ہے جو بلا باپ کے تم سے پیدا ہوگا اور بلا باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ کلمۃ اللہ کہلائے گا اور اللہ کی طرف اس نسبت اور اضافت سے اُس کو ایک خاص شرف اور عزت حاصل ہوگی جس کا نام اور لقب مسیح عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہوگا۔ مسیح اصل میں مشیحا تھا۔ عبرانی زبان میں اس کے معنی مبارک کے ہیں۔ معرب ہو کر مسیح ہو گیا۔ جیسے موسیٰ موشا کا مُعَرَّب ہے باقی دجال کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ بالاجماع عربی لفظ ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسیح کے معنی پونچھ دینے اور زائل کر دینے کے ہیں چونکہ دجال سے تمام عمدہ خصلتیں پونچھ دی گئی ہیں اس لیے اس کو مسیح دجال کہتے ہیں اور عیسیٰ اصل میں ایشوع تھا۔ یہ بھی عبرانی زبان کا لفظ ہے عبرانی میں ایشوع کے معنی سردار کے ہیں عیسیٰ۔ ایشوع کا معرب ہے۔

نکتہ: حضرت عیسیٰ کو ابن مریم علیہما السلام (یعنی مریم کا بیٹا) اس لیے فرمایا حالانکہ خطاب خود حضرت مریم علیہا السلام کو ہے تا کہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اولاد باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے ماں کی طرف منسوب نہیں ہوتی۔ اب آگے اُس مولود مسعود کے کچھ اوصاف بیان کرتے ہیں کہ وہ مولود مسعود دنیا اور آخرت میں باعزت اور آبرو والا ہوگا اہل دنیا اور اہل آخرت دونوں ہی کی نظروں میں معظم اور محترم اور مرتبہ والے ہوں گے اس صفت کے ذکر سے حضرت مریم علیہا السلام کی تسلی مقصود ہے۔ اس لیے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر باپ کے فرزند پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تو ممکن ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام بمقتضائے بشریت تشویش میں پڑ جائیں کہ دنیا میں کون اس کو باور کرے گا کہ لڑکا بغیر باپ کے پیدا ہوا۔ ناچار لوگ مجھ پر تو تہمت رکھیں گے اور بچہ کو ہمیشہ بُرے نام سے مشہور کریں گے میں کس طرح اپنی براءت ظاہر کروں گی۔ حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ تم گھبراؤ نہیں ہم نے براءت اور نزاہت کا انتظام کر دیا ہے حق تعالیٰ خصوصی طور پر تم کو تمام بُرے الزام اور تہمتوں سے بَری کرے گا۔ چنانچہ پہلی مرتبہ وجاہت کا ظہور اس طرح سے ہوا کہ پیدا ہونے کے بعد شیر خوارگی کی حالت میں کلام کیا اور یہ کہا ﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ۝۳۰ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا ... الیٰ آخرہٖ﴾ (مریم) اس کلام کو سنتے ہی دلوں سے تمام بدگمانیاں دور ہو گئیں اور سمجھ گئے کہ یہ مولود مسعود نہایت مبارک ہے محض خدا کے حکم سے بلا باپ کے پیدا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو بتلا دیا کہ جب کوئی اس بارہ میں تم سے کچھ سوال کرے تو تم اس بچہ کی

طرف اشارہ کردینا وہ خود اپنی طہارت ونزاہت کو بیان کردے گا جس کی تفصیل سورۂ مریم میں آئے گی۔

دوسری بار وجاہت اس وقت ظاہر ہوئی جب دشمنوں نے پکڑنے اور قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے زندہ اور صحیح وسالم آسمان پر اُٹھالیا اور دشمن دیکھتے ہی رہ گئے۔ باقی دُنیاوی وجاہت کی پوری پوری تکمیل نزول من السمآء کے بعد ہوگی جیسا کہ تمام اہلِ اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے اور وہ مولود مسعود فقط باعزت اور باآبرو ہی نہ ہوگا بلکہ حق جل شانہٗ کے خاص الخاص مقربین میں سے ہوگا۔ یعنی بارگاہِ ایزدی کے ان مقربین میں سے ہوگا جو قرب ذاتی اور صفاتی سے متصف ہوں گے اور تجلیات ربانیہ کے مورد اور مظہر ہوں گے اور ان کے مقرب ہونے پر وہ اِرھاصات اور خوارق عادات دلالت کریں گے جو ان سے قبل از نبوت ظہور میں آئیں گے۔ مثلاً وہ بچہ لوگوں سے ایسا حکیمانہ کلام کرے گا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کا کلام ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بچہ اس وقت ماں کی گود میں ہوگا اور اُس کی یہ حالت مستمر اور دائم رہے گی یہاں تک کہ وہ معمر اور بڑی عمر کا ہوگا اور اس حالت میں بھی ایسا ہی کلام کرے گا۔ عہد طفولیت اور عہد کہولت کے کلاموں میں کوئی تفاوت نہ ہوگا ان احوال کے مشاہدہ کے بعد کسی کو وہم بھی نہ ہوگا کہ گہوارہ اور ماں کی گود میں جو کلام سرزد ہوا تھا وہ کسی شیطان یا جن کا اثر تھا اور وہاں شیطان کا اثر یا گذر کہاں ہوسکتا ہے وہ تو نہایت شائستہ اور اعلیٰ درجہ کے نیک بختوں میں سے ہوں گے اور شیطان کا اثر فاسق اور فاجر اور بدکار لوگوں پر ہوتا ہے اور کسی نقصان اور دینی خلل اور فساد کا گذر عباد صالحین پر نہیں ہوسکتا۔

حضرت مریم علیہا السلام کا تعجب اور اس کا جواب

یہ بشارت سُن کر حضرت مریم علیہا السلام سمجھ گئیں کہ وہ لڑکا بے باپ کے پیدا ہوگا اور اسی وجہ سے وہ کلمۃ اللہ اور ابن مریم علیہا السلام کہلائے گا۔ یعنی میری طرف منسوب ہوگا اس لیے حضرت مریم علیہا السلام نے اس بشارت کو سُن کر بطور تعجب یہ کہا: اے میرے رب! میرے لڑکا کیسے ہوگا؟ حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور بچہ عادۃً بغیر مرد کے تعلق کے پیدا نہیں ہوتا۔ پس معلوم نہیں میرے جو بچہ ہوگا وہ کس طرح ہوگا آیا محض قدرت خداوندی سے بغیر باپ کے بچہ پیدا ہوگا یا مجھ کو نکاح کرنے کا حکم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے واسطہ سے جواب میں فرمایا کہ ویسے ہی بلا باپ کے پیدا ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں یعنی وہ کسی چیز کے پیدا کرنے میں کسی سبب کا محتاج نہیں حق جل شانہٗ اس پر قادر ہے کہ وہ اشیاء کو بتدریج قانون عادت کے موافق مادہ اور سبب سے پیدا کرے اسی طرح وہ اس پر بھی قادر ہے کہ دفعۃً بغیر مادہ اور بغیر اسباب کے کسی چیز کو پیدا کردے آخر اسی نے تو اپنی قدرت کاملہ سے اسباب کو بلا سبب کے اور مادہ کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ تو ہو جا پس وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے لہٰذا تم اس بچہ کے بدوں مسِ بشر کے پیدا ہونے پر تعجب نہ کرو وہ لڑکا اسی طرح ہوگا خدا کی غیر محدود قدرت کسی سبب اور مادہ کی محتاج اور پابند نہیں۔

خوارقِ عادات کے متعلق فلاسفہ اور ملاحدہ کے شبہات کے جوابات

جو لوگ پابند اسباب ہیں اور اپنی محدود معلومات اور مخصوص مزعومات کے موافق دُنیا کی ہر چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس قسم کی آیات قدرت کا اکثر وبیشتر انکار کر بیٹھتے ہیں انہی آیات قدرت میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی ہے یہ لوگ اس

کے بھی منکر ہیں حالانکہ ان کے پاس کوئی ایسی عقلی دلیل نہیں کہ جس سے وہ اس کو محال ثابت کر سکیں سوائے اس کے کہ یہ کہیں کہ بغیر باپ کے پیدا ہونا عادت کے خلاف ہے سو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ خلاف عادت ہونے سے کسی چیز کا محال ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔

روزمرہ کائنات میں ایسے عجائب وغرائب کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے جو پہلے سے ہرگز عادی اور معروف نہ تھے بلکہ وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔ جن عجائب وغرائب کے اسباب وعلل معلوم ہو جاتے ہیں ان کو آج کل کی اصطلاح میں اکتشاف اور اختراع کہتے ہیں اور جن کے اسباب وعلل تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکی ان کو فلتات طبعیہ سے تعبیر کر کے خاموش ہو جاتے ہیں یعنی جو چیزیں طبعی اور فطری طور پر ناگہانی اور اچانک طریقہ سے بلا کسی سبب اور علت کے ظہور میں آ گئی ہیں۔ ان کو فلتات طبعیہ کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہے (عالمِ کائنات کے اتفاقی کرشمے) جب اس قسم کی چیزیں ظہور میں آ جاتی ہیں تو ان کے غیر عادی اور خارقِ عادت وجود سے تو انکار ہو نہیں سکتا تو ان کو فلتات طبعیہ کے نام سے موسوم کر کے خاموش بیٹھ جاتے ہیں کہ عقل اور تجربہ نے ان کے اسباب وعلل بتلانے سے جواب دے دیا ہے اب ہم ان منکرین معجزات سے انہیں فلتات طبعیہ کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ جب ان فلتات طبعیہ کے ظاہری اور معلوم اسباب تو ہوتے نہیں تو دو حال سے خالی نہیں یا تو یوں کہو کہ ظاہری اسباب اگرچہ نہیں مگر ان کا ظہور اسباب خفیہ کے بناء پر ہوا ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہو سکے یا یوں کہو کہ ان فلتات طبعیہ کے لیے اسباب ظاہرہ اور اسباب معلومہ کی طرح اسباب خفیہ بھی نہیں مطلقاً بلا کسی ظاہر اور خفی سبب کے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

اگر منکرین معجزات شق اول کو اختیار کرتے ہیں تو ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح فلتات طبعیہ بلا کسی ظاہری اور معلوم سبب کے ظہور میں آ سکتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اگرچہ ظاہراً کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا لیکن ممکن ہے کہ ان کا کوئی خفی سبب ہو جو اب تک ہماری تحقیق میں نہ آیا ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہو جائیں اور اس طرح کی ولادت کا کوئی خفی سبب ہو جو ہماری تحقیق میں نہ آیا ہو پس کیا وجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو تو آپ محال اور ناممکن بتائیں اور فلتات طبعیہ کو ممکن بلکہ اُن کے واقع ہونے کے قائل ہوں۔

اور اگر شق ثانی کو اختیار کریں یعنی یہ کہیں کہ فلتات طبعیہ مطلقاً بلا کسی سبب کے ظہور میں آئے ہیں جس طرح ظاہر میں ان کے وجود کا کوئی سبب نہیں اسی طرح باطن میں بھی کوئی خفی سبب ان کے وجود کا نہیں تو اس صورت میں تو ان گرفتارانِ عادت کو اور بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ اسباب عادیہ لازم اور مطرد نہیں ان اسباب عادیہ کے بغیر بھی کائنات ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس اقرار و اعتراف کے بعد آیات قدرت اور خوارق عادت کا محض اس بناء پر انکار کرنا کہ یہ اسباب عادیہ کے خلاف ہیں انتہائی نادانی اور کمال ابلہی سمجھا جائے گا۔

اگلے لوگوں نے اگر اس قسم کی چیزوں کا انکار کیا تو ان کو کچھ معذور سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ چیزیں اس وقت غیر مالوف اور غیر مانوس تھیں مگر اس زمانہ والوں کے لیے کیا عذر ہے جبکہ وہ سائنس کے حیرت انگیز تجربوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

آج کل تمام مغربی حکماء نے بالاتفاق تولد ذاتی کے امکان کو تسلیم کر لیا ہے کہ حیوان کا بدوں حیوان کے محض جمادات سے پیدا ہونا بھی ممکن ہے اور دن رات اس کے تجربے ہو رہے ہیں۔

پس جب کہ حیوان کا بدوں حیوان کے پیدا ہونا ممکن ہے تو پھر کسی حیوان کا ایک حیوان سے پیدا ہونا کیوں محال ہے یہ تو

بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ اقرب الی الحصول ہے۔

آئے دن کوئی نہ کوئی نئی بات دریافت ہوتی رہتی ہے جواب تک سربستہ راز تھی اسی طرح ممکن ہے کہ خوارقِ عادات بھی ایک سربستہ راز ہوں جو آئندہ چل کر کچھ منکشف ہو جائیں محض اپنے عدم علم کی بناء پر کسی چیز کا انکار کر دینا یا اس کو محال بتانا سراسر بے عقلی ہے انسانوں کا علم اور تجربہ خواہ کتنا ہی وسیع ہو جائے بہر حال محدود اور متناہی ہے اس محدود اور متناہی علم اور تجربہ کی بناء پر خدائے قدوس کی غیر محدود کائنات پر حکم لگانا کھلی ہوئی سفاہت اور غباوت ہے اور جب انسان کا علم ہی حجت نہ ہوا تو اس کی لاعلمی اور بے خبری کہاں سے حجت ہو جائے گی۔

ملاحدہ اور زنادقہ یہ چاہتے ہیں کہ جو چیز کتاب وسنّت کے نصوص اور انبیاء کرام علیہم السلام کے اجماع سے ثابت ہے اور جس کو تمام اُمتیں بطریق تواتر نقل کرتی آئی ہیں۔ اس کو محض اپنی لاعلمی کی بناء پر ردّ کر دیں۔ آئے دن ہم ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جو ہمارے معلوم شدہ قوانین کے خلاف ہوتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض حیوانات ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ جن کے اعضاء عادت اور ہماری مقررہ تعداد سے زیادہ ہوتے ہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض حیوانات اپنی جنس کے علاوہ غیر جنس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے مشاہدہ سے انکار نہیں ہو سکتا اس لیے حکماء اور فلاسفہ اس قسم کے امور کو فلتات طبعیہ (عالم کائنات کے اتفاقی کرشمے) کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے وقوع کا قانون ہماری عقل اور ادراک سے بالا اور برتر ہے ہمیں صرف چند روزمرہ پیش آنے والے امور کے متعلق کچھ تھوڑا بہت کوئی قاعدہ اور قانون معلوم ہے باقی اس قسم کے شاذ و نادر واقعات کے وقوع کے متعلق خداوند ذوالجلال کا کیا قانون ہے وہ کسی کو معلوم نہیں پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو بھی اسی پر قیاس کرو کہ یہ بھی منجملہ انہی شاذ و نادر واقعات میں سے ہے جس کا قانون سوائے خدا کے کسی حکیم اور فلسفی کو معلوم نہیں جدید اکتشافات کے ذریعہ ہم صرف چند ظاہری باتوں کو جان لیتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں مگر اس کی لِم اور حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے اور یہی حق ہے۔

ہم انسان میں حس اور نطق کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر اس کے تعلق اور رابطہ کو نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں یہ دیکھتے ہیں کہ دانہ سے گیہوں پیدا ہوتا ہے لیکن کس طرح اگتا ہے اور اس کی ڈنڈی سیدھی ہونے اور پتّوں کے جھکنے میں کیا تناسب اور ربط ہے اور اس کی کیا حقیقت اور کیا علّت ہے اس کی کچھ خبر نہیں غرض یہ کہ نادانی کا تو یہ عالم کہ کائنات کے ایک ذرہ کی حقیقت اور علت سمجھنے سے قاصر اور خالق کائنات کی خبروں پر نکتہ چینی کے لیے تیار۔ ع بریں عقل ودانش بباید گریست

فضائل وکمالات عیسیٰ علیہ السلام

اور اے مریم علیہا السلام تم اس بچہ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے یہ خیال مت کرو کہ ولادت کے بعد لوگ طعن وتشنیع کا نشانہ بنائیں گے بلکہ وہ مولود تمہاری عزت ووجاہت کا سبب بنے گا۔ اس لیے کہ وہ مولود مسعود عجیب وغریب فضائل وکمالات کا معدن اور مخزن ہوگا جس کو دیکھتے ہی اہل فہم سمجھ جائیں گے کہ یہ پیکر فضائل وشمائل معاذ اللہ ولد الزنا نہیں ہو سکتا بلکہ نمونۂ روح القدس ہے کہ جس کے

پھونک مارنے سے مُردے زندہ ہورہے ہیں اوراس کے مبارک ہاتھ پھیرنے سے کوڑھی اور نابینا چنگے اور سمکھے بن رہے ہیں اس مولود مسعود کی صفات یہ ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ اُن کو بلا کسی معلّم اور بغیر اُستاد کے آسمانی کتابوں کے علوم اور دانائی اور حکمت کی باتیں سکھائے گا۔ اور بالخصوص اُن کو توریت اور انجیل کا علم عطا کرے گا اور بنی اسرائیل کی طرف ایک عظیم الشان رسول بنا کر بھیجے گا جو صاحب معجزات ہوگا اور تحدی کے ساتھ ان سے یہ کہے گا کہ میں تمہارے پاس خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنی نبوت ورسالت کی ایک روشن نشانی لے کر آیا ہوں یعنی ایسے معجزات قاہرہ لے کر آیا ہوں جو میری رسالت کی روشن دلیلیں ہیں جن کو دیکھ کر تم بداہۃً یہ جان لوگے کہ یہ معجزات بلا شبہ مِنْ رَّبِّكُمْ یعنی تمہارے رب کی جانب سے ہیں اس لیے کہ اس زمانہ کے تمام حکماء اور اطباء اُن کے مثل لانے سے عاجز اور درماندہ ہوں گے اور وہ معجزات یہ ہیں کہ میں تمہارے لیے اور تمہارے اطمینان کے لیے گارے سے پرندہ جیسی ایک صورت اور شکل بناؤں گا اور پھر اس مصنوعی صورت اور شکل میں پھونک ماروں گا پس وہ ظاہری صورت وشکل اللہ تعالیٰ کے حکم سے حقیقتاً زندہ پرندہ بن جائے گی۔ اور اس کے علاوہ دوسرا معجزہ یہ ہوگا کہ میں مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو ہاتھ پھیر کر اچھا اور چنگا کردوں گا اور مُردوں کو زندہ کردوں گا۔ اور یہ سب اللہ کے حکم سے ہوگا۔ ظاہراً اگرچہ میرا ہاتھ ہوگا مگر در پردہ اللہ کا حکم ہوگا اور مادرزاد اندھا ہونا اور کوڑھی ہونا یہ وہ بیماریاں ہیں جن سے تمام اطباء اور حکماء عاجز ہیں۔ بالخصوص مردہ کو زندہ کرنا یہ سب ہی سے بڑھ کر اعجاز ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں چونکہ طب کا چرچا تھا اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کے معجزات دیئے گئے تاکہ اطباء اور حکماء کا عجز ظاہر ہو۔

نکتہ: لفظ بِاِذْنِ اللہ کا تکرار الوہیت کا شبہ رفع کرنے کے لیے ہے کہ مردہ کو زندہ کرنا بندہ کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام اور اس کا حکم ہے۔ اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار معجزات کا ذکر ہوا۔ اوّل: خلق کھیئۃ الطیر۔ دوم: ابراء اکمہ۔ سوم: ابراء ابرص۔ چہارم: احیاء موتیٰ۔ یہ چاروں معجزات فعلی تھے۔ اب آگے پانچویں معجزہ کو ذکر کرتے ہیں جو علمی اور قولی معجزہ تھا۔ وہ یہ کہ میں تم کو خبر دوں گا اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھتے ہو۔ یعنی بذریعہ وحی کے بعض مغیبات پر تم کو مطلع کروں گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار عملی معجزات کے بعد یہ ایک علمی معجزہ ذکر فرمایا۔ تحقیق ان تمام علمی اور عملی معجزات میں میری صداقت کی پوری پوری نشانی اور علامت ہے تمہارے لیے یعنی تمہاری ہدایت کے لیے اگر تم ایمان لانا چاہو تو ایمان لے آؤ میرے دعوائے نبوت کی صداقت۔ دلائل قاہرہ اور معجزات باہرہ سے تم پر واضح اور روشن ہوچکی ہے اور یہ پانچ معجزے میری نبوت ورسالت کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں اور مجھ سے پہلے جو توریت نازل ہوچکی ہے میں اس کی تصدیق کے لیے آیا ہوں کہ بیشک وہ خدا کی کتاب تھی اور انبیاء علیہم السلام کی یہی شان ہوتی ہے کہ آسمانی کتابوں کو سچا بتاتے ہیں اور ایک نبی دوسرے نبی کی تصدیق کرتا ہے اور میں اس لیے آیا ہوں کہ حلال کردوں تمہارے لیے اُن بعض چیزوں کو جو تم پر حرام تھیں یعنی وہ بعض چیزیں جو تم پر توریت میں حرام تھیں۔ مثلاً اونٹ کا گوشت اور چربی اس کی حرمت کو منسوخ کروں گا اور مثلاً ہفتہ کے دن جو مچھلی کے شکار کی ممانعت تھی اسکو بھی منسوخ کردوں گا۔ اور حاصل کلام یہ ہے کہ میرا نبی اور رسول ہونا تم پر خوب واضح ہوچکا ہے۔ کیونکہ میں اپنی نبوت کی نشانی خدا کی طرف سے تمہارے سامنے پیش کرچکا ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو یعنی میری مخالفت اور تکذیب میں اللہ کے عذاب سے ڈرو اور بے چون وچرا میری فرمانبرداری کرو یعنی جو کہتا ہوں اس کو مانو تحقیق اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور وہی تمہارا پروردگار ہے۔ یعنی ان معجزات کی وجہ سے مجھ کو اپنا رب اور خدا نہ سمجھنا رب میرا اور تمہارا وہی ایک خدا ہے جس کی ہم سب عبادت کرتے ہیں اور میں اس خدائے پروردگار کا برگزیدہ بندہ اور رسول ہوں معاذ اللہ اس کا بیٹا نہیں۔ یہ تین باتیں جو

میں نے تم کو بتلائیں خدا تک پہنچنے کا یہی سیدھا راستہ ہے یعنی توحید اور تقویٰ اور اطاعت رسول اور توحید اور تقویٰ وہی معتبر ہے جو نبی اور رسول کی ہدایت اور تلقین کے مطابق ہو خود ساختہ توحید اور تقویٰ ہیچ ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ

پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر، بولا کون ہے کہ میری مدد کرے اللہ کی راہ میں! کہا

الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

حواریوں نے ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے، ہم یقین لائے اللہ پر، اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

اے رب! ہم نے یقین کیا جو تُو نے اُتارا، اور ہم تابع ہوئے رسول کے، سو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں۔

ع ۵ ۱۳ ۱۳

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى

اور فریب کیا ان کافروں نے، اور فریب کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ

اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ

میں تجھ کو بھر لوں گا اور اٹھا لوں گا اپنی طرف، اور پاک کر دوں گا کافروں سے اور

جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ

رکھوں گا تیرے تابعوں کو اوپر منکروں سے قیامت کے دن تک پھر

اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

میری طرف ہے تم کو پھر آنا، پھر فیصلہ کر دوں گا تم میں جس بات میں تم جھگڑتے تھے،

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ

سو وہ جو کافر ہوئے ان کو عذاب کروں گا سخت عذاب، دنیا میں اور

الْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مدد گار۔ اور وہ جو یقین لائے، اور عمل

الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ

نیک کئے سو ان کو پورا دے گا ان کا حق، اور اللہ کو خوش نہیں آتے بے انصاف۔ یہ

نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى

پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں، اور مذکور تحقیق۔ عیسیٰ کی مثال

عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے مثال آدم، بنایا اُس کو مٹی سے پھر کہا اس کو ہو جا وہ ہو گیا۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾

حق بات ہے تیرے رب کی طرف سے، پھر تو مت رہ شک میں۔

ذکر عداوتِ یہود با عیسیٰ علیہ السلام وحفاظت خداوند انام وبشارت رفع اِلی السمآء محفوظیت از مکرِ اعداء

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ ... الٰى ... فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾﴾

حسب بشارت جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور پھر نبی ہوئے اور لوگوں کو توحید اور تقویٰ اور اپنی اطاعت کی دعوت دی اور سیدھی راہ کی طرف بلایا اور معجزات اور نشانات اُن کو دکھلائے تو یہود بے بہبود نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کے ایذاء اور قتل کے درپے ہوئے۔

حق جل شانہٗ نے ان آیات میں یہود کی عداوت کا ذکر کیا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کیا کیا تدبیریں کر رہے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی حفاظت کا ذکر فرمایا کہ ہم نے اُن کی حفاظت کی کیا تدبیر کی وہ یہ کہ ہم نے اُن کو زندہ آسمان پر اُٹھایا اور دشمنوں کی ساری تدبیریں اور اُمیدیں خاک میں ملا دیں اصل مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بشارت دینا ہے کہ آپ دشمنوں سے بالکل مامون اور محفوظ رہیں گے اور زندہ آسمان پر اٹھائے جائیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں پس جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی جانب سے کفر اور انکار کو محسوس کر لیا اور دیکھ لیا کہ یہ لوگ میرے قتل کے درپے ہیں تو اپنے مخصوص اصحاب سے جو حواریین کہلاتے تھے۔ یہ کہا کہ کون ہے جو دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کرے؟ اللہ کی طرف ہو کر حواریین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے دین کے ہم آپ ہی کی دعوت اور تبلیغ سے اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ ہم اللہ کے اور آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور پھر پیغمبر علیہ السلام کے جواب کے بعد حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ایمان کی پختگی اور استقامت کے لئے یہ دعا کی۔ اے پروردگار! ہم ایمان لائے ان تمام چیزوں پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور دل وجان سے رسول کے تابع ہوئے۔ پس ہم کو اپنے دین کے شاہدوں کے زمرہ میں لکھ دیجیے یعنی کاملین کے

زمرہ میں ہمارا نام لکھ دیجیے۔ مقصود یہ تھا کہ جب ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں لکھا جائے گا تو گویا کہ ہمارا ایمان رجسٹری ہو جائے گا کہ پھر لوٹنے کا احتمال نہ رہے گا اور یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے پکڑنے اور قتل کرنے کی خفیہ تدبیریں کیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت اور بچاؤ کی ایسی پوشیدہ تدبیر فرمائی جو وہم وگمان سے بھی بالا اور برتر تھی۔ وہ یہ کہ انہی میں سے ایک شخص کو عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شکل بنا دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا۔ یہودی اسی ہم شکل کو عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر پکڑ کے لے گئے اور عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر اس کو قتل کیا اور سُولی پر چڑھایا۔ اور خوش ہو گئے اور اِدھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبریل علیہ السلام گھر کے روشن دان سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا لے گئے اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کرنے والے ہیں کوئی تدبیر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس وقت جبکہ دشمن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نرغہ میں لیے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پریشانی دُور کرنے کے لیے پانچ بشارتیں دیں۔

بشارت اوّل: فرمایا اے عیسیٰ تم گھبراؤ نہیں تحقیق میں تم کو ان دشمنوں کے نرغہ سے بلکہ اس جہان ہی سے تم کو پورا پورا لے لوں گا اور تمہارا کوئی جز ان میں باقی نہ چھوڑوں گا کہ جس کو یہ ہاتھ بھی لگا سکیں پکڑنا اور صلیب پر چڑھانا تو کجا تیرا سایہ بھی ان کو نہ ملے گا۔

بشارت دوم: اور ان کافروں سے پورا پورا ایسے لینے کے بعد تجھ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا یعنی آسمان پر بلا لوں گا جو ملائکہ کی قرارگاہ ہے۔ حق تعالیٰ نے اول توفی کی بشارت دی کہ دشمنوں کے نرغہ سے پورے پورے اور صحیح وسالم نکال لئے جاؤ گے۔ اور پھر دشمنوں سے نجات پانے کے بعد رفع الی السماء کی بشارت دی کہ فقط دشمنوں سے نجات اور رہائی نہ ہوگی بلکہ رفع آسمانی اور معراج جسمانی سے سرفراز کیے جاؤ گے۔

بشارت سوم: اور میں تجھ کو ان ناپاک اور گندوں، یعنی کافروں کے متعفن اور بدبودار پڑوس سے پاک کروں گا اور ایسی پاک و صاف اور مطہر اور معطر جگہ میں پہنچا دوں گا جہاں کفر اور عداوت کی نجاست کا رائحۂ کریہہ بھی محسوس نہ ہو سکے بلکہ ہر دم فرشتوں کی تسبیح و تقدیس کی خوشبوئیں سونگھتے رہو گے۔

بشارت چہارم: اور ناہنجار یہ چاہتے ہیں کہ تجھ کو بے عزت کر کے تیرے دین کے اتباع سے لوگوں کو روک دیں سو میں اس کے بالمقابل تیری پیروی کرنے والوں کو تیرے مخالفوں پر قیامت تک غالب اور فائق رکھوں گا کہ ہمیشہ تیرے خادم اور غلام تیرے مخالفوں اور منکروں پر حکمران ہوں گے اور یہ نالائق وناہنجار تیرے پیروؤں کے محکوم اور باج گذار ہوں گے۔ قیامت تک یوں ہی سلسلہ چلتا رہے گا کہ نصاریٰ ہر جگہ یہود پر غالب اور حکمران رہیں گے چنانچہ اس وقت تک سنا بھی نہیں گیا کہ یہود کو نصاریٰ پر کبھی غلبہ نصیب ہوا ہو اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا یہاں تک کہ جب قیامت قریب آ جائے گی اور دجال کو جو ایک جزیرہ میں محبوس ہے جیل خانہ سے چھوڑ دیا جائے گا تو یہود بے بہبود اس کے اردگرد جمع ہو جائیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ اس کی سرکردگی میں اپنی حکومت قائم کریں اس لیے کہ دجال قوم یہود سے ہوگا اس وجہ سے تمام یہودی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔ اس وقت یکا یک عیسیٰ علیہ السلام بصد جاہ وجلال آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال کو جو یہود کا بادشاہ بنا ہوا ہوگا۔ اس کو خود اپنے دست مسیحائی سے قتل فرمائیں گے اور باقی یہود کے لشکر کا قتل وقتال اور اس گروہ کا بالکلیہ استیصال امام مہدی علیہ السلام کے سپرد ہوگا امام مہدی علیہ السلام مسلمانوں کے لشکر کو ساتھ لے کر دجال کے متبعین کو چن چن کر قتل کریں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے پہلے اگرچہ یہود حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کے غلام اور محکوم تھے مگر زندہ رہنے کی تو اجازت تھی مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کے بعد زندہ رہنے کی بھی اجازت نہ رہے گی ایمان لے آؤ یا

اپنے وجود سے دست بردار ہو جاؤ اور نصاریٰ کو یہ حکم ہوگا کہ میری الوہیت اور ابنیت کے عقیدہ سے توبہ کرو۔ اور مسلمانوں کی طرح مجھ کو اللہ کا بندہ اور رسول سمجھو اور صلیب کو توڑیں گے جو نصاریٰ کا نشان ہے اور خنزیر کو قتل کریں گے جو یہودیوں کا خاص شعار ہے اسی طرح نصرانیت اور یہودیت کو ختم کریں گے اور سوائے دین اسلام کے کوئی دین قبول نہ کریں گے حتیٰ کہ کسی کافر سے جزیہ بھی قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ جزیہ کا حکم اس وقت تھا جب تک کافر کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت تھی اب وہ اجازت اور مہلت ختم ہو چکی ہے۔ اب سوائے اسلام کے کسی اور مذہب پر رہنے کی اجازت نہیں کیونکہ اب فیصلہ کا وقت یعنی قیامت قریب آ گئی ہے اس لیے اب سوائے دین اسلام کے کسی دین کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

بشارت پنجم: الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول من السماء کے بعد اس طرح تمام اختلافات کا فیصلہ فرمائیں گے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ پھر تم سب کو میری طرف لوٹنا ہے۔ پس اس وقت میں تمہارے اختلافات کا فیصلہ کر دوں گا۔ وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے یہود کا یہ زعم باطل ہو جائے گا کہ ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ﴾ (المائدہ:۵۷) اور نصاریٰ کا یہ زعم باطل ہو جائے گا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں اور حیات مسیح کے مسئلہ کا بھی فیصلہ ہو جائے گا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے اُترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو روزِ روشن کی طرح یہ امر واضح ہو جائے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کیے گئے اور نہ سولی دیئے گئے بلکہ زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے اور اب عرصہ دراز کے بعد اسی جسم کے ساتھ آسمان سے نزول ہو رہا ہے۔

اب آئندہ آیت میں اس حکم کی قدرے تفصیل فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے پس جو لوگ کافر ہوئے ان کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اور آخرت میں دنیا میں قتل ہوں گے اور اسیر ہوں گے اور ان پر جزیہ مقرر ہوگا اور طرح طرح سے ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں دوزخ کا دائمی عذاب ہوگا اور کوئی نہیں ان کا مددگار جو ان کو ہمارے عذاب سے بچا سکے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے سو اللہ تعالیٰ ان کو پورا حق دے گا اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا بے انصافی کرنے والوں کو یعنی جو اللہ اور اس کے رسول کا حق ادا نہ کریں۔ اور اللہ اور اس کے رسولوں کا حق ایمان لانا ہے۔

استدلال بر نبوت محمدیہ بقصہ مذکورہ

چونکہ یہ قصہ بھی منجملہ انباء الغیب کے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ ﷺ کو بتلایا اس لیے اس سے آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں یہ قصہ ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ جو منجملہ آپ کی دلائل نبوت سے ہے اور نصیحت اور حکمت کی باتوں میں سے ہے جو ہر طرح سے موجب بصیرت ہے۔

نصاریٰ کے ایک استدلال یا شبہ کا جواب

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝۵۹ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝۶۰﴾

اس آیت میں حق جل شانہٗ نے نصارائے نجران کے ایک شبہ کا جواب دیا ہے جس کو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت کے لیے بطور استدلال ذکر کرتے تھے۔ وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے معلوم ہوا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے تھے حق تعالیٰ نے ان کے جواب کے لیے یہ آیت نازل فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں ہم نے آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت سے بغیر ماں اور باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن اپنی جنس کے ایک فرد سے تو پیدا ہوئے مگر آدم علیہ السلام تو بالکل ہی غیر جنس سے پیدا ہوئے۔ پس اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا دلیل الوہیت ہے تو آدم علیہ السلام اس کے زیادہ سزا اور ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: تحقیق عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام جیسی مثال ہے۔ آدم علیہ السلام کی تصویر کو مٹی سے بنایا پھر اس میں روح پھونکی اور اس قالب کو حکم دیا کہ زندہ آدمی ہو جا تو فوراً اسی طرح ہو گیا جس طرح حکم ہوا تھا۔ یہی بات حق ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بتلا دی گئی۔ پس اے مخاطب! تو ان لوگوں میں سے مت بن جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں شک اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہود کی طرح نہ ان کی والدہ ماجدہ پر تہمت لگا اور نہ نصاریٰ کی طرح اُن کو ابن اللہ سمجھ بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ نے بتلا دیا ہے اس کے مطابق ایمان لا وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے برگزیدہ بندہ تھے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور جب دشمنوں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا۔

نکتہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ روح الامین یعنی جبریل امین علیہ السلام کے نفخہ سے پیدا ہوئے اور روح الامین علیہ السلام کی طرح ان کا لقب بھی روح اللہ ہوا تو معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ صورۃً انسان اور بشر تھے مگر حقیقتاً جنس ملائکہ سے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پر اُٹھایا تا کہ اپنے ہم جنس فرشتوں میں زندگی بسر کریں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات دیئے گئے ان کو بھی رفع الی السماء سے خاص مناسبت تھی۔ وہ یہ کہ مٹی کا پتلا پھونک مارنے سے باذن اللہ پرند بن کر اُڑنے لگتا تھا۔ اشارہ اس طرف تھا کہ ایک دن عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح اُڑ کر آسمان پر چلے جائیں گے اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے باپ آدم علیہ السلام کے مشابہ ہیں۔ اس لیے حضرت عیسیٰ قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے جیسے آدم علیہ السلام آسمان سے زمین پر اُترے تھے ایسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول حضرت آدم علیہ السلام کے ہبوط کے مشابہ ہوگا اور جس طرح آدم علیہ السلام کا ہبوط من السماء جسمانی تھا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول من السّماء بھی جسمانی ہوگا۔

لطائف ومعارف

① **حواری:**۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ یاروں کا لقب تھا حواری اصل میں دھوبی کو کہتے ہیں۔ پہلے دو شخص جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابع ہوئے وہ دھوبی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ کپڑے کیا دھوتے ہو میں تم کو دل دھونے سکھا دوں وہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ پھر اسی طرح سب ساتھیوں کا یہی لقب پڑ گیا۔ (کذا فی موضح القرآن)

غرض کہ حواریین سے حضرت مسیح علیہ السلام کے انصار اور خاص اصحاب مراد ہیں۔ قاموس میں ہے کہ حواری کے معنی دھوبی یا خالص دوست یا نبی کے مددگار کے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص اصحاب۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاون ہونے کی وجہ سے حواریین کے نام سے موسوم ہو گئے۔ صحیحین میں ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم خندق میں تین مرتبہ آواز دی۔ تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن

عوام رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے لیے ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔

② مکر کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے مفسرین کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ مکر اصل لغت میں اُس حیلہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کے نقصان کا سبب ہو۔ اور یہ بظاہر قبیح اور مذموم ہے۔ اس لیے یہ لفظ مکر۔ منکرین عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں تو بطور حقیقت استعمال ہوا ہے اور ﴿مَكَرَ اللّٰهُ﴾ میں جو مکر کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، وہ بطریق مجاز ہے یعنی مقابلہ اور ازدواج کے طور پر استعمال ہوا ہے اس لیے کہ مکر ایک برا فعل ہے جس سے ذاتِ باری تعالیٰ کو منزہ ہونا چاہیئے اس لیے زجاج رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ مکر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اُن کے مکر کا بدلہ دیا جیسے ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا﴾ (الشوریٰ:۴۰) میں برائی کے بدلہ اور سزا کو بطور مقابلہ برائی سے تعبیر کیا گیا ہے اور جیسے قرآن کریم میں جزاء خداع اور جزاء استہزاء کو خداع اور استہزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

محققین کی رائے یہ ہے کہ مکر اصل لغت میں کسی بُرے معنی پر دلالت نہیں کرتا تا کہ بغرض تنزیہ ﴿وَ مَكَرَ اللّٰهُ﴾ میں معنی مجازی مراد لیے جائیں کیونکہ اصل میں مکر کے معنی تدبیر خفی کے ہیں جو ایسے نامعلوم طریقہ سے کی جائے کہ دوسرے کو اس کا خیال بھی نہ ہو۔ پس اگر یہ تدبیر کسی محمود اور مستحسن غرض کے لیے کی جائے تو یہ تدبیر بھی محمود اور مستحسن ہوگی اور اگر کسی غرض فاسد کے لیے کی جائے تو قبیح اور مذموم ہوگی۔ عرف میں اگرچہ لفظ مکر بُری تدبیروں ہی کے لیے بولا جاتا ہے مگر حقیقت اور اصل لغت میں اچھی اور بُری دونوں ہی قسم کی تدبیریں مکر کے مفہوم میں داخل ہیں یعنی اگر کسی حکمت اور مصلحت سے کسی کے حق میں بھلائی کی تدبیر چپکے چپکے کی جائے تو وہ مکر محمود ہوگا اور اگر کسی غرض فاسد سے کسی کی بُرائی کے لیے خفیہ تدبیر کی جائے تو وہ مکر مذموم ہوگا اور ﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ (الفاطر:۴۳) میں مکر کے ساتھ سیئ کی قید لگانا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی اب اس تحقیق کی بناء پر لفظ مکر۔ وَ مَكَرَ اللّٰهُ میں اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ آیت میں معنی مجازی بھی صحیح اور درست ہو سکتے ہیں تاہم بہتر یہی ہے کہ معنی حقیقی مراد لیے جائیں۔ اصل لغت کے اعتبار سے مکر کے معنی میں کوئی برائی نہیں تا کہ بغرض تنزیہ اس کو مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت پیش آئے اور ذوق اور وجدان بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ کا مکر محمود تھا اور بنی اسرائیل کا مکر مذموم تھا اس لیے کہ وَ مَكَرَ اللّٰهُ کو ماقبل پر بطور عطف ذکر فرمایا ہے اور عطف تغایر کو چاہتا ہے۔

حکایت : وقد سئل بعضهم كيف يمكر الله فصاح و قال لا علة لصنعه و انشاء يقول.

"بعض اولیاء اللہ سے سوال کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کیسے مکر کرتا ہے تو ایک چیخ ماری اور یہ کہا کہ اللہ کے فعل کے لیے کسی علت اور سبب کی ضرورت نہیں۔"

اور اس کے بعد یہ شعر پڑھنے شروع کیے۔

فَدَيْتُكَ قَدْ جُبِلْتُ عَلٰى هَوَاكَا وَنَفْسِي لَا تُنَازِعُنِي سِوَاكَا

"قربان ہو جاؤں تجھ پر اے محبوب میری جبلت اور فطرت میں تیری محبت داخل ہے اور میرا نفس تیرے سوا کسی کی کشمکش میں مبتلا نہیں ہوتا۔"

اَحِبُّكَ لَا بِبَعْضِي - بَلْ بِكُلِّي وَاِنْ لَمْ يُبْقِ حُبُّكَ لِي حرَاكَا

"میں تجھ کو محبوب رکھتا ہوں مگر اپنے بعض اجزاء کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے کل اجزاء کے اعتبار سے تجھ کو محبوب رکھتا ہوں

اگرچہ تیری محبت نے مجھ میں ملنے کی بھی سکت باقی نہیں چھوڑی۔"

وَيَقْبُحُ مِنْ سِواکَ الْفِعْلُ عَنْدِی وَتَفْعَلُهٗ فَيَحْسُن مِنْکَ ذاکَا

"اور تیرے سوا سے جو فعل صادر ہوتا ہے وہ میرے نزدیک قبیح اور بُرا ہوتا ہے اور جب اسی فعل کو تو کرتا ہے تو وہ نہایت مستحسن اور پسندیدہ ہوتا ہے۔" (روح المعانی ص ۱۶۹ ج ۳)

③ یہود کا مکر یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور صلب کا ارادہ کیا اور اللہ کا مکر یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جبریل امین علیہ السلام کے ذریعہ گھر کے روشن دان سے آسمان پر اٹھوالیا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کیں بادشاہ کے کان بھر دیئے کہ یہ شخص معاذ اللہ ملحد ہے توریت کو بدلنا چاہتا ہے اور سب کو بے دین بنانا چاہتا ہے بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دیا۔ جب وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرفتار کرنے کے لیے گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچانے کی یہ تدبیر کی کہ انہی لوگوں میں سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہمشکل بنا دیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ لوگوں نے اس شخص کو جو انہی میں کا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہمشکل بنا دیا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر پکڑ لیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سند صحیح کے ساتھ مروی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر (عربی) ص ۳۶۵ ج ۱)

④ لفظ توفی کے متعلق حافظ ابن تیمیہ الجواب الصحیح ص ۲۸۳ ج ۲ میں لکھتے ہیں: لفظة التوفی فی لغة العرب معناہ الاستیفاء والقبض واذلك ثلاثة انواع احدها توفی النوم. والثانی توفی الموت والثالث توفی الروح والبدن جمیعا۔

یعنی لغت عرب میں توفی کے معنی استیفاء پورا پورا لے لینے اور اپنے قبضہ میں کر لینے کے ہیں۔ اور توفی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک توفی نوم۔ یعنی خواب اور نیند کی توفی جس میں انسان کے شعور اور ادراک کو پورا پورا قبض کر لیا جاتا ہے اور دوسری توفی موت۔ یعنی موت کے وقت روح کو پورا پورا قبض کر لینا۔ تیسری توفی الروح والجسد۔ یعنی جسم اور روح کو پورا پورا لے لینا۔ انتہی یعنی روح اور جسم دونوں کو پورا پورا آسمان پر لے جانا۔

لفظ توفی کے متعلق ابوالبقاء اپنی کلیات میں لکھتے ہیں: التوفی الاماتة و قبض الروح وعلیه استعمال العامة او الاستیفاء واخذ الحق وعلیه استعمال البلغاء اھ۔ یعنی توفی کا لفظ عوام کے یہاں موت دینے اور روح قبض کرنے کے لیے مستعمل ہوتا ہے لیکن بُلغاء کے نزدیک استیفاء یعنی کسی چیز کے پورا پورا لے لینے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ توفی کے اصل معنی تو استیفاء کے ہیں اور موت پر جو لفظ توفی کا اطلاق آتا ہے وہ بھی اسی وجہ سے آتا ہے کہ اس میں جان پوری پوری لے لی جاتی ہے یا یہ کہ عمر پوری کر دی جاتی ہے پس اگر فقط جان پوری پوری لے لی جائے تو بھی توفی ہے اور اگر جان اور جسم دونوں کو پورا پورا لے لیا جائے تو بدرجہ اولیٰ توفی ہوگی بلکہ اعلیٰ درجہ کی توفی ہوگی کیونکہ جن ائمہ لغت نے توفی کے معنی قبض روح کے لکھے ہیں انہوں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ فقط قبض روح کو توفی کہتے ہیں اور اگر قبض روح مع البدن ہو تو اس کو توفی نہیں کہتے بلکہ ظاہر ہے کہ اگر قبض روح کے ساتھ قبض بدن بھی ہو تو بدرجہ اولیٰ توفی ہوگی۔

غرض یہ کہ اصل لغت کے اعتبار سے توفی کے معنی استیفاء اور قبض کے ہیں جو اپنے معنی اصلی اور جنسی کے لحاظ سے نوم (نیند) اور موت اور رفع جسمانی سب پر صادق آتا ہے۔

دیکھئے حق جل شانہٗ نے اپنے اس ارشاد ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ (الزمر:۴۲) میں توفی نفس کی دو صورتیں بتلائی ہیں ایک موت اور دوسری نوم یعنی نیند اور حین موتھا کی قید لگا کر یہ بتلا دیا کہ کبھی توفی موت کے وقت ہوتی ہے عین موت نہیں ورنہ شے کا خود اپنے لیے ظرف ہونا لازم آئے گا۔ اور ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ﴾ (الانعام:۶۰) میں بھی توفی کا استعمال نیند کے موقع پر کیا گیا ہے۔

نکتہ: توفی کے اصلی معنی تو پورا پورا وصول کر لینے کے ہیں محاورۂ عرب میں لفظ توفی نوم اور موت کے لیے مستعمل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن قرآنِ کریم نے لفظ توفی کو نوم اور موت کے معنی میں اس لیے استعمال کرنا شروع کیا تا کہ اہل عرب پر موت اور نوم کی حقیقت واضح ہو جائے کہ انسان کے بدن میں کوئی چیز پوشیدہ ہے جس کو حق تعالیٰ نوم اور موت کی حالت میں بندہ سے لے لیتے ہیں عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان مر کر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ موت کو فنا اور عدم کے مترادف سمجھتے تھے اسی لیے وہ بعث یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے اور یہ کہتے تھے۔ ﴿ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ (السجدہ:۱۰) حق تعالیٰ نے اُن کے رد کے لیے یہ ارشاد فرمایا ﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ (السجدہ:۱۱) یعنی آپ ان منکرین بعث سے کہہ دیجیے کہ تم مر کر فنا نہیں ہو جاتے بلکہ موت کا فرشتہ تم سے اللہ کا پورا پورا حق وصول کر لیتا ہے۔ یعنی وہ ارواح جو اللہ کی امانت ہیں وہ تمہارے جسموں سے لے لی جاتی ہیں اور اللہ کے یہاں محفوظ رہتی ہیں قیامت کے دن پھر انہی ارواح کو تمہارے اجسام کے ساتھ متعلق کر کے حساب و کتاب لیا جائے گا چنانچہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''تم اپنے آپ کو دھڑ سمجھتے ہو کہ خاک میں رُل گئے تم جان ہو وہ فرشتہ لے جاتا ہے فنا نہیں ہوتے۔'' اھ

⑤ تمام امت محمدیہ کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے سلف اور خلف میں سے نہ کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء کا منکر ہے اور نہ نزول من السماء کا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تلخیص حبیر ص ۳۱۹ میں اس پر اجماع نقل کیا ہے، اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث نزول کو متواتر کہا ہے تفصیل کے لیے کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ کو دیکھیے۔

اختلاف صرف اس میں ہے کہ رفع الی السماء سے پہلے کچھ دیر کے لیے موت طاری ہوئی یا نہیں یا حالت نوم میں آسمان پر اٹھائے گئے۔

جمہور صحابہ و تابعین اور عامۂ سلف صالحین یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں توفی سے موت کے معنی مراد نہیں بلکہ توفی کے اصلی اور حقیقی معنی مراد ہیں یعنی کسی شے کو پورا پورا لے لینا کیونکہ دشمنوں کے ہجوم اور نرغہ کے وقت توفی کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی اور تسکین کے لیے ہے کہ اے عیسیٰ علیہ السلام تم دشمنوں کے ہجوم اور نرغہ سے گھبرانا نہیں۔ میں تم کو پورا پورا روح اور جسم سمیت ان نابکاروں سے چھین لوں گا تیرا وجود۔ ان کے لیے میری ایک عظیم نعمت تھا ان کے کردار سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ نابکار اور ناہنجار اس قابل نہیں کہ تیرے وجود کی نعمت کو ان کے لیے باقی رکھا جائے ان کی ناقدری اور ناسپاسی کی سزا یہ ہے کہ ان سے یہ نعمت پوری پوری واپس لے لی جائے۔ حضرت مولانا سید انور شاہ قدس سرہٗ اس بارے میں فرماتے ہیں۔

وَجُوْهُ لم تكُنْ اَهْلاً لِخيْر فَيَاْخُذُمِنْهُمْ عِيْسٰى اِلَيْهِ

''یہ چہرے کسی خیر کے قابل نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف کھینچ لیا۔''

وَيَرْفَعُهٗ وَلَا يُبْقِيْهِ فِيْهِمْ كَاَخْذِالشَّيْءِ لَمْ يُشْكَرْ عَلَيْهِ

"اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالیا اور ان میں باقی نہ چھوڑا۔ اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ان سے ایسا لے لیا جیسا کہ اُس شیء کو لے لیا جاتا ہے جس کی ناقدری کی جائے۔"

وَحِيْزَ كَمَا يُحَازُ الشَّيْءُ حِفْظًا وَآوَاهُ اِلٰى مَاْوًى لَدَيْهِ

"اور ان سے چھین کر اپنے پاس ان کو خاص طور سے محفوظ رکھا اور اپنے قریب میں ان کو ٹھکانہ دیا۔"

غرض یہ کہ آیت میں توفی سے پورا پورا لے لینے کے معنی مراد ہیں۔ موت کے معنی مراد نہیں اور نہ اس مقام کے مناسب ہیں اس لیے کہ جب ہر طرف سے خون کے پیاسے اور جان کے لیوا کھڑے ہوئے تو اس وقت تسلی اور تسکینِ خاطر کے لیے موت کی خبر دینا کہ میں تجھ کو موت دوں گا مناسب نہیں دشمنوں کا تو مقصود ہی جان لینا ہے اس وقت تو مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تم گھبراؤ نہیں ہم تم کو تمہارے دشمنوں کے نرغہ سے پورا پورا اور صحیح وسالم نکال لے جائیں گے کہ دشمنوں کو تمہارا سایہ بھی نہ مل سکے گا۔ پس گر آیت میں توفی سے موت کے معنی مراد ہوں تو عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی تو نہ ہوگی البتہ یہود کی تسلی ہو جائے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ اے یہود! تم بالکل نہ گھبراؤ اور نہ مسیح علیہ السلام کے قتل کی فکر کرو میں خود ہی اُن کو موت دوں گا۔ اور میں خود ہی تمہاری تمنا اور آرزو پوری کروں گا تمہیں کوئی مشقت نہ ہوگی یہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی نہ ہوئی بلکہ یہود کی تسلی ہوئی۔

② نیز یہ کہ توفی بمعنی الموت تو ایک عام شے ہے جس میں تمام مومن وکافر انسان اور حیوان سب ہی شریک ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے جو خاص طور پر اُن سے توفی کا وعدہ کیا گیا۔

③ نیز ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ سے بھی یہی معلوم اور مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ کا مکر اور اس کی تدبیر یہود کی تدبیر اور مکر کے خلاف اور ضد تھی جیسا کہ ﴿يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا﴾ (الطارق:۱۵،۱۶)... ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا﴾ (النحل:۵۰) اور ﴿يَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ﴾ (الانفال:۳۰) ان تمام واقعات میں اللہ کی تدبیر کافروں کی تدبیر کے برعکس تھی۔

قوم صالح نے صالح علیہ السلام کے قتل کی تدبیریں کیں اور مشرکین مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تدبیریں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی حفاظت کی تدبیر کی اسی طرح آیت زیرِ بحث میں مراد یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت کی تدبیر کی کہ دشمنوں کے ہاتھ سے صحیح وسالم نکال کر آسمان کی طرف ہجرت کرادی اب اس ہجرت کے بعد زمین پر جو نزول ہوگا۔ وہ اس زمین کے فتح کرنے کے لیے ہوگا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے کچھ عرصہ بعد مکہ فتح کرنے کے لیے تشریف لائے اور تمام اہل مکہ مشرف باسلام ہوئے اسی طرح جب عیسیٰ علیہ السلام زمین کے فتح کرنے کے لیے نازل ہوں گے تو تمام اہل کتاب ایمان لے آئیں گے جیسے تمام اہلِ مکہ ایمان لے آئے تھے۔ امام رازی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ توفی کے معنی کسی چیز کو پورا پورا لینے کے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ شاید کسی کے دل میں یہ خطرہ گذرے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی فقط روح اٹھائی گئی۔ روح اور جسم دونوں نہیں اٹھائے گئے (جیسا کہ نصاریٰ کا خیال ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے لاہوت کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے اور ناسوت زمین پر ہی رہا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ﴿مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ﴾ فرما کر آگاہ کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح اور جسم دونوں پورے پورے اٹھائے گئے اور یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی کے لیے ایسی ہوگی۔ جیسے وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ۔ (تفسیر کبیر ص ۴۸۱ ج ۲)

④ ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ اس آیت میں توفی سے نوم (نیند) مراد ہے۔ جیسا کہ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ﴾ (الانعام:۶۰) میں توفی سے نوم (نیند) کے معنی مراد ہیں جو کہ توفی اور وفات کی ایک قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے سُلا یا اور پھر بحالتِ خواب اُن کو آسمان پر اٹھایا۔ پس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اے عیسیٰ علیہ السلام! تم گھبراؤ نہیں میں تمکو سُلاؤں گا اور پھر اسی حالت میں تم کو اٹھالوں گا۔

⑤ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ توفی سے موت مراد ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ بھی فرماتے ہیں کہ آیت میں تقدیم وتاخیر ہے کہ آیت میں جو چیز پہلے مذکور ہے اس کا وقوع بعد میں ہوگا اور جو بعد میں مذکور ہے۔ اس کا وقوع مقدم ہے یعنی رفع آسمانی پہلے ہوا اور یہ توفی بمعنی الموت قیامت کے قریب نزول من السماء کے بعد ہوگی اور آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام میں اس وقت تم کو آسمان پر اٹھاؤں گا اور پھر آخری زمانہ میں تمہارے نازل ہونے کے بعد تم کو موت دوں گا۔

اس تفسیر کی رُو سے رفع، توفی پر مقدم ٹھہرتا ہے اور آیت میں تقدیم وتاخیر کا قائل ہونا لازم آتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض قابل التفات نہیں اس لیے کہ واؤ ترتیب کے لیے وضع نہیں ہوا اور تقدیم وتاخیر نہ قواعد عربیت کے خلاف ہے اور نہ فصاحت و بلاغت میں مخل ہے امام رازی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں:

ومثله من التقديم والتاخير كثيرفى القرآن. (تفسير كبير ص ٤٨١ ج ٢)

"ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر میں جو تقدیم وتاخیر پائی جاتی ہے سو اس قسم کی تقدیم وتاخیر قرآن کریم میں بہت کثرت کے ساتھ موجود ہے۔"

اور قرآن کریم میں تقدیم وتاخیر کے نظائر اور شواہد ہم نے اپنے رسالہ کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ میں لکھ دیئے ہیں وہاں دیکھ لیے جائیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باسانید صحیحہ منقول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اور آیت ﴿اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ میں توفی سے توفی موت مراد ہے لیکن یہ اخیر زمانہ میں ہوگی۔

اخرج اسحاق بن بشر و ابن عساكر من طريق جوهر عن الضحاك عن ابن عباس فى قوله تعالىٰ انى متوفيك ورافعك الے يعنى رافعك ثم متوفيك فى آخر الزمان. (تفسير در منثور ص ٣٦ ج ٢)

"اسحاق بن بشر اور ابن عساکر ضحاک سے راوی ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ﴿مُتَوَفِّيْكَ﴾ کی تفسیر میں یہ فرماتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا رفع مقدم ہے اور ان کی وفات اخیر زمانہ میں ہوگی۔" (تفسیر درمنثور)

پس اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿مُتَوَفِّيْكَ﴾ کی تفسیر ممیتک کے ساتھ منقول ہے تو انہی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باسانید صحیحہ وجیّدہ یہ بھی منقول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ آیت میں تقدیم وتاخیر ہے تو پھر اُن کے نصف قول کو ماننا اور نصف کا انکار کر دینا کون سی عقل اور کون سی دیانت ہے؟ قادیان کے دہقان ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس نصف قول کو قبول کرتے ہیں جو اُن کی ہوائے نفسانی اور غرض کے موافق ہے۔ اور دوسرا نصف جو اُن کی غرض کے خلاف ہے اس سے گریز کرتے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تارک صلوٰۃ ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ سے حجت پکڑتے ہیں اور ﴿اَنْتُمْ

سُکْرٰی﴾ سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

نکتہ: رہا یہ امر کہ اس تقدیم وتاخیر میں نکتہ کیا ہے سو نکتہ یہ ہے کہ ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ سے مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلّی ہے کہ یہ دشمن جو آپ علیہ السلام کے قتل اور صَلب کے درپے ہیں اور آپ کی جان لینا چاہتے ہیں یہ ہرگز آپ کے قتل کرنے اور سولی دینے پر قادر نہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو وقت مقدّر پر طبعی موت سے وفات دیں گے اور فی الحال آپ کو اپنی طرف اٹھالیں گے آپ علیہ السلام بالکل مطمئن رہیں کہ دشمن آپ کی جان نہیں لے سکیں گے۔ غرض یہ کہ دشمن جان لینا چاہتے تھے اس لیے توفی کا ذکر مقدم فرمایا جس سے مقصود دشمنوں سے محفوظ رہنے کی بشارت دینا ہے کہ موت ان کے قبضہ میں نہیں وہ ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہمارے حکم سے اپنے وقت پر ہوگی۔

نیز توفی کی تقدیم میں ایک نکتہ یہ ہے کہ بیک وقت اور بیک لفظ یہود اور نصاریٰ دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہود کی تردید اس طرح ہوئی کہ یہود اُس کے مارنے میں کامیاب نہ ہوں گے اللہ تعالیٰ خود ان کو وقت مقرر پر وفات دے گا۔

اور نصاریٰ کی تردید اس طرح ہوئی کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں کیونکہ ان پر ایک وقت آنے والا ہے کہ اس وقت ان پر موت اور فناء آئے گی۔ اور فانی خدا نہیں ہوسکتا۔

⑥ حق جل شانہٗ نے اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدوں کا ذکر فرمایا ہے۔

ایک وعدہ توفی کا جس کی تفصیل گذر گئی۔

دوسرا وعدہ رفع الی السماء کما قال اللہ تعالیٰ : ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ یعنی اے عیسیٰ علیہ السلام میں تم کو اپنی طرف اٹھاؤں گا جہاں میرے فرشتے رہتے ہیں وہاں تم کو رکھوں گا۔ اس آیت میں رفع سے جسمانی رفع مراد ہے۔ اس لیے کہ ① ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ میں خطاب عیسیٰ علیہ السلام کو ہے جو مجموعہ ہے جسم اور روح کا۔ ② اور یہاں رفع درجات اس لیے مراد نہیں ہوسکتا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے ہی سے حاصل تھا اور رفع جسمانی میں تو اور بھی رفع درجات حاصل ہو جاتا ہے رفع جسمانی، رفع درجات کے منافی نہیں اور فقط رفع روحانی اس لیے مراد نہیں ہوسکتا کہ رفع روحانی ہر مرد صالح کو بوقت موت حاصل ہوتا ہے۔ اس کو خاص طور پر بطور وعدہ ذکر کرنا بے معنی ہے۔

نیز باتفاق محدثین ومفسرین ومؤرخین یہ آیتیں نصارائے نجران کے حق میں اُن سے مناظرہ اور ان کے عقائد کی اصلاح کے بارہ میں نازل ہوئیں اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور دشمنوں کے ہاتھ سے مقتول اور مصلوب ہوئے اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر آسمان پر اٹھائے گئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں عقیدۂ ابنیت اور عقیدۂ قتل وصلب کی صریح لفظوں میں تردید اور نفی فرمائی کہ وہ خدا کے بیٹے نہ تھے بلکہ خدا کے بندہ اور رسول تھے اور یہود کا یہ زعم کہ ﴿اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ﴾ (النساء:۱۵۷) کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو قتل کر دیا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ (النساء:۱۵۷) اور نصاریٰ کے تیسرے عقیدہ یعنی رفع الی السماء کی تصویب اور تصدیق فرمائی اور ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ (النساء:۱۵۷) (یعنی دشمنوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ سولی دی) میں قتل اور صلب کی نفی کرنے کے بعد متصلاً یہ فرمایا ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ﴾ (النساء:۱۵۸) کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ آسمان پر اٹھایا اگر عقیدۂ قتل وصلب کی طرح عقیدۂ رفع الی السماء بھی غلط تھا تو جس طرح ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا

صَلَبُوْهُ﴾ (النساء:۱۵۷) کہہ کر عقیدۂ قتل وصلب کی صراحتاً تردید فرمائی۔ اسی طرح بجائے ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ (النساء:۱۵۸) کے ﴿مَا رَفَعَهُ اللّٰهُ﴾ فرما کر عقیدۂ رفع الی السماء کی تردید فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہیں اٹھایا۔

تیسرا وعدہ ﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کا ہے تطہیر سے مراد یہ ہے کہ اہل کفر کے نجس اور ناپاک قرب وجوار سے الگ کر کے تم کو آسمان پر بلالوں گا۔

چوتھا وعدہ یہ ہے کہ تیرے متبعین کو تیرے منکروں پر غالب رکھوں گا۔ اور تیرے دشمنوں کو کبھی حاکمانہ اقتدار نصیب نہ ہوگا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ﴾ جاننا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابع اور پیرو نصاریٰ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح پیرو مسلمان ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول مانتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وصیت ﴿وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ﴾ (الصف:۶) پر عمل کرنے والے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ امت محمدیہ اور نصاریٰ ہمیشہ یہود پر غالب اور حاکم رہیں گے۔ چنانچہ یہ وعدہ جلد ہی پورا ہوا کہ یہود ذلیل اور خوار ہوئے اور سلطنت ان کی ختم ہوئی اور پھر آج تک یہود جہاں کہیں بھی ہیں یا تو نصاریٰ کی رعایا ہیں یا اہلِ اسلام کی اور اس وقت فلسطین میں جو یہودیوں کی برائے نام حکومت قائم ہوئی ہے وہ درحقیقت نصاریٰ (امریکہ و برطانیہ) کی ہے نام یہود کا ہے۔ اس برائے نام سلطنت کا وجود تمام تر نصاریٰ کے رحم وکرم اور اعانت اور امداد کا مرہون منت ہے اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا صرف چالیس دن کے لیے دجال کا شور وغوغا ہوگا اور یہودی اس کے ساتھ ہوں گے۔ سو اس چند روزہ شور وغوغا کو سلطنت نہیں کہا جا سکتا اور عجب نہیں کہ فلسطین میں یہ برائے نام حکومت اس لیے قائم ہوئی ہو کہ یہودی سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی علیہ السلام کو نزول اور ظہور کے بعد قتل میں سہولت ہو کہ سب ایک جگہ جمع ہیں قتل کے لیے تلاش نہ کرنا پڑے۔

پانچواں وعدہ فیصلۂ اختلاف ہے ﴿ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ یہ پانچواں وعدہ ہے کہ جو اختلافات کے فیصلہ سے متعلق ہے تمام اختلافات کا آخری فیصلہ تو آخرت اور قیامت کے دن ہوگا لیکن یہود اور نصاریٰ اور اہل اسلام کے اختلافات کا ایک فیصلہ قیامت قائم ہونے سے کچھ روز پہلے ہی ہو جائے گا اور وہ مبارک وقت ہوگا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے اور یہود کو چن چن کر ماریں گے کوئی یہودی اس وقت اپنی جان نہ بچا سکے گا۔ حدیث میں ہے کہ اس وقت اگر کوئی یہودی جان بچانے کے لیے کسی شجر یا حجر کے پیچھے چھپ جائے گا تو شجر اور حجر میں سے آواز آئے گی۔

هٰذا يهودي ورائي فاقتله. "یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے اس کو قتل کیجیے۔"

غرض یہ کہ اس طرح کی تیغ بے دریغ سے تو یہودیت کا فیصلہ اور خاتمہ ہو جائے گا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد صلیب کو جو کہ (نصرانیت کا نشان ہے) توڑیں گے جس سے نصرانیت کا فیصلہ اور خاتمہ ہو جائے گا اور یہود اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے اور یہود عقیدہ قتل وصلب سے تائب ہو جائیں گے اور نصاریٰ عقیدہ ابنیت سے تائب ہو جائیں گے۔ اور مسلمان تو پہلے ہی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں صحیح عقیدہ رکھتے تھے اور ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے تھے مسلمان نزول کے بعد جب ان تمام چیزوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے تو مسلمانوں کا ایمان بالغیب، ایمان شہودی بن جائے گا جس کے بعد ارتداد کا اندیشہ نہیں

رہتا اور چونکہ مسلمانوں کا ایمان اور عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بالکل صحیح ہوگا۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول مسلمانوں ہی کی ایک مسجد کے منارہ پر ہوگا اور مسلمان ہی آپ کے گردوپیش اور آپ کے معین و مددگار ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دین اسلام ہی کی تجدید کے لیے ہوگا۔

غرض یہ کہ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے تمام اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا اور خدا تعالیٰ کا یہ آخری وعدہ دنیا کے اخیر میں پورا ہوگا۔

⑦ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال کی عمر میں نبی بنائے گئے اور اسّی ۸۰ سال کی عمر میں آسمان پر اُٹھائے گئے اور آسمان سے نازل ہونے کے بعد چالیس سال زمین پر زندہ رہیں گے اور اس کے بعد وفات پائیں گے اور حجرۂ نبوی میں مدفون ہوں گے اس طرح وفات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوگی۔ (کذا فی عقیدۃ الاسلام ص ۲۹)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا

پھر جو جھگڑا کرے تجھ سے اس بات میں بعد اس کے کہ پہنچ چکا تجھ کو علم، تو تُو کہہ آؤ!

نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ قف

بلاویں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان۔

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ

پھر دُعا کریں، اور لعنت ڈالیں اللہ کی جھوٹوں پر۔ یہ جو ہے سو یہی ہے

الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ

بیان تحقیق، اور کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست

الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع ۶ ۹ ۱۴

حکمت والا۔ پھر اگر قبول نہ کریں تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے۔

دعوت مباہلہ برائے اتمام حجت بر اہلِ مجادلہ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ... الیٰ ... فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع﴾

ربط: یہاں تک حق کو دلائل اور براہین سے ایسا واضح کر دیا گیا کہ جس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی لیکن جو شخص یا جو گروہ معاند اور ضدی ہو اور باطل پر مصر ہو اس سے کیا معاملہ کیا جائے آئندہ آیات میں اُس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے ساکت

کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُن کو مباہلہ کی دعوت دی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کیا جائے ایسے لوگوں پر اتمام حجت کا یہ طریقہ ہے اور یہ امر ہم شروع سورت ہی میں لکھ آئے ہیں کہ سورۂ آل عمران کی شروع کی تراسی آیتیں نجران کے نصرانیوں کے حق میں نازل ہوئی ہیں اس آیت میں بھی انہی کو خطاب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں حق واضح ہو چکا ہے ان واضح اور روشن دلائل کے بعد بھی اگر یہ جھگڑا کریں تو اے نبی کریم ﷺ آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ تم اپنی عورتوں اور لڑکوں سمیت حاضر ہو جاؤ اور ہم بھی اسی طرح اپنی عورتوں اور لڑکوں کو لے آئیں اور سب مل کر خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو جب جھوٹے پر حق تعالیٰ کا قہر آئے گا تو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: پس جب کہ یہ بتلا دیا گیا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور وہ خدا اور خدا کے بیٹے نہ تھے اور نہ ولد الزنا تھے بلکہ وہ اللہ کے ایک برگزیدہ بندہ اور رسول برحق تھے۔ اس پر بھی اگر آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں کوئی جھگڑا کرے اور کسی طرح حق کو نہ مانے بعد اس کے کہ پہنچ چکا ہے۔ آپ کے پاس اس بارہ میں علم قطعی اور یقینی تو آپ ﷺ اُن کے جواب میں یہ کہہ دیجیے کہ اب مناظرہ اور مباحثہ تو ختم ہوا تمہاری ضد اور عناد کے ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آؤ مباہلہ کریں اس طرح سے کہ بلائیں ہم سب مل کر اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنی ذاتوں کو اور تمہاری ذاتوں کو پھر ہم سب ایک جگہ جمع ہو کر اور مل کر عجز و زاری کے ساتھ حق تعالیٰ سے دعا کریں۔ پس یہ دعا کریں کہ اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہو جھوٹوں پر پس جو جھوٹا ہو گا اس پر اللہ کا قہر آئے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں افراط اور تفریط کرتے ہیں اور کسی طرح امر حق کو مانتے ہی نہیں اور کسی دلیل و برہان پر کان دھرتے ہی نہیں تو ایسے معاندین سے احقاق حق کی تدبیر اور فیصلہ کی آخری صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ ان سے یہ کہہ دیں کہ تم اپنے آدمیوں کی ایک جماعت لے آؤ اور ہم مؤمنین کی ایک جماعت اپنے ساتھ لاتے ہیں اور پھر دونوں فریق مل کر دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدائے تعالیٰ کی لعنت اور عذاب ہو۔ اللہ تعالیٰ خود غیب سے جھوٹے پر کوئی قہر نازل فرمائے گا۔ جس سے راست باز کی راستی اور صداقت ظاہر ہو جائے گی اور جب اس بددعا کا اثر ظاہر ہو گا تو عام لوگ خود ہی صادق اور کاذب کی تعیین کر لیں گے۔

چنانچہ جب آیت نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے نجران کے وفد کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر اُن کو سنائی اور مباہلہ کی اُن کو دعوت دی انہوں نے یہ کہا کہ ذرا صبر کیجیے۔ ہم ذرا غور کر لیں اور باہم مشورہ کر لیں۔ کل آپ کے پاس آئیں گے اور بعض روایات میں ہے کہ یہ کہا کہ آپ ہم کو تین دن کی مہلت دیجیے اور یہ کہہ کر چلے گئے اور باہم مشورہ کیا۔

قال السید للعاقب قد والله علمتم ان الرجل نبی مرسل ولئن لا عنتموہ انه لیستا صلکم و مالا عن قوم نبیا قط فبقی کبیر هم ولا نبت صغیرهم نان ابیتم ان تتبعوہ وابیتم الا الف دینکم فوا دعوہ وارجعوا الیٰ بلاد کم. (در منثور ص ۳۹ ج ۲)

"مشورہ میں اُن کے سردار نے عاقب سے کہا کہ خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ یہ مرد نبی مرسل ہے اور اگر تم نے اس سے مباہلہ کیا تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور واللہ کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ نہیں کیا اور پھر اُن کے بڑے زندہ رہے ہوں اور چھوٹے جوان ہوئے ہوں یعنی سب ہلاک ہوئے پس اگر تم ان کے اتباع اور پیروی کو نہ مانو اور اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہو تو اس شخص (یعنی آنحضرت ﷺ) سے صلح کر لو اور اپنے شہروں کو واپس چلے جاؤ۔"

یہ تجویز لے کر حضور پُرنور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور اِدھر سے آنحضرت ﷺ امام حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لیے ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی انگلی پکڑے ہوئے اور حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو ساتھ لیے ہوئے تشریف لا رہے تھے اور اُن سے یہ فرما رہے تھے کہ میں دُعا کروں تو تم آمین کہنا، وفد نجران کے بڑے پادری نے ان نورانی صورتوں کو دیکھ کر یہ کہا کہ خدا کی قسم! آج مجھ کو ایسے چہرے نظر آتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اس بات کی درخواست کریں کہ یہ پہاڑ اس جگہ سے ہٹ جائیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی درخواست قبول کرے گا۔ لہٰذا تم ان سے مباہلہ کر کے اپنے کو ہلاک اور برباد نہ کرو۔ ورنہ روئے زمین پر ایک نصرانی بھی باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے مباہلہ اور مقابلہ سے گریز کیا اور آپ ﷺ سے صلح کر کے واپس ہو گئے۔ صلح اس پر ہوئی کہ ہر سال حضور ﷺ کو دو ہزار حُلّے (لنگی اور چادر) ایک ہزار صفر میں اور ایک ہزار رجب میں دیا کریں گے۔ حضور ﷺ نے اس کو منظور فرمایا اور ان سے صلح کر لی۔ دلائل ابی نعیم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور پُرنور ﷺ نے جب وفد نجران کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے آپ ﷺ سے تین دن کی مہلت مانگی۔ مہلت ملنے کے بعد مشورہ کے لیے بنو قریظہ اور بنو نضیر اور بنو قینقاع کے یہودیوں کے پاس گئے اور ان سے مشورہ لیا۔

فاشاروا علیهم ان یصالحوه ولا یلا عنوه وهو النبی الذی نجدهٗ فی التوراة فصالحوا النبی ﷺ علی الف حلة فی صفر والفٍ فی رجب و دراهم. (در منثور ص ۳۹ ج ۲)

غرض یہ کہ نصاریٰ میں جو لوگ دانا اور سمجھ دار تھے اُن کے مشورہ سے وفد نے مقابلہ اور مباہلہ سے گریز کیا اور جزیہ دینا قبول کیا۔ تحقیق یہ جو کچھ عیسیٰ علیہ السلام کی بابت بیان کیا گیا یہی بیان تحقیق اور سچا بیان ہے اور سوائے اللہ کے کوئی بھی معبود نہیں تثلیث اور ابنیت کا عقیدہ بالکل غلط ہے اور تحقیق اللہ ہی عزت والا اور حکمت والا ہے۔ سچوں کو عزت دیتا ہے اور اپنے دست قدرت اور اپنی حکمت سے جھوٹے اور سچے کے ساتھ اس کے مناسب حال معاملہ کرتا ہے۔ پس اگر اس کے بعد اہلِ کتاب کلمۂ عدل سے روگردانی کریں نہ دلائل کو مانیں اور نہ مباہلہ پر آمادہ ہوں تو سمجھ لو کہ تحقیق حق مقصود نہیں اور نہ دل میں اپنی صداقت پر وثوق اور اطمینان ہے مباہلہ سے انکار اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وہ اپنے عقائد میں متزلزل ہیں اپنے عقائد کی صحت پر ان کے پاس دلائل نہیں جس سے اُن کو اپنے دعوائے حقانیت کا یقین ہو سکے محض شبہات کی بنا پر اپنے عقائد پر اڑے ہوئے ہیں اور نبی اکرم ﷺ سے جھگڑتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مقصود محض فتنہ اور فساد ہی ہے تو خوب سمجھ لیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے اگر ان کو اپنے عقائد کی حقانیت پر یقین ہے تو پھر ایک جگہ جمع ہو کر اللہ تعالیٰ سے اس دعا اور التجاء کرنے میں کہ اللہ جھوٹوں پر لعنت کرے۔ کیوں تردّد ہے۔

فائدہ: روافض اس آیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں ﴿اَبْنَآءَنَا﴾ سے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں اور ﴿نِسَآءَنَا﴾ سے حضرت فاطمہ اور ﴿اَنْفُسَنَا﴾ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں تو ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عین رسول اور رسول اللہ ﷺ کی طرح مسلمانوں کے جان و مال میں تصرف کے حق دار ہیں۔

کما قال الله تعالیٰ: ﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (الاحزاب:۶) اور جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ تصرف کا حق دار ہو وہی ان کا امام اور خلیفہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ ﴿اَنْفُسَنَا﴾ میں خاص حضرت امیر مراد نہیں بلکہ جماعت مؤمنین مراد ہے جو دین اور ملت میں آپ ﷺ

کے رفیق ہیں۔ جیسا کہ ﴿وَ اَنْفُسِكُمْ﴾ سے کافروں کی جماعت مراد ہے اور یہ مطلب نہیں کہ یہ سب نصاریٰ آپس میں ایک دوسرے کے عین ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک دین اور ایک ملت میں سب شریک ہیں اور قریب اور شریک دین اور رفیق ملت کے لیے لفظ نفس کا استعمال قرآن میں شائع اور ذائع ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

﴿وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ﴾ (البقرہ:۸۴) ﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرہ:۸۵)

﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (الحجرات:۱۱) ﴿لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور:۱۲)

وقال اللہ تعالیٰ: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبہ:۱۲۸)

وقال اللہ تعالیٰ: ﴿اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۶۴)

چونکہ حضرت امیر کو نسب اور قرابت اور مصاہرت اور اتحاد فی الدین والملت کی وجہ سے حضور پُرنور ﷺ سے خاص اتصال تھا۔ اس لیے لفظ نفس سے تعبیر کر دیا گیا اس تعبیر سے اتحاد اور عینیت اور مساوات کا گمان کرنا خیال باطل ہے ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صفات میں حضور پُرنور ﷺ کے مساوی ہو جائیں اور یہ امر فریقین کے نزدیک باطل ہے اس لیے کہ اگر ﴿اَنْفُسِنَا﴾ کا یہ مطلب ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سراسر عین رسول ہیں اور تمام صفات میں حضور ﷺ کے مساوی ہیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اور رسول بھی ہوں اور خاتم النبیین ﷺ اور تمام جن وانس کی طرف مبعوث بھی ہوں اور تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے سردار بھی ہوں۔ نیز لازم آئے گا کہ معاذ اللہ جناب سیدہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح بھی درست نہ ہو۔ غرض یہ کہ ﴿اَنْفُسِنَا﴾ کے لفظ سے تمام صفات میں مساوی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ بعض صفات میں شرکت اور موافقت مفہوم ہوتی ہے اور بعض صفات میں شرکت مفید مدعا نہیں اس لیے محققین شیعہ بھی اس کے قائل ہوئے ہیں کہ یہ آیت حضرت امیر کی محض ایک گونہ فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ افضلیت اور امامت اور خلافت بلافصل سے آیت کا ذرہ برابر تعلق نہیں اور یہی اہل سنّت والجماعت کہتے ہیں۔

اور نساء کے معنی عورتوں کے ہیں اس کا اطلاق عام طور پر زوجہ (بیوی) پر ہوتا ہے جیسا کہ ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ﴾ میں بالاتفاق زوجہ کے معنی مراد ہیں۔ لہٰذا نساء کے لفظ سے بیٹی کے معنی مراد لینا اور یہ کہنا کہ ﴿نِسَآءَنَا﴾ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں لغت اور عرف کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں اور علیٰ ہذا ﴿اَبْنَآءَنَا﴾ سے نواسوں کا مراد ہونا معنی حقیقی نہیں بلکہ معنی مجازی ہیں آنحضرت ﷺ کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ (الاحزاب:۴۰) اور معنی مجازی کے لحاظ سے لفظ ﴿اَبْنَآءَنَا﴾ حسنین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں کو بھی شامل ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا

تو کہہ اے کتاب والو آؤ ایک سیدھی بات پر ہمارے تمہارے درمیان کی، کہ

نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا

بندگی نہ کریں مگر اللہ کو اور شریک نہ ٹھہرائیں اس کی کوئی چیز اور نہ پکڑیں آپس میں ایک ایک کو رب

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

سوا اللہ کے پھر اگر وہ قبول نہ رکھیں تو کہہ، شاہد رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔

دعوتِ اہل کتاب بلطف وعنایات

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ... الٰی... فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾

ربط: ابتداء سورت سے یہاں تک نصاریٰ نجران سے محاجہ اور مناظرہ کا اور پھر مباھلہ کا بیان تھا محاجہ اور مناظرہ سے نصاریٰ پر دلیل اور برہان کے اعتبار سے حجت قائم کی اور مباھلہ کی دعوت سے ضمیر اور وجدان کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ظاہر ہے کہ مباہلہ انتہائی اور آخری حجت ہے اس کا مقتضی تو یہ تھا کہ اس آخری حجت کے بعد اُن سے خطاب ہی چھوڑ دیا جاتا۔ اس لیے کہ خطاب اس سے کیا جاتا ہے جو حق کا طالب ہو اور جو معاند اور مفسد ہے اُس سے روگردانی ہی مناسب ہے لیکن باقتضاء رحمت ورأفت پھر اُن کو مخاطب بناتے ہیں کہ گو تمہاری ہٹ دھرمی انتہا کو پہنچ چکی ہے مگر ہم اپنی بے پایاں رحمت سے پھر تم کو حق دیتے ہیں اس لیے آئندہ آیات میں پھر ان کو نرمی اور ملاطفت کے ساتھ حق اور توحید کی دعوت دی جاتی ہے۔

نیز گزشتہ آیات میں روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا اب آئندہ آیات میں خطاب عام ہے جو یہود اور نصاریٰ دونوں کو شامل ہے۔ نیز زبان سے یہود اور نصاریٰ دونوں توحید کے مدعی تھے کہ ہم خدا کو ایک مانتے ہیں اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان مسلم ہے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام اس کی دعوت دیتے چلے آئے تو اس متفقہ اصول کا اقتضاء یہ ہے کہ سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی کو رب ٹھہرایا جائے اور نہ کسی کو خدا کا بیٹا اور پوتا بنایا جائے۔ اہل کتاب بے شک زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ خدا بے شک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے مگر باایں اقرار طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں۔ اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ اُن کو پھر ایک دفعہ حق کی دعوت دیجیے اور اُن کے ان مسلّمات سے ان پر حجت قائم کیجیے جن کے تسلیم کیے بغیر اُن کو چارہ نہیں تا کہ اس قدر لاچار اور معقول ہو جانے کے بعد شاید کسی کو اتباع حق کا خیال پیدا ہو جائے اور وہ حق کو قبول کر لے اس لیے فرماتے ہیں: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ... الآیۃ﴾ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہیے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک سیدھی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر مسلم ہے۔ جس پر قرآن اور توریت اور انجیل اور تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں متفق ہیں کسی کا اس میں اختلاف نہیں وہ توحید ہے کہ جس کا زبان سے سب اقرار کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو رب اور پروردگار خدا کو چھوڑ کر یہود اور نصاریٰ قولاً ان تینوں باتوں کو تسلیم کرتے تھے مگر عمل ان تینوں باتوں کے برخلاف تھا۔ حضرت عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے اور نصاریٰ تو کھلم کھلا تثلیث کے قائل تھے کہ باپ اور بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدا ہوتے ہیں اور اپنے احبار اور رہبان یعنی پادریوں اور راہبوں کو رب اور پروردگار کے مرتبہ میں مانتے تھے یعنی احبار اور رہبان کا ہر امر اور ہر نہی حق تعالیٰ کے حکم کی طرح بے چون وچرا واجب الاطاعت ہے اور اُن کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس کو چاہیں حرام کریں اور آیت میں ایک دوسرے کو

رب بنانے سے یہی مراد ہے کہ اس کا ہر امر اور ہر نہی بے چون و چرا واجب الاطاعت ہو اور اُس کو تشریع اور تحلیل اور تحریم کا کلی اختیار حاصل ہو اور یہی حقیقت شرک کی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات مختصہ یا حقوق مختصہ میں کسی کو شریک گردانا جائے۔ چنانچہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آیت ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:۳۱) نازل ہوئی تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تو اُن کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بلیٰ انهم حرموا عليهم الحلال واحلو الهم الحرام فاتبعوهم فذالك عبادتهم اياهم.

(اخرجه الترمذی واحمد)

ترجمہ: "کیوں نہیں انہوں نے ان لوگوں کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور لوگوں نے اُن کی پیروی کی پس یہی اُن کو معبود اور رب بنانا ہے۔"

یعنی غیر اللہ اور مخلوق کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے کہنے سے خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام مان لیا جائے اور خدا کی حرام کردہ چیز کو کسی کے حکم سے حلال ٹھہرالیا جائے ایسی ہی تقلید بلاشبہ حرام بلکہ کفر اور شرک ہے اور من دون اللہ کا مصداق ہے کہ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر غیر اللہ کے حکم کو مانا جائے اور رؤساء دین جو احکام چاہیں اپنی طرف سے مقرر کریں اور پھر ان کے احکام کی احکام مُنزّلہ من اللہ کی طرح بجا آوری لازم اور ضروری سمجھی جائے یہ ہے احبار اور رہبان کو رب بنانا اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ رسول اللہ کی اطاعت اس کا مصداق نہیں بلکہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:۸۰) اس لیے کہ رسول کا ہر امر و نہی وحی خداوندی ہوتا ہے۔ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم) اور اسی طرح علماء اور اولیاء اور سلاطین اور حکام کی اطاعت بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو وہ بھی در پردہ اللہ ہی کی اطاعت ہے چنانچہ حکم خداوندی ہے۔ ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹) آیت میں اولے الامر سے علماء اور امراء مراد ہیں۔

ہاں اگر کسی عالم اور حاکم کی اطاعت خلاف شرع ہو تو وہ بے شک ﴿بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہوگی۔

تنبیہ: ائمہ مجتہدین کی تقلید کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ اس آیت کے مضمون میں داخل ہے معاذ اللہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں کہ نصوص شریعت سے قطع نظر کر کے ائمۂ مجتہدین کو یہ اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام کر دیں اور نہ معاذ اللہ کسی امام نے خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا اور نہ خدا کی حرام کردہ چیز کو حلال بنایا۔ بلکہ ائمۂ مجتہدین تو قانون شریعت کے بہترین شارح اور مفسر ہیں اور چونکہ امت میں ائمہ مجتہدین کا علم اور فہم اور ورع اور تقویٰ مسلم ہے۔ اس لیے اُن کے سمجھے ہوئے کے مطابق شریعت کا اتباع کرتے ہیں اور اپنے ناقص اور ناتمام علم اور کم عقلی اور کم فہمی اور صلاح اور تقویٰ سے دوری کی وجہ سے اپنے سمجھے ہوئے پر اعتماد کو روا نہیں سمجھتے رأی العلیل علیلٌ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقین اور شہداء اور صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے سمجھے ہوئے کے مطابق شریعت پر عمل کرنا یہی صراط مستقیم ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات آیات قرآنیہ کی تفسیر ہیں اسی طرح فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال احادیث نبویہ کی شرح ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس اللہ سرہٗ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں:

ان اهل السنة والجماعة افترقت بعد القرون الثلاثة اوالاربعة على اربعة مذاهب ولم يبق فى فروع المسائل سوى هذا المذاهب الاربعة فقد انعقد الاجماع المركب على بطلان قول يخالف كلهم و قد قال رسول الله ﷺ لا تجتمع امتى على الضلالة و قال اللهُ تعالىٰ: ﴿وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۱۱۵﴾

یعنی قرون ثلاثہ یا اربعہ کے بعد اہل سنّت والجماعت ان چار مذہبوں (حنفی۔ مالکی۔ شافعی۔ حنبلی) پر منقسم ہو گئے اور فروعی مسائل میں ان چار کے سوا کوئی پانچواں مذہب باقی نہیں رہا۔ پس جو قول ان چاروں مذاہب کے خلاف ہو اس کے باطل ہونے پر اجماع مرکب منعقد ہو گیا اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری اُمت گمراہی پر متفق نہ ہو گی اور ارشادِ خداوندی ہے کہ سبیل مؤمنین یعنی مسلمانوں کے اجماعی مسلک سے انحراف بُرے انجام کا ذریعہ ہے۔

وقال ابن الهمام فى التحرير انعقد الاجماع على عدم العمل بالمذاهب المخالفة للايمة الاربعة.

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقد الجید میں ائمہ اربعہ کی تقلید کو سوادِ اعظم کا اتباع قرار دیا ہے اور ہندوستان میں خاص امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کو واجب قرار دیا ہے جس کا جی چاہے اصل کتاب کو دیکھ لے۔ پس اگر اصول مسلم کے بعد بھی اہل کتاب روگردانی کریں اور اس صاف اور سچی بات کو قبول نہ کریں جس پر تمام آسمانی کتابوں اور تمام پیغمبروں کا اتفاق ہے۔ تو اے مسلمانو! تم یہ کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ یعنی اللہ کے فرمانبردار اور اس کے حکم کے تابعدار ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حضور پُرنور ﷺ نے جب وفد نجران سے کہا اَسْلِمُوْا مسلمان ہو جاؤ تو کہنے لگے کہ اَسْلَمْنَا ہم تو مسلمان ہیں۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ نصاریٰ نجران جو دعویٰ اسلام کا کرتے ہیں وہ غلط ہے اس لیے کہ جب توحید ہی کے قائل نہیں جو تمام شریعتوں کا مسلم اُصول ہے تو پھر دعوائے اسلام بالکل غلط ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ
اے کتاب والو کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم پر ؟ اور توریت
وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۵ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ
اور انجیل تو اُتریں اس کے بعد، کیا تم کو عقل نہیں؟ سنتے ہو تم لوگ
حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ
جھگڑ چکے، جس بات میں تم کو خبر تھی، اب کیوں جھگڑتے ہو جس بات میں تم کو
بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۶ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ
خبر نہیں؟ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ نہ تھا ابراہیم

يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ

یہودی اور نہ نصرانی اور لیکن تھا ایک طرف کا حکم بردار۔ اور نہ تھا

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا

شرک والا۔ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی، جو ساتھ اس کے تھے، اور اس

النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾

نبی کو اور ایمان والوں کو اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا۔

ابطالِ دعوائے اہلِ کتاب دربارۂ ملت ابراہیم علیہ السلام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ ... الٰی ... وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾﴾

ربط: جس طرح دعوائے توحید میں سب مشترک تھے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم وتکریم میں سب شریک تھے اور یہود اور نصاریٰ ہر ایک فرقہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے عیسائی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے اور ہم ملت ابراہیمی پر ہیں اور اُن سے زیادہ قریب ہیں۔ اور یہودی یہ کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے اور ہم اُن کی ملّت پر ہیں اور اُن سے زیادہ قریب ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کے اس دعوے کے ردّ اور ابطال کے لیے یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ تم سب غلط کہتے ہو۔ تم کو ابراہیم علیہ السلام سے کیا واسطہ تم سب مشرک ہو اور ابراہیم علیہ السلام مُواحد اور مسلم یعنی خدا کے فرمانبردار بندہ تھے۔ ابراہیم علیہ السلام سے محبت کرنے والے اور اُن کے طریقہ پر چلنے والے یہ نبی اور مسلمان ہیں چنانچہ فرماتے ہیں: اے اہلِ کتاب! یعنی یہود و نصاریٰ تم ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں کیوں جھگڑتے ہو اور ان کو یہودی یا نصرانی بتلاتے ہو اور حالانکہ توریت اور انجیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک مدت دراز کے بعد نازل ہوئیں اور یہودیت اور نصرانیت توریت اور انجیل کے نازل ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ علیہما السلام سے ایک ہزار سال مقدم تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل تھے پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ملت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بعثت اور شریعت سے مقدم تھی تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہودیت اور نصرانیت کی نسبت کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ پس کیا تم کو اتنی عقل نہیں کہ ایسی باطل بات زبان سے نکالتے ہو کہ جو جو طریقہ (یہودیت اور نصرانیت) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک ہزار یا دو ہزار برس بعد ظاہر ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے وجود سے پہلے کیسے اس کے متبع تھے آگاہ ہو جاؤ تم ہی وہ لوگ ہو جو اس چیز میں جھگڑ چکے ہو جس کا تمہیں کچھ تھوڑا بہت علم تھا اور اس کے متعلق تمہیں کچھ شُد بُد تھی۔ یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے حالات اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کی تمہیں کچھ خبر تھی حالانکہ عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جب تک آدمی کو پورا علم نہ ہو اس بارہ میں بحث اور مناظرہ نہ کرے۔ پس اے احمقو! اس چیز میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کیا مذہب

اور مسلک تھا اور آج دنیا میں کون سی جماعت ان کے مسلک کے قریب ہے اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور جس چیز کو آدمی نہ جانتا ہو اس کو چاہیے کہ اس کے علم کو خدا کے سپرد کرے اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ابراہیمؑ کا کیا طریقہ تھا۔ سنوان کا طریق یہ تھا کہ ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی ولیکن حنیف تھے یعنی سب طرف سے بیزار ہو کر صرف ایک خدا کے فرمانبردار اور تابعدار تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے بلکہ موحد اور حنیف اور مُسلِم تھے۔ حنیف کے معنی ہیں کہ سب باطل راہوں کو چھوڑ کر راہ حق پکڑے اور سب طرف سے ہٹ کر ایک طرف (یعنی خدا کا) ہو جائے اور مسلم کے معنی فرمانبردار اور تابعدار کے ہیں اور اے اہل کتاب تم نہ موحد ہو اور نہ حنیف اور نہ مسلم ہو شرک میں مبتلا ہو نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو احکام خاوندی کو پس پشت ڈالے ہوئے ہو اور ثالث ثلاثہ کا عقیدہ رکھتے ہو، اور حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو ابن اللہ کہتے ہو تو یہ تم کیسے دم بھرتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ تحقیق تمام لوگوں میں سے ملت اور مذہب کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اور خصوصیّت رکھنے والے البتہ اوّل تو وہ لوگ تھے جنہوں نے اُن کے وقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع اور پیروی کی وہ آپ کی اُمت کے آدمی تھے اور بلاشبہ آپ کے دین پر تھے اور پھر اس اخیر زمانہ میں یہ نبی اور مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نزدیک ہیں کہ جن کی شریعت کے اکثر احکام ملتِ ابراہیمی کے موافق ہیں اللہ کو ایک مانتے ہیں اور قربانی اور ختنہ کرتے ہیں اور خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور حج اور عمرہ بجالاتے ہیں اور غسل جنابت کرتے ہیں اور جن باتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان میں پورے اُترے مسلمان اُن کو پوری طرح ادا کرتے ہیں اور اللہ مسلمانوں کا والی اور کارساز ہے اور جس کا خدا والی ہو اس پر کسی کا داؤ نہیں چل سکتا اور نہ اس کو کوئی راہِ حق سے ہٹا سکتا ہے خلاصۂ جواب خداوندی یہ ہے کہ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے۔ یعنی معاذ اللہ یہودی یا نصرانی تھے اگر اس معنے کر کہتے ہو کہ وہ توریت یا انجیل پر عمل کرتے تھے تو یہ صریح بے عقلی ہے توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک ہزار برس بعد ہوئے اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار برس بعد ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دین یہودی اور دین مسیحی کا پیرو بتلانا صریح بے عقلی ہے اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودی یا نصرانی بتلانے کا یہ مطلب ہے کہ اُس زمانہ میں اہل ہدایت اور اچھے دینداروں کا نام یہودی یا نصرانی تھا تو یہ بات بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو حنیف اور مسلم کہا ہے اور حنیف کے معنی یہ ہیں کہ جس نے تمام باطل راہوں کو چھوڑ کر ایک حق کی راہ پکڑ لی ہو اور مسلم کے معنی حکم بردار اور تابع دار کے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے حوالہ اور سپرد کر دیا ہو اب تم خود غور کرو کہ یہ صفت تم میں ہے یا مسلمانوں میں اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہودی یا نصرانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب دینوں میں یہود یا نصاریٰ کے دین کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے زیادہ مناسبت ہے تو یہ بات بھی غلط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سب سے زیادہ مناسبت اُس وقت کی اُمت کو تھی اور پچھلی اُمتوں میں سب سے زیادہ مناسبت امت محمدیہ کو ہے کہ جس کا پیغمبر خَلْقاً وخُلُقاً وصورۃً وسیرۃً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشابہ ہے اور ان کی خاص دُعا ہے۔ ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ .. الخ﴾ (البقرہ:۱۲۹) اور آپ کی امت کا بھی وہی نام ہے ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا تھا ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ (البقرہ:۱۲۸) اور آپ کی شریعت کے قواعد کلیہ وہی ہیں جو ملت ابراہیمی کے تھے اور غالباً اسی مناسبت کی وجہ سے درود شریف میں كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ فرمایا۔ تشبیہ میں کسی اور نبی کا ذکر نہیں فرمایا۔

ضروری تنبیہ : یادرہے کہ ﴿وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ میں ابراہیم علیہ السلام کے مسلم ہونے سے یہ مراد نہیں کہ آپ شریعت اسلامیہ کو مانتے تھے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی کیونکہ اس صورت میں بھی وہی اعتراض وارد ہوگا کہ یہ شریعت بھی تو توریت اور انجیل کی طرح ابراہیم علیہ السلام کے بعد میں نازل ہوئی۔ پھر ابراہیم علیہ السلام اس شریعت کے کیونکر متبع ہو سکتے ہیں؟ بلکہ اس آیت میں اسلام سے معنی لغوی یعنی تفویض اور تسلیم توحید اور اخلاص فی العمل اور فرمانبرداری کے معنی مراد ہیں جو تمام انبیاء علیہم السلام کا دین رہا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس نام اور صفت کو روشن کیا۔ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (البقرہ:۱۳۱) ﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ﴾ (الصافات:۱۰۳) اور یہی تفویض اور تسلیم اور توحید اور اخلاص فی العمل۔ اصل حقیقت ہے شریعت محمدیہ یعنی اسلام کی اور اس سے اہل کتاب بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین بایں معنی اسلام تھا کیونکہ خود اُن کی کتابوں میں ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جو کچھ آیا ہے وہ بالکل اسی معنی پر منطبق ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے وقت میں اسی معنی کر اسلام کی دعوت دیتے چلے آئے یعنی توحید اور اخلاص فی العمل اور یہی لفظ اسلام اسی معنی اور حقیقت کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین اور مذہب کا نام ہو گیا ہے۔ پس اگر اس نام اور صفت اور اس معنی اور حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمان ہی ابراہیم علیہ السلام سے اقرب اور اشبہ ہوں گے۔

یہود اور نصاریٰ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا نسبت؟

وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ

آرزو ہے بعض کتاب والوں کو ، کس طرح تم کو راہ بھلادیں، اور راہ بھلاتے نہیں

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ

مگر آپ کو اور نہیں سمجھتے اے کتاب والو! کیوں منکر ہوتے ہو اللہ

اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ

کے کلام سے اور تم قائل ہو۔ اے کتاب والو! کیوں ملاتے ہو صحیح

ع ۸ ۱۵ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ

میں غلط؟ اور چھپاتے ہو سچی بات کو جان کر۔ اور کہا ایک لوگوں نے

مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ

اہل کتاب میں، کہ مان لو جو کچھ اترا مسلمانوں پر دن چڑھے،

وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ

اور منکر ہو جاؤ آخر دن، شاید وہ پھر جاویں۔ اور یقین نہ کریو مگر اسی کا جو بہلے تمہارے

دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ

دین پر، تو کہہ ہدایت وہی جو ہدایت کرے اللہ، اس واسطے کہ کسی کو ملا جیسا کچھ

اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ

تم کو ملا تھا، یا مقابلہ کیا تم سے تمہارے رب کے آگے، تو کہہ بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ۚ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ

دیتا ہے جس کو چاہے۔ اور اللہ گنجائش والا ہے خبر دار۔ خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر

يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ

چاہے۔ اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ اور بعض اہل کتاب میں وہ ہے

تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ

کہ اگر تو اس کے پاس امانت رکھے ڈھیر مال کا ادا کرے تجھ کو، اور بعض ان میں وہ ہے، اگر تو اس کے پاس امانت رکھے ایک اشرفی،

لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا

ادا نہ کرے تجھ کو مگر جب تک تو رہے اس کے سر پر کھڑا۔ یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے

لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ

نہیں ہم پر جاہلوں کے حق کا گناہ۔ اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر جانتے

هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

(جان بوجھ کر) کیوں نہیں! جو کوئی پورا کرے اپنا اقرار، اور پرہیز گار ہے، تو اللہ چاہتا ہے

الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا

پرہیز گاروں کو ۔ جو لوگ خرید کرتے ہیں اللہ کے اقرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا مول،

قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا

اُن کو کچھ حصّہ نہیں آخرت میں، اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ اور نہ

يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

نگاہ کرے گا اُن کی طرف قیامت کے دن اور نہ سنوارے گا ان کو، اور ان کو دُکھ کی مار ہے۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ

اور ان میں ایک لوگ ہیں، کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب، کہ تم جانو وہ

الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا

کتاب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں۔ اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے، اور وہ نہیں

هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

اللہ کا کہا اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جان کر۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ

کسی بشر کا کام نہیں، کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حُکم اور پیغمبر کرے پھر وہ کہے

لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا

لوگوں کو کہ تم میرے بندے ہو اللہ کو چھوڑ کر، لیکن تم ربی ہو جاؤ جیسے

كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ

تھے تم کتاب سکھاتے، اور جیسے تھے تم پڑھتے۔ اور نہ یہ کہے تم کو،

اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ

کہ ٹھہراؤ فرشتوں کو اور نبیوں کو رب کیا تم کو کفر سکھاوے گا ؟ بعد اس کے

اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع ۱۰ ۱۶

کہ تم مسلمان ہو چکو۔

یہود کی شرارتوں اور خیانتوں اور افتراء پردازیوں کا بیان

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ ...الیٰ... اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾

ربط: گزشتہ آیات میں اہلِ کتاب سے مناظرہ اور مباہلہ کا بیان تھا کہ یہ لوگ نہ تو کسی دلیل کو مانتے ہیں اور نہ مباہلہ پر آمادہ ہوتے ہیں معلوم ہوا کہ حق کی تحقیق مقصود نہیں بلکہ مقصود شرارت اور فتنہ پردازی ہے اس لیے آئندہ آیات میں یہود کی کچھ شرارتوں اور عداوتوں اور دغابازیوں اور فریب کاریوں کو بیان کرتے ہیں کہ کس کس طرح سے یہ لوگ حق اور باطل کو خلط ملط کرنے میں مکر اور فریب سے کام لیتے ہیں یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ تم حق پر اور سیدھے راستہ پر ہو مگر یہ لوگ تم کو دھوکہ دے کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ دور تک یہی سلسلۂ کلام چلا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اہل کتاب کی ایک جماعت دل سے آرزو رکھتی ہے کہ کسی طرح تم کو گمراہ کر دیں یعنی صحیح راستہ سے تم کو ہٹا دیں اور وہ کسی کو گمراہ نہیں کر رہے ہیں مگر اپنے آپ کو اور وہ سمجھتے بھی نہیں کہ اس کا وبال ان ہی کے سر ہے۔ یعنی ان پر دُگنا عذاب ہوگا ورنہ خود تو پہلے ہی سے گمراہ ہیں گمراہ کو گمراہ کرنا مراد نہیں بلکہ گمراہ کر دینے کا وبال مراد ہے۔ یہود لیل ونہار مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور اپنی چالوں سے مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور توریت کی ان آیات بینات کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے جو حضور پُرنور ﷺ کے نبی برحق ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور علیٰ ہذا آنحضرت ﷺ کے معجزات کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے جو آپ ﷺ کی نبوّت کے دلائل اور شواہد ہیں۔ پس یہود کی یہ کوشش دوسروں کی تضلیل نہیں بلکہ درحقیقت خود اپنی ہی تضلیل ہے مگر اُن کو اس کا شعور اور احساس بھی نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور اس کا کیا انجام ہے۔

اب آئندہ آیات میں ایمان داروں کو ہوشیار کرنے کے لیے اہلِ کتاب کے چند مکر ذکر کرتے ہیں۔ (اوّل) یہ کہ اہلِ کتاب حضور پُرنور ﷺ کے معجزات کو سحر بتاتے ہیں اور آپ ﷺ کی جو بشارتیں کتب سابقہ میں مذکور ہیں باوجود شہادت دینے کے اُن کو چھپاتے ہیں اور طرح طرح سے اُن کی تاویلیں کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اے اہل کتاب! کیوں کفر کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا دیدہ ودانستہ اور حالانکہ تم اپنی زبان سے اس کے قائل اور گواہ ہو کہ یہ آیتیں حق ہیں۔

فائدہ: آیات اللہ سے یا تو توریت وانجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں جن میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت اور نعت اور صفت کا ذکر ہے یعنی نبی کریم ﷺ اور قرآن عظیم کے متعلق جو بشارتیں توریت وانجیل میں مذکور ہیں تم خود اپنی خلوتوں میں اُن کا اقرار کرتے ہو۔ پس ایمان لانے سے کیا چیز مانع ہے؟ خوب سمجھ لو کہ آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کرنا توریت اور انجیل اور تمام کتب سماویہ کا انکار کرنا ہے یا آیات اللہ سے قرآن کی آیتیں مراد ہیں یعنی تم خود بھی جانتے ہو کہ یہ اللہ کی آیتیں ہیں اور پھر بھی ایمان نہیں لاتے یا آیات اللہ سے نشانیاں یعنی معجزات مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ معجزات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نبی برحق ہیں پھر کیوں آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہو۔ یہ تو ملامت ہوئی خود اُن کی ضلالت یعنی خود اُن کی گمراہی پر اب آئندہ آیت میں اضلال یعنی دوسروں کے گمراہ کرنے پر ملامت فرماتے ہیں اے اہل کتاب کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور سچ کے ساتھ کیوں جھوٹ کو ملاتے ہو اور کیوں حق اور

سچی بات کو چھپاتے ہواور حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ حق ہے اور یہ باطل اور یہ بھی جانتے ہو کہ حق کو چھپانا اور حق کو باطل کے ساتھ ملانا کتنا بڑا جرم ہے۔ قانون حکومت میں ایک حرف کا تغیر وتبدل بھی جرم عظیم ہے۔ اہل کتاب توریت کے بعض احکام کو تو دنیوی اغراض کی خاطر بالکل موقوف ہی کر ڈالتے تھے اور بعض آیات میں لفظی تحریف کرتے اور بعض آیات کے معنی پھیر ڈالتے یعنی تاویل فاسد کرتے اور بعض چیزوں کو چھپا کر رکھتے ہر کسی کو خبر نہ دیتے جیسے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی بشارتیں۔ پس ''باطل'' سے یہ تمام تحریفات اور تاویلات فاسدہ مراد ہیں کہ ان کو حق کے ساتھ خلط ملط کر دیتے تھے تا کہ حقیقت واضح نہ ہو غرض یہ کہ لفظی تحریف بھی کرتے تھے اور تاویل فاسدہ کے ذریعہ سے معنوی تحریف بھی کرتے تھے اور کبھی حق بات کو چھپا کر رکھتے یہ تحریف کا نرالا طریق تھا کہ تحریف کا نام بھی نہ ہو اور تحریف کا مقصد حاصل ہو جائے جیسے ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (النساء: ۴۳) کو ذکر کر دینا اور ﴿ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ کو چھپا لینا یہ بھی تحریف ہی ہے۔

اب آئندہ آیت میں یہود کی مسلمانوں کو دین حق سے گمراہ کرنے کی ایک عجیب وغریب سازش اور مکر وفریب کو ظاہر کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عبداللہ بن صیف اور عدی بن زید اور حارث بن عوف نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے چند لوگ صبح کے وقت چل کر محمد (ﷺ) پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ظاہراً ایمان لے آئیں اور پھر شام کو اس کا انکار کر دیں تا کہ لوگ شک اور تردّد میں پڑ جائیں کہ یہ لوگ علماء اہل کتاب ہیں انہوں نے دین اسلام میں ضرور کوئی عیب اور نقصان کی بات دیکھی ہوگی جو داخل ہونے کے بعد اس سے پھر گئے۔ شاید دوسرے لوگ بھی ہم کو اس طرح دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس مکر سے مطلع کر دیا اور بتلا دیا کہ وہ اس قسم کے مکر اور فریب سے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کر سکتے اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے مشورہ کر کے یہ کہا کہ جو کتاب مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے اس پر شروع دن میں ظاہراً ایمان لے آؤ اور پھر آخر دن میں اس سے منکر ہو جاؤ شاید مسلمان بھی شک میں پڑ جائیں اور اپنے دین سے پھر جائیں کہ یہ لوگ علم والے ہیں اور بے تعصّب ہیں کہ اسلام میں داخل ہو گئے ان لوگوں نے دینِ اسلام میں ضرور کوئی خرابی دیکھی ہوگی جو داخل ہونے کے بعد اس سے پھر گئے ہیں۔

خلاصہ [1] یہ کہ صرف مسلمانوں کے دکھلانے کے لیے صرف ظاہری طور پر مسلمانوں کی کتاب پر ایمان لاؤ اور صدق دل سے کسی کے قول کی تصدیق نہ کرو یعنی سچا ایمان جس میں دل اور زبان موافق ہوتے ہیں وہ کسی کے لیے بھی نہ لاؤ مگر جو شخص تمہارے دین کا پیرو ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو یہود مسلمانوں کے پاس جا کر شروع دن میں ظاہراً ان کی کتاب پر ایمان لائیں اور بطور نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کریں ان کو یہ بات برابر ملحوظ رہے کہ وہ اس ظاہری ایمان کی وجہ سے اپنے کو مسلمان نہ سمجھیں بلکہ صدق دل سے اپنے کو یہودی ہی سمجھیں اور سچے دل سے اسی شخص کی بات کو قبول کریں جو ان کے دین کا پیرو ہو سوائے اپنے مذہب والوں کے کسی کی بات کا یقین نہ کریں اس صورت میں ﴿ لِمَنْ تَبِعَ ﴾ میں لام زائد ہوگا اور بعض نے ﴿ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ﴾ کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ تمہارا صبح کے وقت ظاہری طور پر ایمان لانا بھی محض اُن لوگوں کے دین کی حفاظت کے لیے ہو جو تمہارے ہم مذہب اور تمہارے دین کے پیرو

---

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ ﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا﴾ کا عطف ﴿اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ﴾ پر ہے اور یہ جزء آیت کلام یہود کا بقیہ ہے اور ان کے کلام سابق پر معطوف ہے۔ وكذالك قال ابن عطية لا خلاف بين اهل التاويل ان هذا القول من كلام الطائفة، انتهٰى۔

ہیں اس صورت میں ﴿لِمَنْ تَبِعَ﴾ کا لام انتفاع کے لیے ہوگا۔ یعنی اس تدبیر سے اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت مقصود ہونی چاہیے کہ وہ آئندہ چل کر مسلمان نہ ہو جائیں یا جو ہمارے ہم مذہب مسلمان ہو چکے ہیں وہ اس تدبیر سے پھر واپس آ جائیں۔ اے محمد ﷺ آپ ﷺ یہود کے ان علماء اور رؤساء سے کہہ دیجیے کہ تمہارا یہ مکر و فریب سب بیکار ہے تحقیق ہدایت وہ ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے ہدایت ہو جس کے دل میں اللہ ہدایت کا نور ڈال دے اُس کو کسی کا مکر و فریب گمراہ نہیں کر سکتا۔ اور تمہارا یہ مکر و فریب ہدایت نہیں۔ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو عطا ہوئی اور اللہ جس کو چاہے تمہاری طرح کتاب اور دین دے کر ہدایت کر سکتا ہے کوئی وجہ انکار نہیں اور تم مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی یہ چالبازیاں اور مکاریاں اس لیے کر رہے ہو کہ تمہیں اس بات پر حسد ہے کہ کسی اور کو بھی تم جیسا دین اور کتاب اور حکمت دیا جائے جیسا پہلے تمہیں دیا گیا۔ یہود کا یہ گمان تھا کہ نبوت و شریعت اور علم و حکمت بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہے۔ عرب کے اُمیین کو اس فضیلت اور نعمت سے کیا واسطہ * یا یہ مکر اور تدبیر تم نے اس حسد اور جلن میں کی ہے کہ دین کی مددگاری میں رب کے سامنے تم پر کوئی غالب نہ آ جائے کیونکہ وہ ہدایت پر ہیں نہ کہ تم یعنی اس حسد نے تم کو اس مکر پر مجبور کیا تم کو حسد یہ ہے کہ دین کی مددگاری میں ہمارا مقابل کوئی اور کیوں ہو یا یہ معنی ہیں کہ یہ حسد اس بناء پر ہے کہ تم کو یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان تم کو خدا کے رو برو ملزم نہ ٹھہرائیں کہ توریت اور انجیل میں حضور پُرنور ﷺ کی نبوت و رسالت کی بشارتیں مذکور تھیں اور یہ لوگ اس کا اقرار بھی کرتے تھے مگر باوجود اس اقرار اور اعتراف کے آپ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ آپ ﷺ ان رؤساء یہود سے یہ کہہ دیجیے کہ تمہارا یہ حسد اور یہ تدبیر اس صورت میں کارگر ہو سکتی ہے کہ جب فضل اور انعام تمہارے ہاتھ میں ہو لیکن تحقیق فضل و نعمت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے تمہارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں وہ مالک الملک ہے جس کو چاہے عطا کرے اور تم اس کے انعام میں کسی قسم کی کمی اور تنگی بھی نہیں کر سکتے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بڑی گنجائش والا ہے۔ یعنی اس کا فضل نہایت وسیع ہے اور خوب جاننے والا ہے کہ کون اُس فضل و انعام کے لائق ہے وہ اپنی مہربانی اور بخشایش سے جس کو چاہتا ہے خاص کرتا ہے اور اس وقت اس نے اپنی رحمت سے مسلمانوں کو خاص فرمایا ہے اور خداوندِ ذوالجلال کی رحمت پر حسد کرنا فضول بلکہ حماقت ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے اس کے فضل کو کوئی روک نہیں سکتا۔

اہلِ کتاب میں سے اہلِ امانت کی مدح اور اہلِ خیانت کی مذمت

گزشتہ آیت میں اہل کتاب کی تلبیس اور کتمان حق کا بیان تھا اب اس آیت میں اُن کی خیانت فی المال کا ذکر ہے کہ ان لوگوں میں امانت داری اور خدا ترسی نہیں چند پیسوں کے لیے خیانت سے دریغ نہیں کرتے۔ دین اور آخرت کے معاملہ میں ان پر کیسے بھروسہ کیا جائے البتہ ان میں بعض بعض اب بھی امین ہیں جن کو حق کے قبول کرنے میں دریغ نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور بعضے اہلِ کتاب

---

* اشارہ اس طرف ہے کہ ﴿اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ﴾ کا عطف يُؤْتٰٓى پر ہے اور اَنْ کی وجہ سے منصوب ہے اور ﴿يُحَآجُّوْكُمْ﴾ کی ضمیر مرفوع احد کی طرف راجع ہے اور لفظ احد اگرچہ مفرد ہے مگر بلحاظ معنی جمع ہے اور ﴿اَنْ يُّؤْتٰٓى﴾ الیٰ آخرہ بتقدیر لام فعل محذوف کی علت ہے۔ ای لاجل ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم قلتم ذٰلك القول و دبرتم تلك المکیدۃ ای فعلتم ذٰلك حسدا و رخوفا من ان تذهب ریاستکم و یشارککم احد فیما اوتیتم من فضل العلم او یحاجوکم عند ربکم ای یقیمون الحجۃ علیکم عند الله اذ کتابکم طافح بنبوۃ رسول الله صلی الله علیه و سلم و ملزم لکم ان تؤمنوا به و تتبعوه کذا فی البحر المحیط۔

سے ایسے امین ہیں کہ اے مخاطب اگر تو اس کے پاس کوئی خزانہ اور مال کا ڈھیر بھی امانت رکھ دے تو وہ تیری امانت تجھ کو واپس دے دیں گے۔ اگرچہ تو ان سے اپنی امانت کا مطالبہ بھی نہ کرے پس جو شخص مخلوق کے معاملہ میں اس درجہ امین ہوگا تو وہ خالق کے معاملہ میں بدرجہ اولیٰ امین ہوگا ایسا شخص توریت کے احکام میں اور نبی آخر الزمان ﷺ کی بشارتوں میں ذرہ برابر خیانت نہ کرے گا اس لیے کہ وہ اللہ کی امانت ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کسی شخص نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ہزار اور دوسو اوقیہ سونا امانت رکھا۔ آپ ﷺ نے بعینہٖ اُس کی امانت ادا کردی۔ یہ آیت ان کے بارہ میں نازل ہوئی اور بعض ان میں سے ایسے ہیں کہ اس کے پاس اگر ایک اشرفی امانت رکھ دو تو وہ بھی تجھ کو ادا نہ کرے گا مگر جب تک رہے تو اس کے سر پر کھڑا۔ یعنی جب مجبور ہو جائے تب امانت ادا کرے۔ یہ آیت فخاص بن عازوراء یہودی کے بارہ میں نازل ہوئی جس کے پاس کسی شخص نے ایک اشرفی امانت رکھی تھی۔ اور اس نے اس میں بھی خیانت کی اور ان کی یہ خیانت اس وجہ سے ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ناخواندوں اور ان پڑھوں یعنی عربوں کے مال میں ہم پر کوئی راہ نہیں۔ یعنی ہم پر خدا کے یہاں عربوں کے مال میں کوئی مواخذہ اور مطالبہ نہیں۔ عربوں کے مال ہمارے لیے حلال ہیں۔ اہل کتاب کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم اہلِ کتاب ہیں اور ساری دُنیا جاہل ہے اور غیر اہل کتاب مثلاً قریش وغیرہ کے مال میں خیانت کرنے میں ہم پر مذہباً کوئی گناہ نہیں جیسے برہمنوں نے ہندوؤں کے بہکانے کے لیے بہت سی باتیں بنا رکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوے کی تکذیب میں فرماتے ہیں۔ اور یہ لوگ اللہ پر دیدہ دانستہ جھوٹ بولتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی مخالف اور دشمن کے مال میں چوری اور خیانت کی کبھی اجازت نہیں دی ان لوگوں نے پرایا مال کھانے کے لیے یہ مسئلہ بنایا کہ غیر مذہب والوں کی امانت میں خیانت جائز ہے جان بوجھ کر جھوٹ بنالیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے امانت میں خیانت کی کبھی اجازت نہیں دی اور شریعت اسلامیہ کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ مسلمان ہو یا کافر، ہندو ہو یا یہودی یا نصرانی، کسی کی امانت میں خیانت جائز نہیں۔ اور یہ خود بھی جانتے ہیں کہ توریت میں کوئی ایسا حکم نہیں اور آج کل یورپین اقوام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً اور ایشیائی اقوام کے ساتھ عموماً عہد و میثاق کا پورا کرنا ضروری نہیں وقت کا جو تقاضا ہو اس پر چلتے ہیں کیوں نہیں ضرور خیانت پر مؤاخذہ ہوگا کیونکہ اس کے متعلق ہمارا قانون یہ ہے کہ جو شخص اپنے عہد کی وفا کرے خواہ وہ عہد خالق سے ہو یا مخلوق سے ہو اور پرہیز گاری کرے یعنی اللہ سے ڈرے کہ امانت میں کسی قسم کی خیانت نہ ہو جائے۔ پس تحقیق اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کو محبوب رکھتا ہے۔ اور اللہ کا دوسرا قانون یہ ہے کہ تحقیق جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلہ میں دنیا کا تھوڑا سا مول یعنی حقیر معاوضہ خرید کرتے ہیں۔ یعنی معمولی نفع اور معمولی فائدہ کے لیے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھا بیٹھتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے نہ کوئی بات کرے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرے گا یعنی ان کے گناہوں کو نہیں بخشے گا۔ اس لیے کہ خیانت حقوق العباد میں سے ہے اور ان میں لامحالہ قصاص یعنی بدلہ ہے اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہوگا آگ بھی ہوگی اور خطابِ تہدید و توبیخ بھی ہوگا اور نظر غضب بھی ہوگی اور کفر و شرک کی نجاستوں اور گندگیوں سے پاک بھی نہ کئے جائیں گے اور یہ سب کچھ کیوں نہ ہو تحقیق ان اہل کتاب میں سے ایک ایسا گروہ ہے جو کتاب کو زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں اور اس میں کچھ اپنی طرف سے بھی ملا دیتے ہیں اور کتاب ہی کے لہجہ میں اُس کو پڑھتے ہیں تاکہ تم اس ملائے ہوئے کو کتاب کا جزء سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا جزء نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کی طرف سے ہوتا ہے یہ لوگ چالاکی سے آسمانی کتاب میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے گھٹا بڑھا کر ایسے انداز اور لہجہ میں پڑھتے ہیں کہ ناواقف آدمی سن کر دھوکہ میں آجاتا ہے اور

یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ الفاظ اور یہ عبارت بھی آسمانی کتاب کی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ [1] سے مروی ہے کہ یہ آیت یہود اور نصاریٰ کے بارہ میں نازل ہوئی جو کتاب اللہ میں اپنی طرف سے زیادتی اور اضافہ کر دیتے تھے۔ (تفسیر ابن جریر ص ۲۳۱ ج ۳)

صحیح بخاری میں طرق متعددہ سے مروی ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما یہ فرماتے ہیں۔

یا معشر المسلمین کیف تسألون اهل الکتٰب عن شئ و کتاب الله الزی انزله علی نبیه احدث اخبار الله تقرؤ ونه خضالم یشب و قد حد ثکم الله تعالیٰ ان اهل الکتاب قد بدلوا کتاب الله و غیروہ و کتبوا بایدیهم الکتاب و قالوا هو من عند الله لیشتروا به ثمنًا قلیلًا افلا ینهاکم ما جائکم من العلم عن مساء تهم ولا والله مارأینا منهم احدا قط سألکم عن الذی انزل علیکم کذافی تفسیر ابن کثیر تحت تفسیر قوله تعالیٰ ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ... الخ﴾ (طبع بیروت ص ۱۱۷ ج ۱)

"اے گروہ مسلمین! تم اہل کتاب سے کیسے پوچھتے ہو حالانکہ اللہ کی وہ کتاب جو اس نے اپنے نبی پر اتاری ہے وہ سب سے نئی اور آخری کتاب ہے جس کو تم تر و تازہ پڑھتے ہو اور اس میں کسی دوسری چیز کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں یعنی بعینہٖ اللہ کی کتاب پڑھتے ہو اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم کو بتلا دیا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب میں یعنی توریت وغیرہ میں تغیر و تبدل کر لیا ہے اور بہت سی چیزیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس میں شامل کر دی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ دنیا کا فائدہ حاصل کریں کیا جو صحیح اور تازہ علم تمہارے پاس آیا ہے وہ تم کو اہلِ کتاب سے سوال اور استفادہ سے منع نہیں کرتا یعنی صحیح علم کے ہوتے ہوئے محرف کتاب کی طرف کیوں نظر کرتے ہو علاوہ ازیں تمہارا اہلِ کتاب سے سوال کرنا غیرت کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ خدا کی قسم ہم نے تو اہل کتاب کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن کے متعلق تم سے کچھ سوال کرتے ہوں پھر تم کیوں اُن سے سوال کرتے ہو۔" (رواہ البخاری)

اور تفسیر کبیر ص ۵۰۲ ج ۲ و تفسیر نیسابوری ص ۲۲۸ ج ۳ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما [2] سے منقول ہے کہ یہ آیت اُن یہود کے بارہ میں نازل ہوئی جو کعب بن اشرف یہودی کے پاس توریت کا ایک نسخہ لے کر آئے جس میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُن صفات اور علامات کو بدل دیا تھا جو توریت میں آئی تھیں۔ بنی قریظہ نے اُن کی لکھی ہوئی کتاب کو لیا اور اپنی کتاب میں اس کو ملا دیا۔

اور قفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں ﴿لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ﴾ سے یہ مراد ہے کہ یہود بعض الفاظ کی حرکات اعرابیہ کو زبان موڑ کر اس طرح پڑھتے تھے کہ جس سے لفظ کے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے جیسے راعنا کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہماری رعایت فرمایئے لیکن یہود جب اس لفظ کو زبان موڑ کر پڑھتے تو یہ لفظ راعینا بن جاتا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں جو

---

[1] روی الضحاك عن ابن عباس رضی الله عنهما ان الآیة نزلت فی الیهود والنصاری جمیعا و ذلك انهم حرفوا التوراة والانجیل والحقوا بکتاب الله ما لیس منه (کذافی روح المعانی ص ۱۸۱ ج ۳) دا خرجه ابن جریر و ابن ابی حاتم من طریق العوفی عن ابن عباس فی قوله وان منهم لفریقا یلوون السنتهم بالکتاب قال هم الیهود کانوا یزیدون فی کتاب الله مالم ینزل الله. (درمنثور ص ۴۶ ج ۲)

[2] نقل عن ابن عباس رضی الله عنهما انه قال ان النفر الذین لا یکلمهم الله یوم القیامة ولا ینظر الیهم کتبوا کتبا شوّ شوافیه نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و خلطوه بالکتاب الذی کان فیه نعت محمد صلی الله علیه و سلم ثم قالوا هذا من عند الله. (تفسیر کبیر ص ۵۰۲ ج ۲)

سراسر تحقیر ہے یا یہ کہ بعینہٖ یہی لفظ عبرانی اور سریانی زبان میں گالی کا تھا۔

خلاصۂ کلام

جمہور مفسرین کے نزدیک جن میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم بھی ہیں ﴿ لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ ﴾ (النساء:۴۶) سے کتاب خداوندی میں لفظی تحریف کرنا اور اپنی طرف سے کسی چیز کا کتاب الٰہی میں ملا لینا مراد ہے اور قفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ﴿ لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ ﴾ سے حرکات اعرابیہ کو اس طرح توڑ موڑ کر پڑھنا مراد ہے کہ جس سے معنی بدل جائیں اور مطلب کچھ کا کچھ بن جائے۔ جاننا چاہیے کہ ان دونوں معنوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں اس لیے کہ لیٌّ کے معنی پھیرنے اور موڑنے کے ہیں یعنی زبان کلام الٰہی اور کتابِ خداوندی کو اس طرح مروڑے کہ وہ کلام راستی سے ہٹ کر کجی کی طرف آ جائے اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ کتاب کا اصل عبارت ہی کو مسخ کر دیا جائے یعنی اُس کے حروف اور الفاظ میں تغیر و تبدل کر دیا جائے یا اس میں کوئی دوسری چیز ملا لی جائے جیسا کہ علمائے یہود و قریظہ کی نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہوا اور یہ صریح تحریف لفظی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ الفاظ کی حرکات اعرابیہ کو اس طرح موڑ توڑ کر پڑھا جائے کہ معنی بدل جائیں اور کلام اصل معنی اور اصل حقیقت سے دُور جا پڑے یہ دوسرے درجہ کی تحریف ہے اور یہود میں دونوں طرح کی تحریف شائع تھی کبھی اصل لفظ ہی کو بدل ڈالتے اور کبھی تلفظ اور قرأت میں ایسا تغیر و تبدل کرتے کہ جس سے لفظ کے معنی بدل جائیں۔

اور حق جل شانہٗ کا یہ ارشاد ﴿ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ اور پھر ﴿ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یہ تاکید در تاکید اس امر کی صریح دلیل ہے کہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ یہود تحریف میں اس قدر جری اور دلیر ہیں کہ بے خوف و خطر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور بے باکی کا یہ عالم ہے کہ تعریض اور کنایہ پر کفایت نہیں کرتے بلکہ صراحت کے ساتھ تحریفیں کرتے ہیں اور علانیہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور بہتان لگاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور یہ تحریف کرنے والے ایہام اور تعریض پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ صراحت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ بالکل اللہ کی طرف سے نہیں نہ صراحۃً نہ اشارۃً نہ کنایۃً نہ تاویلاً نہ استنباطاً نہ لفظاً نہ معنیً اور یہ لوگ بڑے ہی ڈھیٹ ہیں کہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ہم اللہ پر جھوٹ بول رہے ہیں اور اُن کو یقین ہے کہ یہ ہمارا ملایا ہوا ہے۔ اللہ کی طرف سے بالکل نہیں۔

مسئلہ تحریف: کتب سابقہ کی تحریف کے بارہ میں جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ ان میں تحریف لفظی ہوئی اور بعض شاذ و نادر علماء اس طرف گئے ہیں کہ ان میں صرف تحریف معنوی ہوئی ہے کتب سماویہ کے اصل حروف و الفاظ بعینہٖ محفوظ ہیں۔ جیسا کہ حضرت وہب * بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ توریت و انجیل اسی طرح محفوظ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اتارا تھا لیکن یہود تاویلات فاسدہ کے ذریعہ سے

---

* قال وهب بن منبه ان التوراة والانجيل كما انزلهما الله تعالىٰ لم يغير منها حرف ولكنهم يضلون بالتحريف والتاويل و كتب كانوا يكتبونها من عند انفسهم و يقولون هو من عند الله وما هو من عند الله فاما كتب الله فانها محفوظة ولا تحول رواه ابن ابی حاتم۔

(روح المعانی ص ۱۸۲ ج ۳ تفسیر ابن کثیر ۳۸۶ ج ۱)

گمراہ کرتے ہیں۔ (روح المعانی ص ۱۸۲ ج ۳)

علماء محققین سب اس طرف ہیں کہ توریت وانجیل میں تحریف لفظی بھی ہوئی ہے اور تحریف معنوی بھی اور اہل کتاب نے فقط تراجم میں نہیں بلکہ اصل کتاب میں تغیر اور تبدل کیا ہے کمی بھی کی ہے اور زیادتی بھی علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اگر اُن سے صحیح اور ثابت بھی ہو جائے تو یہ محض ان کی رائے اور گمان ہے جو ناتمام استقراء اور ناقص تتبع سے ناشی ہوا ہے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور یہ امر بدیہی ہے کہ کتب الٰہیہ میں بہت کچھ تغیر وتبدل ہوا ہے اور آج وہ اس طرح موجود نہیں جیسا کہ نزول کے وقت تھیں اور پھر علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دلائل اور شواہد بیان کیے ہیں۔ (روح المعانی ص ۱۸۲ ج ۳)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ وہب بن منبہ کے اس قول * سے کہ اللہ کی کتابیں محفوظ ہیں ان میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ کیا مراد ہے اگر ان کتابوں سے وہ کتابیں مراد ہیں جو فی الحال اُن کے ہاتھ میں موجود ہیں تو ان میں تو بلاشبہ تحریف اور تبدل اور کمی اور زیادتی سب موجود ہے جس کا انکار ممکن نہیں اور اگر ان کتابوں کے تراجم مراد ہیں تو ان میں جو غلطیاں اور زیادتی اور کمی اور اوہام فاحشہ موجود ہیں تو وہ اس قدر کثیر ہیں کہ بیان سے باہر ہیں بلکہ اکثر بلکہ سب کا فہم اُن تراجم کے بارہ میں فاسد اور کاسد ہے اور اگر اس سے اللہ کی وہ کتابیں مراد ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں تو بے شک اُن کو محفوظ کہا جاسکتا ہے مگر اب ان کا کہیں نام ونشان نہیں اور نہ ان میں کلام ہے۔ انتہیٰ۔ (کلام ابن کثیر محصلاً ص ۳۷۶ ج ۱)

اخرج ابن جرير عن عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فی قوله: ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ قال الويل جبل فی النار و هو الزی انزل فی اليهود لا نهم حرفو التوراة زادوا فيها ما احبوا و محوا منها ما يكرهون و محوا اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم من التوراة. (تفسیر درمنثور ص ۸۲ ج ۱)

(تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۷ ج ۱)

"حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ ویل جہنم میں ایک پہاڑ ہے اور یہ فرمایا کہ وہ آیت یہود کے بارہ میں نازل ہوئی اس لیے کہ یہود نے توریت میں تحریف کی توریت میں جس چیز کا اضافہ پسند کیا اُس کو توریت میں زیادہ کر دیا اور جو چیز توریت میں ناپسند ہوئی اُس کو توریت سے مٹا دیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی توریت سے مٹا دیا۔"

اور ایک اور حدیث میں ہے:

((لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم وقولوا امنا بالله وما انزل الاية)). (بخاری)

"اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب اور یہ کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو اللہ کی طرف سے پیغمبروں پر اُتاری گئی۔"

اس لیے کہ ان کی کتاب محرف ہے اور حق اور باطل مخلوط ہے یہ متعین نہیں کہ کون سا حصہ اللہ کا اتارا ہوا ہے اور کون سا حصہ ان

---

* اصل عبارت یہ ہے: واما كتب الله فانها محفوظة ولا تحول. (ابن کثیر ص ۳۷۶ ج ۱)

محرفین کی طرف سے ملایا ہوا ہے۔ لہٰذا اہلِ کتاب کی مطلقاً تصدیق مت کرو مبادا کہ اس سے ان کی تحریف اور ملاوٹ کی تصدیق ہو جائے اور نہ مطقاً کی اس کی تکذیب کرو ممکن ہے کہ وہ بات اللہ کی طرف سے ہو تو اس تکذیب سے اللہ کی بات کی تکذیب لازم آئے گی۔ اجمالی طور پر یہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ نے جو اپنے پیغمبروں پر اُتارا اس پر ایمان رکھتے ہیں اگر وہ حق ہوگا تو ﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ میں داخل ہوگا ورنہ نہیں باقی جو کتابیں اہل کتاب کے ہاتھ میں موجود ہیں ان میں چونکہ کمی اور زیادتی اور تغیر و تبدل سب کچھ ہو چکا ہے اور حق و باطل کا کوئی تمیز نہیں اس لیے ہم نہ اُن کی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب اس لیے تمام علماء محققین کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ موجودہ توریت اور انجیل محرّف ہے جس میں ہر قسم کی تحریف ہوئی ہے کمی بھی ہوئی ہے اور زیادتی بھی ہوئی اور خود علماء توریت و انجیل کو بھی اس کا اعتراف اور اقرار ہے۔ قرآنِ کریم میں صراحت کے ساتھ اس امر کا ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صفت اور نعت توریت اور انجیل میں مذکور ہے اور اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآن کریم میں منصوص ہے کہ ان کی صفات توریت اور انجیل میں مذکور ہیں۔

كما قال الله تعالىٰ: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۛ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ﴾ (الفتح:۲۹)

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ صفات توریت اور انجیل میں مذکور ہیں مگر موجودہ توریت و انجیل میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ پس اگر توریت و انجیل کو تحریف لفظی سے محفوظ مانا جائے تو ان آیات قرآنیہ کی تکذیب لازم آتی ہے۔

اور قران کریم میں جا بجا کتب سابقہ میں تحریف کی خبر دی گئی وہاں سب جگہ تحریف لفظی ہی مراد ہے کیونکہ تحریف معنوی تو قرآنِ کریم میں بھی ہوئی ہے بلکہ ملاحدہ اور زنادقہ قرآن کی تاویلات باطلہ میں یہود اور نصاریٰ سے بھی سبقت لے گئے۔ سر سید علی گڑھی اور غلام احمد قادیانی کی تحریفات اور تاویلات کو دیکھ لیجیے یہود اور نصاریٰ کے بھی کان کُتر لیے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ الحمد للہ قرآن کریم جس طرح تحریف لفظی سے محفوظ ہے اسی طرح تحریف معنوی سے بھی محفوظ ہے۔ اس لیے کہ احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے بعد قرآن کریم کی مراد اس درجہ واضح ہو گئی ہے کہ اب اس میں کسی ملحد زندیق کی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ فللّٰهِ الحمد والمنة

اطلاع:

جس شخص کو کتب سابقہ کی تحریف لفظی و معنوی کی پوری تفصیل درکار ہو تو وہ ازالۃ الشکوک اور ازالۃ الاوہام اور اظہار الحق ہر سہ مصنفہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مراجعت کرے۔

ایک ضروری تنبیہ:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ تحریف معنوی کے قائل ہیں اس لیے کہ صحیح بخاری میں ہے:

قال ابن عباس رضی الله عنهما يحرفون و يزيلون و ليس احد يزيل لفظ كتاب من كتب الله ولكنهم يحرفونه ويتأولونه على غير تاويلهم.

"ابن عباس رضی اللہ عنہما ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں یہود تحریف کرتے ہیں اور کتاب الٰہی کے

الفاظ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور کسی مخلوق کی یہ مجال نہیں کہ اللہ کی کسی کتاب کے کسی لفظ کو زائل اور فنا کر دے لیکن کتاب الٰہی میں تحریف اور اس کی غلط تاویل کرتے ہیں۔"

اس عبارت سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہو گیا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تحریف لفظی کے منکر ہیں اور اسی کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے

یہ صحیح نہیں اس لیے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطرق کثیرہ یہ منقول ہے کہ اہل کتاب نے توریت میں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات مذکور تھیں ان میں بڑا تغیر اور تبدل اور ردّ و بدل کر دیا تھا یہ روایتیں تفسیر درمنثور ص ۸۲ ج ۱ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ وہاں دیکھ لی جائیں۔

لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کتب سماویہ میں تحریف لفظی کے منکر ہیں خصوصاً جب کہ صحیح بخاری میں متعدد جگہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ: اے گروہ مسلمین! تم اہل کتاب سے کیوں دریافت کرتے ہو حالانکہ تمہاری کتاب (قرآن) ابھی خدا کی طرف سے تازہ بتازہ نازل ہوئی ہے اور خالص ہے اور اس میں ذرہ برابر کوئی آمیزش نہیں ہوئی اور تحقیق اللہ نے تم کو خبر دے دی ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کتب سابقہ میں بہت سی چیزیں ملاوٹ کی ہیں اور قرآن کریم خالص دودھ ہے جس میں ذرہ برابر کسی قسم کی ملاوٹ نہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو ایک دوسری غرض سے نقل کیا ہے وہ یہ کہ اللہ کا کلام قدیم اور غیر مخلوق ہے کسی مخلوق سے اُس کا زائل کرنا اور فنا کرنا ممکن نہیں البتہ بندہ اس میں تاویل اور تحریف کر سکتا ہے اور بندہ کا یہ فعل تاویل اور عمل تحریف حادث اور مخلوق ہے اس لیے کہ بندہ کے تمام افعال مخلوق اور حادث ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التوحید میں اسی غرض کے لیے متعدد تراجم اور ابواب رکھے ہیں سب سے مقصد یہی ہے کہ اللہ کا کلام قدیم اور غیر مخلوق ہے اور بندہ کا جو فعل کلام خداوندی سے متعلق ہو یعنی بندہ کا تلفظ اور اس کی قرأت اور اس کی تلاوت اور اس کی کتابت یہ سب مخلوق اور حادث ہیں۔ یعنی کلام ملفوظ اور مقروٗ اور کلام متلو قدیم اور غیر مخلوق ہے اور بندہ کا تلفظ اور قرأت اور کتابت سب حادث ہے۔ اسی طرح بندہ کا یہ عمل یعنی تحریف اور تاویل فاسد بھی مخلوق اور حادث ہوگا۔

اہلِ کتاب کا حضرات انبیاء علیہم السلام پر افتراء اور اس کی تردید

گزشتہ آیت میں یہ ذکر تھا کہ اہل کتاب اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے ہیں اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اب اس آیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام پر ان کی افتراء پردازی کا بیان کرتے ہیں کہ اہل کتاب یہ کہتے ہیں۔ معاذ اللہ۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے ابنیت اور الوہیت کے عقیدہ کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ عیسائی الوہیت مسیح اور تثلیث کے مسئلہ میں جب دلیل اور برہان کے پیش کرنے سے عاجز ہوتے تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہم کو ایسا ہی حکم دے گئے ہیں۔ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا ہے، اور اس قسم کے اور کلمات کا بھی ذکر کرتے ہیں جن سے اپنے زعم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس کا شریک الوہیت ہونا

ثابت کرتے ہیں آئندہ آیت یعنی ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ .. الخ﴾ ان کی تردید اور جواب میں نازل ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو کتاب اور حکمت دے کر بھیجتے ہیں وہ خدا پرستی ہی کی دعوت دیتا ہے یہ ناممکن ہے کہ وہ نبی لوگوں کو اپنی بندگی کی طرف بلائے اور توریت اور انجیل میں صدہا مقامات پر خدا پرستی کی صریح تعلیم موجود ہے۔ لہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے آپ کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا ہے صریح کذب اور افتراء ہے اور اُن کی تصریحات کے صریح خلاف ہے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے توحید کے بعد تم سے اس بات کا بھی عہد اور اقرار لیا تھا کہ جب تم نبی آخر الزمان ﷺ کا زمانہ پاؤ تو ضرور بالضرور اُن کی تصدیق کرنا اور ان پر ایمان لانا اور ان کی نصرت اور اعانت کرنا اور ان کا وہی دین ہوگا جو تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا دین ہے۔ یعنی دین اسلام چنانچہ فرماتے ہیں کسی بشر کے لیے بشر ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور شریعت اور نبوت عطا فرمائیں باوجود اس کے پھر وہ لوگوں سے کہے اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ اس لیے کہ بشر کے سامنے اپنی بشریت کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہوگی اور عاجزی اور درماندگی کے ہوتے ہوئے ادنیٰ عقل والا بھی اپنی الوہیت کا گمان تک نہیں کرسکتا۔ اور پھر جس کو کتاب وحکمت اور نبوت عطا ہو گی وہ وہی شخص ہوگا جو لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دے بعثت کا مقصد ہی توحید وتفرید ہے جس کا امر بالشرک کے ساتھ جمع ہونا ناممکن اور محال ہے اور لیکن وہ نبی تو یہ کہے گا کہ تم اللہ والے ہو جاؤ۔ یعنی ایک خدا کی محبت اور اطاعت میں فنا ہو جاؤ اس لیے کہ تم دوسروں کو اللہ کی کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور اس وجہ سے بھی کہ تم خود بھی اس کتاب الٰہی کو پڑھتے رہتے ہو جو توحید وتفرید کی تعلیم سے بھری پڑی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ نبی تم کو ربانیت کے حکم کے بعد یہ حکم دے کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو پروردگار ٹھہراؤ۔ فرشتے اور پیغمبر معاذ اللہ خدا اور پروردگار نہیں بلکہ پروردگار تک پہنچنے کا واسطہ اور راستہ ہیں اور انبیاء علیہم السلام کفر اور شرک کے مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں کیا وہ نبی تم کو کفر اور شرک کی طرف لوٹنے کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم اسی کی تعلیم وتلقین سے مسلمان اور موحد ہو چکے ہو۔ ابن اسحٰق اور بیہقی رحمہما اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب وفد نجران رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی تو ابورافع قرظی یہودی نے کہا کہ اے محمد (ﷺ)! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی ایسی ہی پرستش کرنے لگیں جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: معاذ اللہ! اور اس پر ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ سے ﴿مُسْلِمُوْنَ﴾ تک آیت نازل ہوئی۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں: یہود مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تمہارا نبی ہم کو کہتا ہے کہ بندگی کرو اللہ کی ہم تو آگے سے اسی کی بندگی کرتے ہیں مگر وہ (یعنی تمہارا نبی) چاہتا ہے کہ میری بندگی کرو سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نبی کرے اور وہ لوگوں کو کفر سے (یعنی غیر اللہ کی عبادت سے) نکال کر مسلمانی میں لاوے پھر اُن کو کیونکہ کفر سکھا دے مگر تم کو (اے اہلِ کتاب) یہ کہتا ہے کہ تم میں جو آگے دینداری تھی کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ (اب تم میں باقی) نہیں رہی اب میری صحبت میں وہی کمال حاصل کرو۔ انتہیٰ یعنی اب میری صحبت میں قرآن پڑھو اور پڑھاؤ اور سیکھو اور سکھاؤ اور عالم ربانی اور عارف یزدانی بنو۔

فائدہ: عبادت اور بندگی تو اللہ ہی کی ہے مگر اطاعت اور پیروی نبی کی بھی ضروری اور لازم ہے۔ شاید اُس معترض نے عبادت اور اطاعت میں فرق نہ کیا اور اعتراض کر دیا کہ معاذ اللہ حضور پُرنور ﷺ لوگوں سے اپنی بندگی چاہتے ہیں۔ یہ اعتراض بالکل لغو اور مہمل تھا عبادت اور اطاعت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ عبادت خالص اللہ کا حق ہے اور بے چون وچرا اطاعت اور پیروی نبی ﷺ کا حق ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ

اور جب لیا اللہ نے اقرار نبیوں کا کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم

ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ

پھر آوے تم پاس کوئی رسول کو سچ بتاوے تمہارے پاس والی کو تو اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔

قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ

فرمایا کہ تم نے اقرار کیا؟ اور اس شرط پر لیا میرا ذمہ؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا

فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ

تو اب شاہد رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ شاہد ہوں۔ پھر جو کوئی پھر جاوے اس کے بعد،

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

تو وہی لوگ ہیں بے حکم۔

تذکیر میثاق انبیاء وتوبیخ برانحراف ازاں

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ ... الیٰ ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

ربط: گزشتہ آیت میں یہ بتلایا کہ عبادت اور بندگی خاص اللہ کا حق ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی نبی اپنی بندگی کی تعلیم دے۔ اب اس آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ انبیاء کا حق یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور بے چون و چرا اُن کی اطاعت کریں اور ہر قسم کی ان کی مدد کریں ہر نبی کے زمانہ میں ہر اُمت سے یہی عہد لیا گیا ہے۔ جس سے اہل کتاب اعراض اور روگردانی کر رہے ہیں اور پختہ عہد کے بعد روگردانی کرنا صریح فسق ہے۔ اور اس آیت کے اخیر میں ﴿فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ میں فسق یہی بدعہدی مراد ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے عہد و پیمان لیا پیغمبروں سے کہ البتہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور حکمت یعنی شریعت کا علم دوں اور پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول جس کے ساتھ دلائل نبوت اور شواہد رسالت ہوں اور وہ رسول تصدیق کرنے والا ہو تمہاری اس کتاب اور شریعت کی جو تمہارے ساتھ ہے تو البتہ تم اس رسول پر ضرور ایمان لانا اور لفظ ایمان اور تصدیق پر اکتفاء نہ کرنا بلکہ جان و مال سے اس کی پوری پوری مدد بھی کرنا اور اس کے دین اور شریعت کی تبلیغ اور ترویج میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہ رکھنا پھر اس عہد کے بعد مزید تاکید اور توثیق کے لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس کام پر میرے پختہ عہدہ و پیمان کو قبول کر لیا سب نے کہا ہم نے اقرار کیا فرمایا تو اب شاہد اور گواہ رہو ایک دوسرے کے اقرار پر اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے گواہ ہوں۔ یہ تمام الفاظ عہد و

میثاق کی تاکید وتوثیق کے لیے فرمائے کہ جس عہد اور پیمان پر حق تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کی گواہی ہو اور مدعا علیہ کا اقرار اور شہادت بھی اس کے ساتھ مقرون ہو تو اُس دستاویز کے پختہ ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ پس جو شخص پھر جائے ایسے پختہ عہد سے بھی جس پر خدا تعالیٰ کی اور اس کے تمام پیغمبروں کی گواہی ہو اور باوجود عہد اور اقرار کے نہ اُس رسول پر ایمان لاوے اور نہ اس کی مدد کرے تو ایسے ہی لوگ پرلے درجہ کے بدعہد اور بدکار اور نافرمان ہیں جو ایسے پختہ عہد و پیمان کی بھی پرواہ نہیں کرتے جاننا چاہیے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرات صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں۔ رسول سے عام رسول اور عام نبی مراد ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں رسول سے خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔

تشریح قولِ اوّل:

اگر ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں۔ رسول سے عام نبی اور پیغمبر کے معنی مراد ہوں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ہر نبی سے جو آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آئے یہ عہد لیا کہ جس کو ہم کتاب وحکمت دے کر بھیجیں اور اس کے بعد دوسرا نبی آئے جو پہلے انبیاء علیہم السلام کی نبوت اور ان کی کتابوں اور حکمت کی اجمالاً یا تفصیلاً تصدیق کرنے والا ہو تو ضروری ہے کہ پہلا نبی بعد میں آنے والے نبی کی تصدیق کرے اور اس کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے یہ نہ ہو کہ پہلے نبی کا علم اور حکمت دوسرے نبی کی تصدیق اور نصرت سے مانع ہو اور اگر خود اس دوسرے نبی کا زمانہ نہ پائے تو اپنی اُمت کو اس کی پوری پوری ہدایت اور وصیّت کر جائے کہ اگر بعد میں آنے والے پیغمبر کا زمانہ پاؤ تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ ایسی وصیّت بھی آنے والے نبی کی نصرت اور اعانت میں داخل ہے۔

اور اس عموم میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی داخل ہوں گے کیونکہ جب عام طور پر اللہ تعالیٰ یہ عہد لے چکا کہ جو نبی اپنے سے پہلی کتاب وحکمت کا مُصدق ہو اس کی تصدیق اور نصرت ضروری ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ونصرت بھی بطریق عموم اس عہد میں داخل ہوگی کیونکہ آپ بھی دلائل وشواہد کے ساتھ اللہ کے رسول ہیں اور سابقہ کتاب اور حکمت توریت وانجیل کے مصدق ہیں۔ لہٰذا یہود ونصاریٰ کو اپنے انبیاء علیہم السلام کے عہد و پیمان کی بناء پر آپ پر ایمان لا کر آپ کی مدد کرنی چاہیے مقصود یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کو انبیاء سابقین علیہم السلام کا عہد و پیمان یاد دلا کر ان کو معقول کیا جائے تاکہ معقول پسند طبیعتیں کفر اور انکار سے باز آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کریں۔

تشریح قولِ دوم:

اور اگر ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں رسول سے خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات مراد ہو تو آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام۔ اور انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں اور اُمتوں سے اس بات کا عہد لیا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں اور تم ان کا زمانہ پاؤ تو ضرور بالضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا حضرت علی * اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے آیت کے یہی

---

* قال علی ابن ابی طالب و ابن عمه ابن عباس رضی الله عنهما ما بعث الله نبیا من الانبیاء الا اخذ علیه المیثاق لئن بعث الله محمدا صلی اللہ علیہ وسلم وهو حی لیؤمنن به ولینصرنه وامره ان یاخذ المیثاق علی امته لئن بعث محمد وهم احیاء لیؤمنن به ولینصرنه۔

(تفسیر ابن کثیر ص ۳۷۸ ج ۱)

معنی منقول ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آیات سابقہ سے لے کر آیت محولہ بالا تک برابر سلسلہ کلام آپ ہی کی نبوت کے اثبات میں چلا آ رہا ہے اور یہی قول جمہور مفسرین کے نزدیک مختار اور راجح ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے قول کے مطابق خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ لفظ رسول اگرچہ نکرہ ہے مگر اشارہ معین اور مخصوص کی طرف ہے جیسے حق تعالیٰ کے قول ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً﴾ (النحل: ۱۲) الیٰ قولہ ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ﴾ (النحل: ۱۳) میں رسول سے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات مراد ہے۔ (تفسیر قرطبی ۱۲۵ ج ۴)

دونوں قولوں میں فرق:

ان دونوں تفسیروں میں فرق یہ ہے کہ اگر رسول سے عام نبی کے معنی مراد ہوں تو اس سے مقصود یہ ہوگا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام باہم متحد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مُصدق اور معین و مددگار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ایک بادشاہ ایک وقت میں دو عامل دو مستقل ولایتوں میں بھیجے تو ہر عامل پر دوسرے عامل کے عمل اور ولایت کی تصدیق اور عندالضرورت اُس کی نصرت اور اعانت ضروری ہے۔ اگرچہ دونوں ولایتوں کے قوانین اور احکام جُزئیہ میں کچھ اختلاف ہو لیکن حکومت کے دستور اساسی میں دونوں متفق ہوتے ہیں۔ البتہ صوبہ اور ولایت کے حالات مختلف ہونے کی وجہ سے مالیہ اور محاصل اور ٹیکس کے احکام ہر صوبہ کے الگ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر دو رسول بیک وقت ایک قوم میں بھیجے جائیں تو وہ دونوں شریعت کی ہر بات میں متفق ہوں گے جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کی شریعت کے احکام بالکل ایک تھے اور اگر ایک نبی اور رسول دوسرے نبی اور رسول کے بعد آئے تو جائز ہے کہ بعد میں آنے والا نبی پہلے نبی کے بہت سے احکام کو منسوخ کر دے مگر اصول دین میں تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اوّل سے آخر تک متفق رہے ہیں۔ اور دوسرے قول کی بنا پر اگر رسول سے خاص حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات مراد لی جائے تو مقصود آیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت اور خاتمیت کو بیان کرنا ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اوّلین اور آخرین کے سردار ہیں کہ آپ کے اتباع اور نصرت کا عہد تمام انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا۔ جیسا کہ شب معراج میں آپ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت فرمائی اور قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کے مقام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کھڑے ہوں گے اور تمام بنی آدم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے یہ تو دلیل ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت عامہ اور اُمت کبریٰ کی۔ اور آپ کے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی دلیل یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ کا تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ فرمانا ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ کہ تم سب کے بعد ایک عظیم الشان رسول آئے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس عظیم الشان رسول کی آمد سب کے بعد ہوگی۔ اور اس کے بعد کسی کو نبی نہیں بنایا جائے گا۔ یہی معنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ سے پہلے نبی بن چکے ہیں۔ البتہ عمر اُن کی طویل ہے اخیر زمانہ میں آپ کی اُمت کی مدد کے لیے آپ کی شریعت کے تابع ہو کر آسمان سے نازل ہوں گے۔

فائدہ: یہ عہد یا تو عالم ارواح میں لیا گیا یا جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے اُن کی ذریت کو نکالا گیا۔ اور پھر عالم شہادت میں ہر نبی کے زمانہ میں اس عہد کی تجدید ہوئی اور عہد الست کی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام نے اس عہد کو یاد دلایا تاکہ یاد کے بعد اُس عہد کا ایفاء کریں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

اب کچھ اور دین ڈھونڈتے ہیں سوائے دین اللہ کے، اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے،

طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ

خوشی سے یا زور سے اور اسی کی طرف پھر جاویں گے تو کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر، اور جو کچھ اُترا ہم پر اور

مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ

جو کچھ اُترا ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر

وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ

اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے ہم جدا نہیں کرتے ان میں

اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ

کسی کو اور اسی کے حکم پر ہیں۔ اور جو کوئی چاہے سوا حکم برداری کے اور

دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ

دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہو گا، اور وہ آخرت میں خراب ہے۔ کیونکر

يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ

راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ منکر ہو گئے مان کر، اور بتا چکے کہ رسول

حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ

سچا ہے، اور پہنچ چکے ان کو نشان۔ اور اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو۔ ایسے لوگوں

جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾

کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت اللہ کی، اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

پڑے رہیں اس میں نہ ہلکا ہو اُن پر عذاب، اور نہ ان کو فرصت ملے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

مگر جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد، اور سنوار پکڑی تو البتہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ

جو لوگ منکر ہوئے مان کر پھر بڑھتے رہے انکار میں، ہرگز قبول نہ ہو گی

تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ

اُن کی توبہ اور وہی لوگ ہیں راہ بھولے۔ جو لوگ منکر ہوئے اور مر گئے

هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ

وہ منکر ہی تو ہرگز قبول نہ ہو گا ایسے کسی سے زمین بھر کر سونا اگرچہ

افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع ۹ ۱۱ ۱۷

بدلہ دیوے یہ کچھ ان کو دکھ کی مار ہے، اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔

خلاصۂ حقیقت اسلام وعدم قبول غیر دینِ اسلام

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ... الیٰ ... وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾﴾

توحید اور رسالت کے بعد دین اسلام کی حقیقت کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں کہ اسلام اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا نام ہے اور یہی تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے اور اسلام ہی تمام کائنات کا دین ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی دین کی دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں جس کی طرف تمام انبیاء علیہم السلام دعوت دیتے چلے آئے آخرت کی نجات کا دارومدار یہی دین اسلام ہے۔ اس کے سوا اللہ کے یہاں کوئی دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کیا یہ لوگ [1] آنے والے رسول پر ایمان لانے اور اس کی نصرت کا پختہ عہد اور پیمان کرنے کے بعد بھی اللہ کے دین کو چھوڑ کر کسی اور دین کو ڈھونڈتے ہیں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس نہیں کرتے کہ جس دین کی وہ رسول دعوت دے رہا ہے اس کو قبول کریں، حالانکہ زمین و آسمان کے کل باشندے حق تعالیٰ ہی کے سامنے سر تسلیم و نیاز خم کیے ہوئے ہیں کوئی خوشی سے اور کوئی ناخوشی سے یعنی زبردستی سے اور قیامت کے دن سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

فائدہ: احکام کی دو قسمیں ہیں: ایک تشریعی جیسے نماز و روزہ جن میں بندے کے اختیار کو دخل ہے اور دوسرے تکوینی جیسے جلانا اور مارنا

---

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ آیت میں ہمزۂ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے اور معطوف علیہ مقدر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ایتولون بعد میثاق الایمان والنصرۃ تغیر دین اللہ یبغون. یا تقدیر اس طرح ہے۔ ایفسقون فغیر دین اللہ یبغون۔

اور بیمار کرنا۔ احکام تکوینیہ کے تو سب مسخر ہیں کوئی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا۔ کرھًا سے یہی تسخیری اطاعت مراد ہے اور طوعاً سے احکام تشریعیہ کی اختیاری اطاعت مراد ہے اور خوشی سے اطاعت کرنے والے فرشتے ہیں اور جن اور انس میں ایمان دار لوگ ہیں۔ کہہ دیجیے اے محمد ﷺ جس دین کی میں تم کو دعوت دے رہا ہوں وہی تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر جو اتاری گئی ہم پر یعنی قرآن پر اور اس چیز پر جو اتاری گئی ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب علیہم السلام پر اور اس کی اولاد پر جن کو خدا نے نبی بنایا اور جن پر خدا کی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی اور اس چیز پر بھی جو تمام پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی۔ اور ہم انبیاء علیہم السلام میں تفریق نہیں کرتے جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کا حال ہے کہ کسی کی تصدیق کریں اور کسی کی تکذیب سب خدا کے برگزیدہ اور فرستادہ تھے اور سب دین حق پر تھے۔ دین سب کا ایک تھا اور ان کی شریعتوں کے قوانین اور احکام میں جو اختلاف تھا وہ وقتی طور اسی زمانہ اور اس ملک اور اس کے باشندوں کے لحاظ سے تھا اور ہم سب اسی ایک خدا کے خالص فرمانبردار ہیں خالص خدا کی بندگی یہ دین اسلام کا خلاصہ ہے اور جو شخص اسلام کے سوا یعنی اللہ کی خالص بندگی کے سوا کوئی اور دین طلب کرے تو وہ دوسرا دین اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ دین وہ دین نہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہو اور اس کو پسند کیا ہو اور وہ آخرت میں خسارہ والوں میں سے ہوگا یعنی اُس کی نجات نہ ہوگی اللہ کے حکم کے سامنے گردن ڈال دینے کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اور مذہب ہے اس کے علاوہ کوئی دین قابلِ قبول نہیں۔

بیان حکم مرتدین:

اب تک ان لوگوں کا بیان تھا جنہوں نے اسلام میں داخل ہونے سے اعراض کیا اب آئندہ آیت میں اُن لوگوں کا بیان ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام سے پھر گئے، ایسے لوگوں کو شریعت کی اصطلاح میں مرتد کہتے ہیں پھر یہ مرتدین دو قسم کے ہیں: ایک وہ ہیں جو اپنے کفر اور ارتداد پر قائم رہے۔ اور ایک قسم وہ ہے جو تائب ہو کر پھر صدق دل سے اسلام میں واپس آ گئے۔ آئندہ آیات میں دونوں کا بیان آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت اور توفیق اور عنایت سے نوازے جو دل سے ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے اور زبان سے اس شہادت اور اس اقرار کے بعد کہ یہ رسول، اللہ کے برحق پیغمبر ہیں اور بعد اس بات کے کہ ان کے پاس آپ کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کی واضح دلیلیں اور روشن نشان پہنچ چکے ہیں اسلام سے پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت اور توفیق نہیں دیتا کہ اقرار کرنے کے بعد پھر جائیں۔ ایسے لوگوں کو توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی ظالم سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہٹ دھرم اور ضدی ہیں ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور تمام فرشتوں کی وہ دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دُور رکھے اور ان پر تمام لوگوں کی لعنت ہے مؤمنین تو صراحتاً کفار پر لعنت بھیجتے ہیں اور کفار بھی حق بات نہ ماننے والے پر لعنت کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس لعنت کا مصداق وہ خود ہیں ہمیشہ رہیں گے اُس لعنت میں اور عذابِ لعنت میں داخل ہونے کے بعد نہ تو عذاب میں ان سے کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی مگر جن لوگوں نے اس کفر اور ارتداد کے بعد توبہ کر لی اور اپنے ایمان کی اور اعمال کی اور نفس کی اصلاح کر لی اور خرابی کے بعد اُس کو درست کر لیا تو البتہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول فرما کر اُن کے جرم سے درگذر کرے گا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انصار میں ایک شخص تھا اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا پھر نادم ہو کر اپنی قوم سے استدعاء کی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کسی کو بھیج کر دریافت کرو کہ میری توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے اس پر یہ آیت ﴿ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا

بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ۔ تا۔ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ نازل ہوئی۔ چنانچہ اس کی قوم نے اس کو بلوایا اور وہ پھر اسلام لایا۔ (نسائی وابن حبان وحاکم)

تحقیق جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا اور پھر کفر میں بڑھتے گئے اور ترقی کرتے رہے کہ مسلمانوں کے ستانے اور حق کے مٹانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جان بوجھ کر اسلام کی دشمنی پر تلے رہے ایسے لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اس لیے کہ سمجھ بوجھ کر حق کی دشمنی کرنے والوں کو اول تو توبہ ہی نصیب نہ ہوگی جو قبول ہو اور اگر مرنے کے وقت یا اور کسی وقت کسی مصلحت سے ظاہری طور پر رسمی الفاظ توبہ کے محض زبان سے کہہ بھی دے مگر دل حق کی عداوت سے صاف نہ ہوا تو ایسی توبہ کہاں قابل قبول ہو سکتی ہے اور ایسے ہی لوگ کامل اور پورے گمراہ ہیں جن کے دل حق کی عداوت سے لبریز ہیں اور اگر کسی وقت زبان سے کوئی لفظ توبہ کا نکلتا ہے تو وہ کسی مصلحت کی بناء پر ہوتا ہے جیسے آج کل کی سیاسی توبہ۔ یہی کمالِ گمراہی ہے کہ اس گمراہی کے مقابلہ میں گویا کوئی گمراہی نہیں کیونکہ یہ لوگ ایسے گمراہ ہیں جن کی گمراہی سے نکلنے کی کوئی اُمید نہیں جیسے وہ بیمار جس کے اچھے ہونے کی اُمید ہو وہ اس بیمار کے مقابلہ میں کیا بیمار ہے جس کے شفاء پانے کی اُمید ہی نہ ہو۔ تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا اور بدوں توبہ کے کفر کی حالت میں مر گئے تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ایسے کسی شخص سے روئے زمین کے برابر سونا اگرچہ وہ سونے کی اتنی مقدار کو عذاب کے فدیہ اور معاوضہ میں لا کر پیش بھی کر دے اور یہ کہے کہ مجھ کو عقاب سے چھوڑ دو تب بھی نہیں قبول کیا جائے گا۔ اور بدوں پیش کیے تو پوچھتا ہی کون ہے یعنی اگر بالفرض والتقدیر کافر کے پاس روئے زمین کے برابر سونا موجود بھی ہو اور بطور فدیہ کے عذاب سے رہائی کے لیے پیش بھی کرنا چاہے تب بھی قبول نہیں چہ جائیکہ خالی ہاتھ ہو اور ایک ذرہ کا بھی مالک نہ ہو تو ایسے کو کون پوچھتا ہے ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہوگا اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا جو ان کو عذاب خداوندی سے بچا سکے۔

فائدہ: کافروں کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو کفر سے صحیح توبہ کریں اور اعمال صالحہ اختیار کریں۔ ایسے لوگوں کی توبہ قبول ہے اور ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾﴾ (آل عمران:۸۹) میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے دوسرے وہ جو کفر سے توبہ تو کرتے ہیں مگر ان کی توبہ صحیح نہیں ہوتی بلکہ ان کی توبہ فاسد ہوتی ہے مثلاً یہ کہ دل سے توبہ نہ کریں محض زبان سے کسی مصلحت سے الفاظ توبہ کے کہہ دیں یا وقت نکلنے کے بعد توبہ کریں جیسے فرعون نے بالکل ڈوبتے وقت توبہ کی اسی طرح یہ لوگ جو ایسے وقت توبہ کریں جب موت بالکل سامنے آ گئی تو ایسے لوگوں کی توبہ مقبول نہیں اس لیے کہ توبہ کی شرط مفقود ہے۔ دل میں ایمان نہیں۔ دل حق کی عداوت اور باطل کی محبت سے لبریز ہے محض زبان سے یا کسی مصلحت سے توبہ کی جا رہی ہے یا توبہ کا وقت نکل چکا ہے اور وقت نکلنے کے بعد مجبور ہو کر توبہ کر رہے ہیں اس آیت یعنی ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾﴾ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے اور تیسرے وہ کہ جو تمام عمر کفر پر قائم رہے اور دن بدن کفر میں ترقی کرتے رہے اور بالآخر بغیر توبہ کے مر گئے اس آخری آیت یعنی ﴿فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا ..الخ﴾ میں یہی لوگ مراد ہیں پہلی آیت میں پہلی قسم کے کافروں کا حکم بیان ہوا۔ اور دوسری آیت میں دوسری قسم کے کافروں کا اور اس آخری آیت میں تیسری قسم کے کافروں کا کہ ایسے لوگ اگر بالفرض والتقدیر قیامت کے دن روئے زمین کے برابر سونا بھی عذاب کے فدیہ میں دینا چاہیں تو وہ قبول نہ ہوگا۔ اس لیے کہ آخرت میں ایمان اور اعمالِ صالحہ قبول ہوں گے مال وزر کی اس دن کوئی حقیقت نہیں۔

الحمد للہ کہ آج بروز دوشنبہ ۱۱ شوال ۱۳۷۸ھ بوقت چاشت شہر لاہور میں تیسرے پارہ کی تفسیر سے فراغت ہوئی۔

فلله الحمد والمنة اَللّٰهُمَّ و فقنا لا تمام التفسير و تقبله منا وتب علينا فانك انت السميع العليم و انك انت التواب الرّحيم. آمين